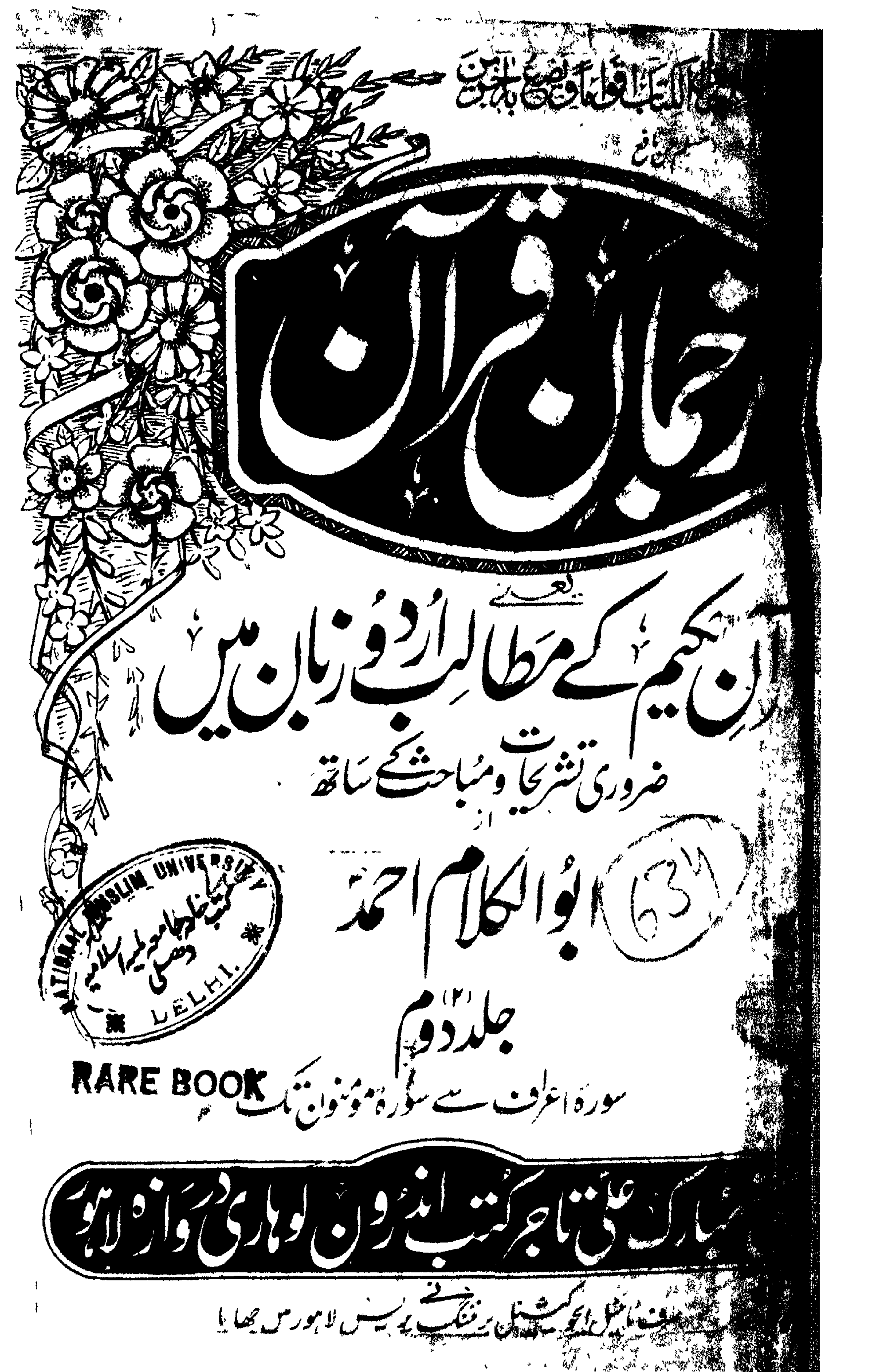

ترجمان القرآن
یعنی
قرآن حکیم کے مطالب اردو زبان میں
ضروری تشریحات و مباحث کے ساتھ
از
ابوالکلام احمد
جلد دوم (۲)
سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک
مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

إنّ اللہ یرفع بہذا الکتاب اقواماً ویضع بہ آخرین

مسلم عن نافع

ترجمان القرآن

یعنی

قرآن حکیم کے مطالب اردو زبان میں

ضروری تشریحات و مباحث کے ساتھ

از

ابو الکلام احمد

جلد دوم

سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک

مطبوعہ مدینہ برقی پریس بجنور

تَرجُمانُ القُرآن

جلد دوم

فہرست

الاعراف

صفحہ ۱

فہرست

الاعراف

صفحہ (۱)

الانفال

صفحہ ۵۲

التوبۃ

صفحہ ۷۳

[illegible] سورتوں میں غلط پڑ گئے ہیں۔ مثلاً یہاں نمبر ۳۰ ہونا چاہیے غلطی سے ۲۹ چھپ گیا ہے۔

(۴) جہاد کے معاملے میں دوسری کی پرواہ کیے بغیر (؟) جب تک کوئی ایسا عذر نہ ہو جو مشکل سے دور ہو جائے، سوائے اس کے قبول نہیں کر سکتا۔

۷۴

(۵) جہاد کے معاملے میں عام اعلان ضروری ہے۔

(۶) جنگ میں اسلام کی سب سے پہلی شکایات اور ظلم و فساد کی انتہا

(۷) قرآن پاک میں جنگ کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام مسلمانوں کا تحفظ ... ظلم ... اور ان کو سمجھیں ... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتحین جنگ کی ... نقصان اور انتقام کے لیے نہیں بلکہ اس لیے تھی کہ ظلم و تشدد سے باز آ جائیں۔

(۸) ایک حدیث میں چھ باتوں کی خبر دی گئی تھی، جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔

(۹) خانۂ کعبہ کی تولیت۔

(۱۰) قرآن کا اعلان کہ شرف و بزرگی کے اصل مناصب کوئی چیز نہیں ہیں۔ بندگی اسی کے لیے ہے جو ایمان و عمل کی بزرگی رکھتا ہو۔

حجاج کی سقایت اور کعبہ کی مجاوری۔

(۱۱) خدا کی عبادت گاہ کی تولیت کا حق متقی انسانوں کو ہے، نہ کہ فاسق و بدعمل اشرار کو۔

(۱۲) مومن صادق کا ایک اہم وصف یہ فرمایا کہ "لم یخش الا اللہ" اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ مانے۔

۸۸

(۱۳) حقیقی نیکیاں اور رواجی نیکیاں۔ قرآن کے نزدیک سب سے بڑا درجہ ان انسانوں کا ہے جو ایمان و حق پرستی کی راہ میں قربانیاں کرنے والے ہیں، نہ کہ ان لوگوں کا جو رواجی نیکیوں اور رسمی نمائشوں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

(۱۴) سورۂ براءت کے نزول کے وقت عرب کی عام حالت اور احکام قرآنی کا ان کی طرف اشارہ۔

(۱۵) اس اصلی تعلیم کی طرف اشارہ کہ مومن وہ ہے، جس کی حب ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت غالب نہ آسکے۔

علائق زندگی کے آٹھ رشتے۔ فرمایا - ایمان باللہ کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے کوئی رشتہ بھی رشتۂ حق پر غالب نہ آسکے۔

(۱۶) جنگ حنین کے مواعظ و عبر۔

اس حقیقت کی تلقین کہ فتح و کامرانی کی بنیاد تعداد کی کثرت پر نہیں ہے، دلوں کی مضبوطی پر ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد دشمنوں سے تین گنا زیادہ تھی، لیکن فتح ہوئی تو تعداد کی کثرت سے نہیں ہوئی بلکہ دلوں کی مضبوطی سے ہوئی۔ مسلمانوں کے عزم و ثبات نے...

(۱۷) خانۂ کعبہ کا مستقبل اور اس بارے میں اعلان عام۔

(۱۸) مشرک کے نجس ہونے سے مقصود معنوی نجاست ہے نہ کہ جسمانی۔ اسلام کسی انسان کے جسم کو ناپاک نہیں قرار دیتا، وہ اس اعتبار سے ہر انسان کو خواہ کسی گروہ اور عقیدہ کا ہو ایک درجہ میں رکھتا ہے۔

۸۰

(۱۹) داخلہ کی ممانعت صرف خانۂ کعبہ کے لیے ہے، نہ کہ عام مساجد کے لیے۔ اسلام نے اپنی عبادت گاہوں کا دروازہ ہر انسان پر کھلا رکھا ہے، بشرطیکہ بے احترامی کے قصد سے داخل نہ ہو۔

(۲۰) عرب کے جن یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف ظلم و تعدی پر کمر باندھ لی تھی، فرمایا ان کے خلاف بھی جنگ کے بغیر چارہ نہیں۔

(۲۱) یہودیوں اور عیسائیوں کی ان اعتقادی اور عملی گمراہیوں کی طرف اشارہ جن کے رسوخ سے ان کی جماعتی سیرت یکقلم مسخ ہو گئی تھی، اور اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ راست بازی و نیک عملی کی روح نشو و نما پا سکے۔

۸۶

(۲۲) عرب جاہلیت کے ایک جاہلانہ قاعدہ کا ازالہ، اور مہینوں کے قدرتی حساب کے قیام کا اعلان۔

(۲۳) غزوۂ تبوک اور اس کے مواعظ و عبر۔

موسم سخت تھا، پچھلی جنگوں سے لوگ تھکے ہوئے تھے، مال کی قلت تھی، سروسامان مفقود تھا، احوال و ظروف ناموافق تھے اور سفر ملک کی حدود سے باہر کا تھا، تاہم حکم ہوا کہ ہر فرد تیار ہو جائے، کیونکہ فرض دفاع کا تقاضہ کسی حال میں بھی نہیں ٹالا جا سکتا۔

ایمان کی آزمائش اور سچے مومنوں کی قربانیاں۔

(۲۴) "استبدال اقوام" کا قانون اور قرآن کی موعظت۔

(۲۵) ہجرت مدینہ کا واقعہ، اور اس کی موعظت سے استشہاد تفسیر "ثانی اثنین اذ هما فی الغار"

(۲۶) حکم دفاع کا وجوب عام، اور "انفروا خفافا و ثقالا" کا وہ مفہوم جو صحابۂ کرام نے سمجھا تھا۔

(۲۷) مدینہ کے منافقوں کا گریز اور طرح طرح کے اعذار، فی الحقیقت یہ معاملہ ایمان و نفاق کے لیے ایک فیصلہ کن آزمائش ہو گیا۔

(۲۸) منافقوں کا عدم شرکت کے لیے خواستگار اجازت ہونا اور آنحضرت کا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ وحی الٰہی کی اس پر تنبیہ

(۲۹) ادائے فرض کے وقت حکم و رخصت کا منتظر رہنا اور خود اپنی جانب سے سرگرمی ظاہر نہ کرنی، اس بات کی دلیل ہے کہ دل ...

یونس

صفحہ ۱۴۷

ھود

صفحہ ۱۸۳

یُوسُف

صفحہ ۲۱۹

الرّعد

صفحہ ۲۶۸

ابراهیم

صفحہ ۲۸۳

الحِجر

صفحہ ۲۹۵

النحل

صفحہ ۳۰۸

بنیٓ اسرآئیل

صفحہ ۳۴۶

الکہف

صفحہ ۳۷۵

مریم

(صفحہ ۴۳۱)

طٰہٰ

صفحہ ۴۴۶

الانبیاء

صفحہ ۴۶۸

الحج

المؤمنون

صفحہ ۵۲۵

نقوش

استدراک

افسوس ہے کہ طباعت کی غلطیوں سے یہ جلد بھی محفوظ نہ رہ سکی، لیکن اُن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ان اغلاط کی درستگی میں تھوڑی سی زحمت ضرور ہوگی، لیکن اگر آپ نے چند لمحوں کی زحمت گوارا کرلی، تو ہمیشہ کے لیے کتاب کا مطالعہ تردد و اضطراب سے محفوظ ہوجائیگا۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷	۴	بلکہ اُن کرکام میں	بلکہ اُن کوکام میں
۲۸	۷	تاکہ زندگی کی	(تاکہ زندگی کی۔
۴۶	۱۰	قانون مہال	قانونِ امہال
۵۵	۱۰	لڑائی کی فتح مندی میں اُسے کچھ دخل ہو۔	لڑائی لڑنے میں اُسے کچھ دخل ہو۔
۸۵	۶	کفر میں کچھ اور بڑھا دینا	کفر میں کچھ اور بڑھ جانا۔
۹۶	۲۰	ازل ہوئی	نازل ہوئی۔
۹۰	۱۱	تم ایک ایسا گروہ ہوگئے	تم ایک ایسے گروہ ہوگئے۔
۱۱۲	۱۰	وہ اللہ کی	وہ (اللہ کی
〃	۱۹	دانش وفہم پیدا کرے	دانش وفہم پیدا کرتی
۱۱۳	۱	واپس جاتی۔ اور	واپس جاتی، تو
۱۲۴	۲۴	جیوز انسائیکلوپیڈیا	جیوش انسائیکلوپیڈیا۔
۱۳۷	۲	سعی وطلب کی سی	سعی وطلب کی اسی
۱۴۱	۲۲	پہلے تبا تامی	پہلے قبا نامی
۱۵۳	۱۸	خوشنما ہوگئیں	خوشنما ہوگئی
۲۶۶	۱۰	خوف رکھنے والیں	خوف رکھنے والیاں
〃	〃	ذکر کرنے والیں	ذکر کرنے والیاں
۳۰۲	۴	تو اُنھوں نے کہا	تو اُس نے کہا
۳۰۴	۱	اور رقوم لوط کی)	اور (قوم لوط کی)
۳۵۹	۱۱	طرح طرح پر	طرح طرح سے
۳۶۵	۱۶	تو ہم یہ بات	تو بھی ہم یہ بات
۳۶۵	۱۷	جب تک تو	جب تک کہ تو
۳۷۷	۱۶	یہ جاگ رہے ہیں،	یہ جاگ رہے ہیں (یعنے زندہ ہیں)
〃	۱۷	حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔	حالانکہ وہ سو رہے ہیں (یعنے مردہ ہیں)
〃	۱۸	ان کی کروٹ بدلتی رہتی ہے	اُن کے رُخ پلٹتے رہتے ہیں۔
۳۹۹	۲۰	ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا	ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھی۔
۴۰۱	۷	سائرس کا سنگی تمثال	سائرس کی سنگی تمثال
〃	۸	دستیاب ہوا۔	دستیاب ہوئی
۴۱۵	۳۲	ولیز جیکسن	ولیمس جیکسن
۴۲۳	۱۹	شمال مغربی قبائل	شمال مشرقی قبائل
۴۳۰	۲۱	مقام کی عملی پیمائش	مقام کی علمی پیمائش
۴۳۵	۳۱	تسلیم جا سکتے ہیں	تسلیم کیے جاسکتے ہیں۔
۴۵۱	۳	خبر بھی نہ تھی	خبر بھی نہ تھی)
۴۷۷	۲۲	ناانصافی کی بات تو ہم ہی سے ہوگئی۔	اصل میں مجرم تو خود ہم ہی ہیں۔
۴۹۵	۱۷	بے رحم جانچ ہونا چاہیے	بے رحم جانچ ہونی چاہیے۔
۵۱۸	۵	مِنْ جھوچ	مِنْ خروج
۵۲۸	۲	اَمْرِنا	اَمْرُنا

بعض سورتوں کے نوٹوں کے نمبروں میں بھی غلطیاں رہ گئی ہیں، لیکن وہ اس قدر واضح ہیں کہ آپ خود محسوس کرلینگے، اور مطالب کی افادیت پر اُن کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے یہاں اشارہ نہیں کیا گیا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِهٖ اٰخَرِیْنَ

مسلم عن نافع

ترجمان القرآن

یعنی

قرآنِ حکیم کے مطالب اُردو زبان میں

ضروری تشریحات و مباحث کے ساتھ

از

ابُوالکلام احمد

جلد دوم

سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک

مطبوعۂ مدینہ برقی پریس بجنور

مقامِ اشاعت:
دفتر ترجمان القرآن نمبر ۱۹ اے۔ بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہٗ

ترجمان القرآن کی دوسری جلد شائع کرتے ہوئے ضروری ہے کہ چند امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے:

(۱) ترجمان القرآن کی ترتیب سے مقصود یہ تھا کہ قرآن کے عام مطالعہ و تعلیم کے لیے ایک درمیانی ضخامت کی کتاب مہیا ہو جائے۔ مجرد ترجمہ سے وضاحت میں زیادہ، مطول تفاسیر سے مقدار میں کم۔ چنانچہ اس غرض سے یہ اسلوب اختیار کیا گیا کہ پہلے ترجمہ میں زیادہ سے زیادہ وضاحت کی کوشش کی جائے۔ پھر جا بجا نوٹ بڑھا دیے جائیں۔ اس سے زیادہ بحث و تفصیل کو دخل نہ دیا جائے۔ باقی رہا اصولی اور تفسیری مباحث کا معاملہ، تو اس کے لیے دو الگ کتابیں مقدمہ اور البیان زیر ترتیب تھیں۔

لیکن پہلی جلد کی اشاعت کے بعد مؤلف نے محسوس کیا کہ تقسیم کار کی یہ ترتیب پیش نظر مقصد کے لیے کتنی ہی ضروری ہو، مگر ارباب نظر کا جوشِ طلب اس پر رضامند نہیں ہو سکتا۔ قدرتی طور پر ان کی لب تشنگی اس سے زیادہ سیرابی کا سامان ڈھونڈھتی ہے، اور مقدمہ اور البیان کے وعدہ پر صبر نہیں کر سکتی۔ وہ مضطرب ہیں کہ کل کا دور لبریز ہو یا نہ ہو، مگر آج کا جام کیوں خالی رہ گیا!

مشاطہ را بگو کہ بر اسبابِ حُسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد!

مطالب کی وسعت اور دائرۂ بیان کی تنگ نائی خود مؤلف کے اضطرابِ بیان کے لیے بھی سخت شکیب آزما تھی، مگر کیا کیجیے نظم و تقسیمِ کار کا تقاضہ ناگزیر تھا۔ اس لیے قدم قدم پر عنانِ قلم کھینچنی ہی پڑتی تھی:

فرصتِ دیدنِ گل آہ کہ بسیار کم است
و آرزوئے دلِ مرغانِ چمن بسیار است

بہر حال صورت حال کے تقاضے سے مؤلف اغماض نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب کی وضع و اسلوب میں ایک نمایاں تبدیلی کر دینی پڑی، اور اب کتاب کی نوعیت محض ترجمہ اور نوٹوں ہی کی نہیں رہی ہے جیسی کہ پہلی جلد کی رہ چکی ہے، بلکہ تفسیری مباحث و تفصیلات کا بھی معتدبہ حصہ شامل ہو گیا ہے۔ بلاشبہ اسکی تفصیلات البیان کی تفصیلات تک نہیں پہنچتیں، اور پہنچنا بھی نہیں چاہئیں۔ تاہم جہاں تک مہاتِ مطالب کا تعلق ہے، تقریباً تمام مقامات بحث میں آ گئے ہیں اور اربابِ نظر کے لیے کفایت کرتے ہیں۔

(۲) اس غرض سے جو طریقہ اب اختیار کیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

پہلے کوشش کی ہے کہ سورت کا کوئی محل طلب مقام بغیر اشارہ و تشریح کے نہ رہ جائے، اور نوٹوں کی ترتیب میں نہ تو مقدار کے لحاظ سے کمی رہے، نہ تعداد کے لحاظ سے۔ چنانچہ پہلی جلد کے مقابلہ میں نوٹوں کی مقدار کم از کم ڈیوڑھی ہو گئی ہے، اور تعداد تو اکثر حالتوں میں دوگنی سے کم نہیں۔

پھر جب سورت ختم ہو گئی، تو سورت کے تمام اہم مقامات پر از سر نو نظر ڈالی گئی اور جن جن مقامات کے لیے تفصیلی بحث ضروری محسوس ہوئی ان پر مستقل مباحث و مقالات لکھ کر آخر میں بڑھائے گئے۔ ان مباحث نے بعض سورتوں میں اس قدر طول کھینچا کہ بہت دور

تک پھیلتے چلے گئے۔ پھر بھی بہ تکلف اختصار کی کوشش نہیں کی گئی، اور بحث نے جس قدر پھیلنا چاہا، پھیلتا گیا۔ مباحث و مقالات کا خط وہی رکھا گیا ہے جو نوٹوں کے خفی قلم کا خط ہے، اور سطرہ ۲۰ کی جگہ ۳۵ سطری اختیار کیا گیا ہے۔ پس اگر ان کی مقدار کا اندازہ متن کے قلم اور سطر کے لحاظ سے کیا جائے، تو تقریباً دوگنے کا فرق تسلیم کرنا پڑیگا۔ یعنے اگر یہ نوٹ اور مقالات کسی کتاب کی شکل میں طبع ہو کر شائع ہوتے، اور متن کا قلم اور سطر اختیار کیا جاتا، تو اس سے دوگنی جگہ لیتے جتنی جگہ میں یہاں آگئے ہیں۔ مثلاً سورۂ توبہ کے آخر میں چھبیس صفحوں کے مباحث ہیں۔ انہیں عام کتابی شکل میں باون صفحات کا مواد تصور کرنا چاہیے۔ سورۂ کہف کے آخر میں اڑتیس صفحات بڑھائے گئے ہیں۔ یہ اس صورت میں کم از کم ۷۰ صفحات تک پہنچ جاتے!

سورۂ اعراف میں چالیس نوٹ ہیں، اور انفال میں بیالیس۔ سورۂ توبہ میں پہلے بائیس نوٹ اتنے مشرح آئے ہیں کہ بعض دو دو، تین تین صفحوں تک مسلسل چلے گئے ہیں۔ پھر آخر میں چھبیس صفحوں کے مفصل مباحث کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔

سورۂ یونس میں پینتالیس نوٹ ہیں۔ پھر بھی آخر میں دس صفحوں کے مباحث اور بڑھانے پڑے۔ سورۂ ہود کے آخر میں ایک مستقل مقالہ اس اصولی بحث پر درج کیا گیا ہے کہ قصص قرآنی کے مبادی و مقاصد کیا ہیں، اور کیوں قرآن انہیں دلائل و براہین کی حیثیت سے پیش کرتا ہے؟

سورۂ یوسف میں جابجا مشرح نوٹ لکھے گئے ہیں۔ پھر آخر میں بیس صفحوں کا ایک مقالہ بڑھایا گیا ہے تاکہ سورت کے مواعظ و بصائر پر ایک مجموعی نظر پڑ جائے۔ سورت کے تفسیری مباحث تفصیل طلب تھے، اور بہت زیادہ تھے۔ اس لیے انہیں قلم انداز کرنا پڑا۔ البتہ مواعظ و حکم کے تمام اہم پہلو پوری طرح واضح ہو گئے ہیں۔

سورۂ کہف کے آخر میں اڑتیس صفحوں کے مقالات بڑھائے گئے ہیں۔ کیونکہ متعدد تاریخی سوالات حل طلب تھے، اور بغیر شرح و اطناب کے واضح نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ سورت کا ایک واقعہ تفصیلی بحث سے رہ گیا یعنی صاحب موسیٰ (علیہ السلام) کے اعمال ثلاثہ اور اُنکے نتائج و حِکَم۔ اگر تفصیلی بحث کی جاتی تو مقالات کی مقدار بہت زیادہ بڑھ جاتی۔ تاہم نوٹ میں جس قدر اشارات کر دیے گئے ہیں، اہل نظر کے لیے کفایت کرتے ہیں۔

بقیہ سورتوں کے ترجمہ و تشریح میں بھی ایسا ہی اسلوب ملحوظ رہا ہے۔

بلاشبہ یہ تفصیلات اُن حدود سے متجاوز ہو گئیں جو ترجمان القرآن کے لیے قرار دی گئی تھیں، لیکن اگر البیان کی تفصیلات سامنے لائی جائیں، تو یہ تفصیلات بھی اجمال و تلخیص سے زیادہ معلوم نہ ہونگی۔ یہاں سورۂ یوسف کا مقالہ بیس صفحوں میں سما گیا ہے، اور البیان کے مسودہ کا مواد اگر چالیس صفحوں میں بھی سما جائے تو سمجھنا چاہیے، بہت کم جگہ میں آگیا۔ سب سے زیادہ تفصیل سورۂ کہف کے مقالات میں ہوئی ہے، لیکن جو مباحث یہاں اڑتیس صفحوں میں سمیٹ دیے گئے ہیں، اُن کے لیے البیان کے ساٹھ ستر صفحوں کی وسعت بھی بمشکل کفایت کریگی!

نہاں عشق ست بر خود بستہ چندیں داستاں، ورنہ — کسے بمعنیٔ یک حرف صد دفتر نمی سازد!

مباحث و تفصیلات کا اضافہ کرتے ہوئے ایک اور پہلو بھی پیش نظر رہا۔ پہلی جلد کی سورتوں میں یہ طریقہ ملحوظ نہیں رہا ہے۔ اس لیے اُنکے جو مقامات بحث و نظر سے رہ گئے ہیں، ضروری تھا کہ اُنکے لیے بھی کوئی صورت پیدا کی جاتی، تاکہ یہ ایڈیشن اپنی نوعیت میں ناقص نہ رہ جائے۔ چونکہ مطالب قرآنی کی بڑی تعداد ایسی ہے جو بار بار دہرائی گئی ہے، اس لیے اُن مقامات کی تشریح کے لیے مناسب موقعہ پیدا کر لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ چنانچہ اس طرح کے تمام مواقع پیش نظر رہے، اور پہلی جلد کی پانچ سورتوں کی اکثر مہمات اس جلد کی سورتوں کے

مباحث میں آگئیں۔ البتہ بعض مباحث باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً قصۂ آدم، خروجِ بنی اسرائیل، حقوقِ نسواں، تقسیم میراث، وغیرہا، تو وہ تیسری جلد کی سورتوں کے مباحث میں خود بخود آجائینگے، اور اس طرح ابتدائی سورتوں کی تشریحات بھی پوری طرح مکمل ہو جائینگی۔

(۳) اس طرح ترجمان القرآن کا مواد دو جلدوں کی جگہ اب تین جلدوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ یہ جلد سورۂ مؤمنون پر ختم ہوئی ہے۔ تیسری جلد سورۂ نور سے شروع ہوگی، اور آخری سورت یعنی الناس پر ختم ہو جائیگی۔ اسکی ضخامت غالباً سات سو صفحوں تک پہنچ جائے۔ چونکہ آخر میں کئی قسموں کی عام فہرستوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے، اس لیے سو صفحے اور بڑھا دینے چاہئیں۔

(۴) ہر کتاب میں اُسکی خصوصیات کا ایک خاص محل ہوتا ہے۔ اگر اُس محل پر نظر رہے، تو کتاب کی تمام خصوصیات پر نظر رہی۔ اُس سے ہٹ جائے، تو گویا پوری کتاب سے ہٹ گئی۔ ترجمان القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اسکی تمام خصوصیات کا اصلی محل اُس کا ترجمہ اور ترجمہ کا اسلوب ہے۔ اگر اُس پر نظر رہیگی، تو پوری کتاب پر نظر رہیگی۔ وہ اوجھل ہوگی، تو پوری کتاب نظر سے اوجھل ہو گئی!

قرآن کے مقاصد و مطالب کے باب میں جس قدر کاوش کی گئی ہے، راہ کو مشکلات سے جسقدر صاف کیا گیا ہے، قرآن کے علوم و معارف کے جسقدر اصول و مبادیات از سرِ نو مدوّن کیے گئے ہیں، وہ سب کے سب صرف اسی محل میں ڈھونڈھے جا سکتے ہیں، اور یہی خزینہ ہے جس میں کتاب کی تمام خصوصیات مدفون ہیں۔ اگر اہل نظر غور و تدبر سے مطالعہ کرینگے، تو فوراً محسوس کرینگے کہ نہ صرف ترجمہ کا ہر صفحہ، بلکہ ہر صفحہ کے متعدد مقام کسی نہ کسی خصوصیت کو نمایاں کر رہے ہیں، اور اکثر حالتوں میں ترجمہ کے صرف ایک لفظ یا کسی ایک ترکیب نے معاملہ کی بے شمار مشکلیں حل کر دی ہیں۔ اگر ترجمہ کے ساتھ ایسے حواشی بڑھائے جاتے جن میں ہر مقام کی خصوصیتیں واضح کی جاتیں، اور کھول کھول کر بتلایا جاتا کہ پہلے معاملہ کی نوعیت کیا تھی، اور اب کیا سے کیا ہو گئی ہے، تو یقیناً یہ حواشی اپنی مقدار میں ایک پوری کتاب بن جاتے۔ کیونکہ ترجمہ کی ہر چوتھی پانچویں سطر ایک نئے حاشیہ کا تقاضہ کرتی، اور ہر حاشیہ تفسیری مباحث کا ایک مقالہ بن جاتا۔

بہر حال ضروری ہے کہ مطالعہ کے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے۔ جسقدر غور و تدبر سے ترجمہ کا مطالعہ کیا جائیگا، اُسی قدر قرآن حکیم کے حقائق اپنی اصلی طلعت و زیبائی میں بے نقاب ہوتے جائینگے۔

(۵) ترجمہ کے بعد کتاب کا دوسرا محلِ تدبّر، نوٹ ہیں۔

یہ نوٹ عبارت میں مطوّل نہیں ہو سکتے تھے، اور مطوّل نہیں ہیں، لیکن معانی و اشارات میں مفصل ہو سکتے تھے، اور پوری طرح مفصل ہیں، اور اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی ہر سطر تفسیر کا ایک پورا صفحہ بلکہ بعض حالتوں میں ایک پورے مقالہ کی قائم مقام ہے۔ اکثر مقامات میں ایسا ہوا ہے کہ معارف و مباحث کا ایک پورا دفتر دماغ میں پھیل رہا تھا، مگر نوکِ قلم پر پہنچا تو ایک سطر یا ایک جملہ بن کر رہ گیا۔ اب کتاب کے صفحہ پر وہ ایک جملہ ہی رہیگا، لیکن اہل نظر چاہیں تو اپنے ذہن و فکر میں پھر اُسے ایک دفتر کی صورت دے کر پھیلا دے سکتے ہیں:

آں کس ست اہلِ بصارت کہ اشارت اند　　نکتہ ہاست بسے، محرمِ اسرار کجاست؟

پس ضروری ہے کہ نوٹوں کا مطالعہ ایک ہی مرتبہ نہیں، بلکہ بار بار کیا جائے۔ جوں جوں فکر آشنا ہوتا جائیگا، مطالب و دقائق کے نئے نئے پہلو آشکارا ہوتے جائینگے۔

(۶) یہ مشکل ہے کہ کتاب کی علمی حیثیت کا عام طور پر اندازہ کیا جا سکے۔ اس لیے جو چیز پیش نظر ہے، وہ اُس کے مطالعہ کے نتائج ہیں۔ اُس کی حیثیت کا اعتراف نہیں۔

بڑی دقت یہ پیش آگئی ہے کہ ترجمان القرآن تفسیری مباحث کے ردّ و کد میں نہیں پڑتا۔ صرف یہ کرتا ہے کہ اپنے پیشِ نظر اصول و قواعد کے ماتحت، قرآن کے تمام مطالب ایک مرتب و منظم شکل میں پیش کر دے۔ اگر وہ جا بجا یہ بات نمایاں کرتا جاتا کہ معاملہ کے اُلجھاؤ کیا

کیا تھے، اور اب کس طرح حقیقتِ گم گشتہ کا سُراغ لگایا گیا ہے، تو ممکن ہے، اہل نظر اس باب میں کوئی رائے قائم کر سکتے۔ لیکن اگر ایسا کیا جاتا تو کتاب کی اصلی حیثیت مفقود ہو جاتی۔ اس لیے قصداً اس سے احتراز کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں لیکن کام کی نوعیت و حیثیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

ملک میں آج دو ہی گروہ موجود ہیں۔ علماء اور جدید تعلیم یافتہ۔ پہلا گروہ قدیم راہوں سے آشنا ہے، لیکن نظر و تدبر کے نئے تقاضوں سے آشنا نہیں۔ دوسرا گروہ نئے تقاضوں کی تشنگی رکھتا ہے، لیکن قدیم راہوں سے آشنا نہیں، اور نہ راہ کی مشکلات کی اُسے کچھ خبر ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ معاملہ کی علمی نوعیت کا نہ تو پہلا گروہ اندازہ شناس ہو سکتا ہے، نہ دوسرا، اور بدقسمتی سے تیسرا گروہ مفقود ہے!

یارب کجاست محرمِ رازے، کہ یک زماں   دل شرحِ آں دہد کہ چہ دید و چہا شنید!

کام کی علمی نوعیت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا تھا کہ قرآن کے جس قدر اُردو فارسی ترجمے موجود ہیں، سب سامنے رکھ لیے جائیں نیز قدیم تفاسیر میں سے بھی چند مقبول و مستند تفسیریں اُٹھالی جائیں۔ یا کم از کم تفسیر کبیر ہی منتخب کر لی جائے کہ تفسیری مباحث میں متأخرین کا منتہائے نظر و کاوش وہی ہے۔ پھر کم از کم کسی ایک سورت کا ترجمہ ترجمان القرآن میں نکال کر ایک ایک آیت کے ترجمہ و شرح کا ان سب سے مقابلہ کیا جائے، اور پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ دیکھا جائے کہ کونسی بات وہاں کس شکل و نوعیت میں آئی ہے، اور یہاں اُس نے کونسی شکل و نوعیت اختیار کر لی ہے، اور پھر اس اختلافِ نظر نے مقاصد و مطالبِ قرآنی کا معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے اہل نظر کہاں سے آئیں؟ اور اگر کوئی ہو بھی تو اتنی زحمت کیوں برداشت کرنے لگا؟ بہرحال زمانہ اس کام کا اندازہ شناس ہو یا نہ ہو، مگر مؤلف نے زمانہ کی حالت کا پوری طرح اندازہ کر لیا ہے اور اوّل دن سے اُس پر قانع ہے۔ جو کچھ طلب ہے، استفادہ و عمل کی ہے۔ اعتراف و تحسین کی نہیں:

از رد و ہم قبولِ تو فارغ نشستہ ایم   لے آں کہ خوب ماندہ شناسی ز زشتِ ما!

(۷) کتاب کے ساتھ ہر سورت کے مطالب کی جو فہرست دی گئی ہے، وہ صرف فہرست ہی نہیں ہے، بلکہ بجائے خود نظر و مطالعہ کی ایک چیز ہے۔ اگر ایک صاحبِ نظر پوری کتاب نظر انداز کر دے، اور صرف اس فہرست پر قناعت کر لے، جب بھی قرآن کے مقاصد و مطالب پر اتنا عبور حاصل کر لیگا جو شاید دوسری صورتوں میں حاصل نہ کیا جا سکے۔ یہ گویا بجائے خود ایک مجمل تفسیر ہے۔ یہ ہر سورت کے مطالب و دقائق کو پوری ترتیب و تعلیل کے بعد یک نظر واضح و آشکارا کر دیتی ہے!

پہلی جلد کی فہرست جب میں نے مرتب کرنی چاہی، تو اس سے زیادہ کوئی بات پیشِ نظر نہ تھی کہ ایک فہرست مرتب ہو جائے لیکن قلم نے بلا قصد اسلوبِ نگارش کا ایک ایسا رُخ اختیار کر لیا، کہ ترتیب کے بعد دیکھا، تو معاملہ کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دوستِ عزیز نے جنکی نظر سے ابھی اصل کتاب نہیں گذری تھی، صرف سورۂ بقرہ کی فہرست کا پروف پڑھ کر سورۂ بقرہ کی پوری تفسیر پر ایک جامع و مانع تقریر سنادی۔ اب وہی اسلوبِ ترتیب اس جلد کی فہرست میں بھی قصداً ملحوظ رکھا گیا ہے، اور اُمید ہے کہ اہل ذوق کے لیے مزید علم و بصیرت کا موجب ہوگا۔

تیسری جلد کے آخر میں ایک عام اور ابجدی فہرست بھی بڑھائی جائیگی، جو مختلف جہتوں سے مطالبِ قرآنی کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہوئے، ہر نوع و قسم کو الگ الگ کر کے نمایاں کر دیگی، اور انشاء اللہ اپنی نوعیت میں نہایت نافع اور جامع ثابت ہوگی۔ فبشر عباد، الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھدٰھم اللہ، واولئک ھم اولوا الالباب! (۱۸:۳۹)

ابوالکلام

موتی نگر۔ کانگریس کیمپ
لکھنؤ

۱۳- اپریل ۱۹۳۶ء

(کتبہ عبدالقیوم انتظار)

الاعراف (۷)

مکی - ۲۰۶ آیتیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمٓصٓ ۝ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى ۱
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۲
قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ ۳
قَآئِلُوْنَ ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ ۴

(۱) ہدایتِ وحی کا مقصد "تذکیر" اور "تنذیر" ہے۔ "تذکیر" یعنی پند و موعظت کے ذریعہ بیدار کرنا۔ "تنذیر" یعنی انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کرنا۔

(۲) پیروانِ دعوت کو موعظت کہ دعوتِ حق کا معاملہ بڑے ہی عزم و ثبات اور صبر و استقلال کا معاملہ ہے، اور خواہ کتنی ہی مشکلیں پیش آئیں لیکن بالآخر حق کی فتح مندی اٹل ہے۔ پس چاہیے کہ مشکلاتِ کار سے دل تنگ و افسردہ خاطر نہ ہوں۔

(۳) مشرکینِ عرب کو تنذیر۔

۱ الف، لام، میم، صاد۔
(اے پیغمبر!) یہ کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کی پاداش سے) خبردار و ہشیار کردو، اور اس لیے کہ ایمان رکھنے والوں کے لیے بیداری و نصیحت ہو۔ پس دیکھو ایسا نہ ہو کہ اس بارے میں کسی طرح کی دل تنگی تمہارے اندر راہ پائے!

۲ (لوگو!) جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر نازل ہوا ہے، اس کی پیروی کرو، اور خدا کو چھوڑ کر اپنے (ٹھہرائے ہوئے) مددگاروں کے پیچھے نہ چلو (افسوس تم پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو!

(۴) جن جماعتوں نے دعوتِ حق کا مقابلہ کیا، وہ پاداشِ عمل میں ہلاک ہوگئیں۔ کیونکہ انکار و سرکشی کا نتیجہ ہلاکت و نامرادی ہے۔

(۵) قوموں سے پرسش ہوگی کہ انہوں نے پیغمبروں کی دعوت پر کان دھرا یا نہیں، اور پیغمبر بھی اس کے لیے جوابدہ ہیں کہ انہوں نے فرضِ رسالت ادا کیا یا نہیں۔

۳ اور (دیکھو) کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے (پاداشِ عمل میں) ہلاک کردیا۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ لوگ راتوں کو بے خبر سو رہے تھے یا دوپہر کے وقت استراحت میں تھے کہ اچانک عذاب کی سختی نمودار ہوگئی!

۴ پھر جب عذاب کی سختی نمودار ہوئی، تو (انکار و شرارت کا سارا دم خم جاتا رہا) اس وقت

۵ إِلَّآ أَن قَالُوٓا۟ إِنَّا كُنَّا ظَٰلِمِينَ ۝ فَلَنَسْـَٔلَنَّ ٱلَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ ٱلْمُرْسَلِينَ ۝
۷ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ ۖ وَمَا كُنَّا غَآئِبِينَ ۝ وَٱلْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ ٱلْحَقُّ ۚ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَٰزِينُهُۥ
۸ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَٰزِينُهُۥ فَأُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓا۟ أَنفُسَهُم
۹ بِمَا كَانُوا۟ بِـَٔايَٰتِنَا يَظْلِمُونَ ۝ وَلَقَدْ مَكَّنَّٰكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَٰيِشَ ۗ قَلِيلًا
۱ مَّا تَشْكُرُونَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِـَٔادَمَ فَسَجَدُوٓا۟

۵ اُن کی پکار اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ "بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے"!

تو دیکھو، یقیناً ہم اُن لوگوں سے بازپرس کرینگے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے (کہ انہوں نے پیغمبروں کی دعوت پر کان دھرا یا نہیں) اور یقیناً پیغمبروں سے بھی بازپرس ہوگی (کہ

۶ اُنہوں نے فرضِ رسالت ادا کیا یا نہیں) اور پھر یقیناً ایسا ہوگا کہ (اُن کے اعمال کی

۷ سرگزشت) ہم اپنے علم سے اُنہیں سُنا دینگے، اور ہم غائب نہ تھے (کہ بے خبر ہوں)

اور اُس دن (اعمال کا) تولنا برحق ہے۔ پھر جس کسی (کی نیکیوں کا) پلّہ بھاری نکلیگا تو

۸ کامیابی اُسی کے لیے ہوگی، اور جس کسی کا پلّہ ہلکا ہوا، تو یہ وہ لوگ ہونگے جنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا۔ کیونکہ وہ ہماری آیتوں

۹ کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے!

(۶) قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر جماعت کو ویسی ہی نتائج ملیں گے، جیسے کچھ اُس کے اعمال ہونگے۔ کامیاب انسان وہ ہوگا جس کی بھلائیاں بُرائیوں سے زیادہ ہونگی۔ نامراد وہ ہوگا جس کی بُرائیوں کے وزن سے بھلائیاں دب جائینگی۔ دنیا میں اشیاء کے موازنہ کے لیے ترازو کام دیا کرتا ہے۔ اسی طرح اعمال کے موازنہ کے لیے بھی قدرت نے ایک میزان مقرر کردیا ہے جس کی تول میں کبھی غلطی نہیں ہوسکتی۔

اور (دیکھو) ہم نے تمہیں (یعنی نوعِ انسانی کو) زمین میں (قدرت و اختیار کے ساتھ) بسا دیا، اور زندگی کے سروسامان مہیا کردیے، مگر

۱۰ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ شکر گزار ہو!

اور (دیکھو، یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا (یعنی تمہارا وجود پیدا کیا) پھر تمہاری (یعنی نوعِ انسانی کی) شکل و صورت بنادی، پھر (وہ وقت آیا کہ) فرشتوں کو حکم دیا "آدم کے آگے جھک جاؤ!" اِس پر سب جھک گئے، مگر

(۷) نسلِ انسانی کی سعادت و شقاوت کی ابتدائی سرگزشت، اور ہدایتِ وحی کی ابتدا:

(۱) پہلے انسان کے وجود کی تخلیق ہوئی، پھر اُس کی صورت بنی، پھر وہ وقت آیا کہ آدم کا ظہور ہوا، اور اس نے وہ مقام حاصل کرلیا کہ ملائکہ کو حکم ہوا، اُس کے آگے سربسجود ہوجاؤ۔

١١ إِلَّآ إِبۡلِيسَ لَمۡ يَكُن مِّنَ ٱلسَّٰجِدِينَ ○ قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسۡجُدَ إِذۡ أَمَرۡتُكَۖ قَالَ أَنَا۠ خَيۡرٞ
١٢ مِّنۡهُ خَلَقۡتَنِي مِن نَّارٖ وَخَلَقۡتَهُۥ مِن طِينٖ ○ قَالَ فَٱهۡبِطۡ مِنۡهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ
١٤،١٣ فِيهَا فَٱخۡرُجۡ إِنَّكَ مِنَ ٱلصَّٰغِرِينَ ○ قَالَ أَنظِرۡنِيٓ إِلَىٰ يَوۡمِ يُبۡعَثُونَ ○ قَالَ إِنَّكَ مِنَ
١٦-١٥ ٱلۡمُنظَرِينَ ○ قَالَ فَبِمَآ أَغۡوَيۡتَنِي لَأَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَٰطَكَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ○ ثُمَّ لَأٓتِيَنَّهُم مِّنۢ
١٧ بَيۡنِ أَيۡدِيهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ أَيۡمَٰنِهِمۡ وَعَن شَمَآئِلِهِمۡۖ وَلَا تَجِدُ أَكۡثَرَهُمۡ شَٰكِرِينَ ○

(ب) ملائکہ نے تعمیل کی لیکن ابلیس نے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کی۔

(ج) آدم سے بھی لغزش ہوئی، لیکن اُس نے سرکشی نہیں کی عجز و اعتراف کا سر جھکا دیا۔

(د) اب بنی آدم کے لئے دو راہیں ہوگئیں:

ایک آدم والی کہ احکام الٰہی کی اطاعت کرنا اور اگر قصور ہو جائے تو توبہ و انابت کا سر جھکا دینا

دوسری ابلیس والی کہ پہلے نافرمانی کرنا، پھر عجز و اعتراف کی جگہ سرکشی و تکبر کی چال چلنا

جو پہلی راہ چلیگا کامیاب ہوگا جو دوسری راہ چلیگا نامُراد ہوگا

(ہ) ابلیس کے گھمنڈ اور گستاخانہ جرأت کے ذکر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ بُرائی کی قوتیں جب سر اٹھاتی ہیں تو اُنکی سرکشی کا ایسا ہی حال ہوتا ہے، اور

(و) یہاں ڈھیل اور مہلت سب کے لئے ہے، اچھوں کے لیے بھی اور بُروں کے لیے بھی۔

یاد رہے کہ قرآن نے حقائق کی دو قسمیں کر دی ہیں:-

ایک وہ جن کا تعلق عالم غیب سے ہے یعنی غیر محسوسات سے۔

ایک وہ جن کا تعلق عالم شہادت سے ہے یعنی محسوسات سے۔

نوع انسان کی ابتدائی پیدائش اور نشوونما کا معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ ہم اپنے وسائل ذہن و ادراک سے کوئی یقینی روشنی اس بارے میں حاصل نہیں کر سکتے اور اس لیے ضروری ہے کہ کتاب الٰہی نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس پر ایمان لائیں۔

آدم کی سرگزشت کی تاریخ تورات ہی سے شروع نہیں ہوتی، بلکہ آثار قدیمہ کے انکشافات نے اسے بہت قدیم عہد تک پہنچا دیا ہے۔ کم سے کم یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تورات سے کئی ہزار سال پہلے بابل اور مصر میں کسی ایسے واقعہ کا اعتقاد عام تھا چنانچہ کالڈیا کی اینٹوں پر اس کے نقوش ملے ہیں۔ اوزیرس کے معبد

١١ ابلیس، کہ جھکنے والوں میں سے نہ تھا۔

خدا نے فرمایا "کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟"

١٢ کہا "اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ اُسے مٹی سے"۔

١٣ فرمایا "جنت سے نکل جا تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو یقیناً تو ان میں سے ہوا جو ذلیل و خوار ہیں!"

١٤ ابلیس نے کہا مجھے اُس وقت تک کے لیے مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد) اُٹھائے جائیں گے"

١٥ فرمایا "تجھے مہلت ہے"

١٦ اس پر ابلیس نے کہا "چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کر دی، تو اب میں بھی ایسا ضرور کرونگا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں۔ پھر سامنے سے، پیچھے سے، دہنے سے، بائیں سے (غرضکہ ہر طرف سے) اُن پر آؤں، اور تو اُن میں سے اکثروں کو شکرگزار

١٧ نہ پائیگا"۔

۱۸ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۖ لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ ○
وَيَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ
۱۹ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ○ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن
۲۰ سَوْآتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ○
۲۱ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ○ فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا
سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا
عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ

ہیں اس کی تصاویر نمایاں ہیں، اور ہیروغلیفی نقوش بھی اس کے اشاروں سے خالی نہیں۔

خدا نے فرمایا "یہاں سے نکل جا۔ ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کریگا، تو (وہ تیرا ساتھی ہوگا، اور) میں البتہ ایسا کرونگا کہ (پاداشِ عمل میں) تم سب سے جہنم بھر دوں!" ۱۸

"اے آدم! تو اور تیری بیوی، دونوں جنت میں رہو سہو، اور جس جگہ سے جو چیز پسند آئے شوق سے کھاؤ۔ مگر دیکھو، (وہ جو ایک درخت ہے، تو) اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ اگر گئے تو یاد رکھو، تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے" ۱۹

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا، تاکہ اُن کے ستر جو اُن سے چھپے تھے، اُن پر کھول دے۔ اُس نے کہا "تمہارے پروردگار نے اِس درخت سے جو تمہیں روکا ہے، تو صرف اِس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو، تم فرشتے بن جاؤ، یا دائمی زندگی تمہیں حاصل ہو جائے"

اُس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دِلایا کہ میں تم دونوں کو خیرخواہی سے نیک بات سمجھانے والا ہوں۔ ۲۱

غرضکہ شیطان (اس طرح کی باتیں سُنا سُنا کر بالآخر) اُنہیں فریب میں لے آیا پھر جونہی ایسا ہوا کہ اُنہوں نے درخت کا پھل چکھا، اُن کے ستر اُن پر کُھل گئے، اور (جب اُنہیں اپنی برہنگی دیکھ کر شرم محسوس ہوئی، تو) باغ کے پتے، اوپر تلے رکھ کر، اپنے جسم پر چپکانے لگے۔ اُس وقت اُن کے پروردگار نے پکارا "کیا میں نے تمہیں اِس درخت سے نہیں روک دیا تھا، اور

اَقُل لَّکُمَآ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لَکُمَا عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ○ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا ٚ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا ۲۲
وَتَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ○ قَالَ اهۡبِطُوۡا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ ۲۳
مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ○ قَالَ فِیۡهَا تَحۡیَوۡنَ وَفِیۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ وَمِنۡهَا تُخۡرَجُوۡنَ ○ ع یٰبَنِیۡۤ ۲۴-۲۵
اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَرِیۡشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ؕ ذٰلِکَ
مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ○ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّةِ یَنۡزِعُ ۲۶
عَنۡهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوۡاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ یَرٰىکُمۡ هُوَ وَقَبِیۡلُهٗ مِنۡ حَیۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡ

کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟ ۲۲

انہوں نے عرض کیا "پروردگار! ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا۔ اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا، تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں!" ۲۳

فرمایا "یہاں سے نکل جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے، اور یہ کہ ایک خاص وقت تک وہاں سروسامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ ۲۴

اور فرمایا "تم اسی میں جیو گے، اسی میں مرو گے، پھر اسی سے (مرنے کے بعد) نکالے جاؤ گے!" ۲۵

"اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس مہیا کر دیا جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے، اور ایسی چیزیں بھی جو زیب و زینت کا ذریعہ ہیں۔ نیز تمہیں پرہیزگاری کی راہ دکھا دی کہ تمام لباسوں سے بہتر لباس ہے۔ یہ اللہ (کے فضل و رحمت) کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، تاکہ لوگ نصیحت پذیر ہوں!" ۲۶

(اور خدا نے فرمایا:) "اے اولادِ آدم! دیکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اسی طرح بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا تھا، اور ان کے لباس اتروا دیے تھے کہ ان کے ستر انہیں دکھا دے۔ وہ اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے۔

(۸) اب یہاں سے آیت ۳۶ تک اولادِ آدم سے خطاب ہے۔ یعنے وہ احکام بیان کیے گئے ہیں جو آدم کی ابتدائی نسل کے افراد کو دیے گئے تھے، جب وہ زمین پر پھیل گئے؛

(ا) خدا نے زمین کی پیداوار میں تمہارے لیے لباس کا سامان پیدا کر دیا۔ اس میں پوشش و حفاظت بھی ہے اور زیب و زینت بھی۔ نیز اس نے ایک دوسرا لباس بھی مہیا کر دیا ہے، اور وہ لباسِ تقویٰ ہے۔ پہلا جسم کی حفاظت و زینت ہے۔ دوسرا روح کی۔

(ب) دنیا کا سامانِ زیب و زینت خدا کی بخشی ہوئی نعمت ہے۔ پس دینداری کا مقتضا یہ ہوا کہ انہیں کام میں لایا جائے۔ نہ یہ کہ ان سے گریز کیا جائے۔ خدا کی عبادت کرو، تو اپنے سامانِ زینت سے آراستہ ہو کر کرو۔

(ج) کھاؤ پیو، دنیا کی تمام نعمتیں کام میں لاؤ، مگر اسراف یعنے بے اعتدالی نہ کرو۔ یہ بات کہ دنیا کی تمام راحتوں اور لذتوں سے فائدہ اٹھانا، مگر بے اعتدالی سے بچنا، دینِ حقیقی کی وہ بنیادی اصل ہے جس کی اولادِ آدم کو تعلیم دی گئی تھی۔

۲۷ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ○ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا

۲۸ آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا

۲۹ بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ○ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِينَ

أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ

(۸) خدا کا قانون یہ ہے کہ انسان کی ہدایت کے لیے پیغمبر مبعوث کرتا ہے۔ پھر جو کوئی اصلاح کی راہ اختیار کرتا ہے، فلاح پاتا ہے۔ جو سرکشی کرتا ہے، تباہ ہوتا ہے۔

۲۷ یہاں خصوصیت سے لباس کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہ ہی انسان کی عقلی زندگی کا سب سے پہلا مظاہرہ تھا۔ جب وہ لباس پہننے لگا، تو یہ گویا اس حقیقت کا اعلان ہوا کہ اُس کا اخلاقی شعور اُبھر آیا ہے، صنعت و اختراع کی راہوں سے آشنا ہو گیا ہے، اور عام حیوانی زندگی کی جگہ انسانی زندگی کی خصوصیات نشو و نما پا رہی ہیں۔

(۹) خدا کے دین کی اصلی تعلیم تو یہ تھی لیکن لوگوں نے خود ساختہ گمراہیاں پیدا کرلیں اور اُنہیں حکمِ الٰہی سمجھنے لگے۔ آیت (۲۸) میں فرمایا، گمراہی کا سب سے بڑا سرچشمہ اپنے بزرگوں کی تقلید ہے۔ مشرکین عرب کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی "ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے"

۲۸ (۱۰) آیت (۲۹) میں دینِ حق کے تین بنیادی اصول واضح کردیے: عمل میں اعتدال، عبادت میں توجہ، اور خدا پرستی میں اخلاص۔ یہ آیت باب توحید میں اصل اصول ہے۔ فرمایا "دین کو خدا کے لیے خالص کرکے اُسے پکارو" یعنے دین کی جتنی باتیں ہیں، وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کردو!

یاد رکھو، ہم نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے، اُن کے رفیق و مددگار شیاطین ہوتے ہیں!

اور یہ لوگ (یعنے مشرکین عرب) جب بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں، تو کہتے ہیں "ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور (چونکہ وہ کرتے رہے ہیں اس لیے) خدا نے ایسا ہی کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے"۔ (اے پیغمبر!) تم کہدو "خدا کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیگا۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرات کرتے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟"

تم کہو "میرے پروردگار نے جو کچھ حکم دیا ہے، وہ تو یہ ہے کہ (ہر بات میں) اعتدال کی راہ اختیار کرو، اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو، اور دین کو اُس کے لیے خالص

۲۹ کرکے اُسے پکارو۔ اُس نے جس طرح تمہاری ہستی شروع کی، اسی طرح لوٹائے جاؤ گے"

(تمہارے دو گروہ ہوگئے) ایک گروہ کو (اُس کے ایمان و نیک عملی کی وجہ سے کامیابی کی) راہ دکھائی۔ دوسرے پر (اُس کے انکار و بدعملی سے) گمراہی ثابت ہوگئی۔ ان لوگوں نے (یعنی دوسرے گروہ نے) خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنالیا، (یعنی مفسدوں اور شریروں کی تقلید

۳۰ وَّ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا

۳۱ تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ○ؑ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ

مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

۳۲ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَ

الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ

---

۳۰ کی) بااین ہمہ سمجھے کہ راہِ راست پر ہیں!

(اور ہم نے حکم دیا تھا) اے اولادِ آدم! عبادت کے ہر موقعہ پر اپنے جسم کی زیب و زینت سے آراستہ رہا کرو۔ نیز کھاؤ پیو، مگر حد سے نہ گزر جاؤ۔ خدا اُنہیں پسند نہیں کرتا جو حد سے گزر جانے والے ہیں"

۳۱ (اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہو "خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لیے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں؟" تم کہو "یہ (نعمتیں) تو اسی لیے ہیں کہ ایمان والوں کے کام آئیں۔ دنیا کی زندگی میں (زندگی کی مکروہات کے ساتھ اور) قیامت کے دن (ہر طرح کی مکدرات سے) خالص!" دیکھو، اس طرح ہم اُن لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں جو جاننے والے ہیں!

۳۲ (اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہو "میرے پروردگار نے جو کچھ حرام ٹھہرایا ہے، وہ تو یہ ہے کہ: بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر کی جائیں اور جو چھپا کر کی جائیں۔

گناہ کی باتیں۔

ناحق کی زیادتی۔

(۱۱) رُہبانیت کا رد، اور اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ دنیوی زندگی کی آسائشیں اور زینتیں خدا پرستی کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ اُن کو کام میں لانا عین منشاءِ ایزدی کی تعمیل ہے۔ چنانچہ فرمایا، اولادِ آدم کو جو تعلیم دی گئی تھی، وہ یہ تھی کہ اپنی زیب و زینت سے آراستہ ہو کر خدا کی عبادت کرو!

پیروانِ مذاہب کی عالمگیر گمراہی یہ تھی کہ سمجھتے تھے، رُوحانی سعادت جبھی مل سکتی ہے کہ دنیا ترک کر دی جائے، اور خدا پرستی کا مقتضا یہ ہے کہ زینتوں اور آسائشوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے، حقیقت اس کے عین برعکس ہے۔ تم سمجھتے ہو، زندگی کی زینتیں اس لیے ہیں کہ ترک کر دی جائیں، حالانکہ وہ اس لیے ہیں کہ کام میں لائی جائیں۔ دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھیک طور پر کام میں لانا مشیتِ الٰہی کو پورا کرنا ہے۔

خدا نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے سب تمہارے ہی لیے ہے۔ کھاؤ پیو، زینت و آسائش کی تمام نعمتیں کام میں لاؤ، مگر حد سے نہ گزر جاؤ۔ دنیا نہیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے۔

زندگی کی جن زینتوں کو پیروانِ مذاہب خدا پرستی کے خلاف سمجھتے تھے، انہیں قرآن "زینۃ اللہ" یعنے خدا کی زینتوں سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں اُلٹ دیں۔ وہ دنیا جو نجات و سعادت کی طلب میں دنیا ترک کر رہی تھی، اب اُسی نجات و سعادت کو دنیا کی تعمیر و ترقی میں ڈھونڈھنے لگی!

یہاں "زینت" سے مقصود وہ تمام چیزیں ہیں جو زندگی کی قدرتی

۳۳ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ

۳۴ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ

۳۵ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ

۳۶ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ فَمَنْ اَظْلَمُ

مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ

ضروریات سے زیادہ ہوں، مثلاً اچھا لباس، اچھا کھانا، معیشت کی تمام بے ضرر آسائشیں اور لذتیں۔

یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کی اُس نے کوئی سند نہیں اُتاری۔

۳۳ اور یہ، کہ خدا کے نام سے ایسی بات کہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں"

اور (دیکھو) ہر اُمت کے لیے ایک ٹھہرایا ہوا وقت ہے، سو جب کسی اُمت کا ٹھہرایا ہوا وقت آگیا، تو

۳۴ پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتی ہے، نہ ایک گھڑی آگے۔ (جو کچھ اُس کے لیے ہونا ہے، ہو گزرتا ہی!)

(اور فرمانِ الٰہی ہوا تھا:) "اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں، اور میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سُنائیں، تو جو کوئی (اُنکی تعلیم سے متنبہ ہو کر) بُرائیوں سے بچیگا اور اپنے آپ کو سنوار لیگا، اُس کے لیے کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی"

۳۵ "لیکن جو لوگ میری آیتیں جھٹلائیں گے اور اُن کے مقابلے میں سرکشی کرینگے، تو وہ دوزخی ہونگے۔ ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے!"

۳۶ پھر بتلاؤ، اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو جھوٹ بولتے ہوئے خدا پر بہتان لگائے؟ (یعنے خدا نے اُسے مامور نہیں کیا ہے مگر وہ کہے میں مامور ہوں) اور اُس سے بڑھ کر، جو خدا کی آیتیں جھٹلائے؟ (یعنے خدا کا کلام واقعی نازل ہوا ہو اور وہ ضد اور سرکشی سے کہے،

(۱۲) پچھلی آیت (۳۴) میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ افراد کی طرح جماعتوں کی موت و حیات کے لیے بھی مقررہ قوانین ہیں، اور اُن کے احکام اٹل ہیں۔ جب ایک جماعت کا شر و فساد اُس حد تک پہنچ جاتا ہے جو جماعتوں کی ہلاکت کے لیے ٹھہرا دی گئی ہے، تو پھر ظہورِ نتائج میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی۔

یہاں اس اشارہ سے مقصود رؤسائے عرب کی تنبیہ اور مومنوں کی تذکیر ہے کہ انقلابِ حال کا وقت آگیا ہے، اور ضروری ہے کہ فیصلہ کُن نتائج ظہور میں آئیں۔

(۱۳) آیت (۳۵) میں فرمایا کہ اولادِ آدم کو ہدایتِ وحی کے وقتاً فوقتاً ظہور کی خبر دی گئی تھی۔ اِسی قانون کے مطابق اب پیغمبرِ اسلام کا ظہور ہوا ہے۔ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ آنے والے نتائج کر دینگے۔ کیونکہ صورتِ حال نے دو فریق پیدا کر دیے ہیں۔ ایک داعیِ قرآن ہے جو کہتا ہے، میں خدا کی طرف سے مامور ہوں۔ دوسرا فریق منکروں کا ہے جو اسے جھٹلاتا ہے۔ جو شخص خدا پر بہتان باندھے، اُس سے بڑھ کر کوئی گنہگار نہیں، اور جو سچے کو جھٹلائے اُسکی

أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيبُهُم مِّنَ الْكِتَابِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ○ (۳۷) قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ ۖ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ ○ (۳۸) وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ○ (۳۹) ع ۴

بدبختی میں بھی کلام نہیں۔ اب نتائج فیصلہ کردینگے کہ کون فریق مستحقِ عذاب ہے، اور کون مستحقِ کامیابی وارجمندی۔

نازل نہیں ہوا؟) یہی لوگ ہیں کہ (علمِ الٰہی کے) نوشتہ میں جو کچھ ان کے لیے ٹھہرادیا گیا ہے اُس کے مطابق اپنا حصہ پاتے رہیں گے لیکن بالآخر جب ہمارے فرستادہ پہنچینگے کہ اُنہیں وفات دیں، تو اُس وقت وہ کہینگے "جن ہستیوں کو تم خدا کے سوا پکارا کرتے تھے اب وہ کہاں ہیں؟" وہ جواب دینگے "وہ ہم سے کھوئی گئیں" (یعنے اُن کی ہستی و طاقت کی کوئی نمود نہیں دکھائی نہ دی) اور (اس طرح) اپنے اوپر خود گواہی دینگے کہ وہ واقعی (سچائی سے) منکر تھے! ۳۷

اِس پر حکمِ الٰہی ہوگا "انسانوں اور جنوں کی اُن اُمتوں کے ساتھ جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں، تم بھی آتشِ دوزخ میں داخل ہوجاؤ"

جب کبھی ایسا ہوگا کہ ایک اُمت دوزخ میں داخل ہو، تو وہ اپنی طرح کی دوسری اُمت پر لعنت بھیجیگی۔ پھر جب سب اکٹھی ہوجائینگی، تو پچھلی اُمت پہلی اُمت کی نسبت کہیگی "اے ہمارے پروردگار! یہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا (یعنے جن کی تقلید میں ہم گمراہ ہوئے) تو انہیں آتشِ عذاب کا دوگنا عذاب دیجیو!"

خدا فرمائیگا "تم میں سے ہر ایک کے لیے دوگنا عذاب ہے لیکن تمہیں معلوم نہیں" ۳۸

(یہ سُن کر) پہلی اُمت پچھلی اُمت سے کہیگی "دیکھو، تمہیں (عذاب کی کمی میں) ہم پر کوئی بزرگی نہ ہوئی تو جیسی کچھ کمائی کرچکے ہو، اُس کے مطابق اب عذاب کا مزہ چکھ لو!" ۳۹

(۴۲) اصحابِ دوزخ کے بعض احوال و واردات جو عالمِ آخرت میں پیش آئیں گے۔

آیت (۳۸) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب کوئی جماعت برائی میں مبتلا ہوتی ہے، تو خود بھی گمراہ ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے بھی گمراہی کی مثال قائم کردیتی ہے۔ اِسی لیے پچھلی اُمتیں اپنے سے پہلی اُمتوں پر لعنت بھیجینگی کہ ان کی تقلید و پیروی میں ہم گمراہ ہوئیں۔ فرمایا "تم میں سے ہر ایک کے لیے دوگنا عذاب ہے" یعنے ہر ایک جماعت خود بھی گمراہ ہوئی اور اپنے سے بعد آنے والوں کے لیے بھی بُری مثال قائم کی۔ پس سب اس کی مستحق ہوئیں کہ دوگنا عذاب پائیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ○ ٤٠ لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ○ ٤١ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○ ٤٢ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ ٤٣

جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور اُن کے مقابلہ میں سرکشی کی، تو (یاد رکھو) اُن کے لیے آسمان کے دروازے کبھی کھلنے والے نہیں۔ اُن کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہے جیسے سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزر جانا۔ اِسی طرح ہم مجرموں کو اُن کے جرموں کا بدلہ دیتے ہیں! (یعنے ہم نے اِسی طرح قانونِ جزا ٹھہرا دیا ہے) ٤٠

اُن کے نیچے آگ کا بچھونا ہوگا، اوپر آگ کی چادر! ہم ظلم کرنے والوں کو اُنکے ظلم کا ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں: ٤١

اور جو لوگ ایمان لائے اور اُن کے کام بھی اچھے ہوئے، اور (یاد رہے، ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم کسی جان پر اُس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے، تو بس ایسے ہی لوگ جنت والے ہیں۔ ہمیشہ جنت (کے راحت وسرور) میں رہنے والے! ٤٢

اور (دیکھو) اِن لوگوں کے دلوں میں (ایک دوسرے کی طرف سے) جو کچھ کینۂ وغبار تھا، ہم نے نکال دیا۔ اُن کے تلے (آگ کے شعلوں کی جگہ) نہریں رواں ہیں۔ اُنہوں نے (ایک دوسرے پر لعنت بھیجنے کی جگہ) کہا "ساری ستائش اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اِس (زندگی) کی راہ دکھائی۔ ہم کبھی اس کی راہ نہ پاتے اگر وہ ہماری رہنمائی نہ کرتا۔ بلاشبہ ہمارے پروردگار کے پیغمبر سچائی کا پیغام لے کر آئے تھے" اور (دیکھو) اُنہوں نے پکار سُنی "یہ ہے جنت، جو تمہارے ورثہ میں آئی۔ اُن (نیک) کاموں کی بدولت جو تم (دنیا میں) کرتے رہے ہو!" ٤٣

(ت ا) اصحابِ جنت کے بعض احوال و واردات جو آخرت میں پیش آئینگے۔

دوزخیوں کی نسبت فرمایا تھا کہ ان کی ہر جماعت دوسری جماعت پر لعنت بھیجیگی، اور ہر اُمت کی آرزو ہوگی کہ دوسری کو زیادہ عذاب ملے۔ یہاں فرمایا، اصحابِ جنت کے دل بغض و عناد کی کدورتوں سے پاک ہوتے ہیں، کیونکہ ایمان وعمل کی پاکی کے ساتھ کینۂ وعناد کی آلودگی جمع نہیں ہوسکتی!

اِس سے معلوم ہوا کہ اصحابِ دوزخ کے خصائل کا نمایاں وصف یہ ہے کہ راحت کی حالت میں ہوں یا عذاب میں اُن کے دلوں میں بغض و نفرت کے سوا اور کوئی جذبہ جگہ نہیں پاتا برخلاف اِس کے اصحابِ جنت وہ ہیں، جن کے دلوں سے کینہ وغبار یک قلم دور ہوجاتا ہے!

وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ أَصْحَٰبَ ٱلنَّارِ أَن قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدتُّم مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۖ قَالُوا۟ نَعَمْ ۚ فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ أَن لَّعْنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلظَّٰلِمِينَ ۝ ٤٤ ٱلَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُم بِٱلْءَاخِرَةِ كَٰفِرُونَ ۝ ٤٥ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى ٱلْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّۢا بِسِيمَىٰهُمْ ۚ وَنَادَوْا۟ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ أَن سَلَٰمٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ۝ ٤٦ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَٰرُهُمْ تِلْقَآءَ أَصْحَٰبِ ٱلنَّارِ قَالُوا۟ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ ٱلْقَوْمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝ ٤٧ ع ٥ / ١٢ وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُم بِسِيمَىٰهُمْ قَالُوا۟ مَآ أَغْنَىٰ عَنكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ۝

اور جنت والوں نے دوزخیوں کو پکارا "ہمارے پروردگار نے جو کچھ ہم سے وعدہ کیا تھا، ہم نے اُسے سچا پایا ہے۔ پھر کیا تم نے بھی وہ تمام باتیں ٹھیک پائیں جن کا تمہارے پروردگار نے تم سے وعدہ کیا تھا؟" دوزخی جواب میں بولے "ہاں" اس پر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا "ظالموں پر خدا کی لعنت ہو۔ اُن ظالموں پر جو خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے تھے، اور چاہتے تھے، وہ سیدھی نہ ہو۔ اس میں کجی ڈال دیں۔ اور آخرت کی زندگی سے بھی منکر تھے" ٤٤ ٤٥

اور (دیکھو) اِن دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہے؛ اور اعراف پر (یعنے بلندی پر) کچھ لوگ ہیں جو (دونوں گروہوں میں سے) ہر ایک کو اُس کے قیافہ سے پہچان لیتے ہیں۔ اِن لوگوں نے جنت والوں کو پکارا "تم پر سلامتی ہو" وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے۔ اس کے آرزومند ہیں۔ ٤٦

اور جب اِن لوگوں کی نگاہ دوزخیوں کی طرف پھری (اور اُن کی ہولناک حالت نظر آئی) تو پکار اُٹھے "اے پروردگار! ہمیں ظالم گروہ کے ساتھ شامل نہ کیجیو!" ٤٧

اور "اعراف" والوں نے اُن لوگوں کو پکارا جنہیں وہ ان کے قیافہ سے پہچان گئے تھے۔ "نہ تو تمہارے جتھے تمہارے کام آئے، نہ تمہاری بڑائیاں" ٤٨

(١٦) دو مقام ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور اُنہیں الگ الگ کر دینا ہو تو درمیان میں دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ فرمایا، جنت اور دوزخ کی تقسیم بھی ایسی ہی سمجھو۔ ایک دیوار ہے جس نے ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا ہے! ایک قدم اِدھر رہ گئے تو دوزخ ہے۔ آگے بڑھ گئے تو جنت ہے۔ چنانچہ سورۂ حدید میں ہے: "جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک دیوار ہے جس میں دروازہ ہے۔ اندر جاؤ تو رحمت ہے۔ باہر رہو تو عذاب" (٥٧: ١٣)

اِسی دیوار کو یہاں "اعراف" سے تعبیر کیا ہے۔ "اعراف" کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہوتا ہے جو زمین سے بلند ہو۔ فرمایا جنت و دوزخ کے لیے بھی ایک اعراف ہے جہاں سے دونوں طرف دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر حقیقت کے رمز شناس ہو، تو پالو گے کہ زندگی کے ہر گوشہ میں جنت و دوزخ کی تقسیم کا یہی حال ہے۔ دونوں کی سرحدیں اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ایک قدم پیچھے رہ گئے اور جنت کی جگہ دوزخ میں پڑ گئے۔ بسا اوقات ایک قدم کی تیزی

أَهٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ
تَحْزَنُونَ ○ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا ۴۹
رَزَقَكُمُ اللَّهُ ۚ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ ○ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا ۵۰
وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ○ ۵۱
وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ○ هَلْ يَنْظُرُونَ

یا کوتاہی جنت سے دوزخ میں یا دوزخ سے جنت میں پہنچا دیتی ہے:

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد!

(اُنھوں نے جنتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا) "دیکھو، کیا یہ وہی لوگ نہیں ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ خدا کی رحمت سے انہیں کچھ ملنے والا نہیں؟ (لیکن انہیں تو آج رحمتِ الٰہی پکار رہی ہے:) جنت میں داخل ہو جاؤ۔ آج تمہارے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہے نہ کسی طرح کی غمگینی!" ۴۹

اور دوزخیوں نے جنت والوں کو پکارا: "تھوڑا سا پانی ہم پر بہا دو (کہ گرمی کی شدت سے پھنکے جاتے ہیں) یا اس میں سے کچھ دیدو جو خدا نے تمہیں بخشا ہے" جنت والوں نے جواب دیا "خدا نے یہ دونوں چیزیں (آج) منکروں پر روک دی ہیں۔ ۵۰ (کیونکہ وہ فرماتا ہے) جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا تھا (یعنے اعمالِ حق کی جگہ ایسے کاموں میں لگے رہے جو کھیل تماشے کی طرح حقیقت سے خالی تھے) اور دنیا کی زندگی نے اُنہیں دھوکے میں ڈالے رکھا، تو جس طرح اُنھوں نے اِس دن کا آنا بھلا دیا تھا، آج وہ بھی بھلا دیے جائینگے، نیز اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں سے جان بوجھ کر انکار کرتے تھے!" ۵۱

(۱۶) اب منکرینِ قرآن کی طرف سلسلۂ بیان متوجہ ہوا ہے۔ فرمایا، آدم کی اولاد کو ہدایتِ وحی کے وقتاً فوقتاً ظہور کی جو خبر دی گئی تھی، اُسی کے مطابق قرآن کی دعوت نمودار ہوئی ہے، اور اُس نے علم و بصیرت کی راہ واضح کر دی ہے۔ پھر اگر منکرینِ حق سرکشی و فساد سے باز نہیں آتے، تو اُنہیں کس بات کا انتظار ہے؟ کیا اس بات کا کہ انکار و بدعملی کے جن نتائج کی خبر دی گئی ہے، اُن کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں؟ لیکن جس دن اُن کا ظہو

اور (دیکھو) ہم نے تو اِن لوگوں کے لیے ایک ایسی کتاب بھی نازل کر دی جس میں علم کے ساتھ (دینِ حق کی تمام باتیں) الگ الگ کر کے واضح کر دی ہیں، اور جو ایمان رکھنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ ۵۲

(پھر) کیا یہ لوگ اس بات کے انتظار میں ہیں کہ (فساد و بدعملی کے) جس نتیجہ کی اس میں خبر

إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٥٣﴾ إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُ

۵۳ ع

ہوگا، اُس دن اس کی مہلت ہی کب باقی رہیگی کہ کوئی ایمان لائے؟ وہ تو اعمالِ انسانی کے آخری فیصلہ کا دن ہوگا!

دی گئی ہے) اُس کا مطلب وقوع میں آجائے؟ (اگر اسی بات کا انتظار ہے، تو جان رکھیں) جس دن اس کا مطلب وقوع میں آئیگا، اُس دن وہ لوگ کہ اُسے پہلے سے بھولے بیٹھے تھے (نامرادی و حسرت کے ساتھ) بول اُٹھیں گے "بلا شبہ ہمارے پروردگار کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کا پیام لے کر آئے تھے! (مگر افسوس کہ ہم نے اُنھیں جھٹلایا) کاش شفاعت کرنے والوں میں سے کوئی ہو جو آج ہماری شفاعت کرے! یا کاش ایسا ہی ہو کہ ہم پھر دنیا میں لوٹا دیے جائیں، اور جیسے کچھ کام کرتے رہے ہیں اُس کے برخلاف (نیک) کام انجام دیں!"

بلا شبہ اِن لوگوں نے اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہی میں ڈالا، اور دنیا میں جو کچھ افترا پردازیاں کیا کرتے تھے، وہ سب (آج) اُن سے کھوئی گئیں!

۵۴

(۱۷) توحیدِ الوہیت[1] کی تلقین، اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ "خلق" اور "امر" دونوں اللہ ہی کی ذات سے ہیں یعنے وہی کائناتِ ہستی کا پیدا کرنے والا ہے، اور اُسی کے حکم و قدرت سے اُس کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ تدبیر و انتظام کی دوسری قوتیں بھی موجود ہوں، جیسا کہ مشرکین کا خیال تھا۔

"تخت پر متمکن ہوگیا" یعنے خدا کی بادشاہت کائناتِ ہستی میں نافذ ہوگئی۔ کیونکہ وہی خالق ہے، اور وہی مدبّر بھی ہے۔ تمام عالمِ ہستی اُسی کے تختِ جلال کے آگے جھکی ہوئی ہے چنانچہ ایک دوسری جگہ فرمایا "ثم استوی علی العرش یدبّر الامر"

تمہارا پروردگار تو وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ "ایّام" میں (یعنے چھ دوروں میں جو یکے بعد دیگرے واقع ہوئے) پیدا کیا، اور پھر (اپنی حکومت و جلال کے) تخت پر متمکن ہوگیا۔ (اُس نے رات اور دن کی تبدیلی کا ایسا نظام ٹھہرا دیا ہے کہ) رات کی اندھیری دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہے، اور (ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا) دن کے پیچھے لپکی چلی آرہی ہو۔ اور (دیکھو) سورج، چاند،

[1] توحیدِ الوہیت" یعنے خدا کے سوا کوئی ہستی اس کی مستحق نہیں کہ معبود بنائی جائے۔ "توحیدِ ربوبیت" یعنے کائنات کی پیدا کرنے والی اور پرورش کرنے والی ہستی صرف خدا ہی کی ہستی ہے۔ قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ توحیدِ ربوبیت سے توحیدِ الوہیت پر استدلال کرتا ہے۔ یعنے جب خالق و رب اس کے سوا کوئی نہیں تو معبود بھی اس کے سوا اور کسی کو نہیں بنانا چاہیے۔

٦٣ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

٦٤ بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۞ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ

٦٥ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا

٦٦-٦٧ لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

٦٨ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ○

٦٣ انبیاء کرام کا اعلان یہ ہے کہ اُن کے پاس ایک ذریعہ موجود ہے اور وہ "وحی" ہے چونکہ انسان کے پاس ہدایت وحی کے خلاف کوئی یقینی روشنی موجود نہیں، اور چونکہ بغیر اس علم کو قبول کیے کارخانۂ حیات کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اور چونکہ وہ وجدانی طور پر اس کی طلب بھی رکھتا ہے، اس لیے اُس کا فرض ہے کہ اس اعلان کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ اگر نہیں کریگا تو وہ یقین وطمانیت کی جگہ شک وظن کی زندگی کو ترجیح دیگا۔

سے) خبردار کر دے اور تم بُرائیوں سے بچو، اور رحمتِ الٰہی کے سزاوار ہو؟"

٦٤ بایں ہمہ لوگوں نے نوحؑ کو جھُٹلایا پس ہم نے اُسے اور اُن سب کو جو اُس کے ساتھ کشتی میں تھے (سیلاب سے) نجات دی، اور جنہوں نے ہماری نشانیاں جھُٹلائی تھیں، اُنہیں غرق کر دیا حقیقت یہ ہے کہ وہ (اپنی سمجھ بوجھ کھو کر) یک قلم اندھے ہوگئے تھے!

(٣٠) قومِ نوحؑ کے بعد عرب میں قومِ عادؑ کو عروج ہوا۔ اِن کی آبادیاں عمان سے لے کر حضر موت اور یمن تک پھیل گئی تھیں۔ حضرت ہودؑ کا اُنہی میں ظہور ہوا تھا۔

٦٥ حضرت ہودؑ کا وعظ، اور قوم کا آباؤ اجداد کی تقلید کی بناء پر انکار۔

قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ آبا و اجداد کی اندھی تقلید اور گڑھی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتداء میں جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گڑھ لیا جاتا ہے۔ پھر ایک مدت تک لوگ اسے مانتے رہتے ہیں۔ پھر

٦٦ جب ایک عرصہ کے اعتقاد سے اُس میں شانِ تقدیس پیدا ہو جاتی ہے، تو اُسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں، اور عقل و بصیرت کی کوئی دلیل بھی اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو "اسماء سمیتموھا انتم و اٰباؤکم" سے جا بجا

٦٧ تعبیر کرتا ہے، کیونکہ بنائے ہوئے ناموں اور لفظوں کے سوا

٦٨ وہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کر سکتے۔ افسوس مسلمانوں

اور (اسی طرح) ہم نے قومِ عاد کی طرف اُس کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اُس نے کہا "اے قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم (انکار و بدعملی کے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟"

اِس پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا "ہمیں تو ایسا دِکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو، اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو"۔

ہودؑ نے کہا بھائیو! میں احمق نہیں ہوں۔ میں تو اُس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے فرستادہ ہوں۔ میں اُس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں، اور یقین کرو کہ تمہیں دیانتداری کے ساتھ نصیحت کرنے والا

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۚ وَاذْكُرُوْٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ ۶۹ قَالُوْٓا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞ ۷۰ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ۖ أَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ أَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ أَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۚ فَانْتَظِرُوْٓا إِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۞ ۷۱ فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞ ۷۲ وَإِلٰى ثَمُوْدَ أَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ

میں بھی بہت سے ایسے "اسمار" پیدا ہو گئے ہیں جنہیں وہ حجت و دلیل سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ خدا نے ان کے لیے کوئی دلیل نہیں اُتاری۔

ہوں۔ کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ تمہارے پروردگار کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تم ہی میں سے ہے؟ خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قوم نوح کے بعد تمہیں اُس کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی۔ پس چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تاکہ ہر طرح کامیاب ہو۔" ۶۹

اُنہوں نے کہا "کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک ہی خُدا کے پُجاری ہو جائیں، اور اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں؟ اگر تم سچے ہو تو وہ بات لا دکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو؟" ۷۰

ہود نے کہا "یقین کرو، تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب واقع ہو گیا ہے (کہ عقلیں ماری گئی ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہی کے حوالے کر رہے ہو) کیا ہے جس کی بنا پر تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو؟ محض چند نام، جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے اپنے جی سے گڑھ لیے ہیں، اور جن کے لیے خدا نے کوئی سند نہیں اُتاری۔ اچھا، (آنے والے وقت کا) انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا۔" ۷۱

پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہود کو اور اُس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا، اور جنہوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں، اُن کی بیخ و بنیاد تک اُکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے۔ ۷۲

(د) قوم ثمود عرب کے اُس حصے میں آباد تھی جو حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک چلا گیا ہے۔ اسی مقام کو

اور (اسی طرح) ہم نے قوم ثمود کی طرف اُس کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ۷۳ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ ۷۴ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ

اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آچکی ہے۔ یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک (فیصلہ کُن) نشانی ہے پس اسے کُھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے، چرے۔ اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ (اس کی پاداش میں) عذاب جانکاہ تمہیں آپکڑے" ۷۳

"اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قومِ عاد کے بعد اُس کا جانشین بنایا، اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو (یہ اُس کا تم پر احسان ہے) پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو، اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے، خرابی نہ پھیلاؤ"، ۷۴

قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو (اپنی دولت و طاقت کا) گھمنڈ تھا، اُنھوں نے مومنوں سے کہا، اور یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہیں (افلاس و بے چارگی کی وجہ سے) کمزور و حقیر سمجھتے تھے:

"کیا تم نے سچ مچ کو معلوم کر لیا ہے کہ صالحؑ خدا کا بھیجا ہوا ہے؟" (یعنے ہمیں تو ایسی کوئی بات اُس میں دکھائی دیتی نہیں) اُنھوں نے کہا "ہاں، بیشک، جس پیامِ حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے، ہم اُس پر

دوسری جگہ "الحجر" سے بھی تعبیر کیا ہے۔

پالتو جانوروں کو خدا کے نام پر چھوڑ دینے کا طریقہ بہت قدیم ہے۔ بابل اور ہندوستان میں اس کا سُراغ ہزاروں برس پیشتر تک ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کے لوگ بھی اپنے بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ حضرت صالح نے خدا کے نام پر ایک اونٹنی چھوڑ دی، اور اسی معاملہ میں قوم کے لیے اتباعِ حق کی آزمائش ہوگئی۔ اگر وہ اونٹنی کو ضرر نہ پہنچاتے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ اُن کے دل ہدایت کے آگے جُھک گئے ہیں، مگر اُن کے اندر خدا پرستی کے خلاف ایسی ضد اور شرارت پیدا ہوگئی تھی کہ اتنی سی بات بھی نہ مان سکے، اور اونٹنی کو زخمی کر کے ہلاک کر ڈالا۔

"ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ" اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ قتل و غارت، لوٹ مار، شر و فساد میں چھوٹ ہو گئے تھے اور امن و عدالت کا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔

(۵) جو حقیر و ذلیل سمجھے جاتے تھے، اُنھوں نے سچائی قبول کی، اور جنہیں اپنی دنیاوی بڑائیوں کا گھمنڈ تھا، اُنھوں نے انکار کیا۔ دعوتِ حق کا جب کبھی ظہور ہوا ہے، تو ہمیشہ ایسی ہی صورتِ حال پیش آئی ہے۔ قبولیتِ حق کی

مُؤْمِنُوْنَ ○ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا (۷۵-۷۶)
عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (۷۷)
فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ○ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ (۷۸)
لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ○ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ (۷۹)
بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ (۸۰)
قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ○ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ (۸۱)

---

(۷۵) پورا یقین رکھتے ہیں" اِس پر گھمنڈ کرنے والوں نے کہا "تمہیں جس بات کا یقین ہے، ہمیں اس سے انکار ہے"۔

(۷۶) غرضکہ اُنہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا، اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ اُنہوں نے کہا "اے صالح! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا"۔

(۷۷) پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے اُنہیں آلیا، اور جب اُن پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے مُنہ پڑے تھے!

(۷۸) پھر صالح اُن سے کنارہ کش ہو گیا۔ اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی، مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے"

(۷۹) اور لوط کا واقعہ یاد کرو، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا تھا "کیا تم ایسی بے حیائی کا کام کرنا پسند کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی انسان نے نہیں کیا؟ (۸۰) تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر مائل ہوتے ہو۔ یقیناً تم ایک ایسی قوم ہو گئے ہو جو (اپنی نفس پرستیوں میں) بالکل چھوٹ ہو"

(۸۱) لوط کی قوم کے پاس اگر اس کا کچھ جواب تھا تو

راہ میں ایک بڑا مانع، دنیوی خوشحالیوں کا گھمنڈ اور انہماک ہے۔

(و) حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بھتیجے تھے، اور بحرِ میت کے کنارے سدوم میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہ معاملہ وہیں پیش آیا۔

توراۃ میں ہے کہ سدوم اور عمورہ پر آگ اور گندھک کی بارش ہوئی تھی۔ قرآن میں ہے کہ پتھر برسے تھے۔ دونوں بیانوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی حالت پیش آئی ہوگی جیسی آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے سے واقع ہوتی ہے۔

۸۲ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ○ فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ
۸۳ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ○ ۸۴ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ○
وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُمْ
بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا
۸۵ فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ

ع ۱۰ ۱۵

۶۶

یہ تھا کہ آپس میں کہنے لگے "اس آدمی کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو بڑے
۸۲ پاک صاف بننا چاہتے ہیں"۔

پس ایسا ہوا کہ لوطؑ کو اور اُس کے گھر والوں کو تو ہم نے بچا لیا، مگر اُس کی بیوی نہ بچی کہ
۸۳ وہ بھی پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔

۸۴ ہم نے اُن پر (پتھروں کا) مینہ برسا دیا تھا۔ سو دیکھو، مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟

اور (اسی طرح)، مدین کی بستی میں شعیب بھیجا گیا کہ اُنہی کے بھائی بندوں میں سے تھا۔ اُس نے کہا "بھائیو! اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ دیکھو، تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل تمہارے سامنے آ چکی۔ پس چاہیے کہ ماپ تول پورا پورا کیا کرو۔ لوگوں کو (خرید و فروخت میں) اُن کی چیزیں کم نہ دو۔ ملک کی درستگی کے بعد (کہ دعوتِ حق کے قیام سے ظہور میں آ رہی ہے) اُس میں خرابی نہ ڈالو۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو، اسی میں تمہارے
۸۵ لیے بہتری ہے"

"اور دیکھو، ایسا نہ کرو کہ (دعوتِ حق کی اشاعت روکنے کے لیے) ہر راستے جا بیٹھو، اور جو آدمی بھی ایمان لائے، اُسے دھمکیاں دے کر خدا کی راہ

(ز) "مدین" کسی بستی کا نام نہیں۔ ایک قبیلہ کا نام تھا جو جزیرہ نمائے سینا میں عرب سے متصل آباد تھا۔ اسی میں حضرت شعیبؑ کا ظہور ہوا۔

(ح) قرآن نے حضرت شعیبؑ کی کوئی ایسی نشانی بیان نہیں کی جیسی دوسرے پیغمبروں کی بیان کی ہے، اور جو متکلمین کی اصطلاح میں "معجزہ" کے لفظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ تاہم قرآن حضرت شعیب کی زبانی نقل کرتا ہے کہ "واضح دلیل آ چکی"۔ یہ "دلیلِ واضح" کیا تھی؟ حضرت شعیب کی تعلیم تھی جو راست بازی و عدالت کی راہ دکھاتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک انبیاء کی تعلیم بجائے خود دلیل، بیّنہ، اور حجت ہے۔ اور ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی دوسری نشانی اور مصطلحہ معجزہ بھی ہو۔

(ط) ماپ تول کی درستگی، اور یہ اصل کہ خرید و فروخت میں جو جس کا حق ہو اُسے پورا ملنا چاہیے، انسانی معیشت کی وہ بنیادی صداقت ہے جس کی ہمیشہ نبیوں نے تلقین کی۔

(ی) حضرت شعیب نے کہا، کم از کم صبر کرو اور نتیجہ دیکھ لو۔ لیکن منکر اس کے لیے بھی طیار نہ ہوئے۔

تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۞ وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۞ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۚ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۞ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۚ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

۸۶ ۸۷ ۸۸

سے روکو، اور اُس میں کجی ڈالنے کے درپے ہو۔ خدا کا احسان یاد کرو کہ تم بہت تھوڑے تھے اُس نے (امن و عافیت دے کر) تمہاری تعداد زیادہ کر دی۔ اور پھر غور کرو جن لوگوں نے فساد کا شیوہ اختیار کیا تھا، اُنہیں کیسا کچھ انجام پیش آچکا ہے؟" ۸۶

"اور اگر ایسا ہوا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ اُس تعلیم پر ایمان لے آیا ہے جس کی تبلیغ کے لیے میں بھیجا گیا ہوں، اور دوسرا گروہ ہے جسے اُس پر یقین نہیں، تو (صرف اتنی ہی بات دیکھ کر فیصلہ نہ کرلو) صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے، اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!" ۸۷

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں (اپنی دنیوی طاقتوں کا) گھمنڈ تھا، کہا "اے شعیب! (دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہیگی:) یا تو تجھے اور اُن سب کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، ہم اپنے شہر سے ضرور نکال باہر کرینگے، یا تمہیں مجبور کر دینگے کہ ہمارے دین میں لوٹ آؤ" شعیب نے کہا "اگر ہمارا دل تمہارے دین پر مطمئن نہ ہو تو کیا جبراً مان لیں؟" ۸۸

"اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں، حالانکہ خدا نے (علم و یقین کی روشنی نمایاں کر کے) ہمیں اُس سے نجات دیدی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بولتے ہوئے خدا پر بہتان باندھا۔ ہمارے لیے ممکن نہیں کہ اب قدم پیچھے ہٹائیں۔ ہاں اللہ کا جو ہمارا پروردگار ہے ایسا ہی

(ك) آیت (۸۷) میں فرمایا "وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے" اور دوسری جگہ خدا کے اس فیصلہ کو "قضاء بالحق" اور "سب سے بڑی شہادت" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یہ فیصلہ کیا ہے؟ قانونِ الٰہی کا وہ اعلان، جو حق کو کامیاب کر کے اور باطل کو ناکام رکھ کر اپنا فیصلہ صادر کر دیتا ہے!

(ل) آیت (۸۸) نے واضح کر دیا کہ قرآن کے نزدیک مذہبی اعتقاد کا معاملہ دل کے یقین و طمانیت کا معاملہ ہے، اور جبراً کسی کو اس کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ نیز یہ کہ ہمیشہ داعیانِ حق اور منکرینِ حق میں بنائے نزاع یہی بات رہی ہے کہ وہ کہتے تھے، ہمارا دل جس راہ کو حق سمجھتا ہے، اُسی پر چلیں گے، یہ کہتے تھے، نہیں، ہم تمہیں جبراً اپنی راہ پر چلا کر چھوڑینگے۔

رَبُّنَا ۚ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ

۸۹-۹۰ / ۹۱ / ۹۲

چاہتا ہو (تو وہ جو چاہیگا ہو کر رہیگا) کوئی چیز نہیں جس پر وہ اپنے علم سے چھایا ہوا نہ ہو۔ ہمارا تمام تر بھروسہ اُسی پر ہے۔ اے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے، اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!" ۸۹

۹۰ قوم کے سرداروں نے جو شعیب کے منکر تھے (لوگوں سے) کہا "اگر تم نے شعیب کی پیروی کی، تو بس سمجھ لو، تم برباد ہوئے!"

۹۱ پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا، اور جب اُن پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے مُنہ پڑے تھے!

۹۲ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا، (اُن کا کیا حال ہوا؟) گویا اِن بستیوں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا، وہی برباد ہونے والے تھے!

بہرحال شعیب اِن سے کنارہ کش ہو گیا۔ اُس نے کہا "بھائیو! میں نے پروردگار کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے تھے اور تمہاری بہتری چاہی تھی، (مگر جب تم نے جان بوجھ کر ہلاکت کی راہ پسند کی) تو میں نہ ماننے والوں (کی تباہی) پر اب کیسے

(۲۰) تمام پیغمبروں کے حالات پر غور کرو:

(ا) سب اُسی قوم میں پیدا ہوئے جس کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ ایسا نہیں ہوا کہ باہر سے کوئی اجنبی آگیا ہو جس کی زندگی سے لوگ بے خبر ہوں۔

(ب) کوئی بھی بادشاہ یا امیر نہ تھا۔ نہ کسی طرح کا دنیوی سرو سامان رکھتا تھا۔ سب کا ظہور اسی طرح ہوا کہ تنِ تنہا اعلانِ حق کے لیے کھڑے ہو گئے اور صرف خدا کی معیت و نصرت پر اعتماد کیا۔

(ج) سب کا پیام ایک ہی تھا: خدا کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں!

(د) سب نے نیک عملی کی تلقین کی۔ انکار و بدعملی کے نتائج سے متنبہ کیا۔

(ہ) سب کے ساتھ یہی ہوا کہ رئیسوں نے سرکشی کی۔ بے نواؤں نے ساتھ دیا۔

(و) مخالفت بھی ہمیشہ ایک ہی طرح ہوئی یعنی اعلانِ رسالت کی ہنسی اُڑائی گئی۔ ان کی باتوں کو حماقت سے تعبیر کیا گیا۔ انہیں اور اُن کے ساتھیوں کو اذیت پہنچانے کے تمام وسائل کام میں لائے۔ اُن کی دعوت کی اشاعت روکنے کے لیے اپنی ساری قوتیں خرچ کر ڈالیں۔

(ز) پیغمبروں نے ہمیشہ کہا: اگر میری دعوت قبول نہیں

كَذّٰبِيْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ۝ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝

٩٣ ٩٤ ٩٥ ٩٦ ٩٧

کرتے تو کم از کم میری موجودگی برداشت کرلو، اور فیصلہ نتائج پر چھوڑ دو، لیکن منکر اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے۔

(ح) ہمیشہ یہی ہوا کہ داعیٔ حق اور ان کے ساتھی وعظ و پند کے ذریعہ تبلیغ کرتے یعنے دل و دماغ کو اپیل کرتے، لیکن منکر جبر و تشدد سے اُن کی راہ روکنی چاہتے، پیغمبروں کی پکار یہ ہوتی تھی کہ روشن دلیلوں پر غور کرو۔ منکروں کا جواب یہ ہوتا تھا کہ انہیں بستی سے نکال باہر کرو، یا سنگسار کر دو!

(ط) پھر دیکھو نتیجہ بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کا پیش آیا۔ وہ تمام جماعتیں جنہوں نے دعوتِ حق کا مقابلہ کیا تھا، ہلاک و نابود ہوگئیں، اور دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں قانونِ الٰہی کی پکڑ سے نہ بچا سکی؛

یہی نتیجہ ہے جس پر خصوصیت کے ساتھ یہاں توجہ دلائی ہے۔ اور قرآن دعوتِ حق کے ظہور و احوال کی یکسانیت سے بے شمار مقاصد و نتائج پر استدلال کرتا ہے۔ چنانچہ آیت (٩٤) میں فرمایا کہ ہمیشہ سنتِ الٰہی ایسی ہی رہی ہے، اور پھر آیت (١٠١) اور اس کے بعد کی آیات میں واضح کر دیا ہے کہ گذشتہ دعوتوں کے ذکر سے مقصود اسی حقیقت کی تلقین ہے۔

٩٣ افسوس کروں؟"

اور ہم نے جب کبھی کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا، تو ہمیشہ ایسا کیا کہ اس کے باشندوں کو سختیوں اور نقصانوں میں مبتلا کر دیا تاکہ (سرکشی سے باز آئیں اور) عاجزی و نیازمندی کریں۔ ٩٤ پھر ہم نے مصیبت راحت سے بدل دی، پھر جب ایسا ہوا کہ وہ (خوش حالیوں میں) خوب بڑھ گئے، اور (پاداشِ عمل سے بے پروا ہوکر) کہنے لگے "ہمارے بزرگوں پر سختی کے دن بھی گزرے، راحت کے بھی" (یعنے دنیا میں اچھی بُری حالتیں پیش آتی ہی رہتی ہیں۔ جزائے عمل کوئی چیز نہیں) تو اچانک ہمارے عذاب کی پکڑ میں آگئے اور وہ بالکل بے خبر تھے!

٩٥ اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے (جن کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں) ایمان لاتے اور بُرائیوں سے بچتے، تو ہم آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے ضرور اُن پر کھول دیتے لیکن اُنہوں نے جھٹلایا، پس اُس کمائی کی وجہ سے جو اُنہوں نے (اپنے اعمال کے ذریعہ) حاصل کی تھی، ہم نے اُنہیں پکڑ لیا (اور وہ مبتلائے عذاب ہوئے)

(٢١) منکر و سرکش جماعتوں کی ہلاکت کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں، وہ سب اس نوعیت کے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے قدرتی حوادث کا ظہور تھا۔ مثلاً زلزلہ، طوفان، سیلاب، آتش فشانی

٩٦ کیا شہروں کے بسنے والوں کو اس بات سے امان مل گئی ہے کہ ہمارا عذاب راتوں رات آنازل ہو اور وہ پڑے سوتے ہوں؟

٩٧

۹۸ أَوَ أَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ

۹۹ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ أَهْلِهَا أَن لَّوْ

۱۰۰ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ

مِنْ أَنبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِن قَبْلُ ۚ

۱۰۱ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿﴾

پھر انہیں مقررہ عذاب کیوں کہا گیا؟

اس لیے، کہ گو اُن کا ظہور قدرت کی عادی و جاری صورتوں ہی میں ہوا تھا لیکن اس لیے ہوا تھا کہ انکار و سرکشی کے نتائج لوگوں کے سامنے آجائیں، اور پیغمبروں نے اُن کے ظہور کی پہلے سے خبر دیدی تھی۔

ضروری نہیں کہ ہر زلزلہ کسی گروہ کے لیے عذاب ہو، لیکن ہر وہ زلزلہ عذاب تھا جس کی کسی پیغمبر نے اتمامِ حجت کے بعد خبر دیدی تھی، اور جسے مشیتِ الٰہی نے اس معاملہ سے وابستہ کر دیا تھا۔ خدا نے فطرت کے تمام مظاہر کے لیے ایک خاص بھیس مقرر کر دیا ہے۔ وہ جب کبھی آئیگی تو اُسی بھیس میں آئیگی۔ اُس کا بھیس بدل نہیں سکتا، لیکن اُس کے ظہور کے مقاصد ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے، اور حقیقتِ حال انسانی علم کے دسترس سے باہر ہے۔

(۲۲) آیت (۹۹) کا مطلب تم سمجھے؟ عربی میں "مکر" کے معنی مخفی داؤ اور تدبیر کے ہیں۔ غور کرو، فطرت کے داؤ کیسے مخفی اور ناگہانی ہوا کرتے ہیں؟ زلزلہ کے اسباب شب و روز نشو و نما پاتے رہتے ہیں۔ سیلاب ایک لمحہ کی برف باری ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا برسوں تک کھولتا رہتا ہے، تب کہیں جا کر پھٹنے کے قابل ہوتا ہے۔ فطرت چپکے چپکے یہ سب کام کرتی رہتی ہے، لیکن ہم ہیں کہ اس کی گود میں کھیلتے کودتے رہتے ہیں، ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا گمان نہیں ہوتا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ یہاں تک کہ اچانک اُس کا داؤ نمودار ہو جاتا ہے، اور ہم یک قلم غفلت و سرمستی میں سرشار ہوتے ہیں! فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون!

یا اُنہیں اس بات سے امان مل گئی ہے کہ دن دہاڑے عذاب نازل ہو جائے اور وہ (بے خبر) کھیل کود میں مشغول ہوں؟

کیا اُنہیں خدا کی مخفی تدبیروں سے امان مل گئی ہے؟ (اور وہ سمجھتے ہیں، اُن کے خلاف کچھ ہونے والا نہیں؟) تو یاد رکھو، خدا کی مخفی تدبیروں سے بے خوف نہیں ہو سکتے، مگر وہی، جو تباہ ہونے والے ہیں!

پھر جو لوگ (پہلی جماعتوں کے بعد) ملک کے وارث ہوتے ہیں، کیا وہ یہ بات نہیں پاتے کہ اگر ہم چاہیں تو (پہلوں کی طرح) اُنہیں بھی گناہوں کی وجہ سے مصیبتوں میں مبتلا کر دیں، اور اُن کے دلوں پر مُہر لگا دیں کہ کوئی بات سنیں ہی نہیں؟

(اے پیغمبر!) یہ ہیں (دنیا کی پرانی) آبادیاں، جن کے حالات ہم تمہیں سناتے ہیں۔ ان سب میں اُن کے پیغمبر (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آئے، مگر اُن کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے، اُسے (سچائی کی نشانیاں دیکھ کر) مان لیں۔ سو دیکھو، اس طرح خدا اُن لوگوں کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے جو (ہٹ دھرمی سے) انکار کرتے ہیں!

وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِم مِّنْ عَهْدٍ ۖ وَإِن وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَا مِن بَعْدِهِم ۱۰۲
مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝ ۱۰۳
وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ ۱۰۴
إِلَّا الْحَقَّ ۚ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ قَالَ إِن كُنتَ جِئْتَ ۱۰۵
بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ۝ وَ ۱۰۶-۱۰۷
نَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ

اور اِن میں سے اکثروں کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے (یعنے اُنہوں نے اپنا فطری شعور و وجدان کہ فطرتِ انسانی کا عہد ہے ضائع کر دیا تھا) اور اکثروں کو ایسا ہی پایا کہ یک قلم نافرمان تھے! ۱۰۲

پھر ان پیغمبروں کے بعد ہم نے موسیٰ کو فرعون اور اُس کے درباریوں کی طرف، اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا، لیکن اُنہوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ناانصافی کی، تو دیکھو، مفسدوں کا کیسا انجام ہوا؟ ۱۰۳

موسیٰ نے کہا "اے فرعون! میں اُس کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ۱۰۴

میرا فرضِ منصبی ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات نہ کہوں مگر یہ کہ سچ ہو۔ میں تیرے پروردگار کی طرف سے (سچائی کی) روشن دلیلیں لایا ہوں۔ سو بنی اسرائیل کو (آئندہ اپنی غلامی پر مجبور نہ کر، اور) میرے ساتھ رخصت کر دے" ۱۰۵

فرعون نے کہا "اگر تو واقعی کوئی نشانی لیکر آیا ہی اور اپنے دعوے میں سچا ہی، تو پیش کر" ۱۰۶

اس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی، تو اچانک ایسا ہوا کہ ایک نمایاں اژدہا اُن کے سامنے تھا! اور اپنا ہاتھ (جیب سے باہر) نکالا تو اچانک ۱۰۷

(۲۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا تذکرہ اور اس حقیقت کی تلقین کہ جس طرح پیغمبروں کی "تنذیر" ہمیشہ وقوع میں آئی، اُسی طرح "تبشیر" نے بھی اپنی برکتیں دکھلائیں۔ نیز بنی اسرائیل کے ایام و وقائع، جن میں مخاطبین قرآن کے لیے مواعظ و عبر تھے؛

(ا) حضرت موسیٰ کا فرعون سے مطالبہ کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے رہا کر دے اور مصر سے نکل جانے دے۔ بنی اسرائیل حضرت یوسف کے زمانے میں مصر گئے تھے اور عزت کے ساتھ بسائے گئے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ مصریوں نے اُنہیں اپنا غلام بنا لیا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کا ظہور ہوا۔

(ب) جب ایک اُفتادہ جماعت اُٹھتی ہے اور اپنی حالت سنوانا چاہتی ہے تو مستبد قوتیں اسے بغاوت سے تعبیر کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکل جانے دیا جائے۔ لیکن امرائے مصر نے کہا: "یہ چاہتا ہے تم مصریوں کو تمہارے ملک سے نکال باہر کرے" اور سورۂ یونس میں ہے کہ اُنہوں نے موسیٰ سے کہا، تم چاہتے ہو ملک کی سرداری تمہیں مل جائے (۷۸)

(ج) ارکان حکومت کا مشورہ اور حضرت موسیٰ کے مقابلے کے لیے جادوگروں کی طلبی۔ سورۂ طٰہٰ میں مزید تفصیل ہے، (دیکھو آیت ۵۸)

بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۞ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۞ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۞ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۞ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۞ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْۤا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۞ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۞ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِىَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۞ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۞

ایسا ہوا کہ دیکھنے والوں کے لیے سفید چمکیلا تھا!

فرعون کی قوم کے سردار (آپس میں) کہنے لگے "بلاشبہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے۔ یہ چاہتا ہے، (اپنی ان طاقتوں سے کام لیکر) تمہیں ملک سے نکال باہر کرے (اور خود مالک بن بیٹھے) اب بتلاؤ، تمہاری صلاح اس بارے میں کیا ہے؟"

(چنانچہ) اُنہوں نے (باہم مشورہ کے بعد فرعون سے) کہا "موسیٰ اور اُس کے بھائی کو ڈھیل دے کر روک لے، اور (اس اثناء میں) نقیب روانہ کردے کہ (مملکت کے) تمام شہروں سے جادوگر اکٹھا کرکے تیرے حضور لے آئیں"

چنانچہ جادوگر فرعون کے حضور آئے۔ اُنہوں نے کہا "اگر ہم موسیٰ پر غالب آئے تو ہمیں اس خدمت کے صلے میں انعام ملنا چاہیے"

فرعون نے کہا "ضرور ملیگا، اور تم سب میرے مقربوں کی صف میں داخل ہوجاؤ گے"

(پھر جب مقابلہ ہوا، تو) جادوگروں نے کہا "اے موسیٰ! یا تو تم پہلے (اپنی لاٹھی) پھینکو، یا پھر ہم ہی کو پھینکنا ہے"

موسیٰ نے کہا "تم ہی پہلے پھینکو" پھر جب جادوگروں نے (جادو کی بنائی ہوئی لاٹھیاں اور رسیاں) پھینکیں، تو ایسا کیا کہ لوگوں کی نگاہیں جادو سے ماردیں، اور ان میں (اپنے کرتبوں سے) دہشت پھیلادی، اور بہت بڑا جادو بنا لائے۔

(د) مصر کے جادوگروں کا اجتماع اور حضرت موسیٰ سے مقابلہ۔

جادوگروں کی نسبت فرمایا "لوگوں کی نگاہیں جادو سے ماردی تھیں" یعنے جادو کے شعبدوں کی کوئی حقیقت نہیں محض نگاہ کا دھوکا تھا۔ چنانچہ دوسری جگہ اُسے تخیل کی تاثیر سے بھی تعبیر کیا ہے (۲۰: ۶۶) نیز آیت (۱۱۷) میں فرمایا "مایأفکون" یعنے اُن کی نمایش جھوٹی تھی۔

جادو کا اعتقاد دنیا کی قدیم اور عالمگیر گمراہیوں میں سے ہے، اور نوع انسانی کے لیے بڑی مصیبتوں کا باعث ہوچکا ہے۔ قرآن نے آج سے تیرہ سو برس پہلے اس کے بے اصل ہونے کا اعلان کیا، لیکن افسوس ہے کہ دنیا متنبہ نہ ہوئی، اور ازمنۂ وسطیٰ کے مسیحی جہل و قساوت نے ہزاروں بے گناہ انسانوں کو زندہ جلادیا!

اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۞ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا ۱۱۷
يَعْمَلُوْنَ ۞ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۞ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۞ قَالُوْٓا ۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰
اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۞ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ ۱۲۱-۱۲۲
لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۞ لَاُقَطِّعَنَّ ۱۲۳
اَيْدِيَكُمْ وَ

اور (اُس وقت) ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ تم بھی اپنی لاٹھی (میدان میں) ڈال دو۔ جونہی اُس نے لاٹھی پھینکی، تو اچانک کیا ہوا کہ جو کچھ جھوٹی نمایش جادوگروں کی تھی، سب (آناً فاناً) اُس نے نگل کر نابود کر دی! ۱۱۷

غرضکہ سچائی ثابت ہو گئی، اور جو کچھ جادوگروں نے کرتب کیے تھے، سب ملیامیٹ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرعون اور اُس کے درباریوں کو اس مقابلہ میں مغلوب ہونا پڑا اور (فتح مند ہونے کی جگہ) اُلٹے ذلیل ہوئے! ۱۱۸ ۱۱۹

اور پھر ایسا ہوا کہ (موسیٰ کی سچائی دیکھ کر) جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ اُنہوں نے کہا "ہم اُس پر ایمان لائے جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔ جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے!" ۱۲۰ ۱۲۱-۱۲۲

فرعون نے (غضب ناک ہو کر) کہا "مجھ سے اجازت لیے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ ایک پوشیدہ تدبیر ہے جو تم نے (مل جل کر) شہر میں کی ہے، تاکہ اُس کے باشندوں کو اُس سے نکال باہر کرو۔ اچھا، تھوڑی دیر میں تمہیں (اِس کا نتیجہ) معلوم ہو جائیگا" ۱۲۳

"میں ضرور ایسا کرونگا کہ پہلے تمہارے ہاتھ

(۵) جادوگروں کا بُری طرح ہارنا، حضرت موسیٰ پر ایمان لانا، فرعون کا اُسے سازش قرار دینا، اور قتل و تعذیب کی دھمکی۔
سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ یہ معاملہ مصریوں کے تہوار کے دن پیش آیا تھا اور مملکت کی تمام آبادی جمع تھی، اور خود حضرت موسیٰ کی تجویز سے ایسا ہوا تھا (۵۹) نیز یہ، کہ مقابلہ سے پہلے حضرت موسیٰ نے جادوگروں کو نصیحت کی تھی، اور وہ متاثر ہو کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے، لیکن چونکہ فرعون نے اس معاملہ کو قومی خطرہ کا رنگ دیدیا تھا، اس لیے مقابلہ پر جمے رہے۔ اُنہوں نے آپس میں کہا "موسیٰ ہمیں نکال کر ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے" (۶۳)
جب فرعون نے دیکھا، تمام باشندگانِ ملک کے سامنے اُسے شکست ہوئی، اور جن جادوگروں پر بھروسہ کیا گیا تھا، وہی ایمان لے آئے تو ڈرا، کہیں ایسا نہ ہو، لوگ حضرت موسیٰ کے معتقد ہو جائیں۔ اس لیے جادوگروں پر کمزور سازش کا الزام لگایا۔ یعنے حضرت موسیٰ سے مل گئے ہیں۔ اسی لیے جان بوجھ کر اُنہیں فتح مند کرا دیا، اور پھر فوراً اُن پر ایمان لے آئے۔
(۶) سچا ایمان اگرچہ ایک لمحہ کا ہو، ایسی روحانی طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اُسے مرعوب و مسخر نہیں کر سکتی۔ وہی جادوگر جو فرعون سے صلہ و انعام کی التجائیں

۱۲۴-۱۲۵ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ○ وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ

۱۲۶ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ○ وَ قَالَ الْمَلَاُ

مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ

۱۲۷ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا

بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ

۱۲۴ پانوں اُلٹے سیدھے کٹواؤں پھر تم سب کو سولی پر چڑھادوں"

اُنہوں نے جواب دیا "ہمیں اپنے پروردگار

۱۲۵ کی طرف لوٹ کرجانا ہی ہے (پھر ہم جسم کے عذاب و موت سے کیوں ہراساں ہوں؟) ہمارا قصور اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب ہمارے پروردگار کی نشانیاں ہمارے سامنے آگئیں تو ہم اُن پر ایمان لے آئے۔ (ہماری دعا خدا سے یہ ہے کہ) پروردگار! ہمیں صبر و شکیبائی سے معمور کردے۔ تاکہ زندگی کی کوئی اذیت ہمیں اس راہ میں ڈگمگا نہ سکے) اور ہمیں دنیا سے اس حالت میں اُٹھا کہ

۱۲۶ تیرے فرمانبردار رہوں!"

اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے فرعون سے کہا "کیا تو موسیٰ اور اُس کی قوم کو چھوڑ دیگا کہ ملک میں بدامنی پھیلائیں اور تجھے اور تیری معبودوں کو ترک کردیں؟"

۱۲۷ فرعون نے کہا "ہم اُن کے لڑکوں کو قتل کردینگے، اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دینگے (کہ ہماری باندیاں بن کر رہیں) اور (ہمیں ڈرکس بات کا ہے؟) وہ ہماری طاقت سے دبے ہوئے بے بس ہیں"

تب موسیٰ نے اپنی قوم کو (وعظ کرتے ہوئے) کہا "خدا سے مدد مانگو، اور (اس راہ میں) جمے رہو بلاشبہ زمین (کی پادشاہت صرف) خدا ہی کے

کررہے تھے، ایمان لانے کے بعد معاً ایسے بے پرواہوگئے کہ سخت سے سخت جسمانی عذاب کی دھمکی بھی اُنہیں متزلزل نہ کرسکی۔ تفصیل سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ (۷۲)

(ز) فرعون کا حضرت موسیٰ کی روحانی طاقت سے مغلوب ہوکر فیصلہ کرنا کہ اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دے لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی دینا کہ بنی اسرائیل کے لڑکے قتل کردیے جائیں تاکہ اُن کی تعداد بڑھنے نہ پائے۔

فرعون نے پہلے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کیا تھا لیکن اُس کے خاندان کے ایک آدمی نے کہ دل میں مومن تھا، اس سے باز رکھا (دیکھو ۴۰: ۲۸) پس یہاں درباریوں اور فرعون کے مکالمہ کا مطلب یہ سمجھنا چاہیے کہ جب حضرت موسیٰ آزاد چھوڑ دیے گئے، تو درباریوں نے کہا، یہ شورش پھیلائیگا اور ہمارے دیوتاؤں سے علانیہ برگشتہ رہیگا۔ اس پر فرعون نے کہا، ڈرنے کی کیا بات ہے؟ بنی اسرائیل تو ہماری طاقت کے تلے دبے ہوئے ہیں۔

(ح) مصری مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ بڑا دیوتا سورج تھا جسے "رع" کہتے تھے، اور چونکہ پادشاہ کو اُس کا اوتار سمجھتے تھے، اِس لیے اُس کا لقب "فارع" تھا۔ یہی

يُورِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۹ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ

(۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰ ع)

لیے ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اُس کا وارث بنا دیتا ہے، اور انجام کار اُنہی کے لیے ہے جو متقی ہونگے!" ۱۲۸

اُنہوں نے کہا "تمہارے آنے سی پہلے بھی ہم ستائے گئے، اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں"

موسیٰ نے کہا "قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے، اور تمہیں ملک میں اُس کا جانشین بنا لے۔ پھر دیکھے (اُس جانشینی کے بعد) تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں!" ۱۲۹

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے فرعون کی قوم کو خشک سالی کے برسوں اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تھا، تاکہ وہ متنبّہ ہوں۔ ۱۳۰

تو جب کبھی ایسا ہوتا کہ خوش حالی آتی، تو کہتے، یہ ہمارے حصّے کی بات ہے (یعنے ہماری وجہ سے) اور اگر ایسا ہوتا کہ سختی پیش آجاتی، تو کہتے، یہ موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کی نحوست ہے۔

(اے مخاطب!) سُن رکھ کہ اُن کی نحوست (اور کسی کے پاس نہ تھی) اللہ کے یہاں تھی (جس نے انسان کی اچھی بُری حالتوں کے لیے ایک قانون ٹھہرا دیا ہے اور اسی کے مطابق نتائج پیش آتے ہیں) لیکن

فارع عبرانی میں "فاراعو" اور عربی میں فرعون ہوگیا۔

(ط) محکومانہ زندگی کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ عزم و ہمت کی روح پژمردہ ہوجاتی ہے۔ لوگ غلامی کے ذلت انگیز امن پر قانع ہوجاتے ہیں، اور طلب و سعی کی مشکلوں سے جی چرانے لگتے ہیں یہی حال بنی اسرائیل کا ہوا تھا۔ عرصہ تک مصریوں کی غلامی میں رہتے رہتے اس درجہ مسخ ہوگئے تھے کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، آزادی و کامرانی کی طلب میں اُن حقیر راحتوں سے کیوں ہاتھ دھو بیٹھیں جو غلامی کی حالت میں میسر آرہی ہیں؟ حضرت موسیٰ نے جب صبر و استقامت کی تلقین کی تو شکرگزار ہونے کی جگہ اُلٹی شکایتیں کرنے لگے۔ وہ اِن کی نجات و کامرانی کے لیے فرعون کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ تمہاری اس جد وجہد نے فرعون کو اور زیادہ ہمارا مخالف بنا دیا۔ تم فائدہ پہنچانے کی جگہ اُلٹے وبالِ جان ہوگئے!

(ی) حضرت موسیٰ نے کہا، خدا جسے چاہتاہے، زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ پس اُس سے مدد مانگو اور اس راہ میں جمے رہو۔ اس سے معلوم ہوا، جو جماعت دنیوی بے سروسامانی سے ہراساں ہوکر بے ہمت نہیں ہوجاتی بلکہ خدا کی مدد پر بھروسہ کرتی اور مشکلات و موانع کے مقابلہ میں جمی رہتی ہے، وہی ملک کی وراثت کی مستحق ہوتی ہے۔ یعنے "استعانت باللہ" اور "صبر" اس راہ میں اصل اصول ہے۔ نیز فرمایا "انجام کار متقیوں کے لیے ہے" یعنی جو جماعت بُرائیوں سے بچنے والی اور عمل میں پکی ہوگی، بالآخر کامیابی اُسی کے لیے ہے۔

١٣١، ١٣٢ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝
فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا
١٣٣ وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ
١٣٤ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ
الرِّجْزَ إِلَى أَجَلٍ هُمْ بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ۝ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ
كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ۝ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ

---

١٣١ بہتوں کو یہ بات معلوم نہیں۔

اور فرعون کی قوم نے کہا "(اے موسیٰ) تو ہم پر اپنا جادو چلانے کے لیے کتنی ہی نشانیاں
١٣٢ لائے، مگر ہم ماننے والے نہیں"

پس ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، اور ٹڈیوں کے دل، اور جوئیں[1]، اور مینڈک، اور لہو، کہ یہ سب الگ الگ نشانیاں تھیں۔ اس پر بھی اُنہوں نے سرکشی کی، اور اُن کا گروہ مجرموں کا گروہ
١٣٣ تھا۔

(۴۲) قوم فرعون پر نکبت و شدائد کا ورود، اور پہلے سرکشی، پھر حضرت موسیٰؑ سے رجوع۔
تورات میں ہے کہ دریائے نیل کا پانی لہو کی طرح ہو گیا تھا، اور تمام مچھلیاں مرگئی تھیں۔ (خروج: ۲۰)

اور جب اُن پر عذاب کی سختی واقع ہوئی تو کہنے لگے "اے موسیٰ! تیرے پروردگار نے تجھ سے (نبوت کا) جو عہد کیا ہے، تو اس کی بنا پر ہمارے لیے دعا کر۔ اگر تیری دعا سے عذاب ٹل گیا تو ضرور ہم تیرے معتقد ہو جائیں گے، اور
١٣٤ بنی اسرائیل کو چھوڑ دینگے کہ تیرے ساتھ چلے جائیں" لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت تک کے لیے کہ (اپنی سرکشیوں اور بدعملیوں سے) انہیں اُس تک پہنچنا تھا، عذاب
١٣٥ ٹال دیا، تو دیکھو، اچانک وہ اپنی بات سے پھر گئے!

بالآخر ہم نے (ان کی بدعملیوں پر) اُنہیں سزا دی یعنے اس جرم کی پاداش میں کہ ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور اُن کی طرف سے غافل رہے، اُنہیں
١٣٦ سمندر میں غرق کر دیا، اور جس قوم کو کمزور و حقیر

آیت (۱۳۵) میں فرمایا "ایک خاص وقت تک کے لیے کہ اُنہیں اس تک پہنچنا تھا"، یعنے ایک آنے والا وقت تھا جس کی طرف وہ اپنے اعمال کے ذریعہ بڑھ رہے تھے اور بالآخر پہنچنے والے تھے۔

---

[1] عربی میں "قُمّل" جوؤں کو بھی کہتے ہیں اور چھوٹی مکھیوں کو بھی۔ اگر تورات میں جوؤں کا ذکر نہ ہوتا تو ہم یہاں ترجمہ میں "مکھیاں" لکھتے کہ انسانی ہلاکت کے لیے زیادہ موثر و قطعی ہیں۔

الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝ ۱۳۷ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ ۱۳۸ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ۱۳۹

یہ تسنے والا وقت کونسا تھا؟ اُن کے ظلم و فساد کا آخری نتیجہ، کہ خدا کے قانونِ جزا نے اس طرح کے نتیجہ کے لیے جتنی مقدار فسادِ عمل کی ٹھہرادی ہے، جب وہ مہیا ہوگئی، تو نتیجہ ظہور میں آگیا، اور فرعون اور اس کا لشکر ہلاک ہوگیا۔

یہی ظہورِ نتائج کا وقت ہے جسے قرآن نے اُمتوں کی "اجل" سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ اسی سورت کی آیت (۳۴) میں اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔

اس سے معلوم ہوا، ہر جماعت اپنے اعمال کے ذریعہ ایک خاص نتیجہ تک پہنچتی رہتی ہے جو اس کی مقررہ اجل ہے۔ اگر اعمال نیک ہوتے ہیں تو یہ اجل فلاح کی ہوتی ہے۔ بُرے ہوتے ہیں تو ہلاکت کی ہوتی ہے۔

فرعون کی ہلاکت اور بنی اسرائیل کی وراثتِ ارض۔

قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ظالم قومیں جن مظلوم قوموں کو حقیر و کمزور سمجھتی ہیں، ایک وقت آتا ہے کہ وہی شاہی و جہانداری کی وارث ہو جاتی ہیں!

آیت (۱۳۷) سے معلوم ہوا کہ خدا کا وعدۂ نصرت اُنہی کے حق میں پورا ہوتا ہے جو اس کی شرط پوری کریں۔ یعنے راہِ عمل میں جمے رہیں۔ اگر بنی اسرائیل جمے نہ رہتے، تو فتح مندی سے محروم رہتے۔

بنی اسرائیل چونکہ مصری بت پرستی سے مالوف ہو چکے تھے، اس لیے سینا کے بت خانے دیکھ کر خواہشمند ہوئے کہ انکی پرستش کے لیے بھی ایک بت بنا دیا جائے۔

خیال کرتے تھے، اُسی کو ملک کے تمام پورب[1] کا اور اُس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے، وارث کردیا۔ اور اس طرح (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کا فرمانِ پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (ہمت و ثبات کے ساتھ) جمے رہے تھے، اور فرعون اور اُس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کے لیے) جو کچھ بناتا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اُٹھائی تھیں، وہ سب درہم برہم کردیں! ۱۳۷

اور ہمارے حکم سے ایسا ہوا کہ بنی اسرائیل سمندر پار اُتر گئے۔ وہاں اُن کا گزر ایک گروہ پر ہوا کہ اپنے بتوں پر مجاور بنا بیٹھا تھا۔ بنی اسرائیل نے کہا "اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایسا ہی ایک معبود بنا دے جیسا اِن لوگوں کے لیے ہے" موسیٰ نے کہا ("افسوس تم پر!) تم بلا شبہ ایک جاہل گروہ ہو۔ ۱۳۸ یہ لوگ جس طریقہ پر چل رہے ہیں تو تباہ ہونے والا طریقہ ہے، اور اُنھوں نے جو عمل اختیار کیا ہے وہ یکقلم باطل ہے۔ ۱۳۹

[1] یعنے فلسطین اور شام کا ملک جو مصر کے پورب میں واقع ہے، اور اُس کے مغربی حصوں کا ملک یعنے جزیرہ نمائے سینا جو فلسطین کے پچھم میں ہے۔ یہ تمام علاقہ اُس وقت مصری شاہنشاہی کا خراج گزار تھا۔

۱۴۰ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۗ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ

۱۴۱ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ

۱۴۲ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا

ع ۱۷

۱۴۰ (نیز) موسیٰ نے کہا "کیا تم چاہتے ہو خدا کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لیے تلاش کروں، حالانکہ وہی ہے جس نے تمہیں دنیا کی قوموں پر فضیلت دی ہے"

اور (خدا فرماتا ہے۔ اے بنی اسرائیل!) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون کی قوم سے نجات دلائی۔ وہ تمہیں سخت عذابوں میں مبتلا کرتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے۔ اور تمہاری عورتوں کو (اپنی چاکری کے لیے) زندہ چھوڑ دیتے۔ اِس صورتِ حال میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بڑی ہی آزمائش تھی!

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں (کے اعتکاف) کا وعدہ کیا تھا۔ پھر دس راتیں بڑھا کر اُسے پورا (چلّہ) کر دیا۔ اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی پوری میعاد ہو گئی۔

موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا (میں اعتکاف کے لیے پہاڑ پر جاتا ہوں) تم میرے بعد قوم میں میرے جانشین بنکر رہو۔ اور دیکھو، سب کام درستگی سے کرنا۔ خرابی ڈالنے والوں کی راہ نہ چلنا"

اور جب موسیٰ آیا، تاکہ ہمارے مقررہ وقت

(۲۵) حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا پہلا حصّہ ختم ہو گیا، جس کا تعلق اُن ایام و وقائع سے تھا جو اُن کے اور فرعون کے درمیان گزرے۔ اب یہاں سے وہ واقعات شروع ہوتے ہیں جو اُن کے اور اُن کی اُمت کے درمیان گزرے۔ پہلے حصّے میں یہ حقیقت واضح کی تھی کہ دعوت حق کی مخالفت ہمیشہ طاقتور جماعتوں نے کی اور ہمیشہ ناکام رہیں۔ اس حصّہ میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ایک نئی ہدایت یافتہ جماعت کو راہِ عمل میں کیسی کیسی لغزشیں پیش آسکتی ہیں؟ تاکہ پیروانِ دعوت اِن سے اپنی نگہداشت کریں۔

۱۴۱ چونکہ سلسلۂ بیان ایک دوسرے حصّہ کی طرف مڑ رہا تھا، اِس لیے اُس کی ابتدا از سرِ نو بنی اسرائیل کی مخاطبت سے کی گئی ہے۔ گویا موعظت و ارشاد کے لحاظ سے یہ ایک نیا بیان ہے۔

(ا) حضرت موسیٰ کا کوہ طور پر اعتکاف اور شریعت کا عطیہ۔ یہاں شریعت سے مقصود وہ دس احکام ہیں جو حضرت موسیٰ نے وحی الٰہی سے پتھر کی دو تختیوں پر کندہ کیے تھے اور جنہیں تورات میں عہد کے احکام سے تعبیر کیا گیا ہے یعنے قتل مت کر۔ زنا مت کر وغیرہا۔ (خروج ۳۴: ۲۹)

(ب) اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ انسان اپنے حواس کے ذریعہ ذات باری کا مشاہدہ و ادراک نہیں کرسکتا، اور اس راہ میں معرفت کا منتہیٰ مرتبہ یہ ہے کہ عجز و نارسائی کا اعتراف کیا جائے۔

۱۴۲ یہودیوں نے تورات کے تشابہات کو حقیقت پر محمول کر لیا تھا اور سمجھتے تھے حضرت موسیٰ نے خدا کی شبیہ دیکھی (خروج)

وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۴۳) قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ ۝ (۱۴۴) وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا سَأُورِيكُم

میں حاضری دے، اور اُس کے پروردگار نے اُس سے کلام کیا، تو (جوشِ طلب میں بے اختیار ہو کر) پکار اُٹھا "پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نگاہ کر سکوں" حکم ہوا "تو مجھے کبھی نہ دیکھ سکیگا۔ مگر ہاں، اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اگر یہ (تجلیِ حق کی تاب لے آیا اور) اپنی جگہ ٹکا رہا، تو (سمجھ لیجیو، تجھے بھی میرے نظارہ کی تاب ہے، اور تو) مجھے دیکھ سکیگا" پھر جب اُس کے پروردگار (کی قدرت) نے نمود کی، تو پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیا، اور موسیٰ غش کھا کے گر پڑا!

قرآن نے یہاں اس حالت کا اظہار کر دیا۔ فرمایا جب خدا نے موسیٰ سے کلام کیا، تو اُس نے کہا میرے سامنے آجا کہ ایک نگاہ دیکھ لوں یعنے جب غیب سے ندائے حق سُنی، تو جوشِ طلب میں بیخود ہو گئے، اور لذتِ سماع کی محویت میں لذتِ مشاہدہ کے حصول کا ولولہ پیدا ہو گیا:

والاذن تعشق قبل العین احیانا!

حکم ہوا پہاڑ کو دیکھو۔ اگر یہ تاب لا سکا تو تو بھی تاب لا سکیگا یعنے حجابِ نظارہ سے مانع ہے، وہ خود تیری ہی ہستی کا عجز ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ نمودِ حق میں کمی ہو۔ ولنعم ما قیل:

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست!

جب موسیٰ ہوش میں آیا، تو بولا "خدایا! تیرے لیے ہر طرح کی تقدیس ہو! میں (اپنی جسارت سے) تیرے حضور توبہ کرتا ہوں۔ میں اُن میں پہلا شخص ہونگا جو (اس حقیقت پر) یقین رکھتے ہیں!" ۱۴۳

خدا نے کہا "اے موسیٰ! میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہم کلامی سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔ پس جو چیز تجھے عطا فرمائی ہے (یعنے احکامِ شریعت) اُسے لے اور شکر بجا لا" ۱۴۴

اور ہم نے موسیٰ کے لیے اُن تختیوں میں ہر قسم کی باتیں لکھ دی تھیں۔ تاکہ (دین کے) ہر معاملہ کے لیے اُس میں نصیحت ہو، اور ہر بات الگ الگ واضح ہو جائے۔ پس (ہم نے کہا) "اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے، اور اپنی قوم کو بھی حکم دے کہ اس کے پسندیدہ حکموں پر کاربند ہو جائے۔ وہ وقت دور نہیں کہ ہم نافرمانوں کی جگہ تمہیں دکھا دینگے" ۱۴۵

(ج) آیت (۱۴۵) کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے جن جن حکموں کی ضرورت تھی، وہ سب ان تختیوں کے احکام میں موجود تھے۔ "تفصیلاً لکل شیء" یعنے تمام باتیں الگ الگ کر کے بیان کر دی تھیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا جہان کی ہر بات تشریح و تطویل کے ساتھ لکھ دی گئی تھی۔ یاد رہے کہ قرآن "تفصیل" کا لفظ اُس مصطلحہ معنی میں نہیں بولتا جو فنِ بیان و معانی میں بعد کو ٹھہرائے گئے، اور جو "اجمال" کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اگر امام رازیؒ کی نظر اس حقیقت پر

ع ۱۸ ۱۵۱ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ۝ ۱۵۲ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ۱۵۳ وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ۝ ۱۵۴ وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا

موسیٰ نے کہا "پروردگار! میرا قصور بخش دے (کہ جوش میں آگیا) اور میرے بھائی کا بھی (کہ گمراہوں کو سختی کے ساتھ نہ روک سکا) اور ہمیں اپنی رحمت کے سایے میں داخل کر! تجھ سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو" ۱۵۱

خدا نے فرمایا "جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی، اُن کے حصے میں اُن کے پروردگار کا غضب آئیگا، اور دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی پائینگے۔ ہم افترا پردازوں کو (اُن کی بدعملی کا) اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ ۱۵۲ ہاں جن لوگوں نے بُرائیوں کے ارتکاب کے بعد (متنبہ ہو کر) توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخش دینے والا، رحمت والا ہے!" ۱۵۳

اور جب موسیٰ کی خشمناکی فرو ہوئی، تو اُس نے تختیاں اُٹھا لیں۔ اُن کی کتابت میں (یعنے اُن حکموں میں جو اُن پر لکھے ہوئے تھے) اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے پروردگار کا ڈر رکھتے ہیں" ۱۵۴

اور اس غرض سے کہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے وقت میں حاضر ہوں، موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چُنے۔ پھر جب لرزا دینے والی ہولناکی نے اُنہیں آ لیا تو موسیٰ نے (ہماری جناب میں) عرض کیا "پروردگار! اگر تو چاہتا، تو ان سب کو اب سے پہلے ہی ہلاک کر ڈالتا، اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا! مگر تو نے اپنے فضل و رحمت

(ز) حضرت موسیٰ کا قوم کے سرکش سرداروں میں سے ستر آدمیوں کو فیصلہ کے لیے چُننا، اور لرزا دینے والی ہولناکی کا ظہور۔

تورات میں ہے کہ سرداروں کی ایک جماعت نے حضرت موسیٰ کی بزرگی و پیشوائی سے انکار کیا تھا۔ اس پر حکم الٰہی سے ایک وقت مقرر کیا گیا اور سرکش گروہ جمع ہوا۔ اُس وقت زلزلہ آیا، زمین پھٹی، اور سب اُس میں مدفون ہو گئے (گنتی ۱۶: ۳۱)

(ح) آیت (۱۵۶) میں فرمایا کہ کائناتِ ہستی میں اصل و عام حقیقت رحمت ہے، اور تعذیب و عقوبت نہیں ہے مگر خاص خاص حالتوں کے لیے۔ پس یہاں اصلِ قانون، رحمت ہوا جس کے احاطہ سے کوئی گوشہ باہر نہیں ہے۔

یہ مقام معارف قرآنی کی مہمات میں سے ہے، اور اُن تمام گمراہیوں کا ازالہ کر دیتا ہے جو خدا کی صفات و افعال کے بارے میں پھیل گئی تھیں جس حالت کو انسان کے لیے

اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

۱۵۵ ۱۵۶

عذاب قرار دیا اُسے خاص حالتوں سے مخصوص بتلایا، مگر رحمت کو کہا کہ عام ہے۔ کیونکہ رحمت اُسکی قدیم اور ازلی صفت ہے۔ عذاب دینا صفت نہیں۔ اور عذاب بھی اس لیے عذاب ہے کہ جاری ٹھہرائی ہوئی اضافتوں اور نسبتوں کے لحاظ سے ایسا ہوتا تھا۔ ورنہ فی الحقیقت اُس نے جو کچھ بھی کیا ہے، رحمت ہی رحمت ہے۔ سورۂ انعام میں گذر چکا ہے، کتب علی نفسہ الرحمۃ (۱۲)

(ط) آیت (۱۵۶) میں اس فرمان کا ذکر کیا تھا کہ جو لوگ خدا کی نشانیوں پر ایمان رکھیں گے وہ رحمت کے سزاوار ہونگے، اس لیے بعد کی آیات میں سلسلۂ بیان مخاطبین کی طرف متوجہ ہو گیا ہے یعنے اب کہ پیغمبر اسلام کی موعودہ دعوت نمودار ہوگئی، اہل کتاب کے لیے رحمتِ الٰہی کی بخشائشوں کا دروازہ کھل گیا ہے۔ جو لوگ سچائی کی نشانیوں پر ایمان لائینگے، فرمانِ الٰہی کے مطابق کامرانی و سعادت پائینگے۔

(ی) پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں یہاں بیان کیں:

(۱) نیکی کا حکم دیتا ہے۔ برائی سے روکتا ہے۔

(۲) پسندیدہ چیزوں کا استعمال جائز ٹھہراتا ہے۔ ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال سے روکتا ہے۔ قرآن نے اس معنی میں "طیبات" اور "خبائث" کا لفظ اختیار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں اچھی ہیں اُنہیں جائز کیا ہے، جو بُری ہیں، یعنی مضر ہیں اُن سے روک دیا ہے۔

(۳) جو بوجھ اہل کتاب کے سروں پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں گرفتار ہو گئے تھے، اُن سے نجات دلاتا ہے۔ یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کونسے تھے جن سے قرآن نے رہائی دلائی؟

سے ہمیں مہلت دی) پھر کیا ایک ایسی بات کے لیے جو ہم میں سے چند بے وقوف آدمی کر بیٹھے ہیں، تو ہم سب کو ہلاک کر دیگا؟ یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے۔ تو جسے چاہے، اس میں بھٹکا دے، جسے چاہے راہ دکھا دے! خدایا! تو ہمارا والی ہے۔ ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تجھ سے بہتر بخشنے والا کوئی نہیں! اور (خدایا!) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لیے اچھائی لکھ دے، اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے لیے اچھائی کر۔ ہم تیری طرف لوٹ آئے!"

۱۵۵

خدا نے فرمایا "میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ پس میں اُن لوگوں کے لیے رحمت لکھ دونگا جو برائیوں سے بچینگے اور زکوٰۃ ادا کرینگے، اور اُن کے لیے، جو میری نشانیوں پر ایمان لائینگے"

۱۵۶

"جو الرسول کی پیروی کرینگے کہ نبی اُمّی ہوگا، اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل

١٥٩ يَعْدِلُوْنَ ۝ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ١٦٠ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓئٰتِكُمْ ؕ

---

١٥٩ (اُنکے معاملات میں) انصاف بھی کرتا ہے۔

اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ خاندانوں کے بارہ گروہوں میں منقسم کر دیا، اور جب لوگوں نے موسیٰ سے پینے کے لیے پانی مانگا، تو ہم نے وحی کی کہ اپنی لاٹھی (ایک[1] خاص) چٹان پر مارو۔ چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے، اور ہر گروہ نے اپنی اپنی جگہ پانی کی معلوم کر لی، اور ہم نے بنی اسرائیل پر ابر کا سایہ کر دیا تھا۔ اور (اُنکی غذا کے لیے) "من" اور "سلویٰ" اُتارا تھا۔ ہم نے کہا تھا "یہ پسندیدہ غذا کھاؤ جو ہم نے عطا کی ہے" (اور فتنہ و فساد میں نہ پڑو)۔ انہوں نے (نافرمانی کرکے) ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا، خود اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کرتے رہے!

حالت پر ہو۔ لکھنے پڑھنے اور علم و فن کی باتوں سے آشنا نہ ہوا ہو۔ چنانچہ عرب کے باشندے بھی امّی کہلاتے کیونکہ تعلیم و تربیت سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

پیغمبر اسلام کو بھی "الامّی" فرمایا، کیونکہ ظاہری تعلیم و تربیت کا اُن پر سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔ جو کچھ تھا سرچشمۂ وحی کا فیضان تھا!

(ھ) چونکہ تورات کی بشارات میں پیغمبر موعود کے اس وصف کی طرف اشارہ تھا، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا۔ بشاراتِ ظہور کے لیے استثناء ١٨: ١٦۔١٧ و ٣٢: ٢١ و ٣٣: ٢۔ اور زبور ٤٥: ١۔ اور انجیل متی ٢٠: ١۔ یوحنا ١: ٢١ و ١٤: ١٥ کے مقامات دیکھنے چاہئیں۔

(ن) بنی اسرائیل کی بارہ قبیلوں میں تقسیم اور وادی سینا کے واقعات کی طرف اشارہ۔

(س) یہ گمراہی کہ جب فتح و کامرانی حاصل ہوئی تو عبودیت و نیاز کی جگہ غفلت و شرارت میں مبتلا ہو گئے (دیکھو بقرہ از ٥٤ تا ٥٧)

١٦٠ اور پھر (وہ واقعہ یاد کرو) جب بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا "اس شہر[2] میں جا کر آباد ہو جاؤ، (جس کے فتح کرنے کی تمہیں توفیق ملی ہے) اور (یہ نہایت زرخیز علاقہ ہے) جس جگہ سے چاہو، اپنی غذا حاصل کرو، اور تمہاری زبانوں پر حطّة[3] کا کلمہ جاری ہو اور اس کے دروازے میں داخل ہو تو (اللہ کے حضور) جھکے ہوئے ہو۔ ہم تمہاری خطائیں بخش دینگے، اور نیک کرداروں کو (اس سے بھی)

---

[1] تورات میں ہے کہ یہ چٹان جبل حوریب میں تھی۔ (خروج ١٧: ٦) "حوریب" سے مقصود وہ سلسلۂ کوہ ہے جو وادی سینا میں واقع ہے۔
[2] غالباً یہ وہ شہر تھا جسے تورات میں یریحو کہا گیا ہے اور جو یردن پار سرزمین کنعان کی پہلی آبادی تھی جس کے حصول کی بنی اسرائیل کو بشارت دی گئی تھی (گنتی ٣٣: ٥٠) [3] حطّة کلمۂ استغفار ہے۔ یعنے خدایا! گناہوں سے پاک کر دے!

۱۶۱ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ
۱۶۲ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ۝ وَسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ
إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ
۱۶۳ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ
أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ

ع ۲۱ ۔ ۱۲ مع

۱۶۰ زیادہ اجر دینگے'

۱۶۱ لیکن پھر ایسا ہوا کہ جو لوگ ان میں ظلم و شرارت کی راہ چلنے والے تھے، اُنہوں نے خدا کی بتلائی ہوئی بات بدل کر ایک دوسری ہی بات بنا ڈالی (یعنے جس بات کا حکم دیا گیا تھا، اس سے بالکل اُلٹی چال چلے) پس ہم نے آسمان سے اُن پر عذاب بھیجا، اُس ظلم کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے تھے۔

۱۶۲ اور (اے پیغمبر) بنی اسرائیل سے اُس شہر کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا، اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے۔ سبت کے دن اُن کی (مطلوبہ) مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی اُن کے پاس آجاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے، نہ آتیں۔ اس طرح ہم اُنہیں آزمائش میں ڈالتے تھے۔ بہ سبب اس نافرمانی کے جو وہ کیا کرتے تھے۔

۱۶۳ اور جب اُس شہر کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے (ان لوگوں سے جو نافرمانوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے) کہا "تم ایسے لوگوں کو (بیکار) نصیحت کیوں کرتے ہو جنہیں (اُنکی شقاوت کی وجہ سے) یا تو خدا ہلاک کر دیگا یا نہایت سخت عذاب (اُخروی) میں مبتلا کریگا؟" اُنہوں نے کہا "اس لیے کرتے ہیں، تاکہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا

(ع) بنی اسرائیل کی یہ گمراہی کہ دین کے حکموں پر سچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے، اور شرعی حیلے نکال کر اُن کی تعمیل سے بچنا چاہتے تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ سبت کا مقدس دن تعطیل کا دن ہے اس دن شکار نہ کرو لیکن ایک گروہ نے یہ حیلہ نکالا کہ سمندر کے کنارے گڑھے کھود لیے۔ جب جوار کے بعد پانی اُترجاتا تو گڑھے کے اندر کی مچھلیاں پکڑ لیتے اور کہتے یہ مچھلیاں خود آگئیں، شکار نہیں کی گئیں!

بندر ہو جانے کا مطلب کیا ہے؟ اُن کی صورتیں بندروں کی سی ہو گئی تھیں یا دل؟ ائمۂ تفسیر میں سے مجاہد کا قول ہے "مسخت قلوبھم" اُنکے دل مسخ ہو گئے تھے۔ (ابن کثیر)

(ف) گمراہوں کی ہدایت کی طرف سے کتنی ہی مایوسی ہو، لیکن اہلِ حق کا فرض ہے کہ موعظت سے باز نہ رہیں۔ کیونکہ اول تو یہ ایک فرض ہے اور ادائے فرض میں نتیجہ کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ثانیاً کون کہہ سکتا ہے کہ ہدایت قطعاً مؤثر نہ ہوگی؟ ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل کو کوئی بات لگ جائے چنانچہ اسی لیے اہل حق نے کہا "معذرۃ الی ربکم، ولعلھم یتقون" تاکہ اللہ کے حضور معذرت کر سکیں، اور اس لیے بھی کہ شاید لوگ باز آجائیں۔ سبحان اللہ قرآن کی معجزانہ بلاغت پانچ چھ لفظوں کے اندر وہ سب کچھ کہدیا جو اس بارہ میں کہا جا سکتا ہے!

وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ۱۶۴
ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً ۱۶۵
خٰسِـِٕيْنَ ○ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِؕ ۱۶۶
اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ ۱۶۷

کر دیا) اور اس لیے بھی کہ شاید لوگ باز آجائیں"

پھر جب ایسا ہوا کہ اُن لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو اُنہیں کی گئی تھیں، تو ہمارا مواخذہ نمودار ہوگیا۔ ہم نے اُن لوگوں کو تو بچا لیا جو بُرائی سے روکتے تھے، مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی و نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا۔[1] بہ سبب اُن نافرمانیوں کے جو وہ کیا کرتے تھے! ۱۶۵

پھر جب یہ (سزا بھی اُنہیں عبرت نہ دلا سکی اور) وہ اُس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہوگئے جس سے اُنہیں روکا گیا تھا، تو ہم نے کہا "بندر ہو جاؤ۔ ذلت و خواری سے ٹھکرائے ہوئے!" ۱۶۶

اور (اے پیغمبر) جب ایسا ہوا تھا کہ تیری پروردگار نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا: (اگر بنی اسرائیل شرارت و بدعملی سے باز نہ آئے، تو) وہ قیامت کے دن تک اُن پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیگا جو اُنہیں ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا کرینگے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار (بدعملی کی) سزا دینے میں دیر کرنے والا نہیں، اور ساتھ ہی بخشنے والا رحمت والا بھی ہے! ۱۶۷

اور ہم نے اُنہیں الگ الگ گروہ کر کے زمین میں متفرق کر دیا۔ کچھ اِن میں نیک تھے، کچھ

(ص) آیت (۱۶۷) سے معلوم ہوا، کسی قوم پر ظالم و مستبد حکمرانوں کا مسلط رہنا بھی خدا کا ایک عذاب ہے جو پاداش عمل میں نمودار ہوتا ہے۔

(ق) آیت (۱۶۸) میں اس قانونِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ جب کوئی جماعت بدعملی و فساد میں مبتلا ہوتی ہے تو اُس کا مہلک نتیجہ فوراً ظاہر نہیں ہو جاتا، بلکہ تدریج و امہال کی وجہ سے یکے بعد دیگرے مہلتیں ملتی رہتی ہیں کہ اصلاحِ حال پر آمادہ ہو جائے۔

فرمایا "ہم نے اُنہیں الگ الگ گروہ کر کے زمین میں متفرق کر دیا" یعنے بنی اسرائیل کی قومی وحدت باقی نہیں رہی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منتشر ہوگئے یہ تباہی کی ابتدا تھی، تاہم ابھی نیک جماعتیں بالکل معدوم نہیں ہوگئی تھیں۔ لیکن اس دور کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں، وہ عمل و حقیقت سے یکسر محروم ہوگئیں

---

[1] اصل آیت میں "بعذابٍ بئیسٍ" ہے۔ "بئیس" بأس سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی شدت کے ہیں، اور بؤس سے بھی جس کے معنی فقر و فاقہ اور انتہائے محرومی کے ہیں۔ ہم نے دوسرے معنی کو ترجیح دی کیونکہ آگے چل کر "خاسئین" کا لفظ آیا ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے، عذاب کی نوعیت ایسی تھی کہ ذلیل و خوار کرنے والا تھا۔

١٦٨ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۚ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا

١٦٩ فِيْهِ ۚ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ

کچھ اس کے خلاف۔ اور ہم نے انہیں اچھی اور بری دونوں طرح کی حالتوں میں ڈال کر آزمایا، تاکہ (بد عملیوں سے) باز آجائیں۔

١٦٨ پھر ان لوگوں کے بعد ناخلفوں نے ان کی جگہ پائی اور کتاب الٰہی کے وارث ہوئے۔ وہ (دین فروشی کرکے) اس دنیائے حقیر کی متاع (بے تامل) لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں "اس کی تو ہمیں معافی مل ہی جائیگی"، اور اگر کوئی متاع انہیں اسی طرح (فریق ثانی سے) ہاتھ آجائے تو اُسے بھی بلا تامل لے لیں۔ کیا اِن سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات نہ کہیں مگر وہی جو سچ ہو؟ اور کیا جو کچھ کتاب میں حکم دیا گیا ہے، وہ پڑھ نہیں چکے ہیں؟ جو متقی ہیں اُن کے لیے تو آخرت کا گھر (دنیا اور دنیا کی خواہشوں سے) کہیں بہتر ہے (وہ دنیا کے لیے اپنی

(د) چنانچہ علمائے یہود کا یہ حال ہوگیا کہ دنیا کے حقیر فوائد کے لیے دین فروشی کرتے، ناجائز باتوں کو جائز بنا لیتے، اور سمجھتے ہمارے لیے کوئی کھٹکا نہیں، خدا ہمیں بخش دیگا۔

جب کسی گروہ میں عمل اور حقیقت کی روح باقی نہیں رہتی، تو ارتکاب معاصی میں بےچھوٹ ہو جاتا ہے، اور عمل کی جگہ محض خوش اعتقادی کے خودساختہ سہاروں پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ یہی حال یہودیوں کا ہوا جو سمجھتے تھے، ہم خدا کی پسندیدہ اُمت ہیں، آتش دوزخ ہم پر حرام کردی گئی ہے، اور یہی حال اب مسلمانوں کا ہوگیا ہے جو سمجھتے ہیں، ہم اُمت مرحومہ ہیں۔ آتش دوزخ ہم پر حرام کردی گئی ہے۔ اگر کچھ مواخذہ ہوگا بھی، تو کسی پیر کی مریدی، یا کسی وظیفہ کا ورد یا کسی خاص نمازِ نفل کی مداومت یا مجالس میلاد کا انعقاد اور عرسوں کی شرکت بخشش و نجات کے لیے کافی ہے!

(ش) پہلے آیت (۱۵۹) میں کہا تھا کہ قوم موسیٰ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہدایت پر چلتے ہیں۔ یہاں فرمایا، جو لوگ کتاب اللہ پر سچائی کے ساتھ عمل کرتے ہیں، اُن کا اجر ضائع ہونے والا نہیں۔ دونوں جگہ یہ صراحت اس لیے کی تاکہ واضح ہو جائے، جو لوگ سچائی پر قائم رہے، اُنکی سعادت سے انکار نہیں۔

١٦٩ آخرت تاراج کرنے والے نہیں۔ اے علمائے یہود!) کیا اتنی سی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی؟

اور (بنی اسرائیل میں سے) جو لوگ کتاب اللہ کو مضبوط پکڑے ہوئے ہیں، اور نماز میں سرگرم ہیں تو (ان کے لیے کوئی کھٹکا نہیں) ہم کبھی سنوارنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے! ١٧٠

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے اُن کے اوپر پہاڑ کو زلزلہ[1] میں ڈالا تھا، گویا ایک سائبان ہے،

---

[1] عربی میں "نتقنا" کے معنی رفعنا کے بھی ہوسکتے ہیں اور زلزلنا کے بھی۔ نتق السقاء اذا ہزہ ونفضہ لیخرج منہ الزبدۃ ہم نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے

وَظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ١٧١ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ ١٧٢ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ ١٧٣ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ ١٧٤

(جو ہل رہا ہے) اور وہ (دہشت کی شدت میں) سمجھے تھے کہ بس ان کے سروں پر آگرا، اور اُنہیں حکم دیا تھا کہ "یہ کتاب جو ہم نے دی ہے، مضبوطی سے پکڑے رہو، اور جو کچھ اس میں تلایا گیا ہے، اُسے خوب طرح یاد رکھو۔ اور یہ اس لیے ہے کہ تم بُرائیوں سے بچو" ١٧١

اور (اے پیغمبر! وہ وقت بھی لوگوں کو یاد دلاؤ) جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم کی، یعنے اُس ذریت سے جو اُن کے ہیکل سے (نسلاً بعد نسلٍ) پیدا ہونے والی تھی، عہد لیا تھا، اور اُنہیں (یعنے اُن میں سے ہر ایک کو اُس کی فطرت میں) خود اُس پر گواہ ٹھہرایا تھا: "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟" سب نے جواب دیا تھا: "ہاں، تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ ہم نے اس کی گواہی دی" اور یہ اس لیے کیا تھا کہ ایسا نہ ہو، تم قیامت کے دن عذر کر بیٹھو کہ ہم اِس سے بے خبر رہے، یا کہو، خدایا! شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادوں نے کیا۔ ہم اُن کی نسل میں بعد کو پیدا ہوئے (اور لاچار وہی چال چلے جس پر پہلوں کو چلتے پایا) پھر کیا تو ہمیں اُس بات کے لیے ہلاک کریگا جو (ہم سے پہلے) جھوٹی راہ چلنے والوں نے کی تھی؟ ١٧٢ ١٧٣

(ت) اس حقیقت کا اعلان کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے، اور فطرتِ انسانی کی اصلی آواز "بلیٰ" ہے یعنے تصدیق ہے، انکار نہیں ہے، اور اسی لیے کوئی انسان اپنی غفلت کے لیے معذور نہیں ہو سکتا، اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ آباؤ اجداد کی گمراہی سے میں بھی گمراہ ہو گیا۔ کیونکہ اُس کے وجود سے باہر گمراہی کے کتنے ہی موثرات جمع ہو جائیں لیکن اُس کی فطرت کی اندرونی آواز کبھی دب نہیں سکتی، بشرطیکہ وہ خود اس کے دبانے کے درپے نہ ہو جائے، اور اس کی طرف سے کان بند نہ کر لے۔

چونکہ آیت (١٧١) میں اُس عہد کا ذکر کیا تھا جو دین کے اتباع کا بنی اسرائیل سے لیا تھا، اس لیے یہاں واضح کر دیا گیا کہ پیغمبروں کی ہدایت کوئی نیا پیام انسان کو نہیں دیتی، وہ اُسی اعتقاد کی تجدید کرتی ہے، جو اول دن سے فطرتِ انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔

اور (دیکھو) اس طرح ہم سچائی کی نشانیاں الگ الگ کر کے واضح کر دیتے ہیں، تاکہ لوگ (حق کی طرف) لوٹ آئیں! ١٧٤

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ ۚ وَمَنْ

۱۷۵ — ۱۷۷-۱۷۶

(۲۵) پچھلی دعوتوں کا ذکر ختم ہو گیا۔ اب یہاں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جس طرح پچھلے عہدوں کی مفسد جماعتوں نے آخر تک سچائی کا مقابلہ کیا، اسی طرح عرب کے مفسدین بھی کر رہے ہیں اور کبھی ایمان لانے والے نہیں پس ان کی شرارتوں سے پریشان خاطر نہ ہو۔ نتیجہ کا انتظار کرو۔

آیت (۱۷۵) میں غالباً عرب جاہلیت کے ایک حکیم شاعر، اُمیۃ بن عبداللہ ابی الصلت ثقفی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ غیر معمولی ذکاوت و استعداد کا آدمی تھا، اور اہل کتاب کی صحبت میں رہ کر خدا پرستی و دینداری کے خیالات سے آشنا ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر ایسا شخص سب سے زیادہ مستحق تھا کہ اتباع حق کی اس سے توقع کی جاتی لیکن جب اسلام کا ظہور ہوا، تو پیغمبر اسلام کی فضیلت اس پر گراں گزری، اور اس طمع میں پڑ گیا کہ خود ہی عرب کا پیغمبر کیوں نہ ہوا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ ادراک حق کی جو توفیق ملی تھی، ضائع گئی اور ہوائے نفس کی پیروی نے محروم و نامراد کر دیا

کُتّے کی مثال میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم ان لوگوں سے تعرض کرو یا نہ کرو، یہ اپنی مفسدانہ خصلت کا مظاہرہ ضرور کریں گے، کیونکہ سچائی کی مخالفت ایسے لوگوں کی طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہے۔

اور (اے پیغمبر!) ان لوگوں کو اُس آدمی کا حال (کلامِ الٰہی میں) پڑھ کر سُناؤ جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں (یعنے دلائلِ حق کی سمجھ عطا کی تھی) لیکن پھر ایسا ہوا کہ اُس نے (دانش و فہم کا) وہ جامہ اُتار دیا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ ۱۷۵

اور اگر ہم چاہتے، تو اُن نشانیوں کے ذریعہ اُس کا مرتبہ بلند کرتے، (یعنے دلائلِ حق کا جو علم ہم نے دیا تھا، وہ ایسا تھا کہ اگر اُس پر قائم رہتا، اور ہماری مشیت ہوتی تو بڑا درجہ پاتا) مگر وہ پستی کی طرف جُھکا اور ہوائے نفس کی پیروی کی۔ تو اُس کی مثال کُتّے کی سی ہو گئی۔ مشقت میں ڈالو، جب بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ چھوڑ دو، جب بھی ایسا ہی کرے۔ ایسی ہی مثال اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں، تو (اے پیغمبر!) یہ حکایتیں لوگوں کو سُناؤ۔ تاکہ ان میں غور و فکر کریں۔ ۱۷۶

کیا ہی بُری مثال اُن لوگوں کی ہوئی جنھوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں! وہ اپنے ہاتھوں خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے! ۱۷۷

جس پر اللہ (کامیابی کی) راہ کھول دے، تو وہی راہ پر ہے، اور جس پر (کامیابی کی) راہ

يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ

۱۷۸ ۱۷۹ ۱۸۰

گم کر دے، تو ایسے ہی لوگ ہیں جو گھاٹے ٹوٹے میں پڑے! ۱۷۸

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا (یعنے بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے) ان کے پاس عقل ہے مگر اُس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں، مگر اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (عقل وحواس کا استعمال کھو کر) چارپایوں کی طرح ہو گئے۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب گئے ہیں! ۱۷۹

اور (دیکھو) اللہ کے لیے حُسن وخوبی کے نام ہیں (یعنے صفتیں ہیں) سو تم اُنہی ناموں سے اُسے پکارو، اور جو لوگ اُس کے ناموں میں کج اندیشیاں کرتے ہیں یعنے ایسی صفتیں گڑھتے ہیں جو اُس کے جمال و پاکی کے خلاف ہیں) تو انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ وقت دور نہیں کہ اپنے کیے کا بدلہ پالینگے۔ ۱۸۰

اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا، اُن میں ضرور ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے، جو لوگوں

(۲۶) قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت و سعادت کی راہ عقل وتفکر کی راہ ہے، اور گمراہی وشقاوت کا سرچشمہ جہل وکوری اور حواس وتفکر کو بیکار کر دینا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے، یا ہوا ئِ نفس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن وادراک کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں، وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے۔ (مزید تفصیل کے لیے تفسیر فاتحہ دیکھنی چاہیے)

چنانچہ یہاں انسان کی دماغی شقاوت کی اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے، جب بڑے بوڑھوں کے تقلیدی اثرات سے، یا ہوائِ نفس کے غلبہ سے، یا ذاتی طمع وبغض سے، وہ اس درجہ مغلوب ہو جاتا ہے کہ عقل وحواس کی ساری روشنیاں اُس کے لیے بیکار ہو جاتی ہیں۔

قرآن کہتا ہے، ایسا ہی گروہ جہنمی گروہ ہے۔

(۲۷) یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ معرفتِ حقیقت کی دو ہی راہیں ہیں: فکر اور نظر۔ "فکر" یہ کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور اپنے اندر سوچیں سمجھیں۔ "نظر" یہ کہ کارخانۂ ہستی کے عجائب ودقائق کا مشاہدہ کریں، اور اُس سے بصیرت حاصل کریں۔ جو شخص ان دونوں باتوں سے محروم ہے، وہ اندھا بہرا ہے، اور گمراہی سے لوٹنے والا نہیں۔

(۲۸) قرآن نے خدا کی صفتوں کا جو تصور ہم میں پیدا کرنا چاہا ہے، وہ سراسر حُسن وخوبی کا تصور ہے۔ چنانچہ وہ خدا کی تمام صفتوں کو "حُسنیٰ" قرار دیتا ہے۔ یعنے خوبی وجمال کی صفتیں۔ یہ صفتیں کیا ہیں؟ قرآن نے جابجا بیان کی ہیں

وَبِهِ يَعْدِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَأُمْلِي
لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِنْ جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝
أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ
قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ ۖ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ۝ مَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ

ع ۲۵ ‏ ۱۸۱-۱۸۲ ‏ ۱۸۳-۱۸۴ ‏ ۱۸۵ ‏ ۱۸۶-۷

کو سچائی کی راہ دکھاتا، اور سچائی ہی کے ساتھ ان میں انصاف بھی کرتا ہے۔ (۱۸۱)

اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں ہم انہیں درجہ بہ درجہ (آخری نتیجہ تک) لے جائینگے۔ اس طرح، کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوگی۔ (۱۸۲) ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں (یعنے ہمارا قانونِ جزا ایسا ہے کہ نتائج بہ تدریج ظہور میں آتے ہیں، اور مہلتوں پہ مہلتیں ملتی رہتی ہیں) اور ہماری مخفی تدبیر بڑی ہی مضبوط ہے! (۱۸۳)

کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا؟ ان کے رفیق کو (یعنے پیغمبر اسلام کو جو انہی میں پیدا ہوا، اور جس کی زندگی کی ہر بات ان کے سامنے ہی) کچھ دیوانگی تو نہیں لگ گئی ہے (کہ خواہ مخواہ ایک بات کے پیچھے پڑ کر سب کو اپنا دشمن بنالے) وہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ (انکار و بد عملی کی پاداش سے) کھلے طور پر خبردار کر دینے والا ہے! (۱۸۴)

پھر کیا یہ نظر اٹھا کر آسمان و زمین کی پادشاہی اور جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے، نہیں دیکھتے؟ نیز یہ بات کہ ہو سکتا ہے، ان کا (مقررہ) وقت قریب آگیا ہو؟ (اگر سوچنے سمجھنے کی یہ ساری باتیں انہیں ہشیار نہیں کر سکتیں، تو) پھر اس کے بعد اور کون سی بات ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائینگے؟ (۱۸۵)

اور شمار کی گئیں تو ۹۹ نکلیں۔ ان تمام صفتوں کے معانی پر غور کروگے، تو معلوم ہو جائیگا، قرآن کا تصور کس درجہ بلند اور کامل ہے۔ صرف ان صفات کے معانی پر تدبر کرکے ہم کائناتِ ہستی کے بے شمار اسرار و دقائق کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں جو کچھ ہے، انہی صفات کا ظہور ہے۔

(۲۹) آیت (۱۸۱) میں عرب کے اُن موحد اور راست باز انسانوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اپنا جوہرِ فکر و نظر ضائع نہیں کیا تھا، اور دعوتِ حق کے شناسا ثابت ہوئے تھے۔

(۳۰) آیت (۱۸۳) میں قانونِ امہال کی طرف اشارہ ہے، اور مفسدینِ مکہ کی نسبت خبر دی ہے کہ جزائے عمل کا قانون اُن کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ وہ بتدریج اُس نتیجہ تک پہنچ کر رہینگے جو انکار و سرکشی کا لازمی نتیجہ ہے۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ چند برسوں کے اندر قریشِ مکہ کی ساری طاقت نابود ہو گئی۔ (قانونِ امہال کے لیے دیکھو تفسیر فاتحہ)

(۳۱) داعیانِ حق کو ہمیشہ منکروں نے مجنون کہا ہے۔ پیغمبر اسلام کو بھی اشرارِ مکہ مجنون کہا کرتے تھے۔ آیت (۱۸۴) اور (۱۸۵) میں فرمایا۔ یہ منکر نہ تو فکر سے کام لیتے ہیں، نہ مشاہدہ و نظر سے۔ اگر فکر سے کام لیں، تو پیغمبر اسلام کی زندگی جو انہی میں پیدا ہوا اور انہی میں سے ہے، سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر نظر سے کام لیں، تو آسمان و زمین کا ایک ایک ذرہ خدا کی ہستی اور اس کے مقررہ قوانینِ خلقت کی شہادت دے رہا ہے۔

غور کرو۔ قرآن کا طریق تلقین و استدلال کیا ہے، اور مفسرین نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے! (تفصیل کے لیے دیکھو تفسیر فاتحہ)

۱۸۶ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ○ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسٰهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي ۖ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ۚ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ يَسْـَٔلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ ۱۸۷

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۚ

جس پر (کامیابی کی) راہ خدا گم کر دے (یعنے خدا کے ٹھہرائے ہوئے قانونِ نتائج کے مطابق کھو یا جائے) تو پھر اُس کے لیے کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ خدا (کے قانون) نے انہیں چھوڑ دیا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں! ۱۸۶

(اے پیغمبر!) لوگ تم سے (قیامت کے) آنے والے وقت کی نسبت پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کب قرار پائیگا؟ تم کہہ دو، اس کا علم تو میرے پروردگار کو ہے۔ وہی ہے جو اس بات کو اُس کے وقت پر نمایاں کرنے والا ہے۔ وہ بڑا بھاری حادثہ ہے جو آسمانوں اور زمین میں واقع ہوگا۔ وہ تم پر نہیں آئیگا مگر اچانک۔

(اے پیغمبر!) یہ لوگ تم سے اس طرح پوچھ رہے ہیں، گویا تم اس کی کاوش میں لگے ہوئے ہو۔ تم کہو، حقیقتِ حال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ صرف خدا ہی یہ بات جانتا ہے لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو اس حقیقت سے انجان ہیں۔ ۱۸۷

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو "میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضے میں نہیں رکھتا۔ وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا، اور (زندگی میں) کوئی گزند

(۴۲) مشرکین مکہ انکار و تمسخر کی راہ سے پوچھتے تھے، اگر سچ مچ قیامت آنے والی ہے تو کیوں نہیں بتلا دیتے کہ کب آئیگی؟ فرمایا: وقت کا علم تو اللہ کو ہے۔ تمہارے لیے اس قدر جان لینا کافی ہے کہ جب آئیگی تو اچانک آجائیگی۔ ڈھنڈورا پیٹ کر نہیں آئیگی۔

(۴۳) "ثقلت فی السمٰوٰت والارض" سے معلوم ہوا، وہ اجرامِ سماویہ کا ایک عظیم حادثہ ہوگا۔

اس آیت اور اس کی ہم معنی آیات سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ قیامت کے آثار و مقدمات کے بارے میں جتنی باتیں مسلمانوں میں مشہور ہوگئی ہیں، اُن کا بڑا حصہ بے اصل ہے۔ کیونکہ اگر ایک واقعہ سے بہت پہلے اُس کی ظاہر علامتیں یکے بعد دیگرے ظہور میں آنے والی ہوں، اور اُن کی خبر بھی دے دی گئی ہو، تو اُس واقعہ کا ہونا ناگہانی نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ قرآن قطعی طور پر کہتا ہے کہ لوگ یکسر بے خبر ہونگے اور قیامت اچانک نمودار ہوجائیگی۔

(۴۴) انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، تو لوگ چاہتے ہیں، اُسے انسانیت و بندگی کی سطح سے بلند کر کے کچھ ... لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام کی حیثیت ایسے صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کردی کہ ہمیشہ کے لیے اس گمراہی کا ازالہ ہوگیا۔ صرف یہی ایک بات آپ کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے۔ جو دنیا اپنے پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہشمند تھی، اسلام کے پیغمبر نے اُس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب داں تسلیم کر لو۔ زیادہ سے زیادہ بات جو اپنی نسبت

إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا ۚ فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۝

۱۸۹
۱۹۱-۱۹۰

مجھے نہ پہنچتا۔ میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے خبردار کر دینے والا اور بشارت دینے والا ہوں!"

۱۸۸

وہی (تمہارا پروردگار) ہے جس نے اکیلی جان سے تمہیں پیدا کیا (یعنے تمہارے قبیلوں اور گروہوں کا مورث اعلیٰ ایک فردِ واحد تھا) اور اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنا دیا (یعنے مرد ہی کی نسل سے عورت بھی پیدا ہوتی ہے) تاکہ وہ اُس کی رفاقت میں چین پائے۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ مرد عورت کی طرف ملتفت ہوا[1]، تو عورت کو حمل رہ جاتا ہے۔ پہلے حمل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور وہ وقت گزار دیتی ہے۔ پھر جب بوجھل ہو جاتی ہے، (اور وضع حمل کا وقت قریب آ لگتا ہے) تو مرد اور عورت، دونوں اللہ کے حضور دعا مانگتے ہیں کہ اُن کا پرورش کرنے والا ہے:

"خدایا! ہم دونوں تیرے شکرگزار ہونگے اگر ہمیں ایک تندرست بچہ عطا فرما دے!"

۱۸۹

سنائی، یہ بھی کہ انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کر دینے والا اور ایمان و نیک عملی کی برکتوں کی بشارت دینے والا ایک بندہ ہوں۔ اگر میں غیب داں ہوتا تو زندگی کا کوئی گزند مجھ نہ پہنچتا۔ مجھے کیا معلوم قیامت کب آئیگی"

کیا ایسے انسان کی زبان سے سچائی کے سوا کوئی بات نکل سکتی ہے؟

چہ عظمت دادہ یارب بخلق آں عظیم الشاں
کہ "انی عبدہٗ" گوید بجائے قولِ "سبحانی!"

۱۹۰

پھر جب خدا نے اُنہیں ایک تندرست فرزند دیدیا، تو جو چیز خدا نے دی، اُس میں دوسری ہستیوں کو شریک ٹھہرانے لگے۔ سو (یاد رکھو) یہ لوگ جیسی کچھ شرک کی باتیں کرتے ہیں۔ اس سے اللہ کی ذات بہت بلند ہے!

یہ لوگ خدا کے ساتھ کن ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں؟ ایسوں کو، جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے، اور

(۳۵) آیت (۱۸۹) میں مشرکوں کی یہ گمراہی واضح کی ہے کہ اپنی احتیاجوں اور مصیبتوں میں خدا سے التجائیں کرتے ہیں، لیکن جب مطلب حاصل ہو جاتا ہے، تو اُسے اُن آستانوں اور معبودوں کی بخشش سمجھنے لگتے ہیں جو اُنہوں نے ٹھہرا رکھے ہیں۔

چنانچہ مشرکین عرب مصیبتوں میں خدا ہی کو پکارتے تھے لیکن جب مصیبت ٹل جاتی، تو اپنے بنائے ہوئے آستانوں پر نذریں چڑھاتے اور اپنی اولاد کو اُن کی طرف منسوب کرتے اور کہتے یہ اُنہی کی بخشش ہے کہ ہمیں اولاد ملی۔

[1] تغشاها کے معنی یہ ہیں کہ جب "وہ ڈھانپ لیتا ہے" اور یہ عربی میں اُس بات کے لیے کنایہ ہے جسے ہم نے اُردو میں ملتفت ہونے سے ادا کیا ہے۔

وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ۝ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ ۚ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ ۖ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ ۝ إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ۝

۱۹۲ ۱۹۳ ۱۹۴ ۱۹۵ ۱۹۶

۱۹۱ خود کسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اُن میں نہ تو اِس کی طاقت کہ اِن کی مدد کریں۔ نہ اس کی کہ خود اپنی ذات ہی کو مدد پہنچائیں۔ ۱۹۲ اگر تم سیدھی راہ کی طرف بلاؤ تو تمہارے پیچھے قدم نہ اٹھا سکیں، اور تم انہیں پکارو یا چپ رہو، دونوں حالتوں کا نتیجہ تمہارے لیے یکساں ہو!

۱۹۳ (نادانو!) تم خدا کے سوا جن ہستیوں کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح خدا کے بندے ہیں۔ اگر تم (اپنے اس وہم میں) سچے ہو (کہ اُن میں ماورائے بشریت طاقتیں ہیں) تو اپنی احتیاجوں میں پکارو۔ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں!

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ شرک کی قسموں میں سے ایک قسم شرک فی التسمیہ ہے۔ یعنے غیر خدا کی طرف منسوب کرکے نام رکھنا۔ چنانچہ مشرکین عرب عبد العزیٰ، عبد الشمس، وغیرہا نام رکھتے تھے۔ اور افسوس ہے کہ مسلمان بھی اب اسی طرح کے نام رکھنے لگے ہیں۔

(۳۶) قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ روحانی اعتقاد کے ساتھ ایک بالاتر ہستی کو پکارنا، بندگی و نیاز کا ایک ایسا فعل ہے جو صرف خدا ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر کسی دوسری ہستی کے لیے کیا گیا، تو یہ شرک ہوگا۔ یہی مقام ہے جہاں پیروانِ مذاہب نے ٹھوکر کھائی۔ وہ توحید ربوبیت میں نہیں کھوئے گئے۔ کیونکہ خالق و رب خدا ہی کو مانتے تھے۔ توحیدِ الوہیت میں گمراہ ہوگئے۔ یعنے اپنی دعاؤں اور منتوں مرادوں کے لیے بہت سے آستانے بنا لیے جسے قرآن "اِلاہ" بنا لینے سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۹۴ کیا اِن (پتھر کی مورتیوں) کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہوں؟ ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہوں؟ آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہوں؟ کان ہیں جن سے سُنتے ہوں؟ (اے پیغمبر!) اِن لوگوں سے کہو (اگر تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک تمہاری مدد کر سکتے ہیں، تو) اُنہیں (جس قدر پکار سکتے ہو) پکار لو، پھر (میرے خلاف اپنی ساری) مخفی تدبیریں کر ڈالو، اور مجھے (اپنے جاتے) ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (پھر دیکھو، نتیجہ کیا نکلتا ہے)

۱۹۵ میرا کارساز تو بس اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی، اور وہی ہے جو نیک انسانوں کی کارسازی کرتا ہے! ۱۹۶

(۳۷) سورت کا مرکزِ موعظت یہ تھا کہ اوائل اسلام کی غربت و بے چارگی میں پیروانِ دعوت کو تسکین دی جائے، اور یہ حقیقت اُن کے دلوں پر نقش کر دی جائے کہ ظاہری اسباب کتنے ہی مخالف دکھائی دیتے ہوں بالآخر دعوتِ حق کی فتمندی یقینی ہے۔ مخالف جماعتیں جس قدر اپنی سرگرمی میں

۱۹۷ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ

۱۹۸ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ

۱۹۹ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ

۲۰۰-۲۰۱ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَيِّ ثُمَّ

بڑھتی جائینگی، اُتنا ہی زیادہ اُن کی تباہی کا وقت قریب آتا جائیگا۔

اب سورت کے تمام مواعظ پر دوبارہ نظر ڈالو، اور دیکھو

۱۹۷ کس طرح سورت کی ابتدا ہوئی، کس طرح سلسلۂ بیان کھلتا اور پھیلتا گیا، اور کس طرح دین حق کے تمام مہات و مقاصد اس پھیلاؤ میں سمٹ آئے، پھر کس طرح مرکزِ بیان برابر ایک ہی رہا؛ اور اب اُسی پر خاتمہ ہو رہا ہے!

چنانچہ یہاں واضح فرمایا کہ؛

۱۹۸ (ا) مشرکینِ مکہ دعوتِ حق کے خلاف کتنی ہی تدبیریں کریں کامیاب ہونے والی نہیں۔ کیونکہ اس مقابلہ میں حق تمہارے ساتھ ہے۔ اُن کے ساتھ نہیں۔

۱۹۹ (ب) جو لوگ تعصب اور ضد میں کھوئے گئے، وہ کبھی ماننے والے نہیں

(ج) تمہارا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ ہر حال میں نرمی اور درگذر کا شیوہ ملحوظ رکھو، اور نیکی کی دعوت دیتے رہو، مگر جاہلوں

۲۰۰ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

(د) اگر مخالفوں کے عناد، ناموافق حالات کے ہجوم، اور اپنی بے چارگی و بے نوائی کے تصور سے مایوس کن خیالات پیدا ہونے لگیں، تو سمجھ جاؤ، یہ شیطانی وسوسہ ہے، اور اللہ کی یاد سے اس کا علاج کرو۔

(ہ) اس وسوسہ خطرات سب کو گزرتے ہیں، مگر جو لوگ متقی ہیں،

۲۰۱ اُن کا ضمیر ایسا بیدار ہو جاتا ہے کہ جونہی کوئی وسوسہ گزرا، معاً چونک اُٹھے اور راستی و نیکی کی روشنی نمودار ہو گئی۔ مگر جو لوگ ایمان و تقوے سے محروم ہیں وہ اپنے آپ کو وساوس کے ہاتھوں چھوڑ دیتے ہیں۔ جدھر لیجائیں اور جہاں تک لیجائیں، کھنچے چلے جائینگے

تم اللہ کے سوا جنھیں پکارتے ہو، یاد رکھو، وہ نہ تو تمہاری مدد کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، نہ خود اپنی ہی مدد پر قادر ہیں۔

(اے پیغمبر![1]) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے رستے بلاؤ، تو کبھی تمہاری پکار نہ سنیں، تمہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری طرف تک رہے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ دیکھتے نہیں۔

(بہر حال) نرمی و درگزر سے کام لو، نیکی کا حکم دو، جاہلوں کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور اگر ایسا ہو کہ شیطان کی طرف سے وسوسہ کی کوئی خلش محسوس ہو، تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اُس سے پناہ طلب کرو۔ بلا شبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

جو لوگ متقی ہیں، اگر اُنہیں شیطان کی وسوسہ اندازی سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے، تو فوراً چونک اُٹھتے ہیں، اور پھر (پردۂ غفلت اِس طرح ہٹ جاتا ہے گویا) اچانک ان کی آنکھیں کھل گئیں!

مگر جو لوگ شیطانوں کے بھائی بند ہیں، تو اُنہیں وہ گمراہی میں کھینچے لیے جاتے ہیں، اور پھر

[1] قرآن کا یہ عام اسلوب بیان یاد رہے کہ خطاب پیغمبر سے ہوتا ہے، اور مقصود اس کے پیرو ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعد کی آیات نے یہ بات واضح کر دی ہے۔

لَا يُقْصِرُوْنَ ○ وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۲۰۲
مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ۲۰۳
فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّ ۲۰۴
دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ ۲۰۵
عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۲۰۶

اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے۔ ۲۰۲

اور (اے پیغمبر!) جب ایسا ہوتا ہے کہ تم اُن کے پاس کوئی نشانی لیکر نہ جاؤ (جیسی نشانیوں کی وہ فرمائشیں کیا کرتے ہیں) تو کہتے ہیں "کیوں کوئی نشانی پسند کرکے نہ چُن لی" (یعنے کیوں اپنے جی سے نہ بنالی) تم کہہ دو "حقیقت حال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے، اُس کی پیروی کرتا ہوں (میرے ارادے اور پسند کو اس میں کیا دخل؟) یہ (قرآن) تمہارے پروردگار کی طرف سے سرمایۂ دلائل ہے، اور اُن سب کے لیے جو یقین رکھنے والے ہیں، ہدایت اور رحمت!" ۲۰۳

(۵) کلام الٰہی کا جی لگاکر سننا، وساوس و خطرات کے اثرات دور کردیتا ہے۔

آیت (۱۹۹) جمات اصول میں سے ہے۔ چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کردیے: اخذ بالعفو، امر بالعروف، اعراض عن الجاہلین یعنے ناسمجھوں کی ناسمجھی بخشدینی، جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا، اور نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا۔ سرسری نظر میں پتہ نہیں لگیگا۔ اچھی طرح اور بار بار غور کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کونسا گوشہ ہے جس کی ساری عملی مشکلات ان تین اصلوں سے حل نہیں ہوجاتیں؟

(۸ ۳) آیت (۱۹۸) میں فرمایا حقیقت یہ ہے کہ تجھے دیکھتے نہیں، کیونکہ اگر دیکھتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ سو ایک دیکھنا سلمان فارسی کا تھا جو پہلی ہی نگاہ میں پکار اُٹھا: واللہ ماھذا بوجہ کذاب: خدا کی قسم، یہ صورت جھوٹے آدمی کی نہیں ہوسکتی۔ اور ایک دیکھنا ابوجہل کا تھا کہ مالھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق!

اور (مسلمانو!) جب قرآن پڑھا جائے، توجی لگاکر سنو اور چُپ رہو، تاکہ اللہ کی مہربانی کے مستحق ثابت ہو۔ ۲۰۴

اور (اے پیغمبر!) اپنے پروردگار کو صبح و شام یاد کیا کر۔ دل ہی دل میں عجز و نیاز کے ساتھ، ڈرتے ہوئے۔ اور زبان سے بھی، آہستہ آہستہ بغیر پکارے۔ اور ایسا نہ کرنا کہ غافلوں میں سے ہوجاؤ۔ ۲۰۵

جو اللہ کے حضور (مقرب) ہیں، وہ کبھی بڑائی میں آکر اُس کی بندگی سے نہیں جھجکتے۔ وہ اُس کی پاکی و ثنا میں زمزمہ سنج رہتے ہیں، اور اُسی کے آگے سربسجود ہوتے ہیں! ۲۰۶

الانفال (۸)

مدنی - ۷۵ - آیتیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یَسْــَٔلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ
وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ ۱
قُلُوْبُہُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْہِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْہُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ○ الَّذِیْنَ ۲
یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَہُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ ۳

(۱) مکہ میں جب پیغمبر اسلام کی دعوت کا ظہور ہوا، تو قدرتی طور پر دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک اُن لوگوں کا تھا جنھوں نے یہ دعوت قبول کی۔ دوسرا تمام قوم اور اُس کے سرداروں کا جو اس کے مخالف تھے۔ غور کرو، دونوں میں بناءِ نزاع کیا تھی! پیروانِ دعوت کہتے تھے، اُنہیں حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھیں اختیار کریں۔ مخالف کہتے تھے، اُنہیں یہ حق حاصل نہیں۔ یعنے وہ انسان کے اعتقاد وضمیر کی آزادی تسلیم نہیں کرتے تھے وہ چاہتے تھے، بزورِ شمشیر مسلمانوں کو اُنکے اعتقاد سے پھرا دیں۔

پیغمبر اسلام نے تیرہ برس تک ہر طرح کے مظالم برداشت کیے آخر جب مکہ میں زندہ رہنا دشوار ہو گیا، تو مدینہ چلے آئے لیکن قریش مکہ نے یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ پے در پے حملے شروع کر دیے۔

اب پیغمبر اسلام کے سامنے تین راہیں تھیں،

(ا) جس بات کو حق سمجھتے ہیں، اُس سے دست بردار ہو جائیں۔

(ب) اُس پر قائم رہیں مگر مسلمانوں کو قتل ہونے دیں۔

(ج) ظلم وتشدد کا مردانہ وار مقابلہ کریں، اور نتیجہ خدا کے ہاتھ چھوڑ دیں۔

اُنھوں نے تیسری راہ اختیار کی، اور نتیجہ وہی نکلا جو ہمیشہ نکل چکا ہے۔ یعنے حق فتح مند ہوا، اور ظالموں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

قرآن نے جس لڑائی کو جائز رکھا، اُس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

چونکہ لڑائی کی حالت پیش آگئی تھی، اس لیے اُس کے ضروری

(اے پیغمبر!) لوگ تم سے پوچھتے ہیں، مالِ غنیمت کے بارے میں کیا ہونا چاہیے؟ کہہ دو، مالِ غنیمت دراصل اللہ اور اُس کے رسول کا ہے پس اگر تم مومن ہو، تو چاہیے کہ (اس کی وجہ سے آپس میں جھگڑا نہ کرو) اللہ سے ڈرو، اپنا باہمی معاملہ درست رکھو، اور اُس کی اور اُس کے رسول کی اطاعت میں سرگرم ہو جاؤ۔

مومنوں کی شان تو یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دِل دہل جاتے ہیں، اور جب اُس کی آیتیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں، تو اُن کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں، اور وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں!

جو نماز قائم کرتے ہیں، اور ہم نے جو کچھ دے رکھا ہے، اس میں سے (ایک حصّہ ہماری راہ میں بھی) خرچ کرتے ہیں۔

بلاشبہ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے یہاں مرتبے ہیں! اور بخشائش! اور بڑی خوبی وعزت کی روزی!

رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَٰرِهُونَ ۝ يُجَٰدِلُونَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ ۝ وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَٰتِهِۦ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَٰفِرِينَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَٰطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝ إِذْ

احکام بیان کر دیے گئے۔ اس سورت میں اور اس کے بعد کی سورت میں تذکیر و موعظت کا مرکز یہی حالت ہے۔

(۲) مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے، وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ یعنے یہ بات نہیں ہونی چاہیے کہ جو جس کے ہاتھ پڑ گیا، وہ اُسی کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کر دینا چاہیے۔ وہ اُسے جماعت میں تقسیم کریگا۔

(۳) امن کی حالت ہو یا لڑائی کی، لیکن مسلمانوں کو بہرحال صلح و صفائی کے ساتھ رہنا چاہیے۔

(۴) ہر حال میں تقویٰ اور اطاعت اُن کا نصب العین ہو، کہ بغیر اس کے کامیابی ممکن نہیں۔

(۵) سچا مومن وہ ہے جس کی روح خدا پرستی سے معمور رہتی ہے جس کا ایمان گھٹنے کی جگہ برابر بڑھتا رہتا ہے، جو نماز قائم رکھتا اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔

(۶) یہ آیت اس باب میں قاطع ہے کہ قرآن کے نزدیک ایمان کی ہر حالت یکساں نہیں۔ وہ گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے، نفسِ تصدیق کے لحاظ سے سب برابر ہیں، کیفیت و یقین میں تفاوت ہے۔

(اس معاملہ کو بھی ویسا ہی سمجھ) جس طرح (جنگ بدر میں) یہ بات ہوئی تھی کہ تیرے پروردگار نے سچائی کے ساتھ تجھے تیرے گھر سے باہر نکالا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ مومنوں کا ایک گروہ اِس بات سے ناخوش تھا۔

وہ تجھ سے امرِ حق میں جھگڑنے لگا باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا۔ (وہ باہر نکل کر مقابل ہونے سے اس درجہ ناخوش تھے) گویا اُنہیں زبردستی موت کے مُنہ میں دھکیلا جا رہا ہے اور وہ (اپنی موت اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں!

اور (مسلمانو!) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا۔ (دشمنوں کی) دو جماعتوں میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ ضرور آئیگی۔ اور تمہارا حال یہ تھا کہ چاہتے تھے، جس جماعت میں لڑائی کی طاقت نہیں، (یعنے قافلہ والی) وہ ہاتھ آجائے، اور (خدا کا چاہنا دوسرا تھا) خدا چاہتا تھا، اپنے وعدہ کے ذریعہ حق کو ثابت کر دے اور دشمنانِ حق کی جڑ بنیادیں کاٹ کر رکھ دے!

(اور) یہ اِس لیے، تاکہ حق کو حق کر کے دکھلا دے، اور باطل کو باطل کر کے۔ اگرچہ (ظلم و فساد کے) مجرم ایسا ہونا پسند نہ کریں۔

جب ایسا ہوا تھا کہ (جنگ بدر کے موقعہ پر)

(۷) عرب جاہلیت میں دستور تھا کہ لڑائی میں جو مال جس کے ہاتھ

تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝ (۹) وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۱۰) إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۝ (۱۱) إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ

ع ۱۵

لگ جائے، وہ اسی کا سمجھا جاتا تھا۔ رومیوں میں بھی ایسا ہی دستور تھا، اور آج کل بھی یورپ کی تمام قوموں میں ایسا ہی قانون رائج ہے جس شہر یا قلعہ کو فوج حملہ کرکے فتح کر لیتی ہے، ایک خاص وقت تک اُسے لوٹنے کا اُسے حق ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزی فوج نے سرنگاپٹم، بھرت پور، اور حیدرآباد سندھ کو بے دریغ لوٹا، اور غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی فتح ہوئی، تو سات دن تک فوجیوں کو لوٹ مار کی اجازت دیدی گئی تھی۔ لیکن قرآن نے یہ حکم دے کر کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ لگے، حکومت (یعنے اسٹیٹ) کا ہے، نہ کہ لوٹنے والوں کا، سپاہیوں کی ذاتی طمع وحرص کے اُبھرنے کی راہ روک دی۔

چونکہ یہ نئی قسم کی سختی تھی، اس لیے ناگزیر تھا کہ لوگوں پر شاق گزرے۔ پس پہلے تقوے اور اطاعت کی تلقین کی، پھر سچے مومنوں کی شان بتلائی، پھر آیت (۵) میں فرمایا، اس معاملہ کو بھی ویسا ہی معاملہ سمجھو جیسا جنگ بدر میں پیش آیا تھا۔ لوگوں کی خواہش دوسری تھی۔ اللہ کے رسول کا فیصلہ دوسرا تھا لیکن بالآخر سب نے دیکھ لیا کہ حق بات وہی تھی جو اللہ کے رسول نے چاہی تھی۔

(۸) وہ معاملہ یہ تھا کہ ہجرت کے دوسرے سال جب رؤسائے مکہ نے مدینہ پر حملہ کیا، تو اُسی زمانہ میں اُن کا ایک تجارتی قافلہ بھی شام سے مکہ آ رہا تھا، اور مدینہ کے قرب وجوار سے ہو کر گزرنے والا تھا۔ پیغمبر اسلام نے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر فرمایا ایک گروہ مکہ سے آ رہا ہے۔ دوسرا قافلہ ہے۔ ان دو میں سے کسی ایک سے ضرور جنگ ہوگی، اور تم کامیاب ہوگے۔ چونکہ قافلہ کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی تھے، اس لیے مسلمانوں کی خواہش تھی کہ اسی سے مقابلہ ہو، مکہ والی فوج سے نہ لڑیں کیونکہ خود بڑی ہی کمزوری اور بے سروسامانی کی حالت میں تھے

---

(۹) تم نے اپنے پروردگار سے فریاد کی تھی، کہ ہماری مدد کر، اور اُس نے تمہاری فریاد سُن لی تھی۔ اُس نے کہا تھا "میں ایک ہزار فرشتوں سے کہ یکے بعد دیگرے آئینگے، تمہاری مدد کرونگا"

(۱۰) اور اللہ نے یہ بات جو کی، تو اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ (تمہارے لیے) خوشخبری ہو، اور تمہارے (مضطرب دل) قرار پا جائیں۔ ورنہ مدد تو (ہر حال میں) اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ بلاشبہ وہ (سب پر) غالب آنے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

(۱۱) جب ایسا ہوا تھا کہ اُس نے چھا جانے والی غنودگی تم پر طاری کر دی تھی کہ یہ اُس کی طرف سے تمہارے لیے تسکین وبے خوفی کا سامان تھا، اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمہیں پاک و صاف ہونے کا موقع دیدے، اور تم سے شیطان (کے وسوسوں) کی ناپاکی دور کر دے نیز تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھ جائے، اور (ریتلے میدانوں میں) قدم جما دے!

(اے پیغمبر!) یہ وہ وقت تھا کہ تیری پروردگار

فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ۱۲ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ۱۳ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ۝ ۱۴ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ۝ ۱۵ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ

مگر پیغمبر اسلام نے لوگوں کے ان خیالات کی کچھ پروا نہ کی، اور حملہ آوروں کے مقابلہ کا فیصلہ کرلیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تین سو تیرہ بے نواؤں نے رؤسا مکہ کے پورے لشکر کو شکست دیدی!

آیت (۷) میں "غیر ذات الشوکۃ" سے قافلہ والی جماعت مراد ہے۔ آیت (۶) میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ ایک فریق نے پیغمبر اسلام کا فیصلہ مان لیا تھا مگر دل میں سخت ہراساں تھا۔ نکلا تو اس طرح ڈرتا ہوا نکلا، گویا موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔

(۹) آیت (۱۰) سے واضح ہوگیا کہ فرشتوں والی بات صرف اس لیے تھی کہ کمزور مسلمانوں کے دل قرار پا جائیں۔ یہ بات نہ تھی کہ لڑائی کی فتح مندی میں اُسے کچھ دخل ہو۔ چنانچہ محققین تفسیر و حدیث اسی طرف گئے ہیں کہ فرشتوں کا نزول مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ہوا تھا۔ لڑائی میں اُنکی شرکت ثابت نہیں۔ نہ اس کی کوئی ضرورت پیش آئی تھی۔ اور آیت (۱۲) میں "فاضربوا" کا خطاب مسلمانوں سے ہے، نہ کہ فرشتوں سے۔ مسلمانوں کے دلوں کو تھامے رکھنے کے لیے جو فرشتوں کا نزول ہوا، اُس کی حقیقت کیا تھی؟ یہ معاملہ بھی عالم غیب کے حقائق سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم اپنے ذہن و ادراک سے اس کی حقیقت معلوم نہیں کرسکتے۔

(۱۰) بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی حالت بڑی ہی بے بسی اور کمزوری کی تھی۔ کل تین سو تیرہ آدمی لڑنے کے قابل تھے، اور اُن کا بھی یہ حال تھا کہ ایک آدمی کے سوا کسی کے پاس گھوڑا نہ تھا۔ پس قدرتی طور پر لوگ ہراساں ہوئے۔ اور جو دل کے کچے تھے، اُنہیں طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے۔ پھر بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ پانی کی جگہ ایک ہی تھی۔ اُس پر دشمن قابض ہوگیا۔ علاوہ بریں زمین ریتلی تھی۔ پانوں دھنس دھنس جاتے تھے۔ دشمن سوار تھے۔ اُن کا کچھ نہ بگڑتا۔ مسلمان پیدل تھے، اُن کے پانوں نہ جمتے۔

نے فرشتوں پر وحی کی تھی، میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنے میری مدد تمہارے ساتھ ہے) پس مومنوں کو استوار رکھو۔ عنقریب ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں (مومنوں کی) دہشت ڈال دونگا۔ سو (مسلمانو!) ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ! ان کے ہاتھ پانوں کی ایک ایک انگلی پر ضرب لگاؤ! ۱۲

اور یہ اس لیے، کہ اُنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کریگا، تو یاد رکھو، اللہ (پاداشِ عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے! ۱۳

(اے اعدائے حق!) یہ ہے سزا تمہارے لیے، تو اس کا مزہ چکھ لو، اور جان رکھو، منکرینِ حق کو آتشِ دوزخ کا عذاب بھی پیش آنے والا ہے! ۱۴

مسلمانو! جب کافروں کے لشکر سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہو جائے (یعنی وہ تم پر ہجوم کرکے چڑھ دوڑیں اور تم مقابل ہو) تو اُنہیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔ (سینہ سپر ہوکر مقابلہ کرو) ۱۵ اور جو کوئی ایسے موقعہ پر پیٹھ دکھلائیگا، تو سمجھ لو، وہ خدا کے غضب میں آگیا، اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہوا (اور جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا، تو)

١٦ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ

١٧ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○ ذَٰلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ

١٨ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ○ إِن تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ ۖ وَإِن تَنتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَ

١٩ إِن تَعُودُوا نَعُدْ وَلَن تُغْنِيَ عَنكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ○ ع ٢

اُس کے پہنچنے کی جگہ کیا ہی بُری جگہ ہے! مگر (ہاں جو کوئی لڑائی کی مصلحت سے ہٹ جائے، یا (اپنے گروہوں میں سے) کسی گروہ کے پاس جگہ لینی چاہے (اور اس لیے ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جائے، تو اس کا مضائقہ نہیں)

پھر کیا تم نے اُنہیں (جنگ میں) قتل کیا؟ نہیں خدا نے کیا (یعنے محض اُس کی تائید سے ایسا ہوا) اور (اے پیغمبر!) جب تم نے (میدانِ جنگ میں مٹھی بھر کر خاک) پھینکی، تو حقیقت یہ ہے کہ تم نے نہیں پھینکی تھی، خدا نے پھینکی تھی، اور یہ اس لیے ہوا تھا، تاکہ اُس کے ذریعہ ایمان والوں کو ایک بہتر آزمایش میں ڈال کر آزمائے۔ بلاشبہ اللہ سُننے والا علم رکھنے والا ہے!

یہ سب تو ہو چکا۔ اب سُن رکھو کہ اللہ کافروں کی مخفی تدبیروں کو (جو وہ دعوت حق کے مٹانے کے لیے کر رہے ہیں) کمزور کر دینے والا ہے!

(اے رؤساءِ مکہ) اگر تم فتح مندی کے ظہور کے طلبگار رہتے، تو دیکھ لو، فتح مندی تمہارے سامنے آگئی (یعنے جنگ بدر کے نتیجہ نے ہار جیت کا فیصلہ آشکارا کر دیا) اور اگر (آئندہ لڑائی سے) باز آجاؤ، تو

آیت (۱۱) میں فرمایا۔ غور کرو۔ خدا کی کارسازی نے کس طرح یہ ساری مشکلیں حل کر دیں؟ اُس نے دلوں کو چین دینے کے لیے تم سب پر نیند غالب کر دی۔ اُٹھے، تو دل کا سارا خوف و ہراس دور ہو چکا تھا چنانچہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ بدر کی پہلی رات کوئی نہ تھا جو آرام سے سو نہ گیا ہو۔ اِن آنحضرت رات بھر عبادت کرتے رہے (بیہقی فی الدلائل) اور معلوم ہے جس کے دل میں خوف و خطر ہو، وہ کبھی آرام سے سو نہیں سکتا۔ پس اس نیند کا طاری ہو جانا بے خوفی کا القا تھا۔ پھر عین موقع پر بارش ہو گئی اور افراط کے ساتھ سب کو پانی میسر آگیا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ نہا دھو کر صاف ستھرے ہو گئے۔ کوئی نہ تھا جو چست و چاق اور تازہ دم نہ ہو گیا ہو۔ بارش کی وجہ سے ریت بھی جم کر سخت ہو گئی۔ پاؤں کے دھنس دھنس جانے کا اندیشہ جاتا رہا۔ اپنی کامیابی کی طرف سے بے اعتقادی و مایوسی جو در اصل شیطانی وسوسے کی ناپاکی تھی، اب کسی کے دل میں باقی نہیں رہی!

آج کل فن جنگ میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سپاہیوں کی اسپرٹ یعنے معنوی قویٰ درست رکھے جائیں۔ یہاں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صرف اس بات نے کہ پانی کی ضرورت باقی نہیں رہی، ریت میں دھنسنے کا خطرہ جاتا رہا، اور نہا دھو لینے کی وجہ سے جسم میں تازگی آگئی، لوگوں کے اندر جس درجہ خود اعتمادی اور سرگرمی پیدا کر دی ہوگی، اُس کا اندازہ صرف اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جنگ واٹرلو کے تمام مؤرخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کی درمیانی رات میں بارش نہ ہوئی ہوتی، تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا کیونکہ اس صورت میں نپولین کو زمین خشک ہونے کا بارہ بجے تک انتظار نہ کرنا پڑتا۔ سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَا تَوَلَّوْا۟ عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ قَالُوا۟ سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝ إِنَّ شَرَّ ٱلدَّوَآبِّ عِندَ ٱللَّهِ ٱلصُّمُّ ٱلْبُكْمُ ٱلَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَلَوْ عَلِمَ ٱللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا۟ وَّهُم مُّعْرِضُونَ ۝ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَجِيبُوا۟ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ

۲۰ ۲۱ ۲۲-۲۳

تمہارے لیے بہتری کی بات یہی ہے۔ اور اگر پھر یہی چال چلے، تو ہم بھی چلینگے۔ اور یاد رکھو، تمہارا جتھا تمہارے کچھ کام نہ آئیگا اگرچہ بہت سے آدمی اکٹھے کر لو۔ یقین کرو، اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے! ۱۹

مسلمانو! اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اُس سے روگردانی نہ کرو، اور تم (صدائے حق) سُن رہے ہو! ۲۰

اور دیکھو، اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے (زبان سے) کہا تھا "ہم نے سُنا" اور واقعہ یہ تھا کہ وہ سنتے نہ تھے! ۲۱

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہو گئے، جو کچھ سمجھتے نہیں! ۲۲

اور اگر اللہ دیکھتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے (یعنے ان میں فہم و قبولِ حق کی کچھ بھی استعداد باقی ہے) تو ضرور اُنہیں سُنوا دیتا، اور اگر وہ اُنہیں سُنوا دے (حالانکہ وہ جانتا ہے کہ قبولیت کی استعداد کھو چکے ہیں) تو نتیجہ یہی نکلیگا کہ اُس سے منہ پھیر لینگے، اور وہ اس سے پھرے ہوئے ہیں۔ ۲۳

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو، جب وہ پکارتا ہے، تاکہ تمہیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کر دے، اور جان لو کہ (بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ) اللہ (اپنے ٹھہرائے ہوئے قوانین و اسباب کے ذریعہ) انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل

پہنچنے سے پہلے دشمن کو شکست ہو جاتی۔

واقعہ یہ ہے اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا، لیکن اگر بدر میں نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ اُلٹ جاتا۔ اسی طرف پیغمبر اسلام نے اپنی دعا میں اشارہ کیا تھا: اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض: خدایا! اگر خدام حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہو گئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گذار کوئی نہیں رہیگا!

(۱۲) آیت (۱۵) سے جو اوپر گزر چکی ہے، معلوم ہوا کہ اگر دشمن جمع ہو کر مسلمانوں پر چڑھ دوڑیں، تو لڑائی سے بھاگنا مسلمانوں کے لیے سخت گناہ کی بات ہے اور اس کے لیے بڑی ہی سخت وعید آئی ہے۔

لیکن اگر دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہو تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ — اسی سورت کی آیت (۶۶) سے معلوم ہوا کہ میدان جنگ میں ایک مسلمان کو کم از کم دو دشمنوں پر بھاری ہونا چاہیے۔

۲۴ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوا

۲۵ أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ

۲۶ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

۲۷ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَاعْلَمُوا

۲۸ أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

ع ۹ / ۱۷

پس اگر دشمن دو گنے سے بھی زیادہ ہوں، اور مسلمان لڑنے میں مصلحت دیکھیں، تو ایسا کر سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں بھی عزیمت یہی ہوگی کہ خدا پر بھروسہ رکھیں اور لڑنے سے منہ نہ موڑیں۔

۲۴ اس حکم کو خاص جنگ بدر کے لیے سمجھنا صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا، اور آیت میں "یومئذ" سے مراد لڑائی کا وقت ہے۔ نہ کہ جنگ بدر کا دن۔

۲۵ (۱۳) آیت (۱۸) میں فرمایا۔ میدان جنگ کا فیصلہ تو ہو چکا۔ اب رہیں دشمنوں کی خفیہ تدبیریں، تو وہ بھی سست پڑ جائینگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بدر کے بعد قریش مکہ کی کوئی تدبیر بھی اُنکے لیے سود مند نہ ہوئی۔

(۱۴) کفار مکہ کہا کرتے تھے۔ اگر خدا تمہیں فتح مند کرنے والا ہے تو وہ فتح مندی کہاں ہے؟ خود جنگ بدر میں ابوجہل نے دعا مانگی تھی۔ خدایا! دونوں میں سے جو دین تجھے زیادہ پسند ہو، اُس کے ماننے والوں کو فتح مند کر! پس آیت (۱۹) میں فرمایا۔

۲۶ اگر اسی بات کے طلب گار رہے، تو وہ ظہور میں آگئی، اور اہل حق کو خدا نے فتح مند کر دیا۔

نیز فرمایا "اگر باز آجاؤ" یعنے اگر اب بھی ظلم و سرکشی سے باز آجاؤ، اور محض اختلاف دین کی بنا پر مسلمانوں کی ہلاکت کے درپے نہ ہو، تو تمہارے لیے سراسر بہتری ہے۔ اس سے اندازہ کرو کہ کس طرح پیغمبر اسلام نے آخر تک جنگ و خونریزی کو بچانا

۲۷ چاہا، اور فتح و کامرانی کے بعد بھی امن و صلح کی دعوت دیتے رہے؟ اگر جنگ بدر کے بعد قریش مکہ ظلم و عداوت سے باز آجاتے، تو ظاہر ہے، بعد کی جنگوں کی نوبت ہرگز نہ آتی۔ اگرچہ نتیجہ وہی نکلتا یعنے اسلام کی دعوت تمام جزیرۂ عرب کو فتح کر لیتی۔

(۱۵) آیت (۲۱) میں اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے کہ

۲۸ تورات و انجیل سنتے تھے، مگر حقیقۃً نہیں سنتے تھے، کیونکہ اگر سمجھ کر

ہو جاتا ہے، اور جان لو کہ (آخر کار) اُسی کے حضور جمع کیے جاؤ گے!

اور اُس فتنے سے بچتے رہو، جو اگر اُٹھا تو اُس کی زد صرف اُنھی پر نہیں پڑیگی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں، بلکہ سبھی اُس کی لپیٹ میں آجائیں گے، اور جان لو کہ اللہ (بدعملیوں کی) سزا دینے میں سخت ہے!

اور وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ تم اُس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اُچک نہ لے جائیں۔ پھر اللہ نے تمہیں (مدینہ میں) ٹھکانا دیا، اپنی مددگاری سے قوت بخشی، اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا، تاکہ تم شکرگزار رہو!

مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ خیانت کرو، اور نہ یہ کہ آپس کی امانتوں میں خیانت کرو، اور تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو۔

اور یاد رکھو، تمہارا مال اور تمہاری اولاد (تمہارے لیے) ایک آزمایش ہے، اور یہ بھی نہ بھولو کہ اللہ ہی ہے جس کے پاس (بخشنے کے لیے) بہت بڑا اجر ہے!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ۲۹ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ ۳۰ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ ۳۱ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ

سمجھتے و عمل کرتے۔

افسوس، مسلمانوں کا بھی قرآن سننا ویسا ہی سننا ہوگیا۔ وہ سمجھتے ہیں، جن حرفوں کی آوازوں سے قرآن کے الفاظ بنے ہیں، انہیں کسی نہ کسی طرح کان میں ڈال لینا، سماعِ قرآن ہے۔ اس سے زیادہ کسی بات کی ضرورت نہیں۔

(۱۶) آیت (۲۲) سے جلد نہ گزر جاؤ۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن کے ہر صفحہ اور ہر بیان میں بار بار نمایاں ہوئی ہے۔ یعنے اس کی دعوت سرتاسر تعقل و تفکر کی دعوت ہے۔ جو انسان اپنے حواس و عقل سے کام نہیں لیتا، وہ اس کے نزدیک انسان نہیں، بدترین چارپایہ ہے۔ نیز وہ فکر و عمل کی جس حالت کو کفر کی حالت قرار دیتا ہے، اُس کا سرچشمہ یہی عقل و حواس کا تعطل ہے۔

(۱۷) آیت (۲۴) میں فرمایا، پیغمبر اسلام کی دعوت اس لیے ہے کہ تمہیں زندہ کرے۔ یعنے وہ انسانیتِ اعلیٰ کے انبعاث و قیام کی دعوت ہے۔ غور کرو، اس دعوت نے وقت کی تمام مردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اُٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا تھا؟ اس سے بڑھ کر مُردوں کو جلانا اور کیا ہوگا کہ عرب کے ساربانوں میں ابوبکر، عمر، علی، عائشہ، خالد، ابن وقاص، ابن العاص (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابرِ عالم پیدا ہوگئے، اور پچاس برس کے اندر کرۂ ارضی کی سب سے بڑی مہذب و اشرف قوم عرب کے وحشی تھے!

پھر فرمایا، یہ بات نہ بھولو کہ انسان کے افکار و افعال میں حکمتِ الٰہی کا ایک خاص قانون کام کر رہا ہے۔ بسا اوقات اُس کے ارادوں اور اُس کے دل کے جذبوں اور انفعالوں کے درمیان اچانک کوئی غیر متوقع بات آکر حائل ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک اچھائی سے بُرائی میں جا پڑتا ہے

مسلمانو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو (اور اُس کی نافرمانی سے بچو) تو وہ تمہارے لیے (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والی ایک قوت پیدا کر دیگا، اور تم سے تمہاری بُرائیاں دور کر دیگا اور بخشدیگا۔ اللہ تو بہت بڑا فضل کرنے والا ہے! ۲۹

اور (اے پیغمبر!) وہ وقت یاد کر جب (مکہ میں) کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے، تاکہ تجھے گرفتار کر رکھیں، یا قتل کر ڈالیں، یا جلاوطن کر دیں۔ اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے، اور اللہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہا تھا۔ اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے! ۳۰

اور جب اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں، تو کہتے ہیں "ہاں، ہم نے سُن لیا۔ اگر چاہیں تو ہم بھی اس طرح کی باتیں کہہ لیں۔ یہ اس کے سوا کیا ہے کہ جو پہلے گزر چکے، اُن کی لکھی ہوئی داستانیں ہیں" ۳۱

اور (اے پیغمبر!) جب ایسا ہوا تھا کہ (کفا مکہ نے) کہا تھا "خدایا! اگر یہ بات (یعنے پیغمبر اسلام کی دعوت) تیری جانب سے امرِ حق ہے"

۳۲ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ

۳۳ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ

هُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَ

۳۴ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا

الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک بُرائی سے بھلائی میں آنکلتا ہے چنانچہ کتنے ہی اچھے ارادے ہیں جن سے عین وقت پر ہمارے دل نے انکار کر دیا، اور کتنے ہی بُرائی کے منصوبے ہیں جن سے اچانک ہمارے دل نے بغاوت کر دی پس چاہیے کہ انسان اپنے دل کی نگرانی سے کبھی غافل نہ ہو۔ ۳۲

نیز کہا - یہ بھی نہ بھولو کہ خدا کے حضور لوٹنا ہے کیونکہ جس دل میں آخرت کا یقین ہوگا، وہ زندگی کی غفلتوں سے کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔ ۳۳

(۱۸) پچھلی آیات میں انفرادی زندگی کے خطرات سے متنبہ کیا تھا - اب (۲۵) میں اجتماعی خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اُن فتنوں سے بچو جنہیں سوسائٹی کا کوئی ایک فرد یا ایک جماعت برپا کر دیتی ہے، لیکن جب اُن کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، تو صرف اُنہی کو نہیں جلاتی جنہوں نے سُلگائی تھی، سبھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں، اور اس لیے آ جاتے ہیں کہ کیوں آگ لگانیوالے کا ہاتھ نہیں پکڑا؟ کیوں بر وقت بجھانے کی کوشش نہیں کی؟

(۱۹) آیت (۲۷) میں خیانت سے مقصود وہ تمام خیانتیں ہیں جو اسلام کے احکام کی تعمیل و تبلیغ اور اُمت کے مصالح و مقاصد میں کی جائیں لیکن خصوصیت کے ساتھ جس بات کی طرف اشارہ کیا، وہ یہ تھی کہ اہل مکہ کے ساتھ نامہ و پیام نہ رکھو جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے، اگرچہ یہ نامہ و پیام اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کے خیال ہی سے کیوں نہ ہو۔ ۳۴

بعض مہاجرین نے اپنے اہل و عیال کو جو مکہ میں تھے خطوط لکھے تھے۔ اُس میں کچھ اشارہ جنگ کی نسبت بھی آ گیا تھا فرمایا، یہ اللہ کی، رسول کی اور مسلمانوں کی خیانت ہے۔ ۳۵

تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا دے، یا ہمیں (کسی دوسرے) عذابِ دردناک میں مبتلا کر!"

اور اللہ ایسا کرنے والا نہ تھا کہ تو اُن کے درمیان موجود ہو اور پھر اُنہیں عذاب میں ڈالے، اور اللہ ایسا بھی کرنے والا نہیں کہ اُنہیں عذاب میں ڈالے حالانکہ وہ معافی مانگ رہے ہوں۔

لیکن (اب کہ تجھے مکہ چھوڑ دینے پر اُنہوں نے مجبور کر دیا) کونسی بات رہ گئی ہے کہ اُنہیں عذاب نہ دے، حالانکہ وہ مسجدِ حرام سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اُس کے متولی ہونے کے لائق نہیں۔ اُس کے متولی اگر ہو سکتے ہیں تو ایسے ہی لوگ ہو سکتے ہیں جو متقی ہوں۔ (نہ کہ مفسد و ظالم) لیکن اُن میں سے اکثروں کو (یہ حقیقت) معلوم نہیں۔

اور خانۂ کعبہ میں اِن کی نماز اس کے سوا کیا تھی کہ سیٹیاں بجائیں اور تالیاں پیٹیں! تو دیکھو جیسے کچھ کفر کرتے رہے ہو، اب (اُس کی پاداش میں) عذاب کا مزہ چکھ لو!

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ اپنا

اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۝ۙ (۳۶) لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ۧ (۳۷) قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (۳۸)

مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکیں، تو یہ لوگ آئندہ بھی (اسی طرح) خرچ کرینگے، لیکن پھر (وقت آئیگا کہ یہ مال خرچ کرنا) ان کے لیے سراسر پچتاوا ہوگا، اور پھر (بالآخر) مغلوب کیے جائینگے!

اور (یاد رکھو) جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی (اور آخر تک اس پر جمے رہے، تو) وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائینگے۔ (۳۶)

اور یہ اس لیے ہوگا کہ اللہ ناپاک (روحوں) کو پاک (روحوں) سے جُدا کردے، اور جو ناپاک ہیں، اُن میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دے، پھر سب کو (اپنی تباہ حالیوں میں) اکٹھا کردے، پھر (قیامت کے دن) اس (جمع شدہ گروہ) کو دوزخ کے حوالے کرے۔ یہی لوگ ہیں یکسر تباہ ہوجانے والے! (۳۷)

(اے پیغمبر!) جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تم اُن سے کہدو، اگر وہ (اب بھی) باز آجائیں، تو جو کچھ گذر چکا، معاف کردیا جائیگا، لیکن اگر وہ پھر (ظلم و جنگ کی طرف) لوٹے، تو (اس بارے میں) پچھلوں کا طور طریقہ اور اُس کا نتیجہ گذر چکا ہے (اور وہی انہیں بھی پیش آکر رہیگا!) (۳۸)

اور (مسلمانو! اب تمہارے لیے صرف یہی چارہ کار رہ گیا ہے کہ) اُن سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ ظلم و فساد باقی نہ رہے، اور دین کا سارا معاملہ اللہ ہی کے لیے ہوجائے (یعنے دین کا معاملہ

گر صرف اتنی سی بات اللہ اور رسول کی خیانت تھی، تو غور کرو، اُن مسلمانوں کے لیے کیا حکم ہونا چاہیے جو اپنی ساری زندگیاں اعدائے ملت کی سیاسی خدمات میں صرف کر ڈالتے ہیں، اور جو ڈیڑھ سو برس سے بے شمار اسلامی حکومتوں کے زوال و انقراض کا باعث ہوئے ہیں!

(۳۰) آیت (۲۹) سے معلوم ہوا جو جماعت متقی ہوگی، اس میں حق و باطل اور خیر و شر کے امتیاز کی ایک خاص قوت پیدا ہوجائیگی، اور اس لیے کبھی باطل و شر کی طرف قدم نہیں اٹھائیگی۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس اعتبار سے صدر اول کے مسلمانوں کا کیا حال تھا؟ عرب کے صحرا نشین جن کی ساری زندگیاں اونٹ چرانے میں بسر ہوئی تھیں، یکایک ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی قسمتوں کے مالک ہوگئے، لیکن خیر و شر میں امتیاز کی ایک ایسی قوت اُن کے قبضہ میں آگئی تھی کہ جو کچھ کرتے تھے اور جس طرح کرتے تھے، وہ حق و عدالت اور خیر و سعادت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا!

۳۹ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ○ ۴۰ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ ۴۱ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ

وہ زمانہ کیا ہوا جب مری آہ میں اثر تھا
یہی چشم خوں فشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا!

(۲۱) آیت (۴۰) پر غور کرو۔ انسان اپنے جہل و غفلت کی سرشاریوں میں کیا سوچتا ہے، اور حکمت الٰہی کی مخفی تدبیروں کا فیصلہ کیا ہوتا ہے! جب ہجرت سے پہلے قریش مکہ لے یہ منصوبے باندھے تھے تو کیا ایک لمحہ کے لیے اُنہیں آنے والے نتائج کا گمان ہو سکتا تھا! مگر کس طرح خود اُنہی کے ظلم و عداوت نے اُن کا سارا سر و سامان کر دیا! اگر ظلم نہ ہوتا تو ہجرت بھی نہ ہوتی، اور اگر ہجرت نہ ہوتی، تو وہ تمام نتائج بھی ظہور میں نہ آتے جو ہجرت سے ظہور میں آئے۔ یہی ہی صورتِ حال قانونِ الٰہی کی مخفی تدبیر ہے جو انسانی ظلم و فساد کی ساری تدبیریں ملیا میٹ کر دیتی ہے!

(۲۲) آیت (۳۲) میں ابوجہل وغیرہ صنادید قریش کی طرف اشارہ ہے کہ اُنہوں نے کہا تھا۔ خدایا! اگر قرآن واقعی تیری جانب سے ہے اور ہم اسے جھٹلانے میں سچے نہیں تو ہم پر اپنا عذاب نازل کر (بخاری) فرمایا، یہ خدا کی سنت نہیں کہ وہ ایک قوم پر عذاب نازل کرے حالانکہ داعیِ حق اس میں موجود ہو اور نہ اُس کا عذاب ایسی حالت میں نازل ہو سکتا ہے کہ استغفار کرنے والے موجود ہوں۔

پھر آیت (۳۴) میں فرمایا، اب کہ پیغمبر اسلام کو انہوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا، اور اُن کی سرکشی یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ خدا کے بندوں کو اس کی عبادت گاہ سے بجبر روکنے لگے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اِس عمل کی نمود میں تاخیر ہو۔ چنانچہ وہ ظاہر ہوا اور قریش مکہ کے جماعتی اقبال کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

(۲۳) اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو لوگ متقی نہیں وہ عبادت گاہوں کی تولیت کے حقدار نہیں۔

(۲۴) آیت (۳۸) عفو و بخشش اور دعوت امن و صلح کی انتہا ہے۔ اس سے اندازہ کرو کہ دعوتِ اسلام کا اپنے دشمنوں کے

خدا اور انسان کا باہمی معاملہ ہو جائے۔ انسان کا ظلم اس میں مداخلت نہ کر سکے) پھر اگر ایسا ہو کہ وہ (جنگ سے) باز آجائیں، تو جو کچھ وہ کرتے ہیں، خدا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور اگر (صلح و درگزر کی اس آخری دعوت سے بھی) روگردانی کریں، تو یاد رکھو، اللہ تمہارا رفیق و کارساز ہے (اور جس کا رفیق اللہ ہو تو) کیا ہی اچھا رفیق ہے، اور کیا ہی اچھا مددگار!

اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مال غنیمت میں ملے اُس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے، رسول کے لیے (رسول کے) قرابت داروں کے لیے، یتیموں کے لیے، مسکینوں کے لیے، اور مسافروں کے لیے نکالنا چاہیے (اور بقیہ چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں) اگر تم اللہ پر اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو جو ہم نے فیصلہ کر دینے والے دن اپنے بندے پر نازل کی تھی، جبکہ دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے[1]، تو چاہیے کہ اس تقسیم پر کاربند رہو۔ اور (یاد رکھو) اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں!

یہ وہ دن تھا کہ تم اِدھر قریب کے ناکے پر تھے اُدھر دشمن دور کے ناکے پر، اور قافلہ تم سے نچلے حصے میں تھا (یعنے سمندر کے کنارے کنارے نکل گیا

[1] یعنے جنگ بدر کے دن۔

وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ ۴۲ إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ ۴۳ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ ۴۴ ع يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا

تھا) اور اگر تم نے آپس میں لڑائی کی بات ٹھہرائی ہوتی، تو ضرور میعادِ جنگ سے گریز کرتے (کیونکہ تمہیں دشمنوں کی کثرت سے اندیشہ تھا اور تم میں سے بہتوں کی نظر قافلہ پر تھی) لیکن اللہ نے دونوں لشکروں کو بھڑا دیا تاکہ جو بات ہونے والی تھی اُسے کر دکھائے نیز اس لیے کہ جسے ہلاک ہونا ہے اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو، اور جو زندہ رہنے والا ہے، اتمامِ حجت کے بعد زندہ رہے، اور بلاشبہ اللہ سب کی سُنتا اور سب کچھ جانتا ہے! ۴۲

...چھپا رہا: اور کس طرح مجبور و بے بس ہو کر اُسے میدانِ جنگ میں جمنا پڑا!

(۴۵) سورت کے ابتداء میں فرمایا تھا کہ مالِ غنیمت اللہ اور اُس کے رسول کا ہے یعنے حکومت کا ہے۔ اب آیت (۴۱) میں اس کی تقسیم کا طریقہ بتلا دیا۔ اللہ اور اس کے رسول کے حصّہ سے مقصود یہ ہے کہ دین و ملت کے مصالح کے لیے ایک خاص رقم رکھی جائے۔ اسی میں سے پیغمبرِ اسلام کو جب تک زندہ ہیں، ضروری مصارف ملیں۔ ان کے بعد ائمۂ مسلمین کو۔

(۴۶) اس آیت اور اس کی ہم معنی آیات نے واضح کر دیا کہ قرآن کے نزدیک حکومت (اسٹیٹ) یتیموں، مسکینوں، اور مصیبت زدوں کی خبرگیری کے لیے ذمہ دار ہے، اور حکومت کے خزانہ کا ایک لازمی مصرف قوم کے اِن افراد کی اعانت ہے۔

(اور اے پیغمبر!) یہ وہ دن تھا کہ اللہ نے تجھے خواب میں اُن کی تعداد تھوڑی کر کے دکھائی (یعنے یہ دکھلایا کہ اگرچہ بظاہر مسلمانوں سے زیادہ ہونگے لیکن عزم و ثبات میں تھوڑے ثابت ہونگے) اور اگر اُنہیں بہت کر کے دکھاتا، تو (مسلمانو!) تم ضرور ہمت ہار دیتے اور اس معاملہ میں جھگڑنے لگتے۔ اللہ نے تمہیں اس صورتِ حال سے بچا لیا یقین کرو، جو کچھ انسان کے سینوں میں چھپا ہوتا ہے، وہ اُس کے علم سے پوشیدہ نہیں! ۴۳

اور (پھر دیکھو) جب تم دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے، اور اللہ نے ایسا کیا تھا کہ دشمن تمہاری نظروں میں تھوڑے دکھائی دیے، (کیونکہ تمہارے دلوں میں ایمان و استقامت کی روح پیدا ہو گئی تھی) اور اُن کی نظروں میں تم تھوڑے دکھائی دیے (کیونکہ بظاہر تعداد میں وہی زیادہ تھے) اور یہ اس لیے کیا تھا، تاکہ جو بات ہونے والی تھی اُسے کر دکھائے، اور سارے کاموں کا دار و مدار اللہ ہی کی ذات پر ہے! ۴۴

مسلمانو! جب (حملہ آوروں کی) کسی جماعت

(۴۷) آیت (۴۲) میں جنگِ بدر کے اُسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کا پہلے ذکر گزر چکا ہے۔ فرمایا، خدا کی مخفی تدبیروں

۴۵ لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا

۴۶ فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا

۴۷ مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ

فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ

کی کرشمہ سازی دیکھو۔ اُدھر دشمنوں کا گروہ بڑھا چلا آتا تھا، اِدھر تم شہر سے نکل کر ایک قریبی نالے تک پہنچے تھے، اور ابو سفیان کا قافلہ تھا کہ نشیب میں گزر رہا تھا۔ تم اپنی کمزوری کی وجہ سے چاہتے تھے، اُس سے مقابلہ ہو، لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قافلہ تو نکل گیا، اور مقابلہ پڑا حملہ آوروں سے۔ اور تمہاری مٹھی بھر کمزور جماعت نے اُسے ہرا کر بھگا دیا!

(۲۸) آیت (۴۳) میں اُس خواب کی طرف اشارہ کیا ہے جو جنگ بدر سے پہلے پیغمبر اسلامؐ نے دیکھا تھا، اور جس میں دشمن ناکام اور مسلمان فتح مند دکھائے گئے تھے۔ یہ خواب مسلمانوں کے لیے مزید تقویت کا باعث ہوا تھا۔

(۲۹) آیت (۴۵) سے (۴۷) تک چھ باتوں پر زور دیا ہے کہ فتح و کامرانی کا اصلی سرچشمہ ہیں:

(ا) ثابت قدم رہو۔ کیونکہ میدانِ جنگ کی ساری کامیابی اُسی کے لیے ہوتی ہے جو آخر تک ثابت قدم رہے۔

(ب) بہت زیادہ اللہ کو یاد کرو۔ کیونکہ جسم کا ثبات دل کے ثبات پر موقوف ہے اور دل اُسی کا مضبوط رہیگا جو اللہ پر کامل ایمان رکھتا ہے۔

(ج) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور رسول کے بعد اپنے امام و سردار کی، کیونکہ بغیر اطاعت (ڈسپلن) کے کوئی جماعت کامیاب نہیں ہوسکتی۔

(د) باہمی نزاع سے بچو ورنہ سست پڑجاؤگے اور بات بگڑ جائیگی۔

(ہ) کتنی ہی مشکلیں پیش آئیں جھیلتے رہو۔ بالآخر جیت اُسی کی ہے جو زیادہ جھیلنے والا ہوگا۔

(و) کافروں کا سا چلن اختیار نہ کرو جو ایمان و راستی کی جگہ گھمنڈ اور دکھاوے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ تمہارے کاموں کی بنا خدا پرستانہ عجز و اخلاص پر ہونی چاہیے۔

سے تمہارا مقابلہ ہوجائے، تو لڑائی میں ثابت قدم رہو، اور زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو!

اور اللہ اور اُس کے رسول کا کہا مانو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ایسا کروگے تو تمہاری طاقت سُست پڑجائیگی اور ہوا اُکھڑ جائیگی، اور (جیسی کچھ بھی مشکلیں مصیبتیں پیش آئیں، تم) صبر کرو۔ بلا شبہ اللہ اُن کا ساتھی ہے جو صبر کرنے والے ہیں!

اور (دیکھو) اُن لوگوں جیسے نہ ہوجاؤ جو اپنے گھروں سے (لڑنے کے لیے) اِتراتے ہوئے اور لوگوں کی نظروں میں نمائش کرتے ہوئے نکلے، اور جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کی راہ سے (اُس کے بندوں کو) روکتے ہیں۔ اور (یاد رکھو) جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں، اللہ (اپنے علم و قدرت سے) اُس پر چھایا ہوا ہے!

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے اُن کے کرتوت اُن کی نگاہوں میں خوشنما کرکے دکھا دیے تھے اور کہا تھا، آج اِن لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں، مگر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو اُلٹے پاؤں

وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۟ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۟ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

واپس ہوا اور لگا کہنے مجھے تم سے کچھ سروکار نہیں مجھے وہ بات دکھائی دے رہی ہے جو تم نہیں دیکھتے میں اللہ سے ڈرتا ہوں، اور اللہ (بدعملیوں کی پاداش میں) بہت سخت سزا دینے والا ہے"! ۴۸

(۲۶) آیت (۴۸) میں شیطان سے مقصود سراقہ بن مالک ابن جعشم ہے جس نے مشرکین مکہ کا ساتھ دیا تھا، لیکن لڑائی شروع ہوتے ہی بھاگ گیا۔ چنانچہ مکہ کے لوگ کہتے تھے، سراقہ نے ہمیں ہرا دیا۔

اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (ایمان کی کمزوری کا) روگ تھا، کہنے لگے تھے "ان مسلمانوں کو تو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے" (یعنے یہ محض دین کا نشہ ہے جو انہیں مقابلے پر لے جا رہا ہے ورنہ ان کے پلّے ہے کیا؟ وہ نہیں جانتے تھے کہ مسلمانوں کا بھروسہ اللہ پر ہے) اور جس کسی نے اللہ پر بھروسہ کیا، تو اللہ غالب اور حکمت والا ہے! ۴۹

اور (اے مخاطب!) اگر تو (اپنی آنکھوں سے) وہ حالت دیکھے، جب فرشتے (ان) کافروں کی روحیں قبض کرتے اور ان کے چہروں اور پیٹھوں پر ضربیں لگاتے ہیں، اور کہتے ہیں "اب عذابِ آتش کا مزہ چکھو" (تو تیرا کیا حال ہو؟) ۵۰

(اے اعدائِ حق!) یہ اس (بدعملی) کا نتیجہ ہے جو خود تمہارے ہی ہاتھوں نے پہلے سے ذخیرہ کر دیا، اور نہیں ہو سکتا کہ اللہ اپنے بندوں کے لیے ظلم کرنے والا ہو! ۵۱

(۲۷) جب بدر میں مٹھی بھر بے سروسامان مسلمان جنگ کے لیے نکلے تو منافق اور کچے دل کے آدمی اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکے بجز اس کے کہ کہیں، انہیں ان کے دین کے نشہ نے مغرور کر دیا ہے۔ بات اگرچہ بطور طعنہ کے کہی گئی تھی، لیکن ایک لحاظ سے غلط بھی نہ تھی۔ بلاشبہ یہ دین ہی کا نشہ تھا، لیکن نشۂ باطل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی معجزانہ بلاغت نے آیت (۴۹) میں ان کا قول نقل کر کے رد نہیں کیا، بلکہ صرف یہ کہا کہ من یتوکل علی اللہ الخ۔

جیسا کچھ دستور فرعون کے گروہ کا اور ان (سرکشوں) کا جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں، رہ چکا ہے، وہی تمہارا ہوا۔ اللہ کی نشانیوں سے انکار کیا، تو اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا۔ بلاشبہ اللہ (پاداش عمل کی) سزا دینے میں بہت سخت ہے! ۵۲

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

۵۳ عَلِيْمٌ ۙ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ

۵۴ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ

۵۵ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۖ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا

۵۶-۵۷ يَتَّقُوْنَ ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

(اور) یہ بات اِس لیے ہوئی کہ اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ جو نعمت وہ کسی گروہ کو عطا فرماتا ہے، اُسے پھر کبھی نہیں بدلتا جب تک کہ خود اُسی گروہ کے افراد اپنی حالت نہ بدل لیں۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ (سب کی) سُنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے! ۵۳

جیسا کچھ دستور فرعون کے گروہ کا اور اُن (سرکشوں) کا جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں، رہ چکا ہے، وہی تمہارا ہوا۔ انہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیاں جھٹلائیں، تو ہم نے اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُنہیں ہلاک کر ڈالا۔ فرعون کا گروہ (سمندر میں) غرق کیا گیا تھا، اور وہ سب ظلم کرنے والے تھے۔ ۵۴

بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین چارپائے وہ (انسان) ہیں جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی، تو یہ وہ لوگ ہیں کہ کبھی ایمان لانے والے نہیں! ۵۵

(اے پیغمبر!) جن لوگوں سے تم نے (صلح کا) عہد و پیمان کیا تھا، پھر انہوں نے اُسے توڑا، اور ایسا ہوا کہ ہر مرتبہ عہد کر کے توڑتے ہی رہے اور (بدعہدی کے وبال سے) ڈرتے نہیں، ۵۶ تو (اب چاہیے جیسی حالت میں اُنہیں پاؤ، اُسی کے مطابق سلوک بھی کرو) اگر تم لڑائی میں اُنہیں موجود پاؤ، تو ایسی سزا دو کہ جو لوگ اُن کے پس پشت ہیں (یعنی مشرکین مکہ) انہیں بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ

(۲۸) آیت (۵۳) اور اس کی ہم معنی آیات نے قطعی لفظوں میں واضح کر دیا کہ قرآن کے نزدیک اقوام و جماعات کے عروج و زوال اور موت و حیات کا قانون کیا ہے! فرمایا، یہ خدا کی مقررہ سُنت ہے کہ جب وہ کسی گروہ کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے، تو اس میں کبھی تغیر نہیں کرتا جب تک کہ خود اس گروہ کے افراد خود اپنی حالت متغیر نہیں کر دیتے۔ چنانچہ دنیا کی پوری تاریخ ہمیں اس بارہ میں جو کچھ بتلا رہی ہے، اُس کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ہر قوم خود ہی اپنی زندگی کا گہوارہ بناتی ہے، اور پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر بھی کھودتی ہے۔

(۲۹) اسی سورت کی آیت (۲۲) میں فرمایا تھا کہ بدترین چارپائے، وہ انسان ہیں جو اپنی عقل و حواس سے کام نہیں لیتے۔ یہاں آیت (۵۵) میں فرمایا، بدترین چارپائے وہ انسان ہیں جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔ اس سے معلوم ہوا، قرآن کے نزدیک عقل و حواس سے ٹھیک طرح کام نہ لینا اور اندھوں کی طرح چلنا، انسانیت کے درجہ سے گر جانا ہے، اور وہ کہتا ہے: کفر اسی اندھے پن کا نتیجہ ہے۔ پس ایمان کی راہ عقل و بصیرت کی راہ ہوئی، اور کفر اندھے پن کا دوسرا نام ہوا۔

(۳۰) آیت (۵۶) میں مدینہ کے یہودیوں کی طرف اشارہ

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ۝۵۸ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۭ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝۵۹ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۶۰ وَاِنْ

۵۷ کھڑے ہوں (اور) ہو سکتا ہے کہ عبرت پکڑیں۔ اور اگر ایک گروہ (ابھی میدان جنگ میں تو دشمنوں کے ساتھ نہیں نکلا ہے، لیکن اُس) سے تمہیں دغا کا اندیشہ ہے، تو چاہیے، اُن کا عہد اُنہی پر اُلٹا دو۔ (یعنے عہد فسخ کر دو) اِس طرح کہ دونوں جانب یکساں حالت میں ہو جائیں (یعنے ایسا نہ کیا جائے کہ اچانک شکستِ عہد کی اُنہیں خبر دی جائے بلکہ پہلے سے جتا دینا چاہیے۔ تاکہ دونوں فریقوں کو یکساں طور پر طیاری کی مہلت مل جائے) یاد رکھو، اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا! ۵۸

اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، وہ خیال نہ کریں کہ بازی لے گئے۔ وہ کبھی (پیروانِ حق کو) درماندہ نہیں کر سکتے۔ ۵۹

اور (مسلمانو!) جہاں تک تمہارے بس میں ہے، قوت پیدا کر کے اور گھوڑے طیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لیے اپنا ساز و سامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے (کلمۂ حق کے) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔ اللہ اُنہیں جانتا ہے۔ اور (یاد رکھو) اللہ کی راہ میں (یعنے جہاد کی طیاری میں) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، وہ تمہیں پورا پورا ال جائیگا۔ ایسا نہ ہوگا کہ تمہاری حق تلفی ہو۔ ۶۰

یہ ہے۔ جب پیغمبر اسلام مدینہ آئے، تو یہاں یہودیوں کی تین بستیاں آباد تھیں: بنی قینقاع، بنی نضیر، بنی قریظہ۔ پیغمبر اسلام نے ان سب سے صلح و امن اور باہمہ گر اعانت کا معاہدہ کیا۔ معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ تمام جماعتیں ایک قوم بن کر رہیں گی، اور اگر کسی فریق پر اس کے دشمن حملہ کرینگے۔ تو سب اس کی مدد کرینگے (ابن ہشام) لیکن ابھی معاہدہ کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہودیوں نے خلاف ورزی شروع کر دی اور قریش مکہ سے مل کر مسلمانوں کی تباہی کی سازشیں کرنے لگیں حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام کو ہلاک کرنے کی تدبیروں میں لگ گئے۔ یہاں حکم دیا ہے کہ اب ایسے دغا باز لوگوں کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا۔ جو کھلم کھلا لڑیں اُن کا مقابلہ کرو۔ جو ایسا نہ کریں اور غدر و فریب کا ان سے اندیشہ ہو، تو انہیں کھلے طور پر خبر دیدو کہ اب معاہدہ فسخ ہو گیا۔ لیکن فرمایا: یہ بات اس طرح کی جائے کہ دوسرے فریق کو نقصان نہ پہنچے۔ یعنے وقت سے پہلے فسخ معاہدہ سے خبردار ہو جائے، اور اگر طیاری کرنی چاہے تو ہماری طرح اُسے بھی طیاری کا پورا موقعہ ملے۔

یہاں سے اندازہ کرو کہ قرآن نے ہر معاملہ میں حتیٰ کہ جنگ میں بھی سچائی اور دیانت کا جو معیار قائم کیا ہے، وہ کس قدر بلند ہے؟ کہیں بھی اُس نے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا، جہاں اخلاقی کمزوری کو اُبھرنے کا موقعہ دیا گیا ہو۔

کیا دنیا میں اس وقت تک کسی قوم نے احکامِ جنگ کو اس درجہ بلند اخلاقی معیار پر رکھا ہے!

عالمگیر جنگ یورپ کی تاریخ کا ہر صفحہ اس کے جواب میں "نہیں" کہیگا!

جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ ٦١
فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ ٦٢
اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ○ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ع يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ ٦٣-٦٤ ع
الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ

اور (دیکھو) اگر (دشمن) صلح کی طرف جھکیں تو چاہیے تم بھی اُس کی طرف جھک جاؤ، اور (ہر حال میں) اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بلاشبہ وہی ہے جو (سب کی) سُنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے! ٦١

اور (اے پیغمبر!) اگر ان کا ارادہ یہ ہوگا کہ تجھے دھوکا دیں، تو (کوئی اندیشہ کی بات نہیں) اللہ کی ذات تیرے لیے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی مددگاری سے اور مومنوں (کی جماعت) سے تیری تائید کی، اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہم اُلفت پیدا کردی۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے، جب بھی ان کے دلوں کو باہمی اُلفت سے نہ جوڑ سکتا لیکن یہ اللہ ہے جس نے ان میں باہمی اُلفت پیدا کردی۔ بلاشبہ وہ (اپنے کاموں میں) غالب اور حکمت والا ہے! ٦٢

اے پیغمبر! اللہ تیرے لیے کفایت کرتا ہے، اور اُن مومنوں کو بھی جو تیرے پیچھے چلنے والے ہیں![1] ٦٣

اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا۔ (مسلمانو!) اگر تم میں بیس آدمی بھی مشکلوں کو جھیل جانے والے نکل آئے، تو یقین کرو، وہ دو سو دشمنوں پر غالب ہو کر رہینگے، اور اگر تم میں ایسے آدمی سو ہوگئے، تو سمجھ لو ہزار کافروں کو مغلوب کرکے رہینگے۔ اور یہ اس لیے ہوگا کہ کافروں کا گروہ ایسا ٦٤

(۳۱) آیت (۶۰) میں فرمایا "جہاں تک تمہارے بس میں ہے" کیونکہ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی جماعت اس طرح کا سر و سامان جنگ مہیا کرسکے جو ہر اعتبار سے مکمل ہو۔ پس معلوم ہوا مسلمانوں کو اس بارے میں جو کچھ حکم دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے مقدور کے مطابق جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، اور ادائے فرض کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ جب تک دنیا جہان کے ہتھیار اور ہر قسم کے ساز و سامان مہیا نہ ہو جائیں، اُس وقت تک بے بسی کا عذر کرتے رہیں اور فرضِ دفاع سے بے فکر ہو جائیں۔

اگر مسلمانوں نے اس آیت کی روح کو سمجھا ہوتا، تو اُس پانچ پنے میں مبتلا نہ ہوتے جو ڈیڑھ سو برس سے تمام مسلمانانِ عالم پر طاری ہے۔

(۳۲) چونکہ جنگ کی تیاری بغیر مال کے نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے اس کے بعد کی آیت میں انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا۔ اگر اس انفاق کی حقیقت آج مسلمان صحیح طور پر سمجھ لیں، تو اُن کی ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں۔

(۳۳) آیت (۶۱) اور (۶۲) نے کیسے قطعی لفظوں میں قرآن

---

[1] اس آیت کا صحیح ترجمہ یہی ہے اگرچہ بصرہ کے ائمہ نحو اسکے خلاف گئے ہیں، وما کان سیبویہ نبی النحو ولا معصوما۔

لَا يَفْقَهُوْنَ ○ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ ٦٥
صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ
الصّٰبِرِيْنَ ○ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۗ تُرِيْدُوْنَ ٦٦
عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ ٦٧
لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ ٦٨

کی دعوتِ امن کا اعلان کردیا ہے؟ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی جبکہ جنگ بدر کے فیصلے نے مسلمانوں کی فتح مندی آشکارا کردی تھی، اور تمام جزیرۂ عرب ان کی طاقت سے متاثر ہونے لگا تھا تاہم حکم ہوا جب کبھی دشمن صلح و امن کی طرف جھکے، چاہیے کہ بلا تامل تم بھی جھک جاؤ۔ اگر اُس کی نیت میں فتور ہوگا تو ہوا کرے، اِس کی وجہ سے صلح و امن کے قیام میں ایک لمحہ کے لیے بھی دیر نہیں کرنی چاہیے!

(۴۳) دنیا میں کوئی کام انسان کے لیے اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ بکھرے ہوئے انسانی دلوں کو ایک رشتۂ اُلفت میں پرو دے۔ اور یہ کام تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے جب معاملہ ایسے انسانوں کا ہو جو صدیوں سے باہمی جنگ و جدال کی آب و ہوا میں پرورش پاتے رہے ہوں، اور جن کے نفسیاتی سانچوں میں باہمی آمیزش و ائتلاف کا کوئی ڈھنگ باقی نہ رہا ہو۔

پیغمبرِ اسلام کا ظہور ایسے ہی لوگوں میں ہوا تھا۔ مگر ابھی ان کی دعوت پر دس بارہ ہی برس گزرے تھے کہ مدینہ میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا، جو اس اعتبار سے بالکل ایک نئی قسم کی مخلوق تھی۔ وہ جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے باہمی کینہ و انتقام کے مجسمے تھے، لیکن جونہی مسلمان ہوئے محبت و سازگاری کی ایسی پاکی و قدوسیت اُبھر آئی کہ اُن میں کا ہر فرد دوسرے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردینے کے لیے مستعد ہوگیا!

فی الحقیقت یہی وہ تزکیۂ اخلاق کا عمل ہے جو ایک پیغمبرانہ عمل تھا، اور جو پیغمبرِ اسلام کی تعلیم و تربیت نے انجام دیا، اور اُسی کی طرف آیت (۶۳) میں اشارہ فرمایا ہے۔

گروہ ہے جس میں سمجھ بوجھ نہیں۔

(مسلمانو!) اب خدا نے تم پر بوجھ ہلکا کردیا۔ اُس نے جانا کہ تم میں کمزوری ہے۔ اچھا، اب اگر تم میں جھیل جانے والے سو آدمی ہونگے، تو (اُنھیں صرف اپنے سے دوگنی تعداد کا مقابلہ کرنا ہوگا یعنی) وہ دو سو دشمنوں پر غالب رہینگے۔ اور اگر ہزار ہونگے، تو سمجھو، دو ہزار دشمنوں کو مغلوب کرکے رہینگے۔ اور (یاد رکھو) اللہ جھیل جانے والوں کا ساتھی ہے! ٦٦

نبی کے لیے سزاوار نہیں کہ اُس کے قبضہ میں قیدی ہوں جب تک کہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرلے[1]۔ (مسلمانو!) تم دنیا کی متاع چاہتے ہو اور اللہ چاہتا ہے (تمھیں) آخرت (کا اجر دے) اور اللہ غالب ہے حکمت والا! ٦٧

اگر (اس بارے میں) پہلے سے اللہ کا حکم نہ ہوگیا ہوتا، تو جو کچھ تم نے (جنگِ بدر میں مالِ غنیمت لیا) اس کے لیے ضرور تمھیں بہت بڑا عذاب پہنچتا۔ ٦٨

بہرحال جو کچھ تمھیں غنیمت میں ہاتھ لگا ہے،

---

[1] "حتیٰ یثخن فی الارض" ای حتیٰ یغلب فی الارض (بخاری) وقال ابن عباس: حتیٰ یظہر علی الارض۔

۶۹ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۷۰ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

۷۱ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰۗىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا

اُسے حلال و پاکیزہ سمجھ کر اپنے کام میں لاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے!

۶۹ اے پیغمبر! (لڑائی کے قیدیوں میں سے جو لوگ تمہارے قبضہ میں ہیں، اُن سے کہدو" اگر اللہ نے تمہارے دلوں میں کچھ نیکی پائی، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، اُس سے کہیں بہتر چیز تمہیں عطا فرمائیگا، اور تمہیں بخش دیگا۔ وہ بڑا بخشنے والا رحمت والا ہے!

۷۰ اور اگر ان لوگوں نے چاہا، تمہیں دغا دیں، تو (کوئی وجہ نہیں کہ تم اس اندیشہ سے اپنا طرزِ عمل بدل ڈالو) یہ اس سے پہلے خود اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، اور اسی کی پاداش ہے کہ تمہیں اُن پر قدرت دیدی گئی ہے، اور (یاد رکھو) اللہ سب کچھ جانتا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

۷۱ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اور جن لوگوں نے (مکہ کے مہاجروں کو مدینہ میں) جگہ دی اور اُن کی مدد کی، تو یہی لوگ ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کا کارساز و رفیق ہے، اور جن لوگوں کا

اس سے معلوم ہوا مسلمانوں کی باہمی الفت ایک ایسی نعمت ہے جسے خدا نے اپنا خاص انعام قرار دیا ہے۔ افسوس اُن پر، جو اس نعمت سے محرومی پر قانع ہو گئے، اور اس کے لیے اپنے اندر کوئی جلن محسوس نہیں کی۔

آج باہمی اُلفت کی جگہ باہمی مخاصمت مسلمانوں کی سب سے بڑی پہچان ہو گئی ہے۔ اسی کو انقلاب حال کہتے ہیں؛

(۳۵) آیت (۶۵) اور (۶۶) میں دو مختلف حالتوں کے لیے عزیمت و رخصت کی دو مختلف صورتیں فرمائی ہیں۔ ایمان کا مقتضا تو یہ ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان دس دشمنوں پر بھاری رہے لیکن چونکہ ابھی تمہاری حالت بڑی ہی کمزوری کی حالت ہے، اس لیے کم از کم اپنے سے دوگنی تعداد کا مقابلہ کرو، تو امین حق کا فیصلہ یہ ہے کہ غالب رہوگے۔

(۳۶) آیت (۶۵) میں غلبہ کی توجیہ یہ کی کہ بانہم قوم لا یفقہون تمہارے دشمنوں کا گروہ ایسا گروہ ہے جس میں سمجھ بوجھ نہیں۔ یعنی محض اندھے پن کا تعصب ہے، جس کے جوش میں لڑ رہے ہیں۔ علم و بصیرت، معاملہ فہمی، اور صلاحیت کار سے محروم ہیں، اور چونکہ محروم ہیں، اس لیے کتنی ہی بڑی تعداد میں ہوں اصحابِ دانش و بصیرت کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے۔

آج کل کے مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے کہ اب اصحاب دانش و بصیرت وہ ہیں، یا دنیا کی دوسری قومیں؟ اگر حالات منقلب ہو گئے ہیں، تو نتائج بھی کیوں منقلب نہ ہو جائیں؟

(۳۷) جنگ بدر میں جب دشمن قید ہوئے تو سوال پیدا ہوا، اس بارے میں کیا کرنا چاہیے؟ چونکہ اس وقت مسلمان بڑی ہی تنگی و افلاس کی حالت میں تھے، اس لیے عام رائے یہ تھی کہ قیدیوں کے بدلے فدیہ مانگا جائے، اور جب تک فدیہ وصول نہ ہو، قیدی رہا نہ کیے جائیں۔ بعض صحابہ کی رائے ہوئی کہ انہیں قتل کر دینا چاہیے

مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ ۷۲ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۗ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۝ ۷۳ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۗ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ ۷۴

حال ایسا ہوا کہ ایمان تو لائے مگر ہجرت نہیں کی، تو تمہارے لیے ان کی اعانت و رفاقت میں سے کچھ نہیں ہے، جب تک وہ اپنے وطن سے ہجرت نہ کریں، ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد چاہیں تو بلاشبہ تم پر اُن کی مددگاری لازم ہے۔ اِلّا یہ کہ کسی ایسے گروہ کے مقابلہ میں مدد چاہی جائے جس سے تمہارا (صلح و امن کا) عہد و پیمان ہے (کہ اس صورت میں تم عہد و پیمان کے خلاف قدم نہیں اُٹھا سکتے) اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں! ۷۲

اور (دیکھو) جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ بھی (راہِ کفر میں) ایک دوسرے کے کارساز و رفیق ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کروگے (یعنے باہمی دوستی اور بھائی چارگی کا جو حکم دیا گیا ہے، اور وفاءِ عہد اور اعانتِ مسلمین کی جو تلقین کی گئی ہے، اس پر کاربند نہیں رہوگے) تو ملک میں فتنہ پیدا ہو جائیگا اور بڑی ہی خرابی پھیلیگی۔ ۷۳

حضرت عمرؓ بھی انہی میں تھے۔ لیکن آنحضرتؐ نے عام رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا، اور قیدیوں کے لیے فدیہ طلب کیا گیا، اور جن قیدیوں کے لیے فدیہ نہیں ملا، وہ روک لیے گئے۔

اس پر آیت (۶۷) نازل ہوئی۔ فرمایا، دنیا میں نبی اس لیے نہیں آتے کہ اُن کے پیرو دشمنوں کو قید رکھ کر فدیے کا روپیہ لیں، بلکہ مقصودِ اصلی دعوتِ حق کا اعلان ہوتا ہے۔ پس نبی کو سزاوار نہیں کہ جب تک اس کی دعوت ملک میں ظاہر و غالب نہ ہو جائے، اسیرانِ جنگ کو فدیہ کے لیے روکے رکھے۔ تمہاری نظر متاعِ دنیا پر ہے، اور خدا نے تمہارے لیے آخرت کا انعام پسند کیا ہے۔

چنانچہ اس کے بعد آیت (۷۰) نے معاملہ بالکل صاف کر دیا۔ فرمایا، جو قیدی فدیے کے لیے روک لیے گئے ہیں، اُن سے کہہ دو، اگر تمہاری نیتیں صاف ہیں تو تمہارے لیے کوئی کھٹکا نہیں۔

جہاں تک اسیرانِ جنگ کا تعلق ہے، سورۂ محمد کی آیت (۴) نے آخری حکم دیدیا ہے فاما منًّا بعدُ و اما فداءً یعنے آئندہ یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دیا کرو، یا فدیہ لے کر جیسی مصلحتِ وقت ہو۔

(غرضکہ) جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے (مہاجرینِ مکہ کو) پناہ دی، اور مدد کی، تو فی الحقیقت یہی (سچے) مومن ہیں۔ انکے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔ ۷۴

(۳۸) آیت (۷۲) سے آخر سورت تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اُس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:-

(۱) اسلام کی دعوت نے باہمی اُلفت و سازگاری کی جو روح پھونک دی تھی، اُس کا ایک عجیب و غریب منظر تاریخ نے آج تک محفوظ رکھا ہے۔ یہ نو مسلموں کا باہمی بھائی چارہ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ
بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۧ

ع ۱۰

اور جو لوگ بعد کو ایمان لائے، اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا، تو وہ بھی تم ہی میں داخل ہیں۔ (انہیں اپنے سے الگ نہ سمجھو) اور (باقی رہے) قرابت دار، تو وہ اللہ کے حکم میں ایک دوسرے کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں (پس باہمی بھائی چارگی میں ان کے حقوق فراموش نہ کر دیے جائیں) بلاشبہ اللہ ہر بات کا علم رکھتا ہے!

تھا جسے عربی میں مواخاۃ کہتے ہیں۔ یعنے اسلام کے رشتہ سے ایک نومسلم دوسرے نومسلم کا بھائی ہو جاتا تھا، اور پھر ساری باتوں میں دونوں ایک دوسرے کی شرکت وملکیت کے ویسے ہی حقدار ہو جاتے جیسے حقیقی بھائی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ اگر ایک مر جاتے تو دوسرا اُس کا وارث ہو جاتا تھا

یہ مواخاۃ دو مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ مکہ میں، اور یہ صرف مہاجرین کے درمیان ہوئی تھی، دوسری مرتبہ مدینہ میں، اور یہ مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوئی تھی یعنی مکہ کے جو لوگ ہجرت کر کے آئے ان میں اور مدینہ کے نومسلموں میں۔ ایک قول کے مطابق یہ نوّے آدمی تھے، اور ایک قول میں سَو۔

(ب) مسلمانوں کی بڑی تعداد ہجرت کر کے مدینہ چلی آئی تھی، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو موانع ومشکلات سے بے بس ہو کر مکہ ہی میں پڑے رہے۔

(ج) یہاں فرمایا، جو لوگ ایمان لائے، اپنا گھر بار چھوڑا، جان ومال سے راہ حق میں جہاد کیا، تو وہ خواہ کسی قبیلہ اور کسی حلقہ کے ہوں، ایک ہی برادری کے افراد ہو گئے۔ یعنے جاں نثارانِ حق کی برادری کے۔ ان کا ہر فرد دوسرے فرد کا کارساز ورفیق ہے، اور اسی کارسازی ورفاقت پر تمہاری ساری کامیابیوں کا دارومدار ہے۔

(د) لیکن جو ایمان تو لائے مگر ابھی تک ہجرت نہ کر سکے، تو ظاہر ہے کہ اس رشتہ کے حقوق میں انکا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا جب تک، کہ وہ ہجرت کر کے تم سے آملیں۔

(ہ) ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد چاہیں تو تمہارا فرض ہے کہ اُن کی مدد کرو۔ محض اس وجہ سے کہ ابھی تک ہجرت نہ کر سکے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہماری مددگاری کے حق دینی سے محروم ہو جائیں۔

(و) البتہ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اپنے عہد وپیمان کا وفادار رہنا مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض ہے۔ پس اگر وہ کسی ایسے غیر مسلم گروہ کے مقابلہ میں مدد چاہیں جس سے تم صلح کا عہد وپیمان کر چکے ہو، تو تمہارے لیے جائز نہ ہوگا کہ ان کی مدد کے لیے عہد شکنی کرو، نتیجہ خواہ کچھ ہی نکلے لیکن اپنے قول وقرار پر قائم رہنا چاہیے۔

یہ اشارہ اس طرف تھا کہ مدینہ آ کر پیغمبر اسلام نے مدینہ اور اطراف مدینہ کی مختلف جماعتوں سے باہمی صلح وسازگاری کا معاہدہ کیا تھا، جو معاہدہ صحیفہ کے نام سے مشہور رہا۔ صحیفہ کے اکثر فریق عہد شکنی کر چکے تھے، لیکن ابھی تک مسلمانوں کی طرف سے انفساخ کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ اس سے اندازہ کرو کہ قرآن نے وفائے عہد کا، اگرچہ مخالفوں کے ساتھ ہو، اور اگرچہ اس کی وجہ سے اپنوں کی مدد نہ کی جا سکے، کس درجہ لحاظ رکھا ہے!

(ز) فرمایا کہ درجہ کے لحاظ سے جو مقام دو پہلی جماعتوں کا ہے، وہ دوسروں کا نہیں ہو سکتا: یعنے مکہ کے اُن مہاجرین کا جنہوں نے حق کی خاطر گھر بار چھوڑا اور جان و مال سے جہاد کیا، اور مدینہ کے اُن انصار کا، جنہوں نے انہیں پناہ دی اور اُن کی مددگاری کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اولئك هم المؤمنون حقا: چنانچہ دوسری جگہ فرمایا والسابقون الاولون من

المھاجرین والانصار الخ (۹: ۱۰۱) اور سورۂ حشر میں انہی دو جماعتوں کی طرف اشارہ کیا ہے: للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم۔ اور والذین تبوّؤ الدار والایمان من قبلھم الخ (۵۹) نیز والسابقون السابقون اولٰئک المقربون (۵۶: ۱۲) اور یہ ظاہر ہے کہ سچائی کی ہر راہ میں جو درجہ پہل کرنے والوں کا ہوتا ہے، وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتا۔

(ح) اس کے بعد فرمایا، جو لوگ آئندہ ایمان لائیں، ہجرت و جہاد کریں، (یا جن لوگوں نے پہلی ہجرت کے بعد ایمان قبول کیا اور ہجرت کی) تو گو یہ پہلی دو جماعتوں سے پیچھے آئے لیکن انہی میں داخل سمجھے جائیں، یعنے اسی طرح مواخاۃ و اشتراک کے مستحق سمجھے جائیں۔

(ط) اُس کے بعد وراثت کا معاملہ صاف کر دیا۔ مسلمانوں میں اسلامی بھائی چارگی کا ایسا ولولہ پیدا ہو گیا تھا، کہ خون کے عزیزوں سے کہیں زیادہ رشتۂ حق کے اِن عزیزوں کو اپنا سمجھنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اگر ایک مر جاتا، تو رشتۂ مواخاۃ کا بھائی اُس کا وارث سمجھا جاتا۔ اُنہوں نے اپنے سارے پچھلے رشتے بھُلا دیے تھے۔ صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی یعنے سب اللہ کے رسول کے فدائی اور سب اُسی کے محسنِ جہاں آرا پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے والے ہیں:

تو نخلِ خوش ثمرِ کیستی؟ کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند!

لیکن یہاں فرمایا، جو قرابت دار ہیں، وہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے قرابت دار ہیں، اور صلہ رحمی کا رشتہ کسی حال میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ پس وراثت، وغیرہ کے حقوق سے وہ محروم نہیں کیے جا سکتے۔ یاد رہے، یہاں اولوا الارحام سے مقصود اولوا الارحام مصطلحِ فرائض نہیں ہیں، بلکہ مصطلحِ لغت، یعنے قرابت دار۔

(ی) آیت (۷۳) میں فرمایا "اگر ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ اُٹھیگا اور بڑی ہی خرابی پھیلیگی" یعنے دینِ حق کی دشمنی میں کفار ایک دوسرے کے کارساز و رفیق ہو گئے ہیں۔ پس چاہیے، تم بھی راہِ حق میں ایک دوسرے کے کارساز و رفیق رہو نیز اپنے عہد و پیمان میں پوری طرح پکے رہو، کسی حال میں اس سے باہر نہ جاؤ۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے، تو ظلم و فساد سر اُٹھائیگا، اور امن و ہدایت کا جو دروازہ کھُل رہا ہے، نہ کھُل سکیگا۔

جن مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں نے دعوتِ حق کا بیج بویا تھا، اُن کا یہ حال تھا لیکن آج جب کہ روئے زمین میں چار سو ملین مسلمان موجود ہیں، ان کی باہمی مواخاۃ کا کیا حال ہے؟ ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا حال ہے جس میں ستر ملین مسلمان بستے ہیں؟

التوبة (۹)

مدنی - ۱۲۹- آیتیں

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ① فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ② وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۚ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ③

(۱) کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے، لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں، ان سے انکار کیا جا سکے۔ ازانجملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر اسلام کی مخالف تھیں، اُن کے تمام کام اول سے لے کر آخر تک ظلم و تشدد، دغا و فریب، وحشت و خونخواری پر مبنی رہے اور پیغمبر اسلام اور اُن کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا، اس کا ایک ایک فعل صبر و تحمل، راستی و دیانت، اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا۔ مظلومی میں صبر، مقابلہ میں عزم، معاملہ میں راست بازی، طاقت و اختیار میں درگزر، تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے!

قریش مکہ نے جس طرح ظلم و تعدی میں کمی نہیں کی، اُسی طرح بدعہدی میں بھی اپنی مثال چھوڑ گئے۔ آخری معاملہ حدیبیہ کی صلح کا تھا۔ اس میں ایک طرف مسلمان اور اُن کے حلیف تھے۔ دوسری طرف قریش اور اُن کے حلیف۔ مسلمانوں کے ساتھ قبیلہ خزاعہ شریک ہوا۔ قریش کے ساتھ بنو بکر۔ صلح کی بنیادی شرط یہ تھی کہ دس برس تک دونوں فریق صلح و امن پر قائم رہینگے۔ لیکن ابھی دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ بنو بکر نے خزاعہ پر حملہ کر دیا، اور قریش نے اُن کی مدد کی۔ حتیٰ کہ خود سہیل بن عمرو حملہ میں شریک ہوا جس نے معاہدۂ حدیبیہ پر دستخط کیے تھے۔ بنو خزاعہ نے خانۂ کعبہ میں پناہ لی اور خدا کے نام پر امان مانگی تھی، اس پر بھی بے دریغ قتل کیے گئے تھے۔ چالیس آدمی بچ کر مدینہ پہنچے، اور پیغمبر اسلام کو اپنا حال زار سُنایا۔ اب معاہدہ کی رو سے پیغمبر اسلام کا فرض ہو گیا کہ قریش کی

(مسلمانو!) جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح و امن کا) معاہدہ کیا تھا، اب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اُن کے لیے اعلان ہے، کہ "چار مہینے تک ملک میں چلو پھرو (کوئی روک ٹوک نہیں۔ اس کے بعد جنگ کی حالت قائم ہو جائیگی) اور یاد رکھو، تم کبھی اللہ کو عاجز نہ کر سکوگے، اور اللہ منکروں کو (پیروانِ حق کے ہاتھوں) ذلیل کرنے والا ہے"

اور اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اُس کا رسول بھی (یعنے اب کوئی معاہدہ اللہ کے نزدیک باقی نہیں رہا اور نہ اس کا رسول کسی معاہدہ کے لیے ذمہ دار ہے) پس اگر تم (اب بھی ظلم و شرارت سے) توبہ کر لو، تو تمہارے لیے اس میں بہتری ہے، اور اگر نہ مانوگی، تو جان رکھو، تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور (اے پیغمبر!) جو لوگ کفر کی راہ چل رہے ہیں، اُنہیں عذاب دردناک کی خوشخبری سُنا دو!

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٤﴾ فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥﴾ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ﴿٦﴾ كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ

ع ٦

عہد شکنی برداشت نہ کریں چنانچہ دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ اُنہوں نے کوچ کیا، اور بغیر کسی قابلِ ذکر خونریزی کے، مکہ کی فتح مبین ظہور میں آگئی۔

فتح کے بعد ۹ھ ہجری میں اس سورت کی ابتدائی دس تیس یا چالیس تک نازل ہوئیں، اور پیغمبرِ اسلام نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کو ذیقعدہ میں کر بھیجا کر حج کے موقعہ پر بطور اعلانِ عام کے یہ آیات مشتہر کر دیں یعنے

(ا) جن جماعتوں نے بدعہدی کی، اُن کے ساتھ اب کوئی معاہدہ نہیں رہا۔ تاہم اچانک اُن پر حملہ نہیں کیا جاتا۔ چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے جو حج کے دن سے شروع ہوگی اور ۱۰۔ ربیع الآخر کو ختم ہوگی۔ اس عرصہ میں انہیں نقل و حرکت کا پورا امن حاصل ہوگا۔ لیکن اس کے بعد جنگ کی حالت تصور کی جائیگی۔

(ب) لیکن جن جماعتوں نے بدعہدی نہیں کی، تو ان کا معاہدہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔

(ج) حرم کعبہ اب شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک کر دیا گیا ہے جو مشرکینِ عرب نے پیدا کر دی تھیں، پس آئندہ یہ عبادت گاہ صرف اہلِ توحید و ایمان کے لیے ہوگی کوئی مشرک آئندہ سال سے اس کا قصد نہ کرے (آیت ۲۸)

سورت کا بقیہ حصہ بھی ۹ھ ہجری ہی میں غزوۂ تبوک کے اثناء میں اور اُس کے بعد نازل ہوا تھا۔

ہاں، مشرکوں میں سے وہ لوگ کہ تم نے اُن سے معاہدہ کیا تھا، پھر اُنہوں نے (قول قرار نباہنے میں) کسی طرح کی کمی نہیں کی اور نہ ایسا کیا کہ تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی ہو، اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ پس چاہیے کہ اُنکے ساتھ جتنی مدت کے لیے عہد ہوا ہے، اتنی مدت تک اُسے پورا کیا جائے۔ اللہ اُنہیں دوست رکھتا ہے جو (ہر بات میں) متقی ہوتے ہیں! ۴

پھر جب حرمت کے مہینے گزر جائیں، تو (جنگ کی حالت قائم ہوگئی) مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو، اور جہاں کہیں ملیں گرفتار کرلو۔ نیز اُن کا محاصرہ کرو، اور ہر جگہ اُن کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ وہ باز آجائیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، تو اُن سے کسی طرح کا تعرض نہ کیا جائے۔ بلاشبہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا، رحمت والا ہے! ۵

اور (اے پیغمبر!) اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے امان مانگے، تو اُسے ضرور امان دو۔ یہاں تک کہ وہ (اچھی طرح) اللہ کا کلام سُن لے۔ پھر اُسے (بہ امن) اُس کے ٹھکانے پہنچا دو۔ یہ بات اس لیے ضروری ہوئی کہ یہ لوگ (دعوتِ حق کی حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔ ۶

(۲) یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہاں لڑائی کا جو حکم دیا گیا ہے اُس کا

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد اللہ اور

عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

تعلق صرف اُن مشرک جماعتوں سے تھا جو عرب میں دعوتِ اسلام کی پامالی کے لیے لڑ رہی تھیں نہ کہ دنیا جہان کے تمام مشرکوں سے۔ چنانچہ اوّل سے لے کر آخر تک خطاب خاص جماعتوں سے ہے اور صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ اِن جماعتوں نے کس طرح عہد شکنی کی اور کس طرح خود ہی جنگ کے اعادہ کا باعث ہوئے نیز ظلم و جنگ کی ابتدا کرنے والے بھی وہی ہیں۔

(۳) آیت (۵) سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو گئی کہ جس بات کے بعد ایک جماعت مسلمانوں کی جماعت تسلیم کی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ زبان سے اسلام کا اقرار کرے، اور عمل میں دو باتیں ضرور آ جائیں: نماز کی جماعت کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ اگر یہ دو عملی باتیں ایک جماعت میں مفقود ہیں تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

اس اعتبار سے ایک فرد کی حالت میں اور ایک جماعت کی حالت میں جو فرق ہے، اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ایک فرد قیامِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ میں کوتاہی کرتا ہے، تو گنہ گار ہے، لیکن اگر ایک جماعت نے بہ حیثیت جماعت کے ترک کر دیا، تو اسلامی زندگی کی بنیادی شناخت کھو دی، اور وہ مسلمان نہیں۔

اِن چند لفظوں میں تمہیں اُس تمام نزاع کا فیصلہ مل جا سکتا ہے جو تارکِ صلوٰۃ کے باب میں چلی آتی ہے۔ بشرطیکہ غور و فکر سے کام لو۔

(۴) غور کرو جنگ کی سخت سے سخت حالت میں بھی اصل مقصد یعنے ارشاد و موعظت کا دروازہ کس طرح کھلا رکھا! اور کس طرح دین و اعتقاد کے معاملہ کو جبر و اکراہ کے شبہ سے بھی بالاتر رکھا گیا! آیت (۶) میں فرمایا، ان مشرکوں میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جن میں قرآن سُننے اور حقیقتِ حال معلوم کرنے کی خلش پیدا ہو۔ اگر کوئی ایسا آدمی آ جائے، تو عین لڑائی کی حالت میں بھی اُسے بخوشی پناہ دو۔ جب تک رہنا چاہے رہے، قرآن سُنے

اُس کے رسول کے نزدیک عہد ہو! ہاں، جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد و پیمان باندھا تھا (اور اُنھوں نے اسے نہیں توڑا) تو (اُن کا عہد ضرور عہد ہے، اور) جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں، تم بھی اُن کے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہو۔ اللہ اُنہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں۔

ان مشرکوں کا عہد کیونکر عہد ہو سکتا ہے جب کہ اُن کا حال یہ ہے کہ اگر آج تم پر غلبہ پا جائیں، تو نہ تو تمہارے لیے قرابت کا پاس کریں، نہ کسی عہد و پیمان کا۔ وہ اپنی باتوں سے تمہیں راضی کرنا چاہتے ہیں، مگر اُن کے دلوں کا فیصلہ اس کے خلاف ہے، اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔ (یعنے راست بازی کے تمام طریقوں اور پابندیوں سے باہر ہو چکے ہیں)

ان لوگوں نے اللہ کی آیتیں ایک بہت ہی حقیر قیمت پر بیچ ڈالیں۔ (یعنے ہوائے نفس کے تابع ہو گئے اور اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں کیا) پس اُس کی راہ سے لوگوں کو روکنے لگے۔ (افسوس ان پر!) کیا ہی بُرا ہے جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں!

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ ۝ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ١٠
وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ ١١
مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ
يَنْتَهُونَ ۝ أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ ١٢
أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ ١٣

اور جب جانا چاہے تو اُسے اس کے ٹھکانے بحفاظت پہنچا دیا جائے تاکہ اپنے امن کی جگہ پہنچ کر آزادی و اختیار کے ساتھ غور و فکر کرے اور جو راہ چاہے اختیار کرے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دین کے بارے میں تقلید کافی نہیں فہم و اذعان ضروری ہے، ورنہ قرآن کا سُنانا اور پھر غور و فکر کی مہلت دینا ضروری نہ ہوتا۔ یاد رہے، قرآن جس طرح اس معاملہ میں جبر کی پرچھائیں بھی دیکھنا نہیں چاہتا، اُسی طرح تقلیدی اعتقاد کا بھی روادار نہیں۔

کسی مومن کے لیے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں، نہ عہد و قرار کا یہی لوگ ہیں کہ ظلم میں حد سے گزر گئے ہیں۔ ١٠

بہرحال اگر یہ باز آئیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، تو (پھر اِن کے خلاف تمہارا ہاتھ نہیں اُٹھنا چاہیے۔ وہ) تمہارے دینی بھائی ہوگئے۔ اُن لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں، ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ ١١

اور اگر یہ اپنے عہد و پیمان جو خود کر چکے ہیں، توڑ ڈالیں، اور تمہارے دین کو بُرا بھلا کہیں، تو پھر (اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان) کفر کے سرداروں سے جنگ کرو۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کی سوگند، سوگند نہیں۔ (اور تمہیں جنگ اس لیے کرنی چاہیے) تاکہ یہ (ظلم و بدعہدی سے) باز آجائیں۔ ١٢

(٦) آیت (٧)، سے لے کر (١٣) تک یہ حقیقت واضح کی ہے کہ دشمنوں کی پے در پے عہد شکنیوں اور ظلم و عداوت کی انتہا نے کس طرح اس اعلانِ جنگ کو ناگزیر کر دیا تھا۔ فرمایا جن لوگوں نے بار بار عہد کیے، اور بار بار خلاف ورزی کی، اور پھر صلح حدیبیہ کا آخری عہد بھی اس ظالمانہ طریقہ پر پامال کیا، اب اُنکا عہد کیونکر عہد سمجھا جا سکتا ہے؟ ہاں جو فریق اُس عہد پر قائم رہے، تو یقیناً اُن کا عہد اپنی جگہ قائم ہے۔ اسلام کسی حال میں بھی بدعہدی جائز نہیں کر سکتا۔

فرمایا، ان کی دلی عداوت کا یہ حال ہے کہ اگر اب بھی قابو پا جائیں، تو ایک مومن کو زندہ نہ چھوڑیں۔ اگر ایسے لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ نہ کیا جاتا، تو نتیجہ یہ نکلتا کہ مسلمان دائمی خطرہ میں چھوڑ دیے جاتے۔

(مسلمانو!) کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کی قسمیں توڑ ڈالیں، جنہوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کے منصوبے کیے، اور پھر تمہارے برخلاف لڑائی میں پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی؟ کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟ (اگر ڈرتے ہو تو تم مومن نہیں۔ کیونکہ) اگر مومن ہو، تو اللہ اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ اُس کا ڈر تمہارے دلوں میں بسا ہو! ١٣

١٤ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
١٥ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ
تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا
١٦ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ع مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ
١٧ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝

آیت (۱۳) میں فرمایا، یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس کی ابتداء کس نے کی؟ کس نے مظلوموں کو جلا وطنی پر مجبور کیا، اور کون فوج لے کر اُن پر حملہ آور ہوا؟ یہی لوگ تھے جو یہ سب کچھ کرتے رہے۔ اب اگر ہم ان کے خلاف ہتھیار اُٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں تو اِس کی ذمہ داری اُنہی پر ہے۔

١٤ (۷) پھر غور کرو۔ قرآن ہر جگہ اُس جنگ کا مقصد کیا قرار دیتا ہے جس کی اُس نے اجازت دی تھی؟ آیت (۱۲) میں فرمایا لعلھم ینتھون تاکہ ظلم و بدعہدی سے باز آجائیں۔ اسی طرح سورۂ انفال کی آیت (۵۷) میں گزر چکا ہے لعلھم یذکرون تاکہ عبرت

١٥ پذیر ہوں۔ یعنے یہ دفاعی جنگ بھی انتقام کے خیال سے یا دنیوی انتفاع و تغلب کے لیے نہیں ہے، بلکہ محض اس لیے ہے کہ ارباب ظلم و تشدد اپنی بدکرداریوں سے باز آجائیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ناگزیر حالت سے زیادہ ایک لمحہ کے لیے بھی قرآن نے جنگ کا قیام جائز نہیں رکھا، اور پے درپے عہد شکنیوں اور سخت سے سخت مظالم کے بعد بھی دشمنوں پر دروازہ کبھی بند نہیں کیا۔

(۸) آیت (۱۴) میں چھ باتیں فرمائی تھیں:
(ا) تمہارے ہاتھوں اُنہیں عذاب ملیگا
(ب) وہ رسوا ہونگے۔

١٦ (ج) تم فتح مند رہوگے۔
(د) مومنوں کے دلوں میں اپنی مصیبتوں اور اندوہوں کے جتنے دکھ ہیں، سب دور ہو جائیں گے۔
(ہ) ان کے دلوں کی جلن نکل جائیگی۔
(و) جنہیں توبہ ملنی ہے، وہ تائب ہونگے۔

چنانچہ غور کرو، کس طرح یہ تمام باتیں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ مشرکین عرب کی ہستی ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔ اُنہی مسلمانوں کے

١٧ ہاتھوں جو بیس برس تک ان کے مظالم سہتے رہے تھے، ان کی

(مسلمانو!) ان سے (بلا تامل) جنگ کرو۔ اللہ تمہارے ہاتھوں اُنہیں عذاب دیگا، اُنہیں رسوائی میں ڈالیگا، اُن پر تمہیں فتح مند کریگا، اور جماعتِ مومنین کے دلوں کے سارے دُکھ دور کر دیگا۔ اُن کے دلوں کی جلن باقی نہیں رہیگی۔ اور پھر جس پر چاہیگا، اپنی رحمت سے لوٹ آئیگا۔ اللہ سب کچھ جانتا اور (اپنی ہر بات میں) حکمت رکھنے والا ہے!

(مسلمانو!) کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ تم آپنے ہی میں چھوڑ دیے جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تو اللہ نے ان لوگوں کو پوری طرح آزمائش میں ڈالا ہی نہیں، جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہے اور (اللہ، اس کے رسول، اور مومنوں کو چھوڑ کر کسی کو اپنا پوشیدہ دوست نہیں بنایا ہے۔ (یاد رکھو) جیسے کچھ بھی تمہارے اعمال ہیں، خُدا اُن سب کی خبر رکھنے والا ہے!

مشرکوں کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، ایسی حالت میں کہ وہ خود اپنے کفر کا اعتراف کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اُن کے سارے عمل اکارت گئے، اور وہ عذابِ آتش میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰۤىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۤىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ

قوت کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کی رسوائی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگئی۔ اور پھر مسلمانوں کے دلوں کو مظلومیت و بے چارگی کے سارے دکھوں سے کیسی شفاء کامل ملی کہ پچیس برس کے اندر وہ کرۂ زمین کی سب سے اشرف و بہتر مخلوق تسلیم کرلیے گئے!

(۹) آیت (۱۷) سے سلسلۂ بیان ایک دوسرے معاملہ کی طرف متوجہ ہوا ہے جس کا اس موقعہ پر اعلان کیا گیا تھا، اور جو فی الحقیقت اس صورت حال کا لازمی نتیجہ تھا۔ یعنے خانۂ کعبہ کی مستقل حیثیت۔ فرمایا، یہ پرستاران توحید کی عبادت گاہ تھی، اور اب آئندہ بھی انہی کے لیے مخصوص رہیگی۔ مشرکوں کو یہ حق نہیں کہ اسے اپنے مشرکانہ اعمال و رسوم سے ملوث کریں۔ چنانچہ اوپر گزر چکا ہے کہ ۹ ہجری کے حج میں حضرت علی نے جن امور کا اعلان عام کیا، اُن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک خانۂ کعبہ میں قدم نہ رکھ سکیگا۔ اور اسی حکم کی یہ تمہید ہے جو آیت مذکور سے شروع ہوئی ہے۔

(۱۰) قریش مکہ کو خانۂ کعبہ کی مجاوری اور حاجیوں کے کاروبار کے منصرم ہونے کا بڑا غرور تھا۔ اور جب ایک جماعت اعتقاد و عمل کی حقیقت سے محروم ہوجاتی ہے، تو اسی طرح کے رسوم و مظاہر کو ہر طرح کی بزرگی و سعادت کا ذریعہ سمجھنے لگتی ہے۔ چنانچہ آج کل مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ کسی بزرگ کی سجادہ نشینی، کسی مزار کی مجاوری، کسی زیارت گاہ کا متولی ہونا، جو اثر و رسوخ رکھتا ہے، وہ بڑے سے بڑے اور بہتر سے بہتر مومن و متقی کو بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایک صالح و متقی مسلمان کو کوئی نہیں پوچھیگا، لیکن ایک فاسق و فاجر مجاور یا متولی درگاہ کی ہزاروں آدمی قدم بوسی کرینگے!

یہاں اسی گمراہی کا ازالہ کیا ہے۔ فرمایا اصلی نیکی یہ نہیں ہے کہ حاجیوں کو پانی پلانے کی سبیل لگادی یا خانۂ کعبہ میں روشنی کردی۔

فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانا۔ جو لوگ ایسے ہیں، انہی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ (سعادت و کامیابی کی) راہ پانے والے ثابت ہونگے! (۱۸)

کیا تم لوگوں نے یوں ٹھہرا رکھا ہے کہ حاجیوں کے لیے سبیل لگادینی اور مسجد حرام کو آباد رکھنا اُسی درجہ کا کام ہے، جیسا اُس شخص کا کام، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا! اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں، اور اللہ (کا قانون ہے کہ وہ) ظلم کرنے والوں پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا۔ (۱۹)

جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو یقیناً اللہ کے نزدیک ان کا بہت بڑا درجہ ہے، اور وہی ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں! (۲۰)

اُن کا پروردگار اُنہیں اپنی رحمت اور کامل خوشنودی کی بشارت دیتا ہے نیز ... ایسے باغوں

فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ۝ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ إِنَّ اللّٰهَ عِندَهُۥٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لَا تَتَّخِذُوٓا ءَابَآءَكُمْ وَإِخْوٰنَكُمْ أَوْلِيَآءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمٰنِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ۝ قُلْ إِن كَانَ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوٰنُكُمْ وَأَزْوٰجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوٰلٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجٰرَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِۦ وَجِهَادٍ فِى سَبِيلِهِۦ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِىَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِۦ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِينَ ۝ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِى مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۙ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ

۲۱-۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵

کی جہاں اُن کے لیے ہمیشگی کی نعمت ہوگی، اور وہ اُن میں ہمیشہ رہنے والے ہونگے یقیناً اللہ کے پاس (نیک کرداروں کے لیے) بہت بڑا اجر ہے!

مسلمانو! اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں، تو اُنہیں اپنا رفیق و کارساز نہ بناؤ۔ اور جو کوئی بنائیگا، تو ایسے ہی لوگ ہیں جو (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے ہیں!

(اے پیغمبر!) مسلمانوں سے کہدے "اگر ایسا ہی کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے مندا پڑجانے سے ڈرتے ہو، تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں، یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے، اس کے رسول سے، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں، تو (کلمۂ حق تمہارا محتاج نہیں) انتظار کرو، یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے، وہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ (کا مقررہ قانون ہے کہ وہ) فاسقوں پر (کامیابی و سعادت کی) راہ نہیں کھولتا!

اصلی نیکی تو اس کی ہے جو ایمان لایا، اور جس نے اعمالِ حسنہ انجام دیے۔

(۱۱) نیز یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ خدا کی عبادت گاہ کی تولیت کا حق متقی مسلمانوں کو پہنچتا ہے، اور وہی اُسے آباد رکھنے والے ہوسکتے ہیں۔ یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ فاسق و فاجر آدمی مساجد کا متولی نہیں ہوسکتا کیونکہ دونوں میں کوئی مناسبت باقی نہیں رہتی بلکہ متضاد باتیں جمع ہوجاتی ہیں۔ مسجد خدا پرستی کا مقام ہے، اور متولی خدا پرستی سے نفور!

(۱۲) آیت (۱۸) میں مومن صادق کی جو تعریف بیان کی، اس میں ایمان باللہ اور قیامِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ "اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ مانا" اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک اسلام کے فکری و عملی ارکان میں سے ایک رکن یہ بھی ہے، اور جس دل میں ماسوی اللہ کی دہشت ہو، وہ پورا مسلمان نہیں۔

(مسلمانو!) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کرچکا ہے (جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی اُمید نہ تھی)۔ اور جنگِ حنین کے موقعہ پر بھی، جبکہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے (اور سمجھے تھے کہ

(۱۳) آیت (۲۰) میں واضح کردیا کہ اللہ کے نزدیک بزرگی و فضیلت کا معیار کیا ہے؟ فرمایا، سب سے بڑا درجہ اُنہی کا ہے جنہوں نے سچائی کی راہ میں ہر طرح کی قربانیاں کیں، اور ایمان و عمل کی آزمائش میں پورے اُترے۔ تمہارے گڑھے ہوئے تقدس و بزرگی کے مناصب، اور رواجی بڑائیاں اللہ کے نزدیک کوئی حقیقت

۲۵ عَنكُمْ شَيْـًٔا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝ ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ
سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَ
۲۶-۲۷ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ
هَٰذَا ۚ وَإِنْ

نہیں رہتیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ آج کل مسلمانوں کی عام مذہبی ذہنیت کس درجہ اسلام سے دور ہوگئی ہے۔ جاہلیت عرب کی طرح وہ بھی رواجی نیکیوں کو حقیقی اسلامی نیکیوں پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اگر ایک فاسق و فاجر امیر محرم میں سبیل لگا دیتا ہے، یا ربیع الاول میں دھوم دھام سے مولود کی مجلس کر دیتا ہے، یا کسی مسجد اور درگاہ میں بجلی کی روشنی کرا دیتا ہے، تو تمام مسلمان اس کی حمد و ثنا کا غلغلہ مچا دیتے ہیں، اور کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے ایمان و عمل اور ایثار فی اللہ و للہ کا کیا حال ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ رواجی نیکیاں، اللہ کے نزدیک نیکیاں نہیں ہیں۔ نیکی کا معیار صرف ایمان و عمل اور ایمان و عمل کی راہ میں ایثار ہے۔

(۳۴) اوپر گزر چکا ہے کہ یہ سورت ۹ سنہ میں نازل ہوئی تھی، اور ابتدائی تیس سال کے آخری مہینوں یعنے حج کے مہینوں میں اعلان عام کی غرض سے مشتہر کی گئیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ مکہ فتح ہو چکا تھا، جنگ حنین نے دشمنوں کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دی تھی، غزوہ تبوک میں تیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی تھی، اور جزیرۂ عرب میں مسلمانوں کے سوا اور کوئی قوت نظر نہیں آتی تھی۔ تاہم صورتِ حال کے بعض پہلو ایسے تھے جو کمزوری سے خالی نہ تھے:

(۱) مکہ کے طلقاء کا ایک بڑا گروہ نیا نیا مسلمانوں میں داخل ہوا تھا۔ یعنے ان باشندگان مکہ کا جنہیں پیغمبر اسلام نے عفو و بخشش کی ایک بے نظیر مثال قائم کرتے ہوئے فتح مکہ کے دن آزاد کر دیا تھا اور فرمایا تھا: انتم الطلقاء۔ آج تم سے کوئی باز پرس نہیں۔ یہ ابھی اسلامی زندگی کی پختگی کے محتاج تھے اور ان میں سے بہتوں کے عزیز و اقربا دشمنوں میں ملے ہوئے تھے۔ جب اعلان جنگ ہوا، تو انہیں اپنے قرابت داروں کی فکر ہوئی، بعضوں نے جاہلیت کے نسبی اور خاندانی عصبیت کی صدا بھی بلند کی، جو ابھی پوری طرح ان کے دلوں

محض اپنی کثرت سے میدان مار لو گے) تو دیکھو، وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی، اور زمین اپنی ساری وسعت پر بھی تمہارے لیے تنگ ہوگئی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ ۲۵

پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون و قرار نازل فرمایا، اور ایسی فوجیں اُتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور (اس طرح) ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، اور یہی جزا ہے اُن لوگوں کی جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں! (یعنے ان کی بدعملی کا لازمی نتیجہ یہی ہے) ۲۶

پھر اس کے بعد اللہ جس پر چاہیگا، اپنی رحمت سے لوٹ آئیگا (یعنے توبہ قبول کرلیگا) اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا، رحمت والا ہے! ۲۷

مسلمانو! حقیقتِ حال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مشرک نجس ہیں (یعنے شرک نے اُن کے دلوں کی پاکی سلب کرلی ہے) پس چاہیے کہ اب اس برس کے بعد سے (یعنے ۹ سنہ ہجری کے بعد سے) مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں، اور اگر تم کو اُن کی آمد و رفت کے بند ہو جانے

واعلموا ۱۰

۲۸ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۲۹ ع ۵ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ

سے محو نہیں ہوئی تھی۔

(ب) منافق اور کچے دل کے آدمی بھی باقی تھے۔ وہ کہنے لگے "اب جنگ کے اعلان کی ضرورت کیا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔"

(ج) عام مسلمانوں میں بھی، فتح و عروج کی وجہ سے، کچھ نہ کچھ بے پروائی سی پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ خیال کرتے ہونگے، اب تو تمام عرب ۲۸ کلمۂ حق کے آگے جھک رہا ہے، اور دشمنوں میں کچھ دم خم باقی نہیں رہا۔ حالانکہ مشیتِ الٰہی نے عروجِ اسلام کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ کچھ اور ہی تھا، اور اس موقعہ پر طبیعتوں کی بے پروائی نہ صرف مستقبل کے لیے بلکہ موجودہ حالت کے لیے بھی خطرہ سے خالی نہ تھی۔

پس ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ایمان و عمل کے عزائم کی ازسرِ نو تلقین کی جائے، اور یاد دلایا جائے کہ آزمایش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ شروع ہوئی ہے۔ ازانجملہ اس اعلانِ جنگ کی آزمایش ہے جسے دشمنوں کے غدر و فریب نے ناگزیر کر دیا ہے، اور ملک کے امن و امان کا استحکام اس کے بغیر ممکن نہیں۔

چنانچہ پہلے آیت (۱۶) میں فرمایا تھا، ایسا نہ سمجھو، کہ تم اتنے ہی میں چھوڑ دیے جاؤ گے جتنا کچھ ہو چکا ہے، بلکہ ابھی ایمان و عمل کی ۲۹ آزمایشیں باقی ہیں۔ اب یہاں سچے مومنوں کی فضیلت بیان کرنے کے بعد آیت (۲۳) میں خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی کہ ایمان کا دعویٰ اور مومنوں کے دشمنوں سے موالات ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر باپ اور بھائی بھی دشمنوں میں سے ہوں، جب بھی تمہیں ان سے کوئی علاقہ نہیں رکھنا چاہیے۔

(۵ا) آیت (۲۴) مہمات مواعظ میں سے ہے، اور اس باب میں قطعی ہے کہ اگر حبِ ایمانی اور غیر ایمانی میں مقابلہ ہو جائے، تو مومن وہ ہے جس کی حبِ ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت اور علاقہ بھی غالب نہ آ سکے۔ یہاں آٹھ چیزوں کا ذکر کیا ہے، اور اگر غور کرو گے

سے) فقر و فاقہ کا اندیشہ ہو (کہ وہ ہر طرح کی ضروری چیزیں باہر سے لاتے اور تجارت کرتے ہیں) تو گھبراؤ نہیں۔ اللہ چاہیگا تو عنقریب تمہیں اپنے فضل سے تونگر کر دیگا۔ اللہ سب کچھ جانتا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں، نہ آخرت کے دن پر۔ نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اُس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے، اور نہ سچے دین ہی پر عمل پیرا ہیں، تو (مسلمانو!) اُن سے (بھی) جنگ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیں اور حالت ایسی ہو جائے کہ اُن کی سرکشی ٹوٹ چکی ہو۔

اور یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی باتیں ہیں محض اُن کی زبان سے نکالی ہوئی (ورنہ سمجھ بوجھ کر کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتا) ان لوگوں نے بھی انہی کی سی بات کہی جو ان سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت! یہ کدھر کو بھٹکے

أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ ۳۰
مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ ۳۱
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ۳۲
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ
الْمُشْرِكُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ ۳۳
النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ

تو ایک متمدن زندگی کے تمام علائق ان میں آ گئے ہیں، نیز جس ترتیب سے ذکر کیا ہے، علائق کی گہرائیوں کی قدرتی ترتیب یہی ہے۔ فرمایا، انسان کی مدنی زندگی کی الفتوں کے بڑے رشتے یہی ہیں اور اپنی جگہ سب مطلوب و ضروری ہیں، لیکن اگر محبتِ ایمانی سے ان میں مقابلہ ہو جائے، تو پھر مومن وہ ہے جس پر ان تمام الفتوں میں سے کسی الفت کا بھی جادو چل نہ سکے۔ اور کوئی علاقہ بھی اسے اتباعِ حق سے روک نہ سکے!

غور کرو، قرآن فطرتِ انسانی کی کمزوریوں کا کس طرح کھوج لگاتا ہے؟ فرمایا "اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے" یعنے عزائم و مقاصد کی راہ میں جب کبھی قدم اٹھایا جائیگا تو ناگزیر ہے کہ صورتِ حال میں انقلاب ہو، اور جب انقلاب ہوگا، خواہ جنگ کی صورت میں ہو، خواہ کسی دوسری صورت میں، تو عارضی طور پر کاروبار ضرور بگڑیگا، مال و جائداد کے لئے خطرات ضرور پیدا ہونگے، اور یہی بات مال و دولت کے پرستاروں پر ہمیشہ شاق گزرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمارا کاروبار خراب ہو جائیگا اور نہیں جانتے کہ اگر راہِ حق میں استقامت دکھائیں تو جو کچھ خراب ہوگا، وہ بہت تھوڑا ہوگا، اور پھر جو کچھ بنیگا، وہ بہت زیادہ ہوگا وان اللہ عندہ اجر عظیم!

محبتِ ایمانی کی اس آزمائش میں صحابۂ کرام جس طرح پورے اترے اس کی شہادت تاریخ نے محفوظ کر لی ہے اور محتاجِ بیان نہیں۔ بلا شائبۂ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی انسان کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسا عشق نہیں کیا ہوگا جیسا صحابہ نے اللہ کے رسول سے راہِ حق میں کیا۔ انہوں نے اس محبت کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جو انسان کر سکتا ہے، اور پھر اسی کی راہ سے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پا سکتی ہے!

بنا رہے ہیں! ۳۰

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور مشائخ کو پروردگار بنا لیا۔ اور مریم کے بیٹے مسیح کو بھی۔ حالانکہ انہیں جو کچھ حکم دیا گیا تھا، وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک خدا کی بندگی کرو۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی۔ اس کی پاکی ہو اس ساجھے سے، جو یہ اس کی ذات میں لگا رہے ہیں! ۳۱

یہ لوگ چاہتے ہیں، اللہ کی روشنی اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، حالانکہ اللہ یہ روشنی پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں، اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے! ۳۲

(ہاں) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو حقیقی ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس دین کو تمام (ٹھہرائے ہوئے) دینوں پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکوں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے! ۳۳

مسلمانو! یاد رکھو، (یہودیوں اور عیسائیوں کے) علما اور مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق ناروا کھاتے ہیں، اور اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں۔ اور جو لوگ چاندی سونا اپنے ذخیروں

وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

۳۴ ۳۵ ۳۶

لیکن آج ہمارا حال کیا ہے؟ کیا ہم میں سے کسی کو جرأت ہوسکتی ہے کہ یہ آیت سامنے رکھ کر اپنے ایمان کا احتساب کرے؟

(۱۶) آیت (۲۵) میں جنگ حُنین کی طرف اشارہ ہے۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد قبیلہ ہوازن اور ثقیف نے بنی نضر اور بنی ہلال کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا، تو پیغمبر اسلام مکہ سے نکلے اور حُنین نامی وادی میں مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد دشمنوں سے تین گنا زیادہ تھی، اس لیے لوگوں کو اپنی کثرتِ تعداد کا گھمنڈ ہو گیا تھا۔ کہتے تھے اب وہ دن نہیں رہا کہ تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب ہو جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وقت پر تعداد کی کثرت کچھ کام نہ آئی۔ اور فتح مندی ہوئی تو محض پیغمبر اسلام اور اُن کے ساتھ مٹھی بھر مسلمانوں کے عزم و ہمت سے۔

مسلمانوں کو پہاڑ کی ایک تنگ گھاٹی سے گزرنا تھا۔ وہاں دشمنوں کے تیر انداز گھات لگائے بیٹھے تھے۔ مسلمانوں کی فوج میں دو ہزار مکہ کے نئے نئے نومسلم اور بعض معاہد مشرک بھی تھے۔ جونہی اُنہوں نے قدم بڑھایا، دشمنوں نے تیروں پر رکھ لیا، اور اچانک اُن کے قدم اُکھڑ گئے۔ اُنہیں بھاگتا دیکھ کر تمام لشکر نے بھی بھاگنا شروع کر دیا۔ قریب تھا کہ شکست ہو جائے، مگر اللہ نے پیغمبر اسلام کے قلب مبارک کو اپنے سکون و قرار کی روح سے معمور کر دیا۔ آپ نے حضرت عباس کو حکم دیا کہ اصحاب سمرہ کو پکاریں۔ یعنے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بیعت رضوان کرنے والوں کو۔ ان کی ندا کا بلند ہونا تھا کہ ہمت و شجاعت کی نئی لہر سب کے دلوں میں دوڑ گئی، اور پھر لوٹ کر اس بے جگری سے حملہ کیا کہ دشمنوں کے قدم اُکھاڑ دیے۔

یہ حادثہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے مسلمانوں کی تادیب تھی تاکہ محض کثرتِ تعداد ہی کو کامیابی کی بنیاد نہ سمجھ لیں۔ بلا شبہ تعداد کی کثرت بھی موجباتِ فتح میں سے ہے لیکن صرف

میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اُسے خرچ نہیں کرتے، تو ایسے لوگوں کو عذاب دردناک کی خوشخبری سُنا دو!

عذاب دردناک کا وہ دن، جبکہ (اُن کا جمع کیا ہوا) سونے چاندی کا ڈھیر دوزخ کی آگ میں تپایا جائیگا، اور اُس سے اُنکے ماتھے، اُنکے پہلو، اور اُن کی پیٹھیں داغی جائینگی (اور اُس وقت کہا جائیگا:) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا تھا۔ سو جو کچھ ذخیرہ کرکے جمع کرتے رہے، اُس کا مزہ آج چکھ لو!

اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ مہینے کی ہے۔ اللہ کی کتاب میں ایسا ہی لکھا گیا جس دن آسمانوں کو اور زمین کو اُس نے پیدا کیا۔ (یعنے جب سے اجرام سماویہ بنے ہیں، خدا کا ٹھہرایا ہوا حساب یہی ہے) ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت کے مہینے ہوئے (یعنے رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، کہ امن کے مہینے سمجھے جاتے تھے اور لڑائی ممنوع تھی) دین کی سیدھی راہ یہ ہے۔ پس ان حرمت کے مہینوں میں (جنگ و خوں ریزی کرکے) اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو، اور چاہیے کہ تمام مشرکوں سے بلا استثنا جنگ کرو، جس طرح وہ تم

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ۝ ٣٧ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝ ٣٨ ع ٥

ہی سے فتح مندی نہیں مل سکتی۔ اصلی چیز دل کی استعداد ہے، اور وہ موجود ہو تو مٹھی بھر انسان سیکڑوں انسانوں پر غالب آ جا سکتے ہیں۔

فرمایا، اللہ نے تمہیں بہت سی جنگوں میں نصرت دی حالانکہ تم بہت تھوڑے تھے اور ڈرتے تھے کہ کامیابی نہیں ہوگی۔ اور پھر حنین کے دن بھی فتح مندی دی جبکہ تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرہ تھا، اور کثرتِ تعداد نے کچھ کام نہیں دیا تھا۔

(۱۷) آیت (۲۸) میں اُسی حکم کا ذکر ہے جو اوپر گذر چکا ہے۔ یعنے آئندہ سے کوئی مشرک اس عبادت گاہ میں جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنائی تھی داخل نہ ہو سکیگا، اور یہ مقام اُمتِ مسلمہ کے لیے مرکزِ ہدایت بن کر رہیگا، جیسا کہ فی الحقیقت اُسے ہونا تھا۔

(۱۸) اس آیت میں مشرکوں کے نجس ہونے سے مقصود ان کی قلبی نجاست ہے۔ نہ کہ جسمانی۔ کیونکہ اسلام کسی انسان کے جسم کو ناپاک نہیں قرار دیتا، اور ہر انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے ایک درجہ پر رکھتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے چھوت چھات کی ہر قسم اور ہر شکل کو ناجائز قرار دیا ہے۔ خود پیغمبر اسلام کا یہودیوں اور مشرکوں سے ہر طرح کی معاشرت رکھنا، ایک ساتھ کھانا پینا، ان کی دعوتوں میں جانا اور اُنہیں دعوتوں میں بُلانا، حتیٰ کہ اُنہیں مسجد کے اندر ٹھہرانا ثابت ہے۔

(۱۹) بالاتفاق یہ حکم صرف خانۂ کعبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ عام مساجد میں غیر مسلموں کے لیے کوئی شرعی روک نہیں۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے یمن کے عیسائیوں اور طائف کے مشرکوں کو اپنی مسجد میں ٹھہرایا تھا۔

سب سے بلا استثناء جنگ کرتے ہیں، اور (ساتھ ہی) یاد رکھو کہ اللہ اُنہی کا ساتھی ہے جو (ہر حال میں) تقوے والے ہیں۔ ٣٦

"نسی" (یعنے مہینے کو اُس کی جگہ سے پیچھے ہٹا دینا جیسا کہ جاہلیت میں دستور ہو گیا تھا) اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کفر میں کچھ اور بڑھا دینا ہے۔ اس سے کافر گمراہی میں پڑتے ہیں۔ ایک ہی مہینے کو ایک برس حلال سمجھ لیتے ہیں (یعنے اس میں لڑائی جائز کر دیتے ہیں) اور پھر اُسی کو دوسرے برس حرام کر دیتے ہیں۔ (یعنے اس میں لڑائی ناجائز کر دیتے ہیں) تا کہ اللہ نے حرمت کے مہینوں کی جو گنتی رکھی ہے، اُسے اپنی گنتی سے مطابق کر کے اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کو حلال کر لیں۔ اِن کی نگاہوں میں اِن کے بُرے کام خوشنما ہو کر دکھائی دیتے ہیں، اور اللہ (کا قانون ہے کہ وہ) منکرینِ حق پر (کامیابی و سعادت کی) راہ نہیں کھولتا۔ ٣٧

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے، اللہ کی راہ میں قدم اُٹھاؤ، تو تمہارے پانوں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں! کیا آخرت چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی ہی پر ریجھ گئے ہو؟ (اگر ایسا ہی ہے، تو (یاد رکھو) دنیا کی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے مگر بہت تھوڑی! ٣٨

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾ انفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ

۳۹ اگر قدم نہ اُٹھاؤ گے، تو یاد رکھو، وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈالیگا جو دردناک ہوگا، اور تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لا کھڑا کریگا، اور تم (دفاع سے غافل ہوکر) اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے (اپنا ہی نقصان کروگے) اور اللہ تو ہر بات پر قادر ہے۔

۴۰ اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کروگے تو (نہ کرو) اللہ نے اس کی مدد کی ہے، اور اُس وقت کی ہے جب کافروں نے اُسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ (صرف دو آدمی تھے، اور) دو میں دوسرا (اللہ کا رسول) تھا، اور دونوں غار (ثور) میں چھپے بیٹھے تھے۔ اُس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی سے کہا تھا "غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے" (وہ دشمنوں کو ہم پر قابو پانے نہ دیگا) پس اللہ نے اپنا سکون و قرار اُس پر نازل کیا، اور پھر ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنہیں تم نہیں دیکھتے، اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور (تم دیکھ رہے ہو کہ) اللہ ہی کی بات ہے جس کے لیے بلندی ہے، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے!

۴۱ (مسلمانو!) سازوسامان کے بوجھ سے) ہلکے ہو یا بوجھل، جس حال میں ہو نکل کھڑے ہو (کہ دفاع کے لیے تمہیں بلایا جارہا ہے) اور اپنے مال سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اگر تم (اپنا نفع نقصان) جانتے ہو، تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔

(۲۰) آیت (۲۹) میں مشرکین عرب کی طرح عرب کے یہودیوں و رشام کے عیسائیوں کے خلاف بھی جنگ کا حکم دیا ہے اور یہی آیت جزیہ کے باب میں اصل و بنیاد ہے۔ اس کی تشریح سورت کے آخری نوٹ میں ملیگی۔

(۲۱) چونکہ سلسلہ بیان اہل کتاب کی طرف متوجہ ہوگیا تھا اس لیے آیت (۳۵) تک ان کی اعتقادی اور عملی گمراہیوں کے اصول و مبادی واضح کیے ہیں اور دعوت قرآنی کی دائمی فتح مندی کی بشارت دی ہے۔ ان کی ضروری تشریح بھی سورت کے آخری نوٹ میں ملیگی۔

(۲۲) چونکہ اب خانۂ کعبہ اور حج کا معاملہ جاہلیت کی تمام آلودگیوں سے پاک ہوگیا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ جاہلیت کی اُس جاہلانہ رسم کا بھی ازالہ کردیا جاتا جس سے حج کا زمانہ مشتبہ کردیا تھا۔ اور مہینوں کے حساب کا عرب میں کوئی معیار قائم نہیں رہا تھا۔ آیت (۳۶) اور (۳۷) میں اسی بات کا اعلان کیا ہے۔ مزید تشریح کے لیے سورت کا آخری نوٹ دیکھو۔

(۲۲) اوپر گذر چکا ہے کہ اس سورت کی بقیہ آیتیں غزوۂ تبوک کے متعلق نازل ہوئی تھیں، چنانچہ یہاں سے لے کر آخر تک اسی غزوہ کا بیان ہے، اور جابجا موعظت و ارشاد کے مختلف اطراف و متعلقات بھی نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔
"تبوک" مدینہ اور دمشق کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جس کا فاصلہ آج کل مدینہ سے چھ سو دس کیلومیٹر حساب کیا گیا ہے۔

خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝ لَوۡ کَانَ عَرَضًا قَرِیۡبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوۡکَ وَ لٰکِنۡۢ بَعُدَتۡ ۴۱
عَلَیۡہِمُ الشُّقَّۃُ ؕ وَ سَیَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَرَجۡنَا مَعَکُمۡ ۚ یُہۡلِکُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ۚ وَ اللّٰہُ
یَعۡلَمُ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ۝ عَفَا اللّٰہُ عَنۡکَ ۚ لِمَ اَذِنۡتَ لَہُمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ۴۲ ع ۶
وَ تَعۡلَمَ الۡکٰذِبِیۡنَ ۝ لَا یَسۡتَاۡذِنُکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ اَنۡ یُّجَاہِدُوۡا ۴۳
بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ ۝ اِنَّمَا یَسۡتَاۡذِنُکَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۴۴

سنہ میں پیغمبر اسلام کو خبر ملی کہ قیصر روم نے یعنے قسطنطنیہ کی مشرقی رومی حکومت نے مدینہ پر حملہ کا حکم دیدیا ہے اور عرب کے عیسائی قبائل بھی شامل ہوگئے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے لیے پہلا موقع تھا کہ عرب سے باہر کی ایک سب سے بڑی طاقتور شہنشاہیت آمادۂ پیکار ہوئی تھی، اس لیے ضروری تھا کہ بروقت مدافعت کا پورا سامان کیا جاتا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے طیاری اور کوچ کا اعلان کردیا۔

لیکن اگر ایک طرف ضرورت ناگزیر تھی تو دوسری طرف وقت کی ساری باتیں ناموافق ہورہی تھیں۔ مسلمان چند ماہ پہلے جنگ حنین و طائف کی لڑائی میں چور ہو چکے تھے، اور اس سے پہلے فتح مکہ کا معاملہ پیش آچکا تھا۔ پھر اچانک مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اور چونکہ مالی وسائل محدود تھے اور باہمی اشتراک و معاونت کی زندگی تھی، اس لیے تنگی و عسرت سب پر چھائی ہوئی تھی۔ پھر موسم بڑی ہی گرمی کا تھا۔ اور فصل کاٹنے کا وقت سر پر آگیا تھا۔ نیز سفر ملک کے اندر نہ تھا۔ اس سے باہر چودہ مرحلوں کا تھا۔ ان سب باتوں نے مل جل کر مسلمانوں کے لیے بڑی ہی مشکلیں پیدا کردیں، اور قدرتی طور پر ان کے قدم رک رک کر اٹھنے لگے۔ حالت بلاشبہ مجبوری کی تھی، لیکن جب دفاع ملت کی گھڑی آجائے، تو اس طرح کی کوئی مجبوری، مجبوری تسلیم نہیں کی جاسکتی، اور ادائے فرض کی راہ بہرحال آسانیوں اور راحتوں کی راہ نہیں ہے۔ اس میں مشکلیں اور مصیبتیں جھیلنی ہی پڑینگی البتہ مصیبتیں عارضی ہونگی، اور نتائج کی کامرانیاں دوامی۔

چنانچہ ان آیات میں مسلمانوں کو اسی حقیقت کی تلقین کی گئی ہے۔

مومنین صادقین نے اس دعوت کا کیا جواب دیا؟ اور ساری باتوں کے ناموافق ہونے پر بھی کس جوش و سرگرمی کے

---

۴۱ (اے پیغمبر!) اگر تمہارا بلاوا کسی ایسی بات کے لیے ہوتا جس میں قریبی فائدہ نظر آتا، اور ایسے سفر کے لیے جو آسان ہوتا، تو (یہ منافق) بلا تامل تمہارے پیچھے ہو لیتے۔ لیکن انہیں راہ دور کی دکھائی دی (اس لیے جی چرانے لگے) اور (تم دیکھوگے کہ یہ) قسمیں کھا کر (مسلمانوں سے) کہیں گے، اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے۔ (افسوس ان پر!) یہ (قسمیں کھا کر) اپنے کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ قطعاً جھوٹے ہیں!

۴۲ (اے پیغمبر!) اللہ تجھے بخشے! تونے ایسا کیوں کیا کہ (ان کی منافقانہ عذرداریوں پر) انہیں (پیچھے رہ جانے کی) رخصت دیدی؟ اس وقت تک رخصت نہ دی ہوتی کہ تجھ پر کھل جاتا، کون سچے ہیں، اور تو معلوم کرلیتا کون جھوٹے ہیں؟

۴۳ جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، وہ کبھی تجھ سے اجازت کے طلبگار نہ ہونگے کہ اپنے مال سے اور اپنی جانوں سے (اللہ کی راہ میں) جہاد کریں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ کون متقی ہیں۔

۴۴ تجھ سے اجازت طلب کرنے والے تو وہی ہیں جو (فی الحقیقت)

۴۵ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ

۴۶ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝ لَوْ خَرَجُوْا

فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ

۴۷ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ

اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اور ان کے دل شک میں پڑ گئے ہیں، تو اپنے شک کی حالت میں متردد ہو رہے ہیں۔

اور اگر واقعی اِن لوگوں نے نکلنے کا ارادہ کیا ہوتا، تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ سروسامان کی طیاری ضرور کرتے، مگر (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے اُن کا اُٹھنا پسند ہی نہیں کیا۔ پس اُنہیں بوجھل کردیا، اور اُن سے کہا گیا (یعنے اُن کے بوجھل پنے نے کہا) دوسرے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ تم بھی بیٹھے رہو۔

اگر یہ تم مسلمانوں میں (گھل مل کے) نکلتے، تو تمہارے اندر کچھ زیادہ نہ کرتے مگر (ہر طرح کی) خرابی، اور ضرور تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کے گھوڑے دوڑاتے (کہ اِدھر کی بات اُدھر لگاتے۔ اُدھر کی اِدھر) اور تم جانتے ہو کہ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اُن کی بات پر کان دھرنے والے ہیں (پس ظاہر ہے کہ اُن کی موجودگی سے بجز فتنہ و فساد کے کچھ حاصل نہ ہوتا) اور اللہ جانتا ہے، کون ظلم کرنے والے ہیں۔

(اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں نے اس سے پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوششیں کیں، اور تمہارے خلاف ہر طرح کی تدبیریں اُلٹ پلٹ کر آزمائیں (چنانچہ

حاشیہ: اس کا جواب تاریخ سے مل سکتا ہے۔ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ تیس ہزار مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کے ساتھ کوچ کیا تھا، اور انفاقِ مال کی فداکاریوں کا یہ حال تھا کہ اگر ایک طرف حضرت عثمان نے نو سو اونٹ پیش کر دیے تھے، تو دوسری طرف ابو عقیل انصاری نے رات بھر ایک کھیت میں آب پاشی کر کے دو سیر چھوہارے مزدوری میں حاصل کیے تھے، اور وہ لا کر اللہ کے رسول کے قدموں پر رکھ دیے تھے!

اسی فوجی طیاری کا یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا تھا حتیٰ کہ کرتے کی گھنڈیاں بھی توڑ کر شامل کر دی تھیں۔ اور جب اللہ کے رسول نے پوچھا تھا۔ ما ابقیت لاھلك، بیوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ آئے؟ تو اس پیکرِ صدق و وفا نے جواب دیا تھا اللّٰہ و رسولہ:

چونکہ اس فوج کی تیاری بڑی ہی تنگی و افلاس کی حالت میں ہوئی تھی اس لیے جیش عسرت کے نام سے مشہور ہوئی۔

(۴۴) قرآن نے یہاں آیت (۳۹) میں اور نیز دیگر مقامات میں "استبدال اقوام" کا ذکر کیا ہے۔ یعنے فرمایا ہے، یاد رکھو، اگر تم نے ادائے فرض میں کوتاہی کی، تو خدا کا قانون اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لا کھڑا کریگا۔

تاریخ کا مطالعہ کرو، تو اس "استبدال" کے مناظر تمہارے سامنے آجائیں گے، اور قرآن پر تدبر کرو تو اس کے سنن و نوامیس واضح ہو جائیں گے۔

حکمتِ الٰہی نے افراد کی طرح جماعتوں کی زندگی و قیام کے لیے بھی ایک خاص نظام مقرر کر دیا ہے، اور اسی کے مطابق ایک جماعت کی جگہ دوسری جماعت سے، اور ایک قوم کی زندگی دوسری قوم کی زندگی سے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ قرآن کہتا ہے، افراد کے نظامِ حیات کی طرح جماعات کا نظامِ حیات بھی جدّ و جہد، سعی و طلب، اور فکر و عمل کی صلاحیت کا نظام ہے

وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ۴۸
ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۚ أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۗ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ إِنْ ۴۹
تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَإِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ أَخَذْنَآ أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ
يَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ ۵۰
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ۵۱

اور یہاں بھی "بقاء انفع" کا قانون کام کر رہا ہے۔ یعنے وہی جماعت کشمکش حیات میں باقی رہتی ہے جو دنیا کے لیے انفع ہو جو انفع نہیں، وہ چھانٹ دی جاتی ہے۔ پس جو جماعت اس قانونِ فطرت کے مطابق اپنے کو زندگی و بقا کا اہل ثابت نہیں کریگی، ضروری ہے کہ اُس کی جگہ کسی دوسری جماعت کو مل جائے اور یہی "استبدالِ اقوام" ہے۔

(۲۵) آیت (۴۰) میں واقعۂ ہجرت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ذکر سورۂ انفال میں بھی گذر چکا ہے (دیکھو آیت ۳۰) جب مکہ میں اعداءِ حق نے فیصلہ کر لیا کہ تمام قبائل کے لوگ مل کر یک وقت پیغمبرِ اسلام پر حملہ کر دیں تو آپ کو ہجرت کا حکم ہوا۔ آپ حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر ثور کے غار میں پوشیدہ ہو گئے جو مکہ سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے۔ یہاں آپ نے تین راتیں بسر کیں اور پھر مدینہ روانہ ہو گئے۔ دشمن جو آپ کی تلاش میں تھے، وہ یہاں بھی پہنچے، لیکن اللہ نے آپ کی حفاظت کا ایسا سامان کر دیا تھا کہ بغیر دیکھے بھالے واپس چلے گئے۔

یہ تین راتیں حضرت ابوبکر نے کہ شمعِ نبوت کے پروانہ تھے، جس عالم میں بسر کی ہونگی، اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے عشق و محبت کا کچھ بھی ذائقہ چکھا ہو۔ اللہ کا رسول غار میں پوشیدہ تھا، دشمن سُراغ میں تھے۔ ہر لمحہ اندیشہ تھا کہ کہیں سُراغ نہ پالیں۔ اور ایک مرتبہ اُن کی صدائیں بھی کانوں میں آنے لگیں تھیں۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اُن کے دل کے حزن و اضطراب کا کیا عالم ہوگا! بلاشُبہ انہیں یقین تھا کہ اللہ اپنے رسول کا مددگار ہے لیکن عشق و محبت کا قدرتی تقاضہ ہے کہ محبوب کو خطرہ میں دیکھ کر اضطراب ہو۔ اس سے وہ اپنے دل کو نہیں روک سکتے تھے۔ اگر روک سکتے، تو محبت کی عدالت کا فیصلہ اُن کے خلاف ہوتا!

جنگ اُحد میں اُنہوں نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی تھی) یہاں تک کہ سچائی نمایاں ہو گئی اور اللہ کا حکم غالب ہوا، اور ایسا ہونا اُن کے لیے خوشگوار نہ تھا! ۴۸

ر اور ان (منافقوں) میں کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے: "مجھے اجازت دیجیے (کہ گھر میں بیٹھا رہوں) اور فتنہ میں نہ ڈالیے"۔ تو سُن رکھو، یہ لوگ فتنہ ہی میں گر پڑے (کہ جھوٹے بہانے بنا کر خدا کی راہ سے مُنہ موڑا، اور فتنہ یہی فتنہ ہے۔ نہ کہ وہ وہمی فتنہ جو ان کے نفاق نے گڑھ لیا ہے) اور بلا شبہ دوزخ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ ۴۹

(اے پیغمبر!) اگر تمہیں کوئی اچھی بات پیش آ جائے تو وہ انہیں (یعنے منافقوں کو) بُری لگے، اور اگر کوئی مصیبت پیش آ جائے تو کہنے لگیں: "اسی خیال سے ہم نے پہلے ہی اپنے لیے مصلحت بینی کر لی تھی" اور پھر گردن موڑ کے خوش خوش چلدیں! ۵۰

کہہ دو ہمیں کچھ پیش نہیں آ سکتا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے (اپنی کتاب میں) لکھ دیا ہے۔ وہی ہمارا کارساز ہے، اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر (ہر طرح کا) بھروسہ

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا ۖ فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ ○ (۵۲) قُلْ أَنْفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَنْ يُتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۖ إِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ ○ (۵۳) وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ ○ (۵۴) فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ

(۵۱) لیکن پیغمبر اسلام کے سکون قلب کا عالم دوسرا تھا۔ اُن کا رفیق غار جب جوشِ محبت میں مضطرب ہوتا تو تسلی دیتے اور فرماتے "غمگین نہ ہو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" خود حضرت ابوبکر کا بیان ہے کہ جب دشمن غار کے قریب آئے تو میں نے مضطرب ہو کر کہا، ان میں سے کسی نے پاؤں اونچا کیا تو ہمیں دیکھ لیگا۔ آنحضرت نے فرمایا "ابوبکر! تم ان دو آدمیوں کے لیے کیا خیال کرتے ہو جن کے لیے تیسرا خود اللہ ہے؟" (شیخین عن انس) یہاں فرمایا، اللہ نے اپنی جانب سے اُس پر سکون و قرار اُتارا یعنے ابوبکرؓ پر، کیونکہ پیغمبر اسلام کا قلب مبارک تو پہلے ہی سے ساکن و برقرار تھا۔

رکھیں۔ (اُس کے سوا بھروسے کا سہارا کوئی نہیں!)

(اے پیغمبر! تم ان سے) کہو: تم ہمارے لیے جس بات کا انتظار کرتے ہو (یعنے جنگ میں قتل ہو جانے کا) وہ ہمارے لیے اس کے سوا کیا ہے کہ دو خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے (یعنے فتح اور شہادت میں سے شہادت) اور ہم تمہارے لیے جس بات کے منتظر ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ اپنے یہاں سے کوئی عذاب بھیج دے، یا ہمارے ہی ہاتھوں عذاب دلائے۔ تو

(۵۲) اب (نتیجہ کا) انتظار کرو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں!

(۵۳) (اور) کہو: تم (بظاہر) خوشی سے (راہِ حق میں) خرچ کرو یا ناخوش ہو کر، تمہارا خرچ کرنا کبھی قبول نہیں کیا جائیگا کیونکہ تم ایک ایسا گروہ ہو گئے جو (احکام الٰہی سے) نافرمان ہے۔

(۲۶) آیت (۴۱) میں فرمایا خفافًا و ثقالًا "خواہ ہلکے ہو خواہ بوجھل" یہاں اس سے مقصود کیا ہے؟ تو حق یہ ہے کہ استعداد اور کمی استعداد کی تمام حالتیں اس میں داخل ہیں۔ نوجوان چلنے پھرنے میں ہلکا ہوتا ہے، زیادہ عمر کا آدمی بوجھل ہوتا ہے۔ سرگرم آدمی فوراً اُٹھ کھڑا ہوگا، کسلمند کے قدم بوجھل ہونگے۔ جس کے علائق زیادہ ہیں، وہ اپنے کو اتنا ہلکا نہ پائیگا جتنا ایک مجرد آدمی، یا کم علائق رکھنے والا۔ اسی طرح کوئی سروسامانِ سفر سے ہلکا ہوگا، کوئی اسلحۂ جنگ سے۔ اگر قرآن کے سمجھنے میں ہمیں صحابۂ و سلف کے فہم کا اعتبار کرنا چاہیے، نہ کہ بعد کے منطقی اصولیوں اور جدلی فقیہوں کا، تو اُنہوں نے اس طرح کی ساری صورتیں اس میں داخل سمجھی تھیں، اور جب کبھی جنگ

(۵۴) اور خرچ کرنے کی قبولیت سے وہ محروم نہیں کیے گئے، مگر اس لیے کہ اُنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے انکار کیا (اگرچہ وہ ایمان کے دعوے میں کسی سے پیچھے نہیں) وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر کاہلی کے ساتھ، اور (راہِ حق میں) مال خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ خرچ کرنے کی ناگواری ان کے دلوں میں بسی ہوئی ہے!

تو دیکھو، یہ بات کہ ان لوگوں کے پاس مال و

وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا

۵۵-۵۶ ۵۷

دولت ہے اور صاحبِ اولاد ہیں تمہیں متعجب نہ کرے۔ یہ تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ نے مال و اولاد ہی کی راہ سے انہیں دنیوی زندگی میں عذاب دینا چاہا ہے (کہ نفاق و بخل کی وجہ سے مال کا غم وبالِ جان ہو رہا ہے، اور اولاد کو اپنے سے برگشتہ اور اسلام میں ثابت قدم دیکھ کر شب و روز جل رہے ہیں) اور (باقی رہا آخرت کا معاملہ تو) ان کی جانیں اس حالت میں نکلینگی کہ ایمان سے محروم ہونگے! ۵۵

اور (دیکھو) اللہ کی قسمیں کھا کر (تمہیں یقین) دلاتے ہیں کہ وہ تم ہی میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں، بلکہ ایک گروہ ہے ڈرا سہما ہوا! ۵۶

(ان کے دلوں کے خوف و نفرت کا یہ حال ہے کہ) اگر انہیں پناہ کی کوئی جگہ مل جائے، یا کوئی غار، یا کوئی اور چھپ بیٹھنے کا سوراخ، تو تم دیکھو کہ یہ فوراً اُس کا رُخ کریں اور حالت یہ ہو کہ گویا رسی تڑا کر بھاگے جا رہے ہیں! ۵۷

اور ان میں کچھ ایسے ہیں کہ مال زکوٰۃ بانٹنے میں تجھ پر عیب لگاتے ہیں (کہ تو لوگوں کی رعایت کرتا ہے) پھر حالت اُن کی یہ ہے کہ اگر انہیں اس

کا عام اعلان ہو جاتا، تو کسی حال میں بھی وہ اپنے کو شرکت سے معاف نہیں رکھتے تھے۔ الّا یہ کہ قطعاً عاجز و معذور ہوں۔

ابو راشد حرانی کہتے ہیں میں نے مقداد بن اسود کو حمص میں دیکھا، جنگ کے لیے نکل رہے تھے۔ میں نے کہا خدا نے تو تمہیں معذور ٹھہرا دیا ہے (بہت بوڑھے ہو) انہوں نے کہا انفروا خفافاً و ثقالاً کا کیا جواب ہے؟ حیان بن زید شرعبی سے مروی ہے کہ میں نے حمص جاتے ہوئے فوج میں ایک نہایت بوڑھے آدمی کو دیکھا جس کی بھویں آنکھوں پر آگری تھیں۔ میں نے متعجب ہو کر کہا کیا خدا نے معذوروں کو معاف نہیں کر دیا؟ اس نے کہا، خدا نے تو ہمیں ہر حال میں نکل کھڑے ہونے کا حکم دیا ہے: خفافاً و ثقالاً۔ ابو ایوب انصاری سے بھی ایسا ہی مروی ہے (ابن جریر)

یہ آیت اس باب میں قطعی ہے کہ جب دفاع کے لیے اعلانِ عام ہو جائے تو پھر اُن معذوروں کے جنہیں آگے چل کر آیت (۹۱) میں مستثنیٰ کر دیا ہے، ہر شخص پر واجب ہو جاتا ہے کہ جان و مال سے شریکِ جہاد ہو، اور اس بارے میں کوئی عذر مسموع نہیں۔

(۲۷) اب آیت (۴۲) سے سلسلہ بیان منافقوں کی طرف متوجہ ہوا ہے جن کے لیے غزوۂ تبوک کا معاملہ ایک آخری اور فیصلہ کن آزمائش ثابت ہوا تھا۔ اس نے تظاہر و نمائش کے تمام پردے چاک کر دیے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام اس سورت کو الفاضحہ کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ کیونکہ اس نے منافقوں کے بھید کھول کر اُن کی فضیحت کر دی۔

منافقوں کی نسبت سورۂ آلِ عمران کی آیت (۳، ۱۷۹) میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ انہیں مومنوں سے ممتاز کر کے آشکارا کر دیگا چنانچہ یکے بعد دیگرے ایسے مرحلے پیش آتے رہے، جن میں نفاق کے چہروں کو بے نقاب ہونا پڑا۔ اس سلسلہ کا آخری مرحلہ غزوۂ تبوک تھا۔

پڑھ چکے ہو کہ اس موقعہ پر نا موافق حالات سے عام مسلمانوں

۵۸ رَضُوا وَإِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ إِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

۵۹ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ إِنَّآ إِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝ إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ

کی سرگرمیاں بھی ابتدا میں کچھ دھیمی ہی تھیں لیکن منافقوں کی حالت بالکل دوسری تھی۔ یہ حکم اُن کے لیے پیامِ موت سے بھی زیادہ سخت ہُوا۔ لگے حیلے بہانے کرنے۔ ہر شخص ایک نیا بہانہ گڑھ کر لاتا اور کہتا، ویسے تو مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ فلاں کام ناگزیر ہوگیا ہے، فلاں بات ناقابلِ حل ہو رہی ہے۔ فلاں الجھاؤ سلجھایا نہیں جا سکتا۔ اب جیسا آپ کا حکم ہو۔ مقصود یہ تھا کہ جھوٹی سچی مجبوریاں سُنائیں گے تو پیغمبرِ اسلام کا اخلاق ایسا نہیں ہے کہ کسی کو مجبور کر کے لے جانا چاہیں۔ اُن کی رحمت و رافت ہمیشہ رسّی ڈھیلی چھوڑ دیتی ہے۔ وہ یہی کہیں گے کہ مجبور ہو تو نہ چلو۔

۵۸ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پیغمبرِ اسلام اُن کے حیلے بہانے سُنتے، اور یہ دیکھ کر کہ بخوشی چلنے کے لیے طیار نہیں، کہہ دیتے اچھا تمہیں رخصت ہے۔

۵۹ ان میں سے بعضوں نے بات بنانے کے لیے یہ بھی کہا کہ مال حاضر ہے لے لیجیے، مگر نکلنا دشوار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں انہی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرمایا، اگر کوئی ایسی بات ہوتی کہ فوری فائدہ دکھائی دیتا، اور سفر بھی دور کا نہ ہوتا، تو ان کے نفاق کو چھپنے کی آڑ مل جاتی جیسی بار بار مل چکی ہے۔ یہ فوراً تیرے پیچھے قدم اُٹھا دیتے۔ ظاہر میں حکم کی تعمیل کرتے، دل میں دنیا کی طمع اور مکر و غدر کی چالیں ہوتیں۔ چنانچہ اُحد وغیرہ میں ایسا ہی کیا تھا۔ مگر انہیں مشکل یہ آپڑی کہ معاملہ نکل آیا عرب سے باہر دور دراز کا، اور سفر کی مشقتیں ہوئیں بڑی ہی سخت۔ نہ تو دنیا کے نفع قریب کی توقع، نہ قربِ مقام کی سہولت کا سہارا۔ پس بے بس ہو کر رہ گئے۔ اور دکھاوے کے لیے ساتھ نہ نکل سکے۔ اللہ کی طرف سے یہی فیصلہ کن آزمائش تھی جس نے سارا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا، اور جب کبھی راہِ حق میں کوئی سخت آزمائش آجاتی ہے، تو منافقوں

میں سے دیا جائے، تو خوش ہو جائیں، نہ دیا جائے تو بس اچانک بگڑ بیٹھیں!

اور (کیا اچھا ہوتا) اگر ایسا ہوتا کہ جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے اُنہیں دیدیا، اُس پر رضامند ہو جاتے اور کہتے، ہمارے لیے اللہ بس کرتا ہے۔ اللہ اپنے فضل سے ہمیں (بہت کچھ) عطا فرمائیگا، اور اُس کا رسول بھی (عطا و بخشش میں کمی کرنے والا نہیں)، ہمارے لیے تو بس اللہ ہی غایت و مقصود ہے!

صدقہ کا مال (یعنے مالِ زکوٰۃ) تو اور کسی کے لیے نہیں ہے۔

صرف فقیروں کے لیے ہے۔

اور مسکینوں کے لیے ہے۔

اور اُن کے لیے، جو اُس کی وصولی کے کام پر مقرر کیے جائیں۔

اور وہ، کہ اُن کے دلوں میں (کلمۂ حق کی) اُلفت پیدا کرنی ہے۔

اور وہ، کہ اُن کی گردنیں (غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہیں (اور اُنہیں آزاد کرانا ہے)

نیز قرضداروں کے لیے (جو قرض کے بوجھ سے

۶۰

وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ

کچھرے اسی طرح بے نقاب ہو جایا کرتے ہیں!

(۲۸) آیت (۴۳) کے اسلوبِ بیان پر غور کرو کیسے دلکش اور پُرعظمت انداز میں پیغمبرِ اسلام کو متنبہ کیا ہے کہ رحمت و درگزر کی ایک حد ہونی چاہیے۔ اب یہ اس کے مستحق نہیں کہ رسی اتنی ڈھیلی چھوڑ دی جائے۔

فرمایا، جب یہ لوگ ایک طرف تو جھوٹے عذر سُناتے تھے، دوسری طرف یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ جو آپ کا حکم ہو۔ تو بہتر تھا کہ تم انہیں پوری آزمائش میں ڈال دیتے۔ یعنے کہتے، میرا حکم تو یہی ہے کہ چلنا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ کھل جاتا، کون یہ کہنے میں سچے تھے، کون ایسا کہہ دینے پر بھی نہ نکلنے والے تھے۔

(۲۹) آیت (۴۴) میں فرمایا، جن کے دلوں میں ایمان کی لگن ہے، بھلا وہ ایک ایسے کام میں کیوں حکم مانگنے لگے؟ اور کیوں اس کے انتظار میں بیٹھنے لگے؟ اُن کے لیے تو صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ادائے فرض کا وقت آگیا اور جسے ایمان عزیز ہے، وہ ادائے فرض کے لیے مستعد ہو جائے۔ حکم تو وہی مانگینگے جن کے دلوں میں سچّا ایمان نہیں اور جو شک کے روگی ہو رہتے ہیں، تاکہ کوئی نہ کوئی راہ نکل بھاگنے کی مل جائے۔

(۳۰) چونکہ مقابلہ بیزنطانی شہنشاہی سے تھا جو مشرق میں رومۃ الکبریٰ کی عظمت کی جانشین تھی، اور ابھی حال میں ایران کو شکست دے چکی تھی، اس لیے منافقوں کو یقین تھا مسلمانوں کے خاتمے کے دن آگئے۔ عبداللہ بن ابی سلول نے جو منافقوں کا سرغنہ تھا، لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ پیغمبرِ اسلام اس سفر سے لوٹنے والے نہیں۔

آیت (۴۷) میں فرمایا، یہ سمجھے، پیچھے رہ کر مصیبت سے بچے، اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا نہ نکلنا ہی تمہارے لیے بہتر ہوا۔ کیونکہ نکلتے، تو فتنوں کے گھوڑے دوڑاتے، اور کچے دل کے آدمیوں کو بہکاتے رہتے۔ اس سے پہلی آیت میں فرمایا "مگر اللہ کے حضور اُن کا اُٹھنا ناپسند ہوا" یعنے اللہ کے علم میں تھا کہ ایسے

دب گئے ہوں، اور ادا کرنے کی طاقت نہ رکھیں)

اور اللہ کی راہ میں۔ (یعنے جہاد کے لیے، اور اُن تمام کاموں کے لیے، جو مثلِ جہاد کے اعلاءِ کلمۂ حق کے لیے ہوں)

اور مسافروں کے لیے (جو اپنے گھر نہ پہنچ سکتے ہوں اور مفلسی کی حالت میں پڑ گئے ہوں)

یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی بات ہے، اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا (اپنے تمام حکموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

۶۰

اور انہی (منافقوں) میں (وہ لوگ بھی) ہیں جو اللہ کے نبی کو (اپنی بدگوئی سے) اذیت پہنچانا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں یہ شخص تو بہت سننے والا ہے (یعنے کان کا کچّا ہے۔ جو بات کسی نے کہدی، اس نے مان لی۔ اے پیغمبر!) تم کہو، ہاں، وہ بہت سُننے والا ہے، مگر تمہاری بہتری کے لیے (کیونکہ وہ بجز حق کے کوئی بات قبول نہیں کرتا) وہ اللہ پر یقین رکھتا ہے (اس لیے اللہ جو کچھ اُسے سُناتا ہے، اُس پر اُسے یقین ہے) اور وہ (سچّے) مومنوں کی بات پر بھی یقین رکھتا ہے (جن کی سچائی ہر طرح کے امتحانوں میں پڑ کر کھری ثابت ہو چکی ہے) اور وہ اُن لوگوں کے لیے سرتاسر رحمت ہے جو تم میں

٦١ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ

٦٢ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ

٦٣ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ○ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ

اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا

٦٤ تَحْذَرُوْنَ ○

سے ایمان لائے ہیں، اور جو لوگ اللہ کے رسول کو آزار پہنچانا چاہتے ہیں، تو اُنہیں سمجھ لینا چاہیے، اُن کے لیے عذاب ہے، عذاب دردناک!

(مسلمانو!) یہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کرلیں۔ حالانکہ اگر یہ واقعی مومن ہوتے، تو سمجھتے کہ اللہ اور اُس کا رسول اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اُسے (اپنے ایمان و عمل سے) راضی رکھیں۔

کیا (ابھی تک) اُنہوں نے یہ بات (بھی) نہ جانی کہ جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے، اُس کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔ ہمیشہ اس میں جلیگا؟ اور یہ بہت ہی بڑی رسوائی ہے (جو کسی انسان کے حصے میں آسکتی ہے!)

منافق اس بات سے (بھی) ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو، اُن کے بارے میں کوئی سورت نازل ہوجائے، اور جو کچھ اُن کے دلوں میں (چھپا) ہے، وہ اُنہیں (علانیہ) جتادے۔ (تو اے پیغمبر!) تم اِن سے کہہ دو: "تم (اپنی عادت کے مطابق) تمسخر کرتے رہو۔ یقیناً اللہ اب وہ بات (پوشیدگی سے) نکال کر ظاہر کردینے والا ہے جس کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے"

نہیں نکلینگے، اور اللہ نے تمہارے لیے اسی میں بہتری دیکھی کہ نہ نکلیں۔

٦١ (۳۱) اس سے معلوم ہوا کہ جماعتی زندگی کے لیے مذبذب اور کچے دل کے آدمیوں کی موجودگی ایک بڑا مہلکہ ہے خصوصاً جب کہ قوم موت و حیات کی جد و جہد میں مشغول ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد سے آزاد قومیں بھی مجبور ہوئیں کہ جنگ کے وقت حکومت کو غیر معمولی اختیارات دیدیں، اور اگر شخصی آزادی کے قوانین بھی معطل کردے تو معترض نہ ہوں۔ کیونکہ اس وقت ایک منافق کی شرارت پوری قوم کو خطرہ میں ڈال دے سکتی ہے۔

٦٢ اِن آیات کی موعظت یہ ہے کہ حتی الامکان ایسے افراد کی موجودگی برداشت نہیں کرنی چاہیے، اور ایسا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اُن کی علیحدگی سے جو عارضی شور و شغب ہوگا، وہ جماعتی مصالح کے لیے زیادہ مضر ہوگا۔ اگر درخت کی جڑ درست ہے تو جتنا چھانٹوگے، اتنا ہی زیادہ پھلتا جائیگا، اور فاسد اعضا کا الگ کردینا مضر نہیں ہوتا، چھوڑ دینا جسم کے لیے مہلک ہوتا ہے۔

٦٣ (۳۲) جب انسان میں سچائی باقی نہیں رہتی، تو نیکی و پرہیزگاری کے خیال کو خود نیکی و پرہیزگاری ہی کے خلاف استعمال کرنے لگتا ہے اور اس سے حیلے بہانے کا کام نکالتا ہے۔ اور یہ نفاق کا سب سے زیادہ پُرفریب حربہ ہے۔ بہت سے سادہ لوح دیندار اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔

چنانچہ آیت (۴۹) میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرمایا، بعض منافق کہتے ہیں، اس سفر میں نکلنا فتنوں میں پڑنا ہے۔ پس ہمیں فتنہ میں نہ ڈالیے۔ مدینہ ہی میں بیٹھے

٦٤ رہنے دیجیے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ۝ ۶۵ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ إِنْ نَعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝ ۶۶ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ ۚ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ۗ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ ۶۷

اس فتنہ سے اُن کا مقصود کیا تھا؟ اسے اس لیے بیان نہیں کیا کہ یہی قرائن واضح کر رہے ہیں، اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہو۔ وہ یقیناً ہر طرح کے متوقع اور وہمی خطرات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتے ہونگے، اور اُسے فتنہ سے تعبیر کرتے ہونگے۔ مثلاً اس موسم میں ہزاروں آدمیوں کو اس قدر دور کے سفر پر بیجا جان بوجھ کر نہیں ہلاک کرنا ہے، اور یہ نیکی کا کام نہیں۔ پھر جہاں جانا ہے، وہ دوسروں کا ملک ہے۔ نہیں معلوم کن کن برائیوں میں پڑنا پڑے؟

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبر اسلام نے تبوک کا ارادہ کیا تو منافقوں کے ایک سردار جد بن قیس نے کہا "عورتوں کے معاملہ میں میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے ڈر ہے، کہیں بنو اصفر کی عورتیں دیکھ کر مفتون نہ ہو جاؤں۔ پس مجھے رہجانے کی اجازت دیدیجیے، اور اس فتنہ میں نہ ڈالیے" (ابن جریر، بنو اصفر یعنے رومی) اس سے معلوم ہوا، جو باتیں کہی گئی ہونگی، وہ اسی قسم کی ہونگی۔ فرمایا، یہ جھوٹے بہانے نکالنے کے لیے جھوٹے فتنہ کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ یہ خود کراصلی فتنہ میں گر پڑے کہ راہِ حق میں جہاد کرنے سے جی چرایا، اور اس کے لیے جھوٹی نیکی و پرہیزگاری کی آڑ پکڑی۔

غور کروگے تو نفاق کی یہ خصلت آج بڑے بڑے مدعیانِ علم و مشیخت میں بولتی نظر آئیگی۔ جھوٹی دینداری اور وہمی پرہیزگاری نے سعی و عزم کی تمام راہیں اُن پر بند کر دی ہیں، اور وہ ساعی ہیں کہ اُمت پر بھی بند کر دیں۔ ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا، ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصدِ وقت پر توجہ دلاؤں۔ ممکن ہے، چند اصحابِ رشد و عمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی، لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ ائذن لی ولا تفتنی۔ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی، جو اب رحمتِ الٰہی کے جوار میں پہنچ چکی ہے۔

اور اگر تم ان لوگوں سے پوچھو (ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟) تو یہ ضرور جواب میں کہیں "ہم نے تو یونہی جی بہلانے کو ایک بات چھیڑ دی تھی اور ہنسی مذاق کرتے تھے" تم (ان سے) کہو "کیا تم اللہ کے ساتھ، اس کی آیتوں کے ساتھ اور اُس کے رسول کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہو؟" ۶۵

بہانے نہ بناؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے ایمان کا اقرار کرکے پھر کفر کیا۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو (اُس کے عدم اصرار اور توبہ و انابت کی وجہ سے) معاف بھی کر دیں، تاہم ایک گروہ کو ضرور عذاب دینگے۔ اس لیے کہ (اصل میں) وہی مجرم تھے۔ ۶۶

منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک دوسرے کے ہم جنس۔ برائی کا حکم دیتے ہیں، اچھی باتوں سے روکتے ہیں، اور (راہِ حق میں خرچ کرنے سے) اپنی مٹھیاں بند رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ بھی اللہ کے حضور بھلا دیے گئے (یعنے جو اُس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے، اُس کے قوانینِ فضل و سعادت بھی اُسے بھلا کر چھوڑ دیتے ہیں) بلاشبہ یہ منافق ہی ہیں جو (دائرۂ حق سے) باہر ہو گئے ہیں! ۶۷

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِىَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ ۶۸ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ۶۹ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ڏ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ

منافق مردوں اور منافق عورتوں کے لیے اور (کھلے) منکروں کے لیے اللہ کی طرف سے دوزخ کی آگ کا وعدہ ہے کہ ہمیشہ اُس میں رہینگے، اور وہی اُنہیں بس کرتی ہے۔ نیز اللہ نے اُن پر لعنت کی، اور اُن کے لیے عذاب ہے، ایسا عذاب کہ برقرار رہیگا!

۷۰ (منافقو! تمہارا بھی وہی حال ہوا) جیسا اُن لوگوں کا حال تھا کہ تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ تم سے کہیں زیادہ قوت والے تھے، اور مال و اولاد بھی تم سے زیادہ رکھتے تھے۔ پس اُن کے حصّے میں جو کچھ دنیا کے فوائد آئے، وہ برت گئے۔ تم نے بھی اپنے حصّہ کا فائدہ اُسی طرح برت لیا جس طرح اُنہوں نے برتا تھا، اور جس طرح (ہر طرح کی باطل پرستی کی) باتیں وہ کر گئے، تم نے بھی کر لیں۔ (پس یہ نہ بھولو کہ) یہی لوگ تھے، جن کے سارے کام دنیا و آخرت میں اکارت ہوئے، اور یہی ہیں گھاٹے ٹوٹے میں رہنے والے!

۶۹ کیا انہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں ملی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، اور مدین کے لوگ، اور وہ کہ اُن کی بستیاں اُلٹ دی گئی تھیں! اِن سب کے رسول اُن کے

تم نے بعض علماء کے فتوے پڑھے ہونگے کہ مسلمانوں کو وقت کی سیاسی مجالس میں شریک نہ ہونا چاہیے، کیونکہ اُس میں غیر مسلم عورتیں کھلے مُنہ موجود ہوتی ہیں، اور اس لیے اُن کی شرکت فتنہ سے خالی نہیں! اسی طرح یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اُنکی شرکت سے نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے، اور یہ تقوے کے خلاف ہے۔ یاد رکھو، یہ تقویٰ اور دینداری نہیں ہے جو اِن کاموں کی مخالفت پر اِنہیں اُبھارتی ہے۔ یہ مرضِ نفاق کی قسموں میں سے ایک قسم ہے، اور قرآن کی شہادت اس کے لیے بس کرتی ہے۔

(۳۳) آیت (۵۲) کا ٹھیک مطلب سمجھ لو۔ فرمایا تم ہمارے لیے جس بات کے انتظار میں رہتے ہو، وہ یہ ہے کہ ہم جنگ میں مارے جائیں اور شکست ہو، لیکن ہمارے لیے تو یہ بھی اِحدی الحُسنیین ہے۔ یعنے دو خوبیوں میں سے ایک خوبی۔ اور یہی مقام ہے جسے قرآن ایمان اور ایمان والوں کی خصوصیت قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے، جو کفر کی راہ چلے، تو اُنہیں اس کی سمجھ نہیں۔

دنیا میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت کسی مقصد کے لیے جدو جہد کرتی ہے، تو اُس کے سامنے اُمید بھی ہوتی ہے، مایوسی بھی۔ کامیابی بھی ہوتی ہے، ناکامیابی بھی۔ لیکن قرآن کہتا ہے، مومن وہ ہے جس کی جدو جہد میں جو کچھ ہے، اُمید و کامرانی ہی ہے، مایوسی و ناکامی کی اُس پر پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کے لیے کرتا ہے، اور اُس کے لیے یہی بات کامیابی نہیں ہوتی کہ کسی خاص منزل تک پہنچ جائے، بلکہ اُس کی راہ میں چلتے رہنا اور جدو جہد میں لگے رہنا بجائے خود بڑی سے بڑی کامیابی ہے۔ وہ جب اپنا سفر شروع کرتا ہے، تو اس لیے نہیں کرتا، کہ کسی خاص منزل تک ضرور ہی پہنچ جائے،

بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ۷۰ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ۷۱ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ۷۲

بلکہ صرف اس لیے، کہ کسی کی راہ میں چلتا رہے۔ اور یہ جو کسی کی راہ میں چلتی رہنا ہے، تو یہی اس کے لیے منزل مقصود ہے:

رہرواں را خستگی راہ نیست ۔ عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست!

دوسرے اگر جد و جہد کرتے ہوئے مرجائیں تو یہ اُن کی ناکامیابی ہے۔ مومن اگر مرجائے، تو اُس کی بڑی سے بڑی فتح مندی ہے۔ ایسی فتح مندی جس سے بڑی فتح مندی کی وہ اپنی ذات کے لیے آرزو ہی نہیں کرسکتا!

تا نگہ عمر تو بر گزیدند ہمہ ۔ در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکہ دو کون فتح از عشق ست ۔ با آنکہ سپاہ او شہیدند ہمہ

دوسرے اگر لڑیں اور دشمنوں پر غالب نہ آسکیں تو اُن کی ہار ہوئی۔ لیکن مومن وہ ہے جو ہار کے معنی ہی سے ناآشنا ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی میدان میں غالب نہ آئے، جب بھی جیت اسی کی ہے کیونکہ اس کی ہار جیت کا معیار میدان جنگ نہیں ہوتا خود اس کی طلب وسعی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی سعی طلب میں پورا نکلا، تو اُس نے میدان مارلیا، اگرچہ میدانِ جنگ میں اس کی لاش ہزاروں لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ہو!

یہی وجہ ہے کہ اس راہ میں وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ اُس کی موت بھی اُس کی زندگی ہوتی ہے۔ ولکن لا تشعرون!

یہ جو قرآن نے جابجا زور دیا ہے کہ مومن کا مقصدِ سعی صرف اللہ اور اُس کی سچائی ہے، اور مومن کی جہد کا نام "جہد فی سبیل اللہ" رکھ دیا، تو اس میں یہی حقیقت پوشیدہ ہے۔ یعنے وہ ساری منزلوں سے جو دنیا میں پیش آسکتی ہیں، بلند کردیا گیا۔ اب یہاں کی کوئی منزل اُس کی منزل مقصود نہیں ہوسکتی کہ اُس تک نہ پہنچ سکنا اُس کی ناکامیابی کا فیصلہ کردے۔ اُس کے لیے منزل مقصود تو صرف یہ ہے کہ حق کی راہ میں چلتا رہے، اور رکے نہیں۔ اُس کا ہر قدم جو چلتا رہا فتح مندی ہے، اور ہر قدم جو رک گیا، نامرادی!

پاس روشن دلیلوں کے ساتھ آئے تھے، (مگر وہ اندھے پن سے باز نہ آئے) اور ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ اُن پر ظلم کرتا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے! (۷۰)

اور جو مرد اور عورتیں مومن ہیں، تو وہ سب ایک دوسرے کے کارساز و رفیق ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور (ہر حال میں) اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن پر عنقریب اللہ رحمت فرمائیگا۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے! (۷۱)

مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے اللہ کی طرف سے (نعیم ابدی کے) باغوں کا وعدہ ہے، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی (اور اس لیے کبھی خشک ہونے والے نہیں) وہ ہمیشہ اُن میں رہینگے۔ نیز اُن کے لیے ہمیشگی کے باغوں میں پاک مسکن ہونگے، اور ان سب سے بڑھ کر (نعمت یہ کہ) اللہ کی خوشنودیوں کا اُن پر نزول ہوگا! (۷۲)

۷۳ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

۷۴ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا ۷۵-۷۶

۷۳ اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں، دونوں سے جہاد کر، اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آ (کیونکہ کافروں کی عہد شکنیاں اور منافقوں کا غدر و فریب اب آخری درجہ تک پہنچ چکا ہے) بالآخر اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ (اور جس کا آخری ٹھکانا دوزخ ہو، تو) کیا ہی بُری پہنچنے کی جگہ ہے!

یہ (منافق) اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں کہا، اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ضرور کفر کی بات کہی۔ وہ اسلام قبول کرکے پھر کفر کی چال چلے اور اُس بات کا منصوبہ باندھا جو نہ پاسکے۔ انہوں نے انتقام نہیں لیا مگر اس بات کا کہ اللہ اور اُس کے رسول نے اُنہیں اپنے فضل سے (مالِ غنیمت دے دے کر) تونگر کر دیا ہے! بہرحال اگر یہ لوگ اب بھی باز آجائیں تو ان کے لیے بہتر ہے، اور اگر گردن موڑیں، تو پھر یاد رکھیں، اللہ ضرور اُنہیں دنیا اور آخرت میں عذابِ دردناک دیگا، اور روئے زمین پر ان کا نہ کوئی کارساز ہونے والا ہے، نہ مددگار! ۷۴

اور (دیکھو) اِن میں (کچھ لوگ) ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں (مال و دولت) عطا فرمائیگا، تو ہم ضرور خیرات کرینگے، اور ضرور نیکی کی زندگی بسر کرینگے۔ ۷۵

پھر جب ایسا ہوا کہ اللہ نے اُنہیں اپنے فضل سے (مال) عطا فرمایا، تو اُس میں کنجوسی کرنے لگے اور اپنے عہد سے پھر گئے، اور حقیقت یہ ہے کہ (نیکی کی طرف سے) اُن کے دل ہی پھرے ہوئے ہیں۔ ۷۶

بہرحال یاد رہے کہ "دو خوبیوں" سے مقصود یہی حقیقت ہے یعنے فتح مندی یا شہادت، اور شہادت بھی فتح مندی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ "شہادت یا مالِ غنیمت" جیسا کہ بعضوں نے خیال کیا۔ اور حاشا کہ مالِ غنیمت مومن کے لیے اِحدَی الحُسنَیَین ہو۔

(۴۴) آیت (۷۳) تک مدینہ کے منافقوں کے حالات و خصائل پر مزید روشنی ڈالی ہے، اور اُن معاملات کی طرف اشارات کیے ہیں جو غزوۂ تبوک کی ابتدا میں اور پھر سفر کے درمیان اور واپسی پر پیش آئے۔ اور بالآخر ان لوگوں کے لیے آخری احکام صادر کیے ہیں۔ ان تمام آیات کے لیے سورت کا آخری نوٹ دیکھو، کیونکہ بغیر یک جائی نظر ڈالے تمام پہلو واضح نہیں ہو سکتے تھے۔

(۴۵) آیت (۶۰) میں زکوٰۃ کے مصارف بیان کردیے۔ توضیح کے لیے آخری نوٹ دیکھو۔

فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ ۙ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا

۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ع ۸

پس اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے دلوں میں نفاق (کا روگ) دائمی ہوگیا ۔ اُس وقت تک کے لیے کہ یہ اللہ سے ملیں (یعنے قیامت تک دور ہونے والا نہیں) اور یہ اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا اُسے (جان بوجھ کر) پورا نہیں کیا ، اور نیز دروغ گوئی کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے ہیں ۷۷

(افسوس اُن پر!) کیا اُنھوں نے نہیں جانا کہ اللہ اُن کے بھیدوں اور سرگوشیوں سے واقف ہے ، اور یہ کہ غیب کی کوئی بات اُس سے پوشیدہ نہیں ؟ ۷۸

جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خوش دلی سے خیرات کرنے والے مومنوں پر (ریاکاری کا) عیب لگاتے ہیں ، اور جن مومنوں کو اپنی محنت مشقت کی کمائی کے سوا اور کچھ میسّر نہیں (اور اس میں سے بھی جتنا نکال سکتے ہیں راہ حق میں خرچ کردیتے ہیں) اُن پر تمسخر کرنے لگتے ہیں ، تو اُنھیں معلوم ہوجائے کہ) دراصل اللہ کی طرف سے خود اُن پر تمسخر ہو رہا ہے (کہ ذلت و نامرادی کی زندگی بسر کر رہے ہیں) اور (آخرت میں) اُن کے لیے عذاب دردناک ہے! ۷۹

(اے پیغمبر!) تم اُن کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو ، (اب اُن کی بخشش ہونے والی نہیں) تم اگر ستر مرتبہ بھی اُن کے لیے مغفرت کی دعا کرو (یعنے سینکڑوں مرتبہ ہی دعائیں نہ کرو) جب بھی اللہ اُنھیں کبھی نہیں بخشیگا ۔ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ، اور اللہ (کا مقررہ قانون یہ ہے کہ وہ) دائرۂ ہدایت سے نکل جانے والوں پر (کامیابی و سعادت کی) راہ کبھی نہیں کھولتا ۔ ۸۰

جو (منافق جہاد میں شریک نہیں ہوئے اور) پیچھے چھوڑ دیے گئے ، وہ اس بات پر خوش ہوئے کہ اللہ کے رسول کی خواہش کے خلاف اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں ، اور اُنھیں یہ بات ناگوار ہوئی کہ اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں ۔ اُنھوں نے لوگوں سے کہا تھا " اس

لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۗ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۗ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ○ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ ۸۱
لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ ۸۲
فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۗ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ
بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ○ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ ۸۳
عَلٰى قَبْرِهٖ ۗ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ ۸۴
اَوْلَادُهُمْ ۗ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○ وَ ۸۵
اِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ ۸۶
وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ○

گرمی میں (گھر کا آرام چھوڑ کر) کوچ نہ کرو"۔ (اے پیغمبر!) تم کہو "دوزخ کی آگ کی گرمی تو (اس سے) کہیں زیادہ گرم ہوگی"۔ اگر انہوں نے سمجھا ہوتا (توکبھی اپنی اس حالت پر خوش نہ ہوتے!) ۸۱

(اچھا، یہ تھوڑا سا ہنس لیں۔ پھر انہیں اپنی اُن بدعملیوں کی پاداش میں بہت کچھ رونا ہے جو یہ کماتے رہے ہیں! ۸۲

تو (دیکھو) اگر اللہ نے تمہیں ان کے کسی گروہ کی طرف (صحیح سلامت) لوٹا دیا، اور پھر (کسی موقعہ پر) انہوں نے (جہاد میں) نکلنے کی اجازت مانگی، تو اس وقت تم کہہ دینا "نہ تو تم میرے ساتھ کبھی نکلو، اور نہ کبھی میرے ساتھ ہو کر دشمن سے لڑو۔ تم نے پہلی مرتبہ بیٹھ رہنا پسند کیا، تو اب بھی پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ (گھروں میں) بیٹھے رہو!" ۸۳

اور (اے پیغمبر!) ان میں سے کوئی مرجائے، تو تم کبھی اُس کے جنازہ پر (اب) نماز نہ پڑھنا، اور نہ اُس کی قبر پر کھڑے رہنا۔ کیونکہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور اس حالت میں مرے کہ (دائرۂ) ہدایت سے باہر تھے۔ ۸۴

اور (دیکھو) اُن کے مال اور اُن کی اولاد پر تمہیں تعجب نہ ہو۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ چاہتا ہے، مال و اولاد کے ذریعہ انہیں عذاب دے (یعنے ایسے لوگوں کے لیے اُس کا مقررہ قانونِ حیات ایسا ہی ہے) اور ان کی جان اس حالت میں نکلے کہ سچائی کے منکر ہوں۔ ۸۵

اور (اے پیغمبر!) جب کوئی (قرآن کی) سورت اس بارے میں اُترتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو، تو جو لوگ ان میں مقدور والے ہیں، وہی تجھ سے رخصت مانگنے لگتے ہیں کہ "ہمیں چھوڑ دیجیے۔ گھر میں بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہیں" ۸۶

رَضُوا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ ٨٧
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ؗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ ٨٨
الْعَظِيْمُ ۝ وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ ٨٩ ع ١١
رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى ٩٠
وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا

اُنہوں نے پسند کیا کہ پیچھے رہجانے والیوں کے ساتھ رہیں۔ (یعنے مرد ہوکر جنگ کے وقت عورتوں کے ساتھ گھروں میں بیٹھے رہیں) اور اُن کے دلوں پر مہر لگ گئی، پس یہ کچھ سمجھتے نہیں! ٨٧

لیکن اللہ کے رسول نے اور اُنہوں نے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنے مال سے اور اپنی جانوں سے (راہِ حق میں) جہاد کیا، (اور اِن کی منافقانہ چالیں کچھ بھی نہ کرسکیں) یہی لوگ ہیں کہ اُن کے لیے نیکیاں ہیں، اور یہی ہیں کہ کامیاب ہوئے! ٨٨

اللہ نے اُن کے لیے (نعیم ابدی کے) ایسے باغ طیار کردیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور اس لیے کبھی خشک ہونے والے نہیں) یہ ہمیشہ ان میں رہینگے۔ اور یہ ہے بہت بڑی فیروزمندی (جو اُن کے حصے میں آئی)! ٨٩

اور (اے پیغمبر!) اعرابیوں میں سے (یعنے عرب کے صحرائی بدوؤں میں سے) عذر کرنے والے تمہارے پاس آئے کہ اُنہیں بھی (رہ جانے کی) اجازت دی جائے، اور (ان میں سے) جن لوگوں نے (اظہار اسلام کرکے) اللہ اور اُس کے رسول سے جھوٹ بولا تھا، وہ گھروں ہی میں بیٹھے رہے۔ سو معلوم ہو کہ ان میں سے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی، اُنہیں عنقریب عذابِ دردناک پیش آئیگا۔ ٩٠

(١) آیت (٩٠) میں سلسلۂ بیان ایک دوسرے گروہ کی طرف متوجہ ہوا ہے کہ ان میں بھی ایک جماعت منافقوں کی تھی، اور ایک جماعت کمزور ایمان والوں کی یعنے صحرانشین قبائل جن کا بقیہ آج بھی موجود ہے اور عرب کے بدو کہے جاتے ہیں۔ ان کا بڑا حصہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا، اور شہروں میں نہ رہنے کی وجہ سے ابھی اسلامی زندگی کی تربیت نہیں ملی تھی۔ غزوۂ تبوک کا بلاوا ہوا، تو کچھ لوگ آئے اور عذر پیش کیے۔ کچھ ایسے نکلے جو چپکے بیٹھے رہے۔ معذرت کے لیے بھی نہیں آئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذر کرنے والے عامر بن طفیل کے قبیلے کے تھے۔ اُنہوں نے کہا تھا اگر ہم آپ کے ساتھ نکلے تو طَے کے بدو ہمارے مویشی اور اولاد پر آپڑیں گے (ابن جریر) چنانچہ جو منافق تھے، اُن کے لیے وعید ہوئی اور جنھوں نے کمزوری کی وجہ سے پہلوتہی کی تھی، اُن پر عتاب ہوا۔

ناتوانوں پر، بیماروں پر، اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لیے کچھ میسر نہیں، کچھ گناہ نہیں ہے (اگر وہ دفاع میں شریک نہ ہوں) بشرطیکہ اللہ اور

٩١ نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝ ٩٢ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَاۗءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ٩٣ يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ

اُس کے رسول کی خیرخواہی میں کوشاں رہیں۔ (کیونکہ ایسے لوگ نیک عملی کے دائرہ سے الگ نہیں ٩١ ہوئے، اور) نیک عملوں پر الزام کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ بڑا ہی بخشنے والا، رحمت والا ہے!

اور نہ اُن لوگوں پر کچھ گناہ ہے، جن کا حال یہ تھا، کہ (خود سواری کی مقدرت نہیں رکھتے تھے، اس لیے) تیرے پاس آئے کہ اُن کے لیے سواری ہم پہنچا دے، اور جب تونے کہا، میں تمہارے لیے کوئی سواری نہیں پاتا، تو (بے بس ہوکر) لوٹ گئے، لیکن ان کی آنکھیں اس غم میں اشکبار ہو رہی تھیں کہ افسوس، ہمیں میسر نہیں کہ اس راہ میں کچھ خرچ کریں!

٩٢ الزام تو دراصل اُن پر ہے، جو تجھ سے (بیٹھے رہنے کی) اجازت مانگتے ہیں حالانکہ مالدار ہیں۔ اُنھوں نے پسند کیا کہ (جب سب لوگ راہِ حق میں کوچ کر رہے ہوں، تو یہ) گھروں میں رہجانے والی عورتوں کے ساتھ رہیں! (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے انکے دلوں پر مُہر لگادی، پس جانتے بوجھتے نہیں!

٩٣ جب تم (جہاد سے لوٹ کر) اُن کے پاس واپس جاؤگے، تو وہ آئینگے اور تمہارے سامنے (طرح طرح کی) معذرتیں کرینگے۔ (اے پیغمبر! تمہیں چاہیے (اُس وقت) کہدو: "معذرت کی باتیں نہ بناؤ۔ اب ہم تمہارا

(٢) کوئی بات دنیا میں اس سے زیادہ عجیب نہیں ہوسکتی کہ وحشی اور بہائم صفت انسان، اچانک محبت و اخلاص اور ایثار و خود فراموشی کے فرشتے بن جائیں، لیکن قرآن کی تعلیم نے ایسا ہی انقلاب پیدا کیا۔ اوپر گذر چکا ہے کہ غزوۂ تبوک بڑے ہی ناموافق حالات میں پیش آیا تھا حتیٰ کہ لوگوں کی افسردگی پر اللہ کا عتاب ہوا، لیکن اس پر بھی لوگوں کا کیا حال تھا؟ یہ تھا کہ شدتِ دردِ غم سے بے اختیار ہوکر رونے لگتے تھے۔ کس بات پر؟ اس پر، کہ عیش و راحت میں انہیں حصہ نہیں ملا؟ نہیں، اس پر کہ راہِ حق کی مصیبتوں اور قربانیوں میں شریک ہونے سے رہ گئے!

آیت (٩١) میں بتلادیا۔ اگر دفاع کے لیے نفیرِ عام ہو تو کن کن لوگوں کو معذور تصور کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا، ناتواں آدمی۔ یعنے جو لوگ جسمانی طور پر مجبور رہوں۔ مثلاً بہت بوڑھے، اندھے، اپاہج۔ دوسرے بیمار۔ تیسرے ایسے لوگ جو سفر کی لازمی ضروریات کے انتظام کی مقدرت نہ رکھتے ہوں۔

اُس عہد میں نہ تو سرکاری فوج وجود میں آئی تھی، نہ رضاکاروں کی کوئی الگ قسم تھی، نہ سپاہیوں کے مصارف کے لیے حکومت کا کوئی خزانہ تھا۔ سبھی رضاکار تھے اور سب کے لیے ضروری تھا کہ اپنا خرچ خود ہی اٹھائیں، بلکہ بن پڑے تو دوسروں کے لیے بھی خرچ کریں۔ پس فرمایا، جو لوگ فی الحقیقت مقدور نہیں رکھتے، کوئی وجہ نہیں کہ اُن پر الزام آئے۔ خصوصاً وہ لوگ جن کے ایمان و اخلاص کا یہ حال تھا کہ جب اُن کے لیے سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور تیرے ادب و احترام نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ زیادہ اصرار کریں، تو خاموش اُٹھ کر لوٹ گئے لیکن آنکھیں جو دردِ دل کی

لَكُمْ قَدْ نَبَّأَنَا اللّٰهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ
الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا ۹۴
عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ يَحْلِفُونَ ۹۵
لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ ۝ اَلْأَعْرَابُ ۹۶
أَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّأَجْدَرُ

تھا نہیں، خاموش نہ رہ سکیں، حسرت و غم کے آنسو بے اختیار بہنے لگے:

چشم آستیں بردار و اشکم را تماشا کن!

قرآن کی معجزانہ بلاغت دیکھو۔ پہلے بے مقدوروں کا ذکر ہو چکا تھا لیکن خصوصیت کے ساتھ پھر اُن کا ذکر کیا، اور اُن کی محبت ایمانی کی تصویر کھینچ دی: تاکہ نفاق کے مقابلہ میں ایمان کا بھی ایک مرقع سامنے آجائے۔ یعنے یا تو وہ ہیں کہ قدرت رکھنے پر بھی حیلے بہانے نکالتے ہیں۔ یا یہ ہیں کہ مقدرت نہ رکھنے پر بھی دل کی لگن چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک رہی ہے!

غزوۂ تبوک میں سواریوں کی بڑی قلت تھی۔ اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں ایک اونٹ آیا تھا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے جو زادِ راہ کی مقدرت نہیں رکھتی تھی، پیغمبر اسلام سے عرض کیا، ہمارے لیے سواری کا بندوبست کر دیجیے آپ نے کہا، کہاں سے کروں، کوئی سامان نہیں پاتا۔ اس پر وہ روتے ہوئے چلے گئے، اور ان کے درد و غم کا یہ حال تھا کہ "البکائیون" کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ یعنے بہت رونے والے! (ابن جریر)

سبحان اللہ، اُن چند آنسوؤں کی قدر و قیمت جو ایمان کی تپش سے بہے تھے، کہ ہمیشہ کے لیے اُن کا ذکر کتاب اللہ نے محفوظ کر دیا۔ آج بھی کہ تیرہ صدیاں گزر چکی ہیں، ممکن نہیں ایک مومن یہ آیت پڑھے، اور ان آنسوؤں کی یاد میں خود اُس کی آنکھیں بھی اشکبار نہ ہو جائیں!

(۳۴) آیت (۹۲) میں فرمایا، اداءِ فرض کے وقت عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہنا، ایک ایسی نامردی کی بات ہے جسے کوئی خوددار آدمی گوارا نہیں کر سکتا لیکن اُنہوں نے یہ بھی گوارا کر لیا کیونکہ جہل و بے حسی کی انتہائی حالت اُن پر طاری ہو گئی ہے۔ اس حالت کو، جو انتہا درجہ غفلت و انکار کا لازمی نتیجہ ہے، قرآن مہر لگا دینے سے تعبیر کرتا ہے اس تعبیر کی

اعتبار کرنے والے نہیں۔ اللہ نے ہمیں پوری طرح تمہارا حال تبلا دیا ہے۔ اب آئندہ اللہ اور اُس کا رسول دیکھیگا، تمہارا عمل کیسا رہتا ہے (نفاق پر مصر رہتے ہو یا باز آتے ہو) اور پھر (بالآخر) اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر و پوشیدہ، ہر طرح کی باتیں جاننے والا ہے۔ پس وہ تمہیں تبلائیگا کہ (دنیا میں) کیا کچھ کرتے رہے ہو! ۹۴

جب تم لوٹ کر ان سے ملوگے، تو ضرور یہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائینگے تاکہ اُن سے درگزر کرو۔ سو چاہیے کہ تم اُن سے درگزر ہی کر لو (یعنے رُخ پھیر لو) یہ ناپاک ہیں، ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا، اُس کمائی کا نتیجہ جو یہ (اپنی بدعملیوں سے) کماتے رہے! ۹۵

یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائینگے تاکہ اُن سے راضی ہو جاؤ، سو (یاد رکھو) اگر تم راضی بھی ہو گئے (حالانکہ تمہیں راضی نہیں ہونا چاہیے، اور تم راضی نہ ہوگے) تو اللہ اُن سے کبھی راضی ہونے والا نہیں، جو (دائرۂ ہدایت سے) باہر ہو گئے ہیں! ۹۶

اعرابی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں، اور اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ اُن کی نسبت

اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ (۹۷)
مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَاۗىِٕرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَ (۹۸)
مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ
الرَّسُوْلِ ۭ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ (۹۹)

السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ

تشریح پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے، خصوصاً سورۂ اعراف کی آیت (۱۴۶) کے نوٹ میں۔

سمجھا جائے، دین کے اُن حکموں کی اُنہیں خبر نہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیے ہیں۔ (کیونکہ آبادیوں میں نہ رہنے کی وجہ سے تعلیم و تربیت کا موقعہ اُنہیں حاصل نہیں) اور اللہ (سب کا حال) جاننے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے! (۹۷)

(۴) یہ آیتیں سفر تبوک کے اثنا میں نازل ہوئی ہیں۔ آیت (۹۴) میں فرمایا، منافق تو سمجھے ہوئے تھے تم اس سفر سے بخیر و عافیت لوٹنے والے نہیں۔ اب لوٹو گے، تو حسب عادت آئینگے اور طرح طرح کی باتیں عذر و معذرت کی کرینگے۔ پھر جب دیکھینگے کہ بات بنتی نہیں، تو قسمیں کھانی شروع کر دینگے لیکن خواہ وہ کتنی ہی قسمیں کھائیں، تمہیں ان کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اب اُن کا قول نہیں، اُن کا عمل دیکھا جائیگا، اور اسی کے مطابق ان سے سلوک کیا جائیگا، پھر بالآخر اللہ کے حضور لوٹنا اور اپنے کیے کا نتیجہ پانا ہے۔

(۵) شہریوں کے مقابلہ میں بادیہ نشین قبائل عموماً سخت طبیعت کے ہوتے ہیں، کیونکہ اُن میں وہ لچک اور نرمی پیدا نہیں ہوسکتی جو معاشرتی زندگی کا خاصہ ہے۔ یہی حال عرب کے بدوؤں کا تھا۔ آیت ۹۷ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۶) آیت (۹۸) میں فرمایا۔ انہی میں وہ منافق ہیں جو اگر اسلام کی راہ میں کچھ خرچ بھی کرتے ہیں، تو محض اس خوف سے کہ سمجھتے ہیں بغیر اس کے چارہ نہیں، اور یہ خرچ کرنا ان کے لیے ایسا ہے جیسے کوئی ناگواری سے جرمانہ بھرے۔ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت آپڑے تو اُن پر اُلٹ پڑیں۔ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر انہوں نے سمجھا ہوگا، رومیوں کے مقابلہ میں مسلمان کب ٹھہر سکتے ہیں، اب ان کے دن ختم ہوئے۔

اور اعرابیوں ہی میں ایسے لوگ ہیں کہ جو کچھ (راہِ حق میں) خرچ کرتے ہیں، اُسے (اپنے اوپر) جرمانہ سمجھتے ہیں، اور منتظر ہیں کہ تم پر کوئی گردش آجائے (تو اُلٹ پڑیں) حقیقت یہ ہے کہ بُری گردش کے دن خود انہی پر آنے والے ہیں، اور اللہ (سب کچھ) سُننے والا، (سب کچھ) جاننے والا ہے! (۹۸)

اور (ہاں) اعرابیوں ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو کچھ (راہِ حق میں) خرچ کرتے ہیں، اُسے اللہ کے تقرب اور رسول کی دعاؤں کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ تو سُن رکھو کہ فی الحقیقت وہ اُن کے لیے موجب تقرب ہی ہے۔ اللہ اُنہیں اپنی رحمت کے دائرہ میں داخل کریگا۔ بلا شبہ وہ بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحمت والا ہے! (۹۹)

اور مہاجرین اور انصار میں جو لوگ سبقت کرنے والے

وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○ وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ○ وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، یہ بنو اسد اور غطفان کے قبائل تھے۔ (ابن جریر)

(۷) آیت (۱۰۰) سے معلوم ہوا، اس اُمت کے بہترین طبقے تین ہیں:

(ا) مہاجرین میں سے سابقون الاولون یعنے مکہ کے وہ حق پرست جنہوں نے دعوتِ حق کی قبولیت میں سبقت کی اور سب سے پہلے ایمان لائے۔ پھر صلح حدیبیہ سے پہلے کہ غربت و مصیبت کا زمانہ تھا اپنا گھر بار چھوڑ کر، ہجرت کی۔

بالاتفاق سب سے پہلے ایمان لانے والی ہستی حضرت خدیجہؓ کی تھی۔ ان کے بعد گھر کے آدمیوں میں سے حضرت علی (کہ دس برس سے زیادہ عمر کے نہ تھے) اور زید بن حارثہ ایمان لائے اور باہر کے آدمیوں میں حضرت ابوبکر۔ حضرت ابوبکر ہجرت مدینہ میں بھی اسبق ہیں کہ خود آنحضرت کے ساتھی تھے۔

(ب) انصار میں سے سابقون الاولون۔ یعنے مدینہ کے وہ حق شناس جنہوں نے عین اُس وقت جبکہ تمام جزیرۂ عرب داعیِ حق کو جھٹلا رہا تھا، اور خود اُس کے اہل وطن اُس کے قتل و ہلاکت کے درپے تھے، دعوتِ حق قبول کی، اور عقبۂ اولی اور ثانیہ میں بیعت کا ہاتھ بڑھایا۔ پہلی بیعت میں سات آدمی تھے اور یہ اعلانِ نبوت سے گیارہویں برس ہوئی۔ دوسری میں ستر مرد تھے اور دو عورتیں، اور یہ پہلی سے ایک برس بعد ہوئی۔ پیغمبر اسلام نے دوسری بیعت والوں کے ساتھ ابو زرارہ بن مصعب کو بغرض تعلیم بھیج دیا تھا۔ کچھ لوگ اُن کے جانے پر ایمان لائے، اور کچھ اُس وقت جب خود آنحضرت نے ہجرت فرمائی۔

(ج) وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کے قدم بہ قدم چلے، اور گو بعد کو آئے، لیکن اُن کا شمار پہلوں ہی کے ساتھ ہوا۔ چونکہ بعد کو ایمان لانے والوں میں بعض منافق اور کچے دل کے آدمی بھی تھے

سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، اور وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی، تو اللہ اُن سے خوشنود ہوا، وہ اللہ سے خوشنود ہوئے۔ اور اللہ نے اُن کے لیے (نعیم ابدی کے) باغ طیار کر دیے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور اس لیے وہ خشک ہونے والے نہیں) وہ ہمیشہ اس (نعمت و سرور کی زندگی) میں رہینگے، اور یہی بہت بڑی فیروزمندی!

اور ان اعرابیوں میں جو تمہارے آس پاس بستے ہیں کچھ منافق ہیں، اور خود مدینہ کے باشندوں میں بھی جو نفاق میں (رہتے رہتے) مشاق ہو گئے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم اُنہیں نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں ہم اُنہیں دو مرتبہ عذاب دینگے۔ پھر اُس عذاب کی طرف لوٹائے جائینگے جو بہت ہی بڑا عذاب ہے!

اور دوسرے لوگ (وہ ہیں) جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے ملے جلے کام کیے۔ کچھ اچھے کچھ برے، تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ اُن پر (اپنی رحمت سے) لوٹ آئے۔ اللہ بڑا ہی بخشنے والا بڑا ہی رحمت والا ہے!

۱۰۰ ۱۰۱ ۱۰۲

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ۱۰۳ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ۱۰۴ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ۱۰۵ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ

اس لیے "باحسان" کی قید لگا دی۔ یعنے وہ جنھوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔

دنیا میں جب کبھی سچائی کا ظہور ہوا ہے، تو اُس کا پہلا عہد ہمیشہ غربت و بیکسی کا رہا ہے، اور اُن ساری دنیوی ترغیبوں سے خالی رہا جو کسی انسان کے دل کو مائل کر سکتی ہیں۔ پس جو نفوس قدسی اُس وقت حق کا ساتھ دیتے ہیں، ان کی حق شناسی و حق پرستی کے درجہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ وہ داعی حق کا پہلے پہل ساتھ دے کر خود بھی داعیانِ حق کے گروہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کی حق پرستی دنیا کے ہر طرح کے تاثرات سے یکسر منزہ ہوتی ہے۔

۱۰۳ تاریخ اسلام میں مہاجرین و انصار کی جماعت کا یہی مقام ہے۔ اسی لیے السابقون الاولون سے زیادہ اُن کے وصف میں کچھ کہنا ضروری نہ ہوا۔ کیونکہ یہاں اسبقیت و اولیت سے بڑھ کر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

۱۰۴ جب پیغمبر اسلام نے پہلے پہل حضرت ابوبکر کو دعوت دی، اور اُس پیکر صدق و وفا نے سنتے ہی قبول کر لی تو غور کرو، اُس وقت اس معاملہ کا حال کیا تھا؟ پورے کرۂ ارضی میں تن تنہا دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے بُلایا تھا۔ دوسرا دوڑ گیا تھا۔ جس نے بُلایا، اُس کے اندر وحیِ الٰہی کا یقین بول رہا تھا، لیکن جو دوڑا، اُس نے کیا دیکھا تھا کہ ایک عجیب و غریب بات سُنتے ہی قبول کر لی اور بیٹھے بٹھائے تمام ملک و قوم کو اپنا دشمن جانی بنا لیا!

یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست!

۱۰۵ اسی طرح غور کرو، جب عقبۂ اولیٰ میں مدینہ کے سات آدمی بیعت کر رہے تھے، تو کس سے کر رہے تھے، اور کس حال میں کر رہے تھے؟ جس مظلوم کو گیارہ برس سے تمام جزیرۂ عرب جھٹلا

(اے پیغمبر!) ان لوگوں کے مال سے صدقات قبول کر لو۔ تم قبول کر کے اُنہیں (بخل و طمع کی بُرائیوں سے) پاک اور (دل کی نیکیوں کی ترقی سے) تربیت یافتہ کر دوگے۔ نیز اُن کے لیے دعاءِ خیر کرو۔ بلاشبہ تمہاری دعا اُن کے دلوں کے لیے راحت و سکون ہے۔ اور اللہ (دعائیں) سُننے والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے!

کیا اُنہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہی ہے جو اپنی بندوں کی توبہ قبول کرتا اور جو کچھ بطور خیرات کے نکالیں اُسے منظور کر لیتا ہے؟ اور یہ، کہ اللہ ہی ہے، زیادہ سے زیادہ توبہ قبول کرنے والا، اور بڑا ہی رحمت والا؟

اور (اے پیغمبر!) تم کہو "عمل کیے جاؤ۔ اب اللہ دیکھیگا کہ تمہارے عمل کیسے ہوتے ہیں، اور اللہ کا رسول بھی دیکھیگا اور مسلمان بھی دیکھینگے، اور (پھر) تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے جس کے علم سے نہ تو کوئی ظاہر بات پوشیدہ ہے، نہ کوئی چھپی بات۔ پس وہ تمہیں بتلائیگا کہ جو کچھ کرتے رہے ہو اس کی حقیقت کیا تھی:

اور (پچھلے تائب گروہ کے علاوہ) کچھ اور لوگ

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۱۰۶
وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ
وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى ۱۰۷
مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ ۱۰۸
اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ

ہیں جن کا معاملہ اس انتظار میں کہ اللہ کا حکم کیا ہوتا ہے، ملتوی ہوگیا ہے۔ وہ انہیں عذاب دے یا (اپنی رحمت سے) اُن پر لوٹ آئے (اُسی کے ہاتھ ہے) اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے! ۱۰۶

اور (منافقوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں) جنہوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنا کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں، کفر کریں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں، اور اُن لوگوں کے لیے ایک کمیں گاہ پیدا کردیں جو اب سے پہلے اللہ اور اُس کے رسول سے لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو، لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں! ۱۰۷

(اے پیغمبر!) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا۔ اس بات کی کہ تم اُس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) وہی مسجد حقدار ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقوے پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اُس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک و صاف رہیں، اور اللہ (بھی) پاک و صاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے! ۱۰۸

کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد

رہ گیا، اور جو خود اپنی قوم و وطن میں دشمنوں سے گھرا ہوا تھا، اُس نے کہا، مجھے قبول کرلو اور ساری دنیا کی دشمنی مول لے لو، اور ان عشاقِ حق نے کہا، ہم نے قبول کیا، اور تیرے لیے سارے جہان کی دشمنیاں اور ہر طرح کی مصیبتیں اپنے سر لیلیں!

دو عالم نقد جاں بر دست دارند
بہ بازارے کہ سودائے تو باشد!

یہی وجہ ہے کہ یہاں اُن کا معاملہ ایسے پیرایہ میں بیان فرمایا جس سے بڑھ کر پیرایۂ بیان عشاقِ حق کے لیے نہیں ہوسکتا: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اللہ اُن سے خوشنود ہوا، وہ اللہ سے خوشنود ہوئے۔ اور سورۂ مائدہ میں انہی کے لیے پیشین گوئی گزر چکی ہے: یحبھم و یحبونہ۔ اللہ اُن سے محبت کریگا، وہ اللہ سے محبت کرینگے!

اللہ کی خوشنودی تو ظاہر ہے کہ اُن کے کمالِ ایمان و عمل کا نتیجہ تھی لیکن خود اُن کے خوشنود ہونے کا یہاں کیا مطلب ہوا؟ افسوس ہے کہ لوگ اس کی حقیقت نہیں سمجھے، اور اگرچہ یہاں سمجھانے کی گنجایش نہیں، مگر پھر بھی کوشش کرونگا کہ سورت کے آخری نوٹ میں اس کی تشریح بھی آجائے۔

(۸) آیت (۱۰۱) میں منافقوں کے ایک خاص گروہ کا ذکر کیا جو اطراف مدینہ کے بدوی قبائل میں بھی تھے اور شہری باشندوں میں بھی۔ فرمایا مردوا علی النفاق۔ یہ نفاق میں مشاق اور عادی ہوگئے ہیں یعنے منافقانہ زندگی میں رہتے رہتے اُس کی ایسی مشق و مزاولت ہوگئی ہے کہ نو آموزوں کی طرح پکڑے نہیں جاسکتے۔ جو

عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ہَارٍ فَانْہَارَ بِہٖ فِیْ نَارِ جَہَنَّمَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ ۱۰۹ لَا یَزَالُ بُنْیَانُہُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِہِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُہُمْ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۝ ۱۱۰ ع ۱۳ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ

کچے اور نوآموز ہیں ان کے لیے مشکل ہے کہ اپنی دلی حالت چھپائے رکھیں وہ اُن کے چہروں پر ابھری آتی ہے اور باتوں سے ٹپکنے ہی لگتی ہے، لیکن یہ لوگ اس بناوٹ کے ایسے عادی ہوگئے ہیں کہ ممکن نہیں، عام نگاہیں تاڑ سکیں۔

"ہم انہیں دو مرتبہ عذاب دینگے" یعنے یہ اپنی دُہری استعدادِ نفاق کی وجہ سے دُہرے عذاب کے مستحق ہوگئے پہلی استعداد یہ کہ منافق ہوئے، دوسری یہ کہ اس میں کامل و مشاق ہوگئے۔

قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اعمال کے نتائج ٹھیک ٹھیک اُن کی حالت اور درجہ کے مطابق نکلتے ہیں اگر ایک شخص نے زہر کھالیا لیکن ہلکے قسم کا، تو نتیجہ بھی ہلکے قسم کی مضرت کا نکلیگا لیکن اگر زہر قاتل ہے تو نتیجہ بھی قاتل ہوگا۔ ایسا ہی قانون روحانی زندگی میں بھی کام کر رہا ہے، اور اچھائیوں کی طرح بُرائیوں کے بھی اقسام و مدارج ہیں۔

(۹) آیت (۱۰۲) سے لے کر (۱۰۶) تک اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اگرچہ اس موقعہ پر کوتاہی کی تھی، لیکن اُس کا سبب نفاق نہ تھا سستی اور کاہلی تھی پیغمبر اسلام جب سفر سے واپس آئے تو اُن میں سے ہر شخص سچائی کے ساتھ اپنی غفلت پر منفعل ہوا، اور کوئی نہ تھا جس کا دل حسرت و ندامت کے زخموں سے چور نہ ہو رہا ہو۔ اللہ نے اُن کی توبہ قبول کرلی، کیونکہ اُس کی بخشش و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوسکتا۔ شرط صرف یہ ہے کہ خود ہم اپنے دلوں کا دروازہ اپنے ہاتھوں بند نہ کرلیں:

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ سدا
درِ قبول تو اِس آرزو میں باز رہا!

فرمایا، اُنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا، اور اُن کا اعتراف دل کا اعتراف ہے، پس کوئی وجہ نہیں کہ اُن کی توبہ قبول نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں اصل کار گناہوں کا سچا اعتراف ہے

اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی (جو کبھی ہلنے والی نہیں) یا وہ، جس نے ایک کھائی کے گرتے ہوئے کنارے پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی اور وہ مع اپنے مکین کے آتشِ دوزخ (کے گڑھے) میں جا گری؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انہیں (کامیابی و سعادت کی) راہ نہیں دکھاتا جو ظلم کا شیوہ اختیار کرتے ہیں!

۱۰۹ یہ عمارت جو اُنہوں نے بنائی ہے (یعنے مسجدِ ضرار) ہمیشہ ان کے دلوں کو شک و شبہ سے مضطرب رکھیگی (یہ کانٹا نکلنے والا نہیں) مگر یہ کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے جائیں (کیونکہ یہ ان کے نفاق کی ایک بہت بڑی شرارت تھی، جو چلی نہیں، اس لیے ہمیشہ اس کی وجہ سے خوف و ہراس کی حالت میں رہینگے) اور اللہ سب کا حال جاننے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

۱۱۰ بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں بھی خرید لیں، اور اُن کا مال بھی۔ اور اس قیمت پر خرید لیں کہ اُن کے لیے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ

وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ١١١
اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ١١٢ مَا كَانَ لِلنَّبِىِّ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِىْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ
الْجَحِيْمِ ۝ ١١٣

اور جو سر اعترافِ ذنوب میں جھک گیا، پھر اس کے لیے محرومی نہیں ہوسکتی

کہ مستحق ؟ است گناہ گارانند

اس سے پہلے حکم گزر چکا ہے کہ منافقوں کی خیرات قبول نہ کرو اور نہ اُن کی بخشش کے لیے دعا کرو۔ یہاں فرمایا، جن لوگوں نے اب اپنی خطاؤں کا اقرار کرلیا اور تائب ہوگئے، تو جو کچھ راہِ حق میں دیں، اُسے قبول کرلو، اور اُن کے حق میں دعائے خیر کرو تمہاری دعا اُن کے دلوں کے لیے کہ حسرت و ندامت سے زخمی ہو رہے ہیں، راحت و سکون کا مرہم ثابت ہوگی!

نیز فرمایا، تم اس ذریعہ سے اُنہیں طہارت و مزکّی کردوگے یعنے خیرات و زکوٰۃ کا نکالنا اور اُس کا قبول ہونا ایک ایسا معاملہ ہے جو نفس کی پاکی و تربیت کا باعث ہوتا ہے۔ مزید اشارات کے لیے آخری نوٹ میں "زکوٰۃ" کا مبحث دیکھو۔

آیت (۱۰۶) میں فرمایا، کچھ اور لوگ ہیں جو خدا کے فیصلہ کا ابھی انتظار کررہے ہیں یعنے ان کی توبہ کی قبولیت و عدم قبولیت کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ یہ کل تین آدمی تھے: مرارہ بن الربیع، کعب بن مالک، ہلال بن اُمیہ۔ انہوں نے واپسی پر کوئی معذرت نہیں کی، اور کہا، سچی بات یہ ہے کہ کوئی عذر نہ تھا محض کاہلی اور سُستی تھی جس نے نکلنے نہیں دیا۔ اس پر آنحضرت نے فرمایا اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔ چنانچہ آگے چل کر آیت (۱۱۰) میں ان کا حکم ملیگا۔

(۱۰) آیت (۱۰۷) میں منافقوں کی ایک بہت بڑی شرارت کا ذکر کیا ہے، جو انہوں نے ایک مسجد بنا کر کرنی چاہی تھی، اور خصوصیت کے ساتھ اس لیے ذکر کیا کہ اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت و موعظت تھی۔ اس باب میں ضروری اشارات سورت کے آخری نوٹ میں ملینگے۔

کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہوچکا (یعنے اُس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات، انجیل، قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو؟ پس (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا، خوشیاں مناؤ، اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے! ١١١

(ان لوگوں کے اوصاف و اعمال کا یہ حال ہے کہ:)
(اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے) توبہ کرنے والے
عبادت میں سرگرم رہنے والے
اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے
سیر و سیاحت کرنے والے
رکوع و سجود میں جھکنے والے
نیکی کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے
اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدبندیوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔
(اے پیغمبر! یہی سچے مومن ہیں) اور مومنوں کو (کامیابی وسعادت کی) خوش خبری دیدو! ١١٢

پیغمبر کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں، ایسا کرنا سزاوار نہیں کہ جب واضح ہوگیا، یہ لوگ دوزخی ہیں، تو پھر مشرکوں کی بخشائش کے طلب گار ہوں، اگرچہ وہ اُنکے عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔ ١١٣

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ
لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ۝ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى ۱۱۴
يُبَيِّنَ لَهُم مَّا يَتَّقُونَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ إِنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ ۱۱۵
وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللّٰهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝ لَقَد تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِينَ وَالْأَنصَارِ ۱۱۶
الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ

(۱۱) آیت (۱۱۱) میں حُبِّ ایمانی کی حقیقت واضح کی ہے۔ فرمایا جو لوگ اللہ پر ایمان لائے، تو ایمان کا معاملہ یوں سمجھو کہ انہوں نے اپنا سب کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ ڈالا جان بھی اور مال و متاع بھی اب اُن کی کوئی چیز اُن کی نہیں رہی۔ اللہ اور اُس کی سچائی کی ہوگئی!

بندگانِ تو کہ در عشق خداوندانند
دو جہاں را بہ تمنائے تو بفروختہ اند!

اور پھر اللہ کی طرف سے اس کے معاوضہ میں کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ نعیم ابدی کی کامرانیاں انہیں عطا فرمائیں!

یہ گویا خرید و فروخت کا ایک معاملہ تھا جو اللہ میں اور عشاقِ حق میں طے پاگیا۔ اب نہ بیچنے والا اپنی متاع واپس لے سکتا ہے نہ خریدنے والا قیمت لوٹائیگا:

أثامن بالنفس النفيسة ربها ۝ فليس لها في الخلق كلهم ثمن
اذا ذهبت نفسي بدنيا اصبتها ۝ فقد ذهبت مني وقد ذهب الثمن

اور چونکہ مقصود اللہ کے لطف و کرم کا اظہار تھا، اس لیے معاملہ کو اپنی طرف سے شروع کیا۔ نہ کہ بیچنے والوں کی طرف سے یعنے یہ نہیں کہا کہ مومنوں نے بیچ ڈالی، بلکہ کہا، اللہ نے مومنوں سے خرید لی۔ گویا معاملہ کا طالب وہ تھا۔ حالانکہ ہر طرح کی طلب و احتیاج سے وہ منزہ ہے، اور جو متاع اُس نے قبول کی، وہ بھی اُسی کی تھی اور جو کچھ معاوضہ میں بخشا، وہ بھی اُس کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے؟

(۱۲) آیت (۱۱۲) اس سورت کی مہمات معارف میں سے ہے۔ فرمایا سچے مومنوں کے اوصاف و مدارج یہ ہیں کہ:

(ا) التائبون۔ یعنے وہ جو اپنی توبہ میں سچے اور پکے ہوتے ہیں، اور ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرتے، اور اپنی غفلتوں اور لغزشوں پر نادم رہتے ہیں۔

(ب) العابدون۔ یعنے وہ، جو اللہ کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور اُن کی ساری بندگیاں اور نیازمندیاں صرف اُسی کے

اور ابراہیم نے جو اپنے باپ کے لیے بخشائش کی آرزو کی تھی، تو صرف اس وجہ سے کہ اپنا وعدہ پورا کردے جو وہ اُس سے کرچکا تھا یعنے اُس نے کہا تھا میرے بس میں اور تو کچھ نہیں۔ دعا ہے۔ تو اُس سے باز نہیں رہونگا) لیکن جب اُس پر واضح ہوگیا کہ وہ اللہ (کی سچائی) کا دشمن ہے (اور کبھی حق کی راہ اختیار کرنے والا نہیں) تو اُس سے بیزار ہوگیا۔ بلاشبہ ابراہیم بڑا ہی دردمند، بڑا ہی بردبار (انسان) تھا!

۱۱۴ اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ایک گروہ کو ہدایت دے کر پھر گمراہ قرار دے، تاوقتیکہ اُن پر وہ ساری باتیں واضح نہ کردے جن سے انہیں بچنا چاہیے۔ بلاشبہ اللہ کے علم سے کوئی بات باہر نہیں!

۱۱۵ بلاشبہ آسمان اور زمین کی (ساری) بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ (سب کچھ اُسی کے قبضہ میں ہے) اور (مسلمانو!) اُس کے سوا نہ تو تمہارا کوئی رفیق و کارساز ہے، نہ مددگار!

۱۱۶ یقیناً اللہ اپنی رحمت سے پیغمبر پر متوجہ ہوگیا۔ نیز مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے بڑی تنگی اور بے سر و سامانی کی گھڑی میں اُس کے پیچھے قدم اٹھایا، اور اُس وقت اٹھایا، جبکہ حالت ایسی ہو چکی تھی کہ قریب

فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝ مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ

لیے ہوتی ہیں

عبادت سے مقصود عبادتِ خاص بھی ہے اور عام بھی۔ خاص یہ کہ خاص وقتوں اور خاص شکلوں کی عبادت جو دینِ حق نے قرار دیدی ہے، اسے پورے اخلاص اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرے۔ عام یہ کہ انسان کی فکری حالت عبادت گزارانہ ہو جائے اور پھر وہ جو کچھ بھی سُنے، جو کچھ بھی کہے جو کچھ بھی کرے، سب میں ایک عابدانہ روح کام کر رہی ہو!

(ج) الحامدون۔ یعنے وہ، جو اپنے فکر سے اور اپنے قول سے اللہ کی حمد و ستایش کرنے والے ہیں۔ فکر سے حمد و ستائش یہ ہے کہ بحکم یتفکرون فی خلق السماوات والارض (۳:۱۹۱) آسمان و زمین کی خلقت میں غور و فکر کرنا، اور اُن تمام کارفرمائیوں کی معرفت حاصل کرنا جو اُس کی محمودیت و جمال پر دلالت کرتی ہیں۔ قول سے حمد و ستایش، اِس فکری حالت کا قدرتی نتیجہ ہے۔ کیونکہ جس ہستی کی محمودیت دل و دماغ میں بس جائیگی، ضروری ہے کہ زبان سے بھی بے اختیار اُس کی حمد و ثنا کے ترانے نکلنے لگیں!

(د) السائحون۔ وہ، جو راہِ حق میں سیر و سیاحت کرتے ہیں۔ یعنے بحکم قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض (۳:۱۳۶) زمین میں عبرت و نظر کے لیے گردش کرتے ہیں۔ علم کی ڈھونڈھ میں نکلتے ہیں، راہِ حق میں جد و جہد کرتے ہوئے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ کا رُخ کرتے ہیں، حج کے لیے خشکی و تری کی مسافتیں قطع کرتے رہتے ہیں۔

(ہ) الراکعون الساجدون۔ وہ، جو اللہ کے آگے جھک جاتے ہیں، اور رکوع و سجود سے کبھی نہیں تھکتے۔ یہ رکوع و سجود کی حالت جسم پر بھی طاری ہوتی ہے، قلب پر بھی طاری ہوتی ہے اور زبان پر بھی طاری ہوتی ہے۔

(و) الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر۔ وہ جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ یعنے صرف اپنے ہی

تھا، ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگا جائیں پھر وہ اپنی رحمت سے ان سب پر متوجہ ہو گیا۔ بلاشبہ وہ شفقت رکھنے والا، رحمت فرمانے والا ہے!

اور (اسی طرح) اُن تین شخصوں پر بھی (اُس کی رحمت لوٹ آئی) جو (معلق حالت میں) چھوڑ دیے گیے تھے (اور اُس وقت لوٹ آئی) جبکہ زمین اپنی ساری وسعت پر بھی ان کے لیے تنگ ہو گئی تھی، اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آ گئے تھے، اور انہوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انہیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر خود اُسی کے دامن میں۔ پس اللہ (اپنی رحمت سے) اُن پر لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں۔ بلاشبہ اللہ ہی ہے، بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا ہی رحمت والا!

مسلمانو! خدا کے خوف سے بے پروا نہ ہو جاؤ۔ اور چاہیے کہ سچّوں کے ساتھی بنو (کہ یہ سچائی تھی جو ان لوگوں کی بخشش کا وسیلہ ہوئی!)

مدینہ کے باشندوں کو اور ان اعرابیوں کو جو اس کے اطراف میں بستے ہیں، لائق نہ تھا کہ اللہ کے رسول کا (دفاع میں) ساتھ نہ دیں اور پیچھے رہ جائیں، اور نہ یہ بات لائق تھی کہ اُس کی جان کی پروا نہ کر کے محض

عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۱۲۰) وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۲۱) وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ

نفس کی اصلاح پر قانع نہیں ہو جاتے، بلکہ دوسروں کی بھی اصلاح کرتے، اور دنیا میں حق و عدالت کے نشر و قیام کو اپنا فرض سمجھتے ہیں (ز) الحافظون لحدود اللہ۔ یہ آخری وصف اور آخری مقام ہوا۔ یعنے وہ جو اُن تمام حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں جو اللہ نے انسان کے لیے ٹھہرا دی ہیں۔ قرآن کی اصطلاح یہ ہے کہ تمام واجبات و حقوق کو خواہ افراد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں خواہ جماعت سے، وہ حدود اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنے یہ حدیں ہیں جو مقرر کر دی گئیں۔ اِن کے ٹوٹنے میں انسانی امن و سعادت کی بنیادوں کا ٹوٹ جانا ہے۔

یہ کل سات وصف ہوئے، اور جس ترتیب سے بیان کیے گیے ہیں، وہ قابلِ غور ہے۔ یہ گویا نفس انسانی کے تزکیہ و ترقی کے سات درجے ہیں، یا سات طبقے، جو یکے بعد دیگر ٹھیک اسی ترتیب سے سلوک ایمانی میں پیش آتے ہیں۔ (۱۲۰)

جب کوئی انسان راستی و ہدایت کی راہ میں قدم اُٹھائیگا، تو قدرتی طور پر پہلا مقام توبہ و انابت ہی کا ہوگا۔ یعنے پچھلی غفلتوں اور گمراہیوں سے (خواہ وہ کفر کی ہوں، خواہ نفاق کی، خواہ معاصی و زلات کی) باز آئیگا، اور آئندہ کے لیے اُن سے بچنے کا عہد کریگا، اور اپنے سارے دل اور ساری روح سے اللہ کی طرف رجوع ہو جائیگا۔ اور یہی توبہ کی حقیقت ہے۔ (۱۲۱) پھر اگر توبہ سچی ہوگی، تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ نکلیگا کہ اللہ کی بندگی و نیازمندی کی سرگرمی پیدا ہو جائے۔ پس یہ دوسری منزل ہوئی، یا سلوک ایمانی کا دوسرا طبقہ۔ پھر چونکہ عبادت گزاری کی زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر اور ذکر کا مقام حاصل ہو جائے، اور ملکوت السماوات والارض کے مشاہدۂ و معرفت کا دروازہ کھل جائے، اس لیے تیسری منزل تحمید و تسبیح کی منزل ہوئی یعنے اللہ کی حمد و ثنا کے جوش سے معمور ہو جانے کی منزل، کہ ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا! (۳: ۱۹۱)[1]

اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں۔ اس لیے کہ اللہ کی راہ میں اُنہیں جو مصیبت بھی پیش آتی وہ اُن کے لیے ایک نیک عمل شمار کی جاتی، ہر پیاس جو وہ جھیلتے، ہر محنت جو وہ اُٹھاتے، ہر مخمصہ جس میں وہ پڑتے، ہر وہ قدم جو وہاں چلتا جہاں چلنا کافروں کے لیے غیظ و غضب کا باعث ہوتا، اور ہر وہ چیز جو وہ (مالِ غنیمت میں) دشمنوں سے پاتے (یہ سب کچھ ان کے لیے عملِ نیک ثابت ہوتا۔ کیونکہ) اللہ نیک کرداروں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا!

اور (اسی طرح) وہ اللہ کی راہ میں) کوئی رقم نہیں نکالتے چھوٹی ہو یا بڑی، اور کوئی میدان طے نہیں کرتے، مگر یہ کہ (اُس کی نیکی) اُن کے نام لکھی جاتی ہے، تاکہ اللہ اُن کے کاموں کا اُنہیں بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے!

اور (دیکھو) یہ ممکن نہ تھا کہ سب کے سب مسلمان اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں (اور تعلیم دین کے مرکز میں آکر علم و تربیت حاصل کریں) پس کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ اُن کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی کہ دین میں دانش و فہم پیدا کرے، اور جب

[1] سورۂ آل عمران کی آیت (۱۹۱) کا نوٹ دیکھنا چاہیے۔ نیز اعراف آیت (۱۸۵)

لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم ۱۲۲
مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝ وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ ۱۲۳ ع ۱۵ الربع
فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ
يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا ۱۲۴
وَهُمْ كَافِرُونَ ۝ ۱۲۵

پھر ان میں رجوع و انابت کا جذبہ، عبادت کا ذوق، اور تحمید و تسبیح کا عرفان
اس درجہ کا ہو، تو ممکن نہیں کہ وہ مومنِ صادق گھر میں چین سے
بیٹھ رہے۔ ضروری ہے کہ وطن و مکان کی اُلفت کی زنجیریں ٹوٹ جائیں
اور سیر و سیاحت میں قدم سرگرم ہو جائیں پس یہ چوتھی منزل ہوئی
اور السائحون کا طبقہ چوتھا طبقہ ہوا۔

اِن چار منزلوں سے جو کاروانِ عمل گذر گیا، اُس نے اصلاحِ
نفس کی مسافت طے کر لی۔ پس اب پانچویں منزل الراکعون
الساجدون کی ہوئی۔ یعنے بندگی و نیازمندی میں پورے ہو گئے
اور اللہ کے آگے سرِ نیاز ہمیشہ کے لیے جھک گیا۔ اب آمرون بالمعروف
والناھون عن المنکر کا مقام انہیں حاصل ہو جائیگا یعنے اپنی تعلیم
و تربیت کا مرحلہ پورا کر کے دوسروں کے لیے معلم و مُربی ہو جائینگے
یہ چھٹی منزل یہی ہوئی، اور اسی سے آخری منزل کے ڈانڈے
مل گئے کہ الحافظون لحدود اللہ کا مقام ہے۔ یہاں پہنچ کر اُن
کے تمام اعمال حدودِ الٰہی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ وہ خود اپنے
اعمال میں بھی حدود اللہ کی کامل نگہداشت رکھتے ہیں، اور اپنے
دعوت سے باہر بھی اُن کے نفاذ و قیام کی نگہبانی کرتے ہیں۔

(۱۳) اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نیک مقصد سے
سیر و سیاحت کرنا بھی مومنوں کا بہترین عمل ہے، اور اُن اعمال میں
سے ہے جن کے ذریعہ وہ ایمان کے مدارج طے کرتے، اور خصائصِ
ایمانی میں کامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس سرعت کے ساتھ صدرِ
اول کے مسلمان تمام دنیا میں پھیل گئے اس کی کوئی نظیر تاریخ میں
نہیں ملتی، اور جب تک اسلام کی اصلی روح زندہ رہی، اُن سے بڑھ
کر زمین کی مسافتیں قطع کرنے والی کوئی قوم نہ تھی۔ وہ سیاحت کو
سیاحت سمجھ کر نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ کی عبادت سمجھتے تھے۔ اور فی
الحقیقت سیاحت نہ صرف ایک تنہا عبادت ہے بلکہ کتنی ہی عبادتوں
کا مجموعہ ہے۔ گھر بار چھوڑنا، عزیز و اقارب کی جدائی برداشت کرنی،
سفر کی مشقتوں میں پڑنا، قدم قدم پر مال خرچ کرنا، آب و ہوا کی ناموافقت

(تعلیم و تربیت کے بعد) اپنے گروہ میں واپس جاتی اور
لوگوں کو (جہل و غفلت کے نتائج سے) ہشیار کرتی۔
تاکہ (بُرائیوں سے) بچیں؟ ۱۲۲

مسلمانو! اُن کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے
آس پاس (پھیلے ہوئے) ہیں، اور چاہیے کہ وہ (جنگ
میں) تمہاری سختی محسوس کریں (کہ بغیر اس کے جنگ،
جنگ نہیں) اور یاد رکھو، اللہ اُن کا ساتھی ہے جو (ہر
حال میں) متقی ہوتے ہیں! ۱۲۳

اور جب ایسا ہوتا ہے کہ (اللہ کی طرف سے) قرآن
کی کوئی سورت اُترتی ہے، تو ان (منافقوں) میں کچھ
لوگ ہیں جو (انکار و شرارت کی راہ سے) کہتے ہیں تم
لوگوں میں سے کس کا ایمان اِس نے زیادہ کر دیا؟"
تو حقیقت یہ ہے کہ جو ایمان رکھتے ہیں، اُن کا ایمان
تو ضرور زیادہ کر دیا، اور وہ اس پر خوشیاں منا رہے
ہیں! ۱۲۴

لیکن (ہاں) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا)
روگ ہے (اور ایمان کی جگہ انکار کی ناپاکی) تو بلاشبہ
اُس نے ان کی ناپاکی پر ایک اور ناپاکی بڑھا دی۔ اور
(نتیجہ بھی دیکھ لو) وہ مر گئے، اور اس حالت میں مرے کہ
ایمان سے قطعی محروم تھے! ۱۲۵

۱۲۶ أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ وَإِذَا مَا

أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُم مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انصَرَفُوا ۚ صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُم

۱۲۷ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ۝ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم

۱۲۸ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِن تَوَلَّوْا

اجنبیوں سے صحبت ومعاملت، اور پھر ان تمام موانع ومشکلات میں عزم وعمل کا استوار رہنا، ایثار وتحمل کے کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں، تب کہیں جاکر یہ عمل انجام پاتا ہے۔

سورۂ تحریم میں یہی وصف مسلمان عورتوں کے لیے بھی فرمایا: ۱۲۶ مؤمنات، قانتات، تائبات، عابدات، سائحات (۶۶: ۵) اللہ کی فرمانبردار، برائیوں سے پرہیز کرنے والیاں، عبادت گزار، سیاحت میں سرگرم، اور روایات سے ثابت ہے کہ نہ صرف صحابۂ کرام کی بی بیاں، بلکہ خود پیغمبر اسلام کی ازواج مطہرات بھی جنگ میں نکلتی تھیں اور مجاہدین کی خدمت کرتی تھیں۔ بعد کو اس بارہ میں جو حال رہا، وہ شرح وبیان سے مستغنی ہے۔

بعضوں کو اس پر تعجب ہوا کہ سیر وسیاحت کا شمار بھی خصائص ایمانی میں ہو، اس لیے السائحون اور السائحات کے لغوی اور مصطلح معنی سے گزر کرنے لگے، لیکن فی الحقیقت اُن کا تعجب محلِ تعجب ہے۔ قرآن نے ہجرت کو ایمان کا بہترین عمل قرار دیا ہے جو گھر بار چھوڑ کر نکلنا ہے، اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے فرمایا، انفروا ۱۲۷ خفافا وثقالا[۱] (۹: ۴۱) اور حج ہر مستطیع مسلمان پر مرد ہو یا عورت فرض کر دیا جو باشندگانِ مکہ کے علاوہ سب کے لیے بڑی سے بڑی سیاحت ہی ہے۔ یاتین من کل فج عمیق[۲] (۲۲: ۲۷) نیز جا بجا زور دیا کہ ملکوں کی سیر کرو، پچھلی قوموں کے آثار وباقیات سے عبرت پکڑو، اُن کے عروج وزوال کے حالات وبواعث کا کھوج لگاؤ: افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم[۳] (۱۲: ۱۰۹) خدا کی قدرت وحکمت کی ان نشانیوں پر ۱۲۸ غور کرو جو زمین کے چپہ چپہ میں پھیلی ہوئی ہیں: وکاین من آیۃ فی السموات والارض یمرون علیھا وھم عنھا معرضون[۴] (۱۲: ۱۰۵) اور اسی سورت میں یہ حکم پڑھو گے کہ طلب علم کے لئے گھروں سے نکلو

(افسوس ان پر) کیا یہ نہیں دیکھتے کہ کوئی برس اس سے خالی نہیں جاتا کہ ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائش میں نہ ڈالے جاتے ہوں، پھر بھی یہ ہیں کہ نہ تو توبہ کرتے ہیں، نہ نصیحت پکڑتے ہیں!

اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے (جس میں منافقوں کا ذکر ہوتا ہے) تو وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ تم پر کسی کی نگاہ تو نہیں! (یعنے اپنا ذکر سن کر جو تم چونک اُٹھے ہو، تو اس پر کسی کی نگاہ تو نہیں پڑ رہی!) پھر منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دل ہی (راست بازی سے) پھیر دیے (کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ سے کورے ہو گئے!

(مسلمانو!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آ گیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج وکلفت میں پڑنا اُس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ وہ مومنوں کے لیے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے!

(اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں،

[۱] نکل کھڑے ہو، سر وسامان سے ہلکے ہو یا بوجھل [۲] حج کی سواریاں دنیا کی ہر دور دراز مسافت طے کرتی ہوئی آئیں گی [۳] کیا انہوں نے ملکوں کی سیر نہیں کی کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے پچھلی قوموں کا خاتمہ کس طرح ہوا اور کیسی حالتوں میں؟ [۴] اور آسمان وزمین میں (قدرت الٰہی کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں، کہ لوگ اُن پر سے گزر جاتے ہیں اور گردن اُٹھا کر دیکھتے تک نہیں!

فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝

ع ۱۶ ۱۲۹

تو اُن سے کہدو "میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اُسی کی ذات۔ میں نے اُس پر بھروسہ کیا، وہ (تمام عالم ہستی کی جہانداری کے) عرشِ عظیم[1] کا خداوند ہے!" ۱۲۹	... سمجھ کر کیوں نہ پہنچ: فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم (۹: ۱۲۲) اور تجارت کے سفر کو بھی فضل الٰہی کی جستجو سے تعبیر کیا حتیٰ کہ حج کے موقعہ پر بھی اس کی اجازت دی: لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم (۲: ۱۹۸)[1] جبکہ سیر و سیاحت کے صریح احکام موجود ہیں، تو پھر کونسی وجہ ہے کہ یہاں اس وصف کی موجودگی موجب تعجب ہو؟

استغفار للمشرکین کی ممانعت

(۴) اُس عہد کے مسلمانوں نے کلمۂ حق کے رشتے پر دنیا کے سارے رشتے قربان کر دیے تھے۔ اُنہیں اپنے اُن عزیزوں اور رشتہ داروں سے لڑنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہوا جنہوں نے اسلام کے خلاف تلوار اُٹھائی تھی، اور اُس وقت حالت ہی ایسی ہوگئی تھی کہ کلمۂ حق کا ساتھ دینا دنیا کے تمام رشتوں، علاقوں کو خیرباد کہدینا تھا لیکن اسلام کے جو دشمن لڑتے ہوئے قتل ہوگئے، یا اپنی موت مرگئے، اُن کی حالت زندوں سے مختلف ہوگئی تھی، کیونکہ اب وہ زندہ نہ تھے کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کرتے۔ یا اُن کے خلاف لڑتے۔ بعض لوگوں کو خیال ہوا جب اللہ کے رسول کی دعا مقبول ہے، تو کیوں نہ ہم اپنے اُن عزیزوں کے لیے دعاءِ مغفرت کی التجا کریں جو مر چکے ہیں؟ اور خود قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت نازل ہو چکا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کے لیے دعاءِ مغفرت کی تھی، حالانکہ وہ مومنوں کا مخالف تھا: واغفر لابی، انہ کان من الضالین (۲۶: ۸۶)

آیت (۱۱۳) میں اسی معاملہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرمایا، نہ تو پیغمبر کو سزاوار ہے کہ ایسا کرے، اور نہ مومنوں کو۔ اگرچہ وہ اُن کے عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ جب اُن پر یہ بات روشن ہوگئی کہ وہ دوزخی ہیں، تو پھر انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اللہ کے فیصلہ کے خلاف زبان کھولنے کی جسارت کریں۔

اُن پر یہ بات روشن کس طرح ہوئی تھی؟ اللہ کی وحی سے، اگر تعین کے ساتھ کسی کی نسبت نازل ہو چکی ہو، یا اُن کے اُن اعمال سے جن پر اُن کی زندگیوں کا خاتمہ ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ بیس برس تک داعیِ حق اور دعوتِ حق کے جانی دشمن رہے اور کفر و جحود اور ظلم و طغیان کی کوئی شرارت ایسی نہیں ہے جو انسان کر سکتا ہو، اور اُنہوں نے نہ کی ہو۔ پھر اُن کی زندگی کا خاتمہ بھی اسی عالم میں ہوا، اور اپنے اعمالِ بد پر ایک لمحہ کے لیے شرمندہ نہ ہوئے۔ جن لوگوں کی حالت ایسی رہ چکی ہو اُن کے دوزخی ہونے سے زیادہ اور کون سی بات روشن ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد اُس شبہ کا ازالہ کر دیا جو بعض طبیعتوں کو ہوا تھا۔ فرمایا، حضرت ابراہیم نے جو اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعائیں کی تھیں، تو صرف اس لیے کہ جب تک آدمی زندہ رہتا ہے، اُس کی ہدایت و اصلاح سے قطعی مایوسی نہیں ہو جا سکتی اگرچہ کتنا ہی گمراہی و شقاوت میں ڈوبا ہوا ہو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے، مرنے سے پہلے باز آجائے۔ چنانچہ جب تک اُن کا باپ زندہ رہا، وہ مایوس نہ ہوئے اور برابر دعائیں مانگتے رہے۔ یہ بات اُنہوں نے اپنے باپ سے کہ دی تھی، جب اُس سے الگ ہوئے تھے، اور وہ اپنی بات کے سچے تھے لیکن جب وہ کفر و جحود کی حالت میں مرگیا، تو اُن پر واضح ہوگیا کہ وہ اپنی روش سے باز آنے والا نہ تھا۔ پس اپنی اس طلب سے دست بردار ہوگئے۔

چنانچہ قرآن نے سورۂ مریم اور ممتحنہ میں اُن کے اس وعدہ کا ذکر کیا ہے۔ مریم میں ہے کہ جب اُن کے باپ نے غصہ میں آکر انہیں

[1] اور تمہارے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں اگر تم (اس موقعہ پر) اللہ کا فضل بھی حاصل کرنا چاہو (یعنی تجارت کرو)

[1] عرش یعنے تختِ شاہی۔ دیکھو سورۂ اعراف آیت (۵۴) کا نوٹ۔

نکال دیا اور کہا، اگر تو اپنی روش سے باز نہ آیا تو سنگسار کر دونگا، تو اُنہوں نے کہا: سلام علیك، ساستغفر لك ربی انه کان بی حفیا (۱۹: ۴۷) اچھا میں جاتا ہوں۔ تجھ پر سلامتی ہو۔ اب میں اپنے پروردگار سے تیرے لیے بخشش کی دعا کرونگا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اور ممتحنہ میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے خاندان سے تمام تعلقات قطع کر دیے تھے مگر صرف اتنا واسطہ اپنے باپ سے رکھا کہ لاستغفرن لك، وما املك لك من الله من شیءٍ (۶۰: ۴) میں ضرور تیری بخشش کا طلب گار رہونگا۔ اس سے زیادہ تیرے لیے میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے!

اور خود پیغمبر اسلام کا بھی یہی حال رہا کہ دشمنانِ حق کے لیے اُن کی زندگی میں برابر طلبگارِ بخشش رہے کہ ابھی اُمید منقطع نہیں ہوئی تھی۔ جنگ اُحد میں جب اُن کا چہرۂ مبارک زخمی ہوگیا تھا، تو زبانِ مقدس پر یہی دعا طاری تھی کہ رب اغفر لقومی فانہم لا یعلمون! خدایا! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ جانتے نہیں کہ کیا کر رہے ہیں!

یہ واضح رہے کہ قرآن نے حضرت ابراہیم کی یہ بات اُن کے مناقب و فضائل میں شمار کی ہے، اور جابجا بطور نمونہ کے پیش کی ہے، کیونکہ کتنے ہی ناموافق حالات ہوں، مگر ہدایت سے مایوس نہ ہونا، اور اپنے ماں باپ کے لیے ہر حال میں خیر طلب طلب رہنا جن کی محبت و شفقت انسان کی پرورش کا ذریعہ ہوتی ہے، ایمان و راستی کے بہترین اعمال میں سے ہے۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں جہاں اُن کی وہ مقبول دعائیں نقل کی ہیں جو اُمت مسلمہ کے ظہور اور خانۂ کعبہ کی آبادی کے لیے کی تھیں، وہاں یہ دعا بھی نقل کی ہے: ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین (۱۴: ۴۱) خدایا، مجھے بخش دے، اور میرے باپ کو بھی، اور اُن سب کو جو ایمان لائے!

یہاں "باپ" سے مقصود اُن کا حقیقی باپ ہے، یا چچا جس نے بطور باپ کے پرورش کیا تھا؟ تو زیادہ قوی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ آزر اُن کا چچا تھا، اور یہ معاملہ اُسی کے ساتھ پیش آیا تھا چنانچہ سورۂ انعام آیت (۷۴) کے حاشیہ میں اس طرف اشارہ گزر چکا ہے۔

نجات روحانی

(۱۵) آیت (۱۱۶) میں فرمایا آسمان و زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے۔ یہاں جسمانی موت و حیات کا ذکر نہ تھا پس مقصود یہ ہے کہ نجات و بخشش کا رشتہ اُسی کے ہاتھ میں ہے، اور جس طرح اجسام کی موت و حیات اُس کے حکم سے ہے، اُسی طرح روح کی ہدایت و شقاوت کا معاملہ بھی اُسی کے حکم پر موقوف ہے، اور اُس کے حکم سے مقصود اُس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین ہیں۔ اُن قوانین کے مطابق کسی کی راہ سعادت کی راہ ہوتی ہے کسی کی شقاوت کی، اور ان کے خلاف کبھی کوئی بات ظہور میں نہیں آسکتی۔

وعلی الثلاثة الذین خلفوا

(۱۶) آیت (۱۱۷) پچھلی آیتوں کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس میں اُن لوگوں کو قبولیت توبہ کی بشارت دی ہے جن سے غزوۂ تبوک کی طیاریوں میں کوتاہی ہوئی تھی اور جن کی نسبت آیت (۱۰۲) میں فرمایا تھا کہ انہیں رحمت الٰہی کا اُمیدوار رہنا چاہیے۔ چونکہ قبولیت کا مقتضا یہ تھا کہ اُن کے دلوں کے زخم دھوئے جائیں، اور رحمت و اکرام کے مرہموں سے تسکین پائیں، اس لیے پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا گیا کہ اُن کے سارے دکھوں کا مداوا ہوگیا۔ اُنہوں نے اس لغزش کی وجہ سے اپنی اصلی جگہ کھو دی تھی۔ یعنی جن مقبولوں کے ساتھ اُن کا شمار تھا، اُن کی صف سے باہر ہوگئے تھے پس قبولیت توبہ کا مژدہ سنایا گیا تو اس طرح کہ پہلے خود پیغمبر اسلام کا نام آیا، پھر مہاجرین و انصار کا، اور پھر انہی کے ضمن میں ان لوگوں کا بھی ذکر کر دیا گیا، اور رحمتِ الٰہی کی توجہ یکساں طور پر سب کے لیے کی گئی تاکہ اب کوئی اس حلقہ سے باہر نہ رہے۔ جن سے قصور ہوا تھا، وہ بھی محسوس کرنے لگیں کہ رحمت و قبولیت کی ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے ہیں:

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست ٭ کہ سلطانِ جہاں با ماست امروز!

توبہ کے معنی رجوع ہونے اور لوٹنے کے ہیں۔ اللہ کا اپنی رحمت کے ساتھ لوٹنا کاملوں کے لیے یہ ہے کہ مزید رحمت و اکرام ہو۔ قصور مندوں کے لیے یہ کہ قبولیت و مغفرت ہو۔

(۱۷) اس کے بعد فرمایا: اُن تین آدمیوں کی بھی توبہ قبول ہوگئی جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا یعنے جن کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا، اور پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا حکم الٰہی کا انتظار کرو۔ چنانچہ آیت (۱۰۶) میں انہی کی نسبت گزر چکا ہے کہ حکم الٰہی کے انتظار میں ہیں۔

یہ تین شخص کعب بن مالک، ہلال بن اُمیہ، اور مرارہ بن ربیع تھے۔ کعب بن مالک اُن ستر سابقین انصار میں سے ہیں جنہوں نے عقبہ میں بیعت کی تھی، اور ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن ربیع دونوں بدری تھے۔ یعنے اُن جاں نثاروں میں جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی تھی۔

ان تینوں سے بھی غزوۂ تبوک میں کوتاہی ہوئی، اور شریک نہ ہوئے لیکن جب آنحضرت واپس تشریف لائے، اور ساتھ نہ دینے والے اپنے اپنے عذر پیش کرکے معافی مانگنے لگے، تو انہوں نے کوئی خاص عذر پیش نہیں کیا، اور صاف صاف تسلیم کر لیا کہ ہماری سستی اور کاہلی تھی کہ اس سعادت سے محروم رہے۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا، حکم الٰہی کا انتظار کرو۔ پھر تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان کی بیویوں کو بھی حکم ہوا کہ ان سے ملنے جلنے کے تمام تعلقات منقطع کر لو۔ چنانچہ اچانک انہوں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ کی پوری آبادی نے اُن کی طرف سے رُخ پھیر لیا تھا۔ اُن کے عزیز و قریب تک اُن کے سلام کا جواب نہیں دیتے تھے۔ آخر جب پورے پچاس دن اس حالت میں گزر گئے، تو یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں قبولیت توبہ کی بشارت ملی۔

ان تین صحابیوں میں سے حضرت کعب بن مالک نے خود اپنی سرگزشت تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں، "تمام جنگوں میں میں نے رسول اللہ کے ساتھ شرکت کی، اور اس موقعہ پر بھی نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن ایک کے بعد ایک دن نکلتے گئے اور میں اسی خیال میں رہا کہ اپنے معاملات نپٹا لوں تو نکلوں۔ یہاں تک کہ آج کل ہوتے ہوتے پورا وقت نکل گیا۔ اتنے میں خبر اُڑی کہ آنحضرت واپس آ رہے ہیں۔ تب میری آنکھیں کھلیں۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آپ حسب معمول پہلے مسجد میں تشریف لائے، اور جو لوگ کوچ میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ آ آ کر معذرتیں کرنے لگے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی سچائی کا یقین دلانے لگے۔ یہ کچھ اوپر اسّی آدمی تھے۔ انہوں نے جو کچھ ظاہر کیا، آنحضرت نے قبول کر لیا، اور اُن کے دلوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ جب میری طرف متوجہ ہوئے تو مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کوئی جھوٹی معذرت بنا کر کہہ دیتا۔ جو کچھ سچی بات تھی، صاف صاف عرض کر دی۔ آپ نے سُن کر فرمایا "اچھا جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے" میں نے لوگوں سے پوچھا اور بھی کسی کو ایسا حکم ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا، ہاں مرارہ بن ربیع اور ہلال بن اُمیہ کو"

"اس کے بعد جب آنحضرت کا حکم ہوا کہ ہم تینوں سے کوئی بات چیت نہ کرے، تو سب نے منہ پھیر لیا۔ اچانک دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ گویا کل تک جس دنیا میں تھا، اب وہ دنیا ہی نہیں رہی تھی۔ میرے دونوں شریکِ ابتلا گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہے تھے، لیکن میں سخت جان تھا۔ اس حالت میں بھی روز گھر سے نکلتا، مسجد میں حاضری دیتا جماعت میں شریک ہوتا، اور پھر ایک گوشہ میں سب سے الگ بیٹھ جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نماز کے بعد قریب جا کر سلام عرض کرتا، اور پھر اپنے جی میں کہتا، دیکھوں سلام کے جواب میں آپ کے لبوں کو حرکت ہوتی ہے یا نہیں؟ آپ گوشۂ چشم سے کبھی کبھی دیکھ لیتے، لیکن جب میری نگاہِ حسرت اُٹھتی تو رُخ پھیر لیتے؛

بہرِ تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر ۔ وہ جو وقتِ ناز کچھ جنبش تمہارے ابرو میں ہے!

"ایک دن شہر سے باہر نکلا تو قتادہ کے باغ تک پہنچ گیا۔ یہ میرا چچیرا بھائی تھا اور اپنے تمام عزیزوں میں اسے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ میں نے سلام کیا، مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا ابو قتادہ! کیا تم نہیں جانتے کہ میں مسلمان ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کی اپنے دل میں محبت رکھتا ہوں؟ اس پر بھی اس نے میری طرف رُخ نہیں کیا لیکن جب میں نے یہی بات بار بار دہرائی، تو صرف اتنا کہا "اللہ و رسولہ اعلم" اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ تب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔"

"وہاں سے واپس ہوا تو راستہ میں شام کا ایک نبطی مل گیا۔ وہ لوگوں سے کہہ رہا تھا کوئی ہے جو کعب بن مالک تک پہنچا دے؟ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا تو اس نے بادشاہ غسان کا ایک خط نکال کر میرے حوالہ کیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے، تمہارے آقا نے تم پر سختی کی ہے۔ تم ہمارے پاس چلے آؤ، ہم تمہاری قدر و منزلت کریں گے۔ خط پڑھ کر میں نے کہا، یہ ایک اور نئی مصیبت آئی۔ گویا پچھلی بلائیں کافی نہ تھیں۔"

"جب اس حالت پر چالیس راتیں گزر چکیں، تو آنحضرت کی جانب سے ایک آدمی آیا اور کہا حکم ہوا ہے، تم اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ۔ میں نے کہا طلاق دے دوں؟ کہا، نہیں، صرف علٰحدگی کا حکم ہے۔ ہلال اور مرارہ کو بھی ایسا ہی حکم ہوا ہے۔ اس پر میں نے اپنی بیوی کو اس کے میکے بھجوا دیا۔"

"جب دس دن اور گزر گئے، تو پچاسویں رات پر صبح آئی۔ میں اپنے مکان کی چھت پر نماز پڑھ کر بیٹھا تھا، اور ٹھیک ٹھیک ہی حالت تھی جس کی تصویر آیت کے کلام نے کھینچ دی ہے۔ زندگی سے تنگ آگیا تھا، اور خدا کی زمین بھی اپنی ساری پہنائیوں پر میرے لیے تنگ ہو گئی تھی۔ اچانک کیا سنتا ہوں، کوئی آدمی کوہ سلع پر سے پکار رہا ہے "کعب بن مالک! بشارت ہو، تمہاری توبہ قبول ہو گئی!"

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے! آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند!

"اب لوگ جوق جوق مجھے مبارکباد دینے کے لیے دوڑے۔ ایک آدمی گھوڑا دوڑاتے ہوئے آیا، لیکن بشارت کی آواز اس سے بھی زیادہ تیز ثابت ہوئی تھی۔ میں مسجد میں حاضر ہوا تو آنحضرت لوگوں کے حلقہ میں بیٹھے تھے۔ آنحضرت کا قاعدہ تھا کہ جب خوش ہوتے تو چہرۂ مبارک چمکنے لگتا۔ جیسے چاند کا ٹکڑا ہو۔ ہم لوگوں کو یہ بات معلوم تھی۔ اس لیے ہمیشہ آپ کے چہرہ پر نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا، اس وقت بھی چہرۂ مبارک چمک رہا تھا۔ فرمایا۔ کعب! تجھے آج اُس دن کے درود کی بشارت دیتا ہوں جو تیری زندگی کا سب سے بہتر دن ہے۔ میں نے عرض کیا۔ یہ بات آپ کی جانب سے ہوئی یا اللہ کی وحی سے۔ فرمایا اللہ کی وحی سے۔" (صحیحین)

اس آیت کا نوٹ، نوٹ کے حدود سے متجاوز ہو گیا، لیکن تفصیل اس لیے ضروری ہوئی کہ معاملہ اہم ہے، اور اس میں مسلمانوں کے لیے بڑی ہی عبرت و موعظت ہے۔ امام احمد بن حنبل کی نسبت منقول ہے کہ قرآن کی کوئی آیت انہیں اس قدر نہیں رُلاتی تھی جس قدر یہ آیت اور کعب بن مالک کی روایت۔ اس سے معلوم ہوا کہ:

(ل) خدمتِ حق میں تساہل، ایک مومن کے لیے کیسا سخت جرم ہے کہ ایسے مخلص اور مقبول صحابی بھی اس درجہ سرزنش کے مستحق ہوئے، اور تمام مسلمانوں کو اُن سے قطع علائق کا حکم دیا گیا۔

(ب) مسلمانوں کی اطاعت و امتثال کا کیا حال تھا کہ جونہی انقطاعِ علائق کا حکم ہوا، تمام شہر نے بیک دفعہ رُخ پھیر لیا۔ چوری چھپے بھی کسی نے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ حتیٰ کہ اُن کے محبوب سے محبوب عزیزوں کو بھی یہ خیال نہ گزرا کہ ایک لمحہ کے لیے اس پر عمل نہ کریں، یا کم از کم تعمیل میں نرمی و تساہل سے کام لیں۔ ابوقتادہ کا حال خود حضرت کعب کی زبان سے سن چکے ہو۔ جب اُنہوں نے کہا، تم تو اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ سچا مسلمان ہوں۔ اللہ اور اُس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں۔ پھر مجھ سے رُخ کیوں پھیر لیا ہے؟ تو ابوقتادہ نے صرف یہی کہا کہ اللہ و رسولہ اعلم۔ ان تین لفظوں میں اُس عہد کے مسلمانوں کی ذہنیت کی پوری تصویر اتر آئی ہے۔ یعنے مجھے معلوم تو سب کچھ ہے۔ جانتا ہوں کہ تم پکے مسلمان ہو۔ لیکن اپنے جاننے کو کیا کروں، جاننا تو اللہ اور اُس کے رسول کا ہے، اور اُس کا حکم یہی ہے کہ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں!

پھر اس اطاعت کے لیے نہ تو کوئی مادی قوت کام میں لائی گئی تھی۔ نہ عمّال حکومت کا ڈر تھا، نہ قانون و عدالت کا، صرف ایک شخص کے لبوں نے حرکت کی تھی، اور اتنی بات سب کو معلوم ہو گئی تھی کہ اُس کی مرضی یہی ہے۔ بس، اتنی بات کا معلوم ہو جانا اس کے لیے کافی تھا کہ سب کے دل مجسم اطاعت و امتثال بن جائیں۔

(ج) پھر یہ بھی دیکھو کہ مسلمانوں کی باہمی اخوت و محبت کا کیا حال تھا؟ اس سختی کے ساتھ حکم کی تعمیل تو سب نے کی، لیکن ساتھ ہی اُن کی مصیبت کے غم سے کوئی دل خالی بھی نہ تھا۔ سب کے دلوں کو لگی تھی کہ اُن کی توبہ قبول ہو جائے۔ جونہی قبولیت کا اعلان ہوا، ایک پر ایک دوڑنے لگا کہ ان سختی کشانِ عشق کو سب سے پہلے میری زبانی مژدۂ قبولیت ملے۔ کوہ سلع پر سے جس نے پکار کر سب سے پہلے بشارت سنائی تھی، حضرت کعب نے گو اس کا نام نہیں لیا، لیکن وہ حضرت ابوبکر تھے۔

(۱۸) اس سے پہلے آیت (۹۷) میں بدوی قبائل کی نسبت فرمایا تھا کہ احکامِ دین سے بے خبری اُن سے زیادہ متوقع ہو

تعلیم و تعلم کے
لئے امہ کا قیام

کہ تعلیم و تربیت سے محروم رہتے ہیں۔ اب یہاں اشارہ کیا کہ تعلیم کا ایک عام نظم قائم کرنا چاہیے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام مسلمان گھر چھوڑ کر تحصیل علم کے لیے نکل کھڑے ہوں پس ایسا کرنا چاہیے کہ ہر بستی اور ہر گروہ میں سے کچھ لوگ اس کام کے لیے وقف ہو جائیں۔ وہ تعلیم و تربیت کے مرکز میں (اور اُس وقت مرکز مدینہ تھا) رہ کر دین میں بصیرت پیدا کریں، اور پھر اپنی آبادیوں میں جا کر دوسروں کو تعلیم دیں۔

قرآن کے یہی اشارات ہیں جنھوں نے مسلمانوں میں اول دن سے تحصیل علم کا عام ولولہ پیدا کر دیا تھا حتیٰ کہ اُنھوں نے ایک صدی کے اندر ہی اندر اس کا ایک ایسا عالمگیر نظام قائم کر دیا جس کی نظیر دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

معرکۂ یرموک کی پیشین گوئی

(۱۹) آیت (۱۲۳) میں غالباً اس طرف اشارہ تھا کہ گو تبوک میں رومیوں سے مقابلہ نہیں ہوا، کیونکہ اُنھوں نے حملہ کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا، لیکن وہ پھر طیاریاں کرنے والے ہیں، اور ضروری ہے کہ مسلمان جنگ کے لیے مستعد رہیں۔ اس صورت میں "الذین یلونکم" کا مطلب یہ ہوگا کہ جو دشمن تمھاری سرحد سے متصل ہیں۔ یعنے شام کے رومی اور عرب کے عیسائی قبائل چنانچہ چند سالوں کے بعد ایسا ہی ہوا، اور یرموک کا معرکہ پیش آیا۔

چونکہ رومیوں کا مقابلہ اُس عہد کی سب سے زیادہ طاقتور اور متمدن شاہنشاہی کا مقابلہ تھا، اس لیے فرمایا: اس قوت سے لڑو کہ وہ تمھاری سختی محسوس کریں۔ مسلمانوں نے اس حکم کی جس طرح تعمیل کی، اُس کا اندازہ صرف اس بات سے کر لیا جا سکتا ہے کہ ہرقل کی فوج بالاتفاق دو لاکھ سے زیادہ تھی اور مسلمان زیادہ سے زیادہ چوبیس ہزار تھے لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیشہ کے لیے رومی حکومت کا شام میں خاتمہ ہو گیا۔

قانون انذار و تنبیہ

(۲۰) آیت (۱۲۶) میں اگرچہ منافقوں کا ذکر ہے، لیکن قرآن کے تمام بیانات کی طرح یہاں بھی مقصود یہ ہے کہ غفلت انسانی کی ایک عام تصویر سامنے آ جائے۔ افراد کی زندگی ہو یا جماعات کی لیکن ہر ہلاکت و بربادی کے بعد تم سُراغ لگاؤ گے تو پاؤ گے کہ اُن کی ہلاکت اچانک اُن پر نہیں آ گری تھی۔ وہ مدتوں تک اُن پر منڈلاتی رہی، لیکن اُتری نہیں۔ وہ اپنی آمد کی علامتیں بھیجتی رہی۔ اُن کی زندگی کا کوئی برس، کوئی مہینہ، بلکہ کوئی دن ان سے خالی نہیں گیا لیکن جب یہ ساری تنبیہیں بیکار ہوئیں اور وہ غفلت و گمراہی سے باز نہ آئے، تو پھر اُن پر اتر آئی۔ کیونکہ یہ اُن کی "اجل" تھی، اور جب اجل آ جائے تو وہ ٹل نہیں سکتی۔ (دیکھو، ۷: ۳۴)

خدا کے روحانی قوانین بھی اُس کے جسمانی قوانین کی طرح ہیں۔ تم بدپرہیزی کرتے ہو تو فوراً نہیں مر جاتے البتہ موت کے پیام آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ پیام کیا ہیں؟ بیماریاں ہیں جو موت کی طرف سے آنے لگتی ہیں تاکہ تمھیں بروقت ہشیار کر دیں۔ اگر تم ہشیار ہو گئے تو وہ رُک جائیگی۔ نہ ہوئے تو پھر تمھارے سرہانے آ کھڑی ہو گی۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ جماعتوں اور قوموں کے ساتھ بھی پیش آتا ہے، اور ایسا ہی معاملہ افراد کی معنوی سعادت و شقاوت کا بھی سمجھو جو نصیحت پکڑتے اور باز آ جاتے ہیں، وہ سنت الٰہی کے مطابق ہلاکت سے بچ جاتے ہیں۔ جو مصر رہتے ہیں، ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے جا بجا اِمہال، ترَبُّص، اور اِستمتاع سے بھی تعبیر کیا ہے (تشریح کے لیے دیکھو تفسیر فاتحہ)

برات ایک وداعی موعظت ہے

(۲۱) امام بخاری نے براء سے روایت کی ہے کہ آخری سورت جو نازل ہوئی، برات ہے، اور حاکم وغیرہ نے اُبی ابن کعب اور ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ سب سے آخری آیات جو نازل ہوئیں برات کی آخری دو آیتیں ہیں لیکن تمام روایتوں کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، برات سب سے آخری نہیں ہو سکتی۔ کم از کم واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ (۲: ۲۸۱) اور سورۂ نصر اِس کے بعد ضرور نازل ہوئی ہے۔ بہرحال آخری ہو یا نہ ہو، لیکن باعتبار نزول کے یہ آخری کلام میں سے ضرور ہے، اور اسی لیے بہ حیثیت مجموعی پوری سورت میں اور آخری دو آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ اس طرح کا طرز خطاب پایا جاتا ہے، جیسے اُمت کو آخری احکام دیے جا رہے ہوں، یا آخری موعظت کا پیام ہو۔

چنانچہ آخری دو آیتوں میں عرب کی اُس نسل سے خطاب ہے جو اُس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا، اللہ کا رسول تم میں آ گیا، اور اُس نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آ نکلا تھا سنت الٰہی کے مطابق خود تم ہی میں

پیدا ہوا، اور چونکہ وہ تم ہی میں سے تھا اس لیے اوّل سے لے کر آخر تک اُس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے گزر چکی ہیں۔ اُس کا لڑکپن بھی تم ہی میں گذرا، اُس کی جوانی کے دن بھی تم ہی میں بسر ہوئے۔ پھر اُس نے نبوت کا اعلان کیا تو تم سے کہیں چھپ کر زندگی بسر نہیں کی۔ اُس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پھر جو کچھ گزرنا تھا گزرا، اور تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سُن لیے۔ فتح و کامرانی میں اُن کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اُس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو، اور کوئی نہیں جس نے اُس کی ایک ایک بات کی سچائی آزما نہ لی ہو۔

پھر اُن کے ایک ایسے وصف پر زور دیا جو منصب رسالت کے لیے اور ہر اُس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو، سب سے زیادہ ضروری وصف ہے یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت۔ فرمایا۔ اس سے زیادہ کوئی بات تمہارے لیے یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا شفقت و رحمت ہے۔ وہ تمہارا دُکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو خواہ روح کے لیے، اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کے لیے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اُس کی بن پڑتی تو ہدایت و سعادت کی ساری پاکیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتا۔ پھر اُس کی یہ شفقت و محبت صرف تمہارے ہی لیے نہیں ہے۔ وہ تو تمام مومنوں کے لیے خواہ عرب کے ہوں خواہ عجم کے، رؤف رحیم ہے۔

"رؤف" رأفت سے ہے، اور اُس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری و مصیبت پر جوش میں آئے۔ پس رأفت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثیر کے ساتھ واضح ہو گیا۔

خدا نے یہ دونوں وصف جابجا اپنے لیے فرمائے ہیں، اور یہاں اپنے رسول کے لیے بھی فرمائے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر یہ جمیع مخاطبین یہ سب کچھ دیکھ لینے اور تجربہ کر لینے کے بعد بھی ادائے فرض سے اعراض کریں، تو اے پیغمبر! تم آخری اعلان کر دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا تھا، اور اب بھی اللہ بس کرتا ہے۔ وہ اپنے کلمۂ حق کا محافظ ہے، اور اُس کی مشیت نے جو کچھ فیصلہ کر دیا ہے، بہرحال ہو کر رہنے والا ہے۔ اُس کا قیام و عروج کسی خاص ملک اور قوم کی پشت پناہی پر موقوف نہیں۔ میرا بھروسہ اُسی پر تھا اور اُسی پر ہے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

یہ پیامِ موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا؟ اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں۔ سورت کے نزول کا وقت اور سورت کے مطالب۔ یہ سورت اُس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمۂ حق سربلند ہو چکا تھا، اور گو قرآن نے دعوتِ حق کی عالمگیر فیروزمندیوں کی خبر دیدی تھی، تاہم اُن لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بیکسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے، تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی، اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں جو بعضوں سے تساہل ہوا، تو اُس کی تہ میں بھی اسی حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اس تفصیل اور شدت کے ساتھ استعداد کار اور عزم و ہمت کی تلقین کی گئی کہ اس کی نظیر کسی دوسری سورت میں نہیں ملتی۔

پس یہاں اس آخری موعظت و اعلان کا مطلب یہ ہے کہ اہل عرب پر دو باتیں واضح کر دی جائیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہو چکا ہے، یہ معاملہ کی تکمیل نہیں ہے بلکہ محض ابتدا ہے، اور اس لیے ادائے فرض کا مطالبہ بدستور باقی ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کام سے فارغ البال ہو گئے۔ دوسری یہ کہ کلمۂ حق اپنے عروج کے لیے تمہارا محتاج نہیں۔ اگر آئندہ تم نے کوتاہی کی، تو خود نقصان اُٹھاؤ گے، دعوتِ حق کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اُس کے لیے صرف اللہ کی کہ جہاندارئ عالم کے عرش عظیم کا مالک ہے، نصرت و حمایت کفایت کرتی ہے!

مندرجۂ بالا سطور سے وہ تمام الجھاؤ دور ہو گئے جو ان دو آیتوں کے بارے میں پیدا ہو گئے تھے۔ چونکہ ان آیتوں میں اہل عرب سے خطاب ہے اور اعراض کی صورت میں توکل علی اللہ کی تلقین کی گئی ہے، اور یہ اسلوب بیان زیادہ تر مکی سورتوں کا رہا ہے، اس لیے

بعض لوگوں نے خیال کیا، مدنی آیتیں نہیں ہو سکتیں، اور سورۂ برأت میں ان کا ہونا تعجب انگیز ہے۔ پھر اس استعجاب کو دور کرنے کے لیے طرح طرح کی توجیہیں کی گئیں لیکن مندرجہ بالا تفسیر کے بعد وہ سب غیر ضروری اور بے محل ہوگئیں۔

(۲۲) سورت کے بعض مقامات کی تشریح ابھی باقی ہے:

(ل) آیت (۲۹) میں عرب کے اُن یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی تمام معاہدات فسخ کر دینے کا حکم دیا ہے جنہوں نے یکے بعد دیگرے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کی تھیں اور مسلمانوں کے امن و عافیت کے خلاف ایک بہت بڑا خطرہ بن گئے تھے۔ اور حکم دیا ہے کہ مشرکین عرب کی طرح اُن کے خلاف بھی اب اعلانِ جنگ ہو۔

اہل کتاب سے قتال کا حکم کیوں دیا گیا

اسلام کا جب ظہور ہوا تو حجاز میں یہودیوں کی متعدد جماعتیں آباد تھیں لیکن عیسائیوں کی کوئی قریبی آبادی نہ تھی وہ یا تو یمن میں تھے، یا عرب اور شام کے سرحدی علاقے میں۔ یہودیوں کا جو طرزِ عمل رہا، اُس کی طرف اشارات گزر چکے ہیں۔ عیسائیوں کی حالت یہودیوں سے مختلف رہی۔ اُن کی طبیعت میں وہ جمود اور سختی نہ تھی جو یہودیوں میں طبیعت ثانیہ ہو چکی تھی۔ اس لیے جب انہوں نے اس دعوت کا حال سنا تو مخالفت کا جوش پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ چنانچہ یمن کے عیسائیوں نے ابتدا سے مصالحانہ روش اختیار کی تھی، اور خود اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیا تھا۔ پھر خود بخود اسلام نے اپنی راہ وہاں نکال لی۔ انہی کے وفد سے وہ مخاطبات ہوئے تھے جو سورۂ آل عمران میں گزر چکے ہیں۔

عرب سے باہر کے جن عیسائیوں تک اسلام کی دعوت پہلے پہل پہنچی، اُن کا بھی یہی حال رہا چنانچہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے جو بادشاہ مسلمان ہوا، وہ حبش کا عیسائی فرمانروا انیگوش تھا، جسے عرب نجاشی کہا کرتے تھے، اور جس کی حق شناسی اور استعداد ایمانی کی مدح خود کلام الٰہی نے کی ہے۔ (دیکھو ۵: ۸۳)

اُس عہد کے یہودیوں اور عیسائیوں کے اس اختلافِ حال کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے، اور اس کی علت بھی واضح کر دی ہے۔ (دیکھو ۵: ۸۲)

لیکن آگے چل کر جب اسلام کی دعوت زیادہ پھیل گئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو عرب اور شام کے سرحدی علاقہ میں قائم ہو گئی تھیں، اور رومی حکومت کے ماتحت تھیں اس تحریک کی ترقی گوارا نہ کر سکیں، اور رومی شاہنشاہی کی پشت گرمی سے مغرور ہو کر آمادۂ پیکار ہو گئیں۔ سب سے پہلا معاملہ حضرت حارث بن عُمیر کی شہادت کا پیش آیا۔ آنحضرت نے اُنہیں دعوتِ اسلام کا خط دے کر موتہ بھیجا تھا جہاں کا رئیس شرحبیل بن عمرو غسانی تھا۔ اُس نے اِنہیں بغیر کسی جرم و قصور کے قتل کرا دیا۔ اس صریح غدر و ظلم نے پیغمبرِ اسلام کو جنگ پر مجبور کر دیا، اور ایک فوج ۸ھ ہجری میں روانہ کی گئی۔ اُس وقت شہنشاہ قسطنطینہ بھی شام میں مقیم تھا۔ اُس سے رئیس موتہ نے مدد مانگی اور شاہی فوج بھی میدان میں آگئی۔ تاہم فتح مسلمانوں ہی کو ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد شام کے تمام عرب قبائل نے تہیّہ کر لیا کہ مسلمانوں پر حملہ کر دیں، اور شہنشاہ قسطنطینہ نے بھی اُن کی اعانت کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ شاہی فوجیں شام میں جمع ہونے لگیں، اور پیغمبرِ اسلام کو خود مدافعت کے لیے نکلنا پڑا۔ یہی دفاعی اقدام ہے جو غزوۂ تبوک کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن جب پیغمبرِ اسلام تبوک پہنچے تو معلوم ہوا مسلمانوں کے اس بے باکانہ اقدام نے دشمنوں کے ارادے پست کر دیے اور اب حملہ کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہے۔

اس سورت کی یہ آیتیں اس واقعہ کے بعد ہی نازل ہوئی تھیں، اور چونکہ اب مسلمانوں پر اس جانب سے سخت حملہ ہونے والا تھا، اور دوسری طرف عرب کے یہودی بھی اپنی سازشوں میں سرگرم تھے، اس لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ مشرکین عرب کی طرح اُن کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔

پس اس آیت میں "جنگ کرو" کے حکم سے مقصود جنگ کی یہی صورت ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کے تمام یہودیوں اور عیسائیوں پر محض اُن کے یہودی اور عیسائی ہونے کی وجہ سے حملہ کر دو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں یا جزیہ نہ دیں، جیسا کہ معترضین اسلام نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا مطلب صرف وہی قرار دے سکتا ہے جو پورے قرآن سے، پیغمبرِ اسلام کی زندگی سے، صحابہ کے حالات سے، اور تاریخ اسلام سے یک قلم آنکھیں بند کر لے۔

حکمِ قتال کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ ان جماعتوں کو دعوتِ حق سے کیوں بغض ہوا اور کیوں راستی و عدالت سے مُنہ موڑ کر مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے درپے ہوگئے؟ چنانچہ پہلے اہلِ کتاب کا نام نہیں لیا بلکہ اُن کے چار عملی وصف بیان کیے۔ یعنی جن لوگوں کے اوصاف کا یہ حال ہے، اُن سے راستی و عدالت اور پاسِ عہد و قرار کی کوئی اُمید نہیں کی جاسکتی، اور وہ پیروانِ حق کی عداوت سے کبھی باز آنے والے نہیں۔ پس اگر اُن سے جنگ نہ کی جائے تو چارۂ کار کیا رہا ہے!

(الف) باوجود اہلِ کتاب ہونے کے اب اُن کا حال یہ ہے کہ نہ تو اللہ پر ایمان باقی رہا ہے، نہ آخرت پر۔ زبان سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، لیکن اُن کا ہر عمل اعلان کرتا ہے کہ مومن نہیں۔ پھر اللہ اور اُس کے رسول نے جو کچھ حرام کر دیا تھا، اب اُن کے لیے حرام نہیں رہا۔ کیونکہ اوّل تو ہوا و ہوس سے حیلے نکال کر کتنی ہی حرام چیزیں حلال کر لیں، پھر حلت و حرمت کا حق بھی خدا کی جگہ اپنے عالموں اور پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس دینِ حق کی اُنہیں حضرت موسیٰ اور مسیح علیہما السلام نے تعلیم دی تھی اُسے یک قلم چھوڑ چکے ہیں۔

یہاں اہلِ کتاب کے ایمان کی اسی طرح نفی کی ہے، جس طرح سورۂ بقرہ میں کی ہے کہ ومن الناس من یقول اٰمنا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر وما ھم بمؤمنین (۲:۸)

حکمِ جزیہ

(ب) اس کے بعد فرمایا: حتّٰی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر جزیہ دے دیں اور اُن کا گھمنڈ ٹوٹ چکا ہو۔ نہ صرف عربی زبان میں، بلکہ تقریباً ہر زبان میں یہ محاورہ موجود ہے کہ کسی چیز کو خود اپنے ہاتھ سے دے دینا رضامندی سے دینا ہوتا ہے۔ مثلاً اُردو میں کہیں گے "تم اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر جو دے دو گے ہم لے لیں گے" یعنی اپنی خوشی سے جو کچھ دے دو، وہی ہمارے لیے بہت ہے۔ ٹھیک یہی مطلب عربی میں بھی اس ترکیب کا ہوتا ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا منظور کر لیں اور اُن کا گھمنڈ اور ظلم جس نے انسان کے امن و راحت کو خطرہ میں ڈال دیا تھا، باقی نہ رہے[1]۔

(ج) عربی میں "جزیہ"[2] خراج کے معنی میں بھی بولا گیا ہے، جو اراضی سے وصول کیا جاتا ہے، اور ٹیکس کے لیے بھی، جو اشخاص پر عائد ہوتا ہے۔ ایران اور روم میں اس طرح کے ٹیکس لیے جاتے تھے، اور عرب کے جن حصوں نے ان کی باج گزاری منظور کر لی تھی، وہ اس طرح کے ٹیکسوں سے آشنا ہو گئے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نجران (یمن) کے عیسائیوں کا جب وفد آیا، تو اُس نے خود یہ بات پیش کی کہ ہم مسلمان تو نہیں ہوتے، لیکن اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ آپ ہم پر جزیہ مقرر کر دیں۔ غالباً یہ جزیہ لینے کا پہلا واقعہ ہے جو تاریخِ اسلام میں پیش آیا۔ اس کے بعد بحرین کے یہودیوں اور مجوسیوں سے جزیہ لیا گیا۔

(د) یہاں "جزیہ لینے" کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ذکر میں آیا، لیکن اصلاً حکم تمام غیر مسلموں کے لیے ہے جو اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا منظور کر لیں۔ چنانچہ صدرِ اوّل سے لے کر آخر تک تمام اسلامی حکومتوں کا عمل اسی پر رہا۔ خود آنحضرت نے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا، صحابہ نے صابیوں سے لیا، اور خلفاءِ بنو اُمیہ و عباسیہ کا سندھ کے ہندوؤں اور پیروانِ بُدھ سے لینا معلوم ہے۔

البتہ عرب کے غیر مسلموں کے بارے میں اختلاف ہوا، اور امام ابو حنیفہ اور قاضی ابو یوسف اس طرف گئے ہیں کہ اُن سے جزیہ پر مصالحت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس بارے میں صحیح مذہب جمہور ہی کا ہے۔ یعنی عرب و عجم کی کوئی تفریق نہیں، کیونکہ خود آنحضرت اور صحابہ کا عرب کے غیر مسلموں سے جزیہ لینا ایک مسلّم واقعہ ہے۔

باقی رہے مشرکینِ عرب، تو ان کا سوال عملاً پیدا ہی نہیں ہوا، کیونکہ سورۂ براءت کے نزول کے بعد تمام مشرکینِ عرب مسلمان ہو چکے تھے، اور حکمتِ الٰہی کا فیصلہ یہی تھا کہ جاہلیتِ عرب کا شرک پھر یہاں سر نہ اُٹھائے۔

---

[1] امام شافعی نے کتاب الاُمّ میں تصریح کی ہے: سمعت عددًا من اھل العلم یقولون الصغار ان یجری علیھم حکم الاسلام یعنی میں نے متعدد اہلِ علم سے سُنا ہے کہ وھم صاغرون کا مطلب یہ ہے: اُن پر اسلامی حکومت کے قوانین جاری ہو جائیں۔ یعنی وہ اسلامی حکومت کے قوانین کے آگے جھک جائیں۔ [2] خود "جزیہ" کا لفظ بھی ایران کی پیداوار ہے۔ یعنی فارسی لفظ "گزیت" سے معرب ہوا ہے۔ اس بارے میں مولانا شبلی نعمانیؒ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ زمانۂ حال کی نہایت قیمتی اسلامی تحقیقات میں سے ہے۔

(ز) قرآن نے غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم کیوں دیا؟ اس لیے کہ حق و انصاف کا مقتضا یہی تھا، اور اس لیے کہ وہ چاہتا تھا مسلمانوں کے نظام حکومت میں غیر مسلموں پر اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے، جتنا بوجھ مسلمانوں کو اٹھانا پڑیگا۔

اسلام نے مسلمانوں پر جنگی خدمت فرض کر دی تھی یعنے آج کل کی اصطلاح میں فوجی قانون جبری تھا، اور اس لیے ضروری تھا جو غیر مسلم اسلامی حکومت کے ماتحت شہری زندگی بسر کریں، وہ بھی ملک کی حفاظت کے لیے جنگ میں شریک ہوں، لیکن اسلام نے اسے انصاف کے خلاف سمجھا کہ اس بارے میں غیر مسلموں پر جبر کیا جائے۔ اس نے یہ بات اُن کی مرضی پر چھوڑ دی کہ اگر وہ اپنی خوشی سے چاہو تو جنگی خدمات میں مسلمانوں کی طرح شریک ہو۔ نہ شریک ہونا چاہو تو اس کے بدلے ایک سالانہ رقم ادا کر دیا کرو۔ یہی رقم تھی جو غیر مسلموں کے لیے جزیہ ہوئی۔

فی الحقیقت انسان کے عقائد و جذبات کی آزادی کا یہ ایسا اعتراف تھا جس کا اس عہد میں کوئی دوسری قوم تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ کے لیے نکلنا اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ لینا ہے۔ مسلمان مسلمانوں کو اس کے لیے مجبور کر سکتے ہیں، لیکن انہیں کیا حق ہے کہ غیر مسلموں کو اس کے لیے مجبور کریں!

چنانچہ صحابۂ کرام کے زمانہ میں غیر مسلموں کو جو سرکاری فرامین دیے گئے، اُن میں ہم صاف صاف اس کی تصریح پاتے ہیں۔ جو فوج میں شریک ہوگا، اُس سے جزیہ نہیں لیا جائیگا۔ جو نہ ہوگا اُس سے جزیہ لیا جائیگا۔ بعض فرمانوں میں یہاں تک سہولت دی ہے کہ اگر عام طور پر شریک نہیں ہوتے۔ صرف ایک برس شریک ہو گئے، تو اس برس کی رقم معاف ہو جائیگی۔ طبری نے تاریخ میں اور بلاذری نے فتوح البلدان میں یہ فرامین نقل کیے ہیں۔

یہ تو پہلی علت ہوئی۔ دوسری علت کا یہ حال ہے کہ اسلام نے مسلمانوں پر کئی طرح کے ٹیکسوں کا بوجھ ڈال دیا تھا۔ زکوٰۃ انہیں ادا کرنی چاہیے، عام صدقات و خیرات میں اُنہیں حصہ لینا چاہیے۔ جنگ پیش آجائے تو اُس کا بوجھ بھی اُٹھانا چاہیے۔ پس ضروری تھا کہ غیر مسلم رعایا پر بھی ایسا ہی بوجھ ڈالا جاتا، کیونکہ جہاں تک آزادی و حقوق کا تعلق ہے، اُن میں اور مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا تھا، لیکن اسلام نے ایسا نہیں کیا۔ غیر مسلموں کو حقوق تو مسلمانوں ہی کی طرح دیے، لیکن مالی بوجھ مسلمانوں کی طرح نہیں ڈالا۔ اُن تمام ٹیکسوں کے بدلے جو مسلمانوں پر عاید کیے تھے صرف ایک ہی ٹیکس کی ادائیگی ضروری ٹھہرائی۔ یعنے جزیہ کی۔ اور وہ بھی انہیں معاف کر دیا جو فوجی خدمت کے لیے طیار ہو جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فی الحقیقت غیر مسلموں کے لیے کوئی بوجھ بھی نہ رہا اور حقوق سب کے سب رہے۔ یعنے اگر ایک غیر مسلم ذمی فوجی خدمت سے انکار نہ کرے (جو خود اُسی کے وطن کی حفاظت کے لیے ہوگی) تو وہ اسلامی حکومت میں آزادی و حقوق کی ٹھیک، ویسی ہی زندگی بسر کریگا جیسی ایک مسلمان بسر کر سکتا ہے، لیکن مسلمان کی طرح اسے کوئی ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑیگا!

کیا اس طرز عمل کی کوئی دوسری نظیر تاریخ عالم سے پیش کی جا سکتی ہے؟

(ح) جہاں تک غیر مسلموں کے مذہبی، معاشرتی، اور شہری حقوق کا تعلق ہے، موسیو لیبان کا یہ قول کفایت کرتا ہے کہ "اسلامی حکومت کے ماتحت غیر مسلم ذمیوں کو وہ سب کچھ حاصل تھا جو کسی قوم کو حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ صرف ایک بات کا حق نہ تھا۔ یعنے وہ خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے"!

(ط) آیت (۳۰) اور اس کے بعد کی آیتوں میں یہود و نصاریٰ کی اُن گمراہیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جن میں پڑ کر وہ دین حق سے منحرف ہو گئے۔

حضرت عزیر کی نسبت یہودیوں کا اعتقاد۔

یہاں یہودیوں کا یہ قول جو نقل کیا ہے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں، تو اس سے مقصود یہودیوں کا عام اعتقاد نہیں ہے بلکہ صرف اُن یہودیوں کا اعتقاد ہے جو یثرب میں آباد تھے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ سلام بن مشکم، نعمان بن اوفی، ابو انس، شاس بن قیس، اور مالک بن صیف کہ رؤساء یہود میں سے تھے، آنحضرت کے پاس آئے اور کہا، ہم آپ کی کس طرح پیروی کر سکتے ہیں جبکہ آپ نے ہمارا قبلہ ترک کر دیا اور عزیر کو ابن اللہ نہیں مانتے (ابن جریر)

عزیر سے مقصود عزرا ہیں۔ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس میں تورات کے تمام نسخے جل گئے تھے۔ اس لیے جب یہودی

بابل سے چھوٹ کر واپس آئے، تو ان کے پاس تورات کا کوئی نسخہ نہ تھا، اور ان کی نئی نسل عبرانی زبان سے بھی ناآشنا ہو گئی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت عزرا نے کلدانی حروف میں اور ایسی عبرانی میں کہ کلدانی زبان سے مخلوط تھی، از سرِ نو تورات کے صحائف لکھے، اور یہی نسخہ اصلی نسخہ کا بدل سمجھا گیا۔ چونکہ حضرت عزرا نے از سرِ نو شریعت مرتب کی، اور قید بابل کے بعد نئے دور کے بانی ہوئے، اس لیے یہودیوں میں ان کی شخصیت بہت ہی مقدس مانی گئی ہے۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ کا ہم رتبہ بلکہ شریعت کا دوسرا بانی سمجھا گیا۔ چنانچہ آج تک یہودیوں کا عام اعتقاد یہ ہے کہ اگر اُس عہد میں لوگوں سے قصور نہ ہوا ہوتا، تو عزرا بھی وہ سارے معجزے دکھا دیتے جو حضرت موسیٰ نے دکھائے تھے[1]۔

جب یہودیوں کا ان کی نسبت عام اعتقاد یہ ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ یہود یثرب کا غلو موجب تعجب ہو۔

شرح اتخاذ اربابًا من دون اللہ

(۲۴) اُس کے بعد آیت (۳۱) میں اس گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہود و نصاریٰ کی تمام فکری و عملی گمراہیوں کا سرچشمہ تھی یعنے انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو پروردگار بنا لیا ہے۔ "پروردگار بنا لینے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ انہیں رب السموات والارض کہتے ہیں، کیونکہ اس طرح تو کبھی کسی نے کسی کو رب نہیں بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے فقیہوں کو، اور عیسائیوں نے اپنے پوپ اور اُس کے مقرر کیے ہوئے پادریوں کو، دین کے بارے میں جو منصب دیدیا ہے، اور وہ اپنے زاہدوں اور درویشوں کی نسبت جیسا کچھ اعتقاد رکھتے ہیں، وہ فی الحقیقت انہیں مثل پروردگار کے بنا لینا ہے۔

چنانچہ خود پیغمبر اسلام نے اس کا یہی مطلب قرار دیا۔ عدی بن حاتم طائی جو پہلے عیسائی تھے، کہتے ہیں، آنحضرت نے جب براۃ کی یہ آیت پڑھی تو میں نے عرض کیا "ہم انہیں پوجتے تو نہیں" آپ نے کہا "کیا ایسا نہیں ہے کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہرا دیتے ہیں، تم حرام سمجھ لیتے ہو، جس بات کو حلال کر دیتے ہیں، حلال مان لیتے ہو؟" عرض کیا "ہاں" فرمایا "یہی انہیں پوجنا ہے" (ترمذی والبیہقی فی السنن) اس سے معلوم ہوا کہ اپنے دینی پیشواؤں کو تشریع دینی کا حق دیدینا، یعنے اس بات کا حق دیدینا کہ وہ جو کچھ اپنی خواہش اور رائے سے ٹھہرا دیں، اُس کی بلا چون وچرا تقلیداً اطاعت کرنی چاہیے، قرآن کے نزدیک انہیں رب بنا لینا ہے۔ کیونکہ اس بات کا حق اللہ کے سوا اور اللہ کی وحی کے مبلغ کے سوا اور کسی کو نہیں۔ پس جب دوسروں کو بھی یہ حق دیدیا گیا، تو گویا وہ خدائی میں شریک کر لیے گئے۔

عیسائیوں میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ہوا جس نے پوپ اور اُس کے مقرر کیے ہوئے فادرز کو خدا سمجھا ہو، اور نہ یہودیوں نے کبھی اپنے ربیوں کو ایسا سمجھا، لیکن ان کے عمل کا یہی حال رہا۔ گویا حق و باطل، حلال و حرام، عذاب و ثواب، اور جنت و دوزخ کی تقسیم کا سارا اختیار اُنہی کے قبضہ میں ہے۔ وہ جو حلال کر دیں حلال ہے۔ جو حرام کر دیں حرام ہے جسے چاہیں بخشش کا پروانہ دیدیں، جسے چاہیں محروم و مردود کر دیں۔ جنت کی کنجی بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ دوزخ کا داروغہ بھی اُنہی کے زیرِ حکم۔ وہ ایسے مقدس ہیں کہ کوئی بات اُن کی غلط نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ نے انہیں ایسا بااختیار کر دیا ہے کہ اُن کے حکم سے کوئی بات باہر نہیں:

ماشئتَ، لاماشائتِ الاقدارُ ؛ فاحکم، فانتَ الواحدُ القہارُ!

اس گمراہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

اولاً، خدا کی کتاب جو اس غرض سے نازل کی گئی تھی، کہ لوگ اُسے پڑھیں اور اُس پر عمل کریں، یک قلم بے اثر و بے کار ہو گئی۔ کیونکہ اُس کی جگہ انسانوں کی رایوں اور فیصلوں نے لے لی۔

ثانیاً، ہدایت کا مرکز علم خدا کا حکم نہ رہا۔ انسانوں کا حکم ہو گیا۔

ثالثاً، دینی پیشواؤں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو لوگوں کو اندھا بہرا بنا کر جس طرح چاہتا، اپنے اغراض کے لیے کام میں لاتا۔

رابعاً، انسان کی عقلی ترقی کی تمام راہیں بند ہو گئیں۔ کیونکہ جب لوگوں نے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا چھوڑ دیا اور اپنے بنائے ہوئے پیشواؤں کا حکم بلا دلیل ماننے لگے کہ یہی معنی تقلید کے ہیں، تو ظاہر ہے کہ پھر عقل کی نشو و نما اور ترقی کے لیے کونسی راہ باقی رہ گئی؟

خامساً، توہم پرستی اور جہل و کوری کا دروازہ کھل گیا۔ کیونکہ جب اعتقاد و عمل کا دار و مدار چند انسانوں کی رایوں پر ٹھہرا، اور

---

[1] جیوز انسائیکلوپیڈیا۔ اسم عزرا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی وہ مقالہ دیکھنا چاہیے جو عزرا کے حالات پر ہے۔

دوسروں کو اس کا حق نہ رہا کہ اپنی عقل و بینش سے کام لیں، تو ظاہر ہے کہ عقل و بینش کی جگہ جہل و توہم ہی پھیلے گا، اور جو خرافات کسی مجہول شخص کے (یا مذہبی پیشوا کی) زبان سے نکل جائیں گی، لوگوں کے لیے دلیل و حجت کا کام دیں گی۔

سادہ لوح، دینی پیشوا اچھے انسان ہونے کی جگہ بے پناہ دیوتا بن گئے۔ اور ان کی ساری باتوں نے تقدیس و پاکی کا جامہ پہن لیا۔ کیونکہ جب انہیں اپنے پیروؤں کے لیے حکم و تشریع کی غیر مشروط طاقت مل گئی، اور اپنے احکام و اعمال میں یک قلم غیر مسئول ہو گئے، تو پھر انسان کی شرارتیں ان سے جو کچھ بھی کرائیں کم ہے۔

یورپ کے اس عہد کی تاریخ پر نظر ڈالو جسے مؤرخ ازمنۂ وسطیٰ کے نام سے پکارتے ہیں، بلکہ اس عہد کی بھی، جو نشأۃ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے، تمہیں ان نتائج کی ساری نظیریں اور مثالیں قدم قدم پر ملنے لگیں گی۔ صرف پوپ کے منصب کی نسلاً بعد نسل تاریخ پڑھ لی جائے، اس کے لیے کفایت کرے گی۔

قرآن نے جس وقت یہ صدا بلند کی، عیسائی دنیا طیار نہ تھی کہ اس کا جواب دیتی، لیکن بالآخر وہ اس سے اعراض نہ کر سکی، اس لئے کہ قرآن کی اس دعوت حق کو عیسائیوں نے نہیں سمجھا، لیکن یہ تخم ریزی برگ و بار لائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ صلیبی لڑائیوں میں جب یورپ کے عیسائیوں کو مسلمانوں سے ملنے اور اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، تو اس کے اثرات کام کرنے لگے، اور بالآخر لوتھر نے اصلاح کنیسہ کی دعوت بلند کی۔ لوتھر اور کلیسا میں بنائے نزاع یہ تھی کہ حق کا معیار کیا ہے؟ کتاب اللہ یا پوپ کا اجتہاد؟ اور خدا کی کتاب اس لیے ہے کہ پڑھی جائے اور سمجھی جائے، یا اس لیے کہ سب کچھ پوپ پر چھوڑ دیا جائے؟ نزاع کی ابتدا نجات کے مسئلے سے ہوئی تھی یعنے نجات کا دار و مدار ایمان پر ہے، یا پوپ کی سندِ مغفرت پر؟ ظاہر ہے کہ یہ حرف بہ حرف اسی مسئلۂ حق کی بازگشت تھی کہ اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ!

آج یہ واقعہ دنیا کے تاریخی حقائق میں سے سمجھا جاتا ہے کہ یورپ کی تمام ذہنی اور علمی ترقیوں کا دور اصلاح کنیسہ کی دعوت سے شروع ہوا۔ یہ سچ ہے لیکن اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ اصلاح کنیسہ کی بنیاد اس دن پڑی تھی جس دن اللہ کے رسول نے نجران کے بشپ کو یہ دعوت اصلاح دی تھی: یااھل الکتاب! تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم، الا نعبد الا اللہ، ولا نشرک بہ شیئا، ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ (۳: ۶۴) اور پھر اس دن جس دن سورۂ براءت کی یہ آیت نازل ہوئی تھی!

اگر چھٹی صدی عیسوی کے عیسائی جہل و تعصب نے اس دعوت سے انکار نہ کیا ہوتا، تو وہ تمام تاریک صدیاں ظہور میں آتیں جن کی وحشت انگیز سرگزشتیں تاریخ کو قلمبند کرنی پڑیں، اور ازمنۂ مظلمہ کے نام سے پکاری گئیں، اور یقیناً یورپ کے علم و عقلیت کی تاریخ چودھویں صدی کی جگہ ساتویں صدی سے شروع ہو جاتی!

یہ سرگزشت تو عیسائی دنیا کی ہے جسے اس دعوت حق نے مخاطب کیا تھا۔ لیکن خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا، جنہیں اس دعوت کی تبلیغ سپرد کی گئی تھی؟ افسوس ہے کہ وہ خود بھی اس گمراہی سے بچ نہ سکے، اور انہوں نے بھی تشریع دینی کا حق کتاب و سنت کی جگہ انسانوں کی رایوں کے حوالہ کر دیا۔ اعتقاداً نہیں، عملاً، اور سوال یہاں عمل ہی کا ہے۔ نہ کہ اعتقاد کا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام مفاسد ظہور میں آگئے جن کا دروازہ قرآن نے بند کرنا چاہا تھا۔ اور سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ صدیوں سے ان کی عقلی ترقی یک قلم رک گئی اور تقلید نے علم و بصیرت کی راہوں سے انہیں دور کر دیا۔ حتیٰ کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کی معاشرتی و اجتماعی زندگی معطل ہو رہی ہے، کیونکہ اس کی ضرورتوں کے مطابق احکام فقہ نہیں ملتے اور شریعت کو فقہ کے مذاہب مدونہ ہی میں منحصر سمجھ لیا گیا ہے۔ دوسری طرف تمام اسلامی حکومتوں نے قوانین شرع پر یکسر آمد ترک کر دیا ہے، اور اس کی جگہ یورپ کے دیوانی و فوجداری آئین اختیار کر لئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ دفاتر فقہ وقت کے انتظامی و معاشرتی مقتضیات کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور کوئی نہیں جو انہیں بتلائے کہ اللہ کی شریعت کا دامن اس نقص سے پاک ہے، اور اگر وہ کتاب و سنت کی طرف رجوع کرتے تو انہیں اس زمانے کے لیے بھی ویسے ہی صالح و موافق قوانین مل جاتے جس طرح پچھلے عہدوں کے لیے مل چکے ہیں۔ فیا للہ وللمسلمین من ھذہ الفاقرة

۱؎ لوتھر پر پوپ کی طرف سے جو الزام لگائے گئے تھے ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ اسلام کا پیرو ہو گیا ہے، اور یہ کہ قرآن کے مطالعہ سے اس میں یہ گمراہی پیدا ہوئی۔ (ڈاؤڈ ذی ہسٹری آف دی ریفارم۔ باب سوم)

التی ھی [illegible] الدین - والرہبانیۃ التی ما [illegible] سبیل المومنین!

اکل اموال بالباطل

ربط: چونکہ پچھلی آیت میں احبار و رہبان کا ذکر کیا گیا تھا، اس لیے آیت (۳۴) میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو مخاطب کرکے ان کی حالت بیان فرمائی ہے، تاکہ اس سے نصیحت پکڑیں۔

قرآن نے سال اور متعدد مقامات میں یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کی ایک بہت بڑی گمراہی یہ بتلائی ہے کہ ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھا لینے میں بے باک ہوگئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ٹھیک طور پر سمجھ لیا جائے، اس سے مقصود کیا ہے؟ یہ مقصود تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگوں کے مال پر علانیہ ڈاکے ڈالتے تھے۔ ضرور کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو اُن کی روزانہ زندگی کے اعمال میں داخل ہوگئی تھی، اور جس کا نتیجہ اکل اموال بالباطل تھا۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی حلقوں اور اداروں کی تاریخ اب منضبط ہو چکی ہے۔ اُس پر نظر ڈالی جائے تو بے شمار باتیں سامنے آ جاتی ہیں، خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل امور قابلِ غور ہیں:

(۱) بادشاہوں اور امیروں کی مطلب براریوں کے لیے حلال کو حرام، حرام کو حلال بنا دیتے اور اُس کے فتوے دے کر انعام و اکرام پاتے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شریعت کے کسی حکم سے انکار کر دیتے تھے، بلکہ یہ کہ اُس کے حکموں کو توڑ مروڑ کر یا طرح طرح کے حیلے بہانے نکال کر ایسی صورتیں نکال لیتے کہ امیروں کی ہوائے نفس پوری ہو جاتی۔ مثلاً کوئی امیر اپنے کسی دشمن سے انتقام لینا چاہتا ہے تو یہ اس کے کفر کا فتویٰ طیار کرکے دے دیتے کہ شرعاً اسے قتل کرنا جائز ہے۔ کوئی بیوی سے نجات حاصل کرنی چاہتا، تو فتویٰ دے دیتے کہ نکاح قائم نہیں رہا۔ اگر کسی روپیہ پیسے والے سے کوئی ایسی بات ہو جاتی جس کی شرع میں تعزیر ہے، اور وہ روپیہ دے کر بچنا چاہتا، تو مسئلہ کی کوئی ایسی صورت کھینچ تان کے بنا دیتے کہ تعزیر ساقط ہو جاتی۔ بادشاہوں اور امیروں کے نکاح و طلاق کے بارے میں پوپ اور کارڈینلوں کی دین فروشیاں تاریخ یورپ کے ایسے مشہور واقعات ہیں کہ محتاجِ بیان نہیں۔

(۲) ناجائز طریقہ پر مال کھانے کی ایسی صورتیں نکالتے کہ مثلاً فلاں جماعت کافروں اور بت پرستوں کی جماعت ہے۔ اُن کا مال دھوکے فریب سے بھی کھا لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ ثواب ہے۔ چنانچہ علمائے یہود کا مشرکین عرب کی نسبت ایسا ہی فتویٰ تھا۔ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے: ذلک بانھم قالوا "لیس علینا فی الامیین سبیل" (۳:۵۷)

(۳) معاملات و قضایا میں رشوت لے کر فیصلے کرتے۔

قرون وسطیٰ میں پوپ سے لے کر کسی گاؤں کے ایک پادری تک جس طرح بات بات میں رشوتیں لیا کرتے تھے، تاریخ کے مسلّمات میں سے ہے۔

(۴) راہبوں میں سے جو شخص زیادہ شہرت حاصل کر لیتا، لوگ سمجھتے، اسے روحانی تسلط و تصرف کا مقام حاصل ہو گیا ہے، اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ پس ہر طرح کی حاجتیں لے کر اُس کے پاس آتے، اور وہ اُن سے طرح طرح کی نذریں لے کر انہیں یقین دلا دیتا کہ تمہاری حاجت روائی کا سامان ہو گیا۔

(۵) تمام مذہبی اعمال و رسوم کے لیے باقاعدہ قیمتیں مقرر کر دی تھیں، اور اس غرض سے کہ آمدنی کے وسائل زیادہ سے زیادہ بڑھیں، ہمیشہ نئی نئی رسمیں اور نئی نئی تقریبیں نکالتے رہتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی زندگی کے تمام اعمال خرید و فروخت کا معاملہ بن گئے۔ کوئی نماز پڑھے تو اُس کے لیے کچھ نہ کچھ خرچ کرے، روزہ رکھے تو اُس کے لیے نذرانہ نکالے، شادی غمی ہو جائے تو اُس کے لیے فیس مقرر، وعظ و نصیحت کی محفل کرنی چاہے تو اُس کے لیے باقاعدہ رقوم۔ حتیٰ کہ کوئی خدا سے دعا بھی نہیں کرا سکتا جب تک کہ اُس کا مقررہ نذرانہ ادا نہ کر دے!

(۶) کتاب اللہ کے علم و تعلیم کو صرف اپنے ہی طبقہ کے لیے مخصوص کر لیا کہ یہ عوام کے سمجھنے کی چیز نہیں۔ صرف تبرکاً سن کر ثواب کما لینے کی چیز ہے۔ اور پھر جو بہ نیتِ ثواب سُننا چاہے اُسے معاوضہ لے کر سُنانے لگے۔ چنانچہ علمائے یہود نے توراۃ خوانی کو پیشہ بنا لیا تھا، اور رومن کیتھولک چرچ کے راہب آج تک ایک ایک گھر میں جا کر انجیل سُناتے اور اُس کی قیمت وصول

کرتے ہیں۔

(۷) عوام میں یہ اعتقاد پیدا کر دیا کہ نجات کا سررشتہ انہی کے ہاتھ میں ہے۔ جسے چاہیں بخش دیں، جسے چاہیں نہ بخشیں، اور پھر اس غرض سے اعتراف گناہ (Confession) کا طریقہ رائج کیا یعنے ہر عیسائی کے لیے ضروری ہو گیا کہ کسی پادری کے سامنے جا اس غرض سے مقر ہو اپنے گناہوں کا اقرار کرے، اور وہ اُسے مسیح کے نام پر بخش دے۔ اصلاح کے بعد نئے کلیسا یعنے پروٹسٹنٹ نے اس سے انکار کر دیا، لیکن کیتھولک کلیسا کے معتقدین میں آج تک رائج ہے۔

(۸) اس سے بھی بڑھ کر جلب زر کا یہ طریقہ نکالا گیا کہ مغفرت کے پروانے فروخت کیے جانے لگے۔ یعنے جو شخص ایک خاص مقررہ قیمت ادا کر دیتا، اُسے نجات کا مقدس پروانہ مل جاتا، اور اس پروانہ کے حصول کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب کتنے ہی معاصی و جرائم کیے جائیں، آسمان میں کوئی پرسش نہ ہوگی۔ مورخین نے تصریح کی ہے کہ اس تجارت کو اس قدر فروغ ہوا تھا کہ کاروباری آدمیوں نے پوپ سے اس کی فروخت کا ٹھیکہ لینا شروع کر دیا تھا۔

لوتھر کے دل میں سب سے پہلے اسی معاملہ نے خلش پیدا کی تھی۔

(۹) طرح طرح کے تبرکات اور آثار بنائے تھے، اور عوام کے دلوں میں اعتقاد پیدا کر دیا تھا کہ جس کسی نے ان کی زیارت کر لی یا انہیں چھو لیا، اُسے دین و دنیا کی ساری برکتیں مل گئیں۔ مثلاً لکڑی کا کوئی ٹکڑا جس کی نسبت یقین دلایا جاتا تھا کہ اُسی صلیب کا ہے جس پر حضرت مسیح کو سولی دی گئی تھی، یا کسی سینٹ کا ناخن، یا کوئی کپڑا، یا تسبیح۔ لوگ ان کی زیارت کرتے اور مقررہ نذریں ادا کرتے۔ ان تبرکات پر ہیکل بھی تعمیر کیے جاتے تھے جو آج تک موجود ہیں۔

(۱۰) اکل اموال بالباطل کا ایک بڑا ذریعہ مقابر و مشاہد کی مجاوری بھی ہوئی۔ چنانچہ عیسائیوں میں یہ معاملہ اس قدر بڑھا کہ حج و زیارت کا مرکز بھی مقامات بن گئے، اور ایک دنیا کی دولت وہاں سمٹ آئی۔

(۱۱) چونکہ دین میں اخلاص باقی نہیں رہا تھا، اس لیے جب کبھی دیکھتے کہ شریعت کا کوئی حکم اُن کی دنیا پرستیوں میں مزاحم ہے، تو فوراً کوئی نہ کوئی شرعی حیلہ نکال لیتے۔ قرآن نے اصحاب سبت کے حیلہ کا ذکر کیا ہے (۷: ۱۶۳)، اور اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اُنہیں سود کے لین دین سے روکا گیا تھا، مگر وہ بلا تامل کھانے لگے (۴: ۱۶۱) اس باب میں تورات کا حکم کیا تھا، اور علمائے یہود نے کس طرح یکے بعد دیگرے حیلے نکالے، اس کی تشریح البیان میں ملیگی۔

(۱۲) جو مر جائے، اُسے ثواب پہنچانے اور اُس کے گناہوں کا کفارہ دلانے کے لیے مقررہ رقمیں وصول کرتے، اور اس غرض سے طرح طرح کی رسمیں رائج کر دی تھیں۔ چنانچہ یہودیوں اور کیتھولک عیسائیوں میں آج تک رائج ہیں۔

(۱۳) سب سے آخر مگر سب سے اول یہ کہ دین کی ساری باتوں کو یک قلم دکانداری اور پیشہ بنا لیا تھا، اور ان کی پوری زندگی ہر معنی میں دکانداری کی زندگی ہو گئی تھی۔ عالم اور درویش ہونے کے معنی ہی یہ ہو گئے کہ دین اور خدا کے نام سے پیشہ کی روٹی کھانے والے۔ علم دین کا پڑھنا، پڑھانا، مسائلِ دین کی تعلیم، فتویٰ نویسی، ہدایت و وعظ، قرأت و ذکر، کوئی کام ایسا نہ تھا جو بغیر دنیوی معاوضہ کے کیا جاتا ہو۔

قرآن نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے اُن کی اس گمراہی کی طرف اس لیے اشارہ کیا تاکہ واضح ہو جائے، اُن کا ایمان سے محروم ہو جانا اور دینِ حق کا عملاً ترک کر دینا دراصل اُن کے علما و مشائخ کی ان گمراہیوں اور دنیا پرستیوں کا نتیجہ تھا۔

لیکن آج مسلمان، اور مسلمانوں کے علما و مشائخ اپنی حالت پر نظر ڈالیں، اور غور کریں کہ کیا وہ بھی ٹھیک ٹھیک احبار و رہبان کے قدم بہ قدم نہیں چل رہے ہیں؟ اور کیا اکل اموال بالباطل کی یہ تمام صورتیں کسی نہ کسی بھیس میں یہاں بھی کام نہیں کر رہی ہیں؟ حضرت شاہ ولی اللہ نے اب سے دو سو برس پہلے فوز الکبیر میں لکھا تھا کہ اگر احبار یہود کی حالت دیکھنی چاہتے ہو تو آج کل کے علما کو دیکھ لو۔ اور اگر عیسائیوں کے رہبان کا نقشہ کھینچنا چاہتے ہو تو آج کل کے مشائخ کو سامنے بیٹھا کر کھینچ لو۔

قرآن نے اس آیت میں یہ بات تمام احبار و رہبان کی طرف منسوب نہیں کی ہے بلکہ اکثر کی طرف منسوب کی ہے، اور

مواقع کے مواقع میں اس کا عام انداز یہی ہے۔ مثلاً اہل کتاب ہی کی نسبت دوسری جگہ فرمایا ہے: وان اکثرکم فاسقون (۵: ۵۹) تم میں سے اکثر فاسق ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ تم سب فاسق ہو۔ کیونکہ اگر ایسا کہا جاتا تو گو اس اعتبار سے حق بجانب ہوتا کہ اکثریت کا حکم کل ہی کا ہوتا ہے، لیکن پھر بھی حقیقت حال کی پوری تعبیر نہ ہوتی، اور یہ مطلب نکالا جا سکتا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا ایک ایک فرد بلا استثناء اسی طرح کا ہو گیا ہے۔ حالانکہ ان میں خال خال ایماندار اور مخلص افراد بھی موجود تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ پوری امت میں ایک فرد بھی نیک راہ پر نہ رہا ہو۔

النسیء کی حقیقت

(ی) آیت (۳۷) میں "النسیء" سے مقصود کیا ہے؟ اسے خود قرآن نے بتلا دیا ہے، اور صحابۂ کرام نے مزید تشریح کر دی۔ لیکن بعد کو مفسروں کی کاوشوں نے اور خصوصاً علمائے ہیئت کی دقیقہ سنجیوں نے اسے ایک پیچیدہ سوال بنا دیا۔ غالباً ابو معشر فلکی پہلا شخص ہے جس کا خیال اس طرف گیا کہ کبیسہ کا معاملہ تھا۔ پھر ابو ریحان بیرونی نے بھی اسی کی پیروی کی۔ گذشتہ صدی کے بعض مستشرقین یورپ کو بھی اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ توجہ ہوئی کیونکہ انہوں نے خیال کیا، اس سے عرب جاہلیت کی تقویمی معلومات پر روشنی پڑ سکے گی۔ چنانچہ پوکاک، دی ساسی، کاسین دی پرسیول، اسپرنگر، ول ہوسن، وغیرہم نے اس پر طول طویل بحثیں کی ہیں، اور زمانۂ حال کا ایک اطالوی مستشرق پرنس کائتانی بھی اپنی زیر تصنیف تاریخ اسلام کی پہلی جلد میں اس پر بحث کر چکا ہے۔ مستشرقین ہی کی صف میں محمود پاشا فلکی کو بھی شمار کرنا چاہیے جس نے کبیسہ کا نظریہ تسلیم کر کے یہ کوشش کی کہ اس عہد کے شمسی مہینوں کی تقویمی حالت منضبط کی جائے۔

لیکن حق یہ ہے کہ اس نظریہ کے لیے کوئی تاریخی بنیاد موجود نہیں، اور صاف بات وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف خود قرآن نے اشارہ کر دیا ہے، اور آثار صحابہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

عرب میں حضرت اسماعیل کے زمانہ سے یہ بات چلی آتی تھی کہ سال کے چار مہینے امن کے مہینے ہیں، ان میں لڑائی نہیں ہونی چاہیے۔ رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، المحرم۔ اسی لیے انہیں اشہر الحرم کہتے تھے یعنی حرمت کے مہینے۔ نیز قمری مہینوں کے حساب سے کہ قدرتی حساب ہے، حج کا مہینہ بھی متعین تھا، اور وہ اسی نام سے پکارا جاتا تھا یعنے ذی الحجہ۔ اسی مہینہ کی آٹھویں، نویں، دسویں، حج کے اعمال و رسوم کے دن سمجھے جاتے تھے۔

ایک مدت تک یہ بات اسی طرح قائم رہی لیکن پھر لوگوں پر اس حکم کی پابندی شاق گزرنے لگی۔ اول تو اس لیے کہ قمری مہینوں کے حساب کی وجہ سے حج کا زمانہ ہمیشہ ایک ہی موسم میں نہیں آتا۔ بدلتا رہتا۔ اور اس کی وجہ سے قریش کے سفر تجارت میں خلل پڑتا۔ ثانیاً امن کے مہینوں کا معاملہ بھی ان کے جنگجویانہ مقاصد کے خلاف واقع ہوا تھا۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے کتنی ہی عداوت ہو اور انتقام کا کتنا ہی موزوں موقعہ سامنے دیکھے، لیکن اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ ان مہینوں کی بے حرمتی کر کے اعلان جنگ کر دے۔ چونکہ عرب جاہلیت کی طبیعتوں کے لیے نہ تو دینی قیود تھے نہ عقلی حدود، اس لیے مطلب براری کا ایک ڈھنگ نکال لینے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ وہ ڈھنگ یہ تھا کہ امن کے مہینوں کا معاملہ ان کے قدرتی حساب پر موقوف نہیں رکھا بلکہ اس کے لیے ایک خود ساختہ اعلان ضروری ٹھہرا دیا جو حج کے موقعہ پر کیا جاتا تھا۔ اس اعلان کے ذریعہ حسب ضرورت امن کے مہینے پیچھے ڈال دیتے، یا حج کا مہینا مؤخر کر دیتے۔ مثلاً محرم امن کا مہینا تھا۔ اعلان کر دیا جاتا کہ اس سال محرم صفر میں واقع ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ محرم کا حقیقی مہینا حکماً معدوم ہو جاتا اور اس میں لڑائی شروع ہو جاتی۔ پھر جب یہ فرق بہت دور تک پہنچ جاتا تو اسے لوٹانا شروع کر دیتے۔ یہاں تک کہ اصلی مہینوں کی ترتیب پھر قائم ہو جاتی۔

چونکہ یہ طریقہ سرتاسر جہل و فساد پر مبنی تھا، اور اس کی وجہ سے نہ تو تقویم کا کوئی معیار باقی رہا تھا، نہ امن و جنگ کے ایام کا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کا قطعاً انسداد کر دیا جائے، اور حج کے لیے ایک معین اور قطعی زمانہ مقرر ہو جائے۔ اگر فی الحقیقت اس معاملہ کی بنیاد کسی حسابی قاعدہ پر ہوتی، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن اسے زیادۃ فی الکفر سے تعبیر کرتا۔

اسلام کا جب ظہور ہوا تو عرب میں قمری مہینوں کا حساب رائج تھا۔ اس نے بھی اپنے اعمال و عبادات کے لیے اسی حساب پر اعتماد کیا۔ کیونکہ انسان کے لیے مہینوں کا قدرتی حساب یہی ہے۔ چاند چھپتا ہے، اور پھر نکلتا ہے اور ہر شخص خواہ

کسی متمدن شہر میں رہتا ہو، خواہ صحرا میں، معلوم کر لے سکتا ہے کہ کب مہینا ختم ہوا اور کب شروع ہوا۔ اس کے لیے نہ تو علم ہیئت کی حساب دانیوں کی ضرورت ہے، نہ تقویم کی جدولوں کی۔ علاوہ بریں موسموں اور طلوع و غروب کے وقتوں کی جو تبدیلیاں قمری مہینے میں ہوتی رہتی ہیں، وہ سب اس حساب میں پیش آتی رہتی ہیں۔ مثلاً رمضان اور حج کا مہینا ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ کبھی کسی موسم میں آتا ہے، کبھی کسی موسم میں، اور اس طرح ہر انسان کو اپنی زندگی میں پورا موقع ملجاتا ہے کہ یہ اعمال ہر طرح کے موسموں اور اُن کے تاثرات کے ساتھ انجام دے، جس میں بے شمار مصلحتیں ہیں اور یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

تشریح مصارف زکوٰۃ

(لکھم) آیت (٦٠) مصارف زکوٰۃ کے باب میں اصل ہے، اور ضروری ہے کہ بعض مہمات واضح ہوجائیں:

فقیر اور مسکین

(١) ہم نے ترجمہ میں "فقراء" اور "مساکین" کے لیے دوسرے الفاظ اختیار نہیں کیے، کیونکہ عربی میں "فقر" اور "مسکنت" سے مقصود احتیاج کی دو مختلف حالتیں ہیں، اور ضروری ہے کہ اُن کی لغوی نوعیت بجنسہٖ قائم رکھی جائے۔

"فقیر" اور "مسکین" دونوں سے مقصود ایسے لوگ ہیں جو محتاج ہوں، لیکن "فقر" عام ہے اور "مسکنت" کی حالت خاص ہے۔ فقیر اُسے کہینگے جس کے پاس ضروریاتِ زندگی کے لیے کچھ بھی نہیں لیکن "مسکین" وہ ہے، جس کی احتیاج ابھی اس آخری درجہ تک تو نہیں پہنچی، مگر پہنچ جائیگی اگر خبرگیری نہ کی جائے۔ مثلاً سوسائٹی کے ایسے افراد جو مختلف اسباب سے مفلس ہوگئے ہیں، یا وسائلِ معیشت کا اہتمام نہیں کرسکتے۔ اُن کے جسم پر اُجلے کپڑے ابھی باقی ہیں، گھر میں تھوڑا بہت سامان بھی نکل آئے، ممکن ہے دو چار روپے بھی جیب میں موجود ہوں۔ اگر انہیں آج کھانا نہ ملے، تو بھوکے نہیں رہینگے۔ کل نہ ملے تو برتن بیچ لینگے۔ پرسوں نہ ملے تو کپڑے فروخت کر ڈالینگے لیکن پھر اس کے بعد؟ تو کوئی وسیلۂ معاش سامنے نہیں دیکھتے۔

"فقیر" اور "مسکین" میں اس لحاظ سے بھی فرق ہے کہ فقیر کو سوال کرنے میں عار نہیں ہوتا، لیکن "مسکین" کو اسکی خودداری اور عفتِ نفس طلب و الحاح کی اجازت نہیں دیتی۔ صحیحین کی ایک حدیث میں خود آنحضرت نے "مسکین" کی یہ تعریف کی ہے کہ الذی لایجد غنی یُغنیہ، ولا یفطن فیتصدق علیہ، ولا یقوم فیسأل الناس۔ جسے ایسے وسائل میسر نہیں کہ تونگر کردیں، جس کا فقر ظاہر نہیں کہ لوگ خیرات دیں، جو خود سوال کے لیے کھڑا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ اور پھر اسی حدیث میں سورۂ بقرہ کی آیت (٢٧٣) کی طرف اشارہ فرمایا کہ یحسبہم الجاھل اغنیاء من التعفف۔ تعرفھم بسیماھم۔ لا یسئلون الناس الحافا۔ اُن کی خودداری کا یہ حال ہے کہ ناواقف خیال کرے یہ تو تونگر ہیں۔ تم انہیں اُن کے چہروں سے پہچان لے سکتے ہو، مگر وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کبھی سوال نہیں کرتے۔

بلاشبہ ایسے علماءِ دین جو سورۂ بقرہ کی آیت متذکرۂ صدر کے مصداق ہوں کہ الذین اُحصروا فی سبیل اللہ، لا یستطیعون ضرباً فی الارض (٢: ٢٧٣) یعنے دین کی تعلیم و خدمت کے لیے وقف ہوگئے ہوں اور فکرِ معیشت کے لیے وقت نہ نکال سکیں "مساکین" میں بھی داخل ہیں۔ بشرطیکہ اُنہوں نے تعلیم دین کو حصولِ زر کا پیشہ نہ بنالیا ہو، مایحتاج سے زیادہ نہ لیتے ہوں، اور کسی حال میں خود سائل و ساعی نہ ہوتے ہوں۔ نیز وہ تمام افراد جو ان کی طرح خدمتِ دین و اُمت کے لیے وقف ہو جائیں، اور معیشت کا کوئی سامان نہ رکھتے ہوں۔

قوم کے تمام ایسے افراد جن پر وسائل معیشت کی تنگی کی وجہ سے معیشت کے دروازے بند ہو رہے ہیں، اور اگرچہ وہ خود پوری طرح ساعی ہیں، لیکن نہ تو نوکری ہی ملتی ہے، نہ کوئی اور راہِ معیشت نکلتی ہے، یقیناً "مساکین" میں داخل ہیں، اور اس مد کے اولین مستحق ہیں، لیکن اس کا انتظام اس طرح ہونا چاہیے کہ ان کی خبرگیری بھی ہو جائے، اور ساتھ ہی اُن میں بیکاری کی عادت اور اپاہج پنا بھی پیدا نہ ہو۔ یہ بات نہ صرف ان کی اعانت میں، بلکہ تمام مستحقین کی اعانت میں ملحوظ رہنی چاہیے۔

ایسے افراد جو خوشحال تھے، لیکن کاروبار کی خرابی کی وجہ سے یا کسی اور ناگہانی مصیبت کی وجہ سے مفلس ہوگئے ہیں، اگرچہ اپنی پچھلی حیثیت کی بنا پر معزز سمجھے جاتے ہوں، حکماً "مساکین" میں داخل ہیں، اور ضروری ہے کہ اس مد سے اُنکی بھی خبرگیری کی جائے۔

مصارف ثمانیہ

(۲) ان مصارف کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ہر رقم ان سب میں وجوباً تقسیم کی جائے یا یہ ہے کہ خرچ انہی میں کی جاسکتی ہے۔ جس مصرف میں خرچ کرنا ضروری ہو، اُسی میں خرچ کی جائے؟ تو اس بارے میں فقہاء نے اختلاف کیا لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ تمام مصارف میں بیک وقت تقسیم کرنا ضروری نہیں جس وقت جیسی حالت اور جیسی ضرورت ہو اسی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے، اور یہی مذہب قرآن و سنت کی تصریحات اور روح کے مطابق ہے۔ ائمہ اربعہ میں صرف امام شافعی اس کے خلاف گئے ہیں۔

(۳) یہ آٹھ مصارف جس ترتیب سے بیان کیے ہیں، اگر غور کرو گے، تو معلوم ہو جائیگا کہ معاملہ کی قدرتی ترتیب یہی ہے۔ سب سے پہلے ان دو گروہوں کا ذکر کیا جو استحقاق میں سب سے زیادہ مقدم ہیں، کیونکہ زکوٰۃ کا اولین مقصود انہی کی اعانت ہے یعنے فقراء اور مساکین۔ پھر اُس گروہ کا ذکر کیا جس کی موجودگی کے بغیر زکوٰۃ کا نظام قائم نہیں رہ سکتا، اور اس اعتبار سے اُس کا تقدم ظاہر ہے، لیکن چونکہ اُس کا استحقاق بالذات نہیں تھا، اس لیے اولین جگہ نہیں دی جاسکتی تھی۔ پس دوسری جگہ پائی یعنے العاملین علیہا۔ پھر المؤلفۃ قلوبہم کا درجہ ہوا کہ ان کا دل ہاتھ میں لینا ایمان کی تقویت اور حق کی اشاعت کے لیے ضروری تھا۔ پھر غلاموں کو آزاد کرانے، اور قرضداروں کو بارِ قرض سے سبکدوش کرانے کے مقاصد نمایاں ہوئے جو نسبتہً موقت اور محدود تھے۔ پھر فی سبیل اللہ کا مقصد رکھا گیا کہ اگر مستحقین کی پچھلی جماعتیں کسی وقت مفقود ہوگئی ہوں، یا کم ہوگئی ہوں، یا مقتضیاتِ وقت نے ان کی اہمیت کم کر دی ہو، یا مال زکوٰۃ کی مقدار بہت زیادہ ہوگئی ہو، تو ایک جامع و حاوی مقصد کا دروازہ کھول دیا جائے جس میں دین و اُمت کے مصالح کی ساری باتیں آجائیں۔ سب سے آخر میں "ابن السبیل" کی جگہ ہوئی، کیونکہ تقدم میں یہ سب سے کم، اور مقدار کے لحاظ سے بہت ہی محدود صورتیں پیش آنے والا مصرف تھا۔

سبیل اللہ

(۴) قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہِ راست دین و ملت کی حفاظت و تقویت کے لیے ہوں، سبیل اللہ کے کام ہیں۔ اور چونکہ حفاظت و صیانت امت کا سب سے زیادہ ضروری کام دفاع ہے، اس لیے زیادہ تر اطلاق اسی پر ہوا۔ پس اگر دفاع درپیش ہے، اور امام وقت اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مدِ زکوٰۃ سے مدد لی جائے، تو اس میں خرچ کیا جائیگا۔ ورنہ دین و اُمت کے عام مصالح ہیں۔ مثلاً قرآن اور علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت ہیں۔ مدارس کے اجراء و قیام ہیں۔ دعاۃ و مبلغین کے قیام و ترسیل ہیں۔ ہدایت و ارشادِ اُمت کے تمام مفید وسائل ہیں[1]۔

زکوٰۃ اور اسلام کا نظام اجتماعی

(۵) دنیا میں کوئی دین نہیں جس نے محتاجوں کی اعانت اور ابناءِ جنس کی خدمت کی تلقین نہ کی ہو، اور اسے عبادت کا لازمی جزء نہ قرار دیدیا ہو، لیکن یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہے کہ وہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں ہوا بلکہ ہر مستطیع مسلمان پر ایک خاص ٹیکس مقرر کر دیا جو اسے اپنی تمام آمدنی کا حساب کر کے سال بہ سال ادا کرنا چاہیے، اور پھر اسے اس درجہ اہمیت دی کہ اعمال میں نماز کے بعد اُسی کا درجہ ہوا، اور قرآن نے ہر جگہ دونوں عملوں کا ایک ساتھ ذکر کر کے یہ بات واضح کر دی کہ کسی جماعت کی اسلامی زندگی کی سب سے پہلی شناخت یہی دو عمل ہیں: نماز اور زکوٰۃ۔ اگر کوئی جماعت بہ حیثیت جماعت کے انہیں یک قلم ترک کر دیگی تو اُس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا، اور حضرت ابوبکر نے کہا واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ (متفق علیہ)

بلاشبہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مواعظ اس بارے میں بہت دور تک چلے گئے ہیں۔ اُنہوں نے صرف یہی نہیں

---

[1] فقہاء و مفسرین کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔ اور بعضوں نے تو اسے اس درجہ عام کر دیا کہ مسجد، کنوئیں، پل اور تمام اس طرح کی تعمیرات خیریہ بھی اس میں داخل کر دیں۔ وقیل ان اللفظ عام فلا یجوز قصرہ علی نوع خاص ویدخل فیہ جمیع وجوہ الخیر من تکفین الموتی وبناء الجسور والحصون وعمارۃ المساجد وغیر ذلک (نیل الاوطار) فقہاءِ حنفیہ میں سے صاحب فتاویٰ ظہیریہ لکھتے ہیں: المراد طلبۃ العلم اور صاحب بدائع کے نزدیک وہ تمام کام جو نیکی و خیرات کے لیے ہوں اس میں داخل ہیں

ہی کر دیتا دیدو، بلکہ کہا سب کچھ دیدو۔ لیکن چونکہ اسلام کی طرح کوئی معین نظم قائم نہیں کیا، اس لیے یہ تعلیم محض زہد و ترکِ دنیا کا ایک مقام بن کر رہ گئی، اور مسیحیت کے صدرِ اول کے سوا (جبکہ کلیسا کی بنیاد باہمی اخوت و اشتراک پر قائم کی گئی تھی) کوئی زمانہ ایسا ظہور میں نہ آسکا کہ عیسائیوں میں اس تعلیم کے نتائج نے نشو و نما پایا ہو۔

(۶) پھر اس باب میں اُس کی ایک دوسری خصوصیت بھی ہے۔ یعنے وہ علت، جو نہ صرف زکوٰۃ کے لیے بلکہ تمام صدقات و خیرات کے لیے قرار دی گئی، اور جس کی وجہ سے اس معاملہ نے بالکل ایک دوسری ہی نوعیت اختیار کرلی:

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (۵۹: ۷) — تاکہ ایسا نہ ہو، مال و دولت صرف دولت مندوں کے گروہ ہی میں محصور ہو کر رہ جائے۔

یعنے زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ دولت سب میں پھیلے، سب میں بٹے۔ کسی ایک گروہ ہی کی ٹھیکہ داری نہ ہو جائے۔ اور اسی سورت کی آیت (۳۴) میں گزر چکا ہے: والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ جو لوگ چاندی سونا خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، اُن کے لیے اگر کوئی بشارت ہو سکتی ہے تو یہی کہ عذاب دردناک کی بشارت دیدو! اور حدیث بعثِ معاذ الی الیمن میں زکوٰۃ کا مقصد یہ فرمایا کہ:-

تؤخذ من اغنیائھم، فترد فی فقرائھم (رواہ الجماعۃ) — اُن کے دولت مندوں سے وصول کی جائے اور پھر اُن کے محتاج افراد میں لوٹائی جائے۔

قرآن اور احتکار واکتناز

اِن تصریحات سے معلوم ہوا کہ قرآن کی روح، دولت کے احتکار و اختصاص کے خلاف ہے۔ یعنے وہ نہیں چاہتا کہ دولت کسی ایک گروہ کی ٹھیکہ داری میں آجائے، یا سوسائٹی میں کوئی ایسا طبقہ پیدا ہو جائے جو دولت کو خزانہ بنا بنا کر جمع کرے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے، دولت ہمیشہ سیر و گردش میں رہے، اور زیادہ سے زیادہ، تمام افرادِ قوم میں پھیلے اور منقسم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے ورثہ کے لیے تقسیم و اسہام کا قانون نافذ کر دیا، اور اقوامِ عالم کے عام قوانین کی طرح یہ نہیں کیا کہ خاندان کے ایک ہی فرد کے قبضہ میں رہے۔ جونہی ایک شخص کی آنکھیں بند ہوئیں، اُس کی دولت جو اس وقت تک تنہا ایک جگہ میں تھی، اب وارثوں میں بٹ کر کئی جگہوں میں پھیل جائیگی۔ اور پھر ان میں سے ہر وارث کے وارث ہونگے اور اُسے بانٹتے اور پھیلاتے رہینگے۔

اور پھر یہی وجہ ہے کہ اُس نے سود کا لین دین حرام کر دیا، اور قاعدہ یہ ٹھہرایا کہ یمحق اللہ الربوا و یربی الصدقات (۲: ۲۷۶) اللہ سود کا جذبہ گھٹانا چاہتا ہے۔ خیرات کا جذبہ بڑھانا چاہتا ہے۔ یعنے یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ جس قوم میں سود کا جذبہ اُبھریگا، اُس کے غالب افراد شقاوت و محرومی میں مبتلا رہینگے۔ جس قوم میں خیرات کا جذبہ اُبھریگا، اُس کا کوئی فرد محتاج و مفلس نہیں رہیگا۔

اور اسی لیے اُس نے سود کے معاملہ کو اتنی اہمیت دی کہ فرمایا، جو لوگ اس پر مُصر رہینگے، وہ اللہ اور اُس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کرینگے۔ فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ (۲: ۲۷۹) کیونکہ اس معاملہ پر جماعت کی بنیادی فلاح موقوف تھی، اور ضروری تھا کہ اسے ایمان و انقیاد کا معیار قرار دیا جاتا۔

اور یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں انفاق کا حکم دینے کے بعد متصلاً فرمایا: یؤتی الحکمۃ من یشاء و من یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔ وما یذکر الا اولوا الالباب ! (۲: ۲۶۹) یعنے یہ بات، کہ اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسرے افرادِ جماعت کو دیدینا، کھونا نہیں ہے پانا ہے، بہت دقیق بات ہے۔ اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو صاحبِ حکمت ہیں، اور جس کسی نے حکمت کی دولت پائی، تو اُس نے بڑی سے بڑی بھلائی پالی۔ وما یذکر الا اولوا الالباب ![1]

---

[1] قرآن نے زکوٰۃ و صدقات کے باب میں جو کچھ کہا ہے، اُس کے معارف و دقائق بے شمار ہیں، اور بدقسمتی سے مفسرین مذہب کو شرح میں نکل گئے۔ یہاں تفصیل ممکن نہیں۔ اتنی باتیں بھی بلا قصد قلم سے نکل گئیں اور پھر طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ قلمزد کر دی جائیں۔ تفصیل کے لیے البیان کا انتظار کرنا چاہیے۔ سورۂ توبہ کی آیت والذین یکنزون الذھب والفضۃ (بقیہ صفحہ ۱۳۲)

(۷) قرآن و سنت کی تعلیمات اور صحابۂ کرام کی عملی زندگی کے مطالعہ کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا اذعان ہوگیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشہ میں دولت اور وسائل دولت کے احتکار اور اکتناز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ "احتکار" یہ کہ دولت کا کسی ایک طبقہ ہی میں محصور ہو جانا۔ "اکتناز" یہ کہ دولت کے بڑے بڑے خزانوں کا افراد کے پاس جمع ہو جانا۔ اُس نے سوسائٹی کی نوعیت کا جو نقشہ بنایا ہے، اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے، اور صرف چند خانے ہی نہیں بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بن جائیں، تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو جائیگا جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑپتی ہونگے، نہ مفلس و محتاج طبقے۔ ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائیگی۔ بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہونگے کیونکہ سعی و کسب کے بغیر کوئی مومن مومن رہ ہی نہیں سکتا لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائیگا، اُتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہوگا۔ اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائیگی، اُتنی ہی زیادہ جماعت بحیثیت جماعت کے خوشحال ہوتی جائیگی۔ قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائینگے لیکن صرف اپنے ہی لیے نہیں کمائینگے، تمام افراد قوم کے لیے کمائینگے۔ یہ صورت پیدا نہ ہوگی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیام ہو جائے، جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔ یہ بات کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کس طرح کی مدنیت اور اجتماعیت پیدا ہو سکتی ہے؟ جس درجہ اہم ہے، اتنی ہی زیادہ دقیق بھی ہے۔ البیان میں بضمن تفسیر البقرہ اس کی مفصل بحث و تحقیق ملیگی۔

(۸) اگر مسلمان آج اور کچھ نہ کریں، صرف زکوٰۃ کا معاملہ ہی احکام قرآنی کے مطابق درست کرلیں، تو بغیر کسی تامل کے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تمام اجتماعی مشکلات و مصائب کا حل خود بخود پیدا ہو جائیگا۔

(۹) لیکن مصیبت یہ ہے کہ مسلمانوں نے یا تو احکام قرآنی کی تعمیل یک قلم ترک کردی ہے، یا پھر عمل بھی کر رہے ہیں تو اس طرح کہ فی الحقیقت عمل نہیں کر رہے ہیں۔

زکوٰۃ کا نظم شرعی

قرآن نے زکوٰۃ کا معاملہ ایک خاص نظام سے وابستہ کردیا ہے اور اُسی نظام کے قیام پر اس کے تمام مقاصد و مصالح کا حصول موقوف ہے۔ زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے۔ بالکل اُسی طرح کا ٹیکس، جس طرح آج کل انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ پس اس کی ادائیگی کا طریقہ یہ نہ تھا کہ ہر شخص خود ہی اپنا ٹیکس نکالے، اور خود ہی خرچ بھی کر ڈالے، بلکہ یہ تھا کہ حکومت اپنے کلکٹروں کے ذریعہ ہر شخص سے وصول کرکے بیت المال میں جمع کرے، اور پھر ضروریات وقت کے مطابق جس مصرف کو مقدم دیکھے، اُس میں خرچ کرے۔ جب ایک شخص نے حکومت کے مقررہ عامل کو اپنی زکوٰۃ دیدی، اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی چنانچہ اسی لیے کلکٹروں اور عاملوں کی تنخواہ کا بار بھی اسی فنڈ پر ڈال دیا، اور صاف صاف لفظوں میں کہدیا کہ والعاملین علیہا۔ جو کارندے وصولی کے لیے مقرر ہوں، اُن کے ضروری مصارف۔ اگر ادائیگی کے لیے یہ بات ضروری نہ ہوتی، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مصارف کی مد میں مستقلاً عمال حکومت کا ذکر کیا جاتا۔

اور پھر یہی وجہ ہے کہ صاف و صریح لفظوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اس باب میں عمال حکومت کی اطاعت کریں، اور بلا عذر زکوٰۃ اُن کے حوالہ کردیں حتیٰ کہ اگر عمال ظالم ہوں، یا بیت المال کا روپیہ ٹھیک طور پر خرچ نہ ہو رہا ہو جب بھی اصلاح حال کی سعی کے ساتھ، ادائیگی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ بطور خود خرچ کر ڈالی جائے۔ بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا: ان قوماً من اصحاب الصدقۃ یعتدون علینا۔ عمال کا ایک گروہ صدقہ لینے میں ہم پر زیادتیاں کرتا ہے۔ کیا اس کا مقابلہ کریں؟ فرمایا "نہیں" (ابوداؤد) سعد بن وقاص کی روایت میں صاف صاف موجود ہے: ادفعوا الیھم ما صلوا۔ جب تک وہ نماز پڑھتے ہیں زکوٰۃ انہیں دیتے رہو۔

بنو اُمیہ کے زمانہ میں جب نظامِ خلافت بدل گیا، اور حکام ظلم و تشدد پر اُتر آئے، تو بعض لوگوں کو خیال ہوا۔ ایسے لوگ

(بقیہ حاشیہ) کی تفسیر تمام متداول تفاسیر میں پڑھو۔ "ولا ینفقونھا" کی توجیہ میں کیا کیا شکلیں پیدا کی گئی ہیں، اور پھر کیسے دور دراز حل نکالے گئے ہیں! حالانکہ اگر اکتناز کے زور پر غور کیا ہوتا اور اس بارے میں قرآن و سنت کی روح پیش نظر ہوتی، تو معاملہ بالکل واضح تھا۔ بہرحال یہ محل اطناب نہیں۔

ہماری زکوٰۃ کے کیوں امین سمجھے جائیں؟ لیکن تمام صحابہ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ اُنہی کو دینی چاہیے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر ڈالو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا۔ اب زکوٰۃ کسے دیں؟ کہا وقت کے حاکموں کو۔ اس نے کہا: اذا یتخذون بہا ثیابا وطیبا۔ وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور عطروں پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔ فرمایا" وان" اگرچہ ایسا کرتے ہوں، مگر دو اُنہی کو (ابن ابی شیبہ) کیونکہ زکوٰۃ کا معاملہ بغیر نظام کے قائم نہیں رہ سکتا۔

صدر اول سے لے کر آخر عہد عباسیہ تک یہ نظام بلا استثنا، قائم رہا۔ لیکن ساتویں صدی ہجری میں جب تاتاریوں کا سیلاب تمام اسلامی ممالک میں اُمنڈ آیا، اور نظام خلافت معدوم ہو گیا، تو سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ فقہاء حنفیہ کے جس قدر شروح و متون اور کتب فتاویٰ آج کل متداول ہیں، زیادہ تر اسی دور میں یا اس کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس وقت پہلے پہل اس بات کی تخم ریزی ہوئی کہ زکوٰۃ کی رقم بطور خود خرچ کر ڈالی جائے، کیونکہ غیر مسلم حاکموں کو نہیں دی جا سکتی۔ مگر ساتھ ہی فقہاء نے اس پر بھی زور دیا کہ جن ملکوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں رہی ہے اور اعادۂ حالت فوراً ممکن نہیں، وہاں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ کسی اہل مسلمان کو اپنا امیر مقرر کر لیں۔ تاکہ اسلامی زندگی کا نظام قائم رہے۔ معدوم نہ ہو جائے

لیکن افسوس ہے کہ بعد کو بتدریج اس نظام کی اہمیت سے مسلمان غافل ہوتے گئے، اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا۔ زکوٰۃ نکالنے کا معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خود حساب کر کے ایک رقم نکال لیں، اور پھر جس طرح چاہیں، خود ہی خرچ کر ڈالیں۔ حالانکہ جس زکوٰۃ کی ادائگی کا قرآن نے حکم دیا ہے، اُس کا قطعاً یہ طریقہ نہیں ہے اور مسلمانوں کی جو جماعت اپنی زکوٰۃ کسی امین زکوٰۃ یا بیت المال کو حوالے کرنے کی جگہ خود ہی خرچ کر ڈالتی ہے، وہ دیدہ و دانستہ حکم شریعت سے انحراف کرتی ہے، اور یقیناً عنداللہ اس کے لیے جوابدہ ہو گی۔

(۱۰) اگر کہا جائے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت موجود نہیں۔ اس لیے مسلمان مجبور ہو گئے، اور انفرادی طور پر خرچ کرنے لگے، تو شرعاً و عقلاً یہ عذر مسموع نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلامی حکومت کے فقدان سے جمعہ ترک نہیں کر دیا گیا جس کا قیام امام و سلطان کی موجودگی پر موقوف تھا، تو زکوٰۃ کا نظام کیوں ترک کر دیا جائے؟ کس نے مسلمانوں کے ہاتھ اس بات سے باندھ دیے تھے کہ اپنے اسلامی معاملات کے لیے ایک امیر منتخب کر لیں، یا ایک مرکزی بیت المال پر متفق ہو جائیں یا اقلاً ویسی ہی انجمنیں بنا لیں، جیسی انجمنیں بے شمار غیر ضروری باتوں کے لیے بلکہ بعض حالتوں میں بدع و محدثات کے لیے اُنہوں نے جابجا بنا لی ہیں؟

(۱۱) اسلام نے اجتماعی زندگی کا ایک پورا نقشہ بنایا تھا۔ جہاں اُس کے چند خانے بگڑے۔ سمجھ لو پورا نقشہ بگڑ گیا۔ چنانچہ اس ایک نظام کے فقدان نے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی مختل کر دی ہے۔ لوگ اصلاح کے لیے طرح طرح کے ہنگامے بپا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں انجمنوں اور قومی چندوں کے ذریعہ وقت کی مشکلوں اور مصیبتوں کا علاج ڈھونڈھ نکالیں گے، حالانکہ مسلمانوں کے لیے اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی نیا طریقہ ڈھونڈھ نکالیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنے گم گشتہ طریقہ کا کھوج لگائیں!

درازیِ شبِ بیداریِ من این ہمہ نیست ۔۔۔ ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست؟

اگر محض دولت مند افراد کے عطیوں اور قومی انجمنوں کے نظام سے قوم کا اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا تو آج یورپ اور امریکہ سے بڑھ کر کون ہے جو ان دونوں باتوں کا انتظام کر سکتا ہے؟ لیکن معلوم ہے کہ اُن کا کوئی قومی فنڈ اور کوئی قومی نظام بھی نچلے طبقوں کی بیکاری اور متوسط طبقہ کا افلاس روک نہ سکا، اور اب اجتماعی مسئلہ کا ہلاکت آفریں خطرہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ افراد کی وقتی فیاضیاں کتنی ہی زیادہ ہوں، قوم کی اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے کبھی کفیل نہیں ہو سکتیں۔ اس صورتِ حال کا علاج صرف وہی ہے جو اسلام نے تیرہ سو برس پہلے تجویز کیا تھا۔ یعنے قانون سازی کے ذریعہ قوم کی پوری کمائی کا ایک خاص حصہ کمزور افراد کی خبر گیری کے لیے مخصوص کر دینا، کہ توخذ من اغنیائہم فترد فی فقرائہم۔ اور کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم!

(۱۲) بہرحال یہ بات یاد رہے کہ زکوٰۃ کی نوعیت عام خیرات کی سی نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے پورے معنوں میں ایک اہم ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت نے ہر کمانے والے فرد پر لگا دیا تھا۔ بشرطیکہ اس کی کمائی اس کی ذاتی ضروریات زندگی سے زیادہ ہو۔ موجودہ زمانے کے انکم ٹیکسوں میں اور اس میں صرف دو باتوں کا فرق ہے۔ ایک یہ کہ اپنی نوعیت میں یہ زیادہ وسیع ہے۔ یہ صرف کاروبار کی گھٹتی بڑھتی آمدنی ہی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ اندوختہ پر بھی واجب ہو جاتا ہے، اگرچہ اس سال کوئی نئی آمدنی نہ ہوئی ہو۔ نیز اس طرح کی تمام ملکیتیں بھی اس میں داخل ہیں جو بڑھنے کی استعداد رکھتی ہیں، مثلاً مویشی۔ دوسری یہ کہ مقصد کے لحاظ سے یہ ایک خاص مصرف رکھتا ہے۔ جس کی مختلف صورتیں معین کر دی گئی ہیں۔ اسٹیٹ کو حق نہیں کہ ان مصارف کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرے۔

(۱۳) قرآن نے یہودیوں کی اس گمراہی کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے احکام شرع کی تعمیل سے بچنے کے لیے شرعی حیلے نکال لیے تھے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں میں بھی اس گمراہی نے سر اٹھایا۔ حتیٰ کہ حیلہ کا معاملہ بعض کتب فقہ کا ایک مستقل باب بن گیا۔ از انجملہ ایک حیلہ زکوٰۃ کے باب میں بھی مشہور ہے۔ طریقہ اس کا یہ بتلایا جاتا ہے کہ جو شخص زکوٰۃ سے بچنا چاہتا ہے، وہ کسی آدمی سے بخشدینے اور بخشوا لینے کا فرضی معاملہ کر لے، اور قبل اس کے کہ برس پورا ہو، اپنا تمام مال اس کے نام ہبہ کر دے۔ پھر وہ برس ختم ہونے سے پہلے وہی مال اس کے نام ہبہ کر دیگا۔ نتیجہ یہ نکلیگا کہ دونوں پر سے باوجود مالدار رہنے کے زکوٰۃ ساقط ہو جائیگی۔ مثلاً شوہر نے اپنی بیوی سے رجب کے مہینے میں کہہ دیا کہ میں نے اپنا مال تجھے ہبہ کر دیا۔ اس نے کہا قبول۔ اب شوہر پر زکوٰۃ نہیں رہی۔ کیونکہ قبل اس کے کہ سال تمام ہو، وہ صاحب نصاب نہ رہا۔ البتہ بیوی پر پڑیگی بشرطیکہ بارہ مہینے گزر جائیں لیکن وہ بارہ مہینے کیوں گزرنے دیگی! وہ جمادی الاولیٰ میں شوہر سے کہہ دیگی میں نے تمام مال اب تمہیں ہبہ کر دیا۔ اس طرح اس نیک بخت پر سے بھی زکوٰۃ ساقط ہو جائیگی!

قصہ کوتہ گشت ورنہ دردسر بسیار بود!

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ احکام شرع کی تعمیل میں اس طرح کی حیلہ بازیاں نکالنیں فسق و ضلالت کا انتہائی مرتبہ ہے، اور جو شخص اس طرح کی مکاریاں کر کے احکام الٰہی سے بچنا چاہتا ہے، اس کی معصیت ان لوگوں سے بدرجہا زیادہ ہے، جو سیدھی سادھی طرح ترک اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ ایک شخص سے جرم ہو گیا محض جرم ہے۔ مگر یہ بات کہ ایک شخص جرم کو بے جرمی و پاک عملی بنا کر رکھتا ہے، صرف جرم ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے، اور صرف اس کی عملی زندگی ہی کو نہیں بلکہ ایمان و فکر کو بھی تاراج کر دینے والا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جونہی اس طرح کے حیلوں کا چرچا پھیلا، تمام سلف امت نے اس پر انکار عظیم کیا، اور ائمہ فقہا میں کوئی نہیں جس نے انہیں جائز رکھا ہو۔

(۱۴) ایک اور غلط فہمی اس باب میں یہ پھیل گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں، اپنے مفلس رشتہ داروں کی خبرگیری کا یہی طریقہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم سے ان کی مدد کی جائے۔

بلاشبہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ غیروں سے پہلے اپنے محتاج رشتہ داروں کی خبر لے، اور قرآن نے صدقات و خیرات کے معاملہ میں جو اصلاحات کی ہیں، من جملہ ان کے ایک بڑی اصلاح یہ ہے کہ رشتہ داروں کی اعانت کو بھی خیرات قرار دے دیا، بلکہ خیرات کا سب سے پہلا اور بہتر مصرف: قل ما انفقتم من خیر، فللوالدین و الاقربین (۲: ۲۱۵) لیکن زکوٰۃ جو خیرات کی ایک خاص قسم ہے، اس لیے واجب نہیں کی گئی ہے کہ لوگ خیرات کی دوسری قسموں سے ہاتھ روک لیں، اور اپنے محتاج رشتہ داروں کی مدد کا بوجھ بھی اسی پر ڈال دیں۔ زکوٰۃ [illegible] جو صاحب استطاعت ہو، اور اگر ایک شخص خوشحال ہے، اور اس کے رشتہ دار تنگی و محتاجی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا فرض ہے کہ ان کی خبرگیری کرے۔ اگر نہیں کریگا، تو یقیناً عنداللہ جوابدہ ہوگا

کیونکہ صلہ رحمی کا حق خدا کا ٹھہرایا ہوا حق ہے: واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام (۱:۴) بلاشبہ اُس کی یہ خبرگیری اُس کے لیے خیرات کا بہترین عمل ہوگی لیکن خبرگیری ہر حال میں اس کا اسلامی فرض ہے۔ یہ طریقہ کسی حال میں بھی شرعی نہیں ہو سکتا کہ باوجود خوشحال ہونے کے اپنے رشتہ داروں کو فقر و فاقہ میں چھوڑ دیا جائے، اور پھر اگر کچھ دیا بھی جائے تو اُسے زکوٰۃ کی مد میں شمار کر لیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کوئی خاص اسلامی عمل ہی ترک نہیں کر دیا ہے، بلکہ ان کی پوری زندگی غیر اسلامی ہو گئی ہے۔ ان کی فکری حالت غیر اسلامی ہے، اُن کی عملی رفتار غیر اسلامی ہے، اُن کا دینی زاویۂ نگاہ غیر اسلامی ہو گیا ہے۔ وہ اگر اسلامی احکام پر عمل بھی کرنا چاہتے ہیں تو غیر اسلامی طریقہ سے، اور یہ دینی تنزل کی انتہا ہے۔ فمال ھؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا!

(۱۵) ایک عام اور سب سے زیادہ مہلک غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں، زکوٰۃ دے دینے کے بعد انفاق و خیرات کے اور تمام اسلامی فرائض ختم ہو جاتے ہیں۔ جہاں ایک شخص نے رمضان میں اٹھنیوں اور دونیوں کی پڑیاں باندھ کر تقسیم کے لیے رکھ دیں، سال بھر کے لیے اُسے ہر طرح کے انسانی و اسلامی تقاضوں پر چھٹی مل گئی!

حالانکہ ایسا سمجھنا ایک قلم اسلام کو بھلا دینا ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کو جس طرح کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے، وہ محض اپنی اور اپنے بیوی بچوں کے پیٹ ہی کی زندگی نہیں ہے، بلکہ منزلی، خاندانی، معاشرتی، جماعتی، اور انسانی فرائض کی ادائیگی کی ایک پوری آزمایش ہے، اور جب تک ایک انسان اس آزمایش میں پورا نہیں اُترتا، اسلامی زندگی کی لذت اُس پر حرام ہے۔

اُس پر اُس کے نفس کا حق ہے۔ اُس کے والدین کا حق ہے۔ رشتہ داروں کا حق ہے۔ بیوی بچوں کا حق ہے۔ ہمسایہ کا حق ہے، اور پھر تمام نوع انسانی کا حق ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ اپنی استطاعت اور مقدور کے مطابق یہ تمام فرائض ادا کرے، اور انہیں فرائض کی ادائگی پر اس کی زندگی کی ساری دنیوی اور اُخروی سعادتیں موقوف ہیں: واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا، وبالوالدین احسانا، وبذی القربی، والیتامی والمساکین، والجار ذی القربی، والجار الجنب، والصاحب بالجنب، وابن السبیل، وما ملکت ایمانکم (۳۶:۴)

یہ تمام فرائض ادا نہیں کیے جا سکتے، جب تک کہ انفاق و خیرات کے لیے انسان کا ہاتھ کشادہ نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اعمال میں سے کسی عمل پر اتنا زور نہیں دیا، جس قدر نماز اور انفاق پر، اور منافقوں کی سب سے بڑی پہچان اسی سورت میں یہ تبلائی کہ ان کی مٹھیاں بند رہتی ہیں۔ انفاق کے لیے کھلتی نہیں: و یقبضون ایدیھم (۹: ۶۷) اور اگر کچھ دیتے بھی ہیں تو مجبور ہو کر: ولا ینفقون الا وھم کارھون (۹:۵۴) اور مومنوں کی نسبت فرمایا ینفقون اموالھم باللیل والنھار، سراً وعلانیۃ (۲: ۲۷۴) مومن وہ ہیں جن کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا ہے، رات دن، پوشیدہ اور ظاہر، ہر حال میں سرگرم انفاق رہتے ہیں۔ نیز فرمایا، یہ شیطانی خیال ہے کہ خرچ کرنے سے ہم محتاج ہو جائیں گے، اور اس راہ میں بخل "فحش" ہے یعنی سخت قسم کی برائی۔ اور اللہ انفاق کا حکم دے کر تمہیں مغفرت اور خوشحالی کی راہوں پر لگاتا ہے: الشیطن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء، واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا (۲: ۲۶۸)

پس یہ سمجھنا کہ جہاں سال میں ایک مرتبہ زکوٰۃ کا ٹیکس دے دیا، انفاق فی سبیل اللہ کے تمام مطالبات پورے ہو گئے صریح قرآن کی تعلیم سے اعراض کرنا ہے۔ زکوٰۃ تو ایک خاص قسم کا ٹیکس ہے، اور ایک خاص مقصد کے لیے لگایا گیا ہے جو سال میں ایک مرتبہ دینا پڑتا ہے، لیکن ہماری زندگی کا ہر چوبیس گھنٹہ ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے، اور اگر ہم اسلامی زندگی کا توشہ لیکر دنیا سے جانا چاہتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ حسب استطاعت اس کے تمام مطالبات پورے کریں۔

(۱۶) قرآن اور سوشلزم

(۱۶) دنیا میں دولت اور وسائلِ دولت کا احتکار اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ضروری تھا، اُس کا ردِ عمل پیدا ہو چنانچہ اٹھارھویں صدی میں موجودہ سوشلزم کی بنیادیں پڑیں، اور اب اس نے کمیونزم کی انتہائی صورت اختیار کر لی ہے اور چند برسوں سے روس میں اس کا اولین تجربہ بھی ہو رہا ہے۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کی تعلیم سرمایہ داری کے مفاسد مٹانا چاہتی ہے اور دولت کی تقسیم کی حامی ہے، تو کیا ایسا نہیں سمجھا جا سکتا کہ اس کا رُخ بھی اُسی طرف ہے جس طرف سوشلزم جا رہا ہے؟ بلاشبہ سمجھا جا سکتا ہے، لیکن ایک خاص درجہ تک، اور اس کی حقیقت سمجھ لینی چاہیے۔ دو صورتیں ہیں، اور ضروری ہے کہ دونوں کا فرق ملحوظ رکھا جائے:

ایک صورت یہ ہے کہ دولت اور وسائلِ دولت کا احتکار روک دیا جائے، اور ہر کمانے والے فرد کو قانون سازی کے ذریعہ مجبور کیا جائے کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ کمزور افراد کے لیے نکالے۔ نیز اسٹیٹ کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے کہ کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ اصل بھی تسلیم کی جائے کہ معیشت کے لحاظ سے تمام افراد و طبقات کی حالت یکساں نہیں ہو سکتی، اور یہ عدم یکسانیت اکثر حالتوں میں قدرتی ہے۔ کیونکہ سب کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں، اور جب استعداد یکساں نہیں، تو ناگزیر ہے کہ جد و جہدِ معیشت کے ثمرات بھی یکساں نہ ہوں۔ بہ الفاظ دیگر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کر لیا جائے کہ جو جس قدر حاصل کر سکتا ہو، وہ اس کا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ صرف دولت کا احتکار ہی نہ روکا جائے، بلکہ دولت کی انفرادی ملکیت بھی ختم کر دی جائے اور ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں اجباری قوانین کے ذریعہ اقتصادی اور معیشتی مساوات کی حالت پیدا کر دی جائے۔ مثلاً وسائلِ دولت تمام تر قومی ملکیت ہو جائیں۔ انفرادی قبضہ باقی نہ رہے، اور جسمانی و دماغی استعداد کے اختلاف سے معیشت کا مختلف ہونا بطور حق تسلیم نہ کیا جائے۔

قرآن نے جو صورت اختیار کی ہے، وہ پہلی ہے، اور سوشلزم جس بات کے لیے ساعی ہے، وہ دوسری ہے۔ دونوں کا مقصد یہ ہے کہ انسانی اکثریت کی شقاوت دور کی جائے دونوں نے علاج بھی ایک ہی تجویز کیا ہے یعنے دولت کا اکتناز روکا جائے لیکن دونوں کا طریق کار ایک نہیں۔ ایک اختلافِ معیشت سے تعرض نہیں کرتا اور اُسے قائم رکھ کر راہ نکالتی ہے۔ دوسرا اُسے مٹا دینا چاہتا ہے۔

اسلام اور سوشلزم کا یہ اختلاف اگرچہ محض درجہ (ڈگری) کا اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن تہ میں مبدء کا اختلاف بھی موجود ہے۔ سوشلزم کا نظریہ یہ ہے کہ مدارجِ معیشت کا اختلاف کوئی قدرتی اختلاف نہیں ہے لیکن قرآن میں اس طرح کے اشارات جا بجا پائے جاتے ہیں کہ یہ اختلاف قدرتی ہے، اور ضروری تھا کہ ظہور میں آئے۔ وہ کہتا ہے: اگر یہاں سب کی حالت یکساں ہو جاتی تو تزاحم و تنافس کی حالت پیدا نہ ہوتی، اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہوتی تو انسان کی قدرتی قوتوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کے لیے کوئی شے محرک بھی نہ ہوتی اور اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں ظہور میں نہ آتیں جن سے یہ تمام کارخانہ چل رہا ہے!

وھو الذی جعلکم خلائف الارض و رفع بعضکم فوق بعض درجٰت لیبلوکم فی ما اٰتاکم۔ ان ربک سریع العقاب، وانہ لغفور رحیم (۶: ۱۶۵)	اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیے، تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے، اُس میں تمہیں آزمائے بلاشبہ تمہارا پروردگار (بدعملیوں کی) فوراً سزا دینے والا ہے، اور بلاشبہ وہ بڑا ہی بخشنے والا، رحمت والا ہے!

اس آیت میں تین باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اولاً خدا نے انسانی زندگی کا کارخانہ کچھ اس طرح چلایا ہے کہ یہاں ہر گوشہ میں ایک طرح کی جانشینی کا سلسلہ جاری رہتا ہے یعنے ایک فرد اور گروہ جاتا ہے۔ دوسرا فرد اور گروہ اس کی جگہ لیتا اور اُس کے ثمرات و نتائجِ سعی کا وارث ہوتا ہے۔ ثانیاً درجے کے لحاظ سے سب یکساں نہ ہوئے بعض اوپر ہوئے بعض اُن سے نیچے۔ ثالثاً مدارجِ معیشت کی یہ بلندی و پستی اس لیے ہوئی تاکہ انسان کے عمل و تصرف کے لیے آزمائش کی حالت پیدا ہو جائے، اور ہر

افراد اور ہر گروہ کو موقعہ دیا جائے کہ اپنی سعی و کاوش سے جو درجہ حاصل کر سکتا ہے، حاصل کرلے۔ آخر میں فرمایا۔ خدا کا قانونِ جزاء قسمت و قمار نہیں یعنے سعی و طلب کی سعی امتحان گاہ ہے جزاءِ عمل کا معاملہ وابستہ ہے۔ جیسے جس کے اعمال ہونگے، ویسے ہی نتائج اُس کے حصہ میں آجائینگے۔

اسی طرح جابجا قرآن میں پاؤگے: واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق (۱۶: ۷۱) خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں بڑائی دی ہے۔ نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا، ورفعنا بعضھم فوق بعض درجٰت (۴۳: ۳۲) دنیوی زندگی کی معیشت ہم نے لوگوں میں تقسیم کردی، اور اس کا کارخانہ ایسا بنادیا کہ سب ایک ہی درجہ میں نہیں ہیں۔ کوئی کسی درجہ میں ہے، کوئی کسی درجہ میں۔

بہرحال قرآن نے اجتماعی مسئلہ کا جو حل تجویز کیا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ مدارجِ معیشت کی مساوات قائم کرنی نہیں چاہتا لیکن حقِ معیشت کی مساوات ضرور قائم کرتا ہے۔ یعنے وہ کہتا ہے، یہ بات ضروری نہیں کہ سب کو ایک ہی طرح پر سامانِ معیشت ملے، لیکن یہ ضروری ہے کہ ملے سب کو۔ اور سعی و ترقی کی راہ یکساں طور پر سب کے سامنے کھل جائے۔ اُس نے ہر طرح کے نسلی، خاندانی، جغرافیائی، اور طبقاتی امتیاز مٹادیے، اُس نے زندگی کے ہر میدان میں انسانی مساوات کا اعلان کردیا، اُس نے وہ تمام رُکاوٹیں دور کردیں جو سوسائٹی کے اونچے طبقوں نے کمزور افراد کی خوشحالی و ترقی کی راہ میں پیدا کردی تھیں، اُس نے قانون سازی کے ذریعہ دولت کا احتکار و اختصاص روک دیا، اُس نے زندگی کے ہر گوشہ میں دولت کے اکتناز کی جگہ دولت کی تقسیم پر زور دیا۔ اُس نے اس بات سے قطعاً انکار کردیا کہ دولت مندی بجائے خود کوئی حق ہے۔ اُس نے بے اعتدالانہ سرمایہ داری کی تمام راہیں روک دیں، اُس نے سود کی ہر شکل حرام کردی، اُس نے جُوئے کو کسی حال میں جائز نہ رکھا۔ پھر ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ کہ انسانی زندگی کے اعمالِ حق میں انفاق فی سبیل اللہ کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی، اور ہر کمانے والے فرد کو سالانہ ٹیکس کے ذریعہ مجبور کردیا کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دوسروں کے لیے بھی نکالے۔ بس یہ نقشہ ہے جو اسلام نے اجتماعی نظام کا بنایا ہے۔

لیکن سوشیلزم صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہنا چاہتا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے، اور چاہتا ہے، انفرادی ملکیت کی جگہ قومی ملکیت کا نظام قائم کیجیے اور مدارجِ معیشت کا اونچ نیچ معدوم ہوجائے۔ وہ یہ اصل تسلیم نہیں کرتا کہ احوالِ معیشت کا اختلاف قدرتی ہے اور اجتماعی زندگی کی سرگرمی و ترقی کے لیے محور و محرک رہی ہے۔ وہ کہتا ہے، اس وقت تک حالت ایسی ہی رہی ہے، لیکن اگر سوسائٹی کا نظام مساواتِ معیشت پر قائم کیا گیا، تو دوسری طرح کی ذہنی اور معنوی محرکات پیدا ہوجائینگی، اور کارخانۂ معیشت کی سرگرمی اسی طرح جاری رہیگی جس طرح اس وقت تک جاری رہی ہے۔

دنیا کا اس وقت تک کا تجربہ اس کے خلاف ہے اور روس کا نیا تجربہ بھی اس وقت تک اپنے نظریوں کو عملیت کا جامہ نہیں پہنا سکا ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ سوشیلزم کو اس مطالبہ کا حق ہے کہ مزید تجربہ کا موقع دیا جائے۔ ولتعلمن نبأہ بعد حین!

حقیقتِ نفاق

(ل) قرآن نے کفر کی طرح "نفاق" کا بھی جابجا ذکر کیا ہے، اور منافقوں کے اعمال و خصائل کی سب سے زیادہ تفصیل اسی سورت میں ملتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ ٹھیک طور پر سمجھ لیا جائے، نفاق کی حقیقت کیا ہے، اور منافقوں کی جماعت کس طرح کی جماعت تھی؟

(۱) دنیا میں ہم دیکھتے ہیں، فکر و عمل کا کوئی گوشہ ہو، تین طرح کے آدمی ضرور ہوتے ہیں:

مستعد و صالح طبیعتیں۔ یہ ہر اچھی بات کو پہچان لیتی ہیں اور قبول کرلیتی ہیں، اور پھر سرگرمِ عمل ہوجاتی ہیں۔

مفسد طبیعتیں۔ انہیں ہر اچھی بات سے انکار ہوتا ہے۔ کوئی سیدھی بات ان کے اندر اُترتی نہیں۔

درمیانی گروہ۔ یہ ہر بات کو سُن لینے اور مان لینے کے لیے طیار ہوجاتا ہے لیکن فی الحقیقت اس کے اندر طیاری نہیں ہوتی۔ وہ قدم اُٹھا دیتا ہے مگر چلنا نہیں چاہتا، اور چلتا ہے، تو پہلے ہی قدم میں لڑکھڑا جاتا ہے۔ اس میں پہلے گروہ کی مستعدی نہیں ہوتی کہ جو بات مان لی، اُسے ٹھیک ٹھیک مان لے اور عمل کرے۔ اس میں دوسرے گروہ کی بے باکی و جرأت بھی

نہیں ہوتی کہ کھل کر صاف صاف انکار کر دے۔ پس گو وہ سمجھتا ہے کہ ایک راہ اختیار کر لی ہے، لیکن فی الحقیقت معلق ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی نہیں ہوتا۔ جہاں تک اقرار کا تعلق ہے، قبول کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ جہاں تک اذعان و عمل کا تعلق ہے، منکروں کی سی حالت میں: مذبذبین بین ذلک لا الی هؤلاء ولا الی هؤلاء (۴: ۱۴۳)

جزم و یقین اور عزم و عمل پہلے گروہ کا خاصہ ہے۔ انکار و جحود دوسرے کا، اور شک و تذبذب اور بے عملی و تعطل تیسرے کا۔

یہی حال ایمان و عمل کے دائرہ کا بھی ہے۔ یہاں بھی طبیعتِ انسانی کی یہ تینوں حالتیں ظہور میں آتی ہیں۔ بعض طبیعتیں قبول کر لیتی اور عمل پیرا ہو جاتی ہیں۔ یہ مومن ہیں۔ بعض انکار کرتے اور مخالفت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ یہ کافر ہیں۔ کچھ لوگ قبول کر لیتے ہیں، لیکن فی الحقیقت قبولیت کی روح ان کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ منافق ہیں۔

(۲) قرآن نے کفر کی طرح نفاق کے اعمال و خصائص بھی پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ کیونکہ کفر کی طرح نفاق بھی کسی خاص عہد کی پیداوار نہ تھا۔ ہمیشہ ظہور میں آنے والی گمراہی تھی، اور انسان کی گمراہیاں کسی خاص عہد و نسل کی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی گمراہیاں ہوتی ہیں۔

(۳) ایک عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں، منافقوں کا گروہ کافروں کا کوئی خاص سازشی گروہ تھا جو جاسوسوں کی طرح بھیس بدل کر مسلمانوں میں رہنے لگا تھا۔ باہر نکلتا تو مسلمان بن جاتا، اکیلے میں ہوتا تو اپنے اصلی بھیس میں لوٹ آتا۔ حالانکہ ایسا سمجھنا قرآن و احادیث کی صاف صاف تصریحات کو جھٹلانا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام بطور اپنے دین و اعتقاد کے اسی طرح اختیار کر لیا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں نے۔ چنانچہ اسی سورت کی آیت (۷۴) میں ہے کہ: وکفروا بعد اسلامهم۔ اسلام لا کر پھر کفر کی باتیں کیں۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کی بیویاں انہیں مسلمان سمجھتی تھیں۔ ان کے بچے انہیں مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ نماز پڑھتے تھے۔ روزہ رکھتے تھے۔ اسلام کے طور طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے[1]۔ جہاں تک کسی دین کو بطور ایک دین کے اختیار کر لینے کا تعلق ہے، کوئی بات ایسی نہ تھی جو بظاہر ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو۔ تاہم قرآن نے فیصلہ کیا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ کیونکہ اسلام کا گھونٹ تو انہوں نے پی لیا تھا، لیکن حلق کے نیچے نہیں اترا تھا۔ کسی تعلیم کو اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے، اس سے یک قلم محروم تھے۔ اخلاص اور صداقت کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اللہ کا کلام سنتے، مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں، بلکہ اس لیے کہ محض سنتے رہیں۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دلی کے ساتھ۔ خیرات کرتے مگر مجبور ہو کر۔ ان کے دلوں میں دین سے زیادہ دنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کے شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے، ان پر خوش خوش عمل کرتے۔ جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگنا چاہتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقع ہوتا تو وہ سب سے پہلے مومن تھے۔ جب کبھی قربانیوں کا موقع آ جاتا تو سب سے آخری صفوں میں بھی دکھائی نہ دیتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتیں۔ انفاق کا حکم ان کے لیے موت کا پیام ہوتا۔ اسلام کے دشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں انہیں کچھ تامل نہ ہوتا۔ وہ سمجھتے تھے، دونوں طرف ملے رہنے ہی میں مصلحت ہے۔ اگر بازی الٹ پڑی اور دشمن فتح مند ہو گئے، تو ان کے پاس بھی اپنی جگہ بنی رہے گی۔

ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں بھی یکساں نہیں، اور نہیں تھیں۔ چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقرار نما صورت ہے، اس لیے جب بڑھتی ہے، تو انکارِ قطعی ہی کی طرف بڑھتی ہے، اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں۔ کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ چنانچہ اس عہد کے منافقوں کی حالتِ نفاق یکساں نہ تھی۔ عبداللہ بن ابی کا نفاق ہر منافق کا نفاق نہ تھا۔ خود قرآن نے اسی سورت کی آیت (۱۰۱) میں اس طرف اشارہ کیا ہے: وممن حولکم من الاعراب منافقون ومن اهل المدینة مردوا علی النفاق۔ کسی کے نفاق کا رخ زیادہ تر اس طرف تھا کہ ہجرت سے جی چراتے تھے۔ کسی پر انفاقِ مال شاق تھا۔ کوئی جہاد سے بچنا چاہتا تھا۔ کسی پر نماز کا قیام سخت گزرتا تھا۔ کوئی ایسا بھی تھا کہ احکامِ الٰہی اور آیاتِ قرآنی کی ہنسی

---

[1] عبداللہ بن ابی منافقوں کا سرغنہ تھا، لیکن اس کا لڑکا منافق نہ تھا، مخلص مومن تھا۔ اسی طرح تمام منافقوں کی اولاد و احفاد مخلصوں کی جماعت نکلی۔

آزمانا تھا، اور اس تاک میں تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی آفت آپڑے تو کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ ہو جائے۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ اُن سب نے اسلام بطور ایک دین و طریقہ کے قبول کر لیا تھا، اور مسلمانوں ہی میں سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ محض ایک سازشی گروہ بھیس بدل کر مسلمانوں میں آ ملا ہو، اور مسلمانوں میں سے نہ ہو۔

(۴) اب غور کرو، یہاں منافقوں کے اعمال و خصائص کیا کیا بیان کیے ہیں:-

منافقوں کے اعمال و خصائص

(ا) جب راہِ حق میں جان و مال کی قربانی کا وقت آتا، تو طرح طرح کے حیلے بہانے نکال لیتے اور کہتے ہیں گھر بیٹھے رہنے کی اجازت مل جائے۔

(ب) مسلمانوں میں ہمیشہ فتنہ پھیلاتے۔ کمزور اور نا سمجھ آدمیوں کو گمراہ کرتے، اِدھر کی بات اُدھر لگاتے۔

(ج) جب کبھی جماعت کے لیے کوئی نازک وقت آجاتا، تو اس طرح کی باتیں نکالتے کہ دوسروں کے دل بھی کمزور پڑ جاتے، اور کوئی نہ کوئی فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ چنانچہ اُحد میں اُنہوں نے ایسا ہی کیا، اور اس موقع پر بھی کمی نہیں کی۔

(د) دینداری کے بھیس میں اپنا نفاق چھپاتے، اور کہتے۔ اس کام میں ہمارے لیے فتنہ ہے، اس لیے شریک نہیں ہو سکتے۔

(ہ) مسلمانوں کی مصیبت اُن کے لیے مصیبت نہیں ہوتی، اور نہ اُن کی خوشی، اُن کے لیے خوشی۔

(و) جب کوئی جماعتی معاملہ پیش آجاتا، تو اُس کا ساتھ نہ دیتے اور طرح طرح کی فتنہ اندازیاں کرتے۔ پھر اگر کوئی حادثہ پیش آجاتا، تو کہتے، ہم نے پہلے ہی یہ بات معلوم کر لی تھی۔ اسی لیے ساتھ نہیں دیا تھا۔ اور پھر بجائے اس کے کہ قوم کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھیں، دل میں خوش ہوتے کہ چلو اچھا ہوا، کامیاب نہ ہوئے!

(ز) نماز پڑھیں گے تو اس بے دلی سے کہ معلوم ہوگا، ایک بوجھ آپڑا ہے، اور چاہتے ہیں، کسی نہ کسی طرح پٹک کر الگ ہو جائیں۔

(ح) نیکی کی راہ میں خوشدلی سے کبھی خرچ نہ کریں۔ کنجوسی اُن کی سب سے بڑی علامت ہے۔

(ط) قسمیں کھا کھا کر یقین دلائیں گے کہ ہمیں مخالف نہ سمجھو، حالانکہ دل میں نفاق بھرا ہوا ہے۔

(ی) چونکہ دلوں میں کھوٹ ہے، اس لیے ڈرے سہمے رہتے ہیں، اور بہت سے کام دل کی خواہش سے نہیں، بلکہ محض جماعت کے خوف سے کرتے ہیں۔

(ک) چونکہ راہِ حق کی آزمائشیں پیش آتی رہتی ہیں، اور دل میں اخلاص و یقین نہیں ہے، اس لیے بسا اوقات صورتِ حال سے ایسے مضطرب ہو جاتے ہیں کہ اگر چھپ بیٹھنے کی کوئی جگہ مل جائے تو فوراً رسی تڑا کر بھاگ کھڑے ہوں۔

(ل) غرض کے بندے ہیں۔ اُن کی خوشنودی اور ناراضگی کا سارا دار و مدار دنیا اور دنیا کا حصول ہے۔ اگر صدقات کی تقسیم میں انہیں بھی کچھ دے دیا جائے، تو خوش رہیں گے۔ نہ دیا جائے تو بگڑ بیٹھیں گے۔

(م) چونکہ ایمان و راستی سے محروم ہیں، اس لیے حق و ناحق کی کچھ پروا نہیں۔ جس طرح بھی ملے مال و دولت حاصل کرنی چاہیے۔ صدقات و خیرات کے مستحق نہیں، لیکن اُس کے حصول کے خواہشمند رہتے ہیں۔

(ن) اگر اُن کی ہوائے نفس کے خلاف کوئی فیصلہ ہو، تو فوراً طعنہ زنی پر اُتر آئیں کہ دوسروں کی طرفداری کی جاتی ہے۔

(س) پیغمبر اسلام مخلص مومنوں کا اخلاص پہچانتے اور اُنہیں قابلِ اعتماد سمجھتے تھے۔ یہ بات منافقوں پر شاق گذرتی تھی کہ بعضوں نے کہا، وہ کان کے کچے ہیں۔ لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔

(ع) جب دیکھتے ہیں، اُن کی منافقانہ روش پر عام برہمی پیدا ہو گئی، تو قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یقین دلاتے اور اُنہیں اپنے سے راضی رکھنا چاہتے۔ قرآن کہتا ہے۔ ان کی حق فراموشی دیکھو۔ انہیں خدا کی تو کچھ پروا نہیں کہ بد عملیاں کیے جاتے ہیں، لیکن انسانوں کی اتنی پروا ہے کہ جونہی اُن کی نگاہیں بدلی ہوئی نظر آئیں، لگے خوشامد کرنے اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے۔

فی الحقیقت انسانی گمراہی کی بوالعجبیوں میں سے ایک عجیب بوالعجبی یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کا مدعی ہوتا ہے، اور جانتا ہے کہ اُس کے علم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ تاہم ہر طرح کی معصیتیں کیے جائیگا اور ایک لمحہ کے لیے بھی خیال نہ ہوگا

میں کیا کر رہا ہوں، لیکن جونہی انسانوں کی نظر میں اُس کی ہستیں نمایاں ہوئیں، اُس کے ہوش و حواس گم ہو جائینگے اور ہزاروں طرح کے وحشی کر بیٹھیں، وہ ڈر کے مارے سہمے گئیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فی الحقیقت اُسے خدا کی ہستی کا یقین نہیں۔ کیونکہ اگر یقین ہوتا۔ اسی درجہ کا یقین جس درجہ کا یقین انسانوں کی موجودگی پر رکھتا ہے، تو ممکن نہ تھا کہ اُس سے بے پروا ہو جاتا۔ قرآن کہتا ہے، یہی حالت نفاق کی حالت ہے۔

(ف) دین کے بارے میں اُن کی زبانیں چھوٹ ہیں لیکن جب پکڑے جاتے ہیں، تو کہتے ہیں، ہم نے بطور تفریح اور منسی کے ایک بات کہہ دی تھی۔ سچ مچ کو ہمارا یہ مطلب نہ تھا۔ قرآن کہتا ہے، یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوا، تم اللہ کی، اُس کی آیتوں کی، اُس کے رسول کی ہنسی اُڑاتے ہو۔

(ص) جس طرح تمام مومن مرد اور عورتیں، راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و معاون ہیں۔ اسی طرح منافق راہِ نفاق میں ایک دوسرے کے رفیق و معاون ہیں۔

(ق) کذب گوئی اُن کا شعار ہے۔ صریح ایک بات کہینگے، اور پھر انکار کر دینگے۔

(ر) بعضوں کا یہ حال ہے کہ عہد کرتے ہیں۔ خدایا، اگر تو ہم پر فضل کرے، تو ہم تیری راہ میں خیرات کرینگے، اور نیکی کی زندگی بسر کرینگے۔ لیکن جب اللہ فضل کرتا ہے، تو پھر بے تامل بخیلی پر اتر آتے ہیں اور کچھ اُس کی راہ میں نہیں نکالتے۔ اُس کی طرف سے رُخ پھیرے رہتے ہیں!

(ش) اُن کا ایک وصف یہ ہے کہ خود تو کچھ کرینگے نہیں، لیکن کرنے والوں کے خلاف زبان کھولنے میں ہمیشہ بے باک رہینگے۔ مثلاً اگر خوش حال آدمیوں نے بڑی بڑی رقمیں راہِ حق میں نکالیں تو کہینگے، دکھاوے کے لیے یا کسی دنیوی غرض کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اگر کوئی غریب آدمی اپنی محنت مزدوری کی کمائی میں سے چار پیسے نکال کر رکھ دیگا، تو اُس کی ہنسی اُڑائینگے کہ واہ اچھی خیرات کی!

(ت) راہِ حق میں محنتیں مشقتیں برداشت کرنا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ غزوۂ تبوک کا معاملہ سخت گرمی میں پیش آیا تھا اس لیے لوگوں سے کہتے تھے۔ اس گرمی میں کہاں جاتے ہو؟

(ث) ایمان کے ضعف نے انہیں مردانگی کے احساس و غیرت سے بھی محروم کر دیا جب لوگ قوم و ملت کی راہ میں جان و مال قربان کرتے ہیں، تو وہ عورتوں کے ساتھ گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں، اور ذرا بھی نہیں شرماتے۔

(خ) کچھ لوگ ایسے ہیں جو نفاق کی حالت میں شب و روز رہتے رہتے بڑے مشاق ہو گئے ہیں۔ دوسرے اتنے مشاق نہیں۔ جو مشاق ہیں، تم انہیں تاڑ نہیں سکتے۔

(ذ) بعض لوگ دینداری کے بھیس میں ایسی راہیں نکالتے کہ مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ہو اور اُن کے مقاصد کو نقصان پہنچے۔ مثلاً ایک مسجد بنائی اور پیغمبر اسلام سے عرض کیا، آپ اس میں نماز پڑھا دیں تو ہمارے لیے برکت و سعادت ہو۔ مقصود یہ تھا کہ اپنے اجتماع کے لیے ایک نیا حلقہ پیدا کریں، اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ہو۔

(ض) کوئی سال نہیں گزرتا کہ اُن کے لیے تنبیہ و اعتبار کی کوئی نہ کوئی بات ظہور میں نہ آجاتی ہو لیکن غفلت کا یہ حال ہے کہ نہ تو توبہ کرتے ہیں، نہ عبرت پکڑتے ہیں۔

(۵) سورۂ آل عمران، نساء، انفال، احزاب، محمدؐ، فتح، حدید، مجادلہ، اور حشر میں بھی منافقوں کے اعمال و خصائص بیان کیے گئے ہیں، اور ایک پوری سورت منافقون انہی کے حالات میں ہے۔ چاہیے کہ اس موقع پر فہرست کو مدد لے کر وہ تمام مقامات بھی دیکھ لیے جائیں۔

(۶) یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۸) ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر وما ھم بمؤمنین میں اور اس کی بعد کی آیتوں میں جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اُس سے مقصود منافقوں کی یہ جماعت نہیں ہے، بلکہ یہود و نصاریٰ ہیں جو ایمان باللہ کا دعویٰ رکھتے تھے مگر حقیقۃً ایمان کی روح اُن میں باقی نہیں رہی تھی۔ فی الحقیقت یہ حالت بھی نفاق ہی کی حالت ہے۔

جو ایک مدت کے جمود و اعراض کے بعد پیروانِ مذاہب پر طاری ہو جاتی ہے، لیکن مقصود اُس سے مدینہ کے منافق نہیں ہیں۔

(۷) یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اُن احادیث کا مطلب کیا ہے جن میں نفاق کی خصلتیں بیان کی گئی ہیں، اور فرمایا ہے: جس میں یہ خصلت ہو تو سمجھ لو، نفاق کی خصلت آگئی۔ مثلاً اربع من کن فیہ، کان منافقا خالصا، ومن کانت فیہ خصلۃ منہن کانت فیہ خصلۃ من النفاق (بخاری) وان صلی، وصام، وزعم انہ مسلم (مسلم) یعنے چار خصلتیں ہیں جس میں یہ چاروں جمع ہو جائیں، وہ پورا منافق ہے، اور جس میں کوئی ایک خصلت پائی جائے، تو سمجھ لو، نفاق کی ایک خصلت پیدا ہو گئی۔ مسلم کے الفاظ میں یہ بھی ہے "اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اور اس زعم میں ہو کہ مسلمان ہے" پھر وہ خصلتیں بیان کی ہیں جو سچے مومن میں نہیں ہونی چاہئیں۔ مثلاً امانت میں خیانت، جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی، غصہ میں آکر بے قابو ہو جانا۔ تو معلوم ہوا، نفاق کوئی ایسی حالت نہ تھی جو صرف آنحضرت کے زمانہ ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہو، اور نہ منافقوں کا گروہ کوئی ایسا گروہ تھا جو محض چھپے کافروں کا ایک سازشی گروہ ہو۔ یہ ایمان و عمل کی کمزوری کی ایک زیادہ سخت حالت ہے، اور جس طرح اُس زمانہ میں تھی، اُسی طرح ہر زمانے میں ہو سکتی ہے، اور ہوتی رہی ہے۔

اگر آج مسلمانوں کی اکثریت اپنے ایمان و عمل کا احتساب کرے، تو اُسے معلوم ہو جائے کہ نفاق کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اَور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ہی وجود میں اُسے دیکھ لے سکتی ہے۔

حالاتِ ہستی کے احوالِ ثلاثہ

(۸) یہ جو قرآن نے انسان کے عقائد و اعمال کی تین حالتیں قرار دی ہیں، ایمان، کفر، نفاق، تو فی الحقیقت عالمِ ہستی کے تمام گوشوں میں اصلاً تین ہی حالتیں پائی جاتی ہیں۔ یا تو تکوین کی حالت ہو گی، یا اِفساد کی حالت ہو گی، یا پھر دونوں کی درمیانی حالت۔ خود اپنے وجود ہی کو دیکھ لو۔ یا زندگی ہے یا موت ہے، یا بیماری، بیماری کو نہ تو زندگی کی صحیح حالت کہہ سکتے ہیں، نہ موت ہی قرار دے سکتے ہیں۔ دونوں کے بَین بَین ہے، لیکن رُخ اُس کا موت ہی کی طرف ہے۔ قلب و روح کا بھی یہی حال ہوا۔ ایمان زندگی ہے، موت کفر ہے، اور نفاق بیماری۔

یہ مقام مہماتِ معارفِ قرآنی میں سے ہے، لیکن:

گر نویسم شرحِ آں بے حد شود ۔ مثنوی ہفتاد من کاغذ شود!

مسجد ضرار

(۹) آیت (۱۰۷) میں جس مسجد کا ذکر کیا گیا ہے، اور جو تاریخ اسلام میں مسجد ضرار کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اُس کا مختصر حال یہ ہے۔

پیغمبرِ اسلام جب مدینہ آئے، تو پہلے قبا نامی مقام میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے حکم سے ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی جو عہدِ اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ بعض منافقوں نے جن کی تعداد بعض روایات سے بارہ ثابت ہوتی ہے، اسی مسجد کے پاس ایک نئی مسجد تعمیر کی، اور جب پیغمبرِ اسلام تبوک کے لیے نکل رہے تھے، تو آپ کی خدمت میں آکر عرض کیا۔ ایک دن وہاں آکر نماز پڑھا دیجیے۔ آپ نے فرمایا، ابھی تو سفر درپیش ہے۔ واپسی پر دیکھا جائیگا۔ پھر جب آپ تبوک سے واپس ہوئے، اور مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو یہ آیت نازل ہوئی، اور اللہ نے بانیانِ مسجد کے منافقانہ مقاصد سے آپ کو مطلع کر دیا۔ آپ نے فوراً حکم دیا کہ یہ مسجد گرا دی جائے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ مدینہ پہنچیں، مسجد منہدم کر دی گئی تھی۔

اس آیت میں مسجد بنانے کے چار مقصد بیان کیے ہیں:

(۱) "ضراراً" یعنے اُن کا مطلب یہ ہے کہ قبا کے مخلص مومنوں کو نقصان پہنچائیں۔ کیونکہ مسجد قبا کی وجہ سے اُنہیں ایک خاص عزت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ حسد و عناد سے چاہتے ہیں، ان کی یہ خصوصیت باقی نہ رہے۔

(ب) "وکفراً" کفر کے مقاصد پورے ہوں۔ یعنے اپنی الگ مسجد ہو جائیگی، تو مسجد قبا میں نماز کے لیے جانے کی ضرورت باقی نہیں رہیگی، اور اس طرح نماز ترک کرنے کا موقعہ مل جائیگا۔ کیونکہ لوگ سمجھینگے، اُنہوں نے اپنی مسجد میں نماز پڑھ لی۔ یہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہینگے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ترکِ نماز کی حالت ایک ایسی حالت ہے جسے قرآن "کفر" کی حالت سے تعبیر کرتا ہے۔ نیز معلوم ہوا کہ نیک کاموں کا نیک ہونا مقصد و نیت پر موقوف ہے، ورنہ مسجد بنانے جیسا نیک کام بھی، کفر کے لیے ہو جا سکتا ہے۔

(ج) "وتفریقاً بین المومنین" مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے۔ کیونکہ قباء کی تمام آبادی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتی تھی۔ اب اگر اس کے پاس دوسری مسجد بن گئی، تو جماعت بٹ جائیگی۔ کچھ لوگ پہلی مسجد میں جائیں گے، کچھ نئی میں۔ اور جب ایک جماعت نہ رہی، تو مسلمانوں کے باہمی اجتماع و تعارف کا وہ مقصد بھی فوت ہوگیا جو قیام جماعت کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسجد اگر موجود ہو، تو بلا ضرورت دوسری مسجد اس کے قریب تعمیر کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایسا کرنا تفریقاً بین المومنین ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام ائمہ اسلام نے اتفاق کیا کہ ہر شہر میں جمعہ کی جماعت ایک ہی جگہ ہونی چاہیے۔ اور اگر آبادی اتنی زیادہ ہو جائے کہ ایک جگہ کافی نہ ہو، تو پھر بقدر ضرورت ایک سے زیادہ مساجد میں جمعہ قائم کیا جائے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ بلا ضرورت بہت سی مسجدیں تعمیر کردی جائیں اور ہر مسجد میں جمعہ شروع کردیا جائے۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے یہ صریح حکم قرآنی پس پشت ڈال دیا، اور محض ریاکاری اور نام و نمود کے لیے یا کسی سابق مسجد اور اس کے متمنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے بکثرت مسجدیں ہر شہر و قریہ میں تعمیر کردیں، اور روز بروز تعمیر کرتے جاتے ہیں۔ اگر ان کی تعمیر کے حالات و مقاصد کا تفحص کیا جائے تو بڑی تعداد ٹھیک ٹھیک مسجد ضرار کی سی مسجدیں ثابت ہونگی، مگر کوئی نہیں جو اس فساد سے لوگوں کو روکے، بلکہ خود علماء و مشائخ اپنے شخصی انتفاع و ترفع کے لیے اس مفسدانہ فعل کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور اپنے معتقدوں کو تعمیر مسجد کے بے محل ثواب سنا سنا کر مزید ترغیبیں دیتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی تفریق و انتشار کا ایک بڑا باعث مسجدوں کا وجود بھی ہوگیا ہے۔ ایک ہی محلہ میں چار چار، پانچ پانچ جگہ جماعتیں ہوتی ہیں، ایک ہی رقبہ میں بلا ضرورت ایک سے زیادہ جگہ جمعہ پڑھا جاتا ہے۔ پھر صرف اتنے ہی پر قدم افساد نہیں رکا، بلکہ عیدین کی جماعتیں بھی مسجدوں میں ہونے لگی ہیں، حالانکہ ایسا کرنا صریح سنت مستمرہ کے خلاف ہے، اور اجتماع عیدین کا مقصد عظیم ضائع کردینا ہے۔

(د) "وارصاداً لمن حارب الله ورسوله من قبل" اللہ اور اس کے رسول سے جس نے جنگ کی، اس کے لیے ایک کمین گاہ پیدا کردی جائے۔ یا اس کے انتظار و توقع میں پہلے سے ایک جگہ بنادی جائے یعنی دشمنان اسلام کے لیے جن سے یہ لوگ سازباز رکھتے ہیں، سکنے کی جگہ پیدا ہو جائے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں قبیلۂ خزرج کا ایک آدمی ابو عامر راہب تھا جو ظہور اسلام سے پہلے عیسائی ہوگیا تھا۔ جب پیغمبر اسلام مدینہ تشریف لائے، تو کلمۂ اسلام کا عروج اس پر شاق گزرا، اور اسلام کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہوگیا۔ پہلے قریش مکہ کا ساتھ دیا، پھر شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا اور اسے مسلمانوں پر حملہ کی ترغیب دی۔ قباء کے بعض منافقین میں اور اس میں قدیم سے رسم و راہ تھی۔ یہ انہیں اسلام کے خلاف اکساتا رہتا، اور رومیوں کے حملہ کا یقین دلاتا۔ یہاں "لمن حارب الله ورسوله" میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(۹) اس سورت میں منافقوں کے لیے حسب ذیل احکام دیے گئے ہیں:

(ا) ایسے لوگوں کا انفاق قبول نہ کیا جائے (آیت ۵۳) اس سے معلوم ہوا کہ جو افراد جماعت کے مقاصد کو نقصان پہنچائیں، امام کو چاہیے، اُن کی مالی اعانات قبول کرنے سے انکار کردے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا مال قبول کرنا انہیں بدعملیوں اور شرارتوں پر جرأت دلاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں، ہم روپیہ خرچ کرکے اپنے منافقانہ اعمال کی پردہ پوشی کرتے رہینگے۔

(ب) صاف صاف کردیا کہ یہ لوگ بھی معاندوں کی طرح نجات اُخروی سے محروم رہینگے اگرچہ اپنے کو مومن سمجھتے ہیں۔ (آیت ۶۰)

(ج) منافقوں سے بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا (آیت ۷۳) اس سورت کے دوسرے احکام و مواعظ کی طرح اس کا تعلق بھی آئندہ پیش آنے والے واقعات سے تھا۔ چنانچہ جب پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد فتنۂ نفاق نے سر اٹھایا اور متعدد قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا تو صحابۂ کرام نے اس حکم کی تعمیل کی، اور اُن سے قتال کرنے پر متفق ہوگئے۔

(د) اشرار منافقین کی نسبت فرمایا، جو ان میں سے بغیر توبہ کیے مرجائینگے وہ کبھی بخشے نہیں جائینگے۔ اگرچہ خود پیغمبر اسلام

ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں (آیت ۸۰) سورۂ منافقون میں فرمایا تھا۔ سواء علیهم استغفرت لهم
ام لم تستغفر لهم (۶۳: ۶) تم ان کے لیے مغفرت طلب کرو یا نہ کرو، دونوں حالتیں ان کے لیے یکساں ہیں۔ وہ بخشے
جانے والے نہیں۔ یہاں یہی بات زیادہ زور دے کر کہی گئی کہ ان تستغفر لهم سبعین مرة تم ستر مرتبہ یعنے سینکڑوں
مرتبہ ہی کیوں نہ دعاءِ مغفرت کرو، مگر بخشے جانے والے نہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب عبداللہ بن اُبی کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے نے آپ سے درخواست کی کہ کفن
کے لیے اپنا پیراہن عطا فرمائیں اور نماز جنازہ پڑھا دیں۔ اور آپ نے درخواست منظور کر لی۔ حضرت عمر پر یہ بات شاق گذری
تھی مگر آپ نے فرمایا: لو اعلم انی ان زدت علی السبعین غفر له، لزدت علیها (بخاری والجامع) اس حدیث اور آیت
متذکرہ کی تطبیق میں مفسرین کو مشکلات پیش آئی ہیں لیکن فی الحقیقت معاملہ بالکل واضح ہے اور تشریح اس کی سورۂ منافقون کے نوٹ میں ملے گی

(ہ) جن منافقوں نے اس موقعہ پر شرکت نہ کی، آئندہ اگر وہ کسی ایسے کام میں شریک ہونا چاہیں، تو صاف انکار کر دیا جائے
اور انہیں شریک نہ کیا جائے (آیت ۸۳)

(و) ان میں سے جو کوئی بغیر توبہ کیے مر جائے، پیغمبر اسلام اس کے جنازہ میں شریک نہ ہوں اور نہ حسب معمول دعا
مانگیں (آیت ۸۴) حضرت حذیفہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے یہ حکم خاص خاص منافقوں کے لیے ہوا تھا، اور آنحضرت
نے ان کے نام بتلا دیے تھے۔ جبیر بن مطعم سے مروی ہے کہ یہ بارہ آدمی تھے (فتح الباری)

(ز) اگر یہ لوگ معذرت کریں، تو صاف صاف کہہ دیا جائے کہ اب تمہاری زبانی معذرتیں نہیں سُنی جائینگی۔ عمل دیکھا
جائیگا۔ آئندہ اگر تمہارے اعمال سے اخلاص ثابت ہوا، تو سمجھا جائیگا کہ تائب ہو گئے، نہیں تو منافق متصور ہو گے (آیت ۹۴)

(ح) مسلمانوں کو حکم ہوا، ان سے گردن موڑ لو۔ یعنے ان سے ربط ضبط نہ رکھو۔ (آیت ۹۵)

(۱۰) اس باب میں بے شمار امور تفصیل طلب ہیں، اور مباحثِ تفسیر و حدیث کے متعدد مقامات ہیں جن کی وضاحت و تحقیق
ضروری ہے، لیکن مزید تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ البیان کا انتظار کرنا چاہیے۔

شرح مقام رضوا عنه

(ل) آیت (۱۰۰) میں سابقون الاولون اور ان کے تبعین کی نسبت فرمایا: رضی اللہ عنهم و رضوا عنه۔ اللہ ان سے راضی
ہوا۔ وہ اللہ سے۔ اس مقام کا ایک پہلو قابلِ غور ہے جس پر لوگوں کی نظر نہیں پڑی۔ یعنے و رضوا عنه پر کیوں زور دیا گیا؟ اتنا
کہہ دینا کافی تھا کہ اللہ ان سے خوشنود ہوا۔ کیونکہ ان کے اعمال اللہ کی خوشنودی ہی کے لیے تھے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ
کیوں کہی گئی کہ وہ بھی اللہ سے خوشنود ہوئے؟

اس لیے کہ ان کے ایمان و اخلاص کا اصلی مقام بغیر اس کے نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔

انسان جب کبھی کسی مقصد کی راہ میں قدم اُٹھاتا ہے، اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی ہیں۔ کچھ
لوگ جوانمرد اور باہمت ہوتے ہیں۔ وہ بلا تامل ہر طرح کی مصیبتیں جھیل لیتے ہیں لیکن ان کو جھیلنا جھیل لینا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات
نہیں ہوتی کہ مصیبتیں ان کے لیے مصیبتیں نہ رہی ہوں، عیش و راحت ہو گئی ہوں۔ کیونکہ مصیبت پھر مصیبت ہے۔ باہمت آدمی
کڑوا گھونٹ بغیر کسی جھجک کے پی لیگا لیکن اس کی کڑواہٹ کی بدمزگی محسوس ضرور کریگا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں
صرف باہمت ہی نہیں کہنا چاہیے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھنا چاہیے۔ ان میں صرف ہمت و جوانمردی ہی نہیں ہوتی
بلکہ عشق و شیفتگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح نہیں جھیلتے، بلکہ عیش و راحت کی طرح ان کی لذت
و سرور حاصل کرتے ہیں۔ راہ محبت کی ہر مصیبت ان کے لیے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔ اگر اس راہ
میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں انہیں ایسی راحت ملے، جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتی
بلکہ اس راہ کی مصیبتیں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں۔ اتنی ہی زیادہ ان کے دل کی خوشحالیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ ان کے لیے
صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آ رہا ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں، عیش

سو وہ ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اُس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ یہ بات سننے میں تمہیں عجیب معلوم ہوتی ہوگی، لیکن فی الحقیقت حالت میں اتنی عجیب نہیں ہے، بلکہ انسانی زندگی کے عام واردات میں سے ہے۔ عشق و محبت کا مقام تو بہت بلند ہے۔ بوالہوسی کا عالم بھی ان واردات سے خالی نہیں:

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نۂ ناصح ٭ بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن!

سابقون الاولون کی محبت ایمانی کا یہی حال تھا۔ ہر شخص جو اُن کی زندگی کے سوانح کا مطالعہ کریگا بے اختیار تصدیق کریگا کہ انہوں نے راہِ حق کی مصیبتیں صرف جھیلی ہی نہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں اُن میں بسر کر دی ہیں۔ ان میں سے جو لوگ اول دعوت میں ایمان لائے تھے، اُن پر شب و روز کی جانکاہیوں اور قربانیوں کے پورے تیئیس برس گزر گئے، لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہیں دیتی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ اُن کے چہروں پر کبھی کھلی ہو۔ انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت کے ساتھ کی، گویا دنیا جہان کی خوشیاں اور راحتیں اُن کے لیے فراہم ہو گئی ہیں۔ اور جان کی قربانیوں کا وقت آیا، تو اس طرح خوش خوش گردنیں کٹوا دیں، گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں بلکہ موت میں تھی۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے اتنی عمریں نہیں پائیں کہ اسلام کی غربت کے ساتھ اسلام کا عروج و اقبال بھی دیکھ لیتے، اور عدی بن حاتم کی طرح کہہ سکتے "كُنْتُ فِيْ مَنْ افْتَتَحَ كُنُوْزَ كِسْرٰى"[1]، تاہم جب دنیا سے گئے تو اس عالم میں گئے کہ اُن سے زیادہ عیش و خوشحالی میں شاید ہی کسی نے دنیا چھوڑی ہو۔ بدر اور اُحد کے شہیدوں کے حالات پڑھو۔ ایمان لانے کے بعد جو کچھ بھی اُن کے حصے میں آیا، وہ بجز رات دن کی کاوشوں اور مصیبتوں کے اور کیا تھا؟ اور پھر قبل اس کے کہ اسلام کے فتح و اقبال کی کامرانیوں میں شریک ہونے کا موقعہ ملتا دشمنوں کی تیغ و سنان سے چور میدانِ جنگ میں دم توڑ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی غور کرو، اُن کے دل کی شادمانیوں کا کیا حال تھا؟ اس اطمینان و سکون کے ساتھ عیش و نشاط کے بستروں پر کسی نے جان نہ دی ہوگی، جس طرح انہوں نے میدانِ جنگ کی ریتلی زمین پر لوٹ لوٹ کر دی۔ جنگ اُحد میں سعد بن ربیع کو لوگوں نے دیکھا، زخموں میں پڑے سانس توڑ رہے ہیں۔ پوچھا، کوئی وصیت کرنی ہو تو کر دو۔ کہا۔ اللہ کے رسول کو میرا سلام پہنچا دینا، اور قوم سے کہنا، اس کی راہ میں جانیں نثار کرتے رہیں۔ عمارہ بن زیاد زخموں سے چور جانکنی کی حالت میں تھے کہ آنحضرت سرہانے پہنچ گئے۔ فرمایا۔ کوئی آرزو ہو تو کہدو۔ عمارہ نے اپنا زخمی جسم گھسیٹ کر اور زیادہ قریب کر دیا اور اپنا سر آپ کے قدموں پر رکھ دیا، کہ اگر کوئی آرزو ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہے:

منم و ہمیں تمنا کہ بہ وقتِ جاں سپردن ٭ بہ رُخِ تو دیدہ باشم، تو درونِ دیدہ باشی!

عورتوں تک کا یہ حال تھا کہ بیک وقت اُنہیں اُنکے شوہر، بھائی، اور باپ کے شہید ہو جانے کی خبر پہنچائی جاتی تھی، اور وہ کہتی تھیں۔ یہ تو ہوا، مگر بتلاؤ، اللہ کے رسول کا کیا حال ہے؟ پھر جب آپ کا جمالِ جہاں آرا نظر آتا، تو بے اختیار خوش ہو کر پکار اُٹھتیں: كل مصيبة بعدك جلل! تو اگر سلامت ہے، تو پھر دنیا کی ساری مصیبتیں ہمارے لیے شہد و شکر کا گھونٹ ہو گئیں:

من و دل گر فنا شدیم، چہ باک ٭ غرض اندر میان سلامتِ اوست!

تاریخ اسلام میں جنگ حُنین پہلی جنگ ہے جس میں بکثرت مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں، اور چار ہزار اوقیہ چاندی کا ذکر روایات میں ملتا ہے۔ یہ وقت تھا کہ سابقون الاولون کو مال و دولت سے حصۂ وافر ملتا، لیکن آنحضرت نے اُن باشندگانِ مکہ کو ترجیح دی جو فتح مکہ کے بعد نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اور انصارِ مدینہ کے حصے میں کچھ نہ آیا۔ کیونکہ آپ کے پیش نظر نومسلموں کی تالیفِ قلب تھی۔ یہ حالت دیکھ کر بعض نوجوانوں کو خیال ہوا، اہل مکہ سے لڑے تو ہم، لیکن

---

[1] عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ آنحضرت نے فرمایا تھا لتفتحن كنوز كسرىٰ۔ ایسا ضرور ہونے والا ہے کہ تم کسریٰ کے خزانے فتح کر لوگے۔ وكنت فی من افتتح كنوز كسرىٰ۔ یہ پیشین گوئی میں نے اپنی آنکھوں سے پوری ہوتے دیکھ لی۔ کیونکہ میں اُن لوگوں میں کو ہوں جنہوں نے کسریٰ کا خزانہ کھولا تھا۔ (بخاری)



کو مالِ غنیمت کا حصہ مل نہیں رہا ہے۔ بات آنحضرت تک پہنچی تو آپ نے انصار کو جمع کیا اور فرمایا: الا ترضون ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وتذھبون بالنبی الی رحالکم! کیا تمہاری خوشنودی کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ لوگ یہاں سے مالِ غنیمت کے حصے لے کر جائیں، اور تم اللہ کے نبی کو اپنے ساتھ لیکر جاؤ؟ انصار بے اختیار پکار اٹھے رضینا، یا رسول اللہ رضینا! ہم خوشنود ہیں، یا رسول اللہ ہم خوشنود ہیں! (صحیحین)

اور پھر غور کرو، جو لوگ واتبعوھم باحسان میں داخل ہوئے، انہیں بھی کس درجہ اس مقام سے حصہ وافر ملا تھا!
دنیا میں شاید ہی کسی عورت کے دل میں اپنے عزیزوں کے لیے ایسی محبت پیدا ہوئی ہوگی، جیسی جاہلیت کی مشہور شاعرہ خنساء کے دل میں تھی۔ اس نے جو مرثیے اپنے بھائی صخر کے غم میں کہے ہیں، تمام دنیا کی شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے:

یذکرنی طلوع الشمس صخرا ٭ واذکرہ بکل غروب شمس[1]!

لیکن ایمان لانے کے بعد اسی خنساء کی نفسیاتی حالت ایسی منقلب ہوگئی کہ جنگ یرموک میں اپنے تمام لڑکے ایک ایک کرکے کٹوا دیے، اور جب آخری لڑکا بھی شہید ہو چکا، تو پکار اٹھی، الحمد للہ الذی اکرمنی بشہادتھم!
پس رضوا عنہ میں اشارہ اسی طرف ہے کہ اللہ اور اس کے کلمۂ حق کی راہ میں جو کچھ بھی پیش آیا انہوں نے اسے جھیلا ہی نہیں بلکہ کمال محبت ایمانی کی وجہ سے اس میں خوش حال و خوشنود رہے، اور یہی مقام ہے جو ان کے درجہ کو تمام مدارجِ ایمان و عمل میں ممتاز کر دیتا ہے۔
تعجب ہے کہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مفسروں کی نظر اس صاف اور واضح بات کی طرف نہ گئی۔ البیان میں مزید تفصیل ملیگی۔

ترکِ موالات کا حکم اور اس کی حقیقت

(۴) اس سورت میں جا بجا اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دشمنوں سے رفاقت و اعانت کے رشتے نہ رکھو، اگرچہ وہ تمہارے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں، اور دوسری سورتوں میں بھی ایسے ہی احکام موجود ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اور اس طرح کے تمام احکام، احکامِ جنگ میں سے ہیں نہ کہ معیشت و علائق کے عام احکام، اور یہ بات خود قرآن نے جا بجا اس درجہ وضاحت اور قطعیت کے ساتھ واضح کر دی ہے کہ شک و تردد کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی ہے۔
جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے، قرآن کہتا ہے، اصل اس باب میں محبت و شفقت، ہمدردی و سلوک، اور تعاون و سازگاری ہے۔ اس کے سوا کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتا ہے ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے، خواہ اس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو، ہم نسل ہو یا نہ ہو، ہم عقیدہ ہو یا نہ ہو، اور امتیاز و تفریق کی وہ تمام باتیں جو اس انسانی بھائی چارگی کا رشتہ قطع کرتی ہیں، خدا کی طرف سے نہیں ہیں، خود انسانوں کی گڑھی ہوئی معصیت اور گمراہی ہے۔ پیغمبرِ اسلام کی دعاؤں میں سب سے زیادہ اعتراف اسی حقیقت کا ہوتا تھا کہ "انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ" (مسلم) خدایا! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں!
لیکن جب تمام ملک و قوم نے اس دعوت کو بہ زورِ شمشیر نابود کر دینے کا فیصلہ کر دیا، اور پیروانِ دعوت پر محض اختلافِ عقائد کی بنا پر ظلم و ستم کرنے لگے، تو قدرتی طور پر جنگ کی حالت پیدا ہو گئی۔ اب دو فریق ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ ایک فریق مسلمانوں کا تھا جو اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ دوسرا دشمنوں کا تھا جو حملہ آور تھا۔ پس ایسی حالت میں ناگزیر ہو گیا کہ دوستوں اور دشمنوں میں صاف صاف امتیاز ہو جائے۔ جو دوست ہیں، وہ دشمنوں کے کیمپ سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں۔ جو دشمن ہیں، وہ دوستوں سے کسی طرح کی سازش نہ کر سکیں۔ قرآن میں جس قدر احکام عدمِ موالات کے ہیں، وہ سب اسی صورتِ حال سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس سورت کی آیت (۲۳) بھی اسی سے متعلق ہے۔
اصل اس باب میں سورۂ ممتحنہ کی یہ آیات ہیں جو ایک ایسے ہی معاملہ کی نسبت نازل ہوئی تھیں:

---

[1] ہر صبح سورج کا نکلنا صخر کی یاد تازہ کر دیتا ہے، اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں آتی کہ صخر کی یاد سامنے نہ آ گئی ہو!

لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين. إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم في الدين وأخرجوكم من دياركم وظاهروا على إخراجكم أن تولوهم ومن يتولهم فأولئك هم الظالمون.

(۶۰ : ۵)

خدا تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ ان مشرکوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور انصاف کے ساتھ پیش آؤ جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ خدا تو تمہیں صرف ان لوگوں کی رفاقت و سازگاری سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی ہے (یعنی محض اس لیے کہ تم نے ان کا دین چھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر لیا ہے، تم پر حملہ کر دیا ہے) اور (ظلم و ستم کر کے) تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ نیز تمہیں جلاوطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ پس جو کوئی ایسے لوگوں کی رفاقت و سازگاری رکھیگا تو یہی لوگ ہیں جو ظلم کرنے والے ہیں!

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ قرآن میں جہاں کہیں مسلمانوں کو مشرکینِ عرب یا یہود و نصاریٰ کی موالات سے روکا گیا ہے، تو اس سے مقصود صرف وہی جماعتیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں سے محض اختلافِ دین کی بنا پر قتال کیا تھا، اور جن کے ظلم و ستم نے مسلمانوں کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ تمام مشرکینِ عرب سے یا یہود و نصاریٰ سے ترکِ علائق کا حکم دیا گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ قرآن کا یہ حکم کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اس کی دعوت سرتاسر انسانی اخوت و مساوات کی دعوت اور عمومِ شفقت و احسان کا عالمگیر پیام ہے

دعوت ایک فوری اور دوامی پیام تھا

(ن) اس سورت کے تمام مطالب اپنی اصلی حیثیت میں اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک یہ حقیقت پیشِ نظر نہ ہو کہ یہ تمام تر امت کے نام ایک دائمی پیام تھا، اور احکام و مواعظ سے اصل مقصود مستقبل کے پیش آنے والے معاملات تھے۔ نہ کہ موجودہ۔ مفسرین کی نظر چونکہ اس پہلو پر نہیں گئی، اس لیے انہیں اکثر مقامات کی شرح و توجیہ میں دقتیں پیش آئیں۔ یہ اصل پیشِ نظر رکھ کر سورت کے تمام مواعظ و احکام پر دوبارہ نظر ڈالو، صاف واضح ہو جائیگا کہ آئندہ مرحلوں کے لیے مخاطبین کو طیار کیا جا رہا ہے۔ مزید تفصیل کا یہ محل نہیں۔

المومن

الیونس   آل عمران
التوبة   سورۂ یاسین

یونس (۱۰)

مکی ۱۰۹ آیتیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ ○ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْکٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ○ اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ○ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ

الف ۔ لام ۔ را

یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی ۔ (یعنے ایسی کتاب کی جس کی تمام باتیں حکمت کی باتیں ہیں)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبا ہوا کہ اُنہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؟ اس بات کی وحی، کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کردے اور ایمان والوں کو خوش خبری دیدے کہ پروردگار کے حضور اُن کے لیے اچھا مقام ہے! کافروں نے کہا، "بلاشبہ یہ شخص جادوگر ہے۔ کُھلا جادوگر!"

(اے لوگو!) تمہارا پروردگار، تو وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا (یعنے چھ عہد، زمانوں میں پیدا کیا) پھر اپنے تختِ حکومت پر متمکن ہوگیا۔ وہی تمام کاموں کا بندوبست کر رہا ہے (یعنی کائنات ہستی پیدا بھی اُسی نے کی، اور فرماں روائی بھی صرف اُسی کی ہوئی) اُس کے حضور کوئی سفارشی نہیں ہو سکتا، مگر یہ کہ خود وہ اجازت دیدے، اور اجازت کے بعد کوئی اس کی جرأت کرے۔ یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار! پس اُسی کی بندگی کرو۔ کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے!

سورۂ انعام کی طرح اس سورت میں بھی خطاب مشرکین عرب کو ہے، اور مواعظ کا مرکز دین حق کے مبادی و اساسات ہیں یعنی توحید، وحی و نبوت، اور آخرت کی زندگی یہ سلسلۂ بیان منکرین وحی کے ذکر سے شروع ہوا ہے، کیونکہ ہدایت دینی کی سب سے پہلی کڑی یہی ہے، اور اسی کے اعتقاد پر اور تمام باتوں کا اعتقاد موقوف ہے۔

(۱) منکرین حق ایک طرف تو وحی و نبوت سے انکار کرتے، دوسری طرف یہ بھی دیکھتے تھے کہ یہ آدمی اور آدمیوں کی طرح نہیں ہے۔ کوئی انوکھی بات ضرور ہے۔ پھر جب اس کی کوئی توجیہ بن نہ پڑتی تو کہتے، ہو نہ ہو یہ جادوگری ہے۔ اُن کا یہ قول قرآن کی حیرت انگیز تاثیر کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ یعنے اس کا اثر اس درجہ نمایاں اور قطعی تھا کہ باوجود عناد و جمود کے اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اسے جادوگری سے تعبیر کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

(۲) آسمان و زمین کی چھ ایام میں خلقت سے مقصود کیا ہے؟ اس کی طرف سورۂ اعراف میں اشارہ ہو چکا ہے۔ مزید تشریح سورت کے آخری نوٹ میں ملیگی۔

تم سب کو بالآخر اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ وہی ہے جو پیدائش شروع کرتا ہے اور

(۳) توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال۔ یعنے جب تم مانتے ہو کہ کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں، تو پھر مدبر و منتظم عالم کے بہت سے تختِ اقتدار تم نے

ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ○ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○ إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ ○ إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ

۴ ۵ ۶

پھر اُسے دُہراتا ہے (یعنے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کریگا) تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے، اُنہیں انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔ باقی رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی، تو اُنہیں پاداشِ کفر میں کھولتا ہوا پانی پینے کو ملیگا، اور عذاب دردناک!

وہی ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا بنایا، اور چاند کو روشن، اور پھر چاند کی منزلوں کا اندازہ ٹھہرا دیا، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ نہیں بنایا ہے مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ اُن لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں، وہ (اپنی قدرت و حکمت کی) دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے!

بلاشبہ اس بات میں کہ رات کے پیچھے دن اور دن کے پیچھے رات آتی ہے، اور بلاشبہ اُن تمام چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں میں اور زمین میں پیدا کی ہیں، اُن لوگوں کے لیے (قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں جو متقی[1] ہیں۔

جو لوگ (مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع نہیں

کیوں بنا رکھے ہیں؟ اور کیوں اُنہیں بندگی و نیاز کا مستحق سمجھتے ہو! جس طرح یہ بات تم مانتے ہو کہ پیدا کرنے والی ہستی اُس کے سوا کوئی نہیں، اُسی طرح تدبیر و فرماں روائی کا تخت بھی صرف اُسی کا تخت ہوا، اس میں نہ تو کسی سفارشی کی سفارش کو دخل ہے، نہ کسی مقرب کے تقرّب کو۔

۴ یہی مضمون سورۂ اعراف کی آیت (۵۴) میں گذر چکا ہے الا لہ الخلق والامر۔

(۴) آیت (۴) میں سلسلۂ بیان آخرت کی زندگی کی طرف متوجہ ہو گیا ہے، جس سے مشرکینِ عرب کو انکار تھا۔ یہاں تین باتوں کی طرف اشارہ کیا،

(ا) وہ ہستی پیدا کرتی ہے، اور پھر دہراتی ہے۔ پس اگر پہلی پیدائش پر یقین رکھتے ہو، تو دوسری پیدائش پر تمہیں کیوں تعجب ہوتا ہے؟ یہ پہلی نشئۃ سے دوسری نشئۃ پر استدلال ہے۔ زیادہ تفصیل سورۂ حج کی آیت (۵) اور قیامہ کی آخری آیات میں ملیگی۔

(ب) یہ دوسری زندگی کیوں ضروری ہوئی؟ اس لیے ۵ کہ جزاءِ عمل کا قانون چاہتا تھا کہ جس طرح ایک زندگی آزمائشِ عمل کے لیے ہے، اسی طرح ایک زندگی جزاءِ عمل کے لیے بھی ہو۔

(ج) تمام نظامِ خلقت اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہاں کوئی بات بغیر حکمت و مصلحت کے نہیں ہے۔ سورج کو دیکھو، جس کی درخشندگی سے تمام ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ چاند کو دیکھو جس کی گردش کی ۲۸ منزلیں مقرر کر دی ہیں اور اسی سے تم مہینے کا حساب کرتے اور برسوں کی گنتی معلوم کرتے ہو۔ ۶ اگر یہ سب کچھ بغیر مصلحت کے نہیں ہے تو کیا ممکن ہے کہ انسان کا وجود بغیر کسی غرض و مصلحت کے ہو، اور صرف اس لیے ہو کر

[1] متقی اور تقوے کے لیے دیکھو سورۂ بقرہ نوٹ ھدی للمتقین۔

عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۗ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ

کھائے، پیے، اور مر کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے؟ (اس استدلال کی وضاحت کے لیے دیکھو تفسیر فاتحہ)

غور کرو۔ اس قسم کے تمام مواعظ کا خاتمہ ہمیشہ اسی قسم کے جملوں پر ہوتا ہے کہ لقوم یعلمون۔ لقوم یعقلون۔ کیونکہ ان باتوں کو وہی سمجھ سکتا ہے جو علم و بصیرت سے محروم نہ ہو۔

(۵) منازل قمر کی تقدیر سے مقصود کیا ہے؟ اس کی تشریح سورت کے آخری نوٹ میں ملیگی۔

(۶) سبحان اللہ! آیت (۷) کے چند گنے ہوئے لفظوں میں حقیقت حال کی کیسی کامل تصویر کھینچ دی ہے جس سے کوئی گوشہ بھی باہر نہیں رہا۔ ساتھ ہی وجود آخرت کے تمام دلائل بھی نمایاں ہو گئے۔ منکرین آخرت کی ذہنیت کی چار حالتیں ہیں:-

(ا) ان کے اندر خدا سے ملنے کی توقع نہیں

(ب) صرف دنیوی زندگی ہی میں خوشنود ہو رہے ہیں۔

(ج) اس حالت کے خلاف ان کے اندر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی۔ اس پر مطمئن ہو گئے ہیں۔

(د) ان کا ذہن و ادراک اس درجہ معطل ہو گیا ہے کہ قدرت کی تمام نشانیاں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، انہیں بیدار نہیں کر سکتیں۔ وہ یک قلم غافل ہو گئے ہیں۔

ان میں سے ہر بات نہ صرف بیانِ حال ہے، بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے، اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔ تشریح البیان میں ملیگی۔

(۷) یاد رہے کہ قرآن نے ہر جگہ آخرت کے مسئلہ کو "لقاءِ الٰہی" سے تعبیر کیا ہے، اور اس تعبیر نے واضح کر دیا ہے کہ حیات آخرت کی اصل حقیقت قرآن کے نزدیک کیا ہے۔ مختصر تشریح آخری نوٹ میں ملیگی۔

(۸) آیت (۱۰) کی تشریح آخری نوٹ میں ملیگی۔

رکھتے۔ صرف دنیا کی زندگی ہی میں مگن ہیں اور اس حالت پر مطمئن ہو گئے ہیں۔ اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کا (آخری) ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ بہ سبب اُس کمائی کے جو (خود اپنی ہی عملوں کے ذریعہ) کماتے رہتے ہیں!

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، تو ان کے ایمان کی وجہ سے (کامیابی و سعادت کی) راہ اُنکا پروردگار اُن پر کھول دیگا۔ اُن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی جبکہ وہ نعمت الٰہی کے باغوں میں ہونگے! وہاں اُن کی پکار یہ ہوگی کہ "خدایا! ساری پاکیاں تیرے ہی لیے ہیں!" اُن کی دُعا یہ ہوگی کہ "سلامتی ہو" اور دعاؤں کا خاتمہ یہ ہوگا کہ الحمد للہ رب العالمین!

اور (دیکھو) انسان جس طرح فائدہ کے لیے جلد باز ہوتا ہے، اگر اُسی طرح اللہ اُسے نقصان پہنچانے میں جلد باز ہوتا (یعنی اگر اُس کا قانونِ جزا ایسا ہوتا کہ ہر بدعملی کا بُرا نتیجہ فوراً کام کر جائے) تو اُس کا وقت کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا (لیکن قانونِ جزا نے یہاں ڈھیل دے رکھی ہے) پس جو لوگ (مرنے کے بعد) ہماری ملاقات کی توقع نہیں رکھتے ہم اُنہیں اُن کی سرکشیوں میں

يَعْمَهُونَ ○ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ ١١
مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا ١٢
الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا كَذَٰلِكَ
نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ○ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ○ ١٣-١٤
وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ
قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ
عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ○ ١٥

سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں۔

(۹) آیت (۱۱) میں قانون امہال کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی تشریح تفسیر فاتحہ میں دیکھنی چاہیے۔

اور جب کبھی انسان کو کوئی رنج پہنچتا ہے، تو خواہ کسی حال میں ہو، کروٹ پر لیٹا ہو، بیٹھا ہو، کھڑا ہو، ہمیں پکارنے لگیگا، لیکن جب ہم اس کا رنج دور کر دیتے ہیں تو پھر اس طرح (منہ موڑے ہوئے) چل دیتا ہے، گویا رنج و مصیبت میں کبھی اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں تھا! تو دیکھو! جو حد سے گزر گئے ہیں، اُن کی نگاہوں میں اسی طرح ان کے کام خوشنما کر دیے گئے ہیں!

اور تم سے پہلے کتنی ہی اُمتیں گزر چکی ہیں کہ جب اُنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی، تو ہم نے اُنہیں (پاداش عمل میں) ہلاک کر دیا۔ اُن کے رسول اُن کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ آئے تھے، مگر اس پر بھی وہ آمادہ نہ ہوئے کہ ایمان لائیں۔ (تو دیکھو) مجرموں کو اسی طرح ہم ان کے جرموں کا بدلہ دیتے ہیں!

پھر اُن اُمتوں کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشیں بنایا، تاکہ دیکھیں، تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں؟

(۱۰) آیت (۱۲) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رنج و مصیبت کی حالت میں انسان کے اندر وجدانی طور پر یہ ولولہ اُٹھتا ہے کہ ایک بالاتر ہستی موجود ہے جو میرا درد دُکھ دور کر سکتی ہے اور اُسی کو پکارنا چاہیے لیکن جب مصیبت دور ہو جاتی ہے تو پھر عیش و راحت کی غفلتوں میں پڑ کر اُسے بھول جاتا ہے۔ گویا کبھی اس نے کسی کو پکارا ہی نہ تھا!

قرآن نے جابجا انسان کی اس فطری حالت سے استشہاد کیا ہے کیونکہ مصیبت اور بے بسی کی حالت میں بے اختیار اس ولولہ کا اُٹھنا، اس امر کا ثبوت ہے کہ انسانی فطرت اپنے اندرونی ادراک میں خدا کی ہستی کا اعتقاد رکھتی ہے، اور اعراض و غفلت کی حالت وجدانی نہیں ہے، خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

آگے چل کر آیت (۲۲) میں بھی یہی بات ملیگی لیکن ایک دوسرے اسلوب موعظت میں۔

اور (اے پیغمبر!) جب تم ہماری واضح آیتیں انہیں پڑھ کر سناتے ہو، تو جو لوگ (مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں "اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن لا کر سناؤ، یا اسی (کے مطالب) میں رد و بدل کر دو" تم کہو "میرا یہ مقدور نہیں کہ اپنے جی سے اس میں رد و بدل کر دوں میں تو بس اُسی حکم کا

قُل لَّوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا تَلَوْتُهُۥ عَلَيْكُمْ وَلَآ أَدْرَىٰكُم بِهِۦ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِۦٓ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ ۱۶

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ ٱفْتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِـَٔايَٰتِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُفْلِحُ ٱلْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾ ۱۷ وَيَعْبُدُونَ

مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰٓؤُلَآءِ شُفَعَٰٓؤُنَا عِندَ ٱللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّـُٔونَ

ٱللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَلَا فِى ٱلْأَرْضِ ۚ سُبْحَٰنَهُۥ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾ ۱۸ وَمَا كَانَ ٱلنَّاسُ

تابع ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں، کہ اگر اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کروں تو عذاب کا ایک بہت بڑا دن آنے والا ہے"! ۱۵

اور تم کہو "اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اُس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اُس کا کلام نازل ہو، اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟ ۱۶

پھر بتلاؤ، اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے جی سے جھوٹ بات بنا کر اللہ پر افترا کرے، اور اُس آدمی سے جو اللہ کی سچی آیتیں جھٹلائے؟ یقیناً جرم کرنے والے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے! ۱۷

اور (یہ مشرک) اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ تو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں نہ فائدہ، اور کہتے ہیں (ہم اس لیے ان کی پرستش کرتے ہیں کہ) یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں۔ (اے پیغمبر! تم) کہہ دو "کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دینی چاہتے ہو جو خود اُسے معلوم نہیں۔ نہ تو آسمانوں میں اور نہ زمینوں میں؟" پاک اور بلند ہے اُس کی ذات اُس شرک سے، جو یہ لوگ کر رہے ہیں! ۱۸

اور (ابتدا میں) انسانوں کی ایک ہی اُمت تھی

(۱۱) مشرکینِ عرب پیغمبرِ اسلام کی صداقت و فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کہتے تھے، ہم تمہاری بات سُننے کے لیے طیار ہیں مگر تم ایسی باتیں کہتے ہو جنہیں ہم قبول نہیں کر سکتے۔ تم کوئی دوسرا قرآن لاؤ، یا اسی کے مطالب ایسے کر دو کہ ہمارے پُرانے عقیدوں کے خلاف نہ ہوں۔ فرمایا یہ کچھ میرے جی کی من گھڑت نہیں ہے کہ تمہاری فرمائش کے مطابق بنا دوں میں تو خود اللہ کی وحی کا تابع فرمان ہوں جو کچھ مجھ پر وحی ہوتی ہے، تمہیں سنا دیتا ہوں۔ اگر اس کے حکم سے نافرمانی کروں تو اُس کی پکڑ سے مجھے بچانے والا کون ہے؟

(۱۲) پھر آیت (۱۶) میں صداقتِ نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے جس کی حقیقت افسوس ہے کہ مفسرین نے پوری طرح واضح نہیں کی۔ فرمایا، ساری باتیں چھوڑ دو۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں، اور اعلانِ وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمرِ انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ، اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں، تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے طیار ہو جاؤں، اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اُس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اُس کے اخلاق و خصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔ جو سانچا اس عرصہ میں بن گیا، پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک صادق و امین رہا ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب اور مفتری بن جائے کہ انسانوں ہی پر نہیں بلکہ

۱۹ إِلَّآ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ۝ (ع)

۲۰ وَإِذَآ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّن بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِيٓ آيَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ۝

۲۱ هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوٓا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ

پھر الگ الگ ہو گئے۔ اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے پہلے ایک بات نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی (یعنے لوگ الگ الگ راہوں میں چلینگے اور اسی اختلاف میں ان کے لیے آزمایش عمل ہوگی) تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں، ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا!

اور یہ لوگ کہتے ہیں "کیوں ایسا نہ ہوا کہ اس پر (یعنے پیغمبر اسلام پر) اُس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی اُترتی؟" تو (اے پیغمبر!) تم کہہ دو "غیب کا علم تو صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ پس انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں!"

فاطر السماوات والارض پر افترا کرنے لگے!

چنانچہ اس کے بعد فرمایا دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ جو شخص اللہ پر افترا کرے، اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں، اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے۔ اور شریر و مفتری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اب صورتِ حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیے ہیں۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں، تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑیگا، اگر تم سچائی کے مکذب ہو، تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے، اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے، اُن کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ جو صادق تھا، اُس کا کلمۂ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہیگا!

سورۂ انعام کی آیات (۲۱) اور (۹۳) اور سورۂ اعراف کی (۳۷) میں بھی یہی استشہاد گزر چکا ہے۔

اور جب ایسا ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کو درد دُکھ کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں، تو فوراً ہماری (رحمت کی) نشانیوں میں باریک باریک حیلے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم کہہ دو "اللہ ان باریکیوں میں سب سے زیادہ تیز ہے۔ اس کے فرشتے تمہاری یہ ساری مکاریاں قلمبند کر رہے ہیں"

(۱۳) آیت (۱۸) میں توحید الوہیت کا بیان ہے۔ اس کی تفسیر سورت کے آخری نوٹ میں دیکھو۔

(۱۴) آیت (۱۹) کے ہم معنی آیت بقرہ (۲۰۹) میں بھی گزر چکی ہے۔ اور مہمات معارف قرآنی میں سے ہے۔ اس کی مزید تشریح سورۂ ہود کی تشریحات میں ملیگی۔

وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی خشکی اور تری میں سیر و گردش کا سامان کر دیا ہے۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تم جہازوں میں سوار ہوتے ہو، جہاز موافق ہوا پا کر تمہیں لے اُڑتے ہیں، مسافر خوش ہوتے ہیں (کہ کیا اچھی ہوا چل رہی ہے) پھر اچانک ہوائے تند کے جھونکے نمودار ہو جاتے اور ہر طرف سے موجیں ہجوم کرنے لگتی ہیں، اور مسافر خیال کرتے ہیں، بس اب ان میں گھر گئے (اور بچنے کی کوئی امید باقی

دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ ۲۲
اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ ۲۳
مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ
زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا

(۱۸) جب تک دنیوی اسباب و علائق کا کوئی ادنیٰ سا سہارا بھی باقی رہتا ہے، انسان کا وجدان بیدار نہیں ہوتا، اور ایک تنکے کا بھروسہ بھی اسکے لیے کافی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے غافل ہو جائے لیکن جونہی اسباب و علائق کے رشتے ٹوٹے، اور یاس و قنوط کی کامل حالت طاری ہوئی، اور اس نے دیکھا، کہ اب دنیا کا کوئی ہاتھ اسے بچا نہیں سکتا تو اچانک اس کا سویا ہوا وجدان بیدار ہو جاتا ہے، اور خدا پرستی کا جوش اپنے سارے اخلاص کے ساتھ اس کے اندر ابھر آتا ہے، اس وقت وہ خدا کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتا۔ سارے رشتے، سارے بھروسے، ساری ہستیاں یک قلم نابود ہو جاتی ہیں۔ وہ بے اختیار خدا کو پکارنے لگتا ہے، اور اس کی یہ پکار اس کے دل کے ایک ایک ریشہ کی پکار ہوتی ہے!

لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ حالت قائم رہتی ہے؟ نہیں، جونہی اس کی ڈوبتی کشتی ابھری، اور امید و مراد کی گم شدہ متاع واپس آگئی، پھر وہی اس کی غفلتیں ہوتی ہیں، اور وہی سرکشیاں! اگر تم غور کرو گے، تو اس حالت کی مثالیں خود اپنی ہی زندگی میں تمہیں مل جائینگی۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ تم بیمار ہوئے اور طبیبوں نے جواب دیدیا؟ یا کسی دوسری مصیبت میں پڑے اور دنیا کے سارے سہارے ہاتھ سے نکل گئے؟ اگر ایسا ہوا ہے، تو یاد کرو۔ اس وقت تمہاری خدا پرستی اور خدا پرستی کے اخلاص کا کیا حال تھا!

قرآن نے جا بجا اس حالت کے بیان کے لیے بحری سفر کی مثال اختیار کی ہے۔ کیونکہ انسان کی بے بسی اور مایوسی کے لیے اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہاں آیت (۲۲) میں اسی طرف اشارہ کیا ہے، اور سورۂ عنکبوت کی آیت (۱۵) اور لقمان کی آیۃ (۳۲) میں بھی یہی مطلب ملیگا۔

دین حق کی تعلیم و تزکیہ کا مقصد یہی ہے کہ اس حالت سے انسان کو نجات دلائے، اور اس کا وجدان اس طرح بیدار کر دے کہ خدا پرستی کا جو اخلاص خاص خاص حالتوں میں ابھرتا ہے، وہ اس کی پوری زندگی کی ایک دائم اور مستمر حالت ہو جائے۔ یہی وجہ ہے

ٹھہری) تو اس وقت (انہیں خدا کے سوا اور کوئی ہستی یاد نہیں آتی وہ) دین کے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارنے لگتے ہیں "خدایا! اگر اس حالت سے ہمیں نجات دیدے تو ہم ضرور تیرے شکر گذار ہونگے" پھر (دیکھو) جب اللہ ۲۲ انہیں نجات دیدیتا ہے، تو اچانک (اپنا عہد و پیمان بھول جاتے ہیں اور) ناحق ملک میں سرکشی و فساد کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال تو خود تمہاری ہی جانوں پر پڑنے والا ہے۔ یہ دنیا کی (چند روزہ) زندگی کے فائدے ہیں، سو اٹھا لو۔ پھر تمہیں ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اس وقت ہم تمہیں بتائینگے کہ جو کچھ دنیا میں کرتے رہے، اس کی حقیقت کیا تھی! ۲۳

دنیا کی زندگی کی مثال تو بس ایسی ہے، جیسے یہ معاملہ کہ آسمان سے ہم نے پانی برسایا، اور زمین کی نباتات جو انسانوں اور چارپایوں کے لیے غذا کا کام دیتی ہیں اس سے شاداب ہو کر پھلی پھولیں اور باہمدگر مل گئیں۔ پھر جب وہ وقت آیا کہ زمین نے اپنے (سبزی اور لالی کے) سارے زیور پہن لیے اور (لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور گراں بار باغوں سے) خوشنما ہو گئیں، اور زمین کے مالک سمجھے، اب فصل ہمارے قابو میں آگئی ہے، تو اچانک ہمارا

كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًاؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِۚ

حکم دن کے وقت یا رات کے وقت نمودار ہو گیا، اور ہم نے زمین کی ساری فصل اس طرح بیخ و بُن سے کاٹ کے رکھ دی، گویا ایک دن پہلے تک اس کا نام و نشان ہی نہ تھا! اس طرح ہم (حقیقت کی) دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں!

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بُلاتا ہے، اور جسے چاہتا ہے (کامیابی و نجات کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔

(اُس کا قانون تو یہ ہے کہ) جن لوگوں نے بھلائی کی اُن کے لیے بھلائی ہی ہوگی، اور (جتنی اور جیسی کچھ اُن کی بھلائی تھی) اُس سے بھی کچھ زیادہ۔ اُن کے چہروں پر نہ تو (محرومی کی) کالک لگیگی، نہ ذلت کا اثر نمایاں ہوگا۔ ایسے ہی لوگ جنتی ہیں، ہمیشہ جنت میں رہنے والے!

اور جن لوگوں نے بُرائیاں کمائیں، تو بُرائی کا نتیجہ ویسا ہی نکلیگا جیسی کچھ بُرائی ہوگی۔ اور ان پر خواری چھا جائیگی۔ اللہ (کے قانون) سے انہیں بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ ان کے چہروں پر اس طرح کالک چھا جائیگی، جیسے اندھیری رات کا ایک ٹکڑا چہروں پر اُڑھا دیا گیا ہو! سو ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں۔ دوزخ میں

کہ ایمان کی حالت یہ فرمائی کہ مصیبت کی گھڑی ہو یا راحت و سرور کا عالم، لیکن خدا کی یاد سے دل پر غفلت طاری نہ ہو۔

(۲۴) "بغی" کے معنی سرکشی کے ہیں، اور اس میں ہر طرح کی سرکشی داخل ہے، لیکن جب "فی الارض" کے ساتھ کہا جائے، جیسا کہ آیت (۲۳) میں ہے، تو اُس سے مقصود وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں دنیا کی دولت و طاقت حاصل ہو جاتی ہے، اور وہ اس کے گھمنڈ میں آکر ظلم و فساد کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں۔ چونکہ اس سرکشی کا اصلی سرچشمہ دنیوی زندگی کے سر و سامان کا غرور ہے، اس لیے آیت (۲۴) میں فرمایا، دنیا کی زندگی کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کاشت کاری کا معاملہ۔ آسمان سے پانی برستا ہے اور تمہارے کھیت لہلہانے لگتے ہیں۔ پھر جب وہ وقت آتا ہے کہ تم سمجھتے ہو اب فصل پک گئی اور ہماری محنت کی کمائی ہمارے قبضہ میں ہے، تو اچانک کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے، اور ساری فصل اس طرح تباہ ہو جاتی ہے، گویا اُس کا نام و نشان ہی نہیں تھا!

یعنی دنیوی زندگی کی ساری کامرانیاں اور دلفریبیاں بے ثبات اور ہنگامی ہیں۔ تم یہاں کی کسی چیز اور حالت پر بھروسہ نہیں کر سکتے کہ یہ ضرور ویسی ہی رہیگی۔ اول تو زندگی ہی چند نفَس ہے، پھر اس کا بھی ٹھکانا نہیں۔ پھر زندگی کے عیش و تمتع کی جتنی دلفریبیاں ہیں، سب کا حال یہ ہے کہ صبح ہیں تو شام نہیں۔ شام کو ہیں تو صبح کو نہیں۔ ایسی حالت میں اس سے بڑھ کر غفلت و گمراہی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ انسان حق و راستی کی راہ چھوڑ کر سرکشی پر اُتر آئے، اور کس چیز کے بھروسے پر؟ اس زندگی کے سر و سامان اور اقتدار کے بھروسہ پر جسے چند لمحوں

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ ۲۷
فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ۝ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۲۸
إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ۝ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ ۲۹
الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ ۳۰ ع
السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ

کے لیے بھی قطعی اور برقرار نہیں کر سکا!

لیکن انسانی غفلت کے عجائب کا یہی حال ہے۔ کوئی نہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہو، مگر کوئی نہیں جو اس غرورِ باطل کی سرگرانیوں سے اپنی نگہداشت کر سکے!

یہی غفلت ہے جسے دینِ حق دور کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا اور دنیا کی کامرانیوں سے نہیں روکتا، مگر ان کے غرورِ باطل اور بے اعتدالانہ انہماک کی راہیں بند کر دینی چاہتا ہے۔ کیونکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے فتنوں کا اصلی سرچشمہ یہی غرورِ باطل ہے

(۱۷) قرآن نے ہر جگہ ایمان کو روشنی سے اور کفر کو تاریکی سے تشبیہ دی ہے۔ اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور (۲: ۲۵۷) اور مومنوں کی پہچان یہ فرمائی ہے کہ ان کے لیے سرخروئی اور شادمانی ہوگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ (۷۵: ۲۳) تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم (۸۳: ۲۴) وجوہ یومئذ ناعمۃ لسعیھا راضیۃ (۸۸: ۹) اور کفر کے لیے سیاہ روئی اور خواری ہے: وجوہ یومئذ باسرۃ تظن ان یفعل بھا فاقرۃ (۷۵: ۲۵) وجوہ یومئذ خاشعۃ عاملۃ ناصبۃ تصلی نارا حامیۃ (۸۸: ۴) اور آل عمران کی آیت (۱۰۶) میں گذر چکا ہے: یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ۔ یہاں آیات ۲۶۔ اور ۲۷ میں بھی یہی بات بیان کی ہے۔ خوشحالی و کامرانی سے چہروں کا چمک اٹھنا اور نامرادی و خواری سے سیاہ پڑ جانا ایک طبعی حالت ہے۔ پس فرمایا، قیامت کے دن ایک گروہ کے چہرے چمک اٹھینگے۔ دوسرے کے سیاہ پڑ جائینگے۔ اور سیاہ چہروں کا یہ حال ہوگا، گویا پردۂ شب نے ان کے چہرے ڈھانپ لیے ہیں!

(۱۸) آیت (۲۸) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تم جن پیشواؤں کو اپنی حاجت روائیوں کے لیے پکارتے ہو، ان تک

ہمیشہ رہنے والے!

۲۷ اور (دیکھو) جس دن ایسا ہوگا کہ ہم ان سب کو اپنے حضور اکٹھا کرینگے، اور پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے، کہینگے "تم اور وہ سب جنہیں تم نے شریک ٹھہرایا تھا، اپنی جگہ سے نہ ہلو" (یعنے اپنے مقام میں رکے رہو۔ آگے نہ بڑھو) اور پھر ایسا ہوگا کہ ایک دوسرے سے انہیں الگ کر دینگے (یعنے شرک کرنے والوں میں اور ان میں جنہیں شریک بنایا گیا، امتیاز پیدا ہو جائیگا) تب وہ ہستیاں جنہیں خدا کے ساتھ شریک بنایا گیا ہے، کہینگی: "یہ بات تو نہ تھی کہ تم ہماری ہی پرستش کرتے تھے۔

۲۸ آج کے دن ہم میں اور تم میں اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔ (وہ جانتا ہے کہ) تمہاری پرستاریوں سے ہم یک قلم بے خبر تھے"

۲۹ پس اس دن ہر آدمی جانچ لیگا کہ جو کچھ وہ پہلے کر چکا ہے اسکی حقیقت کیا تھی۔ سب اللہ کے حضور کہ انکا مالک حقیقی ہے لوٹائے جائینگے، اور حقیقت کے خلاف جس قدر افترا پردازیاں کرتے رہے ہیں، سب ان سے کھوئی جائینگی!

۳۰ (اے پیغمبر!) ان لوگوں سے پوچھو "وہ کون ہے جو تمہیں آسمان و زمین کی بخشائشوں کے ذریعہ روزی دیتا ہے وہ کون ہے

وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ
اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ كَذٰلِكَ ٣٢-٣٣
حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا ٣٣
الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ ٣٤
مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۚ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ

جس کے قبضہ میں تمہارا سُننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے؟ اور پھر وہ کون ہے جو تمام کارخانہ ہستی کا انتظام کر رہا ہے؟" یہ (فوراً) بول اُٹھینگے کہ "اللہ" پس تم کہو "اگر ایسا ہی ہے تو پھر تم (انکارِ حق کے نتیجہ سے) ڈرتے نہیں؟"

٣٢ یہی اللہ فی الحقیقت تمہارا پروردگار ہے۔ پھر بتلاؤ، سچائی کے جان لینے کے بعد اُسے نہ ماننا گمراہی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ تم (حقیقت سے) مُنہ پھیر کدھر کو جا رہے ہو؟

٣٣ (اے پیغمبر!) اسی طرح تیرے پروردگار کا فرمودہ اِن لوگوں پر صادق آگیا جو (دائرۂ ہدایت سے) باہر ہو گئے ہیں، کہ وہ ایمان لانے والے نہیں!

(اے پیغمبر!) ان سے پوچھو "کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو خلقت کی پیدایش شروع کرے، اور پھر اُسے دُہرائے؟ تم کہو، یہ تو اللہ ہے جو ابتدا میں پیدا کرتا ہے۔ پھر اُسے دُہرائیگا پس

٣٤ غور کرو، تمہاری اُلٹی چال تمہیں کدھر کو لے جا رہی ہے؟

ان سے پوچھو "کیا تمہارے بنائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو حق کی راہ دکھاتا ہے۔ پھر جو حق کی راہ دکھائے، وہ اس کا حقدار ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے، یا وہ، جو خود ہی راہ نہیں پاتا جب

٣٥ جب تک اُسے راہ نہ دکھائی جائے؟ (افسوس تم پر!) تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے فیصلے کر رہے ہو؟"

نہ تو تمہاری پکار سُنتی تھیں، نہ تمہاری پرستاریوں کی انہیں کچھ خبر تھی، وہ تمہاری حاجت روائی کیا کرینگے؟ قیامت کے دن خدا مشرکوں کو اور اُن کے بنائے ہوئے شریکوں کو ایک صف میں کھڑا کریگا کیونکہ معبودوں کو اپنے پرستاروں کے حلقہ ہی میں ہونا چاہیئے لیکن وہ مشرکوں کا ساتھی ہونا پسند نہیں کرینگے۔ وہ کہینگے ہمیں اِن سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ گو ہمارا نام لیتے ہوں، لیکن فی الحقیقت ہمیں نہیں پوجتے تھے۔ اپنی ہوائے نفس کے پُجاری تھے ہمیں تو ان کی پرستش کی خبر بھی نہیں!

٣١ یہ ایسی ہی بات ہے، جیسی مائدہ کے آخر میں حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت فرمائی ہے کہ قیامت کے دن عرض کرینگے میں عیسائیوں کے شرک سے بری ہوں۔ ماقلت لھم الا ما امرتنی بہ (٥: ١١٧) مزید تشریح کے لیے آخری نوٹ میں ولدیت الوہیت کا بحث دیکھو۔

٣٢ (١٩) آیت (٣١) میں بُرہانِ ربوبیت کا استدلال ہے، اور توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استشہاد کیا گیا ہے (برہانِ ربوبیت کی تفصیل تفسیر فاتحہ میں گزر چکی ہے)

٣٣ (٢٠) آیت (٣٥) قرآن کے مہمات حِکَم میں سے ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مفسرین نے اس کی حقیقت بھی اسی طرح ضائع کر دی، جس طرح اکثر دلائل قرآنیہ ضائع کر دی ہیں۔ اس کی تشریح آخری نوٹ میں ملیگی۔

لَا یَهِدِّیۡ اِلَّاۤ اَنۡ یُّهۡدٰی ۚ فَمَا لَكُمۡ ۟ كَیۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ۝ وَمَا یَتَّبِعُ اَكۡثَرُهُمۡ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ ۳۵
لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ۝ وَمَا كَانَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ اَنۡ یُّفۡتَرٰی مِنۡ ۳۶
دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰكِنۡ تَصۡدِیۡقَ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡهِ وَتَفۡصِیۡلَ الۡكِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ ۳۷
اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ
صٰدِقِیۡنَ ۝ بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ یُحِیۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا یَاۡتِهِمۡ تَاۡوِیۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ ۳۸
قَبۡلِهِمۡ فَانۡظُرۡ كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیۡنَ ۝ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یُّؤۡمِنُ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّا یُؤۡمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعۡلَمُ

اور ان لوگوں میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو صرف وہم و گمان کی باتوں پر چلتے ہیں اور سچائی کی معرفت میں گمان کچھ کام نہیں دے سکتا۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں! ۳۶

اور اس قرآن کا معاملہ ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اپنے جی سے گڑھ لائے۔ وہ تو ان تمام وحیوں کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور الکتاب اللہ کی تفصیل ہے (یعنے اللہ کی کتابوں میں جو کچھ تعلیم دی گئی ہے، وہ سب اس میں کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہے) اس میں کچھ شبہ نہیں۔ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے! ۳۷

(۲۱) آیت (۳۶) قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے۔ اس کی تشریح آخری نوٹ میں ملیگی۔

(۲۲) آیت (۳۷) میں فرمایا۔ قرآن جس قسم کی چیز ہے ایسی چیز کبھی انسانی بناوٹ سے نہیں بن سکتی۔ پھر فرمایا، وہ تمام پچھلی صداقتوں کی تصدیق کرنے والا اور تمام پچھلی کتابوں کی تعلیمات پر حاوی ہے۔ قرآن کا یہ وصف کیوں اس بات کی دلیل ہوا کہ وہ انسانی بناوٹ کا کام نہیں؟ اس کے جواب کے لیے تفسیر سورۂ فاتحہ دیکھو۔ یہ مہمات براہین قرآنیہ میں سے ہے۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (یعنے پیغمبر اسلام نے) اللہ کے نام پر یہ افترا کیا ہے؟ تم کہو "اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو (اور ایک آدمی اپنے جی سے گڑھ کر ایسا کلام بنا لے سکتا ہے) تو قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر پیش کر دو، اور خدا کے سوا جن جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہو (تمہیں پوری طرح اجازت ہے) بلا لو! ۳۸

(۲۳) آیات (۳۸) اور (۳۹) اور (۴۱) کی ضروری تشریحات کے لیے آخری نوٹ دیکھنا چاہیے۔

نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا، اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا، جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے! ۳۹

اور (اے پیغمبر!) ان میں (یعنے تیری قوم میں) کچھ تو ایسے ہیں جو قرآن پر (آئندہ) ایمان لائینگے۔ کچھ ایسے ہیں جو ایمان لانے والے نہیں، اور تیرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون

۴۰ بِالْمُفْسِدِينَ ۝ وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا

۴۱-۴۲ تَعْمَلُونَ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ

۴۳ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَ

۴۴ لَٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ

۴۵ بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

---

۴۰ لوگ مفسد ہیں۔

اور اگر یہ (اس قدر سمجھانے پر بھی) تجھے جھٹلائیں، تو کہہ دے "میرے لیے میرا عمل ہے، تمہارے لیے تمہارا۔ میں جو کچھ کرتا ہوں، اُس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ تم جو کچھ کرتے ہو، اُس کے لیے میں ذمہ دار نہیں" (ہر شخص کے لیے اُس کا عمل ہے، اور عمل کے مطابق نتیجہ پس تم اپنی راہ چلو۔ مجھے اپنی راہ چلنے دو، اور دیکھو،

۴۱ اللہ کا فیصلہ کیا ہوتا ہے)

اور (اے پیغمبر!) ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تیری باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں (اور تو خیال کرتا ہے، یہ کلام حق سُن کر اُس کی سچائی پالینگے، حالانکہ فی الحقیقت وہ سُنتے نہیں) پھر کیا تو بہروں کو بات سُنائیگا

۴۲ اگرچہ وہ بات نہ پاسکتے ہوں؟

اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو تیری طرف تکتے ہیں (اور تو خیال کرتا ہے، یہ تجھے سمجھ کر دیکھتے ہیں، حالانکہ وہ دیکھتے نہیں) پھر کیا تو اندھے کو راہ دکھا دیگا، اگرچہ اُسے کچھ سوجھ نہ پڑتا ہو؟

۴۳ یقیناً اللہ انسانوں پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا (کہ اُنہیں جبراً اندھا بہرا بنادے) مگر خود انسان ہی ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے (کہ اس کی بخشی ہوئی قوتوں سے کام نہیں لیتا اور ہٹ اور ضد میں آکر سچائی کا انکار کر دیتا ہے)

۴۴ اور جس دن ایسا ہوگا کہ اللہ ان سب کو اپنے حضور جمع کریگا، اُس دن انہیں ایسا معلوم ہوگا گویا (دنیا میں) اس سے زیادہ نہیں ٹھہرے، جیسے گھڑی بھر کو لوگ ٹھہر جائیں اور آپس میں صاحب سلامت کرلیں

(تو) بلاشبہ وہ لوگ بڑے ہی گھاٹے میں رہے جنہوں نے اللہ کی ملاقات کا اعتقاد جھٹلایا، اور وہ کبھی راہ پانے والے نہ

(۴۲) آیت (۴۲) اور اس کے بعد کی آیات میں اُسی حالت کی طرف اشارہ ہے جو جا بجا قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ یعنی جہل و فساد اور تعصب و تقلید کے جمود سے ایسی حالت کا پیدا ہو جانا جو انسان کی عقل و بصیرت کو یک قلم معطل کر دیتی ہے، اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ سچائی اور حقیقت کا ادراک کر سکے۔ آیت (۴۴) میں فرمایا: یہ حالت اس لیے پیش نہیں آتی کہ خدا نے کسی کو اس پر مجبور کر دیا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو یہ ظلم ہے، اور خدا کا یہ قانون نہیں کہ کسی جان پر ظلم ہو۔ یہ تو خود انسان ہی ہے جو خدا کی دی ہوئی روشنی ضائع کر کے اندھا بہرا بن جاتا ہے۔

(۴۵) آیت (۴۵) میں اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی جب انسان پر طاری ہوگی، تو وہ تمام مدت جو مرنے کے بعد سے لے کر قیامت تک گذرتی ہے، اُسے ایسی محسوس ہوگی جیسے ایک بہت

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ۝ ۴۶
وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ ۴۷ وَيَقُولُونَ
مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ ۴۸
لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ

راہ پانے والے نہ تھے ! ۴۵

اور (اے پیغمبر!) ہم نے اِن لوگوں سے (یعنے منکرینِ عرب سے) جن جن باتوں کا وعدہ کیا ہے (یعنے دعوتِ حق کے پیش آنے والے نتائج کی خبر دی ہے) اُن میں سے بعض باتیں تجھے (تیری زندگی میں) دکھا دیں، یا (اُن کے ظہور سے پہلے) تیرا وقت پورا کردیں، لیکن بہرحال اُنہیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ اس پر شاہد ہے۔ ۴۶

اور (یاد رکھو) ہر اُمت کے لیے ایک رسول ہے (جو اُن میں پیدا ہوتا اور اُنہیں دینِ حق کی طرف بلاتا ہے) پھر جب کسی اُمت میں اُس کا رسول ظاہر ہوگیا، تو (ہمارا قانون یہ ہے کہ) اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے، اور ایسا نہیں ہوتا کہ ناانصافی ہو۔ ۴۷

اور یہ لوگ کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ، یہ بات (یعنے انکارِ حق کی پاداش) کب ظہور میں آئیگی"؟ (اے پیغمبر!) تم کہدو (یہ معاملہ کچھ میرے اختیار میں نہیں کہ بتلا دوں، کب واقع ہوگا) میں تو خود اپنی جان کا بھی نفع نقصان اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ نے چاہا ہے۔ ہر اُمت کے لیئے (پاداشِ عمل کا) ایک مقررہ وقت ہے، اور جب وہ وقت آپہنچا ہے، ۴۸

ہی قلیل مدت کا درمیانی وقفہ گذرا ہو۔ اس حالت کی مثال یوں سمجھو، جیسے کبھی رات بھر سو کر تم اُٹھتے ہو۔ اور اُٹھنے کے بعد خیال کرتے ہو کہ بہت تھوڑی دیر نیند میں رہے۔ حالانکہ رات بھر نیند میں بسر کر چکے ہوتے ہو۔ یہ حقیقت قرآن نے مختلف تعبیرات میں بیان کی ہے، اور سب کا ماحصل یہ ہے کہ وہ عظیم مدت جو انسان پر گذریگی، اُس دن بہت ہی قلیل محسوس ہوگی۔ سورۂ مؤمنون آیت (۱۱۲) روم (۳۰) احقاف (۴۶) اور نازعات کی آخری آیت دیکھنی چاہیے۔

سورۂ روم کی آیت (۵۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا احساس اگرچہ سب کو ہوگا، لیکن اہلِ علم و ایمان جن کے دلوں میں یومِ آخرت کا یقین تھا، اس احساس سے مغلوب نہیں ہو جائینگے۔ وہ پائینگے کہ یہ تمام مدت جو گزر چکی ہے، دنیوی زندگی اور اُخروی زندگی کی درمیانی مدت تھی اور اب قیامت کا دن ہمارے سامنے ہے۔

ان آیات کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ دنیوی زندگی اُس دن اتنی حقیر و قلیل محسوس ہوگی، گویا گھڑی بھر کی زندگی۔ لیکن پہلا مطلب زیادہ واضح اور موزوں ہے۔

(۴۶) آیت (۴۶) کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ حق کی فتحمندیوں اور منکروں کی نامرادیوں کی جو خبر دی گئی ہے، کچھ ضروری نہیں کہ وہ سب کچھ تیری زندگی ہی میں پیش آجائے۔ بعض باتیں تیری جوتے جی ہوکر رہینگی، بعض بعد کو واقع ہونگی۔ پس منکروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس معاملہ کا سارا دارومدار اس شخص کی زندگی پر ہے۔ یہ نہ رہیگا تو کچھ نہ ہوگا۔ تو زندہ رہے یا نہ رہے، لیکن احکامِ حق کو پورا ہو کر رہنا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(۴۷) آیت (۴۷) میں اللہ کے اُس قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت کے لیے اُس کا رسول ظاہر ہوا، اور

فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا
يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝
ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ
اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِىْ وَرَبِّىْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ
لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

۴۹ تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، نہ ایک گھڑی آگے!

۵۰ (اے پیغمبر!) تم ان لوگوں سے کہو "کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ تم کیا کرو گے اگر اس کا عذاب اچانک رات نازل ہو، یا دن دہاڑے تم پر مسلط ہو جائے؟ پھر کیا بات ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچا رہے ہیں؟

۵۱ کیا جب وہ واقع ہو جائیگا، اس وقت تم یقین کرو گے؟ (لیکن اس وقت یقین کرنا کچھ سودمند نہ ہوگا، اس وقت تو کہا جائیگا) "ہاں! اب تم نے یقین کیا، اور تم ہی تھے کہ اس کی طلب میں جلدی مچایا کرتے تھے!"

۵۲ پھر ظلم کرنے والوں سے کہا جائیگا "اب ہمیشگی کا عذاب چکھو، تمہیں جو کچھ بدلہ مل رہا ہے، یہ اس کے سوا کیا ہے کہ خود تمہارے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے جو دنیا میں کماتے رہے ہو!"

۵۳ اور تجھ سے پوچھتے ہیں "کیا یہ بات واقعی سچ ہے؟" تم (بلا تامل) کہو "ہاں، میرا پروردگار اس پر شاہد ہے کہ یہ سچائی کے سوا کچھ نہیں، اور تم کبھی ایسا نہیں کر سکتے کہ اسے (اس کے کاموں میں) عاجز کر دو"

۵۴ اور (آنے والا عذاب اس درجہ ہولناک ہے، اور اس کا وقوع اس درجہ قطعی ہے کہ) اگر ہر ظالم انسان کے قبضہ میں وہ سب کچھ آجائے جو روئے زمین میں ہے تو وہ ضرور اسے اپنے فدیہ میں دیدے، اور دیکھو جب انہوں نے عذاب اپنے سامنے دیکھا، تو (اپنی سرکشی و انکار [illegible]) دل ہی دل میں پچھتانے لگے پھر ان کے درمیان (یعنے مومنوں اور سرکشوں کے درمیان) انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا، اور ایسا کبھی [illegible]

لوگوں نے جب علم و رشد کے ذریعہ اس کی دعوت رد کر دی تو اللہ نے ان دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ کر دیا یعنے حق فتح مند ہوا، باطل نامراد۔ اور چونکہ یہ فیصلہ حق و عدالت کا فیصلہ ہے، اس لیے جا بجا اسے "قضی بالحق" اور "قضی بالقسط" سے تعبیر کیا ہے۔ تفصیل تفسیر سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے۔

(۲۸) استعجال بالعذاب (آیت ۵۰) کی تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ دیکھنی چاہیے۔

(۲۹) آیت (۵۳) میں ان لوگوں کا قول نقل کیا ہے جو منکر جامد نہ تھے، مگر تصدیق میں متامل تھے۔ وہ جب پیغمبر اسلام کی صداقت و دیانت پر غور کرتے جو تمام قوم میں اول دن سے مسلم تھی، تو ان کا دل کہتا سچے آدمی کی زبان سے جھوٹی بات نہیں نکل سکتی۔ لیکن پھر جب دیکھتے کہ ان کی دعوت ایسی باتوں کا یقین دلاتی ہے جن سے وہ اور ان کے آباء و اجداد یکسر ناآشنا رہے ہیں، تو طبیعت کھلتی نہیں، شک و حیرت کی حالت میں مبتلا ہو جاتے، اور پوچھنے لگتے "کیا جو کچھ تم کہہ رہے ہو، فی الحقیقت ایسا ہی ہے؟" فرمایا، تم کہو جب نہیں آج تک میری سچائی میں شبہ نہیں ہوا تو آج کیوں ہو رہا ہے؟ میں جو کچھ کہتا ہوں یہ حق ہے، اور اس پر میرا پروردگار شاہد ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ هُوَ يُحْىٖ وَ يُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝

۵۴ کسی طرح کی زیادتی واقع ہو!

۵۵ یاد رکھو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کے لیے ہے (اُس کے سوا کوئی نہیں جسے حکم و تصرف میں کچھ دخل ہو) اور یہ بات بھی نہ بھولو کہ اللہ کا وعدہ حق ہے۔ (وہ کبھی ٹل نہیں سکتا) مگر ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو یہ بات نہیں جانتے!

۵۶ وہی جِلاتا ہے۔ وہی مارتا ہے۔ اور وہی ہے، جس کی طرف تم سب کو (بالآخر) لوٹنا ہے!

۵۷ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی، جو موعظت ہے، دل کی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے، اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں!

۵۸ (اے پیغمبر!) تم کہو، یہ اللہ کا فضل ہے، اور اللہ کی رحمت ہے۔ پس چاہیے کہ اس پر خوشی منائیں اور یہ اُن ساری چیزوں سے بہتر ہے جسے وہ (دنیا کی زندگی میں) جمع کرتے رہتے ہیں!

۵۹ (اے پیغمبر!) تم ان سے کہو "کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ جو روزی اللہ نے تمہارے لیے پیدا کی ہے تم نے (محض اپنے اوہام و ظنون کی بنا پر) اس میں سے بعض کو حرام ٹھہرا دیا بعض کو حلال سمجھ لیا ہے" تم پوچھو "(یہ جو تم نے حلال و حرام کا حکم لگایا تو) کیا اللہ نے اس کی اجازت دی ہے، یا تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو؟"

(۳۰) آیت (۵۷) میں قرآن کے چار وصف بیان کیے:

(ا) موعظت ہے۔ یعنے دل میں اُتر جانے والی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والی طریقوں سے اُن تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے جو خیر و حق کی باتیں ہیں، اور اُن تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر اور بطلان کی باتیں ہیں۔ کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت ہی نہیں ہے بلکہ ایسی نصیحت جو موثر دلائل اور دلنشیں اسلوبوں کے ساتھ کی جائے۔

(ب) شفاءٌ لما فی الصدور۔ دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے۔ جو فرد اور جو گروہ بھی اس نسخہ پر عمل کریگا، اُس کے قلوب ہر طرح کے مفاسد و رذائل سے پاک ہو جائینگے۔

یاد رہے کہ عربی میں قلب، فواد، اور صدر کے الفاظ جب کبھی ایسے موقعہ پر بولے جائیں جیسا کہ یہ موقعہ ہے، تو ان سے مقصود انسان کی معنوی حالت ہوتی ہے یعنے ذہن و فکر کی قوت، عقلی ادراک، جذبات و عواطف، اخلاق و عادات، اندرونی جبلّات، وہ عضو مقصود نہیں ہوتا جو فن تشریح کا دل اور سینہ ہے۔ پس دل کی شفا کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی فکری اور اخلاقی حالت کے جس قدر مرض ہو سکتے ہیں، ان سب کے لیے یہ نسخۂ شفا ہے۔

(ج) یقین کرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

(د) یقین کرنے والوں [illegible] لیے پیام رحمت ہے۔ یعنے ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے دنیا کو نجات دلاتا اور رحم و محبت اور امن و سلامتی کی روح سے معمور کرتا ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ ع وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ ۶۰
اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا
فِي السَّمَاۗءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ۶۱
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰي فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۶۲-۶۳

اور جن لوگوں کی جرأتوں کا یہ حال ہے کہ اللہ کے نام پر جھوٹ بول کر افترا پردازی کر رہے ہیں، اُنھوں نے روز قیامت کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ (کیا وہ سمجھتے ہیں، اللہ کی جانب سے کوئی پرسش ہونے والی نہیں؟) حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسانوں کے لیے بڑا ہی فضل رکھتا ہے (کہ اُس نے جزاء عمل کو آخرت پر اُٹھا رکھا ہے، اور دنیا میں سب کو مہلتِ عمل دے دی ہے) لیکن اُن میں زیادہ تر ایسے ہیں جو اُس کا شکر نہیں بجا لاتے! ۶۰

اور (اے پیغمبر!) تم کسی حال میں ہو، اور قرآن کی کوئی سی آیت بھی پڑھ کر سُناتے ہو، اور (اے لوگو!) تم کوئی سا کام بھی کرتے ہو، مگر وہ بات کرتے ہوئے ہماری نگاہوں سے غائب نہیں ہوتے، اور نہ تو زمین میں نہ آسمان میں کوئی چیز تمہارے پروردگار کے علم سے غائب ہے۔ ذرہ بھر کوئی چیز ہو، یا اُس سے چھوٹی یا بڑی، سب کچھ ایک کتابِ واضح میں مندرج ہے! ۶۱

یاد رکھو، جو اللہ کے دوست ہیں، اُن کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے اور زندگی ایسی بسر کی کہ بُرائیوں سے بچتے رہے۔ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی (کامرانی و سعادت کی) بشارت ہے، اور آخرت کی زندگی میں بھی ۶۲-۶۳

یعنی قرآن کے اوصاف کا دعویٰ اعلان ہی نہ تھا بلکہ اس کی صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بھی تھی۔ اگر ایک شخص دعوےٰ کرے کہ وہ طبیب ہے، تو سب سے زیادہ سہل اور قطعی طریقہ اُس کے دعوے کی جانچ کا یہ ہوگا کہ دیکھا جائے اس کے علاج کے بیمار کو شفا ملتی ہے یا نہیں؟ اگر تم دیکھو کہ موت کی آغوش میں پہنچے ہوئے بیمار اس کے شفاخانہ میں داخل ہوئے اور تندرست ہو کر نکلے تو تم یقیناً تسلیم کر لو گے کہ اپنے دعوے میں سچا ہے۔ قرآن نے بھی جا بجا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے۔ اُس نے کہا میں نسخۂ شفا ہوں، اور ثبوت میں مومنوں اور متقیوں کی جماعت پیش کر دی جو اس کے دارالشفا میں طیار ہوئی تھی کہ دیکھ لو، یہ تندرست ہو گئے ہیں یا نہیں!

آج بھی اس کی یہ دلیل اسی طرح قاطع ہے جس طرح عہد نزول میں تھی۔ اگر اُس نے عرب جاہلیت کے مریضانِ روح و دل میں سے ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، خالدؓ، سلمانؓ، ابوذرؓ وغیرہم جیسی تندرست روحیں پیدا کر دی تھیں، تو کیا اُس کے نسخۂ شفا ہونے میں شک کیا جا سکتا ہے؟

(۳۱) مشرکین عرب نے اپنے اوہام و خرافات کی بنا پر بہت سی چیزوں کا استعمال حرام ٹھہرا لیا تھا۔ چنانچہ سورۂ انعام میں آیت (۱۳۸) سے (۱۵۰) تک اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے، اور یہاں آیت (۵۹) میں بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس آیت کو اور اس کی ہم معنی آیات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ:

(ا) قرآن کے نزدیک اُن تمام چیزوں میں جو کھانے پینے کی پیدا ہوتی ہیں، اصل اباحت ہے۔ نہ کہ حرمت۔ یعنے جتنی چیزیں کھانے کے قابل ہیں، سب حلال ہیں، الّا یہ کہ وحی الٰہی نے کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیا ہو۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝

۶۴ اللہ کے فرمان اٹل ہیں کبھی بدلنے والے نہیں۔ اور یہی سب سے بڑی فیروزمندی ہے جو انسان کے حصے میں آسکتی ہے!

۶۵ (اور اے پیغمبر!) منکروں کی (معاندانہ) باتوں سے تم آزردہ نہ ہو۔ ساری عزتیں اللہ ہی کے لیے ہیں (وہ جسے چاہے عزت دے۔ جسے چاہے ذلت دی) وہ سننے والا جاننے والا ہے!

۶۶ یاد رکھو۔ وہ تمام ہستیاں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ سب جو زمین میں ہیں، اللہ ہی کے تابع فرمان ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پکارتے ہیں، تم جانتے ہو، وہ کس بات کی پیروی کرتے ہیں؟ (کیا یقین و بصیرت کی؟ نہیں) محض وہم و گمان کی۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ (ہر بات میں) اپنی اٹکلیں دوڑاتے ہیں!

۶۷ وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کا وقت بنا دیا کہ اس میں آرام پاؤ، اور دن کا وقت، کہ اس کی روشنی میں دیکھو بھالو۔ بلاشبہ اس بات میں اُن لوگوں کے لیے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں جو (کلام حق) سنتے (اور سمجھتے) ہیں!

اُس نے صرف انہی چیزوں سے روکا ہے جو خبائث ہیں، یعنے مُضر اور گندی ہیں۔ باقی جتنی چیزیں ہیں، طیبات ہیں۔

(ب) کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینے کا حق صرف خدا کی شریعت کو ہے۔ پس کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ محض اپنے قیاس و رائے سے کوئی چیز حرام ٹھہرا دے۔

(ج) قرآن نے جن باتوں کو افترا علی اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنے خدا پر بہتان باندھنا، ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ بغیر نص قطعی کے محض اپنی رائے اور قیاس سے کوئی چیز حرام ٹھہرا لی جائے۔

(د) انسان کے عقائد و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے۔ نہ کہ وہم و گمان پر۔ وہ مشرکوں کی بنیادی گمراہی یہی قرار دیتا ہے کہ علم و یقین کی کوئی روشنی اپنے سامنے نہیں رکھتے محض اوہام و ظنون کے پرستار ہیں۔

نزول قرآن سے پہلے اقوام عالم کی ایک عالمگیر گمراہی یہ تھی کہ کھانے پینے کے بارے میں طرح طرح کے وہمی قاعدے بنا لیے تھے، حلت و حرمت کی بنیاد علم و حقیقت کی کسی روشنی پر نہ تھی محض اوہام و خرافات پر تھی۔ قرآن نے نوع انسانی کو اس حالت سے نجات دلائی۔ اُس نے اعلان کیا کہ زمین میں جتنی اچھی چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں، سب اسی لیے ہیں کہ انسان اُنہیں برتے اور خدا کے سوا کسی کو یہ اختیار نہیں کہ اس کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو حرام ٹھہرا دے۔ یہ آیت اُن تمام فقہا متشددین کے خلاف حجت قاطع ہے جنہوں نے محض رائے و قیاس سے بعض مباحات حرام ٹھہرا دی ہیں، اور اُن تمام لوگوں کے خلاف بھی، جو سمجھتے ہیں، مباحات کا دائرہ اپنے اوپر تنگ کر لینا تقوے اور تقرب الٰہی کی بات ہے۔

(۳۲) قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ کسی بات کے ٹھہرا دینے اور قطعی طور پر نافذ کر دینے کے لیے "کتابت" کی تعبیر اختیار کرتا ہے۔ یعنے کتابت ہے، یہ بات لکھ دی گئی ہے۔ مثلاً کتب علیکم

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ الْغَنِيُّ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ

۶۸-۶۹ ۷۰

الصیام (۲ : ۱۸۳) ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللہ (۹ : ۳۶) کتب علیہ انہ من تولاہ فانہ یضلہ (۲۲ : ۴) اسی طرح اس مطلب کے لیے کہ حکمت الٰہی نے کارخانۂ ہستی کی ہر چیز کے لیے ایک قانون بنا دیا ہے، اور یہاں جو کچھ ظہور میں آتا ہے، وہ سب کچھ ضبط میں آچکا ہے، کتابت اور "کتاب" کی تعبیر بیا کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی آیت (۶۱) میں فرمایا، آسمان و زمین میں ایک ذرہ بھی ایسا نہیں جو کتاب مبین کے انضباط سے باہر ہو۔ یعنے علم الٰہی سے باہر ہو، یا اُس نے جو قوانین خلقت ٹھہرا دیے ہیں، اُن کے احاطے سے باہر ہو۔

احکام و قوانین کا شاہی فرمانوں میں لکھ دینا اور شاہی دفاتر میں درج کر دینا، دنیا کی نہایت پرانی رسم ہے۔ اس لیے تقریباً تمام زبانوں میں کسی بات کے لکھ دینے کا مطلب یہ ہو گیا ہے کہ بات پکی ہو گئی اور اب اس میں ردّ و بدل کی گنجائش نہیں۔ باہمی عہد و پیمان بھی لکھے جاتے تھے، اور جب لکھ دیے گئے، تو سمجھا جاتا تھا، اب ان کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ عربی میں بھی یہ تعبیر قدیم سے موجود ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے، قرآن نے بھی اسی معنی میں یہ تعبیر اختیار کی ہے۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ ہم جزم و یقین کے ساتھ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے، اور عالم غیب کے حقائق ہماری عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔

(۳۳) آیت (۶۲) کی تشریح آخری نوٹ میں ملے گی۔

(۳۴) قرآن کا عام اسلوب خطاب یہ ہے کہ پہلے وجدانی دلائل بیان کرتا ہے، پھر واقعات و ایام کے شواہد سے استدلال کرتا ہے۔ آیت (۶۹) میں تمام پچھلے مواعظ کا خلاصہ بیان کر دیا کہ مفتری علی اللہ فلاح نہیں پا سکتا۔ پھر آیت (۷۱) میں فرمایا، انہیں حضرت نوح کی سرگذشت سناؤ۔ یعنے حضرت نوح اور ان کی قوم کا معاملہ اس حقیقت کے لیے ایک شاہد و حجت ہے۔ ان کا

یہ کہتے ہیں۔ اللہ نے اپنا ایک بیٹا بنا رکھا ہے۔ اُس کے لیے تقدیس ہو! وہ تو (اس طرح کی تمام احتیاجوں سے) بے نیاز ہے۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اُسی کے لیے ہے۔ تمہارے پاس ایسی بات کہنے کے لیے کونسی دلیل آگئی؟ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟

(اے پیغمبر!) تم کہو۔ جو لوگ اللہ پر بہتان باندھتے ہیں، وہ کبھی فلاح پانے والے نہیں! ان کے لیے صرف دنیا ہی کی متاع ہے۔ پھر (آخر کار) ہماری طرف لوٹنا ہے۔ تب ہم انہیں عذابِ سخت کا مزہ چکھائیں گے کہ جیسی کچھ کفر کی باتیں کرتے رہے ہیں، اُس کا نتیجہ پا لیں!

اور (اے پیغمبر!) انہیں نوح کا حال سناؤ۔ جب ایسا ہوا تھا کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا تھا "اے میری قوم! اگر تم پر یہ بات شاق گذرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لیے) کھڑا ہوں اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ پند و نصیحت کرتا ہوں تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میری خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو، اُسے ٹھان لو، اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو، اُسے اچھی طرح سمجھ بوجھ لو کہ کوئی پہلو نظر سے رہ نہ جائے، پھر جو کچھ میرے

اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ○ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ ۷۱
اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا ۷۲
الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ ○ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰی ۷۳
قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ

خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو (اور دیکھو، آخر کار کیا نتیجہ نکلتا ہے!)" ۷۱

"پھر اگر (اس پر بھی تم باز نہ آئے، اور) مجھ سے روگردانی کی، تو (یاد رکھو، اپنا ہی نقصان کروگے) میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس کے لیے تم سے کسی مزدوری کا طلبگار نہیں ہوا تھا۔ میری مزدوری تو اللہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں۔ مجھے (اُسی کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے کہ اس کے فرمانبردار بندوں کے گروہ میں شامل رہوں!" ۷۲

اس پر بھی لوگوں نے اُسے جھٹلایا پس ہم نے اُسے اور ان لوگوں کو جو اُس کے ساتھ کشتی میں سوار تھے (طوفان سے) بچا لیا، اور (غرق شدہ قوم کا) جانشین بنایا، اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں، اُن سب کو غرق کر دیا۔ تو دیکھو، ان لوگوں کا حشر کیسا ہوا جو (انکار و سرکشی کے نتائج سے) خبردار کر دیے گئے تھے؟ ۷۳

پھر نوح کے بعد ہم نے (کتنے ہی) رسولوں کو اُن کی قوموں میں پیدا کیا۔ وہ اُن کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے تھے، اس پر بھی اُن کی قومیں طیار نہ تھیں کہ جو بات پہلے جھٹلا چکی ہیں، اُسے (دلیلیں دیکھ کر) مان لیں۔ سو دیکھو، جو لوگ (سرکشی و فساد میں) حد سے گزر جاتے ہیں، ہم اسی طرح اُن کے دلوں پر مہر لگا دیتے

اعلان بھی یہی تھا کہ تم میری مخالفت میں جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو۔ اگر میں صادق ہوں، تو تمہاری کوئی کوشش میرے خلاف کامیاب نہیں ہوسکے گی۔ نتیجہ نے فیصلہ کر دیا کہ کون صادق تھا، اور کون خدا کی سچائی جھٹلانے والا تھا۔

(۳۵) آیت (۷۱) جو اوپر گزر چکی ہے، انبیاء کرام کی صداقت کی ایک بہت بڑی دلیل واضح کرتی ہے۔ یعنے وہ کامل یقین جو اپنے مرسل من اللہ اور صادق ہونے کا اُن کے اندر موجود ہوتا ہے۔ حضرت نوح نے کہا، اگر تم پر میری دعوت و تذکیر گراں گزرتی ہے اور مجھے اپنے بیان میں جھوٹا سمجھتے ہو، تو جو کچھ بھی تم میرے خلاف کر سکتے ہو، زیادہ سے زیادہ کوشش، اور زیادہ سے زیادہ اہتمام کے ساتھ کر گزرو۔ تم سب جمع ہو، باہم گر مشورے کرو، بہتر سے بہتر تدبیریں جو میرے مٹانے کے لیے سوچی جا سکتی ہیں، سوچ لو۔ معاملہ کا کوئی پہلو ایسا نہ رہ جائے جس کا پہلے سے بندوبست نہ کر لیا ہو۔ پھر پورے عزم و ہمت کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہو، اور اپنے جانتے بھر ذرا بھی مہلت نہ دو۔ پھر یہ سب کچھ کر کے دیکھ لو۔ تم مجھے اور میری دعوت کو مٹا سکتے ہو یا نہیں!

کیا ممکن ہے کہ محض بناوٹ اور افترا پردازی کی زندگی کو ایسا یقین مل سکے؟ کیا ممکن ہے کہ ایک فرد واحد پوری قوم کو اس طرح مقابلہ کی دعوت دے، اور اُس کے دل میں ذرا بھی کھٹک موجود ہو کہ اپنے بیان میں سچا نہیں؟

(۳۶) حضرت نوح کے ذکر کے بعد فرمایا، اُن کے بعد بہت سے رسول مختلف قوموں میں مبعوث ہوئے اور ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ پھر حضرت موسیٰ کے تذکرہ میں تفصیل کی۔ کیونکہ اہل عرب ان کے نام سے ناآشنا نہ تھے۔

حضرت نوح کے ذکر میں بھی اور حضرت موسیٰ کے حالات میں بھی صرف اُنہی پہلوؤں پر زور دیا ہے جو سورت کی موعظت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنے:

الْمُعْتَدِينَ ○ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا
وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ ○ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُبِينٌ ○ قَالَ
مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ ۖ أَسِحْرٌ هَٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ ○ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا
عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ ○ وَ
قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ○ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ○
فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ○ وَيُحِقُّ اللَّهُ

ہیں!

پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون کو بھیجا۔ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف۔ وہ ہماری نشانیاں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مگر فرعون اور اس کے درباریوں نے گھمنڈ کیا۔ اُن کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا!

پھر جب ہماری جانب سے سچائی اُن پر نمودار ہو گئی، تو کہنے لگے "یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جادو ہے۔ صریح جادو"

موسیٰ نے کہا "تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہو گئی، ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو کبھی کامیابی نہیں پا سکتے"

اُنہوں نے (جواب میں) کہا "کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے۔ اُس سے ہمیں ہٹا دو، اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لیے سرداری ہو جائے! ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں"

اور فرعون نے کہا "میری مملکت میں جتنے ماہر جادوگر ہیں، سب کو میرے حضور حاضر کرو"

جب جادوگر آموجود ہوئے۔ (اور مقابلہ کا میدان گرم ہوا) تو موسیٰ نے کہا "تمہیں جو کچھ میدان میں ڈالنا ہے، ڈال دو"

جب اُنہوں نے (اپنی جادو کی رسیاں اور لاٹھیاں) ڈال دیں، تو موسیٰ نے کہا "تم جو کچھ بنا کر لائے ہو، یہ جادو ہے اور یقیناً اللہ اسے ملیامیٹ کر دیگا۔ اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ مفسدوں کا کام نہیں سنوارتا۔ وہ حق کو اپنے احکام کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائیگا

(ز) مفتری علی اللہ فلاح نہیں پا سکتا۔
(ب) وہ جو صادق کا مقابلہ کرے۔ یعنے اللہ کے رسول کا مقابلہ کرے۔
(ج) ہدایت ایسی چیز نہیں ہے کہ زبردستی کسی کو پلا دو۔ جو ماننے والے نہیں، وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ خواہ کتنی ہی نشانیاں دکھلاؤ۔ ایسا ہی ہمیشہ ہوا ہے، اور اب بھی ہوگا۔

(۳۷) حضرت موسیٰ نے کہا تم حق کی نشانیوں کو جادو کہتے ہو حالانکہ جو جادوگر ہو، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جادو انسان کی بناوٹ اور شعبدہ طرازی ہے، اور ایک انسان اپنی بناوٹوں اور کرتبوں میں کتنا ہی ہشیار ہو، لیکن حق کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹک سکتا۔

(۳۸) الحق "حق" سے ہے، اور عربی میں "حق" کا لغوی خاص

ٱلْحَقَّ بِكَلِمٰتِهِۦ وَلَوْ كَرِهَ ٱلْمُجْرِمُونَ ۝ ٨٢ فَمَآ ءَامَنَ لِمُوسَىٰٓ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِۦ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَإِيْهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ ۚ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى ٱلْأَرْضِ وَإِنَّهُۥ لَمِنَ ٱلْمُسْرِفِينَ ۝ ٨٣ وَقَالَ مُوسَىٰ يٰقَوْمِ إِن كُنتُمْ ءَامَنتُم بِٱللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوٓا۟ إِن كُنتُم مُّسْلِمِينَ ۝ ٨٤ فَقَالُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ ٱلظّٰلِمِينَ ۝ ٨٥ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ ٱلْقَوْمِ ٱلْكٰفِرِينَ ۝ ٨٦ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَن تَبَوَّءَا لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَٱجْعَلُوا۟

ثبوت اور قیام ہے۔ یعنے جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، اَمٹ ہو، اُسکو "حق" کہتے ہیں۔ اور "باطل" ٹھیک ٹھیک اس کا نقیض ہے یعنے ایسی بات جو مٹ جانے والی اور باقی نہ رہنے والی ہو۔ پس قرآن نے سچائی کو حق سے اور انکار کو باطل سے تعبیر کرکے یہ بات واضح کردی ہے کہ سچائی کا خاصہ ثبوت و قیام ہے، اور انکار و سرکشی کے لیے نہ ٹک سکنا اور مٹ جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جابجا اس طرح کی تعبیرات ہمیں ملتی ہیں کہ خدا حق کو حق کر دیگا اور باطل کو باطل یعنے حق ثابت و قائم رہ کر اپنی حقانیت آشکارا کر دیگا، اور باطل نابود ہو کر اپنے بطلان کا ثبوت دے دیگا۔ مثلاً سورۂ انفال کی آیت (۸) میں گذر چکا ہے۔ لیحق الحق ویبطل الباطل۔ اور یہاں بھی آیت (۸۲) میں ایسی ہی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ تعبیر قرآن کے دقائق براہین میں سے ہے۔ جس کی تشریح تفسیر سورۂ فاتحہ میں دیکھنی چاہیے۔

(۳۹) آیت (۸۳) میں اُن لوگوں کو جو ایمان لائے "ذریۃ من قومہ" سے تعبیر فرمایا ہے۔ "ذریۃ" کے اصلی معنی کم سن اولاد کے ہیں، لیکن نسل و اولاد کے معنوں میں مطلقاً بھی بولا جاتا ہے یہاں چونکہ قوم کے ساتھ ذریۃ کا لفظ آیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ لغوی معنوں ہی میں آیا ہو۔ یعنے قوم بنی اسرائیل کے کم سن افراد۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کبھی مقاصد و عزائم کی راہ میں شدائد دشمن کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو قوم کے بڑے بوڑھوں سے بہت کم اُمید کی جا سکتی ہے۔ زیادہ تر نئی نسل کے نوجوان ہی آگے بڑھتے ہیں۔ کیونکہ بڑے بوڑھوں کی ساری زندگیاں ظلم و فساد کی آب و ہوا میں بسر ہو چکی ہیں، اور محکومی کی حالت میں رہتے رہتے عافیت کوشی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ البتہ نوجوانوں میں نیا دماغ ہوتا ہے، نیا خون ہوتا ہے، نئی اُمنگیں ہوتی ہیں۔ اُنہیں شدائد دشمن کا خوف مرعوب نہیں کر دیتا۔ وہی پہلے قدم اُٹھاتے ہیں۔ پھر تمام قوم اُن کے پیچھے چلنے لگتی ہے۔

٨٢ اگرچہ اُن لوگوں کو جو مجرم ہیں، ایسا ہونا پسند نہ آئے"

٨٣ تو دیکھو، اس پر بھی ایسا ہوا کہ موسیٰ پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک گروہ، جو اُس کی قوم کے نوجوانوں کا گروہ تھا۔ وہ بھی فرعون اور اُس کے سرداروں سے ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دیں، اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش (بادشاہ) تھا، اور اس میں بھی شک نہیں کہ (ظلم و استبداد میں) بالکل چھوٹ تھا۔

٨٤ اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے ہو اور اُس کی فرمانبرداری کرنی چاہتے ہو، تو چاہیے کہ صرف اُسی پر بھروسہ کرو (اور فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو")

٨٥ انہوں نے کہا "ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا (ہم دعا کرتے ہیں کہ) پروردگار! ہمیں اس ظالم گروہ کے لیے آزمایشوں کا موجب نہ بنائیو (کہ اُس کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں کمزوری دکھائیں) اور اپنی رحمت سے ایسا کیجیو کہ اس کافر گروہ کے پنجہ سے نجات پا جائیں!"

٨٦ اور ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی (ہارون) پر وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں مکان بناؤ، اور اپنے

بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ ۸۷
زِينَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ
عَلٰى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيمَ ۝ قَالَ قَدْ اُجِيبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا ۸۸
وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَجٰوَزْنَا بِبَنِىٓ اِسْرَآءِيلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهٗ ۸۹
بَغْيًا وَّعَدْوًا ۗ حَتّٰىٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِىٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوٓا اِسْرَآءِيلَ
وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ ۹۰-۹۱
لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۚ

مکانوں کو قبلہ رُخ تعمیر کرو نیز (ان میں) نماز قائم کرو، اور جو ایمان لائے ہیں، انہیں (کامیابی) کی بشارت دو۔ ۸۷

مصر میں حضرت موسیٰ کو ایسی ہی صورت پیش آئی۔ فرعون کے ظلم و استبداد نے بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں کی ہمتیں سلب کر دی تھیں۔ وہ شکر گزار ہونے کی جگہ الٹی شکایتیں کرتے لیکن نوجوانوں کا یہ حال نہ تھا۔ ان میں ایک گروہ نکل آیا، جس نے حضرت موسیٰ کے احکام کی تعمیل کی۔

اور موسیٰ نے دعا مانگی "خدایا! تو نے فرعون اور اُس کے سرداروں کو اس دنیائی زندگی میں زیب و زینت کی چیزیں اور مال و دولت کی شوکتیں بخشی ہیں، تو خدایا! کیا یہ اس لیے ہے کہ تیری راہ سے یہ لوگوں کو بھٹکائیں! خدایا! اِن کی دولت زائل کر دے اور اُن کے دلوں پر مُہر لگا دے کہ اُس وقت تک یقین نہ کریں جب تک عذاب دردناک اپنے سامنے نہ دیکھ لیں!" ۸۸

اللہ نے فرمایا "میں نے تم دونوں کی دعا قبول کی۔ تو اب تم (اپنی راہ میں) جم کر کھڑے ہو جاؤ اور اُن لوگوں کی پیروی نہ کرو جو (میرا طریقِ کار) نہیں جانتے" (اور اس لیے صبر نہیں کر سکتے) ۸۹

اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اُتار دیا۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اُس کے لشکر نے پیچھا کیا مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں لیکن جب حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا، تو اُس وقت پکار اُٹھا "میں یقین کرتا ہوں کہ اُس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں، اور میں بھی اسی کے فرمانبرداروں میں ہوں!" ۹۰

(ہم نے کہا) "ہاں، اب تو ایمان لایا، حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا، اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا!" ۹۱

پس آج ہم ایسا کرینگے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچا لینگے، تاکہ اُن لوگوں کے لیے جو تیرے

(۱۰۳) آیت (۹۲) کا مضمون بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے نیز مشیتِ الٰہی کا یہ فیصلہ کہ فرعون کے جسم کو غرق ہونے سے نجات

وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝ ۹۲ وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ ۹۳ فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ فَسْئَلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ ۹۴ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ ۹۵

دی جائیگی تاکہ آنے والی قوموں کے لیے قدرتِ حق کی نشانی ہو۔ اور اسی لیے قدیم مفسرین کو حلِ مطلب میں مشکلات پیش آئیں لیکن اگر دقتِ نظر سے کام لیا جائے، تو مطلب بالکل واضح ہے۔

قدیم مصریوں میں حنوط کا طریقہ رائج تھا۔ یعنے بادشاہوں اور امیروں کی نعشیں ایک خاص طرح کا مصالحہ لگا کر ایک عرصہ تک کے لیے محفوظ کر دیتے تھے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے اوائل سے لے کر اس وقت تک بے شمار نعشیں مصر میں نکل چکی ہیں، اور دنیا کا کوئی عجائب خانہ نہیں جس کے حصے میں دو چار نعشیں نہ آئی ہوں۔ اس طرح کی نعشوں کے لیے "ممی" کا لفظ یونانیوں نے استعمال کیا تھا جو غالباً خود مصریوں ہی کی اصطلاح تھی۔

آیت کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرمایا۔ تو اب موت سے تو نہیں بچ سکتا، لیکن تیرا جسم سمندر کی موجوں سے بچا لیا جائیگا، تاکہ وہ حسبِ معمول ممی کر کے رکھا جائے اور آنے والی نسلوں کے لیے عبرت و تذکیر کا موجب ہو۔

اگر مصریات (اجپٹالوجیا) کے بعض علماء کی یہ تحقیق درست ہے کہ یہ فرعون رعمسیس ثانی تھا، تو اس کا بدن آج تک زائل نہیں ہوا ہے، کیونکہ اس کی ممی نکل آئی ہے، اور قاہرہ کے دار الآثار میں صحیح و سالم موجود ہے!

اس سلسلہ میں متعدد امور بحث طلب ہیں جن کے لیے البیان کا انتظار کرنا چاہیے۔

(۹۴) قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے کہ مومنوں سے خطاب مقصود ہوتا ہے، لیکن مخاطب پیغمبر اسلام کو کرتا ہے۔ مثلاً یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء (۶۵:۱) پس یہاں بھی آیت (۹۴) میں اگرچہ خطاب پیغمبر اسلام سے ہے، مگر مقصود مومنوں کی وہ ابتدائی جماعت ہے جو آغاز دعوت کی بے چارگی و مظلومی میں ایمان لائی تھی

بعد آنے والے ہیں، (قدرتِ حق کی) ایک نشانی ہو، اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں! ۹۲

اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اپنے وعدہ کے مطابق فلسطین میں) بسنے کا بہت اچھا ٹھکانا دیا تھا، اور پاکیزہ چیزوں سے اُن کی روزی کا سامان کر دیا تھا۔ پھر جب کبھی انہوں نے (دینِ حق کے بارے میں) اختلاف کیا، تو علم کی روشنی ضرور اُن پر نمودار ہوگئی (یعنے اِن میں یکے بعد دیگرے نبی مبعوث ہوتے رہے لیکن پھر بھی وہ حقیقت پر متفق نہ ہوئے) قیامت کے دن تمہارا پروردگار اُن کے درمیان اُن باتوں کا فیصلہ کر دیگا جن میں باہم اختلاف کرتے رہے ہیں! (یعنے انہیں معلوم ہو جائیگا کہ حقیقتِ حال کیا تھی) ۹۳

اور اگر تمہیں اس بات میں کسی طرح کا شک ہو جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے، تو اُن لوگوں سے پوچھ لو جو تمہارے زمانے سے پہلے کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں (یعنے اہلِ کتاب) کہ یقیناً یہ سچائی ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر اتری ہے، تو ہرگز ایسا نہ کرنا کہ شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ ۹۴ اور نہ اُن لوگوں میں سے، جنہوں نے اللہ کی نشانیاں جھٹلائیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ نامراد ہوئے! ۹۵

۹۶ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ ۹۷ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝ ۹۸ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ۝ ۹۹ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا

---

۹۶ (اے پیغمبر!) جن لوگوں پر اللہ کا فرمان صادق آگیا ہے (یعنے اُس کا یہ قانون کہ جو آنکھیں بند کریگا، اُسے کچھ نظر نہیں آئیگا) وہ کبھی ایمان نہیں لائینگے۔ اگر (دنیا جہان کی) ساری نشانیاں بھی اُن کے سامنے ۹۷ آجائیں، جب بھی نہ مانیں، یہاں تک کہ عذاب دردناک اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں!

۹۸ پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ (نزول عذاب سے پہلے) یقین کرلیتی، اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اُٹھاتی؟ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی، تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب اُس پر سے ٹال دیا، جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا، اور ایک خاص مدت تک سروسامان زندگی سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دیدی۔

۹۹ اور (اے پیغمبر!) اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے (اور دنیا میں اعتقاد و عمل کا اختلاف باقی ہی نہ رہتا) لیکن تو دیکھ رہا ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا، اُس کی مشیت یہی ہوئی کہ طرح طرح کی طبیعتیں اور طرح طرح کی استعدادیں ظہور میں آئیں پھر اگر لوگ نہیں مانتے تو) کیا تو اُن پر جبر کریگا، کہ جب تک ایمان نہ لاویں چھوڑنے والا نہیں؟

اور (یاد رکھو) کسی جان کے اختیار میں نہیں ہے

(۴۴) آیت (۹۸) میں حضرت یونس کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا عبرانی نام "یوناہ" تھا عربی میں "یونس" ہوگیا۔ یہ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ہیں، اور عہد عتیق کے نوشتوں میں ایک نوشتہ ان کے نام سے بھی ہے۔ اس نوشتہ سے معلوم ہوتا ہے، اُنہوں نے باشندگان نینوا کو خبر دی تھی کہ چالیس دن کے بعد شہر تباہ ہوجائیگا، کیونکہ تمہارا ظلم و فساد حد سے گزر گیا ہے۔ لیکن کہ اُنہوں نے سرکشی نہیں کی، بلکہ بادشاہ سے لے کر گڈریے تک سب توبہ و استغفار میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس دن کی مدت گزر گئی مگر موعودہ تباہی ظہور میں نہ آئی۔ فرمایا۔ موعودہ عذاب اُن پر سے اس لیے ٹل گیا کہ بات مان لی اور سرکشی نہیں کی۔ اس کے بعد فرمایا۔ ایک خاص مدت تک کے لیے اُنہیں مہلت دیدی گئی۔ چنانچہ حضرت یوناہ کے بعد تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح میں اُن کا ظلم و فساد پھر حد سے گزر گیا، اور ایک اور اسرائیلی نبی ناحوم نامی نے اُنہیں پیش آنے والی تباہی کی خبر دی۔ اس انذار کے ستر برس بعد اہل بابل نے اُن پر حملہ کیا۔ ساتھ ہی دجلہ میں اس زور کا سیلاب آیا کہ نینوا کی مشہور عالم چار دیواری جابجا سے گرگئی اور حملہ آوروں کے لیے کوئی روک باقی نہ رہی چنانچہ آشوری تمدن کا یہ مرکز اس طرح نابود ہوا کہ ۶۰۶ قبل مسیح میں اُس کا جائے وقوع بھی لوگوں کو معلوم نہ تھا جیسا کہ اُس عہد کے ایک یونانی مورخ نے تصریح کی ہے!

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل مکہ انکار و سرکشی کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ کتنے ہی رسول عرب کے قرب و جوار میں آئے، لیکن قوم یونس کے سوا کوئی قوم

بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ ۱۰۰
وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ۝ فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ ۱۰۱
قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِينَ ۝ ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ اٰمَنُوا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا ۱۰۲

نکلی جس نے داعیٔ حق کی بات فوراً مان لی ہو، اور عذاب اُس پر سے ٹل گیا ہو۔ پھر اگر اکثر حالتوں میں ایسا ہی ہوا ہے، تو موجودہ حالت پر تعجب و مایوسی کیوں ہو؟

(۳۴) قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسانی طبیعت و استعداد کا اختلاف فطری ہے، اور خدا کی مشیت یہی ہوئی کہ یہ اختلاف ظہور میں آئے۔ اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طرح کی طبیعت ایک ہی طرح کی استعداد، ایک ہی طرح کی فکری و عملی حالت پر مجبور کر دیتا، مگر اُس نے ایسا نہیں چاہا۔ اُسکی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان میں ہر طرح کی حالت پیدا کرنے کی استعداد ہو، اور ہر طرح کی راہ اس کے آگے کھول دی جائے وہ اگر اونچا ہونا چاہے، تو زیادہ سے زیادہ اونچا ہو سکے پست ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ پستی میں گر سکے۔ اسی تنوع استعداد کا نتیجہ ہے کہ فکر و عمل کے ہر گوشے میں مختلف حالتیں پیدا ہو گئیں ایک فرد و جماعت کا ذوق ایک طرح کا ہوا، دوسرے کا دوسری طرح کا۔ ایک کی سمجھ ایک طرف گئی، دوسرے کی دوسری طرف ایک نے ایک راہ پسند کی کہ حق ہے۔ دوسرے نے اسی سے انکار کیا کہ حق نہیں! اور پھر اسی اختلافِ فکر و عمل نے ہدایت و سعادت اور ضلالت و شقاوت کی وہ کشمکش پیدا کر دی جسے قرآن "ازمایشِ حیات" سے تعبیر کرتا ہے کہ "لیبلوکم ایکم احسن عملا" (۶۷:۲) وہ تمہیں کشمکشِ حیات کی آزمایش میں ڈالتا ہے تاکہ کھل جائے، تم میں کون ہے جس کے اعمال سب سے زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کشمکش میں کامیاب وہی ہو گا جو اپنے عمل میں احسن و انفع ہوگا۔

یہاں آیت (۹۹) میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اور غور کرو۔ کتنے مختصر لفظوں میں کتنی عظیم الشان بات کہہ دی ہے؟ فرمایا۔ فکر و استعداد کا اختلاف یہاں ناگزیر ہے، اور ایمان کوئی ایسی چیز نہیں کہ زور زبردستی سے کسی کے اندر ٹھونس دی جائے۔ یہ تو اُسی کے اندر پیدا ہوگا، جس میں فہم و قبول کی استعداد ہے۔ پھر اگر تم پر یہ بات شاق گزر رہی ہے کہ کیوں لوگ مان نہیں لیتے، تو کیا تم لوگوں پر جبر کرو گے کہ نہیں، تمہیں ضرور

کر (کسی بات پر) یقین لے آئے، مگر یہ کہ اللہ کے حکم سے (یعنے اللہ نے اس بارے میں جو قانونِ طبیعت بنا دیا ہے، اُس کے اندر رہ کر۔ اُس سے باہر کوئی نہیں جا سکتا) اور (اُس کا قانون ہے کہ) وہ اُن لوگوں کو (محرومی و شقاوت کی) گندگی میں چھوڑ دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے! ۱۰۰

(اے پیغمبر!) تم ان لوگوں سے کہو "جو کچھ آسمان میں (تمہارے اوپر) ہے اور جو کچھ زمین میں (تمہارے چاروں طرف) ہے، اس سب پر نظر ڈالو (اور دیکھو، وہ زبانِ حال سے کس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں!)" لیکن جو لوگ یقین نہیں رکھتے، اُن کے لیے نہ تو (قدرت کی) نشانیاں ہی کچھ سود مند ہیں، نہ (ہشیار کرنے والوں کی) تنبیہیں! ۱۰۱

پھر اگر یہ لوگ منتظر ہیں، تو ان کا انتظار اس بات کے سوا اور کس بات کے لیے ہو سکتا ہے کہ جیسے کچھ (عذاب کے) دن ان سے پہلے لوگوں پر گزر چکے ہیں، ویسے ہی اُن پر بھی آموجود ہوں۔ تو تم کہہ دو "اچھا، انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں!" ۱۰۲

پھر (جب عذاب کی گھڑی آجاتی ہے تو ہمارا قانون ہے کہ) اپنے رسولوں کو اور مومنوں کو اس سے بچا لیتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے اپنے اوپر ضروری ٹھہرا

عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَآ أَعْبُدُ الَّذِينَ (۱۰۳)
تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّىٰكُمْ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۰۴)
وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ (۱۰۵)
مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّٰلِمِينَ ۝ وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ (۱۰۶)
فَلَا كَاشِفَ لَهُۥٓ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهِۦ ۚ يُصِيبُ بِهِۦ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ۚ
وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ قُلْ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ (۱۰۷)

لیا ہے کہ مومنوں کو بچا لیا کریں!

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو: "اے لوگو! اگر تم میرے دین کے بارے میں کسی طرح کے شبہ میں ہو، تو میں بتلا دیتا ہوں کہ میرا طریقہ کیا ہے۔ تم اللہ کے سوا جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو، میں اُن کی بندگی نہیں کرتا۔ میں تو اللہ کی بندگی کرتا ہوں، جس کے قبضہ میں تمہاری زندگی ہے، اور جس کے حکم سے تم پر موت طاری ہوتی ہے۔ اور مجھے اسی کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ مومنوں کے زمرے میں رہوں" (۱۰۴)

"اور نیز مجھے کہا گیا ہے کہ ہر طرف سے ہٹ کر اپنا رُخ اللہ کے دین کی طرف کرلے، اور ایسا ہرگز نہ کیجو کہ شرک کرنے والوں میں سے ہو جائے!" (۱۰۵)

"اور (مجھے حکم دیا ہے کہ) اللہ کے سوا کسی کو نہ پکار۔ اُس کے سوا جو کوئی ہے، وہ نہ تو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اگر تو نے ایسا کیا تو پھر یقیناً تو بھی ظلم کرنے والوں میں گنا جائیگا!" (۱۰۶)

"اور اگر اللہ کے حکم سے تجھے کوئی دُکھ پہنچے، تو جان لے کہ اُسے دور کرنے والا کوئی نہیں مگر اُسی کی ذات۔ اگر وہ تجھے کسی طرح کی خوبی بخشنی چاہے، تو جان لے کہ کوئی نہیں جو اُس کا فضل روک سکے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے، اپنا فضل کر دے۔ وہ بخشنے والا، رحمت والا ہے!" (۱۰۷)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہدو کہ "اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی تمہارے پاس

مان ہی لینا چاہیے؟

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ قرآن کے نزدیک دین و ایمان کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں جبر و اکراہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جبر و اکراہ کی صورت کا ذکر ایک اَن ہونی اور ناممکن بات کی طرح کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵۶) اس بارے میں قرآن کا مقررہ قانون ہے کہ لا اکراہ فی الدین۔

(۴۴) آیت (۱۰۴) کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے میری دعوت دین کی حقیقت ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھی ہے، اور اس وہم میں مبتلا ہو کہ شاید تمہارے مطلب کی باتیں بھی تھوڑی بہت مان لوں، تو یہ وہم اپنے دماغ سے نکال دو۔ میرا اعلان صاف صاف یہ ہے کہ میں تمہارے گڑھے ہوئے معبودوں کو نہیں مانتا، صرف پروردگار عالم کی عبادت کرتا، اور اُسی کی طرف سے دعوت دینے پر مامور ہوں۔ اب اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد جو کچھ تمہارے جی میں آئے کرو۔ میری راہ میرے لیے ہے، تمہاری تمہارے لیے، اور فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے!

(۴۵) قرآن حکیم میں تم جا بجا اس طرح کا اعلان پاؤ گے جیسا کہ آیت (۱۰۸) میں ہے۔ اس نے پچھلے نبیوں کے جو مواعظ

۱۰۸ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۞

۱۰۹ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۞ ع ۱۱

نقل کیے ہیں، انہیں بھی ہر جگہ ایسی ہی بات پائی جاتی ہے۔ نیز یہی صداقت کی دعوت کا معاملہ سرتاسر سمجھنے بوجھنے اور سمجھ بوجھ کر اختیار کر لینے کا معاملہ ہے۔ اس میں نہ تو کسی طرح کی زبردستی ہے، نہ کسی طرح کا لڑائی جھگڑا۔ تمہاری بھلائی کے لیے ایک بات کہی گئی ہے۔ اگر سمجھ میں آجائے تو مان لو۔ نہ آئے، تو نہ مانو تمہاری راہ تمہارے لیے۔ ہماری راہ ہمارے لیے۔ اگر مان لوگے تو اپنا ہی بھلا کروگے۔ نہ مانوگے تو اپنا ہی نقصان کروگے۔ ہر شخص اپنے نفس کا مختار ہے۔ چاہے، بھلائی کی راہ چلے اور بھلائی کمائے۔ چاہے بُرائی کی چال چلے اور بُرائی کمائے۔ اگر کوئی بھلائی کی راہ چلیگا تو کسی دوسرے کو کچھ نہیں دیدیگا کہ وہ اُس کے پیچھے پڑ جائے۔ اگر بُرائی کی چال چلیگا تو کسی دوسرے کا نقصان نہیں کردیگا کہ وہ اُس سے بگڑنے لگے۔ اپنی اپنی راہ ہے اور اپنی اپنی کمائی: من عمل صالحا، فلنفسہ، ومن اساء فعلیھا، وما ربك بظلام للعبید (۴۱: ۴۶)

آگئی ہے۔ پس جو ہدایت کی راہ اختیار کریگا، تو اپنے ہی بھلے کے لیے کریگا، اور جو بھٹکیگا، تو اُس کی گمراہی اُسی کے آگے آئیگی۔ میں تم پر نگہبان نہیں ہوں (کہ زبردستی کسی راہ میں کھینچ لیجاؤں اور پھر اُس سے نکلنے نہ دوں)

(اے پیغمبر!) جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے، اُس پر چلتے رہو، اور اپنی راہ میں جمے رہو۔ یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

تذکیر و توکیل

ساتھ ہی واضح کر دیا کہ داعی حق کی حیثیت کیا ہے: وما انا علیکم بوکیل۔ میں داعی اور مذکر ہوں۔ کچھ تم پر وکیل نہیں بنا دیا گیا ہوں۔ یعنے میرا کام یہ ہے کہ نصیحت کی بات سمجھا دوں۔ یہ نہیں ہے کہ نگہبان بن کر تم پر مسلط ہو جاؤں، اور سمجھوں مجھ تمہاری ہدایت کی ٹھیکہ داری مل گئی ہے۔ دوسری جگہ پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب یوں ادا کیا ہے کہ وما انت علیھم بجبار (۵۰: ۴۵) تو ان لوگوں پر ایک حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں ہے کہ جبراً و قہراً بات منوادے نیز فرمایا: لست علیھم بمصیطر (۸۸: ۲۲) تجھے ان لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھا دیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں، لیکن تو انہیں راہِ حق پر چلا دینے کا ذمہ دار ہو۔

نیز جا بجا مختلف پیرایوں میں یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ پیغمبر کا مقام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سچائی کی پکار بلند کرنے والا ہے، پیام حق پہنچا دینے والا ہے، نصیحت کی بات سمجھا دینے والا ہے، ایمان و عمل کے نتائج کی خوشخبری دیتا اور انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کر دیتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے سر کوئی ذمہ داری نہیں

غور کرو۔ اس سے زیادہ صاف، بے لاگ، اور امن و سلامتی کی کوئی راہ ہو سکتی ہے؟ اور اگر دنیا نے دعوتِ حق کی یہ روح سمجھ لی ہوتی تو کیا ممکن تھا کہ کوئی انسان دوسرے انسان سے محض اختلاف اعتقاد و عمل کی بنا پر لڑتا! لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان کے ظلم و سرکشی نے کبھی اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا اور یہی بات ساری نزاعوں کی بنیاد بن گئی۔ قرآن نے پچھلی دعوتوں کی جس قدر سرگزشتیں بیان کی ہیں، اُنہیں جا بجا پڑھو۔ ہر جگہ دیکھوگے کہ بنائے نزاع یہی تھی۔ خدا کے رسولوں کا ہمیشہ اعلان یہی ہوا کہ ہم نصیحت کرنے والے ہیں۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر نہیں مانتے۔ تو تم اپنی راہ چلو۔ ہمیں اپنی راہ چلنے دو، اور دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ لیکن اُن کے منکر کہتے تھے کہ نہیں، نہ تو ہم تمہاری بات مانینگے۔ نہ تمہیں تمہاری راہ چلنے دینگے۔ سورۂ اعراف کی آیت (۸۸) میں حضرت شعیب کی سرگزشت گزر چکی ہے جب ان کی قوم کے سرکشوں نے کہا "اگر تم اور تمہارے ساتھی ہماری ملت میں پھر لوٹ نہ آئے، تو ہم ضرور تمہیں اپنی بستی سے جلاوطن کر دینگے" تو اُنہوں نے جواب میں کہا "اولو کنا کارھین؟" اگر تمہارے مذہب پر ہمارا دل مطمئن نہ ہو، تو کیا جبراً اسے مان لیں؟

اسلام اور اس کے منکروں میں جو نزاع شروع ہوئی وہ بھی تمام تر یہی تھی۔ قرآن کہتا تھا۔ میری راہ تبلیغ و تذکیر کی ہے۔ مخالف

کہتے تھے ہماری راہ جبر و تشدد کی ہے۔ قرآن کہتا تھا اگر میری بات سمجھ میں آئے تو مان لو، نہ سمجھ میں آئے تو ماننے والوں کو ان کی راہ چلنے دو۔ وہ کہتے تھے، ہماری بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے تمہیں ماننی ہی چاہیے۔ نہیں مانو گے تو جبراً منوائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اس آیت میں اور اس کی ہم معنی آیات میں جو بات کہہ دی ہے، اگر دنیا اسے سمجھ لیتی تو نوعِ انسانی کی وہ تمام خوں ریزیاں جو فکر و عمل کے اختلاف سے پیدا ہوئیں، یک قلم ختم ہو جاتیں، اور آج کل بھی جس قدر جھگڑے ہو رہے ہیں، وہ سب ختم ہو جائیں۔ غور کرو سارے جھگڑوں کی اصلی بنا کیا ہے؟ یہی کہ لوگ "تذکیر" اور "توکیل" میں فرق نہیں کرتے، اور قرآن کہتا ہے دونوں میں فرق کرو۔ تذکیر کی راہ یہ ہوئی کہ جو بات ٹھیک سمجھتے ہو، اُسکی دوسروں کو بھی ترغیب دو، مگر صرف ترغیب دو، اس سے آگے نہ بڑھو۔ یعنی یہ بات نہ بھول جاؤ کہ پسند کرنے نہ کرنے کا حق دوسروں کو ہے۔ تم اس کے لیے ذمہ دار نہیں ہو۔ "توکیل" یہ ہوئی کہ داروغہ بن کر کھڑے ہو جاؤ، اور جو کوئی تم سے متفق نہ ہو اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ گویا خدا نے تمہیں لوگوں کی ہدایت و گمراہی کا ٹھیکہ دار بنا دیا ہے۔ جب قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب بھی تذکیر و تبلیغ کے اندر محدود تھا، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے مامور تھے، تو پھر ظاہر ہے کسی دوسرے انسان کے لیے وہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وکیل، مصیطر، اور جبار بن جائے؟

دراصل اعمالِ انسانی کے تمام گوشوں میں اصلی سوال حدود ہی کا ہے، اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے۔ نیز ہر بات کی جو حد ہے، اُس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔ دو حق ہیں، اور دونوں کو اپنی اپنی حدوں کے اندر رہنا چاہیے۔ ایک حق تذکیر و تبلیغ کا ہے۔ ایک پسند و قبولیت کا۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے، اُسے دوسروں کو بھی سمجھائے، لیکن اس کا حق نہیں ہے کہ دوسروں کے حق سے انکار کر دے۔ یعنی یہ بات بھلا دے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے۔ اور ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں۔

ہم نے یہاں جس بات کو "حق" سے تعبیر کیا ہے، قرآن نے اسے ہر انسان کا "فرض" قرار دیا ہے یعنی وہ کہتا ہے، جس بات کو تم سچ سمجھتے ہو، تمہارا فرض ہے کہ اُسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ اگر اس میں کوتاہی کرو گے تو خدا کے آگے جوابدہ ہو گے۔ لیکن ساتھ ہی یاد رکھو کہ فرض تذکیر و تبلیغ کا ہے۔ توکیل و اجبار کا نہیں ہے، اور جوابدہی اس میں ہے کہ تم نے تبلیغ کی یا نہیں کی۔ اس میں نہیں ہے کہ دوسروں نے مانا یا نہیں مانا۔ سورۂ اعراف کی آیت (۱۶۴) میں پڑھ چکے ہو کہ جو لوگ اصحابِ سبت کو نصیحت کرتے تھے انہوں نے کہا تھا "معذرۃ الی ربکم، ولعلھم یتقون" ہم جانتے ہیں کہ ان لوگوں کی سرکشی حد سے گزر چکی ہے، لیکن یہ جاننے پر بھی نصیحت کیے جاتے ہیں۔ تاکہ خدا کے سامنے کہہ سکیں، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا، اور اس خیال سے بھی کہ کون جانتا ہے؟ شاید باز آجائیں۔

غور کرو، قرآن نے کس درجہ صحت و عدالت کے ساتھ معاملہ کے دونوں پہلوؤں کی حفاظت کی ہے اور پھر اُن کی حد بندیوں کا خط کھینچ دیا ہے! اس نے ایک طرف تذکیر و دعوت پر زور دیا، تاکہ حق کی طلب و قیام کی روح افسردہ نہ ہو۔ دوسری طرف انسان کی شخصی آزادی بھی محفوظ کر دی کہ جبر و تشدد بے جا مداخلت نہ کر سکے۔ حد بندی کا یہی خط ہے جو یہاں صحت و اعتدال کی حالت قائم رکھتا ہے۔ اسے اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر کر دو، دونوں میں سے کوئی بات ضرور غلط ہو جائیگی۔ اگر دعوت و تذکیر کا قدم آگے بڑھیگا، اعتقاد و فکر کی شخصی آزادی باقی نہیں رہیگی۔ اگر شخصی آزادی کے مطالبہ میں بڑھ جاؤ گے، حق و عدالت کے طلب و قیام کا نظم مختل ہو جائیگا۔

قرآن کی بہت سی باتوں کی طرح اس بات کے سمجھنے میں بھی دنیا نے بہت دیر لگائی، اور تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلافِ عقائد کی بنا پر ذبح نہ کرے، اور اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" اور "توکیل" میں فرق ہے۔ اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکا اور فرانس کے اعلانِ حقوقِ انسانی سے شروع نہیں ہوئی ہے۔ اس سے بارہ سو برس پہلے شروع ہو چکی تھی!

افسوس ہے کہ خود مسلمانوں نے بھی قرآن کی یہ تعلیم پسِ پشت ڈال دی۔ اگر انہوں نے یہ بات نہ بھلائی ہوتی، تو ممکن نہ تھا کہ مختلف مذہبی فرقہ بندیاں پیدا ہوتیں، اور ہر فرقہ دوسرے فرقہ سے محض اختلافِ عقائد کی بنا پر دست و گریباں ہو جاتا۔

(۴۲) اس سورت کے بعض مقامات کی ضروری تشریحات رہ گئی ہیں۔ وہ یہاں درج کر دی جاتی ہیں:

کائنات کا چھ ایام میں پیدا ہونا

(الف) آیت (۳) میں فرمایا، تمہارا پروردگار وہی ہے جس نے آسمان و زمین چھ "ایام" میں بنائے۔ یہی بات سورۂ اعراف کی آیت (۵۴) میں گزر چکی ہے، اور اس کے نوٹ میں چھ "ایام" کا مطلب واضح کر دیا گیا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں، وہ تمام اشارات جمع کر دیں، جو آسمان و زمین کی ابتدائی پیدایش کے بارے میں جا بجا کیے گئے ہیں:

(۱) آسمان و زمین کی پیدایش ایک ایسے مادہ سے ہوئی جسے قرآن "دخان" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ ثم استوی الی السماء وھی دخان (۴۱: ۱۱) "دخان" کے معنی دھوئیں کے ہیں۔ یا ایسی بھاپ کے جو لو پر چڑھی ہوئی ہو۔

(۲) یہ مادۂ دخانیہ ابتدا میں ملا ہوا تھا۔ الگ الگ نہ تھا۔ پھر اس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جدا کر دیے گئے، اور ان سے اجرام ساویہ کی پیدائش ظہور میں آئی: ان السماوات والارض کانتا رتقا، ففتقناھما (۲۱: ۳۰)

(۳) یہ تمام کائنات بہ یک دفعہ ظہور میں نہیں آگئی بلکہ تخلیق کے مختلف دور یکے بعد دیگرے طاری ہوئے۔ یہ دور چھ تھے جیسا کہ آیت زیر بحث میں ہے۔

(۴) سات ستاروں کی تکمیل دو دوروں میں ہوئی: فقضاھن سبع سماوات فی یومین (۴۱: ۱۲)

(۵) زمین کی پیدائش دو دوروں میں ہوئی، قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ اندادا، ذالك رب العالمین (۴۱: ۹)

(۶) زمین کی سطح کی درستگی اور پہاڑوں کی نمود، اور قوت نشوونما کی تکمیل بھی دو دوروں میں ہوئی، اور اس طرح یہ چار دور ہوئے: وجعل فیھا رواسی من فوقھا، وبارك فیھا، وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام سواء للسائلین۔ (۴۱: ۱۰)

(۷) تمام اجسام حیہ (یعنے نباتات و حیوانات) کی پیدایش پانی سے ہوئی: وجعلنا من الماء کل شیء حی (۲۱: ۳۰)

(۸) انسان کے وجود پر بھی یکے بعد دیگرے مختلف حالتیں گزری ہیں: وخلقکم اطوارا (۷۱: ۱۴)

ان تمام اشارات کا حاصل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مادہ دخانی تھا، پھر اس میں انقسام ہوا یعنی بہت سے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر ہر ٹکڑے نے ایک کرہ کی شکل اختیار کر لی، اور اسی کے ایک ٹکڑے سے زمین بنی۔ پھر زمین میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوئی کہ دخانیت نے مائیت کی شکل اختیار کر لی یعنی پانی پیدا ہو گیا۔ پھر خشکی کے قطعات درست ہوئے پھر پہاڑوں کے سلسلے نمایاں ہوئے۔ پھر زندگی کا نشوونما شروع ہوا اور نباتات ظہور میں آگئیں۔

موجودہ زمانہ میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرۂ ارضی کی ابتدائی نشوونما کے جو نظریے تسلیم کر لیے گئے ہیں، یہ اشارات بظاہر ان کی تائید کرتے ہیں، اور اگر ہم چاہیں تو ان بنیادوں پر شرح و تفصیل کی بڑی بڑی عمارتیں اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ نظریے کتنے ہی مستند تسلیم کر لیے گئے ہوں، لیکن پھر نظریے ہیں، اور نظریات جزم و یقین کے ساتھ حقیقت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس سے کیا فائدہ کہ ان کی روشنی میں قرآن کے مجمل اور محتمل اشارات کی تفسیر کی جائے۔ فرض کرو، آج ہم نے دخان اور دخان کے انقسام کا مطلب اسی روشنی میں آراستہ کر دیا جو وقت کے نظریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن کل کو کیا کریں گے اگر ان نظریوں کی جگہ دوسرے نظریے پیدا ہو گئے؟ صاف بات یہی ہے کہ یہ معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے، جس کی حقیقت ہم اپنے علم و ادراک کے ذریعہ معلوم نہیں کر سکتے، اور قرآن کا مقصود ان اشارات سے تخلیق عالم کی شرح و تحقیق نہیں ہے۔ خدا کی قدرت و حکمت کی طرف انسان کو توجہ دلانا ہے۔

یاد رہے کہ پیدایش عالم کے بارے میں مفسرین نے بہت سی روایات نقل کر دی ہیں جن کی صحت ثابت نہیں اور جو تمام تر یہودیوں کے قصص و روایات سے ماخوذ ہیں۔ صحیح مسلم کی حدیث خلق اللہ التربۃ یوم السبت الخ کی نسبت بھی محققین نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ اس کا رفع مشکوک ہے اور غالباً کعب احبار سے مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اقوال جمع کر دیے ہیں۔

منازلِ قمر

(ب) آیت (۵) میں فرمایا وقدرہ منازل۔ یعنے چاند کے لیے یکے بعد دیگرے وارد ہونے کی منزلیں اندازہ کر کے ٹھہرا دیں۔ سورۂ یاسین کی آیت (۳۹) میں بھی ان منزلوں کی طرف اشارہ کیا ہے: والقمر قدرنٰہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم پس مختصراً ان منازل کا مطلب سمجھ لینا چاہیے۔

چاند زمین کے گرد گردش میں رہتا ہے، اور اپنی گردش کے فلک کو ۲۷ دن، ۷ گھنٹوں، اور ۴۳ منٹوں میں قطع کر لیتا ہے۔ اس مدت کو علمائے ہیئت چاند کے نجومی دورے یا نجومی مہینے سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ اس دورے کے ختم ہونے پر چاند پھر اُسی ستارہ کے قریب دکھائی دیتا ہے جس کے پاس سے اس کی گردش شروع ہوئی تھی۔ نیز اپنی گردش کی ہر رات میں وہ کسی نہ کسی ستارہ، یا ستاروں کے مجموعہ کے پاس ضرور پہنچ جاتا ہے اور وہ گویا اُس کی گردش کے لیے ہر روز کی ایک منزل بن گیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک خاص منزل سے سفر شروع کرتا ہے، ہر روز کی مقررہ منزل پر نمایاں ہوتا ہے اور پھر وہیں پہنچ جاتا ہے، جہاں سے زمین کا طواف شروع کیا تھا۔

اس طرح ۲۷ دن اور ۷ گھنٹے کی مدت نے ۲۸ منزلیں بنا دیں۔ جب ہم ۳۶۰ کے درجوں کو (جو کامل دور کی مقررہ مقدار ہے) ۲۸ راتوں پر تقسیم کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ چاند ہر روز تقریباً ۱۳ درجہ مسافت اپنے فلک کی طے کر لیا کرتا ہے۔ تقریباً اس لیے کہا گیا کہ حساب میں کچھ دقیقے زیادہ ہوتے ہیں۔

انسان کی نگاہ کے لیے آسمان کی کوئی چیز بھی اس درجہ نمایاں اور پُرکشش نہیں جس قدر سورج اور چاند کا طلوع و غروب ہے۔ کیونکہ یہی دو ستارے ہیں جنہوں نے بغیر کسی کاوش اور پیچیدگی کے اُسے اوقات شماری کا راز بتلا دیا۔ اُس نے دیکھا کہ سورج نکلتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے چھپ جاتا ہے۔ پس اُسے یہ اندازہ مقرر کر لینے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ یہ ایک معین وقت ہے جس میں کبھی خلل واقع نہیں ہو سکتا، اور اسے ایک دن ٹھہرا لینا چاہیے۔ پھر اس نے چاند کو دیکھا، اور فوراً معلوم کر لیا کہ اس کے طلوع و غروب کا بھی ایک خاص اندازہ مقرر ہے، وہ ایک خاص زمانہ تک دکھائی دیتا ہے۔ پھر غائب ہو جاتا ہے، اور پھر نمایاں ہو کر بڑھنے گھٹنے لگتا ہے۔ پس اوقات شماری کا دوسرا اندازہ بھی اسے معلوم ہو گیا، اور اُس نے چاند کے چھپنے اور نکلنے کی مدت کو مہینہ ٹھہرا دیا۔ یہی مطالعہ جب آگے بڑھا، تو معلوم ہوا، ہر رات چاند آسمان کے کسی نہ کسی ستارہ کے پاس دکھائی دیتا ہے، اور یہ نظام ایسا ہے جس میں کبھی فرق نہیں پڑتا۔ پس ان ستاروں سے اس کی روزانہ منزلیں بن گئیں، اور ہر منزل کے لیے کسی خاص مناسبت سے ایک نام تجویز کر دیا گیا۔

معلوم ہوتا ہے مطالعہ اور ضرورت کی یکساں حالت نے مختلف قوموں کو اس نتیجہ تک پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں ان منازل کے لیے نچھتر کا لفظ اختیار کیا گیا، اور ستائیس نچھتر قرار دیے گئے جو "اسونی" سے شروع ہوتے اور "ریوتی" پر ختم ہوتے ہیں۔ چینیوں نے بھی اٹھائیس منزلیں بنائی تھیں اور اسے "سیئو"[1] کہتے تھے۔ بابل و اشور کے باشندوں نے شاید سب سے پہلے اس کا سراغ لگایا اور مجوسیوں کی ایک مذہبی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی بھی اس سے بے خبر نہ تھے[2]۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عرب جاہلیت نے مجاور قوموں سے یہ حساب معلوم کیا، یا بطور خود اس نتیجہ تک پہنچے تھے۔ لیکن یہ قاعدہ ان میں رائج ضرور تھا اور اسے چاند کی منزلوں سے تعبیر کرتے تھے۔ علمائے اسلام نے ان منزلوں کو بطلیموس کے نقشہ مندرجہ مجسطی سے تطبیق دی تھی[3]۔ اور علمائے یورپ نے زمانۂ حال کے اسماء و علائم سے تطبیق دی ہے۔ ان منزلوں کے عربی نام حسب ذیل ہیں:

الشرطان۔ البطین۔ الثریا۔ الدبران۔ الهقعه۔ الهنعه۔ الذراع۔ النثره۔ الطرف۔ الجبهه۔ الزبره۔ الصرفه۔ العواء۔ السماک الاعزل۔ الغفر۔ الزبانی۔ الاکلیل۔ القلب۔ الشوله۔ النعائم۔ البلده۔ سعد الذابح۔ سعد بلع۔ سعد السعود۔ سعد الاخبیه۔ الفرغ الاول۔ الفرغ الثانی۔ بطن الحوت۔

الفرغ الاول اور ثانی کے لیے فرغ الدلو المقدم اور فرغ الدلو المؤخر کے نام بھی ملتے ہیں، اور بطن الحوت کو الرشا بھی کہتے ہیں۔

قرآن اور آخرت کی زندگی

(ج) ادیانِ عالم کے بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد بھی ایک زندگی ہے اور اس زندگی میں جیسے کچھ اعمال ہوں گے، ویسے ہی نتائج دوسری زندگی میں پیش آئیں گے۔ قرآن بھی

---

[1] لاطینی حروف میں اسے یوں ادا کیا ہے: Siu

[2] یعنی کتاب "بون دہش" جو ان کتابوں میں سے ہے جو ہندوستان کے پارسیوں سے دستیاب ہوئیں۔

[3] عبد الرحمٰن الصوفی نے کتاب الکواکب الصور میں اور بیرونی نے آثار الباقیہ میں انہیں ضبط کیا ہے۔ قزوینی کی عجائب المخلوقات میں بھی اس کی تفصیل ملتی ہے لیکن ناقص ہے۔

ایمان باللہ کا ایک بنیادی عقیدہ یہی مسئلہ ہے۔ البتہ اُس نے جو تعبیر اختیار کی ہے، وہ پیروانِ مذاہب کے عام تصور سے مختلف ہے۔ وہ اس گوشہ کو کائناتِ ہستی کے عالمگیر قوانینِ خلقت سے الگ نہیں قرار دیتا، بلکہ اُسی کے ماتحت لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، جس طرح دنیا میں ہر چیز کے خواص اور ہر حادثہ کے نتائج ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسانی اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں، اور یہاں مادیات کی طرح معنویات کے قوانین بھی کام کر رہے ہیں۔ پس اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہوگا، بُرے عمل کا نتیجہ بُرائی۔ (اس مقام کی تفصیل تفسیر سورۂ فاتحہ کے مبحث "الدین" میں گذر چکی ہے)۔

یہ اچھے بُرے نتائج کس شکل میں پیش آئینگے؟ قرآن کہتا ہے، نیک عمل انسان اصحابِ جنت ہیں۔ اُن کے لیے بہشتی زندگی کی خوشحالیاں ہونگی اور رضاء الٰہی کی دائمی نعمت۔ بدعمل انسان اصحابِ دوزخ ہیں۔ ان کے لیے دوزخی زندگی کی بدحالیاں ہونگی اور نعمتِ اُخروی سے محرومی۔ پھر دونوں طرح کی زندگیوں کے احوال و واردات ہیں جنہیں جابجا مختلف اسلوبوں میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس کی حقیقت کیا ہے؟

اس بارے میں ہم اپنی عقل سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ عالم ہمارے ادراک کی سرحد سے باہر ہے۔ جس مقام کا ہم ادراک نہیں کر سکتے، وہاں کے حالات کی نسبت حکم کیسے لگائیں؟ اگر لگائینگے، تو یہ ظن و گمان ہوگا، اور ظن سے یقین پیدا نہیں ہو سکتا۔

لیکن پھر اس پر ہم یقین کیوں کریں؟

اس لیے کہ ہم وجدانی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ سرحدِ محسوسات سے ماوراء بھی ایک حقیقت موجود ہے، اور اگر اس حقیقت سے انکار کر دیں، تو کائناتِ ہستی کے مسئلہ کا کوئی حل باقی نہیں رہتا، اور خود ہماری عقل کہتی ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اگر اللہ کی ہستی اور آخرت کی زندگی کا مبدء تسلیم نہیں کیا جاتا تو مسئلۂ ہستی کے سارے سوالات لاینحل ہو جاتے ہیں، لیکن جونہی یہ نقطہ تسلیم کر لیا جاتا ہے، معاً سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں اور مجہولیت کی تاریکی کی جگہ عرفان و بصیرت کی روشنی ہر طرف نمایاں ہو جاتی ہے۔ پس ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ نقطہ بناوٹی نہیں ہے۔ حقیقی ہے۔

البتہ ایک بات بالکل واضح ہے۔ جب ہم عالمِ آخرت کے احوال و واردات سنتے ہیں، تو قدرتی طور پر اُن کی وہی شکل سامنے آجاتی ہے جو اس زندگی کی محسوسات کے لحاظ سے ہو سکتی ہے۔ لیکن خود قرآن و سنت کی تصریحات نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ عالمِ آخرت کی باتوں کو اس دنیا کی باتوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے۔ مثلاً جب ہم سنتے ہیں کہ جہنم میں آگ ہوگی اور بہشت سے مقصود باغ ہے، تو ہمارے سامنے آگ کی وہی شکل آجاتی ہے جو ہمارے چولہوں میں جلا کرتی ہے، اور باغ کا وہی نقشہ کھنچ جاتا ہے جو اپنے مکان کے صحنوں میں اُگایا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ عالمِ آخرت کی آگ اس دنیا کی آگ کی طرح نہیں ہو سکتی، اور نہ وہاں کے باغ و چمن ہمارے لگائے ہوئے باغوں کی طرح ہونگے۔ سورۂ سجدہ کی آیت (۱۷) میں ہے: فلا تعلم نفس ما اُخفی لھم من قرۃ اعینٍ جزاءً بما کانوا یعملون۔ کوئی جان نہیں جانتی کہ اُس کی نیک عملیوں کی جزا میں نگاہ کا کیسا سرور پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے! اس سے معلوم ہوا کہ جنت کی راحت و سرور کی حقیقت کا ہم اس دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ نے جنت کی حقیقت یہ بتلائی ہے: لا عینٌ رأت، ولا اذنٌ سمعت، ولا خطر ببال احدٍ بشر (مسلم)۔ نہ تو کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سُنی، نہ کسی فردِ بشر کے خیال میں گزری! حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ جنت کی نعمتیں دنیا سے کوئی مشابہت نہیں رکھتیں۔ بجز اس کے کہ نام میں مشارکت ہے۔ (ابن کثیر) باقی رہی یہ بات کہ اگر عالمِ آخرت کے یہ معاملات دنیا کے معاملات کے مثل نہیں ہونگے، تو پھر ان کی حقیقت کیسی ہوگی؟ تو اس بارے میں ہماری عقلی کاوش کچھ معلوم نہیں کر سکتی۔

اصل یہ ہے کہ مادی زندگی کے احساسات و معلومات کی زنجیروں میں ہم کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے آزاد ہو کر عالمِ حقیقت کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو کچھ بتلا دیا گیا ہے، اس پر یقین کریں، اور جو کچھ نہیں پا سکتے، اُس کی کاوش میں سرگرداں نہ ہوں۔ اگر سرگرداں ہونگے تو حقیقت کا سُراغ تو نہیں ملیگا۔ البتہ نئے نئے وہموں اور گمانوں

میں مبتلا ہو جائینگے:

اے بروں از وہم و قال و قیل من ؛ خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من!

قرآن نے اسی لیے مطالب وحی کی دو قسمیں ٹھہرا دی ہیں۔ محکمات اور متشابہات۔ متشابہات کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کی حقیقت انسان نہیں پا سکتا: لا یعلم تأویلہ الا اللہ (۳: ۷) یہ اور اس طرح کے تمام معاملات جو عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ماورائے محسوسات ہیں، متشابہات کی قسم میں داخل ہیں۔ اور قرآن کہتا ہے، جو علم میں کامل ہیں، وہ ان کی کاوش میں نہیں پڑتے، بلکہ کہتے ہیں کہ امنا بہ، کلٌ من عند ربنا، وما یذکر الا اولوا الالباب! (۳: ۷)

اس سلسلہ میں چند ضروری امور ہیں جو سمجھ لینے چاہئیں:

لقاء الٰہی

(۱) قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آخرت کے معاملہ کو ہر جگہ "لقاء الٰہی" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ کے دیدار سے۔ چنانچہ جابجا اسی طرح کی تعبیرات پاؤگے "جو لوگ لقاء الٰہی کی توقع رکھتے ہیں" یعنی آخرت کی توقع رکھتے ہیں۔ یا "جن لوگوں نے لقاء الٰہی سے انکار کیا" یعنی آخرت سے انکار کیا۔ وہ کہتا ہے، مومن وہ ہے جو لقاء الٰہی کی طلب رکھتا ہے۔ کافر وہ ہے جو دنیوی زندگی ہی پر قانع ہو گیا اور لقاء الٰہی کی اس میں کوئی طلب نہیں۔ چنانچہ اس سورت کی آیت (۷) میں فرمایا "جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں اور صرف دنیوی زندگی ہی پر راضی ہو گئے ہیں، اور اس کے خلاف ان کے دل میں کوئی خلش نہیں اٹھتی، اور وہ کہ ہماری نشانیوں سے یک قلم غافل ہو گئے ہیں"

پھر جابجا مومنوں کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کی نگاہیں جمالِ الٰہی کا نظارہ کرینگی: وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ (۷۵: ۲۳) اور کافروں کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ اس نعمت سے محروم رہینگے: کلا، انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون (۸۳: ۱۵) پس ان تمام تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے آخرت کی زندگی اور اس کے نعائم کی جو حقیقت قرار دی ہے، وہ کوئی ایسی بات ہے جس کا ماحصل لقاء الٰہی ہے، اور عذاب آخرت کا معاملہ کوئی ایسا معاملہ ہے، جسے وہ محجوب رہنے سے تعبیر کرتا ہے۔

(۲) بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی نعمتوں میں ایک نعمت تو وہ ہے جسے وہ جنت کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے اور ایک اس کے علاوہ بھی ہے۔ اس دوسری نعمت کو اس نے جابجا "رضوان" سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے یہ جنتی زندگی کی نعمت سے بھی بڑی نعمت ہوگی: وعد اللہ المؤمنین والمؤمنات جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ومساکن طیبۃ فی جنات عدن ورضوان من اللہ اکبر۔ ذلک ھو الفوز العظیم (۹: ۷۲) "رضوان" سے مقصود اللہ کی خوشنودی کا اعلیٰ مرتبہ ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے، وہ کوئی ایسی نعمت ہے جس کے لیے بجز اس کے اور کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی تھی کہ اللہ کی کامل ترین رضامندی کی بخشش و نوال کہی جائے۔

تناسخ

(۳) ہندوستان میں آخرت کی زندگی اور جزاء کے لیے آواگون (تناسخ) کا عقیدہ پیدا ہوا۔ قدیم ہندو مذہب اور پیروان بودھ اور جینی، تینوں اس میں متفق ہیں۔ قدیم مصریوں کے عقائد میں بھی اس کا سراغ ملتا ہے، اور بعض حکماء یونان بھی اسی طرف گئے ہیں۔ چونکہ قرآن نے آخرت کے معاملہ کے لیے "رجوع" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یعنی وہ ہر جگہ کہتا ہے "والیہ ترجعون" تم اسی طرف لوٹائے جاؤگے، اس لیے حال میں ایک تھیاسوفسٹ مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کا عقیدۂ آخرت بھی تناسخ کے مبدء پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں، قرآن نے لوٹنے کی تعبیر اختیار کرکے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ زندگی بار بار ظہور میں آتی اور بار بار اصل مرکز کی طرف لوٹتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا استنباط کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ قرآن نے آخرت کی زندگی کو لوٹنے سے تعبیر کیا ہے، اور وہ اس معاملہ کو یوں قرار دیتا ہے، گویا ہستی انسانی کہیں سے آئی ہے، اور پھر اسی کی طرف لوٹیگی، لیکن صرف اتنی ہی بات سے تناسخ ثابت نہیں ہو جاتا۔ فلسفیانہ تناسخ کی بنیاد روح کے رجوع پر نہیں، بلکہ زندگی کے بار بار اعادۂ و گردش پر ہے، اور مذہبی تناسخ کی بنیاد یہ ہے کہ جزائے عمل کا معاملہ اسی اعادۂ و گردش سے مرتب ہوتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن میں ان دونوں عقیدوں کے لیے کوئی تصریح نہیں ملتی۔

ہدایت حواس وعقل اور اس کا استدلال

(د) آیت (۳۵) میں فرمایا: قل ھل من شرکائکم من یھدی الی الحق؟ قل اللہ یھدی للحق۔ افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع، امن لا یھدی الا ان یھدی؟ فما لکم کیف تحکمون! یعنے جن لوگوں کو تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے، اُن میں کوئی ہے جو "حق" کی طرف "ہدایت" کرتا ہو؟ یہ تو اللہ ہی کی ذات ہے جو حق کی راہ چلاتی ہے۔ اچھا تو پھر بتلاؤ، جو ہستی حق کی طرف رہنمائی کرتی ہے، وہ اس کی حقدار ہے کہ اس کے پیچھے چلیں، یا اُس کے پیچھے چلنا چاہیے جو خود اس کی محتاج ہے کہ کوئی راہ سُجھائے؟

یہ مقام قرآن کے مہمات دلائل میں سے ہے اور ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ چونکہ اس آیت میں "ہدایت" اور "حق" کے الفاظ آئے ہیں، اس لیے مفسرین نے خیال کیا، ہدایت سے مقصود ہدایتِ وحی ہے، اور حق سے مقصود دینِ حق، اور فارسی و اردو کے تمام مترجموں نے بھی انہی کی پیروی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے استدلال کی ساری حقیقت مفقود ہو گئی، اور آیت کا مطلب بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس طرح کے تمام مقامات دیکھ کر سخت حیرانی ہوتی ہے کہ متاخرین کا معیارِ نظر و مطالعہ کیوں اس درجہ پست ہو گیا تھا کہ قرآن کے صاف و صریح مطالب سے بھی آشنا نہ ہو سکے؟ علاوہ بریں یہ ظاہر ہے کہ یہاں خطاب مشرکوں سے ہے جو سرے سے وحی و دین کے منکر تھے، اور مقام استدلال کا ہے۔ پھر اگر ہدایت سے مقصود ہدایت وحی و دین ہو، تو اس میں اُن کے لیے دلیل کی بات کیا ہوئی؟ جب وہ وحی و دین کی ہدایت مانتے ہی نہ تھے، تو پھر اسی ہدایت سے اُن پر دلیل کیونکر لائی جا سکتی ہے؟ کم از کم اتنی ہی بات پر ان بزرگوں نے غور کر لیا ہوتا۔

آیت کا اسلوب کہہ رہا ہے کہ یہاں پہلے ایک بات بطور ایک مسلّمہ عقیدہ کے بیان کی گئی ہے جس سے مخاطب انکار نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا۔ پھر جب اُس کا مسلّم ہونا واضح ہو گیا، تو اسی کو بناءِ استدلال ٹھہرایا گیا۔ یعنے پہلے کہا گیا: ھل من شرکائکم من یھدی الی الحق؟ تمہارے بنائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو حق کی رہنمائی کرتا ہو؟ پھر کہا گیا: قل اللہ یھدی للحق۔ یعنے تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ہستی جو رہنمائے حق ہے، وہ اللہ ہی کی ہستی ہے۔ پھر جب یہ مسلّمہ واضح ہو گیا تو اس سے استدلال کیا گیا کہ افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع۔ پس ضروری ہے کہ یہاں ہدایت سے مقصود کوئی ایسی بات ہو جس سے مخاطبوں کو انکار کی مجال نہ تھی۔ اب اگر ہدایت کا مطلب ہدایت وحی و دین قرار دیا جاتا ہے، تو سارا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معلوم ہے کہ مخاطبوں کے لیے یہ مسلّم بات نہیں ہو سکتی۔ وہ سرے سے وحی ہی کے منکر تھے۔

اصل یہ ہے کہ ان بزرگوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی کہ قرآن میں ہدایت کا لفظ کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور اس کے مختلف مراتب و اشکال کیا کیا ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں ہدایت کا لفظ دیکھتے ہیں، اُسے ہدایت دین ہی پر محمول کر لیتے ہیں۔ اگرچہ مطلب ٹھیک نہ بیٹھتا ہو۔

بہر حال یہاں ہدایت سے مقصود ہدایت وحی نہیں ہے، بلکہ وجدان و حواس اور عقل کی ہدایت ہے۔ اور "حق" سے مقصود دینِ حق نہیں ہے بلکہ لغوی حق ہے۔ یعنے سچا راستہ۔ درست راستہ۔ قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جس طرح اللہ کی ربوبیت نے مخلوقات کو ان کے مناسب حال وجود عطا فرمایا ہے، اُسی طرح زندگی و معیشت کی راہ میں اُن کی ہدایت کا قدرتی سامان بھی کر دیا ہے۔ یہ ہدایت کیونکر ظہور میں آئی؟ اس طرح کہ ان میں وجدان و حواس کی قوتیں رکھ دی گئیں، اور انسان کو وجدان و حواس کے ساتھ جوہرِ عقل سے بھی ممتاز کیا۔ چنانچہ اس مقام کی پوری تشریح تفسیر سورۂ فاتحہ کے مبحث ہدایت میں گذر چکی ہے، اور ربنا الذی اعطیٰ کل شیء خلقہ ثم ھدیٰ (۲۰: ۵۰) اور الذی خلقنی فھو یھدین (۲۶: ۷۸) اور الذی خلق فسوی، والذی قدر فھدیٰ وغیرہ آیات میں ہدایت سے مقصود یہی ہدایت ہے۔

پس یہاں فرمایا، تم نے جن ہستیوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا لیا ہے، ان میں کوئی ہے جو زندگی و معیشت کے ٹھیک راستہ پر انسان کو چلاتا ہو؟ یعنے جو دیکھنے سُننے، سمجھنے، بوجھنے کی قوتیں بخشتا ہو؟ پھر فرمایا، تم جانتے ہو کہ یہ کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ صرف اللہ ہی کی کارفرمائی ہے۔ کیونکہ مشرکوں کو اللہ کی ہستی اور اُس کے خالق کل ہونے سے انکار نہیں تھا۔ البتہ وہ سمجھتے تھے

لہٰذا ان ہستیوں کی بھی پرستش کرنی چاہیے جو اللہ کے حضور مقرب ہیں، اور جنہیں دنیا میں علم و تصرف کی قوتیں حاصل ہوگئی ہیں۔ پھر جب یہ بات واضح ہوگئی تو فرمایا۔ جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں تو غور کرو، انسان کو پیروی اس کی کرنی چاہیے جو ہدایت کرنے والا ہے، یا اُس کی جو خود کسی دوسرے کی ہدایت کا محتاج ہے؟ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟

عدم احاطۂ علم اور تکذیب حقائق

(۵) آیت (۳۹) میں منکرین قرآن کی نسبت فرمایا: بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه ولما یأتهم تاویله۔ آیت کا مطلب ترجمہ میں واضح ہو چکا ہے۔ یہاں دو باتوں کی مزید تشریح کردی جاتی ہے:

اولاً، قرآن نے بیک وقت دونوں باتوں کی مذمت کی ہے۔ اس کی بھی کہ بغیر علم و بصیرت کے کوئی بات مان لی جائے اور اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلا دی جائے۔ چنانچہ اسی سورت کی آیت (۳۶) میں گزر چکا ہے کہ منکرین حق علم و یقین کی روشنی سے محروم ہیں۔ اُن کا سرمایۂ اعتقاد محض ظن و گمان ہے۔ اور پھر اس آیت میں فرمایا کہ جس بات کا وہ اپنے علم سے احاطہ نہ کرسکے، اُس کے جھٹلانے پر آمادہ ہوگئے۔ اگرچہ بظاہر یہ دو باتیں الگ الگ معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الحقیقت ایک ہی بات ہے، اور دونوں کی بنیاد اسی ایک اصل عظیم پر ہے کہ نہ تو ظن و گمان کی بنا پر تصدیق کرنی چاہیے نہ ظن و گمان کی بنا پر تکذیب کرنی چاہیے۔ جو کچھ کرنا چاہیے، علم و بصیرت کی بنا پر کرنا چاہیے۔

منکرین قرآن نے کونسی بات جھٹلائی تھی؟ یہ کہ انہی میں سے ایک آدمی پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہو۔ یہ بات انہیں عجیب معلوم ہوئی۔ اس لیے فوراً تکذیب پر آمادہ ہوگئے۔ قرآن کہتا ہے، تمہارے ماننے اور تمہارے جھٹلانے، دونوں کا مدار ظن و گمان پر ہے۔ تم جو باتیں مان رہے ہو، اُن کے لیے بھی تمہارے پاس کوئی علم نہیں، اور جس بات کے جھٹلانے میں اسقدر جلدی کی، اس کے لیے بھی تمہارے پاس کوئی یقین نہیں۔ حالانکہ سچائی کی راہ یہ ہے کہ جو کچھ کرو، علم و بصیرت کے ساتھ کرو محض اٹکل پر نہ چلو۔ اگر ایک شخص علم و یقین کے ساتھ ایک بات پیش کر رہا ہے، اور جتنی باتیں کسی بات کی درستگی اور صداقت کی ہوسکتی ہیں سب اس کے ساتھ ہیں، اور تمہارے پاس اُس کے خلاف ظن و گمان کے سوا کچھ نہیں، تو تمہارے لیے کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ جھٹ جھٹلانے پر آمادہ ہوجاؤ؟ اس سے پہلے آیت (۳۶) میں یہی بات کہی جاچکی ہے کہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ تم ظن کی بنا پر یقین کی دعوت جھٹلاتے ہو۔ حالانکہ ظن کا بھروسہ انسان کو یقین سے مستغنی نہیں کرسکتا!

اگر تم غور کرو گے، تو معلوم ہوجائیگا کہ انسان کی ساری فکری گمراہیوں کا اصلی سرچشمہ یہی بات ہے۔ یا تو وہ عقل و بینش سے اسقدر کورا ہوجاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے۔ یا پھر سمجھ بوجھ کا اس طرح غلط استعمال کرتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی، اُس نے فوراً جھٹلا دی۔ گویا حقیقت کے اثبات و وجود کا سارا دارومدار صرف اسی بات پر ہے کہ ایک خاص فرد کی سمجھ ادراک کرسکتی ہے یا نہیں۔ دونوں حالتیں علم و بصیرت کے خلاف ہیں، اور دونوں کا نتیجہ عقل و بینش سے محرومی اور عقلی ترقی کا فقدان ہے۔ جس عقل و بصیرت کا تقاضہ یہ ہوا کہ حقیقت اور وہم میں امتیاز کریں، وہی متقاضی ہوئی کہ کوئی بات محض اس لیے نہ جھٹلا دیں کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عقل کا پہلا تقاضہ ہمیں وہم پرستی و جہل سے روکتا ہے۔ دوسرا شک و الحاد سے۔ قرآن کہتا ہے، دونوں حالتیں یکساں طور پر جہل و کوری کی حالتیں ہیں، اور اہل علم و عرفان وہ ہیں، جو نہ تو جہل و وہم کی راہ چلتے ہیں۔ نہ شک و الحاد کی۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دو صورتیں ہیں، اور دونوں کا حکم ایک نہیں: ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو۔ ایک یہ کہ تمہاری عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ایسی ہوسکتی ہیں جن کا تمہاری سمجھ احاطہ نہیں کرسکتی، لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ وہ سرے سے خلاف عقل ہیں۔ اول تو تمام افراد کی عقلی قوت یکساں نہیں۔ ایک آدمی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا۔ دوسرا باریک سے باریک نکتے حل کرلیتا ہے۔ ثانیاً عقل انسانی برابر نشو و نما کی حالت میں ہے۔ ایک عہد کی عقل جن باتوں کا ادراک نہیں کرسکتی۔ دوسرے عہد کے لیے وہ عقلی مسلمات بن جاتی ہیں۔ ثالثاً، انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اور عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہوجاتی۔

اچھا، اب مذہب کے میدان سے باہر قدم نکالو، اور غور کرو، قرآن نے ان چند لفظوں کے اندر جو بات کہدی ہے وہ

انسانی علم و عقل کی تمام ترقیوں کے لیے کس طرح اصل و اساس ثابت ہو رہی ہے؟ کونسی بات ہے جس نے علمی ترقی کے غیر محدود و لانہایت امکانات کا دروازہ نوع انسانی کے سامنے کھول دیا، اور علم و ادراک کی سیکڑوں ناممکن باتوں کو نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا؟ کیا یہی بات نہیں ہے کہ کسی بات کے احاطہ نہ کر سکنے سے اُس کا انکار لازم نہیں آ جاتا؟ اگر اصحاب علم و انکشاف نے اس بات سے انکار کر دیا ہوتا، تو کیا ممکن تھا کہ عقلی ترقیات کے قدم یہاں تک پہنچ سکتے اور آئندہ کے لیے اسقدر ممکنات سامنے آجاتے؟ بلاشبہ علم و انکشاف کے ہر عہد میں ایسی جلد باز طبیعتیں بھی ہوئیں، جنہوں نے محض عدم ادراک کی بنا پر انکار کر دیا لیکن علم نے کچھ پروا نہ کی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اُس کا سفر برابر جاری رہا، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اب تک اور کہاں تک جاری رہیگا۔

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لینی چاہیے۔ جہاں تک عقل اور ماوراء عقل کی نزاع کا تعلق ہے، قرآن کے بعد تین دور بحث و نظر کے گزر چکے ہیں۔ ایک دور حکما، و متکلمین اسلام کا جنہوں نے عقلی طریقہ پر مذہبی عقائد کا اثبات کرنا چاہا۔ دوسرا یورپ کے نشئۃ ثانیہ کا جب اسی طرح مسیحی علم کلام مرتب کیا گیا۔ تیسرا علوم عصریہ کا جس نے بحث و نظر کے تمام گوشوں میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے یہاں سیدھے سادے لفظوں میں جو بات کہدی ہے، اُس پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ بلاشبہ بحث و نظر کی کاوشیں دور دور تک گئیں، لیکن ہمیشہ ناکامیاب ہوئیں، اور ہمیشہ اصحاب عرفان و تحقیق کو اقرار کرنا پڑا کہ اس سے بہتر اور فیصلہ کن بات اور کوئی نہیں کہی جا سکتی۔

یہ مقام مہمات معارف میں سے ہے، اور تفصیل اسکی مقدمہ میں ملیگی۔

حقیقت "تاویل" مستعملۂ قرآن

(۲) عربی میں "تاویل" کے معنی کسی بات کے نتیجہ اور مآل کے ہیں، اور چونکہ الفاظ کے معانی بھی ان کی دلالت کا مآل و مصداق ہوتے ہیں، اس لیے مطالب و معانی پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔ لیکن قرآن نے یہ لفظ ہر جگہ لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی آیت (۷) اور اعراف کی (۵۳) میں بھی یہ لفظ گزر چکا ہے اور اس آیت میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن بعد کو جب تفسیر و کلام کے مختلف مذاہب پیدا ہوئے، تو "تاویل" کا لفظ ایک خاص مصطلح معنی میں بولا جانے لگا۔ یعنی کسی لفظ کا ایسا مطلب ٹھہرانا جو اُس کے ظاہری مدلول سے ہٹا ہوا ہو۔ مثلاً قرآن میں ید اللہ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی خدا کا ہاتھ، اور یہ تنزیہ کے خلاف ہے کہ خدا کا ہاتھ ہو، اس لیے ہاتھ کی جگہ اس کا کوئی دوسرا مطلب لینا۔ پھر اس کے مختلف مراتب و اقسام ٹھہرائے گئے، اور مذہب تاویل و تفویض کی نزاعیں برپا ہوئیں چونکہ متاخرین کے دماغوں میں یہ مصطلحات بسی ہوئی ہیں، اس لیے قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے بھی وہ اُن کے اثر سے باہر نہیں جا سکتے۔ چنانچہ قرآن کے لغوی "تاویل" کو بھی انہوں نے مصطلحات کلامیہ کا مصطلح "تاویل" سمجھ لیا، اور اس پر بحث و استدلال کی عمارتیں اٹھانے لگے۔ تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر پڑھو، اور پھر غور کرو کہ تفسیر قرآن کی راہ میں کیسے کیسے الجھاؤ ڈال دیے گئے ہیں، اور اصل حقیقت کس طرح مستور ہو گئی ہے۔

نزاعیں ہو

تفسیر لاخوف علیہم ولاہم یحزنون

(۵) قرآن نے ایمان اور اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے، اُس میں کوئی بات بھی اس قدر نمایاں نہیں ہے جسقدر یہ کہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ خوف اور غم، دونوں سے وہ محفوظ ہو جائینگے۔ چنانچہ اس سورت کی آیت (۶۲) میں بھی یہی بات فرمائی ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ قرآن نے اس وصف پر کیوں اس قدر زور دیا؟

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُسکی شقاوت کی ساری سرگزشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے: خوف اور دکھ۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی، اس کی ساری سعادتیں اُس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں، سب کو ایک ایک کرکے چنو اور دیکھو، خواہ جسم میں چبھتے ہوں خواہ دماغ میں، خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں، خواہ آخرت کی، تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں ہیں۔ یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے، ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے۔ جس کے قدم اس راہ

...جم گئے، اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی!

قرآن نے یہی حقیقت دوسرے پیرایوں میں بھی بیان کی ہے۔ مثلاً آخری پارہ میں سورۂ عصر اسی حقیقت کا اعلان ہے۔

سورۃ هود

مکی۔ ۱۲۳۔ آیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الر کتب احکمت ایته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر ۝ الا تعبدوا الا اللہ انني لكم ١
منه نذیر و بشیر ۝ و ان استغفروا ربكم ثم توبوا اليه يمتعكم متاعا حسنا الى اجل ٢
مسمى و يؤت كل ذي فضل فضله و ان تولوا فاني اخاف عليكم عذاب يوم كبير ۝ ٣
الى الله مرجعكم و هو على كل شيء قدير ۝ الا انهم يثنون صدورهم ليستخفوا منه ٤

(۱) یہ سورت بھی مکی ہے، اور گو خطاب عامۂ منکرین سے ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ مشرکین عرب مخاطب ہیں۔

(۲) قرآن نے گزشتہ دعوتوں، گزشتہ قوموں، اور گزشتہ ایام و وقائع کا جا بجا ذکر کیا ہے، اور ہر جگہ حسب مقام ایک خاص موعظت اور ایک خاص استدلال ہے۔ از انجملہ یہ سورت ہے جس میں حضرت نوح سے لے کر حضرت موسیٰ (علیہما السلام) تک تمام پچھلی دعوتوں کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب بیان تاریخی ہے۔ یعنے جس دعوت کا ذکر جس دعوت کے بعد کیا گیا ہے، وہی اس کی تاریخی جگہ ہے۔

اس موعظت میں سورۂ اعراف کے بعد سب سے بڑی سورت یہی ہے۔

(۳) سب سے پہلے اُس بات کا اعلان کیا ہے، جو اول دن سے تمام دعوتوں کا عالمگیر اعلان رہا ہے۔ یعنے:

(ا) اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو۔

(ب) میں اُس کی طرف سے مامور ہوں، اور اس لیے مامور ہوں کہ تبشیر اور تنذیر کا فرض رسالت ادا کردوں۔ یعنے انکار و سرکشی کے نتائج سے خبردار کردوں۔ ایمان و نیک عملی کی کامرانیوں کی خوشخبری سنادوں۔

(ج) پس سرکشی سے باز آجاؤ اور توبہ و استغفار کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو مجھے اندیشہ ہے، تم عذاب الٰہی میں گرفتار ہوجاؤگے!

(۴) اس کے بعد فرمایا، تمہارے اعمال کا ذرہ ذرہ اللہ کے سامنے ہے۔ اس کے علم سے جب ایک چیونٹی کا سوراخ بھی پوشیدہ نہیں، تو انسان کے افکار و اعمال کیونکر پوشیدہ رہ سکتے ہیں!

الف۔ لام۔ را۔

یہ کتاب ہے جس کی آیتیں (اپنے مطالب و دلائل میں) مضبوط کی گئیں، پھر کھول کھول کر واضح کردی گئیں۔ یہ اُس کی طرف سے ہے جو حکمت والا (اور ساتھ ہی) ساری باتوں کی خبر رکھنے والا ہے! ١

(اس کا اعلان کیا ہے!) یہ، کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یقین کرو، میں اُسی کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں! ٢

اور یہ، کہ اپنے پروردگار سے معافی کے طلب گار ہو، اور اُس کی طرف لوٹ جاؤ۔ (ایسا کروگے تو) وہ تمہیں ایک وقت مقرر تک زندگی کے فوائد سے بہت اچھی طرح بہرہ مند کریگا، اور (اپنے قانون کے مطابق) ہر زیادہ (عمل) کرنے والے کو اُس کی سعی مزید کا اجر بھی دیگا۔ لیکن اگر تم نے روگردانی کی، تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک بڑا دن نمودار نہ ہوجائے۔ ٣

تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور اُس کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں! ٤

(اے پیغمبر!) تو سن رکھ کہ یہ لوگ اپنے سینوں کو لپیٹتے ہیں کہ اللہ سے چھپیں (یعنے اپنے دل کی باتیں

۵ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ○ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ○ ۷ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَعْدُودَةٍ لَيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا

چھپا کر رکھتے ہیں) مگر یاد رکھو، (انسان کی کوئی بات بھی اللہ سے پوشیدہ نہیں) یہ جب اپنے سارے کپڑے اپنے اوپر ڈال لیتے ہیں تو اُس وقت بھی چھپ نہیں سکتے۔ جو کچھ یہ چھپا کر کریں اور جو کچھ کھلم کھلا کریں، سب اللہ کو معلوم ہے۔ وہ تو سینوں کے اندر کا بھید جاننے والا ہے! ۵

۶ اور زمین میں چلنے والا کوئی جانور نہیں ہے جس کی روزی کا انتظام اللہ پر نہ ہو، اور وہ نہ جانتا ہو کہ اُس کا ٹھکانا کہاں ہے، اور وہ جگہ کہاں ہے جہاں بالآخر اس کا وجود سونپ دیا جائیگا؟ یہ سب کچھ (علم الٰہی کی) کتاب میں مندرج ہے۔

۷ اور وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا، اور اُس کے تختِ (حکومت) کی فرماں روائی پانی پر تھی۔ اور اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائش میں ڈالے، اور یہ بات ظاہر ہو جائے کہ کون عمل میں بہتر ہے۔ اور (اے پیغمبر!) اگر تو ان لوگوں سے کہے "تم مرنے کے بعد اُٹھائے جاؤ گے" تو جو لوگ منکر ہیں وہ ضرور بول اُٹھیں "یہ تو صریح جادو کی سی باتیں ہیں!"

اور اگر ان پر عذاب کا نازل کرنا ایک مقررہ مدت تک ہم تاخیر میں ڈال دیں، تو یہ ضرور کہنے لگیں "کونسی بات ہے جو اُسے روک رہی ہے؟" سو سُن رکھو، جس دن عذاب ان پر آئیگا تو پھر کسی کے ٹالے ٹلنے والا نہیں۔ اور جس بات کی ہنسی اُڑایا

(۵) غور کرو۔ قرآن کے ایک ایک لفظ میں کیسی دقیق مناسبتیں پوشیدہ ہوتی ہیں؟ سورت کی تمام موعظت کا مرکزی نقطہ جزاءِ عمل کا معاملہ ہے کیونکہ تمام دعوتوں نے اس کا اعلان کیا، اور تمام جماعتوں پر یہ طاری ہوا۔ پس پہلی آیت میں قرآن کا صرف یہی وصف بیان کیا کہ "احکمت آیاتہ" اُس کے مطالب مضبوط اور ثابت ہیں۔ یعنے اُس کی کوئی بات ایسی نہیں جو کمزور اور کچی نکلے۔ پھر فرمایا "من لدن حکیم خبیر" اُس کی طرف سے جو حکیم اور خبیر ہے۔ یعنے چونکہ وہ حکیم ہے، اس لیے ضروری تھا کہ جزائے عمل کا قانون ظہور میں آئے۔ ساتھ ہی وہ خبیر بھی ہے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ کوئی عمل اس سے پوشیدہ رہ جائے، اور جزاءِ عمل کا نفاذ ٹھیک ٹھیک نہ ہو۔

چنانچہ آیت (۵) میں فرمایا، یہ اپنے سینوں کے بھید چھپاتے ہیں، اور نہیں جانتے کہ اُس کے علم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔

(۶) آیت (۷) میں فرمایا، اللہ کی حکومت پانی پر نافذ تھی۔ دوسری جگہ فرمایا، کہ ہم نے تمام زندہ اجسام پانی سے پیدا کیے (۲۱: ۳۰) اس سے معلوم ہوا کہ زمین پر ایک ابتدائی دور گزر چکا ہے جب کہ پانی تھا۔ یا ایسی چیز تھی جسے پانی سے تعبیر کیا گیا ہے، اور قوانینِ الٰہی اس میں کام کر رہے تھے۔

بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ۧ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ (۸-۹ ع ۸)
وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ (۱۰)
اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ (۱۱)
مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَاۗىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَاۗءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ۭ
اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ۭ

کرتے تھے، (تم دیکھوگے کہ) وہی انہیں آلگی! (۸)

اور اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا مزہ چکھائیں (یعنے اسے ایک نعمت بخشیں) اور پھر اس سے وہ ہٹالیں، تو (وہ ذرا بھی صبر نہیں کرسکتا) یک قلم مایوس اور ناشکرا ہوجاتا ہے۔ (۹) اور اگر اُسے دکھ پہنچا ہو، اور (اس کے بعد راحت کا مزہ چکھادیں، تو پھر (یک قلم غافل ہوجاتا ہے، اور) کہتا ہے، اب تو برائیاں مجھ سے دور ہوگئیں (اب کیا غم ہے) حقیقت یہ ہے کہ انسان (ذراسی بات میں) خوش ہوجانے والا اور ڈینگیں مارنے والا ہے! (۱۰)

مگر ہاں! جو صبر کرتے ہیں اور نیک عملی کی راہ چلتے ہیں، تو اُن کا حال ایسا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لیے بخشش ہے اور بہت بڑا اجر! (۱۱)

پھر (اے پیغمبر!) کیا تو ایسا کریگا کہ جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے، اس میں سے کچھ باتیں چھوڑ دیگا، اور اُس کی وجہ سے دل تنگ رہیگا! اور یہ اس لیے کہ لوگ کہہ اُٹھینگے "اس آدمی پر کوئی خزانہ (آسمان سے) کیوں نہیں اُتر آیا" یا "ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ ایک فرشتہ آکر کھڑا ہوجاتا"؟ (نہیں، تجھے تو دل تنگ نہیں ہونا چاہیے) تیرا مقام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کردینے والا ہے۔ (تجھ پر اس کی ذمہ داری نہیں کہ لوگ تیری باتیں مان

(۷) آیت (۹) میں فطرت انسانی کی اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر مصیبت پیش آتی ہے تو فوراً مایوس ہوجاتا ہے، راحت پیش آتی ہے تو بے پروا ہوکر ڈینگیں مارنے لگتا ہے۔ پھر آیت (۱۱) میں فرمایا، اس عام حالت سے وہ مستثنیٰ ہیں جن کے اندر صبر و ثبات کی روح پیدا ہوگئی ہے اور جنہوں نے نیک عملی کی راہ اختیار کی ہے۔ وہ نہ تو مصیبت میں مایوس ہونے والے ہیں، اور نہ عیش و راحت میں غافل و ناشکرگزار۔

یہاں یہ بات اس لیے بیان کی گئی کہ منکرین حق عذاب کی خبر سُن کر ہنسی اُڑاتے تھے اور مومنوں پر مصیبت کی گھڑیاں شاق گزرتی تھیں پس فرمایا، منکروں کی یہ حالت کوئی غیر معمولی حالت نہیں ہے۔ انسان خوش حالیوں میں پڑکر اسی طرح غافل ہوجاتا ہے اور ڈینگیں مارنے لگتا ہے، لیکن مومنوں کو چاہیے، وقت کی مصیبتوں سے دل تنگ ہوکر مایوس نہ ہوجائیں۔

(۸) دنیا میں ایک انسان کی زبان سے جتنی باتیں نکل سکتی ہیں، اُن میں کوئی بات بھی اس سے بڑھ کر بوجھل اور تھکا دینے والی نہیں کہ ایک آدمی ایک مطمئن اور خوش و خرم قوم کے سامنے کھڑا ہو، اور اچانک اعلان کردے کہ "تمہاری ہلاکت کی گھڑی سر پر آگئی۔ اگر سرکشی سے باز نہ آؤگے تو نیست و نابود کردیے جاؤگے" کتنا بڑا اور عجیب اعلان ہے! کتنی عظیم اس کی ذمہ داری ہے؟ اور کس درجہ مافوق انسانیت صبر و تحمل کی ضرورت ہے کہ وہ سب کچھ جھیل لیا جائے، جو یہ اعلان سن کر لوگوں کی زبانوں سے نکلیگا!

لیکن خدا کے رسولوں کو یہ بوجھ اُٹھانا پڑا۔ کیونکہ وہ اس کے

۱۲ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا

۱۳ مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ

۱۴ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

۱۵ وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ

۱۶ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ڮ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ

بھی لیں) اور ہر چیز پر اللہ ہی نگہبان ہے۔

پھر کیا یہ لوگ ایسا کہتے ہیں کہ اس آدمی نے قرآن اپنے جی سے گڑھ لیا ہے؟ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے "اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو اس طرح کی دس سورتیں گڑھی ہوئی بنا کر پیش کر دو، اور اللہ کے سوا جس کسی کو (اپنی مدد کے لیے) پکار سکتے ہو، پکار لو"۔

"پھر اگر (تمہارے ٹھہرائے ہوئے معبود) تمہاری پکار کا جواب نہ دیں (اور تم اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو) تو سمجھ لو کہ قرآن اللہ ہی کے علم سے اُترا ہے، اور یہ بات بھی سچ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اب بتلاؤ، کیا تم یہ بات تسلیم کرتے ہو؟"

۱۲ لیے، مومن اسد تھے

یہی مرحلہ پیغمبر اسلام کو بھی درپیش تھا اسی لیے وحی الٰہی جابجا اس بات پر زور دیتی ہے کہ لوگوں کی باتوں سے دل تنگ نہ ہو، اعلانِ امر میں ذرا بھی تامل نہ کرو۔ چنانچہ آیت (۱۲) میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔

منکرینِ حق کہتے تھے۔ اگر خدا کے یہاں ایسی ہی تمہاری سائی ہے، تو کیوں نہیں کہتے، ایک خزانہ تم پر اُتار دے، یا فرشتے بھیج دے کہ تمہاری باتوں کی سب کے سامنے تصدیق کر دیں؟ فرمایا،

۱۳ اُن کے اس انکار و استہزاء سے دل تنگ نہ ہو۔ کیونکہ تم تو صرف نذیر ہو۔ تمہیں ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو کہ ان کے ان لینے کے بھی ذمہ دار ہو۔

"نذیر" کی حیثیت پر زور دے کر یہ بات بھی واضح کر دی کہ پیغمبر اس لیے نہیں آتے کہ خزانے بانٹتے پھریں، یا طرح طرح کے اچنبھے دکھائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ انکار و بدعملی

۱۴ کے نتائج سے خبردار کر دیں، اور سچائی کی راہ دکھا دیں۔

جو کوئی (صرف) دنیا کی زندگی اور اُس کی دلفریبیاں ہی چاہتا ہے، تو (ہمارا ٹھہرایا ہوا قانون یہ ہے کہ) اس کی کوشش و عمل کے نتائج یہاں پورے پورے دیدیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ دنیا میں

۱۵ اُس کے ساتھ کمی کی جائے۔ لیکن (یاد رکھو) یہ وہ لوگ ہیں، جن کے لیے آخرت (کی زندگی) میں (دوزخ کی) آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جو کچھ اُنہوں نے یہاں بنایا ہے، سب اکارت جائیگا اور جو کچھ کرتے رہے ہیں سب نابود ہونے والا ہے!

پھر دیکھو، جو لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک روشن دلیل رکھتے ہوں (یعنے وجدان و عقل کا فیصلہ) اور اس کے ساتھ ہی ایک گواہ بھی اسکی

۱۶ (۹) کفار پیغمبر اسلام کے اعلاناتِ حق کی ہنسی اُڑاتے تھے، اور جب قرآن سُنایا جاتا تھا تو کہتے تھے۔ یہ تو تم نے اپنے جی سے گڑھ لیا ہے۔ آیت (۱۳) میں فرمایا، اگر یہ گڑھی ہوئی بات ہے تو تم بھی ایسی ہی بات گڑھ کر بنا لاؤ، اور اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے دعائیں کرو کہ اس کام میں تمہاری مدد کریں۔

ملہ یہ بات سورۂ بقرہ اور یونس میں بھی گزر چکی ہے۔ اور آئندہ سورتوں میں بھی آئیگی۔ اسکی تشریح سورۂ اسراء آیت (۵۹) کے نوٹ میں ملیگی [illegible]

رَبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ
يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ
لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ ١٧
عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ١٨
الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا ١٩

اُس کے بعد یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اگر انکار و سرکشی پر بھی انہیں دنیوی فوائد مل رہے ہیں، تو صرف اتنی ہی بات دیکھ کر یہ مغرور نہ ہو جائیں، اور نہ مومنوں کو چاہیے کہ اس پر متعجب ہوں۔ اللہ نے دنیا کے لیے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا ہے کہ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ رکھتا ہے، اور جیسا کچھ عمل ہوتا ہے، اُسی کے مطابق نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ اگر ایک انسان آخرت کی طرف سے غافل ہے، اور صرف دنیوی زندگی ہی کا خواہشمند ہے، جب بھی ایسا نہ ہوگا کہ اُس کی سعی و طلب بے اثر ہو جائے۔ جیسی کچھ کوشش کریگا، اُس کے مطابق نتیجہ حاصل کریگا۔ اگر اچھی طرح ہل جوتے گا اور تخم ریزی کریگا، تو اچھی فصل پیدا ہو جائیگی۔ ادھورا کام کریگا تو ادھورا نتیجہ نکلیگا۔ البتہ ایسے آدمی کے لیے آخرت میں کچھ نہ ہوگا۔ وہاں اُسے نظر آجائیگا کہ اس کے سارے کام اکارت گئے۔ آخرت کے لیے کچھ سود مند نہ ہوئے

طرف سے آگیا ہو (یعنے اللہ کی وحی) اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی پیشوائی کرتی ہوئی اور سرتا پا رحمت آچکی ہو (اور تصدیق کر رہی ہو، تو کیا ایسے لوگ انکار کر سکتے ہیں؟ نہیں) یہ لوگ اُس پر ایمان رکھتے ہیں، اور (ملک کے مختلف) گروہوں میں سے جو کوئی اس سے منکر ہوا، تو یقین کرو، (دوزخ کی) آگ ہی وہ ٹھکانا ہے جس کا اُس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ پس (اے پیغمبر!) تو اُس کی نسبت کسی طرح کے شک میں نہ پڑیو (یعنے دعوتِ قرآن کی کامیابی کے بارے میں کسی طرح کا شک نہ کیجیو) وہ تیرے پروردگار کی جانب سے امرِ حق ہے لیکن (ایسا ہی ہوتا ہے کہ) اکثر آدمی (سچائی پر) ایمان نہیں لاتے۔ ١٧

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان باندھے؟ جو ایسا کر رہے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حضور پیش کیے جائینگے، اور اُس وقت گواہ گواہی دینگے کہ "یہ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ بولا"۔ تو سُن رکھو اُن ظالموں پر اللہ کی پھٹکار، ١٨ جو اللہ کی راہ سے اُس کے بندوں کو روکتے ہیں، اور چاہتے ہیں اُس میں کجی پیدا کر دیں، اور جو آخرت سے بھی منکر ہوئے! ١٩

(١٠) پھر آیت (١٧) میں فرمایا، جو لوگ اللہ کی طرف سے دلیل و حجت پر ہیں، اور اُنہوں نے راہ حقیقت پالی ہے، وہ ان مغرورین دنیا کی طرح نہیں ہوسکتے۔ اُن کی راہ ہدایت الٰہی کی راہ ہے، اور ہدایت الٰہی کی کامیابی شک و شبہ سے بالاتر۔
پھر آیت (١٨) میں فرمایا، اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر افترا کرے؟ یعنے مومن تو اللہ کی دلیل و حجت پر چلے، اور منکر اللہ پر افترا کر رہے ہیں۔ پس دونوں کی راہ ایک کیونکر

یہ لوگ تو زمین میں (اللہ کو) عاجز کر دینے والے تھے، نہ اللہ کے سوا انکا کوئی کارساز تھا۔ انہیں دوگنا عذاب ہوگا۔ (کیونکہ ان کی سرکشی اور ہٹ دھرمی ایسی تھی

مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا
كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ ۲۰
مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۲۱-۲۲
وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ ۲۳
وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۲۴
اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ

کہ) نہ تو حق بات سُن سکتے تھے، نہ (حقیقت کی روشنی پر) نظر تھی! ۲۰

یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانیں تباہی میں ڈالیں اور زندگی میں جو کچھ (حق کے خلاف) افترا پردازیاں کرتے رہے، وہ سب (آخرت میں) ان سے کھوئی گئیں! ۲۱

سے متضاد ہوئیں، اور نتائج بھی متضاد ہوئے۔ پہلے نے خدا کی بخشی ہوئی عقل سے کام لیا اور اس کی وحی پر ایمان لایا۔ دوسرے نے عقل و بصیرت سے انکار کیا اور خدا کی وحی جھٹلائی۔

(۱۱) اس کے بعد آیت (۲۳) تک اسی حقیقت کی وضاحت کی ہے۔ (۲۰) میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ دنیا میں کلمۂ حق کی راہ نہ روک سکیں گے۔ کیونکہ انسان کتنا ہی زور و اقتدار میں بڑھ جائے، لیکن قوانینِ حق پر غالب نہیں آسکتا۔ اسے مغلوب ہی ہونا پڑتا ہے۔

۲۲ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی لوگ ہیں کہ آخرت میں سب سے زیادہ تباہ حال ہونگے!

لیکن جو لوگ ایمان لائے، نیک کام کیے، اور اپنے پروردگار کی طرف فرار پکڑلیا، تو وہ جنت والے ہیں۔ جنت کی (کامرانیوں) میں ہمیشہ رہنے والے! ۲۳

ان دو فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرا، اور ایک دیکھنے سننے والا۔ پھر بتلاؤ، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟ ۲۴

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اُس نے کہا (لوگو!) میں تمہیں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آشکارا خبردار کرنے والا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔ ۲۵

اس پر قوم کے اُن سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا "ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی

(۱۲) آیت (۲۴) کو تمام پچھلی موعظت کا خلاصہ سمجھو۔ فرمایا۔ دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرا ہو۔ دوسرا دیکھنے سننے والا۔ پھر کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا روشنی اور اندھیاری میں کوئی فرق نہیں؟ کیا بصارت اور کوری کا ایک حکم ہے؟

اگر نہیں ہے، تو ضروری ہے کہ دونوں کے احوال و نتائج ایک دوسرے سے متضاد ہوں اور دنیا میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہو جیسا کہ اب ہو رہا ہے۔

(۱۳) چنانچہ اس کے بعد ہی گذشتہ ایام و وقائع کا بیان شروع ہو گیا ہے جو فی الحقیقت دلائل و حجج کا ایک پورا سلسلہ ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی حضرت نوح (علیہ السلام) کی

كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝

۲۷ ۲۸ ۲۹

دعوت ہے۔

(۱۲) حضرت نوح نے کہا:

(ل) اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو۔

(ب) اگر تم سرکشی سے باز نہ آئے تو عذاب کا ایک بڑا ہی دردناک دن آنے والا ہے۔

(ج) لیکن قوم کے سرداروں اور اونچے درجہ کی جماعتوں نے انکار و سرکشی کی۔ صرف وہ لوگ ایمان لائے جو قوم میں ذلیل سمجھے جاتے تھے۔

(د) منکروں نے کہا۔ تم بھی ہماری ہی طرح ایک آدمی ہو پھر تمہاری بات کیوں مانیں یعنے اگر تم میں کوئی ایسا عجب پایا جاتا جو اور آدمیوں میں نہیں پایا جاتا۔ یا دیوتاؤں کی طرح اُترآئے ہوتے، تو تمہاری تصدیق کرتے۔

(ہ) منکرین نے کہا، جو ہم میں کمینے ہیں، وہی بے سمجھے بوجھے تمہیں مان رہے ہیں۔ پھر کیا ان بے وقوفوں کی طرح ہم بھی مان لیں؟ علاوہ بریں ہم ایسی جماعت میں کیونکر شریک ہوسکتے ہیں جہاں رذیل و شریف میں کوئی امتیاز نہیں؟

(و) حضرت نوح نے کہا۔ انسان کی ہدایت تو انسان ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے، اور وہ اُتنا ہی کرسکتا ہے جو اُس کے اختیار میں ہے۔ تم کہتے ہو میں جھوٹا ہوں لیکن بتلاؤ، اگر تم مجھ سچا سمجھتے تو کیا اس بات کی توقع کرتے کہ جبراً تمہیں سچائی کی راہ دکھا دوں؟ خدا کی طرف سے کتنی ہی واضح دلیلِ حق مجھے مل گئی ہو، لیکن تم سمجھنے سے انکار کردو، تو میں کیا کرسکتا ہوں؟

(ز) اُنہوں نے کہا، تم جن لوگوں کو ذلیل سمجھتے ہو، میں کبھی نہیں کہونگا کہ وہ ذلیل ہیں اور اُنہیں خوبی و سعادت نہیں مل سکتی۔ اگر میں ایسا کروں تو خدا کے مواخذہ میں گرفتار ہوجاؤں۔

(ح) اُنہوں نے کہا۔ میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ سچائی کا پیغام بر ہوں۔ مجھے طاقت و تصرف کا دعویٰ نہیں۔ نہ میں انسانیت سے کوئی بالاتر ہستی ہوں۔

ہو، اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں اُن میں بھی اُن لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں کمینے ہیں، اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لیے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے ہیں، تم جھوٹے ہو۔" ۲۷

نوح نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں، اور اُس نے اپنے حضور سے ایک رحمت بھی مجھے بخش دی ہو، (یعنے راہ حق دکھا دی ہو) مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو (میں اس کے سوا کیا کرسکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟) کیا ہم جبراً تمہیں راہ دکھا دیں، حالانکہ تم اس سے بیزار ہو؟" ۲۸

"لوگو! یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، تو اس پر مال و دولت کا تم سے طالب نہیں۔ میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے، صرف اللہ پر ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نگاہوں میں کتنے ہی ذلیل ہوں مگر) میں ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنے پاس سے انہیں ہنکا دوں۔ اُنہیں بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے۔ (اور وہ ہم سب کے اعمال کا حساب لینے والا ہے) لیکن (میں تمہیں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں؟) میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک جماعت ہو، (حقیقت کی) جاہل" ۲۹

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ

"اے میری قوم کے لوگو! مجھے بتلاؤ، اگر میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر کردوں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جس کے نزدیک معیار قبولیت ایمان و عمل ہے۔ نہ کہ تمہاری گڑھی ہوئی شرافت و رذالت) تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو میری مدد کریگا؟ (افسوس تم پر!) کیا تم غور نہیں کرتے؟"

"اور دیکھو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، اللہ انہیں کوئی بھلائی نہیں دیگا (جیسا کہ تمہارا اعتقاد ہے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے۔ اگر میں (تمہاری خواہش کے مطابق) ایسا کہوں، تو جونہی ایسی بات کہی، میں ظالموں میں سے ہوگیا!"

اس پر ان لوگوں نے کہا "اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا۔ (اب ان باتوں سے کچھ بننے والا نہیں) اگر تو سچا ہے تو جس بات کا وعدہ کیا ہے، وہ ہمیں لا دکھا"

نوح نے کہا "اگر اللہ کو منظور ہوگا تو بلاشبہ تم پر وہ بات لے آئیگا، اور تمہیں یہ قدرت نہیں کہ (اسے کسی بات سے) عاجز کردو"

"اور اگر اللہ کی مشیت یہی ہے کہ تمہیں ہلاک کرے، تو میں کتنا ہی نصیحت کرنا چاہوں، میری نصیحت کچھ سود مند نہ ہوگی۔ وہی تمہارا پروردگار ہے۔ اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے"

(حکم الٰہی ہوا) اے نوح! کیا یہ لوگ کہتے ہیں۔ اس آدمی نے (یعنے نوح نے) اپنے جی سے یہ بات

(ط) منکروں نے ان دلائل و مواعظ پر غور کرنے سے انکار کردیا، وہ ان باتوں کو جدال سے تعبیر کرنے لگے۔ اور یہاں تک سرکشی کی کہ خود عذاب کے ظہور کا مطالبہ کرنے لگے

(ی) اس پر ارشاد الٰہی ہوا کہ کہدے۔ تم کہتے ہو کہ میں مفتری ہوں۔ اچھا، اگر میں مفتری ہوں تو میرا گناہ مجھ پر، اور اگر تم سچائی کو جھٹلا رہے ہو، تو اس کی پاداش تمہیں جھیلنی ہے۔ میں اس سے بری ہوں۔ اب فیصلہ کا انتظار کرو۔

(ک) حضرت نوح کو وحی الٰہی سے مطلع ہوا کہ جو ایمان لاچکے ہیں، ان کے سوا کوئی ایمان لانے والا نہیں، اور یہ کہ ملک غرق ہونے والا ہے۔ بس، ایک کشتی بنالو۔

(ل) منکروں کا اس پر تمسخر کرنا۔

ع ٣ / ١١

قل ان افتریته فعلی اجرامی وانا بریء مما تجرمون ۝ واوحی الی نوح انه لن یؤمن ٣٥
من قومک الا من قد امن فلا تبتئس بما کانوا یفعلون ۝ واصنع الفلک باعیننا ٣٦
ووحینا ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انهم مغرقون ۝ ویصنع الفلک وکلما مر ٣٧
علیه ملا من قومه سخروا منه قال ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون ۝ ٣٨
فسوف تعلمون من یاتیه عذاب یخزیه ویحل علیه عذاب مقیم ۝ حتی اذا جاء ٣٩
امرنا وفار التنور قلنا احمل فیها من کل زوجین اثنین واهلک الا من سبق علیه القول و

گڑھ لی ہے؟ تو کہہ دے "اگر میں نے یہ بات گڑھ لی ہے، تو میرا جرم مجھ پر، اور تم جو جرم کر رہے ہو، (اُس کی پاداش تمہارے لیے) میں اس سے بری الذمہ ہوں!" ٣٥

اور نوح پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، اُن کے سوا اب کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ پس جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اُس پر (بیکار کو) غم نہ کھا۔ ٣٦

"اور (کہا گیا کہ) ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کر دے، اور ان ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کر۔ یقیناً یہ لوگ غرق ہو جانے والے ہیں" ٣٧

چنانچہ نوح کشتی بنانے لگا۔

اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ اُس کی قوم کا کوئی گروہ اُس پر سے گزرتا، تو (اُسے کشتی بنانے میں مشغول دیکھ کر) تمسخر کرنے لگتا۔ نوح اُنہیں جواب دیتا کہ "اگر تم ہماری ہنسی اُڑاتے ہو، تو (اُڑا لو) اسی طرح ہم بھی (تمہاری بے وقوفیوں پر ایک دن) ہنسینگے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہو جائیگا ٣٨

کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ اُسے رسوا کرے، اور پھر دائمی عذاب بھی اُس پر نازل ہو!" ٣٩

(یہ سب کچھ ہوتا رہا) یہاں تک، کہ جب وہ وقت آ گیا کہ ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات ظہور میں آئے اور (فطرت کے) تنور نے جوش مارا، تو ہم نے (نوح کو حکم دیا) "ہر قسم (کے جانوروں) کے دو دو جوڑے کشتی میں لے لو، اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لو۔ مگر اہل و عیال میں وہ لوگ داخل نہیں جن کے لیے پہلے بات کہی جا چکی ہے (یعنے کہا جا چکا ہے کہ انہیں غرق ہونا ہے) نیز اُن لوگوں کو بھی لے لو جو

(ن) طوفان کا ظہور، اور حضرت نوح کا کشتی میں سوار ہونا اور اُن سب کو ساتھ لے لینا جن کے ساتھ لینے کا حکم ہوا۔

(س) سیلاب نے اتنا گہرا پانی جمع کر دیا تھا، اور طوفانی ہواؤں کا یہ عالم تھا کہ اونچی اونچی موجیں اُٹھنے لگی تھیں۔

(ع) حضرت نوح کے لڑکے نے اُن کا ساتھ نہ دیا اور غرق ہو گیا۔ حضرت نوح نے کہا، خدایا! وہ میرے اہل و عیال میں سے ہے۔ فرمایا نہیں، وہ بدعمل ہے، اور بدعمل تیرے اہل میں داخل نہیں۔

یہ آیت اس باب میں قطعی ہے کہ جسمانی رشتہ نجات کے لیے کچھ سود مند نہیں۔ جو کچھ ہے ایمان و عمل ہے۔

حضرت نوح کو اپنے لڑکے کے کفر کی خبر نہ تھی۔ اس لیے

مَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ ۴۰ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ ۴۱ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ○ ۴۲ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ○ ۴۳ وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ ۴۴ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ

ایمان لاچکے ہیں" اور نوح کے ساتھ ایمان نہیں لائے تھے مگر بہت تھوڑے آدمی۔

۴۰ اور (نوح نے ساتھیوں سے) کہا "کشتی میں سوار ہوجاؤ۔ اللہ کے نام سے اُسے چلنا ہے، اور اللہ ہی کے نام سے ٹھہرنا! بلاشبہ میرا پروردگار بخشنے والا، رحمت والا ہے!"

۴۱ اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑ کی طرح اُٹھتی ہیں، کشتی اُنہیں لیے جارہی ہے۔ اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ وہ کنارہ پر (کھڑا) تھا "اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہوجا۔ کافروں کے ساتھ نہ رہ" اُس نے کہا "میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لونگا وہ مجھے پانی کی زد سے بچالیگا" نوح نے کہا "(تو کس خیال

۴۲ خام میں پڑا ہے؟) آج اللہ کی (ٹھہرائی ہوئی) بات سے بچانے والا کوئی نہیں، مگر ہاں، وہی جس پر رحم کرے" اور (دیکھو) دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہوگئی پس وہ اُنہی میں ہوا جو ڈوبنے والے تھے!

۴۳ اور (پھر اللہ کا) حکم ہوا "اے زمین! اپنا پانی پی لے اور اے آسمان! تھم جا!" اور پانی کا چڑھاؤ اُتر گیا، اور حادثہ انجام پاگیا، اور کشتی "جودی" پر ٹھہر گئی، اور کہا گیا "نامرادی اس گروہ کے لیے ہو کہ ظلم کرنے والا گروہ تھا!"

۴۴ اور نوح نے اپنے پروردگار سے دعا کی۔ اُس نے کہا "خدایا! میرا بیٹا تو میرے گھر کے لوگوں میں سے ہے۔ اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے۔ تجھ سے بہتر فیصلہ

عرض کیا کہ وہ میری اہل میں سے ہے، اور میرے اہل و عیال کی حفاظت کا تو نے وعدہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ حقیقت حال دوسری ہے اور تمہیں اس کی خبر نہیں۔ وہ تو اُن میں سے ہے جن کے لیے کہا جا چکا ہے کہ "لاتخاطبنی فی الذین ظلموا" اور "الا من سبق علیہ القول" جیسا کہ آیت (۳۷) اور (۴۰) میں گزر چکا۔

(ف) طوفان اور سیلاب کا تھمنا، حادثہ کا ختم ہونا، اور کشتی کا جودی پہاڑ پر قرار پانا۔
سورۂ قمر کی آیت (۱۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے لگاتار بارش ہوئی تھی اور زمین کی تمام نہروں میں سیلاب آگیا تھا۔ تورات میں بھی ایسا ہی ہے لیکن اُس میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ بڑے سمندر کی تمام سوتیں پھوٹ نکلی تھیں (پیدائش ۷: ۱۲)
حضرت نوح کا ظہور اُس سرزمین میں ہوا تھا جو دجلہ اور فرات کی وادیوں میں واقع ہے۔ دجلہ اور فرات آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلی ہیں اور بہت دور تک الگ الگ بہ کر عراق زیریں میں باہم مل گئی ہیں، اور پھر خلیج فارس میں سمندر سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ آرمینیا کے یہ پہاڑ "اراراط" کے علاقہ میں واقع ہیں اسی

الْحٰكِمِينَ ۝ قَالَ يٰنُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۚ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صٰلِحٍ ۖ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ ۴۵
بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّيٓ أَعِظُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجٰهِلِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ ۴۶
لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِيٓ أَكُنْ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۝ قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِنَّا وَبَرَكٰتٍ ۴۷
عَلَيْكَ وَعَلٰىٓ أُمَمٍ مِمَّنْ مَعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ تِلْكَ مِنْ أَنْبَآءِ ۴۸
الْغَيْبِ نُوحِيهَآ إِلَيْكَ ۖ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۖ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۝ ۴۹ ع

پہلے انہیں تورات میں "ارارات کا پہاڑ" کہا ہے لیکن قرآن نے خاص اُس پہاڑ کا ذکر کیا جس پر کشتی ٹھہری تھی۔ وہ "جودی" تھا۔

زمانۂ حال کے بعض شارحین تورات کے خیال میں "جودی" اُس سلسلۂ کوہ کا نام ہے جس نے ارارات اور رجارجیا کے سلسلۂ کوہ کو ملا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں سکندر کے زمانے کی یونانی تحریرات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کم از کم یہ واقعہ تاریخی ہے کہ آٹھویں صدی مسیحی تک وہاں ایک معبد موجود تھا، اور لوگوں نے اُس کا نام "کشتی کا معبد" رکھ دیا تھا۔

(ص) ایک ایسے طوفان وسیلاب کے بعد ملک کی جو حالت ہوگئی ہوگی، اُس کی ہولناکی محتاج بیان نہیں۔ قدرتی طور پر حضرت نوح اور اُن کے ساتھیوں کو خیال گزرا ہوگا کہ یہ سرزمین زندگی اور زندگی کے تمام سامانوں سے خالی ہوگئی ہے۔ اب اس وحشت کدہ میں ہم کیونکر زندگی بسر کرینگے؟ پس اللہ نے وحی کی کہ سلامتی اور برکتوں کے ساتھ زمین پر قدم رکھو۔ یعنے تمہارے لیے اب خوف کی کوئی بات نہ ہوگی، اور سامان زندگی کی تمام برکتیں پھر ظہور میں آجائینگی۔ چنانچہ آیت (۴۸) میں کہ خاتمۂ سرگزشت ہے، اسی طرف اشارہ کیا ہے۔" و امم سنمتعھم" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بعد جو اُمتیں آئینگی، اُنہیں اگرچہ زندگی کی ساری کامرانیاں ملینگی لیکن پھر پاداش عمل سے تباہی میں پڑینگی۔

کرنے والا کوئی نہیں" ۴۵

(خدا نے) فرمایا "[1] اے نوح! وہ تیرے گھر کے لوگوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو (سراپا) عمل بد ہے۔ پس جس حقیقت کا تجھے علم نہیں، اُس بارے میں سوال نہ کر۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ ناواقفوں میں سے نہ ہو جانا!" ۴۶

(نوح نے) عرض کیا "خدایا! میں اس بات سے تیرے حضور پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی بات کا سوال کروں، جس کی حقیقت کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور رحم نہ فرمایا، تو میں اُن لوگوں میں سے ہو جاؤنگا جو تباہ حال ہوئے!" ۴۷

حکم ہوا "اے نوح! اب کشتی سے اُتر۔ ہماری جانب سے تجھ پر سلامتی اور برکتیں ہوں نیز اُن جماعتوں پر جو تیرے ساتھ ہیں۔ اور دوسری کتنی ہی جماعتیں ہیں (بعد کو آنے والی) جنہیں ہم (زندگی کے فائدوں سے) بہرہ مند کرینگے لیکن پھر اُنہیں (پاداش عمل میں) ہماری طرف سے عذاب دردناک پہنچیگا" ۴۸

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے وحی کے ذریعہ تجھے تبلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا، نہ تیری قوم۔ پس صبر کر (اور منکروں کے جہل و شرارت سے دلگیر نہ ہو) انجام کار متقیوں ہی کے لیے ہے! ۴۹

[1] یعنے جب وہ تیری راہ نہ چلا اور بدعملوں کا ساتھی ہوا، تو فی الحقیقت تیرے حلقۂ قرابت سے باہر ہوگیا۔ اب اُسے اپنا نہ سمجھ۔

۵۰ وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ۝ يَا قَوْمِ

۵۱ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ

۵۲ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ۝ قَالُوا يَا هُودُ

۵۳ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝ إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ

بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ

اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف، اُسکے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا۔

۵۰ ہود نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں یقین کرو۔ تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ (حقیقت کے خلاف) افترا پردازیاں کر رہے ہو۔"

۵۱ "اے میری قوم کے لوگو! میں اس بات کے لیے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا بدلہ تو اُسی پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر کیا تم (اتنی صاف بات بھی نہیں سمجھتے؟"

۵۲ "اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے پروردگار سے (اپنے قصوروں کی) مغفرت مانگو۔ اور (آئندہ کے لیے) اُس کی جناب میں توبہ کرو۔ وہ تم پر برستے ہوئے بادل بھیجتا ہے (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو جاتے ہیں) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھاتا ہے (کہ روز بروز گھٹنے کی جگہ اور زیادہ بڑھتے جاتے ہو) اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اس سے مُنہ نہ موڑو۔"

۵۳ (ان لوگوں نے) کہا "اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر تو آیا نہیں (جسے ہم دلیل سمجھیں) اور ہم ایسا کرنے والے نہیں کہ تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں۔"

"ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے" (اسی لیے اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے)

(۵۱) قوم عاد میں حضرت ہود علیہ السلام کا ظہور ہوا۔

(ا) انہوں نے کہا اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تمہارے عقائد و اعمال حقیقت کے خلاف محض افترا ہیں۔

میں کسی معاوضہ کا طالب نہیں۔ یہ محض ادائے فرض کا تقاضہ ہے جو مجھے دعوت الی الحق پر مجبور کر رہا ہے۔

(ب) لیکن ان کی قوم نے ان مواعظ پر کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا تمہارے پاس کوئی ایسی بات نہیں جو ہمارے نزدیک دلیل ہو۔ ہم تو اپنے معبودوں کی پرستش چھوڑنے والے نہیں۔

ہمارے خیال میں جو بات آتی ہے، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار تمہیں لگ گئی ہے۔ اسی لیے ایسے خیالات آنے لگے ہیں۔

(ج) حضرت ہود نے کہا تم کہتے ہو، تمہارے معبودوں کی مجھ پر مار ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھے تمہارے تمام معبودوں سے کوئی سروکار نہیں۔ اب تم اور تمہارے معبود جو کچھ میرے خلاف کر سکتے ہیں کر دیکھیں۔ تمہارا بھروسا ان معبودوں پر ہے۔ میرا اللہ پر ہے جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔

میرا کام تبلیغ حق تھا میں نے کر دیا۔ اب اگر سچائی کی طرف سے تم نے رخ پھیر لیا ہے، تو جان لو کہ قانون الٰہی کے مطابق تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو ملے گی اور تم ہلاکت سے دوچار ہو گے۔

(د) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مومنوں نے نجات پائی۔ سرکش ہلاک ہو

قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝ مِن دُونِهِ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا ۵۴
تُنظِرُونِ ۝ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي ۵۵
عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي ۵۶
قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ۝ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا ۵۷
هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝ وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا ۵۸

ہودؑ نے کہا "میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہو، کہ جن ہستیوں کو تم نے اس کا شریک بنا رکھا ہے، مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ تم سب مل کر میرے خلاف جو کچھ تدبیریں کر سکتے ہو، ضرور کرو، اور مجھے (ذرا بھی) مہلت نہ دو (پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے!)" ۵۴ ۵۵

"میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے۔ اور تمہارا بھی۔ کوئی حرکت کرنے والی ہستی نہیں کہ اُس کے قبضہ سے باہر ہو[^۱]۔ میرا پروردگار (حق و عدل کی) سیدھی راہ پر ہے" (یعنے اُس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی) ۵۶

"پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لیے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور (مجھے تو نظر آرہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دیدیگا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے" ۵۷

اور (دیکھو) جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو ہم نے اپنی رحمت سے ہودؑ کو بچا لیا، اور اُن لوگوں کو بھی بچا لیا جو اس کے ساتھ (سچائی پر) ایمان لائے تھے، اور ایسے عذاب سے بچایا کہ بڑا ہی سخت عذاب تھا! ۵۸

یہ ہے سرگزشت عاد کی۔ اُنہوں نے اپنے پروردگار

(ھ) آیت (۵۶) میں "ربی و ربکم" کا زور جس بات پر ہے، اُسے سمجھ لینا چاہیے۔ ان تمام مشرک قوموں کو اس بات سے انکار نہ تھا کہ ایک خالق و پروردگار ہستی موجود ہے اور اصلی طاقت اُسی کی طاقت ہے۔ یعنے وہ توحید ربوبیت سے بے خبر نہ تھے لیکن ساری گمراہی یہ تھی کہ توحید الوہیت میں کھوئے گئے تھے۔ یعنے سمجھتے تھے، اُس پروردگار ہستی کے ماتحت دوسری ہستیاں بھی ہیں جنہیں تصرف کا اختیار مل گیا ہے، اور اس لیے ہیں اُن کی پوجا کرنی چاہیے۔ پس ربی و ربکم کا مطلب یہ ہوا کہ میرا بھروسہ تو اس پر ہے، جسے میں بھی رب یقین کرتا اور تم بھی سب مانتے ہو۔

(د) آیت (۵۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد پر ظالم و سرکش بادشاہ حکمراں تھے۔ اور فراعنۂ مصر کی طرح اپنے آپ کو [illegible] تھے۔ فرمایا اُنہوں نے خدا کے رسولوں سے نافرمانی کی اور سرکش و ظالم حکمرانوں کا کہا مانا۔ یعنے جو حق و عدالت کی طرف بلاتے تھے، اُن سے تو منکر ہوئے، اور جو ظلم و سرکشی کرتے تھے، اُن کے پیچھے چلے! ایسے گروہ کے لیے بجز ہلاکت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

"رسلہ" اس لیے کہا کہ گو اُنہوں نے انکار ایک رسول کا کیا تھا، لیکن اُس کی تعلیم تمام رسولوں ہی کی تعلیم تھی۔ پس ایک

[^۱]: آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "کوئی چلنے والا وجود نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ نے اُسے اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے" یہ عربی کا محاورہ ہے، اور اسی معنی میں بولا جاتا ہے جو متن میں اختیار کیے گئے ہیں ۱۲

۵۹ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ

۶۰ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ

۶۱ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ ۭ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝ قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ

اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ

کو جھٹلایا۔ اسے تو جھٹلانا ہوا نیز اُن کے انکار کو "جحود" سے تعبیر کیا۔ جحدوا بآیات ربھم تاکہ واضح ہوجائے اُن کے انکار کی نوعیت کیا تھی! جحود کے معنی یہ ہیں کہ جان بوجھ کر محض ہٹ اور شرارت کو انکار کرنا۔ چنانچہ تفصیل تفسیر فاتحہ میں گزر چکی ہے۔

۵۹ کی نشانیاں (ہٹ دھرمی اور سرکشی کرتے ہوئے) جھٹلائیں اور اُس کے رسولوں کی نافرمانی کی، اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی!

اور ایسا ہوا کہ دنیا میں بھی اُن کے پیچھے لعنت پڑی (یعنے رحمتِ الٰہی کی برکتوں سے محرومی ہوئی) اور قیامت کے دن بھی۔ تو سُن رکھو کہ قوم عاد نے اپنے پروردگار کی ناشکری کی! اور سُن رکھو کہ عاد کے لیے محرومی کا اعلان ہوا جو ہود کی قوم تھی!

(۱۶) قوم ثمود میں حضرت صالح (علیہ السلام) کا ظہور ہوا۔

(ل) انہوں نے کہا۔ اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

دیکھو، کون ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا۔ یعنے ایسی چیز سے پیدا کیا جو زمین کی مٹی کا خمیر تھی (جیسا کہ دوسری جگہ صراحت کی ہے) اور پھر تم سے اُس کی آبادی و رونق کردی؟ کیا پروردگارِ عالم کے سوا کوئی ہوسکتا ہے؟ پھر کیا وہی اُس کا مستحق نہیں کہ اُس کی بندگی کی جائے؟

سرکشی سے باز آجاؤ اور اُس کی طرف رجوع ہو۔

(ب) قوم نے کہا۔ ہمیں تو تمہاری ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں تھیں کہ ہماری سرداری اور پیشوائی کروگے۔ یہ تمہیں کیا ہوگیا کہ ہمارے بزرگوں کے طریقہ کو بُرا کہتے ہو، اور اس سے ہمیں ہٹانا چاہتے ہو!

ہمیشہ یہ بات دیکھی گئی ہے، اور اب بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ جب کبھی ایک غیر معمولی قابلیت کا آدمی قوم میں پیدا ہوتا ہے، تو لوگ اُس کی قابلیت سراہتے ہیں، اور اُس سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں کہ یہ ہمارا پیشوا ہوگا، باپ دادے کا نام روشن کریگا۔ لیکن جب وہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے جو اُن کے طور طریقے کے خلاف ہوتی ہے، تو گردن موڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

۶۰ اور ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا۔

اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اور پھر اُسی میں تمہیں بسا دیا۔ پس چاہیے کہ اُس سے بخشش مانگو، اور اُسکی طرف رجوع ہو کر رہو۔ یقین کرو۔ میرا پروردگار (ہر ایک کے) پاس ہے۔ اور (ہر ایک کی) دعاؤں کا جواب دینے والا ہے!"

۶۱ لوگوں نے کہا "اے صالح! پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ اُن معبودوں کی پوجا نہ کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں؟ اور کیسی بات ہے؟! ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شبہ ہے

مِمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً ۶۲
فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ۶۳
لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝ فَعَقَرُوْهَا ۶۴
فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ

یہ تو کُھلا نکلا۔ ہماری ساری اُمیدیں خاک میں ملا دیں۔ گویا بزرگی و پیشوائی کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ جو بات حق معلوم ہو، اُس کی لوگوں کو دعوت دی جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ لوگ جسے حق سمجھتے ہوں، اُس کی پیروی کی جائے، اور اُسی کی طرف لوگوں کو بھی دعوت دی جائے!

قرآن نے یہاں قوم ثمود کا جو جواب نقل کیا ہے، اس کا مطلب یہی ہے۔

(ج) حضرت صالح نے کہا: تم غور نہیں کرتے کہ اگر ایک شخص پر اللہ نے علم و بصیرت کی راہ کھول دی ہو، اور وہ دیکھ رہا ہو کہ سچائی وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھ رکھی ہے، تو پھر کیا محض لوگوں کے پاس خاطر سے اس کا اظہار نہ کرے؟ اچھا، بتلاؤ، اگر وہ حکم حق سے سرتابی کرے، تو کونی ہے جو خدا کے مواخذہ سے اُسے بچالیگا؟ اگر میں محض اس خیال سے کہ تمہاری اُمیدوں کو ٹھیس نہ لگے، سچائی کا اعلان نہ کردوں، تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دوں۔

(د) بہرحال اُنہوں نے سرکشی کی نتیجہ یہ نکلا کہ مومنوں نے نجات پائی۔ سرکش ہلاک ہوئے۔

اونٹنی کے معاملہ کی تشریح اعراف (۷۳) کے نوٹ میں گزر چکی ہے۔

حضرت ہود اور حضرت صالح کی سرگزشتوں پر اختصار ملحوظ رہا۔ کیونکہ ان دونوں کا ظہور عرب ہی میں ہوا تھا۔ اور مخاطبین ان سے ناآشنا نہ تھے۔

جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اترتی نہیں"

صالح نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں اور اُس نے اپنی رحمت مجھے عطا فرمائی ہو، تو پھر کون ہے جو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کریگا اگر میں اُس کے حکم سے سرتابی کروں؟ تم (اپنی توقع کے مطابق دعوت کا رد کر کے) مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ تباہی کی طرف لیجانا چاہتے ہو"۔ ۶۳

"اور اے میری قوم کے لوگو! دیکھو، یہ اللہ کی اونٹنی (یعنے اُس کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی) تمہارے لیے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے۔ پس اُسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں چرتی رہے۔ اسے کسی طرح کی اذیت نہ پہنچانا، ورنہ فوراً عذاب تمہیں آپکڑیگا"۔ ۶۴

لیکن لوگوں نے (اور زیادہ ضد میں آ کر) اُسے ہلاک کر ڈالا۔ تب صالح نے کہا "(اب تمہیں صرف) تین دن (کی مہلت ہے)۔ اپنے گھروں میں کھا پی لو یہ وعدہ ہے۔ جھوٹا نہ نکلیگا"۔ ۶۵

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو ہم نے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچالیا، اور اُس دن کی رسوائی سے نجات دیدی۔ (اے پیغمبر!)

۶۶–۶۸ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ○ وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ○ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا إِنَّ ثَمُودَ كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ○ ع وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَامٌ ۖ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ ○ فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۚ قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ○ وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِن وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ○ (۶۹–۷۱)

۶۶ بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے!

۶۷ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، اُن کا یہ حال ہوا کہ ایک زور کی کڑک نے آلیا جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ (وہ اس طرح اچانک مر گئے) گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے!

۶۸ تو سُن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کی ناشکری کی، اور ہاں سُن رکھو کہ ثمود کے لیے محرومی ہوئی!

۶۹ اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے تھے۔ اُنہوں نے کہا "تم پر سلامتی ہو" ابراہیم نے کہا "تم پر بھی سلامتی" پھر ابراہیم فوراً ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا (اور اُن کے سامنے رکھ دیا کہ یہ میرے مہمان ہیں)

۷۰ پھر جب اُس نے دیکھا، اُن کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہیں، تو اُن سے بدگمان ہوا، اور جی میں ڈرا (کہ یہ کیا بات ہے؟) اُنہوں نے کہا "خوف نہ کر، ہم تو (اللہ کی طرف سے) قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں"

۷۱ اور اُس کی بیوی (سارہ) بھی (خیمہ میں) کھڑی (سُن رہی) تھی۔ وہ ہنس پڑی (یعنے اندیشہ کے دور ہو جانے سے خوش ہو گئی) پس ہم نے اُسے (اپنے فرستادوں کے ذریعہ) اسحاق (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی، اور اس کی کہ اسحاق کے بعد یعقوب کا ظہور ہوگا۔

(۱۷) حضرت لوط (علیہ السلام) کی دعوت اور باشندگانِ سدوم کی ہلاکت۔

تورات میں ہے کہ حضرت لوط حضرت ابراہیم کے بھتیجے اور حاران کے بیٹے تھے۔ یہ حضرت ابراہیم کے ساتھ شہر اور سے آئے، اور سدوم میں مقیم ہو گئے جو دریائے یردن کی ترائی میں واقع تھا۔ چونکہ سدوم کی ہلاکت کی خبر پہلے حضرت ابراہیم کو دی گئی تھی، اس لیے سرگزشت کی ابتدا انہی کے ذکر سے ہوئی۔

(ل) فرشتوں نے دو باتوں کی خبر دی۔ ایک یہ کہ قوم لوط کی ہلاکت کا وقت آگیا۔ دوسری یہ کہ سارہ کے بطن سے حضرت اسحاق کی پیدایش ہوگی، اور اُن سے حضرت یعقوب پیدا ہونگے۔

ان دونوں باتوں میں بظاہر کوئی علاقہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ کیوں دونوں کی خبر یک وقت دی گئی، کیوں دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا؟ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ دونوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط (علیہما السلام) جب کسدیوں کے ملک سے آکر فلسطین میں مقیم ہوئے، تو یہ ملک ان کے لیے اجنبیوں کا ملک تھا، لیکن مشیت الٰہی کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ ایک دن اسی سرزمین پر ان کی نسل حکمرانی کریگی اس نسل کا ظہور کس سے ہوا؟ اسرائیل سے۔ یعنے حضرت یعقوب سے۔ وہ کس کے لڑکے تھے؟ حضرت اسحٰق کے۔ پس

قَالَتْ يَٰوَيْلَتَىٰٓ ءَأَلِدُ وَأَنَا۠ عَجُوزٌ وَهَٰذَا بَعْلِى شَيْخًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيبٌ ۝ قَالُوٓا۟ أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ ٱللَّهِ ۖ رَحْمَتُ ٱللَّهِ وَبَرَكَٰتُهُۥ عَلَيْكُمْ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ ۚ إِنَّهُۥ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ۝ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَٰهِيمَ ٱلرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ ٱلْبُشْرَىٰ يُجَٰدِلُنَا فِى قَوْمِ لُوطٍ ۝ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ۝ يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَآ ۖ إِنَّهُۥ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ ءَاتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ۝ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا

۷۲ — ۷۳ — ۷۴-۷۵ — ۷۶

وہ بولی "افسوس مجھ پر! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے اولاد ہو حالانکہ میں بڑھیا ہو گئی ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے؟ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے!" ۷۲

اُنہوں نے کہا "کیا تو اللہ کے کاموں پر تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اُس کی برکتیں تجھ پر ہوں، اے اہل خانۂ ابراہیم! (اُس کے فضل و کرم سے یہ بات کچھ بعید نہیں ہے) بلاشبہ اُسی کی ذات ہے جس کی ستائشیں کی جاتی ہیں، اور وہی ہے جس کے لیے ہر طرح کی بڑائیاں ہیں!" ۷۳

پھر جب ابراہیم کے دل سے اندیشہ دور ہو گیا اور اُسے خوشخبری ملی، تو قوم لوط کے بارے میں ہم سے جھگڑنے لگا (یعنے ہمارے فرستادوں سے بار بار سوال و جواب کرنے لگا کہ آنے والی بلا ٹل جائے) ۷۴ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا ہی بردبار، بڑا ہی نرم دل، اور (ہر حال میں) اللہ کی طرف رجوع ہو کر رہنے والا تھا! ۷۵

(ہمارے فرستادوں نے کہا) "اے ابراہیم! اب اس بات کا خیال چھوڑ دے۔ تیرے پروردگار کی (ٹھہرائی ہوئی) بات جو تھی، وہ آ پہنچی، اور ان لوگوں پر عذاب آ رہا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا" ۷۶

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے، تو وہ اُن کے آنے سے خوش نہیں ہوا، اُن کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ بولا "آج کا دن تو

فرشتوں نے بیک وقت دو باتوں کی خبر دی۔ ایک میں ایمان و نیک عملی کی کامرانیوں کا اعلان تھا۔ دوسری میں انکار و بدعملی کی ہلاکتوں کا۔ یعنے جس دن اس بات کی خبر دی گئی کہ سدوم اور عمورہ کا علاقہ بدعملیوں کی پاداش میں ہلاک ہونے والا ہے، اُسی دن اسکی بھی بشارت دیدی گئی کہ نیک عملی کے نتائج ایک نئی نسل طیار کر رہے ہیں، اور وہ عنقریب اس تمام ملک پر حکمرانی کرنے والی ہے!

پھر معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ سدوم اور عمورہ کا علاقہ فلسطین کا سب سے زیادہ شاداب علاقہ تھا۔ اور معلوم ہے کہ سارہ تمام عمر اولاد کی تمنائیں کرتے کرتے بالآخر مایوس ہو چکی تھیں۔ پس قدرتِ الٰہی نے بیک وقت دونوں کرشمے دکھلا دیے: جو زمین سب سے زیادہ شاداب ہے، وہ بدعملیوں کی پاداش میں ایسی اُجڑیگی کہ پھر کبھی سرسبز و شاداب نہ ہو سکیگی۔ جو شجرِ اُمید بالکل سوکھ چکا ہے، وہ اچانک اس طرح سرسبز ہو جائیگا کہ صدیوں تک اُس کی شاخیں بارآور رہینگی!

چنانچہ سدوم اور عمورہ کا علاقہ آتش فشاں مادہ کے انفجار سے ایسا بنجر ہوا کہ آج تک بنجر ہے، اور بشارت پر پورا سال بھی نہیں گزرا تھا کہ حضرت اسحاق کی پیدائش ظہور میں آگئی، اور پھر اُن کی نسل روز بروز بڑھتی اور پھیلتی گئی۔

(ھ) حضرت ابراہیم کی ایک بیوی سارہ تھی ایک ہاجرہ۔ ہاجرہ سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے، لیکن سارہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ مایوس ہو گئی۔ پھر مایوسی کے بعد یہ بشارت ملی اور حضرت اسحٰق پیدا ہوئے۔

(و) تورات (پیدائش ۱۹: ۲۳) میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے بار بار التجائیں کیں کہ عذاب ٹل جائے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے

سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ○ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ
ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ○ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ
مَا نُرِيْدُ ○ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ○ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ
يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا
مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ○

بڑی مصیبت کا دن ہے!"

اور اُس کی قوم کے لوگ (اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر) دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ پہلے سے بُرے کاموں کے عادی ہو رہے تھے۔ لوط نے اُن سے کہا "لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں (یعنے بستی کی عورتیں جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا، اور جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا) یہ تمہارے لیے جائز اور پاک ہیں۔ پس اُن کی طرف ملتفت ہو۔ دوسری بات کا قصد نہ کرو اور) اللہ سے ڈرو۔ میری مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟"

ان لوگوں نے کہا "تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اور تو اچھی طرح جانتا ہے، ہم کیا کرنا چاہتے ہیں" ۷۹

لوط نے کہا "کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی۔ یا کوئی سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا!" ۸۰

(تب مہمانوں نے کہا "اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ (گھبرانے کی کوئی بات نہیں) یہ لوگ کبھی تجھ پر قابو نہ پا سکینگے۔ تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں کو ساتھ لے کر نکل چل۔ اور تم میں سے کوئی اِدھر اُدھر نہ دیکھے (یعنے اور کسی بات کی فکر نہ کرے) مگر ہاں، تیری بیوی (ساتھ دینے والی نہیں۔ وہ پیچھے رہ جائیگی، اور) جو کچھ ان لوگوں پر گزرنا ہے وہ اس پر بھی گزریگا۔ ان لوگوں کے لیے عذاب کا مقررہ وقت صبح کا ہے، اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں۔" ۸۱

سدوم میں چند آدمی ہی نیک کردار باقی رہ گئے ہوں لیکن اللہ نے فرمایا وہاں دس آدمی بھی ایسے نہ رہے جو نیک کردار ہو سکتے۔ کہ آیت (۷۴) میں مجادلنا سے مقصود یہی بات ہو یا اسی طرح کی کوئی بات۔ بہرحال اللہ نے ان کی اس سعی کی مدح کی کہ یہ ان کے حلم اور رحم و شفقت کا نتیجہ تھی۔ پھر واضح کر دیا کہ بات ٹلنی والی نہیں تھی وقت آپہنچا تھا۔

(ز) حضرت لوط کو مہمانوں کے آنے سے اس لیے پریشانی ہوئی کہ وہ جانتے تھے، شہر کے باشندے ضرور حملہ آور ہونگے۔ کیونکہ اُن کا قاعدہ تھا، جب کبھی کوئی اجنبی مسافر آپہنچتا تو اُس پر حملہ کر دیتے اور سمجھتے ہمارے خبیثانہ افعال کے لیے ایک شکار ہاتھ آگیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(ح) اعراف میں حضرت لوط کے وعظ و نصیحت اور قوم کی سرکشی کا حال گزر چکا ہے (آیت ۸۰) یہاں اس کی تفصیل کی کہ عذاب کا ظہور کن حالات میں ہوا تھا۔ بہرحال نتیجہ یہی نکلا کہ قوم ہلاک ہوئی، اور حضرت لوط اور اُن کے ساتھیوں پر کوئی آنچ نہ آئی۔

فَلَمَّا جَاۤءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِىَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۚ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّىْۤ اَرٰٮكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۚ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۤءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۚ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ

۸۲ ۸۳ ۸۴ (ع ۱۵)

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو (اے پیغمبر!) ہم نے اس (بستی) کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں۔ (یعنے تمام بلند عمارتیں گرا کر زمین کے برابر کر دیں) اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے کہ تیرے پروردگار کے حضور (اس غرض سے) نشانی کیے ہوئے تھے[۱]۔ یہ (بستی) ان ظالموں سے (یعنی اشرارِ مکہ سے) کچھ دور نہیں ہے (یہ اپنی سیر و سیاحت میں وہاں سے گزرتے رہتے ہیں، اور اگر چاہیں، تو اُس سے عبرت پکڑ سکتے ہیں) ۸۲ ۸۳

اور ہم نے (قبیلہ) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اور ماپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو۔ (یعنے خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔ پس کفرانِ نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائیگا۔ ۸۴

"اور اے میری قوم کے لوگو! ماپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔ لوگوں کو اُن کی چیزیں (اُن کے حق سے) کم نہ دو۔ ملک میں شر و فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ اگر تم میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ کا دیا (کاروبار میں) بچ رہے، اُسی میں تمہارے لیے بہتری ہے،" اور دیکھو (میرا کام تو صرف نصیحت کر دینا ہے)۸۵

(۱۸) قبیلۂ مدین میں حضرت شعیب (علیہ السلام) کی دعوت کا ظہور ہوا۔

تورات میں ہے کہ قطوراکے بطن سے حضرت ابراہیم کے چھ لڑکے ہوئے جن میں سے ایک کا نام مدیان تھا (پیدائش ۲۵: ۲) یہی "مدیان" عربی میں "مدین" ہو گیا۔ اس کی اولاد بحرِ قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی۔ جن میں حضرت شعیب کا ظہور ہوا۔ بنی اسرائیل انہیں بنی قطورہ کہتے تھے۔

(الف) حضرت شعیب نے کہا۔ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

ماپ تول میں خیانت نہ کرو۔ نہ تو حق سے زیادہ لو، نہ حق سے کم دو۔

ملک میں شر و فساد پھیلاتے نہ پھرو نہ لوٹ مار کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم خوشحال ہو، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ عذاب میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔

(ب) لوگوں نے کہا۔ تم اپنے خدا کی جتنی عبادت کرنی چاہو شوق سے کرو۔ لیکن کیا تمہاری نمازیں یہ بھی کہتی ہیں کہ دوسروں کو ان کی راہ سے ہٹاؤ؟ اور اس راہ سے ہٹاؤ جس پر اُن کے باپ دادا چلتے گئے ہیں! ہم اپنے مال کے مالک مختار ہیں جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ تم اپنے ماپ تول کی باتیں رہنے دو۔

معلوم ہوتا ہے، ساری دنیا میں صرف تم ہی ایک نیک

[۱] دیکھو اعراف آیت (۸۰) کا نوٹ۔

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ

۸۶

نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ○ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ

۸۷

عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ وَ

۸۸

يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ

۸۶ اور خوش معاملہ آدمی رہ گئے ہو!

(ج) حضرت شعیب نے کہا۔ اگر اللہ نے مجھ پر علم و بصیرت کی راہ کھول دی ہو اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہلاکت کی طرف جا رہے ہو، تو بتلاؤ، کیا میرا فرض نہیں ہے کہ تمہیں سلامتی کی راہ دکھاؤں؟ اُس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے رزق و دولت کی فراوانی عطا فرمائی ہے، پھر کیا یہ کفرانِ نعمت نہ ہوگا کہ ادائے فرض میں کوتاہی کروں؟

اور پھر تم میری ضد میں آکر کیوں حق سے منہ موڑو؟ میں ایسا تو نہیں کرتا کہ تمہیں ایک بات سے روکوں اور پھر خود وہی کرنے لگوں۔ میں وہی بات کہتا ہوں جس پر خود عامل ہوں۔

۸۷ اور تم میری تبلیغ سے بگڑتے کیوں ہو؟ میں کچھ تم پر نگہبان بن کر تو نہیں کھڑا ہو گیا ہوں کہ مجبور کروں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں۔ جہاں تک میرے بس میں ہے۔ اور میرے کاموں کو بننا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بننا ہے۔ میرا بھروسہ صرف اسی پر ہے!

میں کچھ تم پر نگہبان نہیں، (کہ جبراً اپنی راہ پر چلا دوں)

لوگوں نے کہا "اے شعیب! کیا تیری یہ نماز (جو تو اپنے خدا کے لیے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہمیں آکر کہے: ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں تمہارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں۔ یا یہ کہ تمہیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو، کرو؟ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو!"

شعیب نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن رکھتا ہوں، اور (اس کے فضل و کرم کا یہ حال ہو کہ) اچھی (سے اچھی) روزی عطا فرما رہا ہو، (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہِ حق کی طرف نہ بلاؤں؟) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں، اُس سے تمہیں تو روکوں اور خود اس کے خلاف چلوں (میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں، اسی پر عمل بھی کرتا ہوں) میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے، اصلاحِ حال کی کوشش کروں۔ میرا کام بننا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بننا ہے۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا، اور اُسی کی طرف رجوع ہوں!"

۸۸

(د) بحرِ قلزم کی جو شاخ عرب اور جزیرہ نمائے سینا کے درمیان گزری ہے، اُسی کے کنارے مدین کا قبیلہ آباد تھا چونکہ یہ جگہ شام، افریقہ، اور عرب کے تجارتی قافلوں کا نقطۂ اتصال تھی، اس لیے اشیاءِ تجارت کے مبادلہ کی بڑی منڈی بن گئی

"اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آکر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا قومِ نوح کو یا قومِ ہود کو یا قومِ صالح

وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ۝ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ۝ قَالُوا ۸۹-۹۰
يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ
وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ۝ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ۹۱
ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝ وَيَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ ۹۲
تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ

تھی اور لوگ خوشحال ہوگئے تھے۔ اسی لیے حضرت شعیب نے کہا: انی اراکم بخیر (۸۴) میں تمہیں خوشحال پاتا ہوں۔

لیکن جب لوگوں کے اخلاق فاسد ہوگئے تو کاروبار میں خیانت کرنے لگے، اور ماپ تول کے انصاف سے نا آشنا ہوگئے یہی وجہ ہے کہ حضرت شعیب نے خصوصیت کے ساتھ اس معصیت سے روکا۔

(ہ) جو مکالمہ گزر چکا ہے، اُس پر اچھی طرح غور کرو۔ لوگوں نے کہا، تم نماز پڑھتے ہو، لیکن تمہارے نماز پڑھنے کا نتیجہ یہ کیوں نکلے کہ ہم لوگوں کو بھی اپنی راہ چلنے کی دعوت دو؟ یعنے بنائے نزاع خود تمہارا عمل نہیں ہے، یہ ہے کہ دوسروں کو کیوں دعوت دیتے ہو؟ حضرت شعیب نے کہا، یہی تو میرا اصلی کام ہے اسے کیسے چھوڑ دوں؟ سچائی کی روشنی میرے سامنے آگئی ہے، اور جب آگئی ہے تو اس کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔ البتہ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے مجھے حق نہیں کہ کسی پر جبر کروں۔ اس سے معلوم ہوا، اتباعِ حق کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ آدمی خود متبع ہوجائے، بلکہ ضروری ہے کہ دوسروں کو بھی اُس کی دعوت دے۔

(و) اتباعِ حق کی راہ میں ذاتی خصومت اور شخصی حسد سے بڑھ کر کوئی روک نہیں۔ مکالمہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ قبیلہ کے سرداروں کو حضرت شعیب سے ذاتی خصومت ہوگئی تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کہا۔ ایسا نہ کرو کہ میری ضد میں آکر پیامِ حق کے مخالف ہوجاؤ، اور خدا کے مواخذہ میں گرفتار ہو۔

(ز) انسان انسانوں کا پاس کرتا ہے، لیکن سچائی کا پاس نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے خیال سے ایک بات چھوڑ دیگا، لیکن خدا کے خیال سے نہیں چھوڑیگا۔ چنانچہ منکروں نے کہا۔ ہم تجھے سنگسار کر دیتے لیکن تیرے کنبہ کے خیال سے ایسا

کو پیش آچکا ہے، اور قومِ لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں[1]۔" ۸۹

"اور دیکھو اللہ سے (اپنے گناہوں کی) معافی مانگو۔ اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا، بڑا ہی محبت والا ہے!" ۹۰

لوگوں نے کہا "اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو، اس میں سے اکثر باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں ایک کمزور آدمی ہو۔ اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں" ۹۱

شعیب نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے لیے کچھ نہ ہوا کہ اسے پیچھے ڈال دیا؟ (اچھا) جو کچھ تم کرتے ہو، میرے پروردگار کے احاطہ (علم) سے باہر نہیں" ۹۲

"اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ۔ میں بھی (اپنی جگہ) سرگرمِ عمل ہوں۔ بہت جلد معلوم کر لوگے کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اُسے رسوا کریگا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے۔ انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ

[1] یعنی ان کا معاملہ کچھ بہت پرانے زمانے کی بات نہیں۔ قریبی زمانہ کی بات ہے۔

۹۳ رَقِيبٌ ۝ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ
۹۴ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۝ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا
۹۶-۹۵ بَعِدَتْ ثَمُودُ ۝ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوا
۹۷ أَمْرَ فِرْعَوْنَ ۖ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ۝ يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ وَبِئْسَ
۹۹-۹۸ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ۝ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ۝ ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ

۹۳ نہیں کرتے۔ حضرت شعیبؑ نے کہا: افسوس تم پر! تمہیں میرے کنبہ کا تو پاس ہوا لیکن خدا کا پاس نہ ہوا۔ خدا کی بات تو تمہارے خیال میں کوئی بات ہی نہیں ہے۔

(۹۳) حضرت شعیبؑ نے کہا: اچھا، تم اپنی راہ چلو میں اپنی راہ میں رہوں۔ اور نتیجہ کا انتظار کرو۔ چنانچہ نتیجہ ظاہر ہوگیا۔ اہل ایمان محفوظ رہے۔ سرکش ہلاک ہوگئے!

انتظار کرتا ہوں"

اور پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا، تو ایسا ہوا کہ ہم نے شعیبؑ کو اور اُن کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا، اور جو لوگ ظالم تھے، انہیں ایک سخت آواز نے

۹۴ آ پکڑا! پس جب صبح ہوئی تو اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے!

(وہ اس طرح اچانک ہلاک ہوگئے) گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہیں تھے!

۹۵ تو سُن رکھو کہ قبیلۂ مدین کے لیے بھی محرومی ہوئی، جس طرح قوم ثمود کے لیے محرومی ہوئی تھی!

۹۶ اور (یہ بھی ہو چکا ہے کہ) ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا تھا۔ فرعون اور

(۱۹) حضرت موسیٰ کی دعوت اور اس کے نتائج کی طرف اشارہ، اور استدلال کی موعظت کا اختتام۔

اُس کے سرداروں کی طرف۔ مگر وہ فرعون کی بات پہ چلے، اور فرعون کی بات راست بازی کی بات

۹۷ نہ تھی۔

قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا (جس طرح دنیا میں گمراہی کے لیے ہوا) اور انہیں

۹۸ دوزخ میں پہنچائیگا۔ تو دیکھو، کیا ہی پہنچنے کی بُری جگہ ہے جہاں وہ پہنچ کر رہے!

اور اس دنیا میں بھی لعنت اُن کے پیچھے لگی (کہ اُن کا ذکر کبھی پسندیدگی کے ساتھ نہیں کیا جاتا) اور

۹۹ قیامت میں بھی (کہ عذاب آخرت کے مستحق ہوئے) تو دیکھو کیا ہی برا صلہ ہے جو اُن کے حصے میں آیا!

(اے پیغمبر!) یہ (پچھلی) آبادیوں کی خبروں میں سے چند کا بیان ہے جو ہم تجھے سنا رہے ہیں۔ ان میں

(۲۰) سورت کی ابتدا میں قوم کو اتباع حق کی دعوت دی تھی اور سرکشی و فساد کے نتیجہ سے خبردار کیا تھا۔ نیز واضح کیا تھا کہ اس باب میں بنیادی امور کیا ہیں۔ پھر آیت (۲۴) میں ان سب کا خلاصہ بیان کیا تھا کہ یہاں راہیں دو ہیں، ایک

۱۰۰ سے کچھ تو اس وقت تک قائم ہیں۔ کچھ بالکل اُجڑ گئیں۔

اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ خود اُنہوں نے

الْقُرَىٰ نَقُصُّهُ عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ ۝ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مِن شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ۝ وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ ۝ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ۝

علم وبصیرت کی۔ ایک اندھےپن کی، اور ضروری ہے کہ دونوں کے چلنے والے اپنی حالت اور اپنے نتیجہ میں ایک ہی طرح کے نہ ہوں۔ پھر اس حقیقت پر دلیل پیش کی تھی۔ یہ گزشتہ ایام و وقائع کا بیان تھا جو حضرت نوح کے تذکرہ سے شروع ہوا، اور حضرت موسیٰ کے تذکرہ پر ختم ہوگیا۔ اب آیت (۱۰۰) سے لیکر آخر سورت تک ان نتیجوں اور عبرتوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس سلسلۂ استدلال سے واضح ہوتی ہیں:

(ا) ان قوموں کو جو کچھ پیش آیا تو اس لیے نہیں پیش آیا کہ اللہ نے اُن پر زیادتی کی ہو۔ اُس کا قانون جزاء تو سرتاسر عدل و رحمت ہے۔ بلکہ اس لیے ہوا کہ اُنہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کرنا چاہا، اور نجات کی راہ سے مُنہ موڑ کر ہلاکت کی طرف چلنے لگے۔

(ب) اس باب میں اللہ کا قانون ایسا ہی ہے۔ اُس کی رحمت نے مہلتوں پر مہلتیں دی ہیں، اور روشنی کو تاریکی سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ لیکن اگر ایک قوم روشنی سے یک قلم مُنہ موڑ لے، تو پھر نتائج و عواقب کا ظہور کبھی نہیں رک سکتا۔ اُن کے ظہور کی دردناکی و شدت کبھی دور نہیں ہوسکتی۔

(ج) ہر اُس انسان کے لیے جو آخرت کے خیال سے بےخوف نہ ہو، اس بات میں حقیقت کی بڑی ہی نشانی ہے۔ کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزاءِ عمل کا قانون یہاں نافذ ہے، اور خدا کے رسولوں کا پیام جھوٹا نہیں۔

(د) اللہ کے یہاں ہر بات کے لیے ایک حساب ہے، اور ہر معاملہ کے لیے ایک مقررہ میعاد۔ جب تک وہ وقت نہ آئے، اُس بات کا ظہور نہیں ہوسکتا۔ آخرت کا دن بھی اسی لیے پیچھے ڈال دیا گیا کہ اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہو۔

(ہ) اُس دن جو شقی نکلینگے، اُن کے لیے شقاوت ہوگی۔

ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔ تو دیکھو، جب تیرے پروردگار کی (ٹھہرائی ہوئی بات) آ پہنچی، تو اُن کے وہ معبود کچھ بھی کام نہ آئے جنہیں اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے۔ اُنہوں نے کچھ فائدہ نہ پہنچایا بجز اس کے کہ ہلاکی کا باعث ہوئے! (۱۰۱)

اور تیرے پروردگار کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے جب وہ انسانی آبادیوں کو ظلم کرتے ہوئے پکڑتا ہے۔ یقیناً اُس کی پکڑ بڑی ہی دردناک، بڑی ہی سخت ہے! (۱۰۲)

(اور) اس بات میں اُس کے لیے بڑی ہی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب کا خوف رکھتا ہو! یہ (آخرت کا دن) وہ دن ہے جب تمام انسان اکٹھے کیے جائینگے، اور یہ وہ دن ہے جس کا نظارہ کیا جائیگا! (۱۰۳)

اور ہم نے اُس دن کو پیچھے نہیں ڈالا ہے، مگر صرف اس لیے کہ ایک مقررہ وقت پر اُس کا ظہور ہو۔ (۱۰۴)

جب وہ دن آ پہنچیگا تو کسی جان کی مجال نہ ہوگی کہ بغیر اللہ کی اجازت کے زبان کھولے۔ پھر (اُس دن) انسانوں کی دو قسمیں ہونگی، کچھ ایسے ہونگے جن کے لیے محرومی ہے، اور کچھ ایسے جن کے لیے سعادت۔ (۱۰۵)

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ۝ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ ۝ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ ۝ وَإِنَّ كُلًّا لَمَّا

جو سعید نکلینگے، اُن کے لیے سعادت۔

۱۰۶ تو جو لوگ محروم ہوئے، وہ دوزخ میں ہونگے اُن کے لیے وہاں چیخنا چلانا ہوگا۔ وہ اسی میں رہینگے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں۔ (اور اس کے خلاف کچھ نہ ہوگا) مگر ہاں، اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے۔ (اور) بلاشبہ تیرا پروردگار اپنے کاموں میں مختار ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے!

۱۰۷ اور جن لوگوں نے سعادت پائی، تو وہ بہشت میں ہونگے۔ اور اسی میں رہینگے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں۔ (اس کے خلاف کچھ ہونے والا نہیں) مگر ہاں، اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے۔ یہ (سعیدوں کے لیے) بخشش ہے ہمیشہ جاری رہنے والی!

۱۰۸ پس (اے پیغمبر!) یہ لوگ جو (خدا کے سوا دوسری ہستیوں کی) پرستش کرتے ہیں، تو اس بارے میں تجھے کوئی شبہ نہ ہو۔ (یعنے اس بارے میں کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے؟) یہ اسی طرح پرستش کر رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا کرتے رہے ہیں۔ ایسا ضرور ہونے والا ہے کہ ہم اُن (کے اعمال کے نتائج) کا حصّہ انہیں پورا پورا دیدیں۔ بغیر کسی کمی کے۔

۱۰۹ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے پروردگار نے پہلے سے ایک بات نہ ٹھہرا دی ہوتی، (یعنے یہ کہ دنیا میں ہر انسان کو اُس کی مرضی کے مطابق مہلت عمل ملتی ہے) تو البتہ اُن کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور ان لوگوں کو اُس کی نسبت شبہ ہے کہ حیرانی میں پڑے ہیں۔

۱۱۰ اور (یقین کر) سب کے لیے یہی ہونا ہے کہ جب

(۱) آیت (۱۰۹) میں پیغمبر اسلام سے خطاب ہے: تمہیں یہ خیال نہ ہو کہ مشرکین عرب کیوں شرک سے باز نہیں آتے؟ اور کیوں انہیں مہلت مل رہی ہے؟ وہ تو اسی راہ پر چل رہے ہیں، جس پر اُن کے باپ دادا چلے، اور انہیں ان کی سرکشی کا نتیجہ پورا پورا ملنے والا ہے۔

پھر فرمایا، تم سے پہلے حضرت موسیٰ کو بھی کتاب دی گئی تھی، لیکن لوگ اختلاف میں پڑ گئے، اور حکمت الٰہی کا فیصلہ یہی ہے کہ یہاں اختلاف عمل دور نہیں ہو سکتا۔

لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ۝ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝

۱۱۱ ۱۱۲ ۱۱۳ ۱۱۴ ۱۱۵

وقت آئیگا، تو تیرا پروردگار ان کے عمل انہیں پورے پورے دیدیگا (یعنے جیسے اُن کے عمل ہونگے، ویسی ہی ان کے نتائج بھی پورے پورے مل جائینگے) جو کچھ لوگ کر رہے ہیں، وہ اس کی پوری خبر رکھنے والا ہے! (۱۱۱)

پس چاہیے کہ جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، تم اور وہ سب، جو توبہ کرکے تمہارے ساتھ ہولیے ہیں (اپنی راہ میں) اُستوار ہوجاؤ، اور حد سے نہ بڑھو یقین کرو، تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے! (۱۱۲)

اور ایسا بھی نہ کرنا کہ ظالموں کی طرف جھک پڑو اور (قریب ہونے کی وجہ سے) آگ تمہیں بھی چھو جائے اللہ کے سوا تمہارا کوئی رفیق نہیں۔ پھر اگر اس سے بچھڑے تو کہیں مدد نہ پاؤگے۔ (۱۱۳)

اور نماز قائم کرو۔ اُس وقت، جب دن شروع ہونے کو ہو، اور اُس وقت جب ختم ہونے کو ہو نیز اُس وقت جب رات کا ابتدائی حصہ گزر رہا ہو۔ یاد رکھو۔ نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے اُن لوگوں کے لیے جو نصیحت پذیر ہیں! (۱۱۴)

اور صبر کرو (یعنے راہ حق کی تمام مشکلیں جھیلتے رہو) کیونکہ اللہ نیک عملوں کا اجر ضائع نہیں کرتا! (۱۱۵)

(۲۱) پھر آیت (۱۱۲) میں پیغمبر اسلام کو اور اُن کے اُن ساتھیوں کو جو ابتدائے عہد کی بے سروسامانیوں اور مظلومیوں میں ایمان لائے تھے، مخاطب کیا ہے، اور حسب ذیل امور کی تلقین کی ہے۔ یہ اُن کے لیے اس سورت کی موعظت کا خلاصہ ہے:

(ل) جو راہ بتلا دی گئی ہے، اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو اور اپنا کام کیے جاؤ۔

(ب) اپنی حد سے تجاوز نہ کرو۔ یعنے استقامت کا رکا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ مخالفوں پر کسی طرح کی زیادتی کرنے کا خیال کرنے لگو۔ یا لڑنے جھگڑنے لگو۔ اپنے دائرہ کے اندر رہو۔ مگر اپنے طریقہ پر قائم رہو۔

(ج) لیکن یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ مخالفوں کی طرف جھک پڑو، اور نتیجہ یہ نکلے کہ اُن کی گمراہی کی چھینٹ تم پر بھی پڑ جائے۔ نہ تو اپنی حد سے تجاوز کرنا چاہیے، نہ اُنکی طرف جھکنا چاہیے۔

(د) نماز کو اس کی ساری حقیقتوں کے ساتھ اُس کے تمام وقتوں میں ادا کرو۔ تمہاری طاقت کا اصلی سرچشمہ یہی ہے۔ یہ بڑی نیک عملی ہے، اور نیک عملی برائیاں دور کردیتی ہے۔

(ہ) صبر کرو۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ نیک کرداروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ یعنے ضروری ہے کہ آخر کار کامیابی اُنہی کے حصہ میں آئے۔

(و) پچھلی قومیں جو یک سر ہلاک ہوگئیں، تو اس لیے ہوئیں کہ اُن میں اہل خیر و صلاح معدوم ہوگئے تھے۔ کوئی نہیں رہا تھا جو شر و فساد سے روکے۔ اگر ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے موجود ہوتے، تو کبھی اس نتیجہ سے دوچار نہ ہوتے۔ کیونکہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک بستی پر عذاب آئے اور اُس کے باشندے مصلح ہوں۔

اس بات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم اپنی راہ میں مستقیم رہے اور ایک گروہ داعیان حق کا پیدا ہوگیا، تو یہ سرزمین عذاب استئصال سے محفوظ رہیگی۔ یعنے ایسی عذاب

فلولا كان من القرون من قبلكم اولوا بقية ينهون عن الفساد في الارض الا قليلا
۱۱۶ ممن انجينا منهم واتبع الذين ظلموا ما اترفوا فيه وكانوا مجرمين ۝ وما كان ربك
۱۱۷ ليهلك القرى بظلم واهلها مصلحون ۝ ولو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة
۱۱۸ ولا يزالون مختلفين ۝ الا من رحم ربك ولذلك خلقهم وتمت كلمة ربك
۱۱۹ لاملان جهنم من الجنة والناس اجمعين ۝ وكلا نقص عليك من انباء الرسل
ما نثبت به فؤادك وجاءك في هذه

جو یک قلم نابود کر دینے والا ہو، جیسا کہ پچھلی قوموں پر آچکا ہے۔
(ز) یاد رکھو دنیا میں اختلاف فکر و عمل ناگزیر ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ سب ایک ہی راہ چلنے والے ہو جائیں، اور حق و باطل کی کشمکش باقی نہ رہے۔ پس اس بات سے مایوس نہ ہو کہ تمام آدمی کیوں دعوت حق قبول نہیں کر لیتے؟ نہ تو پہلے ایسا ہوا، نہ اب اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ بہت سے ماننے والے بہت سے نہیں ماننے والے۔ تم اپنے کام میں سرگرم رہو۔

پھر (دیکھو) ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جو عہد تم سے پہلے گزر چکے ہیں، ان میں اہل خیر باقی رہے ہوتے اور لوگوں کو ملک میں شر و فساد کرنے سے روکتے؟ ایسا نہیں ہوا مگر بہت تھوڑے عہدوں میں جنہیں ہم نے نجات دی ظلم کرنے والے تو اسی راہ پر چلے جس میں انہوں نے (اپنی نفس پرستیوں کی) آسودگی

۱۱۶ پائی تھی۔ اور (وہ سب احکام حق کے) مجرم تھے۔

اور (یاد رکھو) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کر دے اور اُس کے
۱۱۷ باشندے سنوارنے والے ہوں!

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک اُمت بنا دیتا (یعنے سب ایک ہی راہ چلتے) لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اُس نے ایسا نہیں چاہا، اور یہاں الگ الگ گروہ اور الگ الگ راہیں ہوئیں)
۱۱۸ اور لوگ ایسے ہی رہیں گے کہ مختلف ہوں۔ مگر ہاں جس پر تیرے پروردگار نے رحم فرمایا، (تو وہ حقیقت پالیگا اور اس بارے میں اختلاف نہیں کریگا) اور اسی لیے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور (پھر دیکھو اسی اختلاف فکر و عمل کا نتیجہ ہے کہ) تمہارے پروردگار کی (ٹھہرائی ہوئی) بات پوری ہو کر رہی کہ البتہ ایسا ہوگا کہ میں جہنم
۱۱۹ کو کیا جن اور کیا انسان، سب سے بھرپور کر دوں!

(۲۴) یہاں آیت (۱۲۰) میں واضح کر دیا کہ گزشتہ رسولوں کی سرگزشتیں جو مختلف مقامات میں اور مختلف اسلوبوں میں بیان کی گئی ہیں ان سے قرآن کا مقصد کیا ہے:۔
(۱) تاکہ تیرے دل کو تسکین ہو۔ یعنے قوم کو اعراض و سرکشی کی حالت میں دیکھ کر تیرا دل بیقرار ہے۔ دعوت کا ولولہ اور

اور (اے پیغمبر!) رسولوں کی سرگزشتوں میں سے جو جو قصے ہم تجھے سناتے ہیں (یعنے جن جن اسلوبوں سے ہم سناتے ہیں) تو اُن سب میں یہی بات ہے کہ تیرے دل کو تسکین دیدیں، اور پھر اُن کے اندر

الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

١٢٠ تجھے امرِ حق مل گیا (یعنے سچائی کی دلیلیں مل گئیں) اور موعظت (کہ نصیحت پکڑنے والے نصیحت پکڑینگے) اور یاد دہانی ہوئی مومنوں کے لیے!

١٢١ اور (اے پیغمبر!) جو لوگ ایمان نہیں لاتے (اور دعوتِ حق کا مقابلہ کر رہے ہیں) اُن سے کہہ دے "تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ۔ ہم بھی (اپنی جگہ) سرگرم عمل ہیں۔

١٢٢ اور (نتیجہ کے) منتظر رہو۔ ہم بھی منتظر ہیں"

١٢٣ اور (یاد رکھو) اللہ ہی کے لیے آسمان و زمین کی چھپی باتوں کا علم ہے، اور سارے کام اُسی کے آگے رجوع ہوتے ہیں۔ پس اُس کی بندگی میں لگا رہ اور اُس پر بھروسہ کر۔ تیرا پروردگار اس سے غافل نہیں ہے جو کچھ لوگ کر رہے ہیں!

اصلاح کا عشق تجھے مضطرب رکھتا ہے، لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین (۳:۲۶) تو ان سرگزشتوں کا تفکر موجب تسکین ہوگا کہ تجھ سے پہلے بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا [illegible] اعراض و سرکشی کے اس سے بھی زیادہ سخت مظاہرے ہو چکے ہیں۔

(ب) یہ سرگزشتیں حق کو واضح کر دیتی ہیں یعنے اُن میں حقیقت کی دلیلیں اور روشنیاں ہیں۔ یہ بتلاتی ہیں کہ اس بارے میں اللہ کا ایک مقررہ قانون ہے اور اُس میں کبھی تبدیلی ہونے والی نہیں۔

(ج) ان میں موعظت ہے۔ یعنے ایسی باتیں ہیں جو سننے والوں کو عبرت دلاتی ہیں، نصیحت و پند کرتی ہیں، غرور و نادانی کو بیدار کر دیتی ہیں۔

(د) مومنوں کے لیے تذکیر ہے۔ یعنے سچائی کی یاد دلاتی ہیں غفلت سے روکتی ہیں۔

مومنوں کی ایک غفلت یہ بھی تھی کہ کمزور و بے سروسامان تھے اور تمام ملک دشمنی پر تُل گیا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی مایوسی کے خیال آنے لگتے تھے۔

اب یہ چار باتیں سامنے رکھ کر قرآن کے قصص و وقائع کا مطالعہ کرو۔ وہ تمام قفل کھل جائینگے جنہیں ہمارے منطقی مفسروں کی دس دس جلدیں بھی نہ کھول سکیں۔

(۲۳) سورت کی ابتدا جس اعلانِ حق سے ہوئی تھی، اور پھر واضح کیا تھا کہ تمام پچھلی دعوتوں کا بھی یہی اعلان رہ چکا ہے، اُسی پر اب سورت ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ آخر کی تین آیتیں خاتمۂ موعظت ہیں:

(ا) منکروں سے وہی بات کہہ دو جو ہمیشہ کہی گئی ہے۔ یعنے تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ۔ ہم اپنی جگہ کر رہے ہیں۔ تم بھی نتیجہ کا انتظار کرو۔ ہم بھی منتظر ہیں۔ نتیجہ فیصلہ کر دیگا جس طرح ہمیشہ کر چکا ہے۔

(ب) اللہ ہی جانتا ہے کہ پردۂ غیب میں کیا چھپا ہے، اور سارے کام اُسی کے ہاتھ میں ہیں۔

(ج) اور تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ فاعبدہ وتوکل علیہ! اُس کی عبادت میں لگے رہو، اور اس پر بھروسہ رکھو!

قرآن کے قصص اور اُن کا حجہ و برہان ہونا (?)

(۲۴) یہ سورت بھی من جملہ اُن سورتوں کے ہے جن میں گزشتہ دعوتوں کے وقائع سے استشہاد کیا گیا ہے، اور گو سورۂ اعراف کے ایک نوٹ میں اس طرف اشارات کیے جا چکے ہیں، لیکن ضروری ہے کہ یہاں مزید وضاحت کر دی جائے۔ تاکہ آئندہ جہاں کہیں یہ بات آئے، ذہن فہم و تدبر کے لیے مستعد رہے:

(ا) قرآن نے تذکیر و موعظت کے لیے جو باتیں بطور دلائل کے اختیار کی ہیں، اور جنہیں وہ جا بجا حجج، براہین، بینات اور بصائر سے تعبیر کرتا ہے، اُن میں ایک نمایاں استدلال ایام و وقائع کا استدلال ہے۔ اُس نے جہاں کہیں گزشتہ قوموں کے حالات

بیان کیے ہیں، وہاں یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ اس بیان سے اس کا مقصود کیا ہے؟ جیسا کہ اسی سورت کی آیت ١٢٠ میں گزر چکا ہے۔ اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مقصود یہ نہیں ہے کہ تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان کی جائے، بلکہ کچھ باتیں ہیں جنکا دلوں میں اذعان پیدا کرنا چاہتا ہے، اور یہ سرگزشتیں اس کے لیے دلیلیں ہیں، حجتیں ہیں، براہین ہیں۔ پس سمجھ لینا چاہیے کہ کیونکر یہ سرگزشتیں دلیلیں ہوئیں۔ بات بالکل صاف تھی کیونکہ خود قرآن نے کھول کھول کر ہر جگہ بتا دی ہے لیکن منطقی استدلال کے انہماک نے مفسروں کو سمجھنے کی مہلت نہ دی۔

(ب) اس سلسلے میں سب سے پہلے دو باتیں ذہن نشین کرلینی چاہئیں:

وحدتِ قوانین فطرت

اولاً، قرآن کہتا ہے کہ کائناتِ ہستی کے جس گوشہ پر بھی نظر ڈالوگے، تمہیں ایک حقیقت ابھری ہوئی دکھائی دیگی۔ بشرطیکہ دیکھنے سے انکار نہ کرو۔ وہ کیا ہے؟ قوانین فطرت کی وحدت۔ یعنے یہاں ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی طرح پر کام کر رہا ہے کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اپنے قانون خلقت و فعل میں دوسروں سے ذرا بھی الگ ہو۔ بلاشبہ بھیس بہت سے ہوگئے ہیں۔ اور نام بھی یکساں نہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے، اور جونہی سامنے کے پردے ہٹاتے ہو، اصلیت کی بے لاگ وحدت آ کھڑی ہوتی ہے۔ مثلاً تم کہتے ہو کہ حیوان کے لیے موت و حیات ہے۔ پھولوں کے لیے کھلنا اور مرجھا جانا ہے۔ پتھروں کے لیے بننا اور پامال ہونا ہے۔ اجزاء کے لیے ملنا اور بکھر جانا ہے۔ بھیس بہت سے ہوگئے مگر کیا صورتیں بھی بہت ہوئیں؟ نام کئی ہو گئے، مگر کیا حقیقت بھی متعدد ہوئی؟ یہی قانون جو حیوانات میں موت و حیات تھا، نباتات میں کھلنا اور مرجھانا ہوا، جمادات میں بننا اور پامال ہونا۔ اجزاء میں ملنا اور بکھرنا۔ الفاظ بدلتے جاؤ، معنی نہیں بدل سکتے!

عباراتنا شتی وحسنك واحد

وکل الی ذاك الجمال یشیر!

وہ کہتا ہے، جب کائناتِ ہستی کے ہر گوشہ میں، وحدتِ قانون کی بنیادی اصل کام کر رہی ہے، تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو؟ اور وہاں بھی کوئی قانون کام نہ کر رہا ہو؟ اور وہ وہی اور ویسا ہی نہ ہو جیسا تمام گوشوں میں ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ گوشہ بھی دوسرے گوشوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ٹھیک اسی طرح، جس طرح یہاں کا ہر گوشہ دوسرے گوشے سے مربوط ہے۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کارفرما ہے۔ اور یہاں کے بھی وہی احکام و نتائج ہیں جو دوسرے گوشوں میں نظر آرہے ہیں۔ مثلاً اگر عالم مادی میں تم دیکھتے ہو کہ آگ کا خاصہ جلانا ہے، اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ آگ روشن ہو اور اس کے شعلوں سے ٹھنڈک نکلے، تو تمہیں اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں بھی کوئی بات آگ کی طرح ہو سکتی ہے اور جب وہ ظہور میں آجائے تو اس سے گرمی ہی نکلیگی۔ ٹھنڈک نہیں نکل سکتی۔ یعنے مادیات کے خواص کی طرح معنویات کے بھی خواص ہیں، اور خواص و نتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون یکساں طور پر دونوں جگہ کام کر رہا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے تفسیر سورۂ فاتحہ اور مقدمہ دیکھنا چاہیے)

ثانیاً، وہ کہتا ہے جس طرح یہاں ہر بات کے لیے فطرت کے مقررہ قوانین ہوئے، اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور حیات و ممات کا بھی ایک قانون ہوا، اور جس طرح فطرت کے تمام قوانین یکساں ہیں، عالمگیر ہیں، غیر متبدل ہیں، اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے، اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہی ہے۔ خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھائی جائے، اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہی ہونگے، خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اب سے ہزار برس پہلے تو سنکھیا کا خاصہ ہلاکت رہا ہو، اور اب زندگی ہو جائے۔ پس جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے، ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ فطرت کے قوانین میں تبدیلی نہیں۔

سنۃ اللہ

اس نے جا بجا اس قانون کو "سنۃ اللہ" سے تعبیر کیا ہے:

سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد — جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں، اُن کے لیے اللہ کی سنت یہی رہی ہے

ولن تجد لسنة الله تبدیلا (۳۳: ۶۲)
(یعنے اللہ کے قانون کا دستور یہی رہا ہے) اور اللہ کی سنت میں تم کبھی ردوبدل نہیں پاؤگے!

فھل ینظرون الا سنة الاولین؟ فلن تجد لسنة الله تبدیلا۔ ولن تجد لسنة الله تحویلا۔ (۳۵: ۴۳)
پھر یہ لوگ کس بات کی راہ تک رہے ہیں؟ کیا اس بات کی کہ جو کچھ اگلے لوگوں کے لیے سنت رہ چکی ہے، ان کے لیے بھی ظہور میں آجائے؟ تو یاد رکھو تم اللہ کی سنت کو کبھی بدلتا ہوا نہیں پاؤگے، اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اُس کی سُنت کے احکام پھیر دیے جائیں۔

سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا (۱۷: ۷۷)
(اے پیغمبر!) تجھ سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے، اُن کے لیے ہماری سنت یہی رہی ہے، اور ہماری سنت کبھی ٹلنے والی نہیں!

استقراء کا یقین فطری ہے

قرآن کا یہ استدلال فی الحقیقت طبیعت انسانی کا وجدانی اذعان ہے۔ انسان کی ذہنی فطرت کا مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ وہ حوادث سے بالطبع متاثر ہوتی ہے، اور اُس کے اندر کوئی چیز ہے جو اُسے بتلا دیتی ہے کہ یہاں ایک مرتبہ کا حادثہ ایک ہی مرتبہ کا حادثہ نہیں ہے، خواص و نتائج دائمی ہیں۔ یعنے جو بات یہاں ایک مرتبہ ظہور میں آتی ہے، وہ ہمیشہ ظہور میں آئیگی یا ہمیشہ ظہور میں آسکتی ہے۔ اور جس چیز کا جو خاصہ ایک مرتبہ ظاہر ہوا، وہی خاصہ ہمیشہ ظہور میں آئیگا۔ چنانچہ بچوں کو دیکھو کس طرح یہ وجدانی علم ان کے اندر بول رہا ہے! ایک بچہ پہلی مرتبہ آگ میں اُنگلی ڈالتا ہے، اور اُنگلی جلنے لگتی ہے۔ پھر جب کبھی آگ اُس کے سامنے آتی ہے، خود بخود ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ کیوں؟ اسی لیے کہ اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اُسے بتلا دیتی ہے کہ جس چیز نے ایک مرتبہ جلایا، وہ ہمیشہ جلائیگی۔ یہ اعتقاد کہ "آگ ہمیشہ جلاتی ہے" اُسے صرف اتنی بات سے حاصل ہو گیا کہ "آگ نے ایک مرتبہ جلایا تھا!"

طبیعت انسانی کا یہی وجدانی تاثر ہے، جس نے ہمارے ذہن میں استقراء کا اعتقاد پیدا کیا یعنے جزئیات کا تجربہ کرنا، اور اسکے ذریعہ سے کلیات تک پہنچنا۔ اب ہمارے تمام علوم و معارف کا سنگ بنیاد یہی ہے۔

بہرحال قرآن کہتا ہے۔ اگر تم وجدانی طور پر یہ بات محسوس کرتے ہو کہ خواص و نتائج کا تسلسل و اجراء ایک حقیقت ہے یعنے اگر ایک چیز سے بار بار ایک ہی طرح کا نتیجہ نکلا ہے، تو یہ اس کا خاصہ ہے، اور اس میں تبدیلی ممکن نہیں، تو پھر تم کیسے انکار کر دیتے ہو کہ اعمال انسانی کے لیے یہ حقیقت معطل ہو گئی، اور یہاں ایسا ہونا ضروری نہیں؟ اگر تم کہتے ہو کہ فلاں بات سے ایسا نتیجہ ضرور نکلیگا کیونکہ بار بار ایسا ہی ہو چکا ہے، تو پھر اس بات سے کیوں انکار کر دیتے ہو کہ فلاں قسم کے اعمال کا نتیجہ یقیناً ہلاکت ہے، کیونکہ بار بار ایسا ہی ہو چکا ہے؟ چنانچہ یہی بات ہے کہ وہ جا بجا کہتا ہے۔ تم ہی دنیا میں پہلی قوم نہیں ہو۔ تم سے پہلے بھی بے شمار قومیں اسی زمین میں گزر چکی ہیں۔ ان کی بھی آبادیاں تھیں۔ قوتیں اور شوکتیں تھیں، سربفلک عمارتیں تھیں، فکر و عمل کی سرگرمیاں تھیں۔ پس دنیا کی سیر کرو۔ گزری ہوئی سرگزشتیں سنو، مٹی ہوئی نشانیوں کا کھوج لگاؤ، اور پھر دیکھو، سعادت و شقاوت کے قانون کا کیسا عمل درآمد رہ چکا ہے! اور اگر ہمیشہ ایسا ہی ہو چکا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو، خدا تمہارے لیے اپنا قانون ہستی معطل کر دیگا؟ یا اس طرح بدل دیگا کہ جو چیز کل تک سنکھیا رہ چکی ہے، تمہارے لیے شہد ہو جائے؟

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض، فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین؟ (۳: ۱۳۷)
تم سے پہلے بھی (دنیا میں خدا کے) احکام و قوانین کے نتائج گزر چکے ہیں پس ملکوں کی سیر کرو۔ پھر دیکھو، ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جنہوں نے خدا کی نشانیاں جھٹلائی تھیں؟

اولم یسیروا فی الارض، فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلھم وکانوا اشد منھم قوة؟ (۳۵: ۴۴)
کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے، ان لوگوں کا کیسا انجام ہو چکا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، اور جو ان لوگوں سے قوت میں کہیں زیادہ تھے؟

قرآن کی موعظت کا ایک خاص دائرہ ہے، اور وہ جو کچھ کہتا ہے، اُسی کے اندر رہ کر کہتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس استدلال کو بھی اسی کے اندر رہ کر دیکھیں۔ اس سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں۔ تاہم ایک بات ایسی ہے جو بغیر کسی تکلف کے

خود بخود سامنے آجاتی ہے، اور ہم اپنے ذہن کو اُس طرف جانے سے روک نہیں سکتے یعنے قرآن کے اس طرزِ استدلال نے ایک زیادہ عام حقیقت کی طرف بھی اشارہ ضرور کر دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تاریخ کا صحیح استعمال کیا ہونا چاہئے؟ قرآن کی ان تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ گزشتہ کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جائے۔ یعنے جو کچھ گزر چکا ہے، وہ آئندہ کے لیے ذخیرۂ بصیرت ہے، اور ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی صورت دیکھ لی جا سکتی ہے۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس باب میں علم و نظر کی کاوشیں جس قدر بھی سراغ لگا سکی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہے۔ تاریخ میں ابن خلدون پہلا شخص تھا جس نے تاریخ کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہا، اور اب فلسفۂ تاریخ کی ساری بنیادیں اسی اصل پر چنی گئی ہیں۔ البتہ اس وقت تک معاملہ ابتدائی حالت سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اگر بڑھتا تو ہم تاریخ کی ہر داستان میں مستقبل کی ایک نئی داستان پڑھ لیا کرتے۔

(ج) اب یہ اصل سامنے رکھ کر قرآن کے اُن تمام مقامات کا مطالعہ کرو جہاں گزشتہ ایام و وقائع کا ذکر کیا گیا ہے، تم دیکھو گے کہ ہر جگہ یہی استدلال کام کر رہا ہے، اور جونہی یہ بات سامنے رکھ لی جائے، تمام وجوہ و روابط واضح ہو جاتے ہیں۔ البتہ ہر مقام پر ایک ہی طرح کا بیان نہیں ہے، اور نہ ایک ہی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ کسی مقام پر شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہاں اسی کی ضرورت تھی، کہیں قوموں کا ذکر کیا ہے، کیونکہ وہاں کا مقتضا یہی تھا، کہیں وقائع کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ وہاں کے لیے اسی قدر کافی تھا۔ اور پھر کہیں ایسا ہے کہ تمام سرگزشتیں ایک ہی مقام پر جمع کر دی ہیں اور اُن سب سے بحیثیت مجموعی استدلال کیا ہے۔ تاکہ استدلال کے تمام پہلو آشکارا ہو جائیں۔

سورۂ ہود اور استقراء تاریخی

(د) چنانچہ یہ سورت بھی من جملہ اُن سورتوں کے ہے جن میں آخری صورت اختیار کی گئی ہے، اور اس لیے اس استدلال کے جامع و مفصل مقامات میں سے ہے۔ وہ کہتا ہے۔ گزرے ہوئے عہدوں کی طرف مڑ کے دیکھو۔ تم دیکھو گے کہ دنیا کی کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جہاں ایک خاص طرح کا معاملہ پیش نہ آیا ہو، اور خاص طرح کے نتائج پیدا نہ ہوئے ہوں۔ ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ قوموں میں ایک خاص طرح کی شخصیتیں پیدا ہوئیں، ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ اُنہوں نے خاص طرح کی صدائیں بلند کیں، ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ ان کے اور اُن کی قوم کے درمیان خاص طرح کے معاملات پیش آئے، اور پھر ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ اُن کا خاتمہ ایک خاص طرح کے نتیجہ پر ضرور ہوا، اور اس نتیجہ نے تمام قضیہ کا فیصلہ کر دیا۔ تم یہ بھی دیکھو گے کہ یہ سارا معاملہ اپنی ساری باتوں میں کچھ اس طرح کا یکساں اور ہم رنگ واقع ہوا ہے، کہ معلوم ہوتا ہے، ایک ہی حقیقت ہے جو بار بار اُبھرتی اور اپنے آپ کو دہراتی رہی ہے، یا ایک ہی زنجیر ہے جس کی مختلف کڑیاں یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئی ہیں، اور اس کی کوئی کڑی دوسری کڑی سے الگ نہیں۔ پھر کیا یہ بات کہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی طرح کی بات پیش آئی، اور ایک ہی طرح کا نتیجہ نکلا، اس یقین کے لیے کافی نہیں کہ یہ ملکوں اور قوموں کی سعادت و شقاوت کا ایک الٰہی قانون ہے، اور چونکہ ہمیشہ کام کرتا رہا ہے، اس لیے اب بھی کام کریگا؟

(ہ) اب اُن تمام سرگزشتوں پر نظر ڈالو جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں، اور اعراف میں گزر چکی ہیں، اور آئندہ سورتوں میں بھی آئینگی۔ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت سے شروع ہوتی ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر ختم کر دی جاتی ہیں۔ غور کرو، کس طرح ان تمام دعوتوں کے ظہور میں، اعلانات میں، تذکیر و موعظت میں، احوال و ظروف میں، رد و قبول میں، نوعیت و حیثیت میں، اور پھر آخری نتیجہ میں کامل یکسانیت پائی جاتی ہے؟ اور کس طرح اُن کی ہم آہنگی کے تمام نقطے صاف صاف اُبھرے ہوئے ہیں؟ ساتھ ہی کس طرح قدم قدم پر بتلایا جا رہا ہے کہ ہدایت وحی کے ظہور کے عام قوانین کیا کیا ہیں؟ اور کس طرح دعوتِ وحی کا ہر چہرہ اپنے خال و خط میں قطعی اور آشکارا نظر آ رہا ہے کہ شک و اشتباہ کی پرچھائیں بھی اُسے چھونے کی جرأت نہیں کر سکتی!

(و) سورۂ اعراف کے ایک نوٹ میں اشارات گزر چکے ہیں۔ اور اس سورت میں ہر دعوت کے وقائع کا خلاصہ بالمقابل نوٹوں میں پڑھ چکے ہو۔ ان سب پر مکرر نظر ڈالو اور غور کرو۔ جتنے رسول پیدا ہوئے، وہ کیسے وقتوں میں پیدا ہوئے؟ اور کن لوگوں میں پیدا ہوئے؟ ان کی پکار کیا تھی؟ اور پکار کی نوعیت کیا تھی؟ اُن کی دلیلیں کیا تھیں جن سے

انھوں نے زور دیا؟ اُن کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے؟ اُنھوں نے اپنے قدم جہاں ٹکائے تھے وہ جگہ کونسی تھی؟ اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، وہ کون تھا؟ پھر اُن میں اور اُن کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے، وہ کس قسم کے تھے؟ اور اُن معاملات میں اُن کا جو قول و فعل رہا، وہ کس قسم کا تھا؟ تم دیکھوگے کہ ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا، اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں بھی تم ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ سب اسی حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانیوں میں سے کچھ نہیں رکھتے تھے۔ سب کا ظہور ایسے ہی وقتوں میں ہوا جب خدا پرستی اور نیک عملی کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سب انہی قوموں میں پیدا ہوئے جن قوموں کو انھوں نے مخاطب کیا تھا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی پکار نکلی، سبنے ایک ہی طرح پر لوگوں کو بلایا۔ سب نے کہا۔ اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سب نے کہا۔ ظلم و بدعملی سے باز آجاؤ۔ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ سب نے کہا۔ ہماری جد و جہد ادائے فرض ہے۔ مزدوری کی طلب نہیں۔ سب نے کہا۔ ہمارے پاس علم و یقین ہے۔ ہم تمہیں ظن و جہل سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ سب نے کہا۔ ہمارا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان و نیک عملی کے نتائج کی بشارت دینے والے ہیں۔ انکار و بدعملی کے نتائج سے متنبہ کر دینے والے۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ سب نے کہا۔ تمہارا بھروسہ اپنی طاقتوں پر ہے۔ ہمارا پروردگار عالم پر۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو، کر دیکھو۔ ہم اپنے کام سے باز آنے والے نہیں۔ سب نے کہا۔ اگر مانتے نہیں تو کم از کم حق کے مقابلہ میں سرکشی کرنا چھوڑ دو۔ کیونکہ سرکشی کا نتیجہ عذاب ہے۔ اور پھر سب نے کہا کہ تمہاری راہ تمہارے لیے ہے۔ ہماری راہ ہمارے لیے۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ تم بھی انتظار کرو!

پھر اُن قوموں کی طرف نظر اُٹھاؤ جن میں ان تمام دعوتوں کا ظہور ہوا تھا۔ کس طرح۔ یہاں بھی ہر قوم اپنے طرز عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی شبیہ ہے؟ اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا، جس طرح ہدایت کا چہرہ ایک ہی طرح کا رہا ہے؟ غور کرو۔ کوئی بات بھی ایسی دکھائی دیتی ہے جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود۔ ظلم و فساد کی دوسری نمود سے ہم رنگ نہ رہی ہو؟ سب نے اپنی اپنی باری وہی سب کچھ کیا، جو ان میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے انکار کیا۔ سب نے دعوت کی ہنسی اُڑائی۔ سب نے دلیلوں سے مُنہ موڑا۔ سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں سب سرکشی اور گھمنڈ کی چال چلے۔ سب نے جبر و تشدد سے راہ روکنی چاہی۔ سب نے موعظت و دلائل کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے اعراض و انکار کا مزاج ایک ہی طرح کا مزاج رہا۔ اور پھر سب کو غرور و طغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ روشنی و تاریکی میں امتیاز کرتے!

پھر اگر انھیں، مانا تو کن لوگوں نے مانا اور کتنوں نے مانا؟ تو یہاں بھی ہر دعوت کا معاملہ دوسری دعوت کے معاملہ سے بالکل ہم آہنگ رہا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ بے نواؤں اور درماندوں نے قبول کیا، اور سرداروں اور رئیسوں نے مقاومت کی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ جنہوں نے مانا، وہ تھوڑے تھے، جنہوں نے انکار کیا وہ بہت تھے!

پھر دیکھو۔ نتیجہ بھی کس طرح ہمیشہ ایک ہی رہا، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُس ایک کے خلاف ہوا ہو؟ ہمیشہ خدا کے فیصلہ کا انتظار کیا گیا، اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا کہ مومنوں نے نجات پائی۔ سرکشوں کے لیے ہلاکت ہوئی۔ یہ گویا اس معاملہ کا ایک قدرتی خاصہ تھا، اور خاصہ کبھی بدل نہیں سکتا۔ یہ آگ کے لیے گرمی تھی۔ برف کے لیے ٹھنڈک تھی سنکھیا کے لیے ہلاکت تھی۔ اور آگ جب کبھی سلگیگی، گرمی ہی نکلیگی۔ برف جب کبھی جمیگی، ٹھنڈک ہی ہوگی۔ سنکھیا جب کبھی کھائی جائیگی، ہلاکت ہی لائیگی:

سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل، ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا!

(ذ) قرآن کے اس استدلال کی ہم نے جو کچھ تشریح کی ہے، یہ کوئی دور کا مفسرانہ استنباط نہیں ہے بلکہ خود قرآن نے صاف صاف لفظوں میں یہ ساری باتیں واضح کر دی ہیں۔ ضرورت صرف تدبر و بصیرت کی ہے۔ قرآن کے اُن بے شمار مقامات کا مطالعہ کرو، جہاں گزشتہ رسولوں یا گزشتہ قوموں کی الگ الگ سرگزشتیں نہیں بیان کی ہیں بلکہ محض اجمالی اشارہ کر دیا ہے، اور پھر یکے بعد دیگرے ان عبرتوں پر توجہ دلائی ہے جو ان سب کی سرگزشتوں سے مجموعی طور پر نکلتی ہیں۔ مثلاً سورۂ ابراہیم

کی آیت (۹) میں فرمایا کیا اُن قوموں کی خبریں تم تک نہیں پہنچیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ پھر اُن قوموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، اور وہ قومیں جو ان کے بعد ظہور میں آئیں اور جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے" پھر اس کے بعد ان سب کے ایام و وقائع کی متفقہ اور مشترکہ عبرتیں بیان کی ہیں۔ اور صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ تمام رسولوں کی صدائیں ایک ہی طرح کی تھیں، اور تمام قوموں کے انکار و سرکشی کا عنوان بھی ایک ہی رہا۔ پھر جو نتیجہ پیش آیا، وہ بھی سب کے لیے یکساں تھا اور ایک ہی تھا: فاوحیٰ الیھم ربھم لنھلکن الظالمین ولنسکننکم الارض من بعدھم۔ ذالک لمن خاف مقامی وخاف وعید (۱۴:۱۴)

ایام اللہ

(ح) عربی میں ایسے واقعات کو جو بڑے اہم اور فیصلہ کن ہوتے ہیں، اور قومی روایات کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں، یوں تعبیر کیا جاتا ہے، کہ فلاں واقعہ کا دن۔ مثلاً یوم بدر، یوم اُحد، یوم قادسیہ۔ اور اسی سے قومی معرکوں کے لیے "ایام" کی تعبیر پیدا ہو گئی ہے۔ چونکہ فیصلہ نتائج کے یہ دن جو تمام قوموں کو پیش آئے اللہ کے قانون حق کے نفاذ کے دن تھے، اور حق و باطل کی معرکہ آرائی تھی۔ اس لیے قرآن نے انہیں "ایام اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔ ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا ان اخرج قومک من الظلمات الی النور، وذکرھم بایام اللہ۔ ان فی ذلک لآیات لکل صبار شکور! (۵:۱۴)

قصص قرآن و مبادی سبعہ

(ط) اس سورت میں بیان قصص کے بعد فرمایا ہے: وجاءک فی ھذہ الحق وموعظۃ وذکریٰ للمؤمنین (۱۲۰) ان سرگزشتوں نے تم پر حقیقت کھول دی اور وہ سرتاپا موعظت و تذکیر ہیں۔ نیز بے شمار مقامات میں تصریح کی کہ ان سرگزشتوں میں حقیقت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ بڑی بڑی دلیلیں ہیں۔ تو اب غور کرو، "ایام اللہ" کے اس استدلال سے کس طرح حقائق دین کی تمام مہمات واضح ہو جاتی ہیں! اور کس طرح حقیقت کے لیے موعظت و تذکیر مل جاتی ہے؟ تشریح کا یہ محل نہیں، مقصود اختصار ہے تاکہ مطالعہ کرنے والے کے سامنے تدبر کی راہیں خود بخود کھل جائیں۔ مثلاً بنائے استدلال معاملات کی وحدت اور ان کا عالمگیر تسلسل ہے۔ تو اب غور کرو۔ یہ وحدت کس طرح ہر گوشہ میں علم و یقین کا اُجالا پیدا کر رہی ہے؟

اولاً، وحدت انبعاث۔ یعنے معلوم ہو گیا۔ ایک خاص معاملہ کے لحاظ سے تمام ملکوں اور قوموں کی حالت یکساں رہی ہے۔ کوئی ملک ہو، قوم ہو، لیکن سُراغ ملتا ہے کہ وہاں کچھ لوگ ایسے ضرور پیدا ہوئے جنہوں نے ابنائے جنس کو ایک خاص طرح کی تعلیم دی۔

ثانیاً، وحدت دعوت۔ یعنے یہ تعلیم اگرچہ مختلف وقتوں، مختلف ملکوں، مختلف پیرایوں، مختلف زبانوں میں دی گئی لیکن ان اختلافات سے تعلیم مختلف نہیں ہو گئی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی رہی۔ گویا ایک ہی پیغام تھا جو کسی نے بہت سے پیام بروں کو دے کر بھیج دیا ہو۔ اور زبانیں بہت سی ہو گئی ہوں مگر بات ایک ہی رہی ہو۔

ثالثاً، وحدت تذکیر و موعظت۔ یعنے تمام دعوتوں کی صرف تعلیم ہی یکساں نہ رہی۔ بلکہ تذکیر و موعظت کے اصول بھی ہمیشہ ایک ہی رہے۔

رابعاً وحدت شئون و وقائع۔ یعنے اگرچہ زمانے مختلف ہوئے، ملک مختلف ہوئے، قومیں مختلف ہوئیں، احوال و ظروف مختلف ہوئے، مگر جو معاملات پیش آئے، وہ اپنی نوعیت میں ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوئے۔

خامساً، وحدت تصدیق و انکار۔ یعنے دعوت کے ماننے نہ ماننے کے لحاظ سے بھی حالت ہمیشہ یکساں رہی۔

سادساً، وحدت ہدایت و ضلالت فکر۔ یعنے ہمیشہ ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک ہی طرح کی رہی، اور نہ ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک ہی طرح کی رہی۔ جنہوں نے مانا، ہمیشہ ایک ہی طرح پر مانا۔ جنہوں نے نہ مانا، ایک ہی طرح پر نہ مانا۔ حتیٰ کہ تصدیق و یقین کی جتنی صدائیں اُٹھیں، ہمیشہ ایک ہی طرح کی اُٹھیں، اور انکار و شک کی جتنی باتیں کہی گئیں ہمیشہ ایک ہی طرح کی کہی گئیں۔

سابعاً، وحدت ظہور نتائج۔ یعنے پھر نتیجہ بھی ہمیشہ ایک ہی نکلا۔ ایک سے دو نہ ہوا۔

قرآن کہتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے، تو کیا ایسی باتیں اصلیت سے خالی ہو سکتی ہیں؟ کیا ان کی قدامت ان کی عالمگیری، ان کا دائمی تسلسل، ان کا غیر منقطع اعادہ، ان کی بے داغ وحدت، ان کی فطری صداقت کا اعلان نہیں کر رہی؟

مالکم کیف تحکمون؟

پس معلوم ہوا، یہاں کی تمام فطری اور عالمگیر حقیقتوں کی طرح ہدایت وحی کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ ظہور میں آئی ایمان اور عمل صالح کے قانون کی بھی ایک حقیقت ہے جس کی ہمیشہ تعلیم دی گئی ہدایت اور ضلالت کی کشمکش کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ نمودار ہوتی۔ تصدیق رسل کے نتائج کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ ظہور میں آئے، اور انکار و سرکشی کے نتائج بھی دنیا کی ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں کیونکہ ان میں کبھی تغیر نہیں ہوا۔

قرآن نے صرف چند دعوتوں کا کیوں ذکر کیا؟

(ی) اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہے کہ قرآن نے اگرچہ یہاں اور دیگر مقامات میں چند خاص خاص دعوتوں اور قوموں ہی کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کا دعویٰ عام ہے، اور اسی پر استدلال مبنی ہے۔ اس نے جا بجا یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہدایت وحی کا ظہور جمعیت بشری کا عالمگیر واقعہ ہے، اور کوئی قوم نہیں جس میں اللہ کے کسی رسول کا ظہور نہ ہوا ہو نیز یہ کہ بے شمار قومیں دنیا میں گزر چکی ہیں جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ چنانچہ سورہ یونس کی آیت (۴۷) میں گزر چکا ہے: ولکل امۃ رسول فاذا جاء رسولھم قضی بینھم بالقسط وھم لا یظلمون۔ اور دوسرے مقامات میں فرمایا: انما انت منذر، ولکل قوم ھاد (۱۳: ۷) ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا، ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت (۱۶: ۳۶) انا ارسلناک بالحق بشیرا ونذیرا، وان من امۃ، الا خلا فیھا نذیر (۳۵: ۲۴) الم یاتکم نبؤا الذین من قبلکم قوم نوح وعاد وثمود، والذین من بعدھم، لا یعلمھم الا اللہ! (۱۴: ۹)

لیکن ساتھ ہی اس نے یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ قرآن میں تمام رسولوں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے:

ولقد ارسلنا رسلا من قبلک منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک (۴۰: ۷۸)	اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول مبعوث کیے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنکے حالات تمہیں سنائے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے۔

یہ ظاہر ہے کہ قومیں بے شمار گزر چکی ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حسب تصریح قرآن، ہر قوم میں دعوت حق کا ظہور ہوا ہے، پس تسلیم کرنا پڑیگا کہ بے شمار قومیں اور بے شمار دعوتیں ہوئیں، جن میں سے صرف چند ہی کا قرآن نے ذکر کیا۔ باقی کا نہیں کیا۔

قرآن نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ قرآن کا مقصود ان سرگزشتوں کے بیان سے یہ نہیں تھا کہ تاریخ کی طرح تمام واقعات کا استقصاء کیا جائے۔ بلکہ صرف تذکیر و موعظت تھا، اور تذکیر و موعظت کے لیے اس قدر کافی تھا کہ چند دعوتوں اور قوموں کی سرگزشتیں بیان کر دی جائیں، اور باقی کے لیے کہدیا جائے کہ ان کا حال بھی انہی پر قیاس کر لو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں اس کا اسلوب بیان ہر جگہ عام ہے۔ جا بجا اس طرح کی تعبیرات پائی جاتی ہیں کہ پچھلے قرنوں میں ایسا ہوا، پچھلی قوموں میں ایسا ہوا، پچھلی آبادیوں میں ایسا ہوا، پچھلے رسولوں کے ساتھ اس طرح کے معاملات پیش آئے۔ البتہ جہاں کہیں تخصیص کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہاں صرف چند قوموں ہی کی سرگزشتیں بیان کی ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ یہ چند سرگزشتیں پچھلی قوموں کے ایام و وقائع کا نمونہ سمجھی جائیں، اور ان سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس بارے میں تمام اقوام عالم کی روئدادیں کیسی رہ چکی ہیں!

البتہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں خصوصیت کے ساتھ ان چند قوموں ہی کا ذکر کیا گیا جو ایک خاص خطۂ ارضی میں گزر چکی تھیں۔ دوسرے خطوں کی اقوام میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا؟

تو اس کے وجوہ بھی بالکل واضح ہیں اگر تھوڑی سی دقت نظر کام میں لائی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایام و وقائع کے ذکر سے مقصود بعض مقاصد کے لیے استشہاد تھا، اور یہ استشہاد جب ہی موثر ہو سکتا تھا کہ جن ایام و وقائع کا ذکر کیا جائے، ان کے وقوع سے

ﻟﮧ مطالب قرآنی کا یہ مقام نہایت وسیع ہے، اور اس قدر تفصیل کے بعد بھی بے شمار اطراف بحث تشنہ رہ گئے ہیں، لیکن اس کے سوا چارہ نہیں کہ تکمیل بحث کے لیے مقدمہ کا انتظار کیا جائے۔

مخاطب بے خبر نہ ہوں۔ کم از کم ان کی بھنک کانوں میں پڑ چکی ہو۔ یا نہ پڑی ہو تو اپنے پاس کے آدمیوں سے حال پوچھ سکتے ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ لوگ کہہ دیتے پہلے ان وقائع کا وقوع ثابت کرو۔ پھر ان سے ہمیں عبرت دلانا۔ اور اس طرح عبرت و تذکیر کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ اب دیکھو، قرآن نے جن ایام و وقائع کا ذکر کیا ہے، وہ تمام تر کن خطوں میں وقوع ہوئے تھے یعنی ان کی جغرافیائی حدود کیا ہیں؟ یہ تمام وقائع یا تو خود عرب میں ہوئے ہیں، یا سرزمین دجلہ و فرات میں، یا پھر فلسطین اور مصر میں، اور یہ تمام خطے ایک دوسرے سے متصل تھے، تجارتی قافلوں کی شاہراہوں سے باہم گر پیوستہ تھے، آمد و رفت کے علائق کا قدیمی سلسلہ رکھتے تھے، اور نسلی و لسانی تعلقات کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، جیسا کہ آگے چل کر تمہیں معلوم ہوگا۔ پس قرآن نے اسی خطوں کا ذکر کیا جو فی الحقیقت تاریخ اقوام کا ایک ہی وسیع خطہ رہ چکا ہے۔ دوسرے خطوں سے تعرض نہیں کیا۔ کیونکہ مخاطبین کے لیے ان خطوں کا ذکر ان کی شب و روز کی باتوں کا ذکر تھا، اور وہ جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ عرب خود ان کا ملک تھا۔ عراق سے ان کے تعلقات تھے۔ فلسطین کے کھنڈروں پر ہر سال گزرتے رہتے۔ مصر ان کے تجارتی قافلوں کی منڈی تھی۔ ان ملکوں کا نام سننا گویا اپنے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھ لینا تھا۔

پھر جن قوموں کا ذکر کیا، ان کے ناموں سے بھی وہ ناآشنا نہ تھے۔ قوم تبع اور اصحاب اخدود یمن سے تعلق رکھتے تھے اور یمن عرب میں ہے۔ عاد اور ثمود کی بستیاں بھی عرب ہی کے حدود میں تھیں۔ قبیلۂ مدین بالکل عرب کے پڑوس میں تھا۔ قوم لوط کے کھنڈر ان میں سے سینکڑوں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ سرزمین دجلہ و فرات کی قوموں اور ان کی روایتوں سے بھی ناآشنا نہیں ہو سکتے تھے۔ مصر میں گو مصر کے فرعون اب نہیں رہے تھے لیکن مصر میں برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ فراعنہ کے نام ان کے لیے اجنبی نام نہیں ہو سکتے تھے۔

علاوہ بریں یہودی اور عیسائی خود ان کے اندر بسے ہوئے تھے۔ انبیاء بنی اسرائیل کے نام ان لوگوں کی زبانوں پر تھے تفصیلات ربیوں اور راہبوں کو معلوم تھیں۔ یہ ان سے پوچھ سکتے تھے، اور پوچھا کرتے تھے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایام و وقائع کے بیان و استدلال میں جابجا اس طرح کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ جیسے ایک جانی بوجھی ہوئی بات کی طرف اشارہ کیا جائے۔ مثلاً جابجا فرمایا: الم یاتکم نبؤا الذین من قبلکم؟ (۱۴:۹) جو قومیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں، کیا تم تک ان کی خبریں نہیں پہنچ چکی ہیں؟ یا مثلاً جابجا اس طرح کی تعبیرات پاؤ گے! اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم؟ (۳۵:۴۴) کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے پچھلی قوموں کا کیسا انجام ہو چکا ہے! کیونکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ برابر چلتے پھرتے رہتے تھے۔ یعنی ہر موسم میں تجارت کے لیے نکلتے تھے، اور اثنائے سفر میں کتنی ہی اجڑی ہوئی بستیاں، مٹتے ہوئے نشان اور سنسان کھنڈر ان کی نظروں سے گزرتے تھے، بلکہ بسا اوقات انہی میں منزل کرتے، اور انہی کے سایوں میں دوپہر کاٹتے تھے اور پھر جابجا اس طرح کی بھی تصریحات ہیں کہ یہ مقامات تم سے کچھ دور نہیں کہ بُعد کی وجہ سے بالکل بے خبر رہے ہو۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ کیا علمائے بنی اسرائیل سے یہ سرگزشتیں تم نے نہیں سنیں؟ اور اگر بے خبر ہو تو علم والوں سے یعنی علمائے اہل کتاب سے دریافت کرلو جو تمہی میں بسے ہوئے ہیں۔

اور پھر بعض مقامات میں عرب کے حوالی و اطراف کی تصریح بھی کر دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان وقائع میں قصداً یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ سرزمین عرب اور اس کے اطراف و جوانب ہی کے وقائع ہوں۔ مثلاً سورۂ احقاف کی آیت (۲۷) میں قوم عاد کے ذکر کے بعد فرمایا: ولقد اھلکنا ما حولکم من القری، وصرفنا الایات، لعلھم یرجعون۔

البتہ یہ ظاہر و معلوم ہے کہ ان واقعات کی تفصیلات سے لوگ ناآشنا تھے۔ اور بعض وقائع ایسے تھے جن کی صرف کانوں میں بھنک پڑ چکی تھی، لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ کس طرح پیش آیا اور صحیح سرگزشت کیا ہے! نہ صرف عرب میں، بلکہ ان خطوں میں بھی جہاں وہ پیش آئے تھے۔ جن وقائع کا ذکر تورات میں موجود تھا، ان کی بھی بعض حقیقتیں محرف ہو گئی تھیں یا بھلا دی گئی تھیں، اور خود اہل کتاب کو بھی خبر نہ تھی کہ اصلیت کیا رہ گئی ہے۔ پس قرآن نے ان کی حقیقت ٹھیک ٹھیک واضح کر دی۔ ہر معاملہ اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہو گیا۔ بعض وقائع کی نسبت تصریح کر دی کہ اس سے باشندگان عرب بالکل ناآشنا تھے۔ یعنے نام تو سن لیا تھا لیکن اس کی یہ تفصیلات اور جزئیات کسی کو معلوم نہ تھیں، مثلاً اسی سورت میں حضرت نوح علیہ السلام کی

سرگزشت بیان کر کے آیت (۴۹) میں تصریح کر دی کہ یہ باتیں نہ تو تجھے معلوم تھیں، نہ تیری قوم کو۔

جدید اثری تحقیقات اور اقوام مذکورہ

پھر فہم و تدبر کا ایک اور نقطہ بھی ہے، اور اس طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ قرآن نے جن خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے، دنیا کو ان کی قدیم تاریخ بہت کم معلوم تھی۔ اور خود عرب اور عربی نسل کی ابتدائی سرگزشتیں بھی پردۂ خفا میں مستور تھیں۔ لیکن اٹھارویں صدی سے آثار قدیمہ کی تحقیقات کا نیا سلسلہ شروع ہوا، اور پھر انیسویں صدی میں نئے نئے پردے اُٹھے، اور اب بیسویں صدی کے اثری انکشافات روز بروز ایک خاص رُخ پر جا رہے ہیں۔ ان سب سے عرب، عراق، فلسطین، شام اور مصر کی قدیم قوموں اور تمدنوں کے جو حالات منکشف ہوئے ہیں، اُنہوں نے ان خطوں کی قدیم تاریخ کو بالکل ایک نئی شکل دیدی ہے، اور روز بروز نئی نئی حقیقتیں اُبھرتی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عربی نسل اور عربی زبان کے صرف اُتنے ہی معنی نہیں ہیں جتنے آج تک سمجھے گئے ہیں، بلکہ یہ قوموں اور نسلوں کی ایک نہایت قدیم اور وسیع داستان ہے، اور وہ دنیا کے ابتدائی تمدنوں میں عظیم الشان حصہ لے چکے ہیں۔

ان تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عربی زبان اور اس کی ابتدائی شکلوں کے بولنے والوں کو ایک خاص نسل تسلیم کر لیا جائے، تو یہ دراصل بہت سے گروہوں اور قبیلوں کا ایک مجموعہ تھا اور عرب، فلسطین، شام، مصر، اور عراق کے خطوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے دنیا کے ابتدائی تمدن کی تعمیر میں بڑے بڑے حصے لیے۔ ان ملکوں کی وہ تمام قدیم قومیں جو آج تک ایک دوسرے سے بالکل الگ سمجھی جاتی تھیں، مثلاً اشوری، سریانی، فینیقی، مصری، آرامی وغیرہم، فی الحقیقت الگ نہ تھیں، اور عربی زبان کا ابتدائی مواد، اور عربی رسم الخط کے ابتدائی نقوش ان سب میں مشترک تھے۔ حتیٰ کہ انہی گروہوں نے مصر کے تخت عظمت و جبروت پر عرصہ تک شہنشاہی کی، اور اپنی زبان وقت کی تمام متمدن قوموں کو مستعار دیدی۔ چنانچہ بابل کے کتبوں اور مصر کے ہیلوغلیفی نقوش میں عربی الفاظ آج تک پڑھے جا سکتے ہیں، اور یہ بات تو ایک تاریخی حقیقت کی طرح مان لی گئی ہے کہ یونانیوں نے فن کتابت کا پہلا سبق انہی اقوام سے حاصل کیا تھا!

کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ اس سلسلہ میں کیا کیا انکشافات ہونے والے ہیں؟ تاہم جس قدر انکشافات ہو چکے ہیں، اُن سے ایک بات واضح ہو گئی ہے یعنے ایک زمانہ میں یہ تمام خطے ایک خاص نسل کے عروج و انشعاب کے مختلف میدان تھے اور یہی نسل عربی قبائل کی ابتدائی نسل تھی۔ پس اگر قرآن نے صرف انہی خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے، کوئی دوسری قوم اس دائرہ میں داخل نہیں ہوئی ہے، تو بہت ممکن ہے، اس کی علت اس سے کہیں زیادہ گہری ہو جس قدر اس وقت تک ہم سمجھے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تین باتیں نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہیں:

اولاً، جن اقوام کا ذکر کیا گیا ہے، اُن کی خصوصیت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ بعض سرزمین حجاز کے قرب و جوار میں گذری تھیں، اور بعض سے اہل کتاب واقف تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی گہری بات ہے۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے، یہ تمام قومیں اصلاً ایک ہی نسلی حلقہ کی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر مصریوں کا ذکر کیا گیا ہے، تو مصری بھی اس میں داخل ہیں۔

ثانیاً، ان انکشافات کی روشنی میں ایک اور مسئلہ بھی بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ قرآن نے جہاں کہیں ترتیب ظہور کے ساتھ دعوتوں کا ذکر کیا ہے، وہاں قوم نوح کے بعد قوم عاد، اور عاد کے بعد قوم ثمود نمایاں ہوئی ہے، اور ان تینوں قوموں کو ایک دوسرے کا جانشین کہا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف کی آیت (۶۹) میں ہے کہ حضرت ہود نے اپنی قوم سے کہا خدا کی نعمت یاد کرو کہ اُس نے تمہیں قوم نوح کے بعد اس کا جانشین بنایا۔ اور آیت (۷۴) میں ہے کہ اسی طرح حضرت صالح نے فرمایا۔ تم قوم عاد کے بعد اس کے جانشین بنائے گئے۔ چونکہ ان تینوں قوموں کا جغرافیائی محل ایک دوسرے سے الگ تھا، اس لیے یہ بات واضح نہیں ہوتی تھی کہ اس خطاب کا صحیح مطلب کیا ہے؟ لیکن اب بالکل واضح ہو گئی اور اُن توجیہوں کی ضرورت نہ رہی جو مفسرین نے اختیار کی ہیں۔

ثالثاً، اس سوال پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے ہر جگہ یہ تذکرہ حضرت نوح علیہ السلام ہی سے کیوں شروع کیا ہے؟ اس کے متعدد وجوہ سامنے آتے تھے لیکن ان انکشافات کی روشنی نے ایک نیا پہلو واضح کر دیا ہے یعنے حضرت نوح کی دعوت غالباً اس قدیم نسل میں پہلی دعوت تھی، اور چونکہ پہلی دعوت تھی، اس لیے ناگزیر تھا کہ اس کی دعوتوں کا تذکرہ اسی سے شروع ہو۔

واضح تورات کی بنا پر سامی نسلوں اور زبانوں کی جو تقسیم کی گئی تھی، اور جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے علماء انساب والسنہ کے نزدیک بنیادی تقسیم رہی ہے، اب متزلزل ہو رہی ہے، اور معلوم ہوتا ہے از سرِ نو نئی تقسیمیں کرنی پڑیں گی۔ دیکھو تعلیق نباء بعد حین: (۱: ۱۳۸)

(۲۵) اس سورت کی تصریحات میں ایک معاملہ اور تشریح طلب رہ گیا ہے، اور ضروری ہے کہ اس طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔ قرآن نے جس طرح دوسری قوموں کے عذاب کا ذکر کیا ہے، اسی طرح قوم نوح کے عذاب کا بھی ذکر کیا ہے، اور اگر دوسری قوموں کا عذاب صرف انہی قوموں کے لیے تھا، تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم نوح کا عذاب یعنے طوفان عالمگیر تصور کیا جائے۔ لیکن چونکہ تورات کی کتاب پیدائش میں اس طرح کی تصریحات موجود ہیں کہ طوفان عام تھا، اور یہودیوں اور عیسائیوں کا ایسا ہی اعتقاد رہا ہے، اس لیے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا، اور اس طرح کی تفسیر کی جانے لگی جو طوفان کے عموم پر مبنی تھی۔ بہرحال دو باتیں یاد رکھنی چاہییں۔ ایک یہ کہ قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے طوفانِ نوح عام ثابت ہوتا ہو۔ دوسری یہ کہ تورات کے بقیہ اجزاء کے بارے میں کچھ ہی کہا جائے، لیکن موجودہ زمانہ میں علم و تحقیق کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ کتاب پیدائش لائق اعتماد نہیں، خصوصاً اس کا ابتدائی حصہ۔ تفصیل اس کی مقدمہ میں ملے گی۔

انیسویں صدی کی اثری تحقیقات اور وقائع بنی اسرائیل

(۲۶) انیسویں صدی کی اثری تحقیقات نے ایک نیا سوال بھی پیدا کر دیا ہے۔ یعنے تورات اور قرآن میں حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) کی جو سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں، مصر کے تاریخی آثار میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ بنی اسرائیل کے توطنِ مصر اور خروج کا پورا واقعہ اثریات مصر کی تاریخ میں ایک غیر معلوم واقعہ ہے۔

دنیا کی کسی پرانی قوم نے اپنی تاریخ کی کتابت و حفاظت کا ایسا انتظام نہیں کیا جیسا کہ قدیم مصریوں نے کیا تھا۔ جس وقت تک پیپرس (قدیم مصری کاغذ) ایجاد نہیں ہوا تھا، شاہی محلوں، مندروں، اور مقبروں کی دیواروں پر ہر عہد کے حالات مسلسل نقش کیے جاتے تھے، اور جب پیپرس رائج ہو گیا، تو باقاعدہ دفاتر مدوّن ہونے لگے۔ علاوہ بریں ہر بادشاہ اور امیر کی وفات کے بعد اس کی نعش حنوط (ممی) کر کے ایک خاص مقبرہ میں رکھی جاتی تھی، اور نعش کے ساتھ اس کی زندگی کے وقائع بھی رکھ دیے جاتے تھے۔ اب یہ تمام آثار روشنی میں آگئے ہیں، اور ان کی معلومات نے ایک مرتب تاریخ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ان معلومات نے ہمیں پانچ ہزار برس پیشتر کے واقعات تک پہنچا دیا ہے۔ بعد کے واقعات کے لیے یونانی نوشتے موجود ہیں۔ دونوں یکجا کر دیے جائیں، تو تقریباً تین ہزار سال قبل از مسیح سے لے کر عہد سکندر تک کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ اس تمام عرصہ میں چھبیس شاہی خاندانوں نے مصر پر حکومت کی۔ آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا جس کے بعد ۳۳۲ قبل از مسیح میں سکندر اعظم کا تسلط قائم ہوا۔ ان چھبیس خاندانوں کے اکثر افراد روشنی میں آگئے ہیں، اور ان کے ناموں کی فہرستیں مرتب کر لی گئی ہیں۔

علماء آثار کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کا معاملہ ایک نہایت غیر معمولی نوعیت کا معاملہ تھا۔ پھر ان کے خاندان کا مصر آنا اور بس جانا اور حضرت موسیٰ کا ظہور اور فرعون سے مقابلہ، تمام تر ایسے واقعات ہیں جو نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ ضروری تھا کہ آثار مصر میں ان کا ذکر ملتا، لیکن کسی طرح کا بھی تذکرہ نہیں ملتا۔ تورات کی تعیین کے مطابق حضرت یوسف کا زمانہ مصر کے ہیکسس (Hyksos) فرمانرواؤں کا زمانہ ہے، اور حضرت موسیٰ کا زمانہ بیسویں حکمران خاندان کا زمانہ ہونا چاہیے جس میں رعمسیس سوم سے لیکر رعمسیس یازدہم تک کے فراعنہ گزرے ہیں۔ لیکن ان تمام بادشاہوں کے جس قدر حالات معلوم ہوئے ہیں، ان میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جو حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) کی سرگزشتوں کی خبر دیتا ہو۔

اسی بنا پر بیسویں صدی کے علماء تاریخ کا عام رجحان اس طرف ہے کہ دونوں واقعوں کی تاریخی حیثیت قابل تسلیم نہیں۔

لیکن کیا آثار مصر کا سکوت اس کے لیے کافی ہے کہ اسے تاریخ کی منفی شہادت تسلیم کر لیا جائے؟ اور کیا فی الحقیقت آثار مصر میں ان واقعات کے لیے کوئی روشنی نہیں؟ یہ ضروری سوالات ہیں جنہیں حل کرنا چاہیے۔ لیکن اس کا محل البیان ہے۔ ترجمان القرآن نہیں۔

سورۃ یوسف (۱۲)

مکی ـ ۱۱۱ ـ آیتیں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

الٓرٰ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۝ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝ نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ٭ۖ وَ اِنۡ کُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ ۝ اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُهُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ۝ قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡیَاکَ عَلٰۤی اِخۡوَتِکَ فَیَکِیۡدُوۡا لَکَ کَیۡدًا ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ۝

(۱) یہ سورت بھی اُن سورتوں میں سے ہے جو اوائل دعوت میں نازل ہوئیں۔ اس میں اوّل سے لے کر آخر تک ایک ہی سرگزشت بیان کی گئی ہے، اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگزشت ہے

(۲) گزشتہ سورت میں گزر چکا ہے کہ حضرت ابراہیم کو بشارت دی گئی تھی کہ ایک لڑکا پیدا ہوگا، اور پھر اُس سے ایک لڑکا ہوگا، اور اُس کی اولاد میں خدا برکت دیگا۔ (آیت ۱۷) چنانچہ حضرت اسحاق پیدا ہوئے اور اُنکی اولاد میں حضرت یعقوب ہوئے۔ حضرت یعقوب کے بارہ لڑکے تھے:

لیاہ سے: روبن ـ شمعون ـ لادی ـ یہوداہ ـ اشکار ـ زبلون ـ

بلہا سے: دان ـ نفتالی ـ

زلفہ سے: جد ـ آشر

راخل سے: یوسف ـ بن یمین ـ

یوسف اور بن یمین سب سے چھوٹے تھے۔ اور بن یمین کی پیدایش کے بعد ماں کا انتقال ہوگیا۔ پس گھرانے میں چودہ آدمی رہ گئے تھے۔ بارہ لڑکے، باپ اور اُنکی ایک بیوی۔

(۳) توراۃ میں ہے کہ لیاہ اور راخل میں سخت رقابت تھی اور اس کا اثر اُن کی اولاد میں بھی پوری طرح نمایاں تھا حضرت یعقوب یوسف کو سب سے زیادہ چاہتے تھے، اور یہ بات سوتیلے بھائیوں پر بہت شاق تھی۔ (پیدائش ۳۷: ۴) اسی لیے حضرت یعقوب نے روکا تھا کہ اپنا خواب بھائیوں سے نہ کہیو۔

الف ـ لام ـ را ـ

یہ آیتیں ہیں، روشن و واضح کتاب کی!

ہم نے اسے اس شکل میں اُتارا کہ عربی زبان کا قرآن ہے۔ تاکہ تم سمجھو بوجھو۔

(اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کرکے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی) سرگزشتیں سناتے ہیں، اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو اُنھی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگزشتوں سے) بے خبر تھے۔

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا "اے میرے باپ! میں نے (خواب میں) دیکھا کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند، اور دیکھا کہ یہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں!"

(باپ نے) کہا "اے میرے بیٹے! اپنے اس خواب کا حال اپنے بھائیوں سے نہ کہیو کہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبہ کی تدبیریں کرنے لگیں۔ یاد رکھ شیطان انسان کا صریح دشمن ہے"

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ لَّقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ ۝ إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ ۨ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ۝ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ

"اور (اے میرے بیٹے! جس طرح تو نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج چاند تیرے آگے جھکے، تو) اسی طرح تیرا پروردگار تجھے برگزیدہ کرنے والا ہے، اور یہ بات سکھلانے والا ہے کہ باتوں کا نتیجہ و مطلب کیونکر ٹھہرایا جائے۔ نیز جس طرح وہ اب سے پہلے تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر اپنی نعمت پوری کر چکا ہے، اسی طرح تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر بھی پوری کریگا۔ بلاشبہ تیرا پروردگار (سب کچھ جاننے والا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے!" ۶

(۴) توارت میں ہے کہ یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی جب خواب کا معاملہ پیش آیا (پیدائش ۳۷ : ۲)

(۵) خواب میں گیارہ ستاروں سے مقصود یوسف کے گیارہ بھائی تھے، اور سورج چاند سے باپ اور (سوتیلی) ماں۔ توارت میں ہے کہ یوسف نے بھائیوں سے خواب کہہ دیا تھا، اور انہیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ اس کی تعبیر کیا ہے۔ (پیدائش ۳۷ : ۱۱) غالباً حضرت یوسف باپ کی ممانعت سے پہلے یہ بات ظاہر کر چکے تھے۔

جو لوگ (حقیقت حال) پوچھنے والے ہیں، (اگر وہ سمجھیں، تو) اُن کے لیے یوسف اور اُس کے بھائیوں کے معاملہ میں (موعظت و عبرت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں: ۷

اور جب ایسا ہوا تھا کہ (یوسف کے سوتیلے بھائی آپس میں) کہنے لگے "ہمارے باپ کو یوسف اور اُس کا بھائی (بن یمین) ہم سب سے بہت زیادہ پیارا ہے حالانکہ ہم ایک پوری جماعت ہیں (و نیز ہماری اتنی بڑی تعداد ہے) اور یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے"۔ ۸

"پس (بہتر یہ ہے کہ) یوسف کو مار ڈالیں۔ یا کسی جگہ پھینک آئیں۔ تاکہ ہمارے باپ کی توجہ ہماری ہی طرف رہے، اور اس کے نکل جانے کے بعد ہمارے سارے کام سدھر جائیں" ۹

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا "نہیں یوسف

(۶) بھائیوں کا یوسف کے بارے میں مشورہ کرنا، اور اس پر متفق ہونا کہ اسے ایک اندھے کنوے میں ڈال دیا جائے، اور باپ سے اجازت مانگنی کہ یوسف کو اپنے ساتھ جنگل میں لے جائیں جہاں وہ روز مویشی چرانے جایا کرتے تھے۔

توارت میں ہے کہ جب بھائیوں نے مشورہ کیا تو روبن نے کہا قتل نہ کرو کنویں میں ڈال دو (پیدائش ۳۷ : ۲۲)

إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ○ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ ○ أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَن تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ ○ قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَّخَاسِرُونَ ○ فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ○ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِندَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنتَ بِمُؤْمِنٍ

کو قتل مت کرو۔ اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو۔ (گزرنے والے قافلوں میں سے) کوئی قافلہ (اُس پر گزریگا اور) اسے نکال لیگا"۔

(تب سب مل کر باپ کے پاس آئے اور) اُنہوں نے کہا "اے ہمارے باپ! کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے؟ (اور ہمارے ساتھ کہیں جانے نہیں دیتے؟) حالانکہ ہم تو اُس کے دل سے خیرخواہ ہیں۔ کل ہمارے ساتھ اسے (جنگل میں) جانے دیجیے کہ کھائے پیے، کھیلے کودے ہم اُس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"۔

(ے) حضرت یعقوب کا اندیشہ ظاہر کرنا اور پھر اجازت دیدینی۔

اُس زمانہ میں قبائل کی دولت و ثروت کا بڑا ذریعہ مویشی تھا۔ مرد دن بھر چراتے تھے۔ شام کو خیموں میں آکر آرام کرتے تھے۔ ایسی ہی زندگی حضرت یعقوب کے گھرانے کی بھی تھی۔ بھیڑیے مویشی کے دشمن ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے بے اختیار حضرت یعقوب کی زبان سے نکل گیا، کہیں ایسا ہی حادثہ یوسف کو پیش نہ آجائے۔ یوسف کے بھائیوں نے یہی بات پکڑلی، اور اسی کا جھوٹا قصہ بنا کر سُنا دیا۔

(باپ نے) کہا "یہ بات مجھے غم میں ڈالتی ہے کہ تم اسے اپنے ہمراہ لے جاؤ۔ اور میں ڈرتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو، بھیڑیا کھالے اور تم اس سے غافل ہو"۔

اُنہوں نے کہا "بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بھیڑیا اُسے کھالے اور ہمارا ایک پورا جتھا موجود ہو۔ اگر ایسا ہو تو پھر ہم نرے نکمّے ہی نکلے!"

پھر جب یہ لوگ (باپ سے رخصت لیکر) یوسف کو ساتھ لے گیے، اور سب نے اس پر اتفاق کرلیا کہ اندھے کنوئیں میں ڈال دیں (اور ایسا ہی کرگزرے) تو ہم نے یوسف پر وحی بھیجی کہ (مایوس نہ ہو) ایک دن ضرور آنے والا ہے، جب اُن کا یہ معاملہ تو اُنہیں جتائیگا اور وہ نہیں جانتے (کہ کیا کچھ ہونے والا ہے)

اور وہ اپنے باپ کے پاس شام کو روتے پیٹتے آئے۔ اُنہوں نے کہا "اے ہمارے باپ! ہم ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے لیے دوڑ میں لگ گیے تھے، اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ پس ایسا ہوا کہ بھیڑیا آنکلا اور یوسف کو (مار کر) کھالیا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ آپ ہاری بات کا یقین

لَنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ۝ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ ۱۷
اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ ۱۸
فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ ۱۹

---

۱۷ کرنے والے نہیں۔ اگرچہ ہم کتنے ہی سچے ہوں"

اور وہ یوسف کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون لگا لائے تھے۔ باپ نے (اُسے دیکھتے ہی) کہا "نہیں (میں یہ نہیں مان سکتا) یہ تو ایک بات ہے جو تمہارے نفس نے گڑھ کر تمہیں خوشنما دکھا دی ہے (اور تم سمجھتے ہو چل جائیگی) خیر میرے لیے اب صبر کرنا ہے، (اور) صبر (بھی ایسا کہ) پسندیدہ (ہو) اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اُس پر اللہ ہی سے مدد مانگنی ہے!"

۱۸ اور (دیکھو) ایک قافلہ کا اُس پر گزر ہوا۔ (یعنی اُس کنویں پر جس میں یوسف کو ڈالا تھا) اور قافلہ والوں نے پانی کے لیے اپنا سقہ بھیجا۔ پھر جونہی اُس نے اپنا ڈول لٹکایا (اور یہ سمجھ کر کہ پانی سے بوجھل ہو چلا ہے، اوپر کھینچا) تو کیا دیکھتا ہے، ایک جیتا جاگتا لڑکا اس میں بیٹھا ہے! (وہ) پکار اُٹھا "کیا خوشی کی بات ہے! یہ تو ایک لڑکا ہے!" اور (پھر) قافلہ والوں نے اُسے اپنا سرمایۂ تجارت سمجھ کر چھپا رکھا (کہ کوئی دعویدار نہ نکل آئے) اور وہ جو کچھ کر رہے تھے، اللہ کے علم سے پوشیدہ نہ تھا!

۱۹ اور (پھر) اُنہوں نے یوسف کو بہت کم داموں پر کہ گنتی کے چند درہم تھے (بازار مصر میں) فروخت کر دیا

(۷) یوسف کے بھائیوں کا یوسف کو کنویں میں ڈال دینا، بھیڑیے کے حملے کا جھوٹا قصہ بنانا، حضرت یعقوب کا اُن کے کذب پر مطلع ہو جانا، مگر صبر جمیل کا شیوہ اختیار کرنا۔ "صبر" کے معنی شدائد جھیلنے کے ہیں "جمیل" ایسی بات جو پسندیدہ ہو۔ پس "صبر جمیل" ایسا صبر ہوا جو بڑے ہی پسندیدہ طریقہ پر ہو۔ یعنے نہ صرف یہ کہ شدائد جھیل لیے جائیں بلکہ بڑی خوبی کے ساتھ جھیلے جائیں۔ شدائد کا شکوہ نہ ہو۔ درد و الم کی شکایت زبان پر نہ آئے۔ چونکہ حضرت یعقوب کو فراستِ نبوت سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ پچھلی بشارتیں یوسف ہی کے ذریعہ پوری ہونے والی ہیں، اس لیے وہ کبھی باور نہیں کر سکتے تھے کہ اس طرح اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ پس فرمایا "صبر جمیل" یعنے اس معاملہ میں حکمتِ الٰہی کا ہاتھ صاف نظر آ رہا ہے۔ پس میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ بغیر شکوہ و شکایت کے دردِ فراق جھیلتا رہوں، اور اُس کی کارفرمائیوں کے ظہور کا انتظار کروں، "واللہ المستعان علی ما تصفون"!

آیت (۱۸) میں خون آلود کرتے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا کیونکہ اسی سے اُن کا سارا جھوٹ کھل گیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے خیال میں یہ بڑی ہوشیاری کی بات کی تھی کہ یوسف کے کرتے پر بکری کا خون لگا کر بطور شہادت کے لے آئے لیکن یہ نہ سمجھے کہ اگر بھیڑیے نے حملہ کیا تھا تو کرتا کیسے بچ رہا! اس کے تو پُرزے پُرزے ہو جانے تھے۔ حضرت یعقوب نے جب کرتا دیکھا، تو اُنہیں پورا یقین ہو گیا کہ ساری کہانی من گھڑت ہے۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت دیکھو حضرت یعقوب نے صرف اتنا کہہ کر "سولت لکم انفسکم امرا" کس طرح ساری باتیں

وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا

۲۰ ۲۱ ۲۲

اور وہ اس معاملہ میں (اچھی قیمت لینے کے چنداں) خواہشمند بھی نہ تھے (یعنی چونکہ لڑکا مفت مل گیا تھا، یا بہت کم داموں خریدا تھا، اس لیے بڑی قیمت کے چنداں خواہشمند نہ تھے) ۲۰

اور اہل مصر میں سے جس شخص نے یوسف کو قافلہ والوں سے مول لیا تھا، وہ (اُسے لیکر اپنے گھر آیا، اور) اپنی بیوی سے بولا "اسے عزت کے ساتھ رکھو۔ عجب نہیں، یہ ہمیں فائدہ پہنچائے، یا ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں"

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے یوسف کا سرزمین مصر میں قدم جما دیا، اور مقصود یہ تھا کہ اُسے باتوں کا نتیجہ و مطلب نکالنا سکھا دیں۔ اور اللہ کو جو معاملہ کرنا ہوتا ہے، وہ کر کے رہتا ہے، لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے! ۲۱

اور پھر جب ایسا ہوا کہ یوسف اپنی جوانی کو پہنچا، تو ہم نے اُسے کارفرمائی کی قوت اور علم کی فراوانی بخشی۔ ہم نیک عملوں کو ایسا ہی (اُن کی نیک عملی کا) بدلہ عطا فرماتے ہیں! ۲۲

اور (پھر ایسا ہوا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف

کہ دیں جو اس معاملہ کے لیے کہی جاسکتی تھیں: یعنے ان کا حسد کرنا، سازش کرنی، معاملہ کی ایک پوری صورت بنا لینی، اور پھر سمجھنا، اس طرح ہم کامیاب بھی ہو جائینگے، اور ہمارا جھوٹ بھی نہیں کھلیگا۔ سب کی طرف اس میں اشارے ہو گئے۔

(۹) ایک عرب قافلہ کا کنویں پر سے گزرنا، حضرت یوسف کا ڈول میں بیٹھ کر نکل آنا، اور فروخت ہونا۔

تورات میں ہے کہ قافلہ اسماعیلیوں کا تھا جو گرم مصالح، بلسان، اور مُر مصر لے جا رہا تھا، اور اُس وقت پہنچا تھا جب یوسف کے بھائی اپنا کام پورا کر کے روٹی کھانے بیٹھے تھے۔ تب یہودا نے کہا۔ بہتر ہے، ہم یوسف کو ان لوگوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ اس کے مار ڈالنے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا چنانچہ انھوں نے بیس سکوں پر بیچ ڈالا (پیدائش، ۳۷: ۲۵)

اسماعیلی یعنے حجاز کے عرب جو حضرت اسمٰعیل کی نسل سے تھے۔ اگر یہ معاملہ واقعی پیش آیا تھا، تو قرآن نے اسے حذف کر دیا۔ کیونکہ ضروری نہ تھا۔ اور آیت (۲۰) میں وہ واقعہ بیان کر دیا جو مصر پہنچنے کا ذریعہ ہوا۔

ڈول کھینچنے والے نے اظہار تعجب کی جگہ اظہار مسرت اس لیے کیا کہ غلامی کا رواج عام تھا، اور کم سن اور خوبصورت لڑکا ہاتھ لگ جاتا تو ایک قیمتی متاع سمجھی جاتی اور معقول قیمت وصول ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا: واسروہ بضاعۃ

تورات میں ہے کہ یہ کنواں بیابان میں تھا اور اس میں ایک بوند پانی نہ تھا (پیدائش ۳۷: ۲۲ و ۲۴) پس حضرت یوسف کنوئیں میں پڑے رہے۔ جب قافلہ کے آدمی نے ڈول لٹکایا تو سمجھے، شاید کوئی آدمی مجھے نکالنے آیا ہے، اور ڈول میں بیٹھ گئے۔ اس طرح اُن کی رہائی کا خود بخود سامان ہو گیا۔

عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ
اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ ۲۳
لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَ ۲۴
قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ
سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ يُّسْجَنَ

(۱۰) مصر کے ایک ۔۔۔ کا حضرت یوسف کو خریدنا، اور اُن کے اخلاق وخصائل سے اس درجہ متاثر ہونا کہ اپنا سب کچھ اُن کے سپرد کردینا۔

توراۃ میں ہے کہ جس مصری نے خریدا تھا، اُس کا نام فوطی فار تھا، اور وہ فرعون کا ایک امیر اور سردار فوج تھا (پیدایش ۳۷: ۳۶)۔ قرآن نے بھی آگے چل کر اُسے "عزیز" کہا ہے۔ یعنے ایسا آدمی جو ملک میں بڑی جگہ رکھتا تھا۔

عزیز مصر نے پہلے تو خوبصورت غلام دیکھ کر خرید لیا تھا۔ لیکن جب تھوڑے ہی دنوں کے اندر اُس پر حضرت یوسف کے جوہر کھل گئے۔ تو اُن کی راست بازی، نیک عملی، اور پاکی نفس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنے سارے گھر بار اور علاقہ کا مختار کل بنا دیا۔ توراۃ میں ہے کہ یوسف کے حسن انتظام سے فوطی فار کی آمدنی دوگنی ہوگئی تھی (پیدایش ۳۹: ۴)

غور کرو قرآن نے یہ سارا معاملہ ایک چھوٹی سی آیت میں بیان کردیا یعنے آیت (۲۱) میں۔ عزیز کا اپنی بیوی سے یہ کہنا کہ اسے عزت کے ساتھ گھر میں رکھو، اسی طرف اشارہ ہے۔

(۱۱) حضرت یوسف کی مصری زندگی اور مصری کامرانیوں کی ابتداء،

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو گویا حضرت یوسف کی مصری کامرانیوں کی بنیاد پڑگئی، اور وہ میدان پیدا ہوگیا جہاں اُن کے جوہر کھلنے والے اور بتدریج تخت مصر تک پہنچانے والے تھے۔ پس فرمایا: کذالک مکنا لیوسف فی الارض اس طرح ہم نے یوسف کے مصر میں قدم جما دیے کہ غلام ہوکر بکا تھا، لیکن معزز و محترم ہوکر زندگی بسر کرنے لگا۔ نیز اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ اُس پر "تاویل الاحادیث" کے علم کی راہ کھول دیں، جس کی خبر ستاروں والے خواب میں دی جاچکی تھی (تاویل الاحادیث کی تشریح آخری نوٹ میں ملیگی)۔

رہتا تھا (یعنے عزیز کی بیوی) وہ اُس پر (ریجھ گئی، اور) ڈورے ڈالنے لگی کہ بے قابو ہوکر بات مان جائے۔ اُس نے (ایک دن) دروازے بند کردیے، اور بولی "لو آؤ" یوسف نے کہا "معاذاللہ! (مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہوسکتی) تیرا شوہر میرا آقا ہے اُس نے مجھے عزت کے ساتھ (گھر میں) جگہ دی ہے (میں اُس کی امانت میں خیانت نہیں کرونگا) اور حد سے گزرنے والے کبھی فلاح نہیں پاسکتے!"

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت یوسف کے پیچھے پڑچکی تھی، اور (حالت ایسی ہوگئی تھی کہ بے قابو ہوکر) یوسف بھی اس کی طرف متوجہ ہوجاتا اگر اُس کے پروردگار کی دلیل اُس کے سامنے نہ آگئی ہوتی۔ (تو دیکھو اس طرح (ہم نے نفس انسانی کی اس سخت آزمائش میں بھی اُسے دلیل حق کے ذریعہ ہشیار رکھا) تاکہ برائی اور بے حیائی کی باتیں اُس سے دور رکھیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے اُن بندوں میں سے تھا جو برگزیدگی کے لیے چن لیے گئے!

اور (ایسا ہوا کہ) دونوں دروازہ کی طرف دوڑے اس طرح، کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا (یوسف اس لیے کہ عورت سے

عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ○ وَاِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ○ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ۭ اِنَّ (۲۵، ۲۶، ۲۷)

بھاگ نکلے۔ عورت اس لیے کہ اُسے نکل بھاگنے سے روکے) اور عورت نے یوسف کا کرتا پیچھے سے کھینچا اور دو ٹکڑے کر دیا۔ اور (پھر اچانک) دونوں نے دیکھا کہ عورت کا خاوند دروازے کے پاس کھڑا ہے۔ تب عورت نے (اپنا جرم چھپانے کے لیے فوراً بات بنا لی اور) کہا "جو آدمی تیرے اہل خانہ کے ساتھ بُری بات کا ارادہ کرے اُس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟ کیا یہی نہیں ہونی چاہیے کہ اُسے قید میں ڈالا جائے یا (کوئی اور) دردناک سزا دی جائے؟" (۲۵)

(اس پر) یوسف نے کہا "خود اسی نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور مجبور کیا کہ پھسل پڑوں" (میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا)

اور (پھر ایسا ہوا کہ) اُس عورت کے کنبہ والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی، اُس نے کہا۔ "یوسف کا کرتا (دیکھا جائے) اگر آگے سے دو ٹکڑے ہوا ہے، تو عورت سچی ہے۔ یوسف جھوٹا ہے۔ (۲۶) اگر پیچھے سے دو ٹکڑے ہوا ہے، تو عورت نے جھوٹ بولا۔ یوسف سچا ہے" (۲۷) پس جب عورت کے خاوند نے دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیچھے سے دو ٹکڑے ہوا ہے، تو (اصلیت پا گیا اور) عورت سے کہا "کچھ شک نہیں

پھر فرمایا: واللہ غالب علیٰ امرہ۔ دیکھو خدا جو کچھ چاہتا ہے کس طرح کر کے رہتا ہے! بھائیوں نے یوسف کو نامراد کرنا چاہا تھا، لیکن اُنہوں نے جو کچھ کیا، وہی اُس کی فتح و فیروزی کا ذریعہ بن گیا!

(۱۲) حضرت یوسف کا بلوغ کو پہنچنا، اور دانشِ حکومت اور فضیلتِ علم کی تکمیل۔

اوپر تورات کی تصریح گزر چکی ہے کہ باپ سے علیٰحدگی کے وقت ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔ پس آیت (۲۲) میں فرمایا عزیز کے یہاں کئی سال رہنے کے بعد جب وہ جوان ہو گئے تو حکمرانی کی دانش اور علم کی فضیلت مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی، اور قانونِ الٰہی یہ ہے کہ نیک کرداروں کو اسی طرح اُن کے حُسنِ عمل کے نتائج ملا کرتے ہیں!

(۱۳) عزیز کی بیوی کا حضرت یوسف پر فریفتہ ہونا، اور ایک سخت ترین آزمائشی حالت میں ڈالنا، پھر ناکام رہ کر جھوٹا الزام لگانا، مگر اُن کا معصیت سے بچے رہنا، اور حیرت انگیز طریقہ پر الزام کا بھی جھوٹا ثابت ہونا۔

آیت (۲۳) سے اُس واقعہ کا بیان شروع ہوتا ہے، جو حضرت یوسف کی زندگی کا سب سے زیادہ عظیم واقعہ ہے۔ تشریح اس کی آخری نوٹ میں ملیگی۔

تورات میں ہے کہ یوسف خوبصورت اور نور پیکر تھے (پیدائش ۳۹ : ۶) پس جب جوانی کو پہنچے، تو اس کی بیوی ان پر فریفتہ ہو گئی، اور جب دیکھا، دوسری طرف سے جواب نہیں ملتا، تو جیسا کہ قاعدہ ہے، فتنت کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کام میں لائی۔ پھر جب اس پر بھی وہ نہ پھسلے، تو ایک دن جوشِ فریفتگی میں وہ بات کر بیٹھی جو اس معاملہ کی انتہائی حد ہے۔ یعنے ہر طرح کے موانع جو کسی انسان کو ضبطِ نفس پر مجبور کر سکتے ہیں راہ سے دور کر دیے،

كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ۝ يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ۝ ۲۸
وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَن نَّفْسِهِ ۖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۖ إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ ۲۹ ع ۱۴
فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۳۰

اور کھلے لفظوں میں ذالب ومُصر ہوئی۔ غور کرو۔ آیت کے ابتدائی جملے نے ان ساری باتوں کی طرف کس طرح صاف صاف اشارات کر دیے ہیں!

۲۸ جس شخص نے انکشاف حقیقت کا طریقہ بتلایا، اُسے شاہد کہا۔ کیونکہ اُس نے کرتا دیکھ کر اصلیت پالی تھی، اور حضرت یوسف کی پاکی کی شہادت دی تھی، اور پھر ثبوت میں کہا تھا کہ تم خود بھی دیکھ لو، ان کے کرتے کا کیا حال ہے؟ یہ کون شخص تھا؟ خود اس عورت کے عزیزوں میں سے تھا۔ اس سے زیادہ قرآن نے تصریح نہیں کی۔ کیونکہ جو بات واضح کرنی تھی وہ صرف یہ تھی کہ حضرت یوسف کی پاکی

۲۹ وراست بازی نے گھر کے تمام آدمیوں کو اُن کا معتقد بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ خود عورت کے ایک رشتہ دار نے اپنے رشتہ داری کا لحاظ نہیں کیا، یوسف کی حمایت میں سچائی ظاہر کر دی۔
(۱۴) شہر کی ہم درجہ عورتوں میں اس بات کا چرچا ہونا، عورتوں کا بناوٹ اور ریاکاری سے طعن تشنیع کرنا عزیز کی بیوی کا سُننا اور ضیافت کا [illegible] سامان کرنا، اور

۳۰ حضرت یوسف کی عصمت وپاکی کا اس آزمائش میں بھی بے داغ نکلنا۔

آیت (۳۰) میں جس واقعہ کا ذکر کیا ہے، یہ حضرت یوسف کے جمال سیرت کا ایک دوسرا مظاہرہ ہے، اور پہلے سے بھی زیادہ عظیم ہے۔ ضروری تشریح آخری نوٹ میں ملیگی۔ ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اس زمانہ کی مصری معاشرت کس درجہ شائستہ ہو چکی تھی؛ ضیافت کی مجلسیں خاص طور پر آراستہ کی جاتی تھیں، نشست کیلیے مسندیں لگائی جاتی تھیں، کھانے کے لیے ہر شخص کے سامنے چھری رکھی جاتی تھی۔ مسندوں کے اہتمام کا حال اس سے معلوم ہو گیا کہ واعتدت لھن متکا۔ مصر کے آثار قدیمہ اور یونانی مورخوں کی شہادت سے جو حالات روشنی میں آئے ہیں اُن سے بھی اس متمدن معاشرت کی تصدیق ہوتی ہے۔ خصوصاً اُن نقوش سے جن میں امراء کی

یہ تم عورتوں کی مکاریوں میں سے ایک مکاری ہے؛ اور تم لوگوں کی مکاریاں بڑی ہی سخت مکاریاں ہیں!"

(پھر اُس نے کہا) اے یوسف! اس (معاملہ) سے درگزر کر (یعنے جو کچھ ہوا، اُسے بھلا دے) اور (بیوی سے کہا) "اپنے گناہ کی معافی مانگ۔ بلاشبہ تو ہی خطاوار ہے"

اور (پھر جب اس معاملہ کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں "دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی کہ اُسے رجھالے۔ وہ اُس کی چاہت میں دل ہار گئی۔ ہمارے خیال میں تو وہ صریح بدچلنی میں پڑ گئی ہے"

جب عزیز کی بیوی نے مکاری کی یہ باتیں سُنیں، تو انہیں بلوا بھیجا، اور اُن کے لیے مسندیں آراستہ کیں، اور (دستور کے مطابق) ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی (کہ کھانے میں کام آئے) پھر (جب یہ سب کچھ ہو چکا تو) یوسف سے کہا، ان سب کے سامنے نکل آؤ۔ جب یوسف نکل آیا اور ان عورتوں نے اُسے دیکھا، تو (ایسا پایا کہ) اسکی بڑائی کی قائل ہوگئیں۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ ۳۱
فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا
مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ ۳۲
كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ ۳۳
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ

مجلسوں کا مرقع دکھایا گیا ہے اور جو قرآن کے اِن اشارات کی پوری تفسیر ہیں۔

اور (بے اختیار) پکار اُٹھیں "سبحان اللہ! یہ تو انسان نہیں ہے۔ ضرور ایک فرشتہ ہے۔ بڑے مرتبے والا فرشتہ!" ۳۱

تب (عزیز کی بیوی) بولی "تم نے دیکھا! یہ ہے وہ آدمی جس کے بارے میں تم نے مجھے طعنے دیے تھے۔ ہاں بیشک میں نے اُس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا۔ اور (اب اُسے سُنا کے کہے دیتی ہوں کہ) اگر اُس نے میرا کہنا نہ مانا (اور اپنی ضد پر اڑا رہا) تو ضرور ایسا ہوگا کہ قید کیا جائے، اور بے عزتی میں پڑے" ۳۲

یوسف نے (یہ سُن کر) اللہ کے حضور دعا کی: خدایا! مجھے قید میں رہنا اس بات سے کہیں زیادہ پسند ہے، جس کی طرف یہ عورتیں بُلا رہی ہیں۔ اگر تو نے (میری [illegible] نہ کی اور) ان کی مکاریوں کے دام سے نہ بچایا، تو عجب نہیں میں ان کی طرف جھک پڑوں، اور اُن لوگوں میں سے ہو جاؤں جو نادانستہ ہیں!" ۳۳

تو (دیکھو) اُس کے پروردگار نے اُس کی دعا قبول کرلی، اور اُس سے عورتوں کی مکاریاں دفع کردیں۔ بلاشبہ وہی ہے (دعاؤں کا) سُننے والا (سب کچھ) جاننے والا! ۳۴

پھر (ایسا ہوا کہ) اگرچہ وہ لوگ (یعنے عزیز اور اُس کے خاندان کے آدمی) نشانیاں دیکھ چکے تھے

(۱۵) عزیز کی بیوی کا دھمکی دینا کہ اگر کہا نہ مانو گے تو قید میں ڈالے جاؤ گے، اور حضرت یوسف کا معصیت پر قید کو ترجیح دینا، اور قید خانہ میں بھی تبلیغ حق سے غافل نہ ہونا۔

عزیز پر حضرت یوسف کی سچائی ظاہر ہو گئی تھی، اس لیے اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ لیکن اُس کی بیوی کا عشق ایسا نہ تھا جو اس ناکامی سے سرد پڑ جاتا۔ وہ اور زیادہ بڑھ گیا۔ اور جب دیکھا کہ طلب و الحاح سے کسی طرح کام نہیں بنتا تو سختی پر اتر آئی، اور یوسف سے کہا یا تو میرا کہا نو، نہیں تو قیدی ہونے کی ذلت و رسوائی گوارا کرو۔ حضرت یوسف نے کہا، قید خانہ مجھے پسند ہے، لیکن راستی سے منحرف ہونا پسند نہیں!

توراۃ میں ہے کہ "جب یوسف قید خانے میں ڈالا گیا، تو قید خانے کا داروغہ اُس پر مہربان ہو گیا، اور تمام قیدیوں کا انتظام اُس کے سپرد کر دیا۔ وہ قید خانہ کا بالکل مختار ہو گیا تھا، اور خدا نے وہاں بھی اُسے اُس کے تمام کاموں میں اقبال مند کیا" (پیدائش ۳۹: ۲۲)

قرآن کی آیت (۳۶) میں بھی اس کے اشارات موجود ہیں [illegible] تو دو قیدیوں کا خواب کی تعبیر پوچھنا ہی اس کی دلیل ہے [illegible] غیر معمولی علم و فضیلت کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان

لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ
خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ
اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ
اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ
اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

(یعنے یوسف کی پاک دامنی کی نشانیاں) پھر بھی انہیں یہی بات ٹھیک دکھائی دی کہ ایک خاص وقت تک کے لیے یوسف کو قید میں ڈال دیں۔

۳۵ اور (دیکھو) ایسا ہوا کہ یوسف کے ساتھ دو جوان آدمی اور بھی قید خانے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے (یوسف سے) کہا۔ مجھے (خواب میں) ایسا دکھائی دیا ہے کہ میں شراب (بنانے) کے لیے (انگور کا عرق) نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا۔ مجھے ایسا دکھائی دیا ہے کہ سر پر روٹی اُٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اُسے کھا رہے ہیں۔ (اور دونوں نے درخواست کی کہ) ہمیں بتلا دو، اس بات کا نتیجہ کیا نکلنے والا

۳۶ ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ تم بڑے نیک آدمی ہو"

یوسف نے کہا (گھبراؤ نہیں) قبل اس کے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے، میں تمہارے خوابوں کا مآل تمہیں بتلا دونگا۔ اس بات کا علم بھی من جملہ اُن باتوں کے ہے جو مجھے میرے پروردگار نے تعلیم فرمائی ہیں۔ میں نے اُن لوگوں کی ملت ترک کی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر

۳۷ ہیں۔ میں نے اپنے باپ دادوں یعنے ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی۔ ہم (اولادِ ابراہیم) ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں۔ یہ (ملت) اللہ کا ایک فضل ہے جو اُس نے ہم پر، اور لوگوں پر کیا ہے، لیکن اکثر آدمی ہیں جو (اس نعمت کا) شکر نہیں

۳۸ بجا لاتے!"

دونوں کا یہ کہنا کہ "ہم دیکھتے ہیں، تم بڑے نیک آدمی ہو" صاف طور پر واضح کر دیتا ہے کہ قید خانے میں اُنکا تقدس عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔

توراۃ میں ہے کہ ان دو قیدیوں میں ایک پادشاہ کے ساقیوں کا سردار تھا۔ دوسرا روٹی پکانے والوں کا۔ پادشاہ اُن پر ناراض ہوا اور قید خانے میں بھیج دیا۔ یوسف ہر روز قیدیوں کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ ایک دن اُنہیں دیکھا کہ بہت اُداس بیٹھے ہیں۔ سبب پوچھا تو اُنہوں نے کہا۔ ہم نے آج رات کو ایسی ایسی باتیں خواب میں دیکھی ہیں۔

(پیدائش ۴: ۱)

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ ۳۹ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ○ ۴۰ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ○ ۴۱ وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى ۴۲

"اے یارانِ مجلس! (تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ) جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے؟ تم اُس کے سوا جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو، اُن کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے اُن کے لیے کوئی سند نہیں اُتاری، حکومت تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اُسی کی بندگی کرو۔ اَور کسی کی نہ کرو یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے!" ۳۹

"اے یارانِ مجلس! (اب اپنے اپنے خوابوں کا مطلب سُن لو) تم میں ایک آدمی (وہ ہے جس نے دیکھا کہ انگور نچوڑ رہا ہے) تو وہ (قید سے چھوٹ جائیگا، اور بدستور سابق) اپنے آقا کو شراب پلائیگا۔ اور دوسرا آدمی (وہ ہے جس نے دیکھا، اُس کے سر پر روٹی ہے اور پرندروٹی کھا رہے ہیں) تو وہ سولی پر چڑھایا جائیگا، اور پرند اُس کا سر نوچ نوچ کر کھائینگے۔ جس بات کے بارے میں تم سوال کرتے ہو، وہ فیصل ہو چکی۔ اور فیصلہ یہی ہے۔" ۴۰

اور یوسف نے جس آدمی کی نسبت سمجھا تھا کہ نجات پائیگا، اُس سے کہا "اپنے آقا کے پاس جب جاؤ تو مجھے یاد رکھنا" (یعنے میرا حال اُس سے ضرور کہہ دینا) لیکن (جب تعبیر کے مطابق اُس نے نجات پائی، تو) شیطان نے یہ بات بھلا دی کہ اپنے آقا کے حضور پہنچ کر اُسے یاد کرتا۔ پس یوسف کئی برس تک قید خانہ میں رہا۔ ۴۱

(۱۶) حضرت یوسف کا دو قیدیوں کو اُن کے خواب کی تعبیر بتلانا، اور اسی کے مطابق ظہور میں آنا، پھر پادشاہ مصر کا ایک عجیب و غریب خواب دیکھنا اور مصر کے تمام دانشمندوں اور جادوگروں کا تعبیر سے عاجز ہونا، اور بالآخر حضرت یوسف کو قید خانہ سے طلب کرنا۔

تورات میں ہے کہ حضرت یوسف نے ساقیوں کے سردار کو اس کے خواب کی تعبیر یہ بتلائی تھی کہ تین دن کے اندر فرعون تجھے تیرے منصب پر بحال کر دیگا۔ اور آگے کی طرح تو اُس کے ہاتھ کا جام دیگا۔ اور کہا تھا جب تو خوش حال ہو

اور پھر ایسا ہوا کہ (ایک دن) پادشاہ نے (اپنے تمام درباریوں کو جمع کر کے) کہا "میں (خواب میں) کیا دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی انہیں سات دبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں۔ اور سات بالیں ۴۲

سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا
۴۳ الْمَلَاُ اَفْتُوْنِىْ فِىْ رُءْيَاىَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ
۴۴ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِىْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ
۴۵ فَاَرْسِلُوْنِ ۝ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِىْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ
۴۶ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّىْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

تو مجھے یاد رکھیو اور فرعون سے میرا ذکر کیجیو کہ لوگ عبرانیوں کے ملک سے مجھے چرا لائے، اور یہاں بھی بغیر کسی قصور کے قید خانے میں ڈال دیا اور نان پزوں کے سردار سے کہا تھا کہ تین دن کے اندر تیری موت کا فیصلہ ہو جائیگا اور تیری لاش درخت پر لٹکائی جائیگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن فرعون کی سالگرہ کا دن تھا۔ اس دن سردار ساقی بحال کر دیا گیا، مگر نان پزوں کے سردار کو سزا ہوئی لیکن سردار ساقی نے بحال ہو کر یوسف کو یاد نہ رکھا۔ وہ یہ معاملہ بھول گیا (پیدائش ۴۰: ۱۲ تا ۳۰)

۴۳ چنانچہ حضرت یوسف کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ کئی سال تک قید خانہ میں پڑے رہے۔

۴۴ اس کے بعد وہ معاملہ پیش آیا جس کی طرف آیت (۴۳) میں اشارہ کیا ہے۔ یعنے پادشاہ مصر نے ایک عجیب طرح کا خواب دیکھا، اور جب دربار کے دانشمندوں سے تعبیر دریافت کی تو کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ تورات میں ہے کہ بادشاہ نے مصر کے تمام حکیموں اور جادوگروں کو جمع کیا تھا۔ مگر کوئی اس کی تعبیر بتلا نہ سکا (پیدائش ۴۱: ۸)

۴۵ یہاں قرآن نے درباریوں کا جو جواب نقل کیا ہے، اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی تشفی بخش بات معلوم نہ کر سکے تو کوشش کی کہ پادشاہ کے دل سے اس خواب کی اہمیت کا خیال نکال دیں۔ پس انہوں نے کہا۔ یہ کوئی روحانی بات نہیں ہے۔ ویسے ہی پریشان خیالی سے طرح طرح کی باتیں سوتے میں نظر آگئی ہیں۔ لیکن سردار ساقی کو خواب کی بات سن کر اپنے خواب کا معاملہ یاد آگیا، اور ساتھ ہی یہ بات بھی یاد آگئی کہ حضرت یوسف نے کیا کہا تھا؟ تب اس نے اپنا واقعہ پادشاہ کے گوش گزار کیا، اور قید خانہ میں جا کر حضرت یوسف سے ملا۔ حضرت

۴۶ یوسف نے فرمایا۔ سات گایوں سے مقصود زراعت کے

ہری ہیں، اور سات دوسری سوکھی۔ اے اہلِ دربار اگر تم خواب کا مطلب حل کر لیا کرتے ہو، تو بتلاؤ، میرے خواب کا حل کیا ہے؟"

درباریوں نے (غور و فکر کے بعد) کہا "یہ پریشان خواب و خیالات ہیں (کوئی ایسی بات نہیں جس کا کوئی خاص مطلب ہو) ہم سچے خوابوں کا مطلب تو حل کر دے سکتے ہیں لیکن، پریشان خوابوں کا حل نہیں جانتے"

اور جس آدمی نے (اُن) دو قیدیوں میں سے نجات پائی تھی، اور جسے ایک عرصہ کے بعد (یوسف کی) بات یاد آئی، وہ (خواب کا معاملہ سن کر) بول اٹھا "میں اس خواب کا نتیجہ تمہیں بتلا دونگا۔ تم مجھے (ایک جگہ) جانے دو"

(چنانچہ وہ قید خانے میں آیا اور کہا) "اے یوسف! اے کہ مجسّم سچائی ہے! اس (خواب) کا کیا حل بتا کہ سات موٹی تازی گایوں کو سات دُبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں، اور سات بالیں ہری ہیں سات سوکھی۔ تاکہ (اُن) لوگوں کے پاس واپس جا سکوں (جنھوں نے مجھے بھیجا ہے) کیا عجب ہے، وہ (تمہاری قدر و منزلت) معلوم کر لیں"

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ۝ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ۝ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ۝ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ

۴۷ ۴۸ ع ۶ ۴۹ ۵۰

کے سات برس ہیں۔ آئندہ سات برس تک بہت اچھی فصلیں ہونگی۔ یہ گویا سات موٹی گائیں ہوئیں۔ اس کے بعد سات برس تک متواتر قحط رہیگا۔ یہ سات دُبلی گائیں ہوئیں۔ انہوں نے موٹی گائیں نگل لیں۔ یعنے فراوانی کو قحط نے نابود کردیا۔ سات ہری بالوں اور سات سوکھی بالوں میں بھی یہی بات واضح کی گئی ہے۔ پھر فرمایا۔ اس آنے والی مصیبت سے ملک کو کیونکر بچایا جاسکتا ہے؟ اس کی تدبیر یہ ہے کہ بڑھتی کے سات برسوں میں قحط کے لیے اناج ذخیرہ کیاجائے اور اُسے اس طرح محفوظ رکھاجائے کہ آنے والے سات برسوں میں ملک کے لیے کفایت کرے۔

یہ قرآن کے ایجاز بلاغت میں سے ہے کہ تعبیر اور تدبیر کو الگ الگ بیان نہیں کیا۔ ایک ساتھ ہی بیان کردیا۔ تاکہ تکرار بیان کی حاجت نہ رہے۔

جب سردار ساقی نے حضرت یوسف کا جواب پادشاہ کو سُنایا، تو تعبیر اس درجہ واضح اور چسپاں تھی کہ اس نے سُنتے ہی اس کی تصدیق کی، اور اُن کی ملاقات کا مشتاق ہوگیا چنانچہ حکم دیا۔ فوراً انہیں قید خانے سے نکالاجائے اور دربار میں لایاجائے۔

یوسف نے کہا "اس خواب کی تعبیر اور اسکی بنا پر تمہیں جو کچھ کرنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ) سات برس تک تم لگاتار کھیتی کرتے رہوگے۔ (ان برسوں میں خوب بڑھتی ہوگی) پس (جب فصل کاٹنے کا وقت آیا کرے تو) جو کچھ کاٹو، اُسے اس کی بالوں ہی میں رہنے دو (تاکہ اناج سڑے گلے نہیں) اور صرف اتنی مقدار الگ کرلیا کرو جو تمہارے کھانے کے لیے (ضروری) ہو۔ پھر اس کے بعد سات بڑے سخت مصیبت کے برس آئینگے جو وہ سب ذخیرہ کھاجائینگے جو تم نے (اس طرح) پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا۔ مگر ہاں تھوڑا سا جو تم روک رکھوگے بچ رہیگا۔ پھر اس کے بعد ایک برس ایسا آئیگا کہ لوگوں پر خوب بارش بھیجی جائیگی۔ لوگ اس میں (پھلوں اور دانوں سے) عرق اور تیل خوب نکالیں گے"

(جب اُس آدمی نے یہ بات پادشاہ تک پہنچائی تو) پادشاہ نے کہا "یوسف کو (فوراً) میرے پاس لاؤ"۔ لیکن جب (پادشاہ) کا پیام بر یوسف کے پاس پہنچا، تو اُس نے کہا "میں یوں نہیں جاؤنگا۔ تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ، اور (میری طرف سے) دریافت کرو۔ اُن عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ (میں چاہتا ہوں پہلے اس کا فیصلہ ہوجائے) جیسی کچھ مکاریاں اُنہوں نے کی تھیں، میرا پروردگار اُسے خوب جانتا ہے"

(اس پر) پادشاہ نے (اُن عورتوں کو بُلایا اور) کہا "صاف صاف بتلادو تمہیں کیا معاملہ پیش آیا

إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ۝ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ۝ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ

۵۱ ۵۲ ۵۳

تھا، جب تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اُسے اپنی طرف مائل کر لو؟" وہ بولیں "حاشا للہ! ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی" (یہ سن کر) عزیز کی بیوی بھی (بے اختیار) بول اٹھی "جو حقیقت تھی، وہ اب ظاہر ہو گئی۔ ہاں، وہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے بلا شبہ وہ (اپنے بیان میں) بالکل سچا ہے"۔

"یہ میں نے اس لیے کہا کہ اُسے معلوم ہو جائے (یعنے یوسف کو معلوم ہو جائے) میں نے اُس کے پیٹھ پیچھے اُس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی نیز اس لیے، کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا۔ میں اپنے نفس کی پاکی کا دعوی نہیں کرتی۔ آدمی کا نفس تو برائی کے لیے بڑا ہی اُبھارنے والا ہے (اُس کے غلبہ سے بچنا آسان نہیں)، مگر ہاں اُسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے۔ بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے!"

اور (پھر) بادشاہ نے حکم دیا "یوسف کو میرے پاس لاؤ کہ اُسے خاص اپنے (کاموں کے) لیے مقرر کروں" پھر جب (وہ آیا تو بادشاہ نے) کہا "آج

(۴۷) حضرت یوسف کا مژدہ رہائی سُن کر قیدخانہ چھوڑنے سے انکار کر دیا، اور بادشاہ کہلا بھیجا کہ پہلے میرے قضیہ کی تحقیقات کر لی جائے۔ بادشاہ کا تحقیق کرنا، اور اُن کی پاکی و راستی کا آشکارا ہو جانا، اور عزیز کی بیوی کا اعلان کرنا کہ وہ سچا ہے۔ سارا قصور میرا تھا!

تعبیر سُن کر بادشاہ کے دل میں حضرت یوسف کا اس درجہ احترام پیدا ہو گیا کہ اس نے ایک خاص پیام بر ان کے لانے کے لیے بھیجا جسے آیت (۵۰) میں "رسول" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن حضرت یوسف نے تعمیل حکم سے انکار کر دیا انہوں نے کہا۔ میں اس طرح رہا ہونا پسند نہیں کرتا۔ پہلے میرے معاملہ کی تحقیقات کر لی جائے کہ مجھے قید میں کیوں ڈالا گیا؟ اگر میں مجرم ہوں تو رہائی کا مستحق نہیں۔ اگر مجرم نہیں ہوں تو بلاشبہ مجھے رہا ہونا چاہیے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے عزیز کی بیوی کی جگہ ان عورتوں کا ذکر کیوں کیا جنہوں نے مکاری سے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ اس لیے کہ:

(ا) قید کے معاملہ میں ان عورتوں کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے اپنی ناکامیابی کی ذلت مٹانے کے لیے جھوٹے الزام تراش لیے ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ قید کا معاملہ ان کے معاملہ کے بعد ظہور میں آیا

(ب) عزیز کی بیوی نے ان سب کے سامنے اُن کی بے گناہی اور اپنی طلب و سعی کا اعتراف کیا تھا جیسا کہ آیت (۳۲) میں گزر چکا ہے۔ پس یہ سب اس بات کی گواہ تھیں کہ عزیز کی بیوی کے معاملہ میں اُن کا دامن بے داغ ہے۔

(ج) ان سب کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا تھا خود اُس کو بھی عزیز کی بیوی کا الزام بے اصل ثابت ہوتا تھا۔ کیونکہ جس شخص کی پاکی طبع کا یہ حال ہو کہ ان تمام فتنہ گران شہر اور خوب رویان عہد کا متفقہ اظہار عشق بھی اُسے مسخر نہ کر سکا، کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ ایسا آدمی اپنے آقا کی بیوی پر

أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ○ (٥٤) قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ○ (٥٥) وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ○ (٥٦) وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ○ ع (٥٧) وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ○ (٥٨) وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَكُمْ مِنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي

ہاتھ ڈالے، اور ایسی حالت میں ہاتھ ڈالے کہ وہ متنفر اور گریزاں ہو!

اس معاملہ میں ایک اور دقیق نکتہ بھی ہے۔ آیت (۲۹) میں گزر چکا ہے کہ جب عزیز پر اپنی بیوی کا قصور ثابت ہو گیا تھا تو اُس نے کہا تھا یوسف اعرض عن ھذا۔ یوسف! اس بات سے درگزر کر دیجئے جو ہوا سو ہوا۔ اب اس کا چرچا نہ کیجیو کہ اس میں میری بدنامی ہے۔ بعد کو اگرچہ عزیز اپنی بات پر نہ رہا اور حضرت یوسف کو قید میں ڈال دیا، لیکن حضرت یوسف کا اخلاق ایسا نہ تھا کہ یہ بات بھول جاتے۔ عزیز نے اُنہیں غلام کی حیثیت سے خریدا تھا اور پھر اپنے عزیزوں کی طرح عزت و آرام کے ساتھ رکھا تھا۔ وہ اس کا یہ احسان نہیں بھول سکتے تھے، پس اُن کی طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ اس موقعہ پر اُس کی بیوی کا ذکر کر کے اُس کی رسوائی کا باعث ہوں۔ صرف ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کا ذکر کر دیا کہ ان میں کوئی نہ کوئی ضرور نکل آئیگی جو سچائی کے اظہار سے باز نہیں رہیگی۔

لیکن عزیز کی بیوی اب وہ عورت نہیں رہی تھی جو چند سال پہلے تھی۔ اب وہ ہوس کی خام کاریوں سے نکل کر عشق کی پختگی و کمال تک پہنچ چکی تھی۔ اب ممکن نہ تھا کہ اپنی رسوائی کے خیال سے اپنے محبوب کے سر الزام لگائے۔ جب عورتوں نے یوسف کی پاکی کا اقرار کیا۔ تو اُس نے بھی خود بخود اعلان کر دیا۔ سارا قصور میرا تھا۔ وہ بے جرم اور راست باز ہے!

کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحب اقتدار اور امانت دار انسان ہے!" (٥٤)

یوسف نے کہا "مملکت کے خزانوں پر مجھے مختار کر دیجیے۔ میں حفاظت کر سکتا ہوں، اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں" (چنانچہ بادشاہ نے اُسی مملکت کا مختار کر دیا) (٥٥)

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کے قدم جما دیے کہ جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے۔ ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب کر دیتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے! (٥٦)

اور جو لوگ (اللہ پر) ایمان لائے اور (بدعملیوں سے) بچتے رہے، اُن کے لیے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے! (٥٧)

اور (پھر قحط کے سالوں میں) ایسا ہوا کہ یوسف کے بھائی (کنعان سے غلہ خریدنے مصر آئے۔ یوسف نے اُنہیں (دیکھتے ہی) پہچان لیا لیکن اُنہوں نے نہیں پہچانا۔ (٥٨)

اور جب یوسف نے اُن کا سامان مہیا کر دیا، تو (جاتے وقت) کہا۔ "اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی (بن یمین) کو بھی ساتھ لانا۔ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں پوری تول (غلہ) دیتا ہوں اور (باہر

۵۹-۶۰ الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ○ فَإِنْ لَمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ ○

۶۱ قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ○ وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ

۶۲ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا إِلَى أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَى أَبِيهِمْ

۶۳ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ قَالَ هَلْ

آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنْتُكُمْ عَلَى أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ فَاللَّهُ خَيْرٌ حِفْظًا وَهُوَ

۵۹ سے آنے والوں کے لیے) بہتر مہمان نواز ہوں لیکن اگر تم اُسے میرے پاس نہ لائے، تو پھر یاد رکھو، نہ تو تمہارے لیے میرے پاس کچھ خرید و فروخت ہوگی، نہ تم میرے نزدیک جگہ پاؤگے"

۶۰ اُنہوں نے کہا "ہم اس کے باپ کو اس بات کی ترغیب دینگے اور ہم ضرور ایسا کرینگے"

۶۱ اور یوسف نے اپنے خدمتگاروں کو حکم دیا "اُن لوگوں کی پونجی (جس کے بدلے میں اُنہوں نے غلہ مول لیا ہے) انہی کی بوریوں میں رکھ دو۔ جب یہ لوگ اپنے گھر کی طرف لوٹینگے، تو بہت ممکن ہے، اپنی پونجی دیکھ کر پہچان لیں (کہ لوٹا دی گئی) اور پھر عجب نہیں کہ دوبارہ آئیں"

۶۲ پھر جب یہ لوگ اپنے باپ کے پاس لوٹ کر گئے، تو کہا "اے ہمارے باپ! آئندہ کو غلہ کی فروخت ہم پر بند کر دی گئی ہے۔ پس ہمارے بھائی (بن یمین) کو ہمارے ساتھ بھیج دے کہ غلہ خرید لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں"

۶۳ باپ نے (یہ سُن کر کہا) "کیا میں اس کے لیے اُسی طرح تمہارا اعتبار کروں جس طرح پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں کرچکا ہوں؟ سو خدا ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے، اور اس سے

(۱۸) حضرت یوسف کا بادشاہ سے ملنا، تمام مملکت کے انتظام کا ذمہ دار قرار پانا، پھر تعبیر کے مطابق قحط کے سالوں کا نمودار ہونا، بھائیوں کا غلہ کی طلب میں مصر آنا، اور بن یمین کا حضرت یوسف کے پاس پہنچ جانا۔

(ل) جب تحقیقات کا نتیجہ آشکارا ہوگیا تو حضرت یوسف بادشاہ سے ملنے کے لیے تیار ہوگئے کیونکہ اب اُن کی رہائی بادشاہ کی بخشش نہ رہی اُن کا حق ہوگئی۔

(ب) اس معاملہ نے بادشاہ کا اشتیاق اور زیادہ کر دیا۔ اُس نے خیال کیا، جس شخص کی راست بازی، امانت داری، اور وفائے عہد کا یہ حال ہے، اُس سے بڑھ کر مملکت کے کاموں کے لیے کون موزوں ہوسکتا ہے؟ پس کہا۔ فوراً میرے پاس لاؤ۔ میں اُسے اپنے کاموں کے لیے خاص کرلونگا۔ چنانچہ حضرت یوسف آئے، اور پہلی ہی ملاقات میں اس درجہ مسخر ہوا کہ بول اُٹھا۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم میری نگاہ میں بڑا مقام رکھتے ہو۔ مجھے بتلاؤ اس آنے والی مصیبت سے جس کی خبر خواب میں دی گئی ہے، مملکت کیونکر بچائی جاسکتی ہے؟ حضرت یوسف نے کہا۔ اس طرح، کہ ملک کی آمدنی کے تمام وسائل میرے ماتحت کر دیے جائیں۔ میں علم و بصیرت کے ساتھ اس کی حفاظت کرسکتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا، اور جب وہ دربار سے نکلے، تو تمام مملکت مصر کے حکمراں و مختار تھے!

(ج) توراۃ میں ہے کہ فرعون نے یوسف کی باتیں سُن کر درباریوں سے کہا، ہم ایسا آدمی کہاں پاسکتے ہیں جیسا یہ ہے، اور جس میں خدا کی روح بول رہی ہو؟ پھر یوسف سے کہا۔ دیکھ، میں نے ساری زمین مصر پر تجھے حکومت بخشی

اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ○ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَھُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَھُمْ رُدَّتْ اِلَیْھِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِیْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا وَنَمِیْرُ اَھْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ کَیْلَ بَعِیْرٍ ذٰلِكَ کَیْلٌ یَّسِیْرٌ ○ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَکُمْ حَتّٰی تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِکُمْ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَھُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ ○ وَقَالَ یٰبَنِیَّ

٦٤ ٦٥ ٦٦

بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں!"

٦٤ اور جب اِن لوگوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ اُن کی پونجی انہی کو لوٹا دی گئی ہے۔ تب اُنہوں نے (اپنے باپ سے کہا) "اے ہمارے باپ! اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیے؟ دیکھ، یہ ہماری پونجی ہے۔ جو ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ (ہمیں غلہ بھی اُس نے دیدیا اور قیمت بھی واپس کر دی۔ پس ہمیں اجازت دے کہ بن یمین کو ساتھ لے کر پھر جائیں) اور اپنے گھرانے کے لیے رسد لے آئیں ہم اپنے بھائی کی حفاظت کرینگے، اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لے لینگے۔ یہ غلہ (جو اس مرتبہ لائے ہیں) بہت تھوڑا ہے"

٦٥ باپ نے کہا "میں کبھی اُسے تمہارے ساتھ بھیجنے والا نہیں جب تک کہ اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو۔ (تم عہد کرو کہ) بجز اس صورت کے کہ ہم خود گھیر لیے جائیں (اور بے بس ہو جائیں) ہم ضرور اُسے تیرے پاس واپس لے آئینگے" جب اُنہوں نے باپ کو (اُس کے کہنے کے مطابق) اپنا پکا قول دے دیا، تو اُس نے کہا "ہم نے جو قول و قرار کیا اُس پر اللہ نگہبان ہو"

٦٦ اور باپ نے اُنہیں (چلتے وقت) کہا "اے

فقط ایک تخت نشینی ہی میں تجھ سے اوپر رہونگا، اور اُس نے اپنی انگوٹھی اُتار کر یوسف کو پہنا دی، اور گلے میں سونے کا طوق ڈالا، اور کتان کا لباس عطا کیا، اور اپنی رتھ سواری کو دی کہ شاہی رتھوں میں دوسری رتھ تھی۔ پھر جب وہ نکلا تو اُس کے آگے آگے نقیب پکارتے تھے "سب ادب سے رہو" اور فرعون نے حکم دیا یوسف کو صاحب مملکت کے لقب سے پکارا جائے (پیدائش ۴۱: ۴۷)

(د) حضرت یوسف کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نقطے تھے۔ ایک وہ، جب غلام ہو کر بکے، اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اُس کے علاقہ کے مختار ہو گئے۔ دوسرا یہ، کہ قید خانے سے نکلے، اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکمرانی کی مسندِ اجلال پر جلوہ آرا نظر آئے! پس جب پہلے انقلاب تک سرگزشت پہنچی تھی، تو آیت (٢١) میں حکمتِ الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی کہ کذالك مکنا لیوسف فی الارض۔ اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا، تو اسی طرح آیت (٥٦) میں فرمایا: کذالك مکنا لیوسف فی الارض! وہاں چونکہ معاملۂ مصر کی ابتدا ہوئی تھی، اور ابھی حضرت یوسف کو حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی، اس لیے فرمایا تھا: ولنعلمه من تاویل الاحادیث، واللہ غالب علی امرہ۔ یہاں چونکہ تکمیلِ کار کے بعد اُس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا، اس لیے فرمایا: لا نضیع اجر المحسنین۔ یہ اس لیے ہوا کہ ہمارا قانون ہے۔ نیک عملی کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ ضروری ہے کہ پھل لائے!

(ہ) توراۃ میں ہے کہ یوسف جب بادشاہ کے پاس آیا تو اس کی عمر تیس برس کی تھی۔ (پیدائش ۴۱: ۴۶)

(و) اس کے بعد جو حالات پیش آئے، قرآن نے اُن کی تصریح نہیں کی کیونکہ خواب کی تعبیر میں اُن کا بیان آچکا تھا اور چونکہ تعبیر سچی تھی، اس لیے ظاہر تھا کہ ویسے ہی حالات پیش

لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ
شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ ۶۷
حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ
قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ ۶۸ ع

ئے ہونگے، اور یہ ایجاز بلاغت کی انتہا ہے۔

چنانچہ پہلے سات برس ویسے ہی گذرے، اور جو تدبیر تجویز کی تھی، اسی کے مطابق انہوں نے غلہ کے ذخیرے جمع کر لیے۔ پھر جب قحط کے سال شروع ہوئے، تو وہی ذخیرے کام میں لائے گئے، اور حکومت کی جانب سے غلہ تقسیم ہونے لگا۔

توراۃ میں ہے کہ تمام روئے زمین پر کال تھا (پیدائش ۴۱ : ۵۶) تمام روئے زمین کا مطلب یہ ہوگا کہ مصر کے اطراف و جوانب میں بھی کال تھا، اور وہاں کے باشندے بھی مصر آکر حضرت یوسف کی بخشش سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ کیونکہ یقیناً اس بات کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا ہوگا کہ مصر میں غلہ کے وافر ذخیرے موجود ہیں۔

(ذ) اسی زمانے کی بات ہے کہ کنعان سے یوسف کے بھائی بھی غلہ مول لینے مصر آئے، اور اس طرح اس سرگزشت کا آخری باب اپنی عجیب و غریب موعظتوں اور عبرتوں کے ساتھ ظہور میں آنا شروع ہوگیا۔ آیت (۵۸) سے اسی کا بیان شروع ہوتا ہے۔

(ح) حضرت یوسف انہیں دیکھتے ہی پہچان گئے، لیکن وہ کیونکر پہچان سکتے تھے؟ اول تو یوسف جب گھر سے جدا ہوئے، سترہ برس کے لڑکے تھے، اور اب چالیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ پھر اس بات کا کسے گمان ہو سکتا تھا کہ چند سکوں کا بکا ہوا غلام مصر کا حکمران ہوگا؟

حضرت یوسف نے جب انہیں دیکھا تو باپ کی اور اپنی ماں جائے بھائی بن یمین کی صورتیں سامنے آگئیں۔ ان سے کھود کھود کر گھر کے حالات پوچھے، اور چلتے وقت کہا۔ تمہارے یہاں قحط چھایا ہوا ہے۔ تم غلہ لینے پھر آؤ گے، لیکن یاد رکھو۔ اگلے میں غلہ جبھی دونگا کہ اپنے بھائی بن یمین کو بھی ساتھ لاؤ۔

(ط) توراۃ میں ہے کہ یہ صورت اس طرح پیش آئی

میرے بیٹو! دیکھو (جب مصر پہنچو تو شہر کے) ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔ جُدا جُدا دروازوں سے داخل ہونا۔ میں تمہیں کسی ایسی بات سے نہیں بچا سکتا جو اللہ کے حکم سے ہونے والی ہو (لیکن اپنی طرف سے حتی المقدور احتیاط کی ساری تدبیریں کرنی چاہئیں) فرماں روائی کسی کے لیے نہیں ہے مگر اللہ کے لیے۔ (دنیا کے سارے حکمرانوں کی طاقت اُس کے آگے ہیچ ہے) میں نے اُسی پر بھروسہ کیا، اور وہی ہے جس پر تمام بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے!"

(پھر) جب یہ لوگ (مصر میں) داخل ہوئے اسی طرح جس طرح باپ نے حکم دیا تھا، تو (دیکھو) یہ بات اللہ (کی مشیت) کے مقابلہ میں کچھ بھی کام آنے والی نہ تھی، مگر ہاں، یعقوب کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا تھا جسے اُس نے پورا کر دیا۔ بلاشبہ وہ صاحبِ علم تھا کہ ہم نے اُس پر علم کی راہ کھول دی تھی۔ لیکن اکثر آدمی (اس بات کی حقیقت) نہیں جانتے!

اور جب ایسا ہوا کہ یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے، تو اُس نے اپنے بھائی (بن یمین) کو اپنے پاس بٹھا لیا، اور اُسے (پوشیدگی میں) اشارہ کر دیا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں۔ پس

اٰوٰۤی اِلَیْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ ٦٩
بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ
لَسٰرِقُوْنَ ○ قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَیْهِمْ مَّا ذَا تَفْقِدُوْنَ ○ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ ٧٠-٧١
جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِیْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ ○ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ ○ ٧٢-٧٣

جو (بدسلوکی یہ لوگ تیرے ساتھ) کرتے آئے ہیں، اُس پر غمگین نہ ہو اور خوش ہو جا کہ اب زمانہ پلٹ گیا)

پھر جب یوسف نے ان لوگوں کا سامان ان کی روانگی کے لیے مہیا کیا، تو اپنے بھائی (ابن یمین) کی بوری میں اپنا کٹورا رکھ دیا (تاکہ بطور نشانی کے اُس کے پاس رہے) پھر ایسا ہوا کہ (جب یہ لوگ روانہ ہو گئے اور شاہی کارندوں نے پیالہ ڈھونڈھا اور نہ پایا، تو اُن پر شبہ ہوا، اور) ایک پکارنے والے نے (اُن کے پیچھے) پکارا "اے قافلہ والو! (ٹھہرو) ہو نہ ہو تم ہی چور ہو"۔

وہ پکارنے والے کی طرف پھرے اور پوچھا "تمہاری کونسی چیز کھو گئی ہے؟" ٧١

(شاہی کارندوں نے) کہا "ہمیں شاہی پیمانہ نہیں ملتا۔ جو شخص اُسے لا دے، اس کے لیے ایک بارِ شتر (غلّہ) انعام ہے، اور (کارندوں کے سردار نے کہا) میں اس بات کا ضامن ہوں" ٧٢

اُنہوں نے کہا "اللہ جانتا ہے، ہم اس لیے یہاں نہیں آئے کہ ملک میں شرارت کریں، اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو (کہ پہلے بھی ایک مرتبہ آ چکے ہیں) اور ہمارا کبھی یہ شیوہ نہیں رہا کہ چوری کریں" ٧٣

کہ یوسف نے اُنہیں جاسوس کہا تھا جب اُنہوں نے اپنی بریت میں اپنے گھرانے کے حالات سُنائے، تو اُن کی بات پکڑ لی، اور کہا۔ تم کیسے ہو۔ تمہارا ایک بھائی اور بھی ہے؟ اچھا، اُسے بھی اپنے ساتھ لاؤ تاکہ تمہارے بیان کی تصدیق ہو جائے اور اس وقت تک کے لیے ایک آدمی یہاں چھوڑ جاؤ۔
(پیدائش ۴۲ : ۱۰)

معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر جاسوسی کا شبہ ضرور کیا گیا تھا اگرچہ خود حضرت یوسف کی طرف سے نہ ہوا ہو اسی لیے حضرت یعقوب جب مجبور ہوئے کہ بن یمین کو اُن کے ساتھ بھیج دیں، تو نصیحت کی کہ ایک دروازہ سے شہر میں داخل نہ ہونا کہ کنعانیوں کا ایک پورا جتھا دیکھ کر مصریوں کو شبہ ہوگا۔ الگ الگ دروازوں سے ایک ایک دو دو کر کے داخل ہونا۔ نیز فرمایا: ان الحکم الا للہ۔ اصلی فرماں روائی تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ نہ چاہے تو مصر کا حکمراں کیا کر سکتا ہے! پس جو کچھ بھروسہ ہے، اسی پر ہے۔ البتہ اپنی طرف سے تدبیر و احتیاط ضرور کرنی چاہیے۔

لیکن جو کچھ پیش آنے والا تھا، وہ دوسرا ہی معاملہ تھا۔ جاسوسی کی بنا پر نہیں بلکہ ایک دوسری مصلحت کی بنا پر بن یمین کو روک لیا گیا، اور جس بات کی احتیاط کی تھی وہی پیش آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آیت (٦٨) میں فرمایا۔ یہ احتیاط کچھ کام نہ دے سکی۔ ہاں حضرت یعقوب نے ایک خطرہ محسوس کیا تھا سو اپنی جگہ اس کی پیش بندی کر لی۔ پھر اُن کے علم و دانشمندی کا بھی اظہار کر دیا۔ تاکہ واضح ہو جائے، اُنہوں نے جو احتیاط کی تھی، وہ گو کام نہ دے سکی۔ لیکن یہ قصور علم کی وجہ سے نہیں ہوا۔ علم کا مقتضا تو یہی تھا کہ تدبیر و احتیاط میں کمی نہ کرتے، اور پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتے جیسا کہ فی الحقیقت اُنہوں نے کیا۔

(ی) بہرحال بن یمین کو لے کر جب دوبارہ گئے تو حضرت

۷۴ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ○ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ

۷۵ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ○ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ

اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ

۷۶ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ○ قَالُوْٓا

۷۴ (کارندوں نے) کہا "اچھا، اگر تم جھوٹے نکلے تو بتلاؤ، چور کی سزا کیا ہونی چاہیے؟"
انہوں نے کہا "چور کی سزا یہ، کہ جس کی بوری میں چوری کا مال نکلے، وہ آپ اپنی سزا

یوسف نے اس پر اپنی حقیقت ظاہر کر دی، اور چونکہ جانتے تھے، سوتیلے بھائی ضرور اس کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہونگے، اس لیے کہا، اب دن پھرنے والے ہیں، اس لیے آزردہ خاطر نہ ہو۔

۷۵ (یعنے اپنے جرم کی پاداش میں پکڑا جائے) ہم زیادتی کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں"

پس (کارندوں کے سردار نے) اُن کی بوریوں کی تلاشی شروع کی۔ قبل اس کے کہ یوسف کے بھائی (بن یمین) کی بوری کی تلاشی لیتے اور کچھ نہ پایا) پھر یوسف کے بھائی کی بوری (دیکھی، اور اس میں) سے پیالہ نکال لیا۔ (تو دیکھو) اس طرح ہم نے یوسف کے لیے (بن یمین کو پاس رکھنے کی) تدبیر کر دی۔ وہ پادشاہ (مصر) کے قانون کی رو سے ایسا نہیں کرسکتا تھا کہ اپنے بھائی کو روک لے (اگرچہ ایسا کرنے کے لیے اُس کا دل بیقرار تھا) مگر ہاں، اسی صورت میں کہ اللہ کو (اس کی راہ نکال دینا منظور ہوتا۔ سو اُس نے غیبی سامان کرکے راہ نکال دی) ہم جسے چاہتے ہیں، مرتبوں میں بلند کر دیتے ہیں، اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والی ہستی ہے (جس کا علم سب کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یعنے اللہ کی ہستی)

۷۶ (جب بن یمین کی بوری سے کٹورا نکل آیا، تو بھائیوں

(۱۹) حضرت یوسف کا چاہنا کہ بن یمین کو اپنے پاس رکھ لیں، لیکن اس کی کوئی راہ نہ پانا اور رخصت کر دینا، لیکن حکمت الٰہی سے ایک عجیب و غریب حادثہ کا پیش آجانا، اور بن یمین کا اُن کے پاس رہ جانا۔

(ل) بن یمین حضرت یوسف کا حقیقی بھائی تھا۔ اتنی مدت کے بعد دیکھا۔ تو کسی طرح دل نہیں مانتا تھا کہ اُسے جدا ہونے دیں، لیکن مشکل یہ آپڑی کہ روک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس بارے میں مصر کا قانون بہت سخت تھا۔ بلا وجہ کسی آدمی کو، خصوصاً اجنبی کو روک لینا جائز نہ تھا۔ اور ابھی اس کا وقت بھی نہیں آیا تھا کہ اپنی شخصیت بھائیوں پر ظاہر کریں۔ مجبور ہو کر رخصت کر دیا، اور اس غرض سے کہ اپنی ایک نشانی اُسے دیدیں، اُس کے سامان میں اپنا چاندی کا کٹورا رکھ دیا۔ چونکہ بھائیوں پر اس بات کا اظہار خلاف مصلحت تھا، اس لیے یہ بات پوری پوشیدگی کے ساتھ عمل میں آئی۔
لیکن جب یہ لوگ روانہ ہوگئے، تو حضرت یوسف کے محل کے کارندوں نے پیالہ ڈھونڈھا، اور جب نہ ملا تو اُن لوگوں کے تعاقب میں نکلے۔ اُنہیں پیالہ کا حال معلوم نہ تھا اور چونکہ ان لوگوں کے سوا کوئی اور آدمی محل میں ٹھہرا نہیں تھا، اس لیے سمجھے، ہو نہ ہو۔ انہی اجنبیوں کی کارستانی ہے۔ پھر جب کارندوں کے سردار نے تلاشی

إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ
قَالَ أَنتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ○ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا ۷۷
كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ○ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَن نَّأْخُذَ إِلَّا ۷۸
مَن وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِندَهُ إِنَّا إِذًا لَّظَالِمُونَ ○ فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۖ قَالَ ۷۹ ع ۱۱

(۱) جس کی موجودگی کا پتہ آیت (۲) کے اس جملے سے ملتا ہے کہ "انا بہ زعیم" تو بن یمین کی خرجی سے پیالہ نکل آیا۔ اب کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے چور ہونے میں انھیں شبہ ہوتا۔ وہ ان سب کو لے کر حضرت یوسف کے پاس پہنچے۔

جب حضرت یوسف نے یہ معاملہ سنا، تو سمجھ گئے اس حادثہ میں خدا کا ہاتھ کام کر رہا ہے، اور اس نے بن یمین کو روک لینے کا خود بخود سامان پیدا کر دیا ہے۔ وہ خاموش ہو رہے، اور کہا، تو صرف یہی کہا کہ ہم اور کسی کو روک نہیں سکتے اسی کو روکیں گے جس کے پاس ہماری چیز نکلی۔ یہ دراصل یہی بات تھی جو خود ان لوگوں کی زبان سے نکل چکی تھی۔ ان سے جب کارندوں نے پوچھا تھا۔ اگر مال نکل آیا تو چور کی کیا سزا؟ تو انہوں نے کہا تھا جس کے پاس سے نکلے، وہ خود اپنی سزا ہو۔ یعنے بطور قیدی کے یا غلام کے اسے صاحب مال رکھ لے۔

یہی وجہ ہے کہ آیت (۷۶) میں اس معاملہ کے ذکر کے بعد ہی فرمایا۔ کذلک کدنا لیوسف۔ یوسف ملک کے قانون کے مطابق بن یمین کو نہیں روک سکتا تھا، اور اس نے روکنا چاہا بھی نہیں، اگرچہ دل اس کے لیے بیقرار تھا، لیکن حکمت الٰہی نے ایک مخفی اور دقیق تدبیر پیدا کر دی۔ جو انسان کے کیے نہیں ہو سکتی تھی۔ اور کید کے معنی مخفی اور دقیق تدبیر ہی کے ہیں۔

(۲) جھوٹوں کا قاعدہ ہے، کوئی موقعہ کوئی بات ہو، جھوٹ بولنے سے نہیں رکتے۔ اگر مدح کا موقعہ ہو، تو جھوٹی مدح کر دیں گے۔ مذمت کا موقع ہو، تو کوئی جھوٹا الزام لگا دیں گے۔ جب بن یمین کی خرجی میں سے پیالہ نکل آیا، تو بھائیوں کا سوتیلے پن کا حسد جوش میں آ گیا۔ جھٹ بول اٹھے اگر اس نے چوری کی تو کوئی عجیب بات نہیں۔ اس کا بھائی یوسف بھی چور تھا۔ پس یہ بغض و حسد کی ایک بات تھی اس کا

نے کہا "اگر اس نے چوری کی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اس سے پہلے اس کا (حقیقی) بھائی بھی چوری کر چکا ہے" تب یوسف نے (جس کے سامنے اب معاملہ پیش ہوا تھا) یہ بات اپنے دل میں رکھ لی ان پر ظاہر نہ کی (کہ میرے منہ پر مجھے چور بنا رہے ہو) اور (صرف اتنا) کہا کہ "سب سے بری جگہ تمہاری ہوئی (کہ اپنے بھائی پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو) اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اللہ اسے بہتر جاننے والا ہے" ۷۷

انھوں نے کہا "اے عزیز! اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے (اور اس سے بہت محبت رکھتا ہے) پس اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے (مگر اسے نہ روکیے) ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں" ۷۸

یوسف نے کہا "اس بات سے اللہ کی پناہ کہ ہم اس آدمی کو چھوڑ کر جس کے پاس ہمارا سامان نکلا، کسی دوسرے کو پکڑ لیں۔ اگر ایسا کریں تو ہم ظالم ٹھہریں"

پھر جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے (کہ یہ ماننے والا نہیں) تو مشورہ کے لیے (ایک جگہ) اکیلے میں بیٹھ گئے۔ جو ان میں بڑا تھا، اس نے کہا تم جانتے ہو کہ باپ نے (بن یمین کے بارے

كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُم مَّوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ وَمِن قَبْلُ مَا فَرَّطتُمْ فِي
يُوسُفَ ۖ فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّىٰ يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝ ٨٠
ارْجِعُوا إِلَىٰ أَبِيكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا
لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ ۝ وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ ٨١-٨٢
قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ۚ
إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ ٨٣

مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ واقعی کوئی ایسی بات ہوئی بھی تھی۔ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ اُن کی یہ بات اس لیے نقل کی، کہ واضح ہو جائے، بغض و حسد انسان کو کیسی کیسی غلط بیانیوں کا عادی بنا دیتا ہے۔

میں) اللہ کو شاہد ٹھہرا کر تم سے عہد لیا ہے، اور اس سے پہلے یوسف کے معاملہ میں بڑی تقصیر ہو چکی ہے پس میں تو اب اس ملک سے ٹلنے والا نہیں، جب تک خود باپ مجھے حکم نہ دے، یا پھر اللہ میرے لیے کوئی دوسرا فیصلہ کر دے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"

٨٠ "تم لوگ باپ کی طرف لوٹ جاؤ، اور اُس سے جا کر کہو "اے ہمارے باپ! (ہم کیا کریں) تیرے بیٹے نے (پرائے ملک میں) چوری کی۔ جو بات ہمارے جاننے میں آئی، وہی ہم نے ٹھیک ٹھیک کہہ دی، اور ہم غیب کی باتوں کی خبر رکھنے والے نہ تھے" (کہ پہلے سے جان لیتے۔ بن یمین سے ایسی بات سرزد ہونے والی ہے)

٨١ "اور (یہ بھی کہہ دینا کہ) آپ اُس بستی سے دریافت کر لیں جہاں ہم ٹھہرے تھے، اور اُس قافلہ کے آدمیوں سے پوچھ لیں جس میں ہم آئے ہیں۔ ہم (اپنے بیان میں) بالکل سچے ہیں"

٨٢ (چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا، اور کنعان آکر یہ ساری باتیں باپ سے کہہ دیں) اُس نے (سُن کر) کہا "نہیں، یہ تو ایک بات ہے جو تمہارے جی نے تمہیں سمجھا دی ہے (یعنے بن یمین کا چوری کرنا) خیر! میرے لیے صبر کے سوا چارہ نہیں۔ ایسا صبر کہ خوبی کا صبر ہو۔ اللہ (کے فضل) سے کچھ بعید نہیں کہ وہ (ایک دن) ان سب کو میرے پاس جمع کر دے۔ وہی ہے جو (سب کچھ) جاننے والا (اور اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!"

٨٣ اور اُس نے ان لوگوں کی طرف سے رُخ پھیر لیا، اور (چونکہ اس نئے زخم کی خلش نے پچھلا زخم تازہ کر دیا تھا، اس لیے) پکار اُٹھا "آہ یوسف کا دردِ فراق!" اور شدتِ غم سے (روتے روتے) اُس کی

۸۴ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ○ قَالُوا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتّٰى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ
۸۵-۸۶ مِنَ الْهٰلِكِينَ ○ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللّٰهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○
يٰبَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَايْـَٔسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ إِنَّهُ لَا يَايْـَٔسُ
۸۷ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُونَ ○ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يٰٓأَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَ
أَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي

---

۸۴ آنکھیں سفید پڑ گئیں، اور اُس کا سینہ غم سے لبریز تھا!

(باپ کا یہ حال دیکھ کر بیٹے) کہنے لگے "بخدا تم تو ہمیشہ ایسے ہی رہو گے کہ یوسف کی یاد میں لگے رہو۔ یہاں تک کہ (اسی غم میں) گھُل جاؤ، یا اپنے کو ہلاک کر دو"

۸۵ باپ نے کہا "میں تو اپنی حاجت اور اپنا غم اللہ کی جناب میں عرض کرتا ہوں (کچھ تمہارا شکوہ نہیں کرتا) میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں"

۸۶ (پھر اُنہوں نے کہا) "اے میرے بیٹو! (ایک بار پھر مصر) جاؤ، اور یوسف اور اُس کے بھائی کا سُراغ لگاؤ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اُس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو منکر ہیں"

۸۷ پھر جب (باپ کے حکم کی تعمیل میں یہ لوگ مصر پہنچے، اور) یوسف کے پاس گئے، تو (اپنے پھر آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے) کہا "اے عزیز، ہم پر اور ہمارے گھر کے آدمیوں پر بڑی سختی کے دن گزر رہے ہیں۔ پس (مجبور ہو کر غلہ کی طلب میں ہمیں پھر نکلنا پڑا) ہم تھوڑی سی پونجی لے کر آئے ہیں اسے قبول کر لیجیے۔ اور غلہ کی پوری تول عنایت کیجیے، اور (اسے خرید و فروخت کا معاملہ نہ سمجھیے بلکہ ہمیں محتاج سمجھ کر) خیرات دیجیے۔ اللہ خیرات کرنے والوں

(۲۰) حضرت یعقوب کا بن یمین کی گم گشتگی میں بازیافتگی کی ایک نئی اُمید محسوس کرنا، اور بیٹوں کو جستجوئے مقصود میں روانہ کرنا، بالآخر پردۂ راز کا ہٹنا، اور کرشمۂ حقیقت کا سامنے آجانا!

(ا) اب یہ سرگزشتِ عبرت اپنی آخری منزل کو قریب ہو رہی ہے۔ جب یوسف کے بھائی بن یمین کے معاملہ میں مایوس ہو گئے، تو آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ تورات میں ہے کہ جب حضرت یعقوب راضی نہیں ہوتے تھے کہ بن یمین کو جدا کریں، تو روبن نے خصوصیت کے ساتھ اس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا (پیدائش ۴۲: ۳۸) اور روبن ہی ان سب میں بڑا تھا۔ پس اُس نے کہا۔ یوسف کے معاملہ میں ہم سے جو بدعہدی ہو چکی ہے، اُس کا داغ اب تک باپ کے دل سے مٹا نہیں۔ اب بن یمین کے لیے ہم نے قول و قرار کیا تھا، اُس کا نتیجہ یہ نکلا۔ میری ہمت تو پڑتی نہیں کہ باپ کو جا کر منہ دکھاؤں تم جاؤ، اور جو کچھ گزرا ہے، بے کم و کاست سُنا دو۔ چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا، اور گھر آ کر تمام سرگزشت باپ کو سُنا دی۔

(ب) غور کرو قرآن واقعہ کی جزئیات نقل کرتے ہوئے کس طرح دقیق سے دقیق پہلو فطرتِ انسانی کے ملحوظ رکھتا ہے؟

الْمُتَصَدِّقِينَ ○ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ○ ۸۹
قَالُوا أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَنْ
يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ○ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ آثَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا ۹۰
وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ ○ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ ۹۱

بن یمین ان سب کا بھائی تھا۔ ماں ایک نہ سہی، مگر باپ تو ایک ہی تھا، لیکن انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہمارے بھائی نے چوری کی۔ بلکہ کہا "تیرے لڑکے نے چوری کی" اس ایک بات میں کتنی باتیں چھپی ہوئی ہیں! اس میں طعن ہے، تحقیر ہے، ملامت ہے، اپنی بڑائی ہے، مغرورانہ برتیت ہے، اور پھر حد درجہ کی سنگ دلی، کہ ایسے موقعہ پر بھی جب کہ بوڑھے باپ کے دل پر ایک نیا زخم لگنے والا تھا، طعن تشنیع سے باز نہ رہ سکے، اور کہا، یہ ہے تیرا چہیتا بیٹا جس نے چوری کا ارتکاب کیا اور ہم سب کو مصیبت میں ڈالا۔

(ج) معلوم ہوتا ہے حضرت یعقوب نے ابن یمین کی گم گشتگی میں یوسف کی بازگشت کی جھلک دیکھ لی تھی، اور یہ ان کی فراستِ نبوت کا کرشمہ تھا۔ اسی لیے فرمایا عسی اللہ ان یاتینی بھم جمیعا۔ اور یہ قرب وصال کے تصور کا نتیجہ تھا کہ دردِ فراق کی شدتیں بڑھ گئیں اور بے اختیار یا اسفی علی یوسف کی صدا نکل گئی۔ اور اسی لیے آخر میں اشارہ کیا کہ انی اعلم من اللہ ما لا تعلمون!

(د) اس کے بعد حضرت یعقوب کا کہنا کہ مایوس ہو کر نہ بیٹھ رہو، جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ، واضح کر دیتا ہے کہ وحی الٰہی کا اشارہ ہو چکا تھا، اور وہ سمجھ چکے تھے کہ شمیم یوسف اسی رُخ سے آنے والی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ یوسف کا نام اُن کی زبان سے نکلتا کیونکہ جو معاملہ پیش آیا تھا، بن یمین کا تھا۔ یوسف کا نہ تھا۔ چنانچہ آگے چل کر آیت (۹۶) سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جب حضرت یوسف کا کرتا اور پیام پہنچا تو انہوں نے کہا: الم اقل لکم انی اعلم من اللہ ما لا تعلمون؟

(ہ) ایک طرف تو یہ حالات پیش آ رہے تھے۔ دوسری طرف قحط کی شدتیں بھی روز بروز بڑھتی جاتی تھیں پس بھائیوں نے مصر آ کر جو کچھ حضرت یوسف سے کہا، وہ اپنے دوبارہ آنے

کو اُن کا اجر دیتا ہے!"

(یہ حال سن کر یوسف (کا دل بھر آیا۔ اس) نے کہا "تمہیں یاد ہے، تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جبکہ تمہیں سمجھ بوجھ نہ تھی؟"

(یہ سن کر بھائی چونک اٹھے، اور اب جو عزیز کی صورت اور آواز پر غور کیا، تو ایک نیا خیال اُن کے اندر پیدا ہو گیا) انہوں نے کہا "کیا فی الحقیقت تم ہی یوسف ہو؟"

یوسف نے کہا "ہاں میں یوسف ہوں، اور یہ (بن یمین) میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی (برائیوں سے) بچتا اور (مصیبتوں میں) ثابت قدم رہتا ہے، تو اللہ (کا قانون یہ ہے کہ وہ) نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا!"

(یہ سن کر بھائیوں کے سر شرم و ندامت سے جھک گئے) انہوں نے کہا "بخدا، اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ نے تجھے ہم پر برتری دی، اور بلاشبہ ہم سرتاسر قصور وار تھے"

یوسف نے کہا "آج کے دن (میری جانب سے) تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ (جو ہونا تھا، وہ ہو چکا) اللہ تمہارا قصور بخشدے۔ اور وہ تمام رحم کرنے والوں

أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝ اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلٰى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا ۚ وَأْتُونِي ۹۲
بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ۝ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ ۖ لَوْلَا أَنْ ۹۳ ع
تُفَنِّدُونِ ۝ قَالُوا تَاللّٰهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ۝ فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلٰى ۹۵-۹۴
وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۚ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ ۹۶

کا بہانہ نہ تھا، بلکہ واقعی مصیبت کی سچی داستان تھی جب حضرت یوسف نے یہ حالات سُنے، اور دیکھا کہ اُن کے بھائی اُن کے سامنے کھڑے خیرات کی بھیک مانگ رہے ہیں، تو جوش رحم و محبت سے بے اختیار ہوگئے، اور اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ جب اُنہوں نے کہا تمہیں یاد ہے۔ تم نے یوسف کے ساتھ کیا کیا تھا؟ تو بھائی چونک اُٹھے کہ عزیز مصر یوسف کا ذکر اس طرح کیوں کر رہا ہے؟ اور اب جو اُس کی صورت اور آواز پر غور کیا تو صاف نظر آگیا کہ یہ تو بالکل یوسف کی سی ہے۔ پس حیران ہو کر بول اُٹھے: ء انك لانت یوسف!

قرآن نے اس موقعہ کا سارا مکالمہ صرف دو جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ ایک حضرت یوسف کا ہے۔ دوسرا بھائیوں کا، لیکن غور کرو۔ موقعہ کی طبیعت حال کا کونسا پہلو ہے جو اِن دو جملوں کے اسلوب بیان اور لب ولہجہ میں نہیں آگیا! بھائیوں نے یہ نہیں کہا کہ "کیا تم یوسف ہو؟" بلکہ کہا "ءَ اِنّك" اور "لانت یوسف" یعنے کیا فی الحقیقت تم ہی یوسف ہو؟ اس اسلوب استفہام نے وہ ساری حالتیں واضح کر دیں جو اُن کے ذہن و فکر پر اُس وقت طاری ہوگئی تھیں، اور اس طرح کے موقعہ میں قدرتی طور پر طاری ہوا کرتی ہیں۔

(د) جب بھائیوں نے یوسف کی ہلاکت کی خبر باپ کو سُنائی تھی، تو خون آلود کرتا جا کر دکھایا تھا۔ اب وقت آیا کہ زندگی و اقبال کی خوش خبری سُنائی جائے، تو اس کے لیے بھی کرتے ہی نے نشانی کا کام دیا۔ وہی چیز جو کبھی فراق کا پیام لائی تھی، اب وصال کی بشارت بن گئی۔

سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے!" ۹۲

"اب تم یوں کرو کہ میرا یہ کرتا (بطور علامت کے) اپنے ساتھ لے جاؤ، اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو کہ اُس کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔ اور (پھر) اپنے گھرانے کے تمام آدمیوں کو لیکر میرے پاس آجاؤ" ۹۳

اور پھر جب (یہ لوگ یوسف کے حکم کے مطابق کرتا لے کر روانہ ہوئے اور) قافلہ نے مصر کی سرزمین چھوڑی، تو (اُدھر کنعان میں) اُن کا باپ کہنے لگا۔ "اگر تم لوگ یہ کہنے لگو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی، تو میں کہونگا، مجھے یوسف کی مہک آرہی ہے" (اور مجھے اس کا یقین ہے) ۹۴ سننے والوں نے کہا "بخدا تم تو اب تک اپنے (اُسی) پرانے خبط میں پڑے ہو" (یعنے یوسف کا تو نام و نشان بھی نہ رہا، اور تمہیں اُس کی واپسی کے خواب آرہے ہیں!) ۹۵

لیکن پھر جب (قافلہ کنعان پہنچ گیا، اور) خوش خبری سُنانے والا (دوڑتا ہوا) آیا، تو اُس نے آتے ہی، یوسف کا کُرتا یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا اور اُس کی آنکھیں پھر سے روشن ہوگئیں تب اُس نے کہا "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں؟" ۹۶

وہ (شرم و ندامت میں ڈوب کر) بولے "اے ہمارے باپ! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے

لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ۝ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ۹۷، ۹۸
فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۝ ۹۹
وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَي الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ
قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ

(اللہ کے حضور) دعا کر، فی الحقیقت، ہم سے سراسر قصور ہی ہوتے رہے!" ۹۷

(۲۱) حضرت یعقوب کے خاندان کا مصر پہنچنا، خواب کی تعبیر کا ظہور میں آنا، اور سرگزشت کا خاتمہ۔

(ل) اُدھر کاروانِ بشارت نے کوچ کیا، اور ادھر کنعان میں حضرت یعقوب نے کہنا شروع کر دیا: انی لاجد ریح یوسف: مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے!

ولقد تہب لی الصبا من ارضہا
فیلذ مس ہبوبہا و یطیب!

اس سے معلوم ہوا کہ وحی الٰہی نے اُنہیں مطلع کر دیا تھا، کہ اب ایامِ فراق قریب الاختتام ہیں، اور مژدۂ وصال جلد پہنچنے والا ہے۔

(ب) جب بھائیوں نے حضرت یوسف کے آگے عجز و اعتراف کا سر جھکایا، تو اُنہوں نے بلا تامل کہہ دیا: لاتثریب علیکم الیوم۔ یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین۔ لیکن جب حضرت یعقوب سے دعائے مغفرت کے طلبگار ہوئے تو کہا: سوف استغفر لکم ربی۔ میں عنقریب تمہارے لیے دعائے مغفرت کرونگا۔ یعنے طلب مغفرت کی دعا کو کسی آئندہ وقت پر ملتوی کر دیا۔ یہ اختلافِ حال غالباً اس بات کا نتیجہ ہے کہ بھائیوں نے جو کچھ ظلم کیا تھا، وہ حضرت یوسف کی ذات خاص پر کیا تھا۔ اس لیے اُنہیں عفو و درگزر میں تامل نہیں ہوا۔ کیونکہ معاملہ خود اُن کا معاملہ تھا۔ لیکن حضرت یعقوب کو تامل ہوا۔ کیونکہ معاملہ صرف انہی کا نہیں، بلکہ حضرت یوسف کا بھی تھا۔ پس فرمایا میں عنقریب ایسا کرونگا۔ یعنے عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ سب یکجا ہونگے، اور عفو و بخشش کا آخری فیصلہ ہو جائیگا۔ پھر میری دعائیں ہونگی اور تم ہوگے۔

(ج) تورات میں ہے کہ جب یوسف نے اپنے بھائیوں پر اپنے آپ کو ظاہر کر دیا، تو وہ گھبرا گئے، لیکن یوسف نے

باپ نے کہا "وہ وقت دور نہیں کہ میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے دعائے مغفرت کروں۔ وہ بڑا بخشنے والا، بڑی ہی رحمت والا ہے!" ۹۸

پھر جب (ایسا ہوا کہ یوسف کی خواہش کے مطابق) یہ لوگ (کنعان سے روانہ ہوگئے، اور شہر کے باہر) یوسف سے ملے، تو اُس نے اپنے باپ اور ماں کو (عزت و احترام سے) اپنے پاس جگہ دی اور کہا۔ اب شہر میں چلو۔ خدا نے چاہا تو تمہارے لیے ہر طرح کی سلامتی ہے!" ۹۹

اور (جب شہر میں داخل ہوئے تو) اُس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا، (باقی سب کے لیے نیچے نشستیں رکھیں) اور (دیکھو) اُس وقت ایسا ہوا کہ سب اُس کے آگے سجدے میں گر پڑے (اور مصر کے دستور کے مطابق اُس کے منصبِ حکومت کی تعظیم بجا لائے) اُس وقت (اُسے اپنے بچپنے کا خواب یاد آگیا، اور بے اختیار) پکار اُٹھا "اے باپ! یہ ہے تعبیر اُس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا میرے پروردگار نے اُسے سچا ثابت کر دیا۔ یہ اُسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی، تم سب کو صحرا سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا، اور

الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ

انہیں تسلی دی اور کہا اپنے دلوں میں پریشان نہ ہو یہ خدا کی مصلحت تھی کہ اُس نے مجھے تم لوگوں سے پہلے اس سرزمین میں بھیج دیا دو برس سے زمین پر کال ہے، اور ابھی پانچ برس اور کال رہیگا۔ پس خدا نے مجھے اس لیے مصر کا حاکم بنا دیا کہ تمہاری اولاد باقی رہے، اور تمہیں غموں سے نجات ملے۔ تم اب فوراً میرے باپ کے پاس جاؤ اور اُسے مع اپنے پورے گھرانے کے میرے پاس لے آؤ۔ میں اُسے جشن کی زمین میں رکھونگا۔ (پیدائش ۴۵: ۴)

توراۃ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب فرعون کو معلوم ہوا یوسف کے بھائی آئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا اور اُس نے یوسف کو کہا اپنے بھائیوں سے کہہ۔ اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو میرے پاس لے آئیں۔ میں اُنہیں مصر کی ساری اچھی چیزیں دونگا۔ نیز حکم دیا کہ اُن کے لانے کے لیے مصر کے رتھ اپنے ساتھ لے جائیں، اور جو اسباب وہاں چھوٹ جائے، اُس کا افسوس نہ کریں۔ مصر کی ساری خوشیاں اُن کے لیے ہونگی (۴۵: ۱۶)

(د) چنانچہ کنعان سے حضرت یعقوب کا گھرانا روانہ ہو گیا۔ توراۃ میں ہے کہ وہ سب ۶۶ تھے، اور اگر یوسف اور اُس کے لڑکوں کو جو مصر میں پیدا ہوئے تھے، ملا لیا جائے تو خاندان کی پوری تعداد ستر ہو جاتی ہے (پیدائش ۴۶: ۲۷)

(ہ) جب قافلہ مصر کے قریب پہنچا، تو حضرت یوسف نے اُن کا استقبال کیا۔ اُس زمانہ میں مصر کا دارالحکومت رعمسیس تھا، اور اسے جشن کا شہر کہتے تھے۔ کیونکہ سالانہ جشن وہیں ہوا کرتا تھا۔ پس یہ لوگ دارالحکومت میں آئے جہاں حضرت یوسف نے دربار منعقد کیا، اور اپنے والدین کے لیے بلند مسند بچھائی۔ اب وہ وقت آگیا تھا جس کا مرقع سالہا سال پہلے حضرت یوسف نے خواب میں دیکھا تھا۔ جونہی حضرت

یہ سب کچھ اس واقعہ کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا! بلاشبہ میرا پروردگار اُن باتوں کے لیے جو کرنی چاہے، بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ بلاشبہ وہی ہے کہ (سب کچھ) جاننے والا (اور اپنے سارے کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!" ۱۰۰

(پھر یوسف نے دعا کی) "پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی، اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔ اے آسمان و زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تو (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرماں برداری کی حالت میں جاؤں۔ اور اُن لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں!" ۱۰۱

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی تجھ پر وحی کر رہے ہیں۔ ورنہ (ظاہر ہے کہ) جس وقت یوسف کے بھائی سازش میں مصمم ہو گئے تھے اور پوشیدہ تدبیریں کر رہے تھے، تو تم اُس وقت کچھ اُن کے پاس کھڑے نہ تھے (کہ سب کچھ دیکھ سُن لیا ہو) ۱۰۲

اور (اس پر بھی یاد رکھو) اکثر آدمیوں کا حال یہ

وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ ○ وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۞ وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ○ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ○ أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○ قُلْ هٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّٰهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا

۱۰۳ ، ۱۰۴ ، ۱۰۵ ، ۱۰۶ ، ۱۰۷

یوسف دربار میں نمودار ہوئے تمام درباریوں نے مصر کے دستور کے مطابق تعظیم دی، اور تعظیم یہ تھی کہ سجدے میں گر پڑے۔ جب حضرت یوسف کے والدین اور بھائیوں نے یہ دیکھا تو وہ بھی سجدے میں جھک گئے اور درباریوں کا ساتھ دیا۔ تب حضرت یوسف کو اپنے خواب کی بات یاد آگئی۔ وہ بے اختیار پکار اٹھے! ھٰذا تاویل رؤیای من قبل۔ قد جعلھا ربی حقا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ سورج، چاند، اور گیارہ ستارے اُن کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ تو سورج اور چاند اُن کے والدین تھے اور گیارہ ستارے گیارہ بھائی۔ آج یہ سب اُن کی عظمت و اجلال کے آگے جھک گئے، اور وقت کی سب سے بڑی مملکت کے اوج و اقبال نے اپنا تخت اُن کے لیے خالی کر دیا!

(و) حضرت یعقوب اور اُن کے بیٹوں کا یہ سجدہ تعظیم کا سجدہ تھا۔ دنیا میں قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ حکمرانوں اور پیشواؤں کے آگے سجدے کرتے ہیں اور اسے تعظیم و احترام کی خاص علامت سمجھتے ہیں۔ مصر، بابل، ایران، ہندوستان، اور سلاطین بنی اسرائیل، سب کے یہاں تعظیم و احترام کا یہی طریقہ رائج تھا، اور ہندوستان میں اب تک رائج ہے۔ لیکن قرآن نے توحید کے اعتقاد و عمل کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا، وہ اس طرح کے رسوم و اشکال کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے سجدہ کی ہر قسم اور ہر صورت صرف اللہ ہی کی عبادت کے لیے مخصوص کر دی، اور کسی حال میں جائز نہ رکھا کہ کسی دوسری ہستی کے لیے سر نیاز جھکایا جائے۔ اس نے صرف سجدہ ہی کو نہیں روکا جو پیشانی کے زمین پر رکھنے کا نام ہے، بلکہ یہ بھی جائز نہ رکھا کہ کوئی انسان کسی دوسری ہستی کے آگے اپنا جسم دُہرا کرے۔ ہر جھکاؤ، ہر خمیدگی، ہر رکوع، جو کسی قلمت پر طاری ہو سکتا ہے، وہ کہتا ہے، صرف اللہ ہی کے لیے ہے اور کوئی دوسری ہستی اس میں شریک نہیں ہو سکتی!

پس یاد رہے کہ یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ محض ایک

ہے کہ تم کتنا ہی چاہو، (اور کتنی ہی دلیلیں پیش کرو) کبھی ایمان لانے والے نہیں!

حالانکہ تم ان سے اس بات کے لیے کوئی مزدوری نہیں مانگتے۔ یہ تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے، کہ تمام جہان کے لیے پند و وعظ ہے!

اور (دیکھو!) آسمانوں میں اور زمین میں (اللہ کی قدرت و حکمت کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے لوگ گزر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں!

اور ان میں سے اکثروں کا حال یہ ہے کہ اللہ پر یقین لاتے ہیں، تو اس حال میں لاتے ہیں کہ اُس کے ساتھ شریک بھی ٹھہرائے جاتے ہیں!

پھر کیا یہ لوگ اس بات سے مطمئن ہو گئے ہیں کہ اللہ کے عذاب میں سے کوئی آفت اُن پر آئے اور چھا جائے؟ یا اچانک قیامت آجائے اور وہ بے خبری میں پڑے ہوں!

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو میری راہ تو یہ ہے میں اُس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے، اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اُٹھایا ہے، وہ بھی (اسی طرح بلاتے) ہیں۔ اللہ کے لیے پاکی ہو۔ میں شرک کرنے والوں

وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا ١٠٨
نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی ؕ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ حَتّٰۤی اِذَا اسْتَایْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ١٠٩
ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ۝ لَقَدْ كَانَ ١١٠

گذشتہ واقعہ کی حکایت ہے۔ اسلامی احکام کی تشریح نہیں ہے۔

(د) اس طرح یہ سرگزشت جس خواب کے ذکر سے شروع ہوئی تھی، اسی کی تعبیر کے ظہور پر ختم ہوگئی!

(ھ) حضرت یوسف نے اس موقعہ پر جو کچھ فرمایا، اور اس کے بعد جو دعا فرمائی وہ ان کی سیرت مطہرہ کا سب سے زیادہ اہم مقام ہے، اور اس کی مختصر تشریح آگے آئیگی۔

(۴۲) سورت کا خاتمہ۔

سرگزشت ختم ہوگئی۔ اب آیت (۱۰۲) سے خطاب پیغمبر اسلام کی جانب ہے، اور دعوتِ حق کی بعض مہمات واضح کی ہیں:

(ا) اس سرگزشت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ سرتاسر غیب کی باتیں ہیں۔ اگر وحی الٰہی کا فیضان نہ ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ اس واقعہ کی ایک ایک جزئیات پر تم مطلع ہوتے اور دنیا کے آگے اس طرح پیش کر دیتے۔ یہ ظاہر ہے کہ واقعہ تم سے دو ہزار سال پہلے کا ہے، اور دنیا میں گزشتہ واقعات کے علم وسماعت کے جتنے وسائل ہو سکتے ہیں، ان میں سے کوئی وسیلہ بھی تمہارے لیے موجود نہیں، اور اگر موجود بھی ہو تو یقینی ہے کہ اس باب میں کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔

(ب) لیکن کیا منکرینِ حق تمہاری سچائی کی یہ دلیل واضح دیکھ کر ایمان لے آئینگے؟ نہیں، تم کتنا ہی چاہو، جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ کبھی ماننے والے نہیں۔

(ج) خدا کی کائنات تو سرتاسر حقیقت کی نشانی ہے، آسمان وزمین کا کون گوشہ ہے جو اس کی نشانیوں سے خالی ہے، اور شب و روز انسان کو دعوتِ فکر و عبرت نہیں دے رہا ہے؟ بااینہمہ بندگانِ غفلت کا کیا حال ہے؟ یہ ہے کہ اُن پر سے گزر جاتے ہیں، اور نگاہ اُٹھا کر دیکھتے بھی نہیں!

قرآن نے یہاں اور دوسرے مقامات میں آسمان و زمین کی نشانیوں پر توجہ دلائی ہے، اور اُن کے مطالعہ و تفکر کو معرفتِ حق کا سرچشمہ ٹھہرایا ہے، اور یہی بات اس کے تمام استدلال کا مبدء و اساس ہے۔ چنانچہ پچھلی سورتوں کے نوٹوں میں اس طرف اشارات گزر چکے ہیں، اور تفصیل کے لیے تفسیر فاتحہ

میں نہیں ہوں!"

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا ہے، مگر اسی طرح کہ وہ باشندگانِ شہر ہی میں سے ایک آدمی تھا اور ہم نے اُس پر وحی اُتاری تھی (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان سے فرشتے اُترے ہوں) پھر کیا یہ لوگ (جو تمہارے اعلانِ رسالت پر متعجب ہو رہے ہیں) زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے، ان لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے جو پہلے گزر چکے ہیں؟ اور جو لوگ (برائیوں سے) بچتے ہیں، تو یقیناً آخرت کا گھر اُن کے لیے کہیں بہتر ہے۔ پھر (اے گروہِ مخاطب!) کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟ ١٠٩

(اور ان گزری ہوئی قوموں پر فوراً عذاب نہیں آگیا تھا۔ اُنہیں مہلت ملتی رہی) یہاں تک کہ جب اللہ کے رسول (اُن کے ایمان لانے سے) مایوس ہو گئے، اور لوگوں نے خیال کیا، اُن سے جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا، تو (پھر اچانک) ہماری مدد اُن کے پاس آ پہنچی، پس ہم نے جسے بچانا چاہا، بچا لیا، اور (جو مجرم تھے، تو) ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ مجرموں سے ہمارا عذاب ٹل جائے! ١١٠

یقیناً اِن لوگوں کے قصّہ میں دانشمندوں

فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ ع ۱۱

کے لیے بڑی ہی عبرت ہے۔ یہ کوئی جی سے گڑھی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اُس کتاب کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے آچکی ہے نیز اُن لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں (ہدایت کی) ساری باتوں کی تفصیل ہے (یعنے الگ الگ کرکے واضح کردینا ہے) اور رہنمائی ہے اور رحمت ہے!

کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(د) آیت (۱۰۶) کے پانچ چھ لفظوں میں وہ سب کچھ بیان کردیا جو باب توحید میں دعوت قرآنی کا ماحصل ہے۔ فرمایا۔ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کی ہستی پر یقین بھی رکھتے ہیں، اور ساتھ ہی دوسروں کو اس کا شریک بھی ٹھہراتے ہیں یعنی اُن کا خدا کو ماننا ایسا ماننا نہیں ہے جو شرک سے انہیں باز رکھے۔

دنیا کی تمام قوموں کی دینی ذہنیت کی یہ کیسی مکمل تعبیر ہے جو چند لفظوں کے اندر بیان کردی گئی ہے؟ نزول قرآن کے وقت دنیا کی تمام خدا پرست جماعتوں کی خدا پرستی کا یہی حال تھا۔ اور اب بھی دیکھ لو یہی حال ہے۔ وہ خدا پر ایمان رکھتے تھے، لیکن اُن کا ایمان طرح طرح کے مشرکانہ عقائد و اعمال سے آلودہ ہوگیا تھا۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایمان صحیح کے ساتھ شرک جمع نہیں ہوسکتا۔ عرب کے بت پرستوں کو بھی اس سے انکار نہ تھا کہ آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں: ولئن سالتهم من خلق السموٰت والارض، وسخر الشمس والقمر؟ ليقولن الله، فانی یؤفکون؟ (۲۹: ۶۱) لیکن یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کہ کیوں صرف اُسی کی ایک ہستی ہر طرح کی بندگیوں کی مستحق سمجھ لی جائے! کیوں دوسری ہستیوں کی بھی بندگی نہ کی جائے؟ کیوں خدا اور بندے کے درمیان کوئی درمیانی قوت وسیلۂ تقرب و تزلف نہ ہو!

قرآن کی دعوتِ توحید

لیکن قرآن کی دعوتِ توحید یہ تھی کہ اس طرح کی خدا پرستی سچی خدا پرستی نہیں ہے۔ سچی خدا پرستی یہ ہے کہ نہ صرف اُسے مانا جائے، بلکہ جو کچھ اس کے لیے مانا جائے، اُس میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کیا جائے۔ اُس نے کہا ہر طرح کی بندگی و نیاز کی مستحق صرف اُسی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا، تو سچی خدا پرستی باقی نہ رہی۔ اُس نے کہا۔ دعا، استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اسی طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیازمندانہ اعمال، وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں پس اگر ان اعمال میں دوسروں کو بھی شریک کرلیا، تو خدا کے رشتۂ عبودیت کی یگانگت باقی نہ رہی اور جب یگانگت باقی نہ رہی، تو سچی خدا پرستی بھی نہ ہوئی۔ اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں، اور بے نیازیوں کا جو تصور تمہارے اندر خدا کا اعتقاد پیدا کرتا ہے، وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کرلیا، تو تم نے اُسے خدا کا شریک بنادیا، اور جب شریک بنادیا، تو صرف اسی کو نہیں مانا۔ دوسروں کو بھی مان لیا! حالانکہ اُس کے ماننے کے معنی تو یہ تھے کہ صرف اُسی کو مانا جائے!

دعوتِ وحی علم و بصیرت ہے

(ه) آیت (۱۰۸) میں جو بات کہی گئی ہے، قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے۔ فرمایا۔ تم اعلان کردو میری راہ یہ ہے کہ علم و یقین کی بنا پر خدا پرستی کی دعوت دیتا ہوں، اور کہتا ہوں میری راہ شرک کرنے والوں کی راہ نہیں ہے۔ برخلاف اس کے تمہارا حال یہ ہے کہ شرک کے داعی ہو، اور بنیادِ دعوت علم و یقین نہیں ہے جہل و ظن ہے۔ اب فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے، اور ایسے ہی فیصلے پچھلی قوموں کے لیے بھی ہوچکے ہیں۔

یہاں "بصیرة" کا لفظ فرمایا۔ بصیرة کے معنی علم، معرفت اور یقین کے ہیں، اور اسی لیے دلیل و حجت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ پس قرآن کہتا ہے، میں جس راہ کی طرف بلاتا ہوں اُس کے لیے میرے سامنے علم و یقین ہے۔ پھر کیا تمہارے پاس بھی علم و یقین میں سے کچھ ہے؟ اگر نہیں ہے، تو اتباع یقین و عرفان کا کرنا چاہیے یا جہل و کوری اور شک و

کان کا ؟ اس مقام کی تشریح پچھلی سورتوں کی تشریحات میں بار بار گزر چکی ہے۔

(ف) آخری آیت میں فرمایا۔ قرآن انسان کی بناوٹ نہیں ہے، بلکہ وحی الٰہی کی سچائی ہے، اور پھر اس کے چار وصف بیان کیے ہیں جو کبھی کذب و افترا کے اوصاف نہیں ہو سکتے:

قرآن کے اوصاف اربعہ

اولاً، وہ پچھلی صداقتوں کی تصدیق ہے۔ اگر بناوٹ ہوتی تو پچھلی کڑیوں کے ساتھ اس طرح نہ جُڑ جاتی، گویا ایک زنجیر کی مختلف قدرتی کڑیاں ہیں، اور ہر کڑی دوسری کڑی کو سہارا دے رہی ہے۔

ثانیاً، ارباب یقین کے لیے اس میں دین کی ساری باتوں کی تفصیل ہے۔ یعنی ہر بات اس طرح الگ الگ کر کے بیان کر دی گئی ہے کہ شبہ و التباس کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔

ثالثاً، ارباب یقین کے لیے سر تا سر رہنمائی ہے۔ یعنی انسان کو کامیابی و سعادت کی منزلوں تک پہنچاتی، اور ہر طرح کی گمراہیوں سے بچاتی ہے۔

رابعاً، ارباب یقین کے لیے رحمت ہے۔ یعنی ہر طرح کی شقاوتوں اور نامرادیوں سے نجات دلانے والی ہے۔

سورۂ یوسف کے مواعظ و حکم

(۲۳) سورت کی ضروری تشریحات ختم ہو چکیں، لیکن ضروری ہے کہ اب حضرت یوسف کی سرگزشت پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈال لی جائے، تاکہ اُس کی موعظتیں اور عبرتیں پوری وضاحت کے ساتھ واضح ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں:

مصری تمدن کا عروج

(ا) حضرت مسیح (علیہ السلام) سے تقریباً دو ہزار سال پہلے دنیا کے نقشہ کا یہ حال تھا کہ سرزمین مصر وقت کے تہذیب و تمدن کا مرکز بن چکی تھی، لیکن اس کے اطراف و جوانب کی قومیں ابھی تمدن و حضارۃ سے آشنا نہیں ہوئی تھیں اور صحرا نشینی و بدویت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ مصر سے ایک قریب تر علاقہ وہ تھا جو آگے چل کر فلسطین کے نام سے مشہور ہوا، اور جسے خاکنائے سینا نے سرزمین افریقہ سے ملا دیا ہے۔ اس علاقہ کی تمام پچھلی آبادیاں مٹ چکی تھیں۔ اب محض ایک صحرائی علاقہ تھا جو مویشی کے لیے چراگاہوں کا کام دیتا تھا، اور مختلف بدوی قبائل وہاں بود و باش رکھتے تھے۔ انہی قبائل میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان کا بھی تھا۔

حضرت ابراہیم کا قبیلہ اور عہد الٰہی

حضرت ابراہیم کا ظہور تمدن قدیم کے ایک دوسرے مرکز یعنی سرزمین دجلہ و فرات میں ہوا تھا۔ انہوں نے وہاں سے ہجرت کی اور کنعان میں مقیم ہو گئے۔ کنعان سے مقصود وہ علاقہ ہے جو بحر میت کی مغربی جانب واقع ہے، اور دریائے یردن سے سیراب ہوتا ہے۔ تورات میں ہے کہ انہوں نے یہ علاقہ وحی الٰہی سے منتخب کیا تھا، اور اللہ نے فرمایا تھا "تو جس جگہ کھڑا ہے، اس کے چاروں طرف دیکھ۔ یہ تمام ملک میں تجھے اور تیری نسل کو دونگا، اور تیری نسل کو میں خاک کے ذروں کی مانند بنا دونگا۔ اگر کوئی خاک کے ذروں کو گن سکتا ہے، تو تیری نسل بھی گن لی جائیگی" پیدائش (۱۳: ۱۵) قرآن نے بھی جابجا اس بشارت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جب حضرت ابراہیم یہاں مقیم ہو گئے، تو وقتاً فوقتاً انہیں اور بشارتیں بھی ملتی رہیں۔ ان تمام بشارتوں کا ماحصل یہ تھا کہ اللہ نے انہیں اُمتوں کا پیشوا، نسلوں کا مورث، اور پادشاہوں کا جد بنایا ہے، اور ان کی نسل کو اپنی برکتوں کے لیے چن لیا ہے۔ جب تک اُن کی نسل ظلم و ضلالت سے آلودہ نہ ہوگی، وعدہ کی برکتوں کی مستحق ہوگی۔ یہ بشارتیں اس خاندان میں اللہ کا "عہد" سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی اللہ کا وعدہ جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ خاندان کا ہر بزرگ اسے محفوظ رکھتا، اور پھر اپنے وارث کو اس کی وصیت کرتا۔ یہ "عہد" دو باتوں پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ نسل ابراہیمی اللہ کے دین پر قائم رہیگی اور اس کی دعوت دیگی۔ دوسری یہ کہ اللہ اسے برکت دیگا، اور اس کی دعوت کامیاب ہوگی۔ قرآن نے ان تمام بشارتوں کا جابجا ذکر کیا ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت (۱۲۴) اور ہود کی آیت (۷۱) میں دو بشارتیں گزر چکی ہیں۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک موقعہ پر حضرت ابراہیم کو ایک خاص واقعہ کی خبر دی گئی تھی۔ یعنی یہ کہ تیری اولاد ایک ایسے ملک میں جائیگی جو اُن کا ملک نہ ہوگا۔ وہاں لوگ اُسے غلام بنا لینگے، اور وہ چار سو برس

ملک وہاں رہیگی" (پیدائش ۱۵: ۱۳)

حضرت ابراہیم سے حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیل حجاز میں بس گئے اور حضرت اسحٰق کنعان میں خاندان کے جانشین ہوئے۔ حضرت اسحاق سے یعقوب پیدا ہوئے۔ یہ پہلے حاران گئے تاکہ اپنی خالہ زاد بہن سے نکاح کریں۔ پھر نہیں برس کے بعد کنعان واپس آئے۔ اور وہیں مقیم ہو گئے۔ تورات میں ہے کہ اللہ نے نسل ابراہیمی کا "عہد" اُن سے تازہ کیا تھا، اور قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے۔

فلسطین کے تمام علاقہ کی طرح حضرت یعقوب کے خاندان کی زندگی بھی بالکل بدویانہ زندگی تھی۔ مویشی چراتے تھے، اور اُن کے گوشت، اون، اور دودھ پر گزران کرتے تھے۔

مصریوں کا غرورِ تمدن

لیکن اس علاقہ سے تھوڑے فاصلہ پر مصر کی سرزمین تمدن وحضارۃ میں شہرۂ آفاق ہو رہی تھی، اور ایک بڑی مملکت کی پایۂ گاہ تھی۔ اس کا دارالحکومت تنیس وقت کے علوم وصنائع کا مرکز تھا، اور وہاں کے باشندوں میں شہریت وامدنیت کی خصوصیتیں نشوونما پا چکی تھیں۔ جیسا کہ قاعدہ ہے، مصر کے لوگ اپنے آپ کو متمدن اور ترقی یافتہ سمجھتے، اور اطراف و جوانب کے بدویوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ خصوصاً کنعانی اور عبرانی اُن کی نگاہوں میں بڑے ہی ذلیل تھے۔ وہ انہیں "چرواہا" کہہ کر پکارتے، اور اس قابل نہ سمجھتے کہ اپنی مجلسوں میں جگہ دیں۔ یہ بات بھی اُن میں عام تھی کہ کوئی مصری کنعانی کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا نہ کھاتا (پیدائش ۴۳: ۳۲) اور مصر کے دیہاتی بھی انہیں اس درجہ حقیر سمجھتے کہ اپنی آبادیوں میں اُن کا بسنا گوارا نہ کرتے (پیدائش ۴۶: ۳۴)

قدرتِ الٰہی کی کرشمہ سازی

(ب) لیکن قدرتِ الٰہی سے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ کنعان کے اس بدوی قبیلہ کا ایک کم سن لڑکا بغیر اپنی خواہش اور مرضی کے مصر پہنچ گیا، اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دنیا نے دیکھا کہ اس عظیم الشان مملکت کی حکومت کی باگ اسی کنعانی کے ہاتھوں میں ہے، اور بادشاہ سے لیکر مصر کی ادنیٰ رعایا تک سب اس کی عظمت وفضیلت کے آگے جھکے ہوئے ہیں! گویا وقت کی سب سے بڑی پُرشوکت، سب سے بڑی متمدن، سب سے بڑی مغرور مملکت کے تخت حکمرانی پر اچانک کون پہنچ گیا؟ اُسی بدوی قبیلہ کا ایک چرواہا، جسے اس متمدن آبادی کا ہر فرد نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتا تھا!

اور پھر یہ عجیب وغریب معاملہ کن حالات میں ظہور پذیر ہوا؟ ایسے حالات میں جو اصل معاملہ سے بھی کہیں زیادہ عجیب وغریب تھے!

اُسے سوتیلے بھائیوں نے ہلاک کرنے کے لیے کنوئیں میں ڈال دیا۔ کنواں خشک تھا اور شاہراہ سے الگ۔ اس لیے اُنہیں یقین تھا کہ کوئی انسان وہاں نہیں پہنچ سکیگا۔ لیکن اتفاق سے ایک قافلہ راہ بھول کر وہاں آنکلتا ہے، اور پانی کے لیے ڈول ڈالتا ہے۔ لڑکا سمجھتا ہے۔ میرے بھائیوں کو رحم آگیا۔ اب مجھے نکالنے کے لیے ڈول ڈال رہے ہیں۔ وہ اس میں بیٹھ جاتا ہے، اور اس طرح اُس کی رہائی کا سامان ہو جاتا ہے!

کنعانی غلام!

لیکن کیسی رہائی؟ ایسی رہائی جس میں ایک ہلاکت سے جو تھوڑی دیر کی تھی نجات مل گئی، لیکن دوسری ہلاکت جو عمر بھر جاری رہنے والی ہلاکت تھی نمودار ہو گئی یعنے بھائیوں نے اُسے اپنا بھاگا ہوا غلام ظاہر کر کے قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ وہ اسے کسی دوسرے گاہک کے ہاتھ بیچنے کے لیے مصر لے آئے۔

اس طرح مصر میں اُس کا داخلہ، ایک غلام کا داخلہ تھا۔ اور غلام بھی ایسا جو کم سے کم قیمت میں خریدا گیا، اور اب کم سے کم قیمت پر فروخت کیا جا رہا ہے۔ نہ تو بیچنے والے اس کی قدر وقیمت بڑھانے کے خواہشمند تھے۔ نہ اب بازار مصر میں اس جنس کی گرانی کا کوئی سامان ہے!

لیجائیے دکھلانے اُسے مصر کا بازار　　خواہاں نہیں پر کوئی وہاں جنسِ گراں کا!

غلامی کا خواجگی و آقائی ہو جانا!

بہرحال ایک خریدار کی نظر پڑ جاتی ہے۔ یہ اس کے گھر میں ایک زرخرید غلام کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے، مگر اپنے حسنِ عمل سے خواجگی و آقائی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ انقلاب حال بجائے خود عجیب وغریب تھا، لیکن اس سے بھی عجیب تر معاملہ وہ تھا جب اس زرخرید غلام کے سامنے بیک وقت دو باتیں پیش کی گئیں کہ دونوں میں سے

امتحانِ عصمت!

جسے چاہے، اپنے لیے پسند کرے: ولئن لم یفعل ما اٰمرہٗ لیسجنن ولیکونا من الصاغرین (۳۲) نفسانی زندگی کی سب سے بڑی عشرت و کامرانی، اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی محرومی و نامرادی، پہلی میں نفس کی عشرت مگر حق کی معصیت تھی۔ دوسری میں نفس کی محرومی مگر حق کی اطاعت تھی۔ وہ پہلی سے بھاگتا ہے، اور دوسری کے لیے آرزو مند ہوتا ہے۔ پہلی سے اس طرح بھاگتا ہے گویا اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں، دوسری کے لیے اس طرح التجا میں کرتا ہے، گویا اس سے بڑھ کر کوئی محبوب شے نہیں: رب السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ! (۳۳)

تمنت سلیمیٰ ان نموت بحبہا ٭ واھون شیء عندنا۔ ما تمنت!

مصر میں کسی انسان کی ذلت و نامرادی کے جتنے سامان ہو سکتے تھے، اب وہ سب جمع ہو گئے۔ اول تو عبرانی قبیلہ کا ایک فرد۔ پھر کیسا فرد؟ زر خرید غلام۔ کیسا غلام؟ جسے اس کے آقا نے ایک بڑے جرم کا مرتکب پایا اور سزا کا مستحق تصور کیا۔ کیسی سزا؟ قید خانے میں ڈالے جانے کی سزا، جو ذلت و خواری اور تعذیب و عقوبت کی بڑی سے بڑی سزا سمجھی جاتی تھی۔ اب وہ مصریوں کی نگاہ میں قابلِ نفرت عبرانی بھی ہے۔ غلام بھی ہے مجرم بھی ہے۔ اور قیدی بھی!

قید خانہ اور تختِ مصر!

لیکن پھر غور کرو دنیا کی کونسی بات اس سے زیادہ عجیب ہو سکتی ہے کہ اسی قیدی کے لیے اچانک قید خانے کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور کھولنے والا کون ہوتا ہے؟ خود مصر کا پادشاہ۔ اور پھر کیوں کھولتا ہے؟ اس لیے کہ ایک عبرانی قیدی کو قید خانہ سے نکالے، اور مصر کے تختِ فرماں روائی پر بٹھائے۔ گویا مصر کے قید خانے اور مصر کے تختِ حکومت کا درمیانی فاصلہ ایک قدم سے زیادہ نہ تھا۔ اس نے قید خانہ سے قدم اٹھایا، اور اس نے تختِ فرماں روائی پر قدم رکھ دیا۔

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے ٭ ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم!

پھر اس عجیب و غریب انقلاب کا نتیجہ کیا نکلا؟ ایسا، کہ ان ساری باتوں سے بھی زیادہ عجیب ہے، اور جسے قرآن کی ایجاز بلاغت نے صرف ایک جملہ میں واضح کر دیا ہے: وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوّأ منہا حیث یشاء (۵۶) اللہ نے سرزمینِ مصر میں اس کے قدم اس طرح جما دیے کہ اس کے جس حصے کو چاہے اپنے کام میں لائے۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام خاندان کو کنعان سے مصر بلا لیا، اور عین دار الحکومت میں کہ جشن کی سرزمین تھی عزت و احترام کے ساتھ وہ بسائے گئے۔ اب وہی صحرا کے بدوی جو مصر میں قابلِ نفرت سمجھے جاتے تھے مصری دار الحکومت کے معزز باشندے ہو گئے، اور وہاں ان کی نسل میں اس درجہ برکت ہوئی کہ جب چار سو برس کے بعد مصر سے نکلے تو کئی لاکھ تک تعداد پہنچ چکی تھی!

کئی لاکھ انسانوں کی یہ قوم جو مصر سے نکلی، کن لوگوں کی نسل سے بنی تھی؟ اسی لڑکے کی نسل سے جو غلام بن کر آیا تھا، اور فرماں روا بن کر چکا تھا، اور اس کے گیارہ بھائیوں کی نسل سے، جنہوں نے اسے ہلاک کرنا چاہا تھا، لیکن اس نے انہیں زندگی اور زندگی کی کامرانیاں بخشدیں۔

(ج) اس طرح اس عہد کی کرشمہ سازیوں کا ظہور شروع ہو گیا جس کی بشارتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھیں، اور پھر حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب سے بھی ان کی تجدید ہوئی تھی۔

روحانی صداقت اور مادی ترقیات کا مقابلہ!

(د) سب سے پہلی بات جو اس سلسلہ میں سامنے آتی ہے، وہ روحانی صداقت اور مادی ترقیات کا مقابلہ ہے۔ حضرت یعقوب کا گھرانا دینِ حق کی امانت رکھتا تھا۔ وحی الٰہی کی برکتوں سے فیض یاب تھا، لیکن مادی ترقیوں اور دنیوی شوکتوں میں سے کوئی بات بھی اسے میسر نہ تھی۔ حتیٰ کہ شہری زندگی کی ابتدائی خصوصیات سے بھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس کے تمام افراد صحرا میں رہتے تھے، مویشی چراتے تھے، اور قدرتی زندگی کی سادگی پر قانع تھے!

لیکن مصر کی حالت بالکل اس سے مختلف تھی۔ وہ دینِ حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان سے محروم تھا، لیکن وقت کی تمام مادی ترقیوں کا سرمایہ دار تھا۔ اس کے دار الحکومت کے لوگ لکھنے پڑھنے میں ماہر تھے، اس کے امراء و اشراف حکمرانی و دانشوری میں ترقی یافتہ تھے۔ اس کے مندروں کے کاہن حقائقِ اشیاء کے بھید جاننے والے تھے، اور اس کے حکیم علوم و صنائع کے عجائب و غرائب سکھلانے والے تھے۔ آج اثریاتِ مصر نے ایک مدوّن علم کی

حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اُس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد کا فرعون غالباً وہ شخص تھا جسے آثارِ مصریہ "آبوفی" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کے عہد میں مصری تمدن پوری طرح ترقی کر چکا تھا۔

لیکن جب عجیب و غریب اتفاقات نے اس صحرائی گھرانے کے ایک فرد کو مصر پہنچا دیا، اور ایسی حالتوں میں پہنچایا جو کسی حال میں بھی عزت و کامرانی کا ذریعہ نہیں ہوسکتی تھیں، تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟ یہ نکلا کہ دونوں قوتوں میں مقابلہ ہوا اور بالآخر دینِ حق کے علم و عمل اور وحیِ الٰہی کے فیضان نے وقت کی تمام مادی فضیلتوں کو مسخر کرلیا!

حضرت یوسف کے پاس دینِ حق کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مصریوں کے پاس دینِ حق کے سوا اور سب کچھ تھا۔ یہ صرف دینِ حق کی فضیلت سے آراستہ تھے۔ وہ ہر طرح کی مادی فضیلتوں میں تفوق رکھتے تھے۔ بایں ہمہ ہر مقابلہ میں فتح مندی حضرت یوسف ہی کی سیرت و عمل کو ہوئی، اور قدم قدم پر مادی فضیلتوں کو اپنے تفوق سے دست بردار ہونا پڑا۔ حتی کہ جب مملکت کی سلامتی خطرہ میں پڑ گئی، تو اُس کی نجات کے لیے مادی فضائل کی کوئی پیداوار بھی کام نہ دے سکی۔ اسی عبرانی نوجوان کے آگے مصر کو جھکنا پڑا کہ اُس کی سلامتی کی راہ نکال دے!

جب حضرت یوسف نے پادشاہِ مصر سے کہا تھا: اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم (۵۵) تو فی الحقیقت یہ دینِ حق اور فیضانِ وحی کا ایک اعلان تھا جو وقت کے سب سے بڑے مرکزِ تمدن کے مقابلہ میں کیا گیا تھا۔ یعنی آج مملکت کی نجات کے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علم و کاردانی کے ساتھ حفاظت کرنے والا ہو۔ لیکن ایسا شخص پیش کرنے سے مصر کی پوری مدنیت عاجز ہوگئی۔ اس کا عظیم الشان دار الحکومت، جو کار فرماؤں، دانشمندوں، اور کاہنوں سے بھرا ہوا ہے، ایک فرد بھی پیش نہ کرسکا جو یہ بوجھ اُٹھانے کا اہل ہو۔ لیکن میں طیار ہوں کہ یہ بوجھ اُٹھالوں۔ میں دنیا کی سب سے بڑی مملکت کو اس کی ہلاکت کی گھڑیوں میں بچالونگا۔ کیونکہ میں حفاظت کرنے والا، علم رکھنے والا ہوں!

متمدن مصر نے کنعان کے صحرائی کا یہ اعلان سُنا، اور اس کے آگے سرنیاز خم کردیا! یہی معنی ہیں اس آیت کے کہ وکذالک مکنا لیوسف فی الارض، یتبوأ منہا حیث یشاء، نصیب برحمتنا من نشاء، ولا نضیع اجر المحسنین۔ ولاجر الاخرۃ خیر للذین آمنوا وکانوا یتقون! (۵۷)

قوانینِ عمل و نتائجِ عمل

(۵) لیکن یہ معاملہ کتنا ہی عجیب معلوم ہوتا ہو، اور کیسی ہی عجیب حالتوں میں پیش آیا ہو، قرآن کہتا ہے کہ قوانینِ الٰہی کے قدرتی نتائج کا ظہور تھا، اور حقیقت شناسوں کے لیے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ یہ سب کچھ ٹھیک اُسی طرح ہوا، جس طرح آگ کے جلانے سے گرمی نکلے، یا پانی پینے سے پیاس بجھ جائے۔ کیونکہ اللہ نے اشیاء کی طرح اعمال کے بھی خواص و نتائج ٹھہرا دیے ہیں، اور جب کبھی ایک خاص طرح کا عمل وجود میں آتا ہے، ایک خاص طرح کا نتیجہ بھی ضرور ظہور میں آجاتا ہے۔ یہاں ہر گوشے میں علت کے ساتھ معلول کا دامن باندھ دیا گیا ہے۔ بھائیوں نے جو کچھ یوسف کے ساتھ کیا، وہ اس کے سوا کیا تھا کہ ایک خاص طرح کا انسانی عمل تھا اور جب خاص طرح کا عمل تھا، تو خاص طرح کا نتیجہ نکلنا ہی تھا اور نتیجہ نکلا۔ حضرت یوسف زندگی کی مختلف آزمائشوں میں جو کچھ کرتے رہے، اُس کی حقیقت بھی اس کے سوا کیا تھی کہ ایک خاص سیرت کے خاص اعمال تھے، اور جب اعمال تھے، تو ضروری تھا کہ جیسے کچھ اعمال ہوں، ویسا ہی نتیجہ بھی نکلے، اور ویسا ہی نتیجہ نکل رہا۔ اسی طرح سرگزشت کی تمام سیرتوں پر نظر ڈالو۔ ہر سیرت ایک خاص طرح کے عمل میں لگی ہوئی ہے، اور ہر عمل ایک خاص طرح کا نتیجہ طیار کر رہا ہے۔ سب نے اپنے اپنے بیج بوئے تھے، اس لیے سب کو اپنے اپنے پھل ملنے تھے، اور سب نے اپنے اپنے پھل پالیے۔ پس جہاں تک اعمال و نتائج کا تعلق ہے، یہ تاریخِ انسانیت کا کوئی مستثنیٰ حادثہ نہ تھا۔ بلکہ سنتِ الٰہی کی وہی کار فرمائی تھی، جو ہمیشہ سے کار فرما ہے اور ہمیشہ کار فرما رہیگی۔ جب کبھی ایسے احوال و ظروف میں ایسے اعمال ظہور پذیر ہونگے، ضروری ہے کہ اسی طرح کے نتائج بھی ظہور میں آئیں: سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل، ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا! (۳۳: ۶۲)

بلاشبہ حوادث کی نوعیت عجیب تھی، اور نتائج بھی عجیب طرح کے نکلے، لیکن سنتِ الٰہی کی کرشمہ سازیوں کا تو

ہمیشہ ایسا ہی حال رہتا ہے۔ وہ ایسی کس بات میں عجیب نہیں؟ وہ تو سرتاسر معجزہ ہے۔ تم جب چاہو، اپنے حسن عمل کی قوت سے ہر طرح کے کرشمے اور اچنبھے پیدا کر دے سکتے ہو، لیکن مشکل یہ ہے کہ تم چاہتے ہی نہیں، اور اسی لیے قانونِ عمل کے کرشمے تم پر کھلتے بھی نہیں۔ دنیا میں یوسفؑ کی سرگزشت ایک ہی مرتبہ گزری، لیکن یوسف کے حسن عمل کی سرگزشت ایک ہی مرتبہ کے لیے نہ تھی۔ بلاشبہ مصر کا بازار اب باقی نہیں رہا، لیکن دنیا کا بازار کس نے بند کیا ہے؟ آج بھی جس کا جی چاہے، شانِ یوسفیت پیدا کر کے دیکھ لے۔ دنیا کے تخت عظمت و اجلال اس کا استقبال کرتے ہیں یا نہیں!

ہر کس نہ شناسندۂ راز است، وگرنہ　　ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است!

یہی وجہ ہے کہ سورت میں جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارات کیے گئے کہ ارباب دانش کے لیے اس میں عبرتیں ہیں، موعظتیں ہیں، نشانیاں ہیں۔ سرگزشت کی ابتدا ہی اس اعلان سے ہوتی ہے کہ لقد کان فی یوسف واخوتہ آیات للسائلین (۷)، پھر خاتمہ بھی اسی پر ہوتا ہے کہ لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب (۱۱۱) نیز جا بجا اہم واقعات کے ظہور کے بعد وضاحت کر دی ہے کہ کذلک نجزی المحسنین (۲۲) انہ لا یفلح الظالمون (۲۳) انہ من یتق ویصبر، فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (۹۰) یعنی یہ سب کچھ جو ظہور میں آیا، عمل کا نتیجہ ہے، بدلہ ہے، مکافات ہے۔ اور جب نتیجہ ہے تو ضروری ہے کہ ہمیشہ ظہور میں آئے۔ جب بدلہ ہے، تو ضروری ہے کہ ہمیشہ کام کرنے والوں کو ملے!

حسد و بغض کا نتیجہ وہی ہے جو بھائیوں نے پایا۔ راست بازی اور نیک عملی کا نتیجہ وہی ہے جو حضرت یوسف کو ملا۔ صبر جمیل کبھی اس نتیجہ سے محروم نہیں رہ سکتا جو حضرت یعقوب کے حصے میں آیا تھا۔ معصیت کے بیج سے ہمیشہ وہی پھل پیدا ہوگا جو امرأۃ العزیز کو نصیب ہوا تھا۔ جھوٹ کتنا ہی سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہو سچ نہیں ہو جا سکتا۔ سچ کتنے ہی ناموافق حالات میں اپنے کو پائے لیکن جھوٹ نہیں ہو جا سکتا۔ علم و فضیلت ہر حال میں ایک حکمراں قوت ہے۔ سب کو اس کے آگے جھکنا پڑیگا۔ حسن عمل ہر حال میں ایک فتح مند حقیقت ہے۔ سب کو اس کا لوہا ماننا پڑیگا!

سرگزشت کی شخصیتیں اور اُن کی سیرت

(د) سرگزشت کی اصلی عبرت، اُس کی خاص خاص شخصیتیں ہیں، اور ضروری ہے، انہیں اچھی طرح پہچان لیا جائے:

سب سے پہلے حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس میں درد و غم کی انتہا ہے مگر ساتھ ہی صبر اور یقین کی روح بھی چھائی ہوئی ہے، اور اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے، درد و غم کے طوفان اٹھ رہے ہیں، لیکن صبر و یقین سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں۔ اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ اور یہی صورتِ حال اس سیرتِ مقدس کا اسوۂ حسنہ ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام

قرآن کی معجزانہ بلاغت یہ ہے کہ وہ داستان سرائی نہیں کرتا۔ ایک دو لفظوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا کرتا ہے۔ پس غور کرو صورتِ حال کے یہ تینوں عنصر کس طرح اپنی انتہائی اور کامل صورتوں میں نمایاں ہو گئے ہیں؟ درد و غم کی شدت جب نمایاں ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ آتشِ فراق کے شعلوں کا دھواں آنکھوں سے بے اختیار بہہ رہا ہے، اور جسم کا ایک ایک ریشہ اس طرح گھل گیا ہے، گویا سرتا پا جاں گدازی و ہلاکت کی تصویر ہے: وتولی عنھم، وقال یا اسفی علی یوسف! وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم! (۸۴) اور یہ حالت ایک دن کی حالت نہ تھی بلکہ اس مدتِ فراق کی ہر صبح اور ہر شام اسی عالم میں بسر ہوئی تھی، قالوا "تاللہ تفتؤا تذکر یوسف، حتی تکون حرضا او تکون من الھالکین! (۸۵)

یذکرنی طلوع الشمس صخرا!　　واذکرہ بکل غروب شمس

لیکن پھر جب یقین کی روشنی چمکتی ہے، تو اُس کی نمود کا یہ حال ہے کہ دنیا کے سارے سہارے جواب دے چکے ہیں، اُمید کے سارے رشتے یک قلم ٹوٹ چکے ہیں، ہر طرف سے صدا اٹھ رہی ہے کہ یوسف کی اب کوئی اُمید نہیں، لیکن اُن کے دل کے ایک ایک ریشے کی صدا یہ ہے کہ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ واعلم

من اللہ ما لا تعلمون (۸۶) اور اذھبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ، ولا تایئسوا من روح اللہ! (۸۷) حتیٰ کہ ہر زبان جھٹلا رہی ہے اور ہر نگاہ دیوانہ سمجھ رہی ہے، لیکن انکی زبان سے بے اختیار نکل رہا ہے: انی لاجد ریح یوسف! (۹۴) مجھے یوسف کی مہک آرہی ہے!

تفاوت است میان شنیدن من و تو ٭ تو بستن در و من فتح باب می شنوم!

پھر دیکھو، جب صبر کا مقام نمایاں ہوتا ہے، تو اُس کی مضبوطی کیسی غیر متزلزل، کیسی اٹل ہے! جب یوسف کے فراق کا داغ لگا، تو اُس وقت بھی زبان سے یہی نکلا کہ بل سولت لکم انفسکم امرا، فصبر جمیل واللہ المستعان علیٰ ما تصفون! (۱۸) اور پھر جب بن یمین کی جُدائی کی خبر سُنی تو اُس وقت بھی اس کے سوا کچھ زبان سے نہ نکلا کہ فصبر جمیل. عسی اللہ ان یاتینی بھم جمیعا. انہ ھو العلیم الحکیم! (۸۳) پھر باوجودیکہ بے خبر نہ تھے. علم و یقین کے ساتھ سمجھ چکے تھے کہ یوسف کے خلاف سازش کی گئی ہے، لیکن پوری سرگزشت میں کہیں کوئی اشارہ اس کا نہیں ملتا کہ دو باتوں سے زیادہ اس باب میں کچھ زبان سے نکلا ہو. ایک تو یہ کہ بل سولت لکم انفسکم امرا، اور دوسرا وہ، جو اُس وقت زبان سے نکل گیا، جب بھائیوں نے بن یمین کو ساتھ بھیجنا چاہا: ھل امنکم علیہ الا کما امنتکم علیٰ اخیہ من قبل! (۶۴) اور ان دونوں جملوں میں بھی نہ تو ملامت کی سختی ہے نہ شکایت کی تیزی. بلکہ صورت حال کی ایسی تعبیر ہے، جس سے زیادہ نرم اور دھیمی تعبیر ہو ہی نہیں سکتی. پہلے جملہ میں صرف اس کا اظہار تھا کہ جو بات کہہ رہے ہو، اصلیت اس کے خلاف ہے. لیکن خیر، صبر کے سوا چارہ نہیں! دوسرے میں صرف پہلے واقعہ کا نتیجہ یاد دلایا ہے. کسی طرح کا الزام نہیں دیا ہے. یعنے مجھے بھروسہ کرنے کے لیے کہتے ہو، لیکن اگر بھروسہ کروں تو کیا اسی طرح کروں جس طرح پہلے کر چکا ہوں اور اس کا جو نتیجہ نکل چکا ہے تمہیں معلوم ہے؟

اتنا ہی نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے، تو پہلے جملہ کا اسلوب ایسا واقع ہوا ہے کہ سرزنش سے کہیں زیادہ رحم و تاسف پوشیدہ ہے، اور مخاطبوں کے لیے ایک طرح کی معذرت کا پہلو پیدا کر رہا ہے یعنے یہ نہیں فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو. یا تم نے یوسف کے خلاف سازش کی ہے. بلکہ کہا. تمہارے جی نے تمہارے لیے ایک بات بنادی ہے، اور اسے تمہارے خیال میں خوشنما دکھا دیا ہے. کیونکہ "تسویل" کے معنی یہ ہیں کہ کسی بات کا جما دینا، خوشنما بنا کر دکھا دینا، اور اس کے لیے طمع و خواہش کا پیدا ہو جانا. پس گویا یہ ایک ہمدرد دل کا تاسف تھا کہ افسوس، تم نفس کے دام میں پھنس گئے، اور اُس کے دھوکے سے بچ نہ سکے. پھر ساتھ ہی اُن کے اس طرز عمل کے لیے معذرت کے پہلو کا بھی اعتراف ہے کہ طمع نفس میں اگر ایسا کر بیٹھے ہو، اور انسان نفس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے!

ایک ایسے صدمۂ جانکاہ میں جیسا کہ حضرت یعقوب کو ناگہاں پہنچا تھا، اور کسی طرح کی بات کا زبان پر نہ آنا صرف اسی جملہ کا نکلنا، صبر کا کیسا عظیم الشان مظاہرہ ہے! یہ ممکن ہے کہ صدمہ کے فوری تاثر کے بعد ایک ضابط اور متحمل آدمی اپنے دل و زبان کی نگرانی کرلے، لیکن عین اُس وقت جب صدمہ کی پہلی چوٹ لگ رہی ہو اور دل کی بے تابیاں بے اختیار زبان کی طرف اُٹھنے لگی ہوں، ممکن نہیں کہ دل و زبان کی نگہداشت کی جا سکے. ضابط سے ضابط دل بھی اس عالم میں چیخ اُٹھتا ہے. مضبوط سے مضبوط طبیعتیں بھی بے اختیار متزلزل ہو جاتی ہیں. لیکن حضرت یعقوب کا مقام صبر ایسا نہ تھا جو کسی حال میں بھی متزلزل ہو سکے. اس عالم میں بھی زبان کھلتی ہے تو ایسا سنبھلا ہوا جملہ نکلتا ہے، گویا بے حالی و جانکاہی کا کوئی معاملہ پیش ہی نہیں آیا ہے!

یہی وہ صبر ہے جسے "صبر جمیل" فرمایا.

بظاہر خیال ہوتا ہے کہ تینوں باتیں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں. اگر صبر کامل ہے، تو پھر درد و غم کی شدتیں کیوں ہوں؟ اور اگر یقین موجود تھا، تو درد و غم کو محو ہو جانا چاہیے تھا. یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس مقام میں مشکلات محسوس کیں، اور طرح طرح کی توجیہوں کی جستجو میں نکلے. لیکن اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو معاملہ بالکل واضح ہے اور کسی ایسی توجیہ کی ضرورت نہیں جو بہ تکلف پیدا کی جائے. ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب

کا مقام صبر کا مقام تھا، اور صبر جبھی صبر ہو سکتا ہے، جب بے صبری کے اسباب موجود ہوں اور زیادہ سے زیادہ موجود ہوں۔ اگر درد و غم کی ٹیس نہیں اٹھ رہی ہے، تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ جھیلنے اور اُف نہ کرنے کی حالت موجود ہے؟ جھیلنا تو اسی کا جھیلنا ہوگا جو برابر آگ کی جلن محسوس کر رہا ہو، لیکن پھر بھی زبان سے اُف نہ نکالے۔ اگر حضرت یعقوب کا درد و غم اس طرح محو ہو جاتا کہ اس کی جلن باقی ہی نہ رہتی، یا رہتی تو بہت دبی دبائی رہتی، تو یہ مقام صبر کا مقام نہ ہوتا۔ ہو جاتا غم سے متاثر نہ ہونے کا مقام ہوتا۔ اور ایسی حالت یا تو فرشتوں کی سی مخلوق کی ہو سکتی ہے، یا ایسے انسان کی جس کے احساسات معطل ہو چکے ہیں۔ لیکن حضرت یعقوب انسان تھے۔ فرشتہ نہ تھے، اور اسی حیثیت سے قرآن نے انکا اُسوۂ حسنہ پیش کیا ہے۔ اُن کی روح صبر و یقین سے معمور تھی۔ وہ یوسف کے خواب میں اُس کا مستقبل دیکھ چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کسی نہ کسی دن یہ جُدائی ختم ہونے والی ہے۔ تاہم دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ جن کی جدائی ایک گھڑی کے لیے شاق تھی، وہ برسوں کے لیے ان سے جُدا ہو گیا تھا۔ یہ جانتے پر بھی کہ وہ زندہ و سلامت موجود ہے، اُس کے فراق کا زخم بھر نہیں سکتا تھا۔ بلکہ اس بات کے تصور نے کہ وہ زندہ موجود ہے مگر مجھ سے دور ہے، دردِ فراق کی چبھن اور زیادہ کر دی تھی:

بلائے ہجر دارد انتظارِ پیر کنعانی ٭ کسی داند کہ چوں یوسف عزیزے درسفر دارد!

فی الحقیقت اس صورتِ حال کی ساری عظمت اسی میں ہے کہ یہ ایک ماوراء انسانیت سیرت نمودار نہیں کرتی، بلکہ ایسی حالتوں میں ایک کامل صابر و مومن کی زندگی کی جو تصویر ہو سکتی ہے، وہ سامنے آ گئی ہے۔ دل آتشِ فراق میں پھنکا جا رہا ہے اور ہزار کوشش کی جائے لیکن یہ آگ اس طرح بجھنے والی نہیں۔ لیکن ساتھ ہی روحِ ایمان و یقین سے معمور ہے، اور دماغ صبرِ جمیل کا عزم کر چکا ہے۔ پس غم کو دیکھا جائے تو وہ اپنی جگہ ہے۔ صبر و یقین کو دیکھا جائے تو وہ اپنی جگہ ہے۔ اگر دل اپنی بے قراریوں میں کبھی کمی نہیں کرتا، تو دماغ بھی اپنے شیوۂ صبر و رضا میں کبھی متزلزل نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل کی بے تابیاں حد سے گزر جاتی ہیں اور "یا اسفیٰ علیٰ یوسف" بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی نکلتا ہے تو کس کے آگے نکلتا ہے؟ اُس کے آگے جس کے آگے اپنا درد و غم پیش نہ کیجیے، تو یہ بھی شانِ عبودیت کے خلاف ہے! انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ، واعلم من اللہ ما لا تعلمون! (۸۶)

مکن تغافل ازیں بیشتر کہ می ترسم ٭ گماں برند کہ ایں بندہ بے خداوند ست!

یوسف علیہ السلام

پھر حضرت یعقوب کے بعد حضرت یوسف (علیہما السلام) کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے، اور یہی سرگزشت کی اصلی شخصیت ہے۔ یہاں پہنچتے ہی ایک خاص حقیقت کی جلوہ نمائی شروع ہو جاتی ہے، اور جس جس رُخ سے دیکھیے، اور جہاں کہیں دیکھیے، اسی کی نمود سامنے آتی رہتی ہے۔ یعنی انسان کی سیرت (کیریکٹر) کی فضیلت، اور اس فضیلت کی اٹل کامرانیاں۔ ان کی سیرت کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اُس کی سیرت کی فضیلت ہے، اور اگر یہ فضیلت موجود ہو، تو پھر اُس کے لیے فتح و کامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں، جب بھی وہ اپنی راہ نکال لیگا۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اُس کی راہ میں حائل ہو جائیں، جب بھی اُس کی رفتار نہیں رُکیگی۔ حوادث و وقائع اُس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال و ظروف اُس پر غالب نہیں آ سکتے۔ افراد و جماعات کی کوششیں اسے مسخر نہیں کر سکتیں۔ اُس کے لیے ہر حال میں کامرانی ہے۔ اُس کے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔ اس کے لیے ہر طاقت پر فرماں روائی ہے۔ وہ اعمال و نتائج کی اس امتحان گاہ میں صرف اسی لیے ہے کہ سربلند ہو۔ عجز و درماندگی کی آلودگی کبھی اُسے چھو نہیں سکتی!

سترہ برس کا ایک کم سن لڑکا باپ کی آغوشِ محبت سے جبراً چھین لیا جاتا ہے، اور اچانک اپنے آپ کو کن لوگوں میں پاتا ہے؟ اُن میں، جو چند سکوں کے بدلے اُسے غلام بنا کر بیچ رہے ہیں۔ دنیا کی ایک لاکھ انسانی طبیعتیں ایسی حالت

میں کیا کریں؟ مگر غور کرو، اُس نے کیا کیا؟ اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ایک تجربہ کار دانشمند کی طرح اُس نے صورت حال کا پورا جائزہ لے لیا ہو، اور پھر فیصلہ کر لیا ہو کہ جو حالت بھی پیش آجائے، اُسے صبر و سکون کے ساتھ جھیل لینا چاہیے، اور اُسی کے مطابق کام کیے جانا چاہیے۔ قافلہ والوں نے اُنہیں غلام کی حیثیت میں پیش کیا۔ وہ ایک غلام کی طرح پیش ہوگئے۔ عزیزِ مصر نے غلام کی طرح خرید کیا۔ اُنہوں نے غلام کی طرح اُس کی خدمت شروع کر دی، اور اُس کے ساتھ اُسی طرح پیش آئے جس طرح ایک طاعت شعار اور وفادار غلام کو اپنے آقا کے ساتھ پیش آنا چاہیے کہیں سے بھی کوئی ایسی بات مترشح نہیں ہوتی کہ ایسا کرنے میں اُنہیں کوئی تامل ہوا ہو۔ گویا یہ ناگہانی مصیبت جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے پوری زندگی کی سوگواری بن جاتی، ان کے لیے کوئی مصیبت ہی نہ تھی۔ باپ کے آغوشِ محبت سے نکل کر اچانک ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی کا غلام بن جانا، اُن کے لیے ایسی ہی بات ہوئی جیسے اپنی مرضی سے زندگی کا ایک گوشہ چھوڑ کر دوسرا گوشہ اختیار کر لینا۔ نہ پچھلی حالت کا ماتم ہے، نہ موجودہ حالت سے جھجک۔ نہ گذشتہ کی یاد میں سوگواری ہوئی۔ نہ آئندہ کے اندیشہ میں بدحالی۔ اُس عازم اور بے پروا ملاح کی طرح، جسے نہ تو کنارہ چھوٹنے کا غم ستاتا ہے، نہ آنے والے طوفان کا اندیشہ، اُس نے اپنی کشتی چلانی شروع کر دی، اور دیکھو، بالآخر ساحلِ مقصود تک پہنچ کر رہی۔ حوادث و انقلاب کے ترکش میں اس سے بڑھ کر اور کون تیر ہو سکتا ہے جو اُس پر چلایا گیا تھا! لیکن اس کے صبر و عزم نے اسے پرکاہ کے برابر بھی نہ سمجھا، اور اس طرح بے داغ نکل گیا، گویا گردشِ حوادث کا ہاتھ اُس کے خلاف اُٹھا ہی نہ تھا!

چیں بر جبیں ز جنبشِ ہر خس نمی رسد ۔ دریا دلاں چو موج گہر آرمیدہ اند!

غور کرو۔ ہر اُس انسان کے لیے جو دنیا کی مصیبتوں اور ناموافقتوں میں اپنی راہ نکالنی چاہتا ہو، اس معاملہ میں کیسی عظیم الشان عبرت ہے! اگر حضرت یوسف نے مصائبِ دہر کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم، اعتمادِ نفس، اور توکل علی اللہ کی یہ روحِ عظیم اپنے اندر نہ پیدا کر لی ہوتی، تو کیا ممکن تھا کہ اُس منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے جو بالآخر اُن کی منزلِ مقصود ثابت ہوئی؟

پھر دیکھو۔ زمانہ کی گردشیں کس طرح آزمائشوں پر آزمائشیں پیدا کرتی رہیں، اور ان کی غیر متزلزل اور بے داغ سیرت کس طرح فتح مندیوں پر فتح مندیاں حاصل کرتی گئی؟

سب سے پہلے عزیزِ مصر کے ساتھ ان کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ اُس نے بہ حیثیت غلام کے اُنہیں خرید کیا تھا، اور مصر کے آثار و نقوش ہمیں بتلا رہے ہیں کہ مصریوں کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیسا ہوا کرتا تھا۔ وہ غلاموں کے لیے اُتنے ہی سنگدل تھے جتنی سنگدل دنیا کی تمام پرانی قومیں رہ چکی ہیں۔ تاہم اُنہوں نے تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اپنے حسنِ سیرت سے اُس کا دل ایسا مسخر کر لیا کہ غلامی کی جگہ آقائی کرنے لگے، اور اُس نے اپنی بیوی سے کہا اکرمی مثوٰىه عسىٰ ان ینفعنا او نتخذه ولدا (۲۱)

غور کرو۔ یہ انقلابِ حال کیونکر پیدا ہوا ہوگا؟ وہ کیسی وفاداری و دیانت اور راست بازی و امانت شعاری ہوگی جس نے ایک مصری امیر کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ ایک عبرانی غلام کو اپنے فرزند کی طرح چاہنے لگا، اور اپنے تمام گھر بار اور علاقہ کا مختارِ کل بنا دیا؟

پھر امرأۃ العزیز کا معاملہ رونما ہوتا ہے۔ پچھلی آزمائش ذہن و دماغ کی آزمائش تھی۔ یہ جذبات کی تھی، اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ وہ سمندر کی موجوں سے ہراساں نہیں ہوتا، پہاڑ کی چٹانوں سے نہیں گھبراتا، آسمان کی بجلیوں سے نہیں لرزتا، درندوں کے مقابلہ سے مُنہ نہیں موڑتا۔ تلواروں کے سایے میں کھیلنے لگتا ہے، لیکن نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنیٰ سی کشش کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن حضرت یوسف کی سیرت کی چٹان یہاں بھی متزلزل نہ ہو سکی۔ اُن کی بے داغ فضیلت پر نفسِ انسانی کا سیاہ سے سیاہ ہاتھ بھی دھبہ نہ لگا سکا۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے چند لفظوں کے اندر صورت حال کی پوری تصویر کھینچ دی ہے، اور اگر اُن اشاروں کو تشریح و بیان کا پیرا جامہ پہنایا جائے تو کئی صفحوں کی داستان بن جائے۔ تم چشم تصور سے کام لو، اور دیکھو ترغیبات کی قہرِ سلطانی کا کیا عالم تھا، اور عیش نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں اور صبر رُبا حالتوں کے ساتھ پیش آئی تھی! عمر عین عروج شباب کی عمر، اور معاملہ محبت کا نہیں محبوبیت کا، طلب کا نہیں مطلوبیت کا پھر طلب بھی ہوئی تو کیسی طلب؟ دیوانگی کی طلب اور دل باختگی کا تعاقب۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ موانع بکلی مرتفع ہوگئے۔ کوئی انسانی آنکھ دیکھنے والی نہیں۔ کوئی پردۂ حجاب حائل ہونے والا نہیں۔ کون ہے جو ایسی حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے؟ عفت و پاکی کا کونسا پہاڑ ہے جو ان بجلیوں کی تاب لاسکتا ہے؟ لیکن ایک پہاڑ تھا جسے یہ بجلیاں بھی جنبش میں نہ لاسکیں۔ یہ حضرت یوسف کی سیرت تھی جو کسی حال میں بھی متزلزل نہیں ہوسکتی تھی۔ خود امراۃ العزیز کے لفظوں میں (اور اس سے بڑھ کر اس معاملہ کا کون شاہد ہوسکتا ہے) انا راودتہ عن نفسہ فاستعصم (۳۲) وہ اس حال میں بھی اپنی جگہ سے بے جگہ نہ ہوا۔ اس کو عصمت کے لیے ذرا سی بھی جنبش نہ تھی!

پھر دیکھو۔ امراۃ العزیز کی دعوت عیش کے جواب میں جو کچھ ان کی زبان سے نکلا، وہ کیا تھا؟ معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای (۲۳) تیرا شوہر میرا آقا ہے۔ اُس نے مجھ پر اعتماد کیا۔ عزت و احترام کے ساتھ رکھا۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اُس کے حسن سلوک کا بدلہ میں یہ دوں کہ اُس کی امانت میں خیانت کرنے لگوں؟ غور کرو۔ یہ بُرائی ایسی بُرائی تھی کہ اسے بُرائی دکھلانے کے لیے کتنی ہی باتیں کی جاسکتی تھیں، لیکن اُن کا ذہن اسی بات کی طرف گیا، اور اسی کو قرآن نے بھی نمایاں کرکے دکھلایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انکی سیرت کا اصلی جوہر ہمیں ڈھونڈھنا چاہیے۔ امانت داری، راست بازی اور ادائے فرض کی روح اس طرح اُن پر چھائی ہوئی تھی کہ ہر موقعہ پر سب سے پہلے وہی سامنے آتی تھی۔

پھر اس کے بعد تُہمات کا معاملہ پیش آتا ہے۔ اب صرف ایک امراۃ العزیز ہی کا فتنہ نہ تھا۔ دارالحکومت مصر کے تمام فتنہ گرانِ حسن جمع ہوگئے تھے کہ ان کی متاع ضبط و تحمل کی غارتگریوں میں حصہ لیں:

دلے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند!

مگر یہاں بھی کیا نتیجہ نکلا؟ قلن حاش للہ! ماھذا بشرا۔ ان ھذا الا ملک کریم! (۳۱)

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں :: جسے غرور ہو، آئے، کرے شکار مجھے!

پھر دیکھو۔ راست بازی و حق پرستی کی آزمائش نے اچانک کیسی صورت اختیار کرلی؟ دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے بھگتنی پڑتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو نہیں روک سکتے، لیکن اب حضرتِ یوسف کے سامنے قید کی سزا اس لیے لائی جارہی ہے کہ جرم و معصیت سے کیوں اپنے آپ کو روک رہے ہیں! لوگوں کو قید و بند کی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے کہ عیش حیات ڈھونڈھتے ہیں، اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف کو اس لیے قید خانے کی دھمکی دی جارہی ہے کہ عیش حیات نے اپنی ساری دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ انہیں دعوت دی اور انہوں نے اس سے مُنہ موڑ لیا!

یہ حضرت یوسف کی سیرت کا سب سے زیادہ عظیم مظاہرہ ہے۔ یہ عشق حق کا نمونہ ہے۔ یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب ان کے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں: زندگی کا عیش مگر معصیتِ حق کی راہ میں۔ زندگی کے شدائد مگر راست بازی کی راہ میں۔ تو ان کا فیصلہ قطعی اور بغیر کسی تامل کے یہ تھا کہ السجن احب الی مما یدعوننی الیہ (۳۳) قید خانہ مجھے محبوب ہے مگر وہ بات نہیں جس کی مجھے دعوت دی جارہی ہے!

ہمارے مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت یوسف کی بدشگونی تھی کہ خود قید خانہ کی بات بول اُٹھے۔ اگر جلدی میں آکر ایسا نہ کہہ دیتے تو یہ ابتلا پیش نہ آتی۔ افسوس کس درجہ حقیقت فراموشی ہے! حضرت یوسف کی جو بات اُنکی پاکی و عظمت کا سب سے بڑا جوہر تھی، وہی ان حقیقت ناآشناؤں کی نظروں میں ان کی لغزش ہوگئی۔ گویا حضرت یوسف کا قید خانہ کو معصیت پر ترجیح دینا، اور اُسے خوشی خوشی اختیار کرلینا، کوئی ایسی بات تھی جو نہ ہونی چاہیے تھی، اور صرف اس لیے ہوگئی

کہ حضرت یوسف نے بدشگونی کی بات کہدی تھی! غور کرو، قرآن کہاں ہے اور اس کے شارح کہاں پہنچ گئے ہیں!

نزلوا بمكة في قبائل هاشم ٭ ونزلت بالبيداء ابعد منزل!

پھر دیکھو حضرت یوسف کی یہی سیرت ہے جو قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری کو بھی اسی طرح روشن کر دیتی ہے جس طرح عزیز مصر کے ایوان عزت و اقبال کو اس نے روشن کر دیا تھا، کیونکہ چراغ جہاں کہیں بھی رکھ دیا جائے روشنی ہی دیگا، اور ہیرے کی چمک اس سے کم نہیں ہو جائیگی کہ جواہر خانۂ شاہی میں رہنے کی جگہ کوڑے کرکٹ میں ڈال دیا گیا۔ تورات کی تصریح پڑھ چکے ہو کہ قید خانہ کا افسر ان کا معتقد ہو گیا تھا، اور قید خانہ میں انہی کی افسری قائم ہو گئی تھی۔

پھر دیکھو عین قید خانہ کی زندگی میں دعوت حق کا داعیہ ان کے قلب مبارک میں اٹھتا ہے۔ اس وقت تک انہوں نے مصر میں دین حق کی تبلیغ نہیں کی تھی اگرچہ خود اسی پر قائم تھے لیکن اب وقت آگیا تھا کہ خاندانی نبوت کا ان میں ظہور ہو۔ چنانچہ یہی کا نتیجہ ہے کہ اب یکایک اپنے قلب کو ولولۂ تبلیغ سے معمور پایا۔ لیکن یہاں کون تھا جو اس تبلیغ کا مخاطب ہوتا؟ صرف قید خانہ کے چند ساتھی تھے جو طرح طرح کے جرموں کی پاداش میں یہاں پہنچا دیے گئے تھے۔ مگر غور کرو انہوں نے رہائی کا انتظار نہیں کیا۔ انہی قیدیوں میں تبلیغ حق شروع کر دی، اور اب مصر کا قید خانہ دعوتِ حق کی تعلیم و تربیت کی ایک درس گاہ بن گیا!

پھر دیکھو۔ تبلیغِ حق کے جوش و طلب کا کیا حال ہے! دو نئے قیدی آتے ہیں جو بادشاہ کے خاص پیش خدمتوں میں سے تھے۔ اور اپنا اپنا خواب بیان کرتے ہیں۔ خواب سن کر حضرت یوسف معلوم کر لیتے ہیں کہ ایک کی رہائی قریب ہے، دوسرے کی موت قریب ہے۔ پس چاہتے ہیں کہ فرصت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں، اور تعلیم حق سے انہیں آشنا کر دیں۔ ممکن ہے کہ جو رہا ہونے والا ہے وہ حق کا بیج اپنے ساتھ لیجائے اور دربار شاہی میں تخم ریزی کر سکے۔ جس کی موت قریب ہے، ممکن ہے کہ سچائی قبول کر لے اور دنیا سے جاتے تو راہ حق پر جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، انہوں نے خواب سنتے ہی اس کی تعبیر نہیں بتلا دی، بلکہ ان کی توجہ و رجوع سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرا ہی بیان شروع کر دیا: انی ترکت ملة قوم لا یومنون باللہ وھم بالاخرة ھم کافرون (۳۷)

ان کی سیرت کے اس مقام سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ دعوتِ حق کا فریضہ کیونکر ادا کرنا چاہیے اور داعی حق کے جوش و طلبِ دعوت کا کیا حال ہوتا ہے؟ قید خانے کی زندگی بھی اداء فرض دعوت سے مانع نہ ہوئی۔ اس حالت میں بھی فکر اس کی نہ تھی کہ میں کیونکر قید سے رہائی پاؤں۔ بلکہ تمام تر اس کی تھی کہ خدا کے بندے جہل و گمراہی سے کیونکر نجات پائیں؟ مہلت جب کبھی ملی اور جس حال میں ملی، معاً اسی مقصد کے لیے کام میں لائی گئی، اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی مدتوں زندہ رہنے والا تھا، اسی طرح اس کی ہدایت کے لیے بھی صبر نہ کر سکے جس کے سر پر اجل کی تلوار لٹک رہی تھی۔ کیونکہ ہدایت پانا ہر انسان کا قدرتی حق ہے، اور زندہ رہنے والا ہو یا مر رہا ہو، اسے اس کا حق فوراً ملنا چاہیے!

پھر دیکھو۔ معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک پہنچا سکتے ہیں، پہنچا دیں۔ جونہی یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے اور پھر اسی منصب پر مامور ہونے والا ہے، معاً ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ ایسے آدمی کو جو خلوت و جلوت میں بادشاہ کے حضور رہنے والا ہے، کتنا اچھا موقعہ حاصل ہوگا کہ پیام حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے! چنانچہ تعبیر بیان کرنے کے بعد اس سے فرمایا: اذکرنی عند ربك (۴۲) اپنے آقا کے پاس جائیو تو مجھے یاد رکھیو۔ یعنے میری یہ تعلیم و دعوت یاد رکھیو اور اپنے آقا سے بعنوانِ مناسب اس کا تذکرہ کر دیجیو۔ ممکن ہے کہ پیامِ حق کام کر جائے۔

عام طور پر حضرت یوسف کے اس قول کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی رہائی کے لیے کہا تھا یعنے اپنے آقا سے میری سفارش کیجیو۔ لیکن جس محل میں یہ بات کہی گئی ہے، اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ قیدیوں سے جو کچھ بھی ان کی گفتگو ہوئی ہے، یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کے بارے میں ہے۔ اس کا کوئی اشارہ نہیں

بیاجاتاکہ اُنھوں نے اپنے قیدومحن کے مصائب کا کوئی ذکر کیا ہو۔ پس اس بات کا وہی مطلب موزوں معلوم ہوتاہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ قیدیوں کا خواب سُن کر آپ نے تعبیر فوراً کیوں بیان نہیں کردی تھی؟ مفسرین کہتے ہیں بہ غرض اس لیے کی کہ وحی کا انتظار تھا، لیکن اگر آپ انتظار کی حالت میں ہوتے تو اس وثوق کے ساتھ کیونکر وعدہ کرلیتے کہ لا یاتیکما طعام ترزقانہ۔ الا نبأتکما بتاویلہ (۳۷) اور فیضان وحی سے تو آپ کا قلب معمور ہورہا تھا، تعبیر کے لیے انتظار کرنے کی کیوں ضرورت پیش آتی؟ صاف بات یہی ہے کہ تاخیر قصداً کی تھی، اور اس خیال سے کی تھی کہ تعبیر کی احتیاج نے ان دونوں کو میری طرف متوجہ کردیا ہے۔ چاہیے کہ اس توجہ سے فوراً فائدہ اٹھایا جائے اور دینِ حق کی دعوت چھیڑدی جائے۔ چنانچہ اس کا ذکر اس مناسبت سے شروع کردیا کہ: ذلکما مما علمنی ربی۔ انی ترکت ملۃ قوم لا یؤمنون باللہ وھم بالاخرۃ ھم کافرون (۳۷) یعنے خواب کی تعبیر میں بہت جلد بتلا دوں گا۔ کیونکہ میرے پروردگار نے مجھے اس کا علم دیا ہے لیکن میرے علم کو اس طرح کا علم نہ سمجھنا جس طرح پُر کاہنوں اور جادوگروں کا سمجھا کرتے ہو۔ میری راہ دوسری ہے۔ میں تمھارے طریقہ پر کاربند نہیں۔ پھر اس طرح بات میں سے بات نکالتے ہوئے دینِ حق کی دعوت شروع کردی کہ یاصاحبی السجن! ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار؟ (۳۹)

پھر دیکھو اس سیرت کی فضیلت کا کیسا عجیب منظر سامنے آجاتاہے جب بادشاہِ مصر خواب دیکھتاہے، اور سردار ساقی آکر یہ معاملہ اُنھیں سُناتاہے۔ دنیا کا ہر انسان ایسے موقعہ پر کیا کرتا؟ دنیا کا ہر وہ قیدی کیا کرتا جسے بغیر کسی جرم و گناہ کے قید خانے میں ڈال دیا گیا ہو اور سالہا سال سے اس حالت میں بے یار و مددگار پڑا ہو؟ یقیناً اسے تائید غیبی سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا، اور کہتا: میں یہ مشکل حل کردے سکتا ہوں۔ مجھے یہاں سے نکلنے اور بادشاہ کے حضور حاضر ہونے کا موقعہ دیا جائے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں، حضرت یوسف کی جانب سے کوئی اس طرح کی خواہش ظاہر نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے خواب سُنتے ہی اُس کی تعبیر بیان کردی۔ اس کا خیال بھی اُنھیں نہیں گزرا کہ اپنی مطلب براری کی یہ نہایت قیمتی بات تھوڑی دیر کے لیے بھی روک لوں۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ جتنی بات پوچھی گئی تھی، بتلادی، بلکہ اُس سے بھی زیادہ علم و فضل کی بخشش سائل کے دامن میں ڈال دی۔ یعنے خواب میں ایک آنے والی ہولناکی کی خبر دی گئی تھی۔ اُنھوں نے تعبیر کے ساتھ یہ بھی بتلادیا کہ اس ہولناک مصیبت سے بچنے کی سبیل کیا ہوسکتی ہے۔ سوال بادشاہ کی طرف سے تھا، لیکن دیکھو، جس نے جواب دیا، وہ قیدخانہ کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا، اپنے علم و فضیلت کی بخشش میں بادشاہوں سے بھی زیادہ فیاض تھا:

گدیم بہت ساقی ست فطرتِ عرفی بہ کہ حاتم دگران و گدائے خویشتن ست!

حضرت یوسف نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ دنیا نے اُن کے ساتھ کچھ ہی کیا ہو، وہ دنیا کی خدمت و ہدایت کے سوا اور کوئی شے اپنے سامنے نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب اُنھوں نے خواب سُنا، اور خواب کا حل اُن کے علم و بصیرت نے معلوم کرلیا تھا، تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی علم و ہدایت کا فیضان انسانوں پر نہیں روک سکتے تھے۔ اُن کا فرض تھا کہ جب کبھی طلب اعانت کا ہاتھ اُن کے آگے بڑھے، وہ اُس کی دستگیری کریں۔ اور اُنھوں نے دستگیری کی۔ اگر نہ کرتے تو داعیِ حق نہ ہوتے۔ اُن کا بے لوث جذبۂ خدمت اس خود غرضانہ مطلب براری کا تحمل نہیں ہوسکتا تھا کہ ایک انسان کی مشکل اور احتیاج کو اپنی رہائی کا ذریعہ بنائیں۔

پھر جب بادشاہ ملاقات کا مشتاق ہوا اور اپنا پیام بھیجا، تو چاہیے تھا کہ جوشِ مسرت سے اس پیام کا استقبال کرتے کیونکہ اب خود بخود رہائی سامنے آگئی تھی، اور ایسی حالت میں آئی تھی کہ بادشاہ وقت مشتاقِ زیارت ہورہا تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف کی نگاہوں میں معاملہ نے دوسری ہی شکل اختیار کی۔ اُنھوں نے قید خانہ چھوڑنے اور بادشاہ کی ملاقات سے انکار کردیا، اور کہلایا کہ پہلے میرے معاملہ کی تحقیقات کرلی جائے۔

اب یہاں پھر بے اختیار یہی سوال سامنے آجاتا ہے کہ دنیا کا ہر مظلوم قیدی ایسی حالت میں کیا کرتا اور اس پیکر صدق و صفا نے کیا کیا؟ غور کرو، اُن کی سیرت کیسے جوہروں سے گوندھی گئی تھی، اور کس طرح صبر و ضبط کی عدیم النظیر قوتوں کے ساتھ خودداری اور عزت نفس کی روح اس کے ایک ایک ذرہ میں رچی ہوئی تھی! حضرت یوسف کے اس انکار و استغنا میں اُن کی اخلاقی ذہنیت کی ایک پوری دنیا پوشیدہ ہے۔ گویا وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ قید سے رہائی ملا چاہیے ایک خوشخبری ہے، لیکن ایسی رہائی مجھے کیا خوش کر سکتی ہے جو میری بے جرمی کی وجہ سے ظہور میں نہ آرہی ہو، بلکہ محض بادشاہ کا ایک عطیہ اور بخشش ہو! میں تھا تو مجرم، لیکن چونکہ بادشاہ نے خواب دیکھا، کسی سے تعبیر بن نہ آئی، میں نے بتلا دی، اس لیے خوش ہو کر بادشاہ نے رہا کر دیا۔ پس یہ بادشاہ کا احسان ہوا، حق و انصاف کا فیصلہ نہ ہوا۔ نہیں، میں اپنی رہائی بطور ایک احسان کے قبول نہیں کر سکتا۔ اگر میں مجرم ہوں تو سزا کا سزاوار ہوں۔ کیوں مجھے کوئی بخشے؟ اگر مجرم نہیں ہوں، تو میری بے جرمی کا اعتراف کرنا چاہیے، اور اس لیے رہا کرنا چاہیے کہ سزا کا مستحق نہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ کسی نے بخش دیا۔

عزتِ نفس اور استقامتِ حق کا کیسا بلند مقام ہے! اور اخلاقی سیرت کی کیسی عجیب مضبوطی ہے۔ جس میں کہیں سے بھی کوئی جھکک پڑتی دکھائی نہیں دیتی! جس رُخ سے دیکھو اور جہاں کہیں دیکھو، اُس کی بے داغ خصوصیتیں یکساں طور پر نمایاں ہیں، اور اس سورج کی روشنی کبھی مدھم نہیں پڑ سکتی!

کانہٗ علم فی راسہ نار!

فی الحقیقت جمالِ یوسف کی یہی رعنائیاں تھیں جنہوں نے ایک ہی نظارہ میں بادشاہ کا دل مسخر کر لیا تھا، انک الیوم لدینا مکین امین! (۵۴)

پھر سب سے آخر اس موقعہ کا مطالعہ کرو جب حضرت یوسف کے بھائی اُن کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ کون بھائی؟ جنہوں نے قتل کا سامان کیا اور پھر غلام بنا کر اجنبیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ کس کے سامنے؟ اُسی مظلوم کے سامنے جو آج مظلوم نہیں ہے بلکہ وقت کی سب سے بڑی مملکت کا مالک اور قحط سالی کی سب سے بڑی مصیبت میں سامان زندگی کا بخشنے والا ہے۔ کیسا عجیب موقعہ تھا، اور نفسِ انسانی کے لیے ولولۂ انتقام کی کیسی صبر آزما آزمائش! تاہم غور کرو، اوّل سے لیکر آخر تک حضرت یوسف کا طریقِ عمل کیسا رہا ہے! کہیں بھی کوئی بات ایسی دکھائی دیتی ہے کہ کہہ سکو، بغض و انتقام کے جذبہ کی کوئی ہلکی سی بھی پرچھائیں پڑ رہی ہے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ تو ان کے لیے سرتاپا شفقت و رحمت ہو گئے تھے۔ انتقام و سرزنش کا کیا ذکر ہے۔ اُن کی زبان سے تو ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا جس سے بھائیوں کے دلوں کو ذرا سی بھی ٹھیس لگتی۔ صاف نظر آرہا ہے کہ اُن کی شرمندگی و پشیمانی کا زخم اُن سے کہیں زیادہ خود ان کے دل پر لگ رہا ہے، اور اب فکر ہے تو اس بات کی کہ کس طرح اُن کے دلوں کے لیے تسکینِ خاطر کے سامان پیدا کر دیں!

جب تیسری مرتبہ بھائی آئے اور اپنی مصیبتوں کی داستان سُنائی: مسنا و اھلنا الضر، اور پھر دستِ سوال بڑھایا کہ تصدق علینا۔ ان اللہ یجزی المتصدقین! (۸۸) تو جوشِ محبت سے بیقرار ہو گئے۔ اُس وقت اُن کے سامنے اور کوئی بات نہ تھی۔ صرف یہ تھی کہ میرے بھائی فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ میں مسندِ عزت پر بیٹھا ہوں، اور وہ دریوزہ گروں کی طرح دستِ سوال دراز کیے ہوئے ہیں۔ بے اختیار اُن کا جی چاہا کہ اپنے آپ کو ظاہر کر دیں۔ ھل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیہ؟ تمہیں وہ بات بھی یاد ہے جو یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کی تھی؟ کہنے کو تو یہ کہہ گئے، اور یہ کہے بغیر چارہ بھی نہ تھا، کیونکہ یاد دلانا تھا کہ میں مصر کیونکر پہنچا، لیکن معاً خیال ہوا کہ اس معاملہ کی یاد ہی اُن کے لیے سرتاسر سرزنش و خجالت ہے اس لیے فوراً ایک ایسی بات بھی کہہ دی کہ اُن کے لیے ایک معذرت کا پہلو نکل آئے اور شرمندگی کا بوجھ محسوس نہ کریں، اذ انتم جاھلون (۸۹)، یہ اُس وقت کی بات ہے جب تمہاری نادانیوں کا زمانہ تھا۔ یعنے اس معاملہ پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ نادانیوں کے زمانے کی ایک بات ہے، اور دنیا میں کون ہے جس پر کوئی نہ کوئی زمانہ نادانیوں کا نہ گزرا ہو!

یہ سنتے ہی جب اُنہوں نے پہچان لیا اور عجز و ندامت کا سر جھکا کر بولے۔ تاللّٰہ لقد آثرك اللّٰہ علینا، وان کنا لخاطئین! (۹۱) تو بلا تامل جواب ملا: لا تثریب علیکم الیوم۔ یغفر اللّٰہ لکم وھو ارحم الراحمین: (۹۲) نہیں آج کا دن بچھڑے ہوؤں کے ملنے اور ٹوٹے ہوئے رشتوں کے جُڑنے کا دن ہے۔ ملامت و الزام کی باتوں کا یہاں گذر نہیں۔ میرا دل تو ہر طرح کی رنجشوں سے صاف ہے۔ باقی رہا خدا کا معاملہ، تو اس کے لیے بھی میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ وہ تمہارے سارے قصور بخش دے۔ اور وہ ضرور بخش دیگا، کیونکہ اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور کون ہے!

پھر آگے چل کر جب وقت آیا کہ اللہ کے فضل و کرم کا شکر ادا کرتے ہوئے گزرے ہوئے واقعات کی طرف اشارہ کریں، تو دیکھو، اس معاملہ کی طرف کیونکر اشارہ کرتے ہیں! من بعد ان نزغ الشیطان بینی و بین اخوتی (۱۰۰) جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا یعنے اول تو اس معاملہ کو شیطان کی طرف منسوب کر دیا کہ بھائیوں پر اس کا بوجھ نہ پڑے۔ گویا یہ شیطان کا ایک فتنہ تھا ورنہ میرے بھائی ایسا کیوں کرتے۔ پھر سارے معاملہ کو محض ایک طرح کے اختلاف سے تعبیر کیا تاکہ اصل واقعہ کی شناعت کم ہو جائے۔ پھر جتنا کچھ بھی ہونا ظاہر کیا، وہ اس طریقہ پر کیا کہ مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف پڑ گیا تھا" گویا یہ بھائیوں کا بلا وجہ جور و ستم نہ تھا۔ کوئی ایسی بات تھی جیسے بھائیوں میں باہم کرچپش آ جایا کرتی ہے، اور دونوں جانبوں کو اختلاف کے وجوہ میں دخل ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی ایک ہی جانب کا قصور تھا۔

غور کرو عفو و بخشش کا وہ کیسا مقام ہے، ہمت کا وہ کیسا علو ہے، ظرف کی وہ کیسی پہنائی ہے! خلق کی وہ کیسی عظمت ہے، جو دشمنی کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتی ہے! اور جس سیرت کا یہ حال ہو، اس کے لیے فضیلت کی اور کونسی بات باقی رہ گئی؟

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا   دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام   کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

مظلومی و بے چارگی کی حالت میں صبر کر لینا بلاشبہ ایک بڑائی ہے، لیکن طاقت و اختیار کی حالت میں بدلہ نہ لینا اور بخش دینا سب سے بڑی بڑائی ہے: ولمن صبر و غفر، ان ذلك لمن عزم الامور (۴۲:۴۳) اور اس سیرت کی عظمت میں دونوں مقام جمع ہو گئے۔ جب بیچارگی تھی، تو اُف تک نہ کی۔ جب طاقت ملی تو انتقام کا وہم و گمان بھی نہ گزرا۔ اور بلاشبہ یہ اس زندگی کا سب سے بڑا اُسوۂ حسنہ ہے!

سب کے آخر میں اُن کی دعا نمایاں ہوتی ہے، اور یہ فی الحقیقت ایک مرقع ہے جس میں ان کی سیرت کا ایک ایک خال و خط دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ عظمت و کامرانی کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی جو صدا اُن کے دل و دماغ سے نکل سکتی تھی وہ یہی تھی کہ فاطر السموٰت والارض: انت ولی فی الدنیا والاخرۃ۔ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین! (۱۰۱) یعنے زندگی کی ساری کامرانیوں کا آخری ماحصل جس کی طلب و آرزو سے کبھی دل خالی نہیں ہو سکتا، یہی ہے کہ اطاعتِ حق پر خاتمہ ہو، اور الحاق اُن کے ساتھ ہو جو تیرے صالح بندے ہیں!

امرأۃ العزیز

حضرت یوسف کے بعد سرگزشت کی نمایاں شخصیت امرأۃ العزیز کی شخصیت ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف کی مصری زندگی کے حوادث میں بڑا حصہ اسی کا ہے۔ اس شخصیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ عشق و ہوس کے مختلف مراتب یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئے ہیں، اور قرآن حکیم نے ایک عجیب اسلوب بلاغت کے ساتھ اُنہیں ہر جگہ ابھارا ہے اور ہر مرتبہ کی خصوصیت واضح کر دی ہے۔

سب سے پہلے وہ موقعہ سامنے آتا ہے جب اُس نے حضرت یوسف کو دعوت عیش دی اور ناکام رہی۔ ولقد ھمت بہ وھم بھا لولا ان رای برھان ربہ (۲۴) اور جب پردہ فاش ہو گیا اور شوہر سامنے کھڑا نظر آیا، تو اپنی ذلت و رسوائی برداشت نہ کر سکی۔ جھٹ اپنا جرم دوسرے کے سر ڈال دیا، اور پھر کس دوسرے کے سر؟ اسی

کے سر جس کی محبت و شیفتگی کی مدعی بنی تھی: قالت ماجزاء من اراد باھلك سوءا الا ان یسجن او عذاب الیم
(۲۵) اس سے معلوم ہوا کہ محبت میں ابھی کچی تھی۔ اور ہوس سے معاملہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ کیونکہ اگر محبت کامل ہوتی
تو محبت کی راہ میں ذلت و رسوائی سے نہ ڈرتی، اور خود اپنے محبوب کے سر جھوٹا الزام نہ لگاتی۔
لیکن پھر جب کچھ دن گزر گئے تو معلوم ہوتا ہے اس حالت نے دوسرا رنگ اختیار کیا۔ اب اس کو لائمات کے
سامنے تو اقرار محبت میں عار نہ آیا۔ لیکن دنیا کے آگے اشتہار نہ کر سکی: انا راودتہ عن نفسہ فاستعصم
(۳۲) ساتھ ہی محبت ابھی اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی کہ اپنے نفس کی کاجوئیوں پر محبوب کی مرضی کو ترجیح دیتی

قبول خاطر معشوق شرط دیدار است ؛ بہ حکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبی است!

اس لیے دھمکیاں دیکر رام کرنا چاہا: ولئن لم یفعل ما آمرہ لیسجنن ولیکونا من الصاغرین (۳۲)
لیکن پھر جب وہ وقت آیا کہ عشق کی خامیاں پختگی و کمال تک پہنچ گئیں، تو اب نہ تو ننگ و ناموس کی جھجک باقی رہی
تھی، نہ زور و طاقت سے کام نکالنے کا گھمنڈ۔ جونہی سنا کہ یوسف کے معاملہ کی پوچھ گچھ ہو رہی ہے، بے پردہ اور صریح اعلان
کر دیا: الان حصحص الحق۔ انا راودتہ عن نفسہ، وانہ لمن الصادقین! (۵۱)[1] وہ تو سرتاسر سچا ہے۔ جو کچھ بھی قصور
تھا، میرا تھا۔

ہاں، بانگ بلند ست ایں، پوشیدہ نمی گویم!

اب اقرار محبت میں نہ تو کسی طرح کا عار محسوس ہوتا تھا۔ نہ عشق کی ذلت و رسوائی ذلت و رسوائی رہی تھی۔ اب تو ہر بات جو
محبوب کی راہ میں پیش آئے، محبوب ہی کی طرح محبوب ہو گئی تھی:

اجد الملامۃ فی ھواك لذیذۃ ؛ حبا لذکراك، فیلمنی اللوم!

محبت کی خامی و پختگی کے یہ مراتب قدرتی ہیں، اور عام ہیں جب کبھی اور جہاں کہیں بھی آئیگی، ان تین حالتوں میں
سے کوئی حالت ضرور ہوگی؛

خام بودم، پختہ شدم، سوختم!

تاویل الاحادیث

(ل) حضرت یوسف کے حالات میں جابجا "تاویل الاحادیث" کا لفظ آیا ہے، اور اس طرح آیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے
یہ ایک علم تھا جو اللہ نے انہیں سکھا دیا تھا۔ پس معلوم ہونا چاہیے کہ اس علم سے مقصود کونسا علم ہے؟
عربی میں تاویل کے معنی کسی بات کے نتیجہ اور مآل کار کے ہیں، اور باتوں کے مطلب و مقصد پر بھی اس کا اطلاق
ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی آیت (۳۹) کے نوٹ میں اس کی تشریح گزر چکی ہے۔ "احادیث" یعنی باتیں۔ پس
تاویل الاحادیث کا مطلب یہ ہوا کہ باتوں کا مطلب و نتیجہ، اور مآل بوجھ لینے کا علم یعنے انسان میں علم و بصیرت
کی ایسی قوت کا پیدا ہو جانا کہ ہر بات کے مطلب اور مآل کا شناسا ہو جائے۔ معاملات کی تہہ تک پہنچ جانا، امور
و مہمات کے بھیدوں کا رمز شناس ہو جانا، ہر بات کی نبض پہچان لینی، ہر واقعہ کا مطلب پا لینا، کوئی بات کتنی ہی
الجھی ہوئی ہو، لیکن اس طرح سلجھا لینا کہ ساری باتوں کی کل ٹھیک بیٹھ جائے۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا ظہور کنعان کے صحرا میں ہوا تھا، اور ایک ایسے خاندان میں جو پشتہا پشت کے
صحرا کی بدویانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیدائش سے لیکر عنفوان شباب تک اسی عالم میں زندگی بسر ہوئی نہ تو
کسی طرح کی خارجی تعلیم و تربیت کا موقعہ ملا۔ نہ شہری زندگی کے رسم و راہ سے آشنا ہو سکے۔ جب شہری زندگی ہی سے
آشنا نہ تھے، تو ظاہر ہے، اجتماعی زندگی کی تمدنی خصوصیات سے کیونکر باخبر ہو سکتے تھے؟ ملکی معاملات اور انتظامی

[1] اس آیت کے بعد کی آیت ذلك لیعلم انی لم اخنہ بالغیب الخ اور وما ابرئ نفسی الخ امراۃ العزیز کے
قول کا بقیہ حصہ بھی ہو سکتا ہے، اور حضرت یوسف کا قول بھی ہو سکتا ہے۔ سیاق بیان پہلی بات کے حق میں ہے،
اور بعض وجوہ قرائن دوسری کے حق میں۔ عام طور پر مفسرین نے دوسری صورت اختیار کی ہے لیکن ہم نے پہلی کو ترجیح دی،
کیونکہ ظاہر سیاق یہی ہے۔

حمات کی تو اُن کے کانوں میں بھنک بھی نہ پڑی ہوگی۔

بسا اوقات خاندان کے موروثی اثرات خارجی اثرات سے بے نیاز کر دیتے ہیں، لیکن حضرت یوسف کا خاندانی ورثہ نبوت تھا، شہریاری و ملک داری نہ تھی۔ اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے توطن کنعان کے بعد سے تو شہری زندگی کا علاقہ بھی یک قلم مفقود ہو گیا تھا۔

بایں ہمہ جب گردشِ حوادث نے اُنہیں مصر جیسی متمدن سرزمین میں پہنچا دیا، تو وہ نہ صرف اس کے نظم و نسق کے لیے سب سے بہتر حکمراں ثابت ہوئے، بلکہ اُن کی کاردانی و حقائق فہمی نے مملکت کو اس کی سب سے بڑی ہولناک بربادی سے بچا لیا اور اُن کے فضل و کمال کے آگے سب نے سر جھکایا۔ خود بادشاہ وقت کو اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ ایک ایسے شخص میں جو ابھی چند سال ہوئے، صحرا کے ویرانوں سے نکل کر آیا تھا، یہ قوت علمی کیسے پیدا ہو گئی کہ تمام باتوں کا نبض شناس اور تمام معاملات و مہمات کی کل بٹھانے والا ہو گیا؟ یقیناً مبدأ فیاض کے کرشمۂ فیضان سے۔ لیکن اس کرشمۂ فیضان کا نام کیا ہے؟ "علم تاویل الاحادیث" کا سکھا دینا۔ اب جبکہ صناعی علوم کی تدوین اور فنی مصطلحات کی بنا، قوموں نے ہمیں طرح طرح کی تعبیرات سکھا دی ہیں، ہم اس طرح کے علم و بصیرت کے لیے بہت سے مصطلح الفاظ بولینگے۔ لیکن قرآن کی زبان صناعی مصطلحات کی زبان نہیں ہے۔ یہ علمی مصطلحات سے اُس وقت عربی زبان آشنا ہوئی تھی۔ اس نے اُن ساری باتوں کے لیے ایک ایسی ترکیب استعمال کی جو ادائے مطلب کا قدرتی اور سیدھا سادھا اسلوب ہو سکتا ہے۔ یعنی باتوں کے مطلب اور مآل پا لینے کا علم۔ تعلیم کی ساری کاوشیں، تربیت ذہنی کی ساری محنتیں، تجربہ و اختبار کی ساری کوششیں کس غرض سے ہوتی ہیں؟ اسی لیے کہ باتوں کا مطلب و مآل بوجھ لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ علم و دانش کا تمام تر حاصل و مقصود کیا ہے؟ یہی کہ باتوں کی کل بٹھانی آ جائے۔ جس مطلب کے لیے ہم نے بے شمار علمی اصطلاحیں بنالی ہیں، قرآن نے اسی کو بغیر کسی پیچ و خم کے اس طرح کہدیا، جو ادائے مطلب کا ایک صاف اور قدرتی طریقہ ہو سکتا ہے، اور یہ اس کی بلاغت کی معجزانہ خصوصیت ہے۔

چونکہ حضرت یوسف نے خواب کی تعبیریں بتلائی تھیں، اس لیے مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کر لینے کا علم تھا۔ بلاشبہ خواب کی بات بھی احادیث میں داخل ہے، اور اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ایک گوشہ اس کا یہ بھی تھا لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ براہ راست علم تعبیر منام پر اس کا اطلاق ہوا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کر لینا نبوت کے عام خصائص میں سے ہے اور ہر نبی وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خواب کی حقیقت معلوم کر لیتا ہے۔ خود حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کا خواب سنتے ہی حقیقت معلوم کر لی تھی اور حضرت انیال اور عزرا وغیرہما کی سرگزشتیں ہمیں معلوم ہیں۔ پس اگر یہی بات مقصود ہوتی، تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خصوصیت کے ساتھ تاویل الاحادیث کا ذکر کیا جاتا۔ یہ نبوت کے اعمال و خصائص میں سے تھی، اور جب نبوت کا مقام مل رہا تھا، تو لازمی طور پر اس طرح کی تمام باتوں کی قابلیت بھی مل رہی تھی لیکن حضرت یعقوب نے خواب سن کر کہا: وکذٰلك یجتبیك ربك ویعلمك من تاویل الاحادیث، ویتم نعمته علیك وعلی آل یعقوب كما اتمها علی ابویك من قبل (۶) یعنی اللہ تجھے برگزیدگی عطا فرمائیگا، تاویل الاحادیث کا علم سکھائیگا، اور جس طرح تیرے بزرگوں پر اپنی نعمتیں پوری کر چکا ہے، اسی طرح تجھ پر اور آل یعقوب پر بھی کریگا۔ اس بیان میں برگزیدگی سے مقصود امتیاز اور تفوق ہے اور اتمام نعمت سے مقصود نبوت ہے، پس تاویل الاحادیث کی تعلیم سے مقصود کوئی تیسری چیز ہونی چاہیے۔ اگر تعبیر خواب ہی کی بات ہوتی، تو وہ حصولِ نبوت کی بشارت میں آ گئی تھی، خصوصیت کے ساتھ الگ کر کر دکھائی جاتی۔

علاوہ بریں ایک نبی کے لیے تعبیر خواب کا ملکہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں کہ خصوصیت کے ساتھ اُسے اللہ کا ایک خاص عطیہ قرار دیا جاتا۔

پھر اگر اِن تینوں مقامات پر غور کیا جائے جہاں تاویل احادیث کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ حقیقت اور زیادہ

نمایاں ہو جاتی ہے لیکن اس کی تفصیل البیان میں ملیگی۔

عزیز مصر کا اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ

(۴) عزیز مصر کا اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ مفسرین کے لیے ایک حیرت انگیز معاملہ رہا ہے، اور بعض مجبور ہوئے ہیں کہ طرح طرح کی دور از کار توجیہیں کریں۔ وہ کہتے ہیں، اُس پر اپنی بیوی کی بد چلنی بالکل واضح ہو گئی تھی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ انہ من کیدکن، ان کیدکن عظیم (۲۸) لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں، اُس نے اس معاملہ کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دی کہ بیوی سے کہا: استغفری لذنبک۔ انک کنت من الخاطئین (۲۹) اور پھر اسی طرح مختار و آزاد چھوڑ دیا جس طرح پہلے تھی۔ چنانچہ شہر کی عورتوں کی دعوت، مجلس طرب کی آراستگی، اور حضرت یوسف کی طلبی، سب بعد کے واقعات ہیں۔ نیز اُس کا اختیار و تصرف اس سے ظاہر ہے کہ قید کرنے کی دھمکی دیتی ہے، اور اسے پورا کر کے دکھا دیتی ہے۔ گویا بیوی کی بد چلنی کوئی ایسی بات نہ تھی جو عزیز کو استغفری لذنبک کہنے سے زیادہ کسی سرزنش اور مخالفانہ اقدام پر آمادہ کرتی۔ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شریف اور معزز آدمی اس بارے میں اس قدر بے حس اور بے پروا واقع ہو!

لیکن اگر مفسرین کے سامنے اُس عہد کی مصری معاشرت کی تفصیلات ہوتیں، تو اس معاملہ پر انہیں ذرا بھی استعجاب نہ ہوتا۔ انھوں نے دو ڈھائی ہزار برس پیشتر کی مصری معاشرت اور اس کے اخلاقی احساسات کو اپنے وقتوں کی معاشرت و احساسات پر قیاس کیا، اور اسی کے مطابق توجیہات کے جالے تراشنے لگے۔

اس بارے میں ہمارے پاس معلومات حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں ایک براہ راست اُسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا بعد کے عہدوں سے۔ پہلا اثریات مصر (اجپٹیالوجی) سے ماخوذ ہے۔ دوسرا بعض یونانی تحریرات جو سنہ مسیحی سے کچھ عرصہ پیشتر لکھی گئی ہیں۔ اور یہ دونوں ذریعے اس بارے میں متفق ہیں کہ اُس عہد کی مصری معاشرت کی حالت ٹھیک ویسی ہی تھی جس کی تصویر اس موقعہ پر قرآن نے کھینچ دی ہے۔ یعنے امرا کے طبقہ کی معاشرتی اور ازدواجی حالت عامۃ الناس سے بالکل مختلف تھی۔ ان کی عورتیں اپنے اعمال و تصرف میں بالکل آزاد تھیں۔ مردوں کے دباؤ میں رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ازدواجی زندگی میں پلہ اُنہی کا بھاری رہتا۔ اخلاقی حیثیت سے معاملہ نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ عصمت و بے عصمتی کا معاملہ عملاً غیر اہم ہو گیا تھا۔ لوگ سب جانتے تھے، اور پھر اسے ناگزیر حالت سمجھ کر برداشت کر لیا کرتے تھے۔ گویا اس اعتبار سے، پندرہ سو سال قبل مسیح مصری سوسائٹی کا حال ٹھیک ویسا ہی تھا، جیسا ایک ہزار سال بعد رومۃ الکبریٰ کے دارالحکومت میں ہمیں دکھائی دیتا ہے، اور جس کا نمونہ خود جولیس سیزر کی بیویوں کی زندگی میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ انہیں شک و شبہ سے اس لیے بالاتر کہا گیا تھا کہ شک و شبہ کا سب سے بڑا محل اُنہی کی زندگی تھی! دراصل یونان اور روم کا تمدن اور بہت سی باتوں کی طرح اس بات میں بھی، بابل اور مصر ہی کے نقش قدم پر چلا تھا۔

مصر کی یہ حالت برابر رہی۔ امراۃ العزیز کے عہد سے لیکر کلیوپیٹرا تک، وہ صرف نسوانی حسن و جمال ہی میں نہیں، بلکہ ازدواجی زندگی کی بے باکیوں اور مطلق العنانیوں میں بھی شہرہ آفاق رہا۔

خود اس سرگزشت میں بھی اس کی اندرونی شہادت موجود ہے۔ عزیز پر جب معاملہ کھل گیا، تو جو بات اس کی زبان پر بے اختیار آ گئی، غور کرو وہ کیا تھی؟ انہ من کیدکن۔ ان کیدکن عظیم! (۲۸) ہاں معلوم ہو گیا یہ تم عورتوں کا چرتر ہے۔ تم لوگوں کے چرتر بڑے ہی چرتر ہوتے ہیں! اس سے معلوم ہو گیا کہ اُس وقت عورتوں کی نسبت سوسائٹی کے عام خیالات کیا تھے، اور کس طرح یہ بات دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی کہ مکر و فریب میں طاق ہیں۔ اُن کے فریب سے عہدہ برا ہونا آسان نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ اس موقعہ پر اس طرح کی بات بے اختیار عزیز کی زبان سے نکل جاتی۔ چرتر جو کچھ بھی کیا تھا اُس کی بیوی نے کیا تھا۔ تمام عورتوں نے نہیں کیا تھا۔ لیکن چونکہ وقت کی معاشرتی زندگی عام طور پر ایسی ہی ہو رہی تھی، اس لیے جب ایک عورت کا معاملہ سامنے آیا، تو بے اختیار زبان سے نکل گیا: "تم سب کا یہی حال ہے۔ تمہارے مکر و فریب سے خدا کی پناہ!"

پھر یہ کو جو معاملہ پیش آیا، اُس سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس بارے میں وقت کے نسوانی اخلاق کا معیار کیا تھا؟ شہر کی امیرزادیوں نے جونہی یہ خبر سُنی کہ ایک عبرانی غلام ایسا طرحدار ہے کہ امرأۃ العزیز جان دینے لگی ہے، اور وہ تا بو میں نہیں آتا، تو بے اختیارانہ اس سے ملنے کی مشتاق ہو گئیں، اور پھر جب مجلسِ ضیافت آراستہ ہوئی، اور یوسف بلائے گئے، تو کوئی نہ تھا جس نے اپنی دلربائیوں اور شیوہ طرازیوں کے بے باکانہ تیروں سے اُنہیں چھلنی نہ کر دینا چاہا ہو۔ ظاہر ہے کہ سوسائٹی کی عورتوں کا اس طرح بے حجابانہ کھُل کھیلنا، اور بغیر کسی جھجک کے ایک پورے مجمع کا اظہارِ تعشق کرنا، جبھی ہو سکتا ہے جبکہ لکھنؤ کی اصطلاح میں "خوفِ خدا وقت کا فیشن ہو گئی ہو، اور شوقین عورتیں پوری طرح آزاد ہوں۔

پس عزیز کے طرزِ عمل کے لیے اس کے سوا اور کسی توجیہ کی ضرورت نہیں کہ مصر کے ایک امیر کا طرزِ عمل تھا، اور اُسے ایسا ہی ہونا تھا۔ اُس نے بیوی کو ملامت کر دی کہ قصور تیرا ہی ہے۔ یوسف سے کہا اس بات کو اور آگے نہ بڑھانا، اور معاملہ ختم ہو گیا۔ اس سے زیادہ نہ تو وہ کچھ کر سکتا تھا، اور نہ وقت کے احساسات متقاضی تھے کہ کرے۔

(ن) عزیز کے اس قول میں کہ "ان کیدکن عظیم" (۲۸) جو رائے ظاہر کی گئی ہے، وہ ظاہر ہے کہ اپنے وقت اور اپنے شہر کی عورتوں کی نسبت ہے۔ نہ کہ دنیا جہان کی تمام عورتوں کے لیے۔ اور پھر جو کچھ بھی ہے، عزیز کا قول ہے۔ خود قرآن کا حکم نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس مقولہ کا اس طرح استعمال شروع کر دیا، گویا عورتوں کے جنسی اخلاق کے لیے یہ قرآن کا فیصلہ ہے، اور اُس کے نزدیک عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلہ میں زیادہ مکار اور بے عصمتی کی گھاتیں نکالنے میں زیادہ ہشیار ہے۔ چنانچہ عام طور پر ہمارے مفسروں نے اس کا ایسا ہی مطلب قرار دیا ہے۔ اور پھر حسبِ عادت وجوہ و مباحث کی دور دراز وادیوں میں گم ہو گئے ہیں۔ پہلے اسے عورتوں کی جنس کی نسبت قرآن کا عام و مطلق حکم قرار دیتے ہیں۔ پھر حیرانی میں پڑتے ہیں کہ شیطان کے کید کو تو ضعیف کہا ہے: ان کید الشیطان کان ضعیفا۔ عورتوں کا کید کیسے "عظیم" ہو گیا! پھر توجیہوں کی وادیوں میں قدم اُٹھاتے ہیں اور جہاں تک نکل جا سکتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ بعضوں کو مان لینا پڑتا ہے کہ شیطان کے کید سے بھی عورتوں کا کید بڑا ہے۔ کیونکہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے! بعضوں کی دقیقہ سنجی اس پر مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں نہیں، علی الاطلاق نہیں ہو سکتا۔ صرف جنسی تعلقات کے معاملہ میں ہے۔ اس میدان میں مرد اُن سے بازی نہیں لے جا سکتے! حالانکہ نہ تو قرآن کا یہ حکم ہے۔ نہ عزیز کا قول ایسے محل میں ہے کہ اطلاق و عموم کے یہ سوالات پیدا ہوں۔ بحث و تفسیر کی یہ پوری عمارت بنیاد سے لیکر چوٹی تک، بالکل بے اصل ہے۔

بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کیے ہیں لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس نے ہر جگہ مرد اور عورت، دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے، اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے، وہاں صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے: للرجال نصیبٌ مما اکتسبوا، وللنساء نصیبٌ مما اکتسبن، وسئلوا اللہ من فضلہ۔ ان اللہ کان بکل شیءٍ علیما (۴: ۳۲) چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے، اُسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے، اور جس طرح بدعمل مردوں کی بُرائیاں بتلائی ہیں، اسی طرح بدعمل عورتوں کی بھی بتلائی ہیں کہیں بھی دونوں میں کسی طرح کا امتیاز اُس نے جائز نہیں رکھا ہے۔ مردوں کے لیے اگر فرمایا: التائبون العابدون، الحامدون، السائحون، الراکعون، الساجدون، الآمرون بالمعروف، والناھون عن المنکر، والحافظون لحدود اللہ (۹: ۱۱۲) تو عورتوں کے لیے بھی فرمایا: مسلمات، مومنات، قانتات، تائبات، عابدات، سائحات (۶۶: ۵) منافقوں کا ذکر کیا، تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا، دونوں جنسوں کا کیا: المنافقون والمنافقات بعضھم

تفسیر ان کید کن عظیم

من بعض یأمرون بالمنکر وینھون عن المعروف (۹: ۶۷) مومنوں کا ذکر کیا، تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا، دونوں کا کیا: والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض، یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر (۹: ۷۱) مردوں اور عورتوں کی یہ اخلاقی مساوات اُس کا عام اسلوب ہے۔ ہر جگہ تم دیکھو گے کہ وہ دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتا، ایک ہی درجہ میں رکھتا، اور ایک ہی طرح یکجا خطاب کرتا ہے: ان المسلمین والمسلمات، والمؤمنین والمؤمنات، والقانتین والقانتات، والصادقین والصادقات، والصابرین والصابرات، والخاشعین والخاشعات، والمتصدقین والمتصدقات، والصائمین والصائمات، والحافظین فروجھم والحافظات، والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات، اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما (۳۳: ۳۵) یعنے جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں، اُسی طرح عورتوں میں بھی مسلمہ و مومنہ ہیں۔ جس طرح مردوں میں قانت مرد ہیں، اُسی طرح عورتوں میں بھی قانتہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں، اُسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بکثرت اُس کا ذکر کرنے والے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بکثرت ذکر کرنے والیاں ہیں، اور پھر جس طرح مردوں میں ایسی پاکباز ہیں کہ نفسانی خواہشوں کے غلبہ سے اپنی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی ایسی پاکباز ہستیاں ہیں جو اپنی حفاظت سے کبھی غافل نہیں ہوتیں۔ غور کرو، کسی صف میں بھی تفریق نہیں، کسی فضیلت میں بھی امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں بھی عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اُسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلہ میں زیادہ بداخلاق ہے اور مرد بڑے پاکباز ہوتے ہیں مگر بدبخت عورتیں بڑی نفس پرست اور مکار ہیں؟ تفسیر قرآن کی تاریخ کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ ایک مصری بت پرست کے قول کو اللہ کا فرمان سمجھ لیا گیا، اور اس سے اس طرح استدلال کیا جا رہا ہے، گویا عورتوں کی جنسی پستی و بداخلاقی کے لیے کتاب اللہ کا قطعی فیصلہ موجود ہے!

حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکبازی و عصمت کے لحاظ سے دونوں جنسوں میں تفریق ہی کرنی ہو، تو ہر طرح کی نفس پرستیوں اور مکاریوں کی حیوانیت مرد کے حصہ میں آئیگی، اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لیے ثابت ہوگی۔ یہ مرد ہی ہے جس کی حیوانیت پر عورت کی فرشتگی شاق گزرتی ہے۔ وہ چاہتا ہے، اسے بھی اپنی ہی طرح کا حیوان بنا دے۔ اس لیے اپنے کید عظیم کے سارے فتنے کام میں لاتا اور برائیوں کی ایک ایک راہ سے اُسے آشنا کر کے چھوڑتا ہے۔ پھر جب وہ اس کے پیچھے قدم اُٹھا دیتی ہے، تو اُس سے گردن موڑ لیتا ہے، اور کہنے لگتا ہے، اس کا کید تو سب سے بڑا کید اور اس کی بُرائی تو سب سے بڑی بُرائی ہے! فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو مرد ہی کا کید ہے جو پہلے اُسے اپنی کامجوئیوں کا آلہ بناتا ہے، اور جب بن جاتی ہے، تو خود پاک بنتا اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اس معصوم کے سر ڈال دیتا ہے!

دنیا میں کوئی عورت بُری نہ ہوتی اگر مرد اُسے بُرا بننے پر مجبور نہ کرتا۔ عورت کی بُرائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں ہوتی ہو لیکن اگر جستجو کرو گے تو تہہ میں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دیگا، اور اگر اُس کا ہاتھ نظر نہ آئے تو اُن برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئیگا جو کسی نہ کسی شکل میں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

تورات میں ہے کہ شجر ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب آدم کو حوا نے دی تھی، اس لیے نافرمانی کا پہلا قدم جو انسان نے اُٹھایا وہ عورت کا تھا۔ اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی خلقت میں مرد سے زیادہ بُرائی اور نافرمانی ہے اور وہی مرد کو سیدھی راہ سے بھٹکانے والی ہے۔ لیکن قرآن نے اس قصہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی، بلکہ ہر جگہ اس معاملہ کو آدم اور حوا، دونوں کی طرف منسوب کیا۔ انہیں جو حکم دیا گیا تھا، وہ بھی یکساں طور پر دونوں کے لیے تھا: ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین (۲: ۳۵) اور لغزش بھی ہوئی تو ایک ہی طرح پر دونوں سے ہوئی: فازلھما الشیطان عنھا، فاخرجھما مما کانا فیہ (۲: ۳۶) شیطان نے دونوں کے قدم ڈگمگا دیے، اور دونوں کے نکلنے کا باعث ہوا۔ یعنے جو لغزش ہوئی اُس میں یکساں طور پر دونوں کا حصہ تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ کسی ایک پر دوسرے سے زیادہ ذمہ داری ہو۔

بہرحال یہ بات یاد رہے کہ سورۂ یوسف کی اس آیت سے جو استدلال کیا جا رہا ہے، وہ قطعاً بے اصل ہے، اور جہاں تک عورتوں کے جنسی اخلاق کا تعلق ہے، قرآن میں کہیں کوئی ایسی بات موجود نہیں جس سے مترشح ہوتا ہو کہ عورت کی جنس مرد سے فروتر ہے، یا بے عصمتی کی راہوں میں زیادہ مکار اور شاطر ہے۔

امرأة العزیز کا نام

(ن) تورات میں ہے کہ مصر کے جس امیر نے حضرت یوسف کو خریدا تھا، اُس کا نام فوطی فار تھا (پیدائش ۳۶: ۳۶) لیکن اس کی بیوی کا نام نہیں لکھا ہے۔ نہیں معلوم ہمارے مفسرین نے کہاں سے یہ بات معلوم کر لی کہ اُس کا نام زلیخا تھا؟ بہرحال اس کی کوئی قابلِ اعتنا اصلیت پائی نہیں جاتی۔ البتہ مفسرین کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ اُس وقت مصر کا حکمراں خاندان عمالقہ میں سے تھا۔ یہ عمالقہ وہی ہیں جنہیں مصر کی تاریخ میں ہیکسوس کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور جن کی اصلیت یہ بتائی گئی ہے کہ چرواہوں کی ایک قوم تھی۔ یہ چرواہوں کی قوم مصر میں کہاں سے آئی تھی؟ جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب سے آئی تھی، اور یہ دراصل عربی قبائل عاربہ ہی کی ایک شاخ تھی۔ قدیم قبطی اور عربی زبان کی مشابہت اُن کے عرب ہونے کی ایک مزید دلیل ہے۔

حضرت یوسف کا انتقال

(س) تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف زندگی بھر مصر کے حکمران و مختار رہے، اور جب انکا آخری وقت آیا تو اپنے بھائیوں اور اپنی اولاد سے کہا "ایک وقت آئیگا جب خدا تمہیں پھر اُسی زمین کنعان میں لے جائیگا، جس کا ابراہیم، اسحاق، اور یعقوب سے اُس نے وعدہ کیا ہے، تو جب وہ وقت آئے تم میری ہڈیاں اپنے ساتھ لیجانا، اور میرے بزرگوں کے پاس دفن کر دینا۔" چنانچہ ان کے خاندان کے لوگوں نے اُن کی نعش میں خوشبو بھری اور ایک صندوق میں محفوظ کر دی (پیدائش ۵۰: ۲۴)

خوشبو بھرنے کا غالباً مطلب یہ ہے کہ مصریوں کے طریقہ کے مطابق ممی کر کے رکھی گئی تھی۔ جب چار سو برس بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکلے، تو انہوں نے حضرت یوسف کی نعش بھی اپنے ساتھ لے لی تھی۔ اس طرح حضرت یوسف کی وصیت کی تعمیل ظہور میں آگئی۔

(ع) سورۂ یوسف کے بصائر و حکم کی طرح اُس کے مباحث و مسائل کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ لیکن مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

سُوْرَۃُ الرَّعْدِ

مکی - ۴۳ - آیات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱ الٓمّٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۞
اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَہَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
۲ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ ۞ وَھُوَ
الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْہَا رَوَاسِیَ وَاَنْھٰرًا ؕ وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْہَا زَوْجَیْنِ

الف - لام - را -

(اے پیغمبر!) یہ الکتاب (یعنے قرآن) کی آیتیں ہیں، اور جو کچھ تیرے پروردگار کی جانب سے تجھ پر نازل ہوا ہے، وہ امرِ حق ہے (اس کے سوا کچھ نہیں) مگر اکثر آدمی ایسے ہیں کہ (اس پر) ایمان نہیں لاتے۔

یہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بلند کر دیا، اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں ہے۔ پھر وہ اپنے تخت (حکومت) پر نمودار ہوا (یعنی مخلوقات میں اس کے احکام جاری ہوگئے) اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا کہ ہر ایک اپنی ٹھہرائی ہوئی میعاد تک (اپنی اپنی راہ) چلا جا رہا ہے۔ وہی (اس تمام کارخانۂ خلقت کا) انتظام کر رہا ہے، اور (اپنی قدرت و حکمت کی) نشانیاں الگ الگ کر کے بیان کر دیتا ہے تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ ایک دن اپنے پروردگار سے ملنا ہے!

اور (دیکھو) وہی ہے جس نے زمین کی سطح پھیلا دی، اس میں پہاڑ بنا دیے، نہریں جاری کر دیں، اور ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے، دو دو قسموں کے اگا دیے۔ اس نے رات اور دن (کے بتدریج ظاہر

یہ سورت بھی مکی ہے، اور خطاب مشرکینِ مکہ سے ہے۔

(۱) تمام مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی دینِ حق کے بنیادی عقائد کا بیان ہے یعنے توحید، رسالت، وحی، جزاءِ عمل، لیکن خصوصیت کے ساتھ جس بات پر زور دیا گیا ہے، اور جو سورت کی تمام موعظت و تذکیر کے لیے مرکزِ بیان و خطاب ہے، وہ "حق" اور "باطل" کی حقیقت اور اُن کی باہمی آویزش کا قانون ہے۔ چنانچہ سورت کی ابتدا بھی اسی اعلان سے ہوئی ہے کہ والذی انزل الیک من ربک الحق (۱) اور خاتمہ بھی اسی پر ہوا ہے کہ فانما علیک البلاغ وعلینا الحساب (۴۰)

حق و باطل کے امتیاز کا یہی عالمگیر اور فیصلہ کن قانون ہے جو دعوتِ قرآنی کی حقانیت اور عدمِ حقانیت کا فیصلہ کر دیگا۔ اگر پیغمبرِ اسلام کا اعلانِ رسالت "حق" ہے، تو "حق" کا خاصہ یہی ہے کہ باقی رہے اور فتح مند ہو۔ اگر "باطل" ہے تو بلاشبہ "باطل" کے لیے مٹ جانا اور نامراد ہونا ہے یہی اللہ کی شہادت ہے جس سے بڑھ کر کوئی فیصلہ کن شہادت نہیں ہو سکتی، اور اب اس شہادت کے ظہور کا انتظار کرنا چاہیے۔

(۲) سورت کی ابتدا اس اعلان سے ہوئی ہے کہ قرآن فکرِ انسانی کی بناوٹ نہیں ہے، اللہ کی جانب سے نازل ہوا ہے

اثْنَيْنِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ ۳
مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ
وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ وَإِن تَعْجَبْ فَعَجَبٌ ۴
قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ
فِي أَعْنَاقِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ ۵

اور امر حق ہے، لیکن مخاطبین دعوت میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اسے نہیں مانتے، پس ضروری ہے کہ ان کے مقابلہ میں اس کی حقانیت آشکارا ہو جائے۔

پھر اللہ کی ہستی اور آخرت کی زندگی پر برہان حکمت و ربوبیت کا استدلال کیا ہے اور یہ حقیقت واضح کی ہے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز کسی ایسی ہستی کی موجودگی کی شہادت دے رہی ہے جس نے جو کچھ بنایا ہے، مصلحتوں اور حکمتوں کے ساتھ بنایا ہے، اور یہاں کا ذرہ ذرہ اسی کی تدبیر و انتظام سے چل رہا ہے۔ پھر فرمایا ان نشانیوں کا تفکر دلوں میں یقین پیدا کر دیتا ہے کہ انسانی زندگی صرف اتنے ہی کے لیے نہیں ہو سکتی جتنی حیات دنیوی میں نظر آ رہی ہے۔ ضروری ہے کہ کوئی دوسرا مرحلہ بھی پیش آنے والا ہو، اور وہ ایسا ہو کہ مخلوق کو خالق کے حضور پیش کر دے!

اس آیت میں قدرت و حکمت الٰہی کے تین مرتبے بیان کیے ہیں:

(ا) سب سے پہلے یہ کہ اجرام سماویہ کو پیدا کیا اور فضا میں پھیلا دیا۔ وہ بلند ہیں لیکن کوئی سہارا نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو۔ محض جذب و انجذاب کا قانون ہے جس کے توازن نے انہیں اپنی اپنی جگہ معلق و قائم رکھا ہے۔

(ب) یہ ان کی پیدائش تھی، لیکن اب ان کے قیام و اجراء کے لیے ضروری تھا کہ احکام و قوانین ہوں، اور نافذ ہو جائیں، پس اس تمام کائنات ہستی پر اللہ کی فرماں روائی نافذ ہو گئی۔ یعنی اس کا تخت حکومت بچھ گیا۔ اس کے احکام کے آگے سب جھک گئے!

(ج) یہ احکام و قوانین کس طرح نافذ ہوئے؟ اس طرح کہ سورج اور چاند کو دیکھو، احکام الٰہی نے کس طرح انہیں مسخر کر رکھا ہے؟ بال برابر ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے

ہونے) کا ایسا قاعدہ بنا دیا کہ دن کی روشنی کو رات کی تاریکی ڈھانپ لیا کرتی ہے یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے کتنی ہی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرنے والے ہیں! ۳

اور دیکھو۔ زمین میں (طرح طرح کے) ٹکڑے ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ ان میں انگور کے باغ ہیں، (غلہ کی) کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں۔ باہم دگر ملتے جلتے ہوئے اور بعض ایسے کہ ملتے جلتے ہوئے نہیں ہیں۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر ہم بعض پھلوں کو بعض پر مزہ میں برتری دیدیتے ہیں۔ یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں! ۴

اور (اے مخاطب!) اگر تو عجیب بات دیکھنی چاہتا ہی، تو (سب سے زیادہ) عجیب بات ان منکروں کا یہ قول ہے کہ "جب ہم (مرنے کے بعد گل سڑ کر) مٹی ہو گئے، تو پھر کیا ہم پر ایک نئی پیدائش طاری ہو گی"؟ (یہ بات تو سمجھ میں آتی نہیں!) تو یقین کرو، یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار سے انکار کیا، اور یہی ہیں جنکی گردنوں میں طوق پڑے ہونگے، اور یہی ہیں کہ

۵ ...... ○ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلَتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ

۶ الْعِقَابِ ○ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ

۷ قَوْمٍ هَادٍ ○ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۖ وَكُلُّ شَيْءٍ

۸ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ○ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

۵ دوزخی ہوئے، ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے!

اور (اے پیغمبر!) یہ تم سے بُرائی کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔ قبل اس کے کہ بھلائی کے لیے خواستگار ہوں۔ حالانکہ ان سے پہلے ایسی سرگزشتیں گزر چکی ہیں جن کی (دنیا میں) کہاوتیں بن گئیں۔ (مگر یہ ہیں کہ عبرت نہیں پکڑتے) تو اس میں شک نہیں کہ تیرا پروردگار لوگوں کے ظلم سے بڑا ہی درگزر کرنے والا ہے، اور اس میں بھی شک نہیں کہ تیرا پروردگار

۶ سزا دینے میں بڑا ہی سخت ہے!

اور جن لوگوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں "اس آدمی پر اُس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتری؟" حالانکہ تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کر دینے والا ایک رہنما ہے، اور

۷ ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہوا ہے۔

(اللہ کے علم کا تو یہ حال ہے کہ وہ) جانتا ہے، ہر مادہ کے پیٹ میں کیا ہے (یعنے کیسا بچہ ہے) اور کیوں پیٹ گھٹتے ہیں اور کیوں بڑھتے ہیں (یعنے درجہ بدرجہ شکمِ مادر میں کیسی کیسی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں) اُس کے یہاں ہر چیز کا ایک اندازہ ٹھہرایا ہوا ہے

۸ وہ غیب اور شہادت (یعنے محسوس اور غیر محسوس

ان کی سیر و گردش کے لیے جو میعادیں ٹھہرا دی گئی ہیں ٹھیک ٹھیک اُس کے مطابق چل رہے ہیں۔

پھر اس کے بعد اس معاملہ کی وضاحت کر دی کہ "یدبّر الامر" اور یہاں یہی بات بنائے استدلال ہے۔ یعنے یہ سب کچھ جو ہوا اور ہو رہا ہے، اس حقیقت کی شہادت ہے کہ یہاں تدبیر امور کرنے والا ایک ہاتھ موجود ہے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ یہ سب کچھ ظہور میں آجاتا اور قائم و جاری رہتا۔ اور اگر تدبیر امور کی قوت کام کر رہی ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ اعمال انسانی کے لیے اُس نے کوئی انتظام نہ کیا ہو، اور انسانی زندگی ایک فعل عبث کی طرح رائگاں جائے؟

(۳) آیت (۲) میں عالم سماویہ کا ذکر کیا تھا۔ آیت (۳) میں فرمایا، زمین کو دیکھو۔ وہ ایک گیند کی طرح مدور اور گول ہے لیکن اُس کی سطح کا ہر حصّہ ایسا واقع ہوا ہے کہ گولائی محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ایسا دکھائی دیتا ہے، جیسے ایک مسطح فرش بچھا ہوا ہو۔ پھر اس میں پہاڑ پیدا کر دیے گئے جن کی چوٹیوں پر برف جمتی اور پگھلتی رہتی ہے، اور اس طرح اُن نہروں کی روانی کا سامان ہوتا رہتا ہے جو میدانی زمینوں سے گذرتی ہیں اور انہیں سیراب کرتی رہتی ہیں!

پھر زمین میں روئیدگی کی کیسی عجیب و غریب قوت پیدا کر دی کہ اس کی تمام سطح طرح طرح کی خوش ذائقہ غذاؤں کا خوانِ نعمت بن گئی ہے! ہر طرح کے پھلوں کے درخت ہیں ہر طرح کے دانوں کی فصلیں ہیں۔ سب میں دو دو قسموں کو جوڑوں کا قانون کام کر رہا ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ نباتات کی کوئی قسم نہیں جس میں حیوانات کی طرح نر و مادہ

الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَاءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَن جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ (۹)
بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۝ لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ (۱۰)
أَمْرِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۗ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا
فَلَا مَرَدَّ لَهُ ۚ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَالٍ ۝ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ (۱۱)
السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ (۱۲)

کی جنسی تقسیم نہ ہو، اور اس اعتبار سے بھی کہ ہر درخت کے پھل دو قسموں کے ضرور ہوتے ہیں۔ مثلاً کھٹے اور میٹھے۔ خوش ذائقہ اور بد ذائقہ۔ اچھی قسم کے اور گری ہوئی قسم کے۔ پھر اس کی حکمت فرمائی کا یہ کرشمہ دیکھو کہ رات دن کا دائمی انقلاب طاری ہوتا رہتا ہے، جو نباتات کی روئیدگی اور پختگی کے لیے ضروری تھا جب دن کی تپش انہیں خوب اچھی طرح گرم کر دیتی ہے۔ تو رات آتی ہے اور زمین کو ڈھانپ لیتی ہے اور اس کی چادر کے تلے وہ خنکی و برودت کی مطلوبہ مقدار حاصل کر لیتے ہیں!

پھر ربوبیت الٰہی کی یہ کار فرمائی دیکھو کہ زمین کی سطح ایک ہے، مگر اس کے مختلف قطعات یکساں نہیں۔ سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، لیکن اپنی روئیدگی اور پیداوار کی مختلف خدمتیں انجام دے رہے ہیں۔ ایک قطعہ میں باغ ہیں، ایک میں کھیت ہیں، ایک میں نخلستان ہیں پھر اگرچہ زمین ایک ہے، اور ایک ہی پانی سے ہر قطعہ سیراب ہوتا ہے، لیکن ہر درخت کا پھل یکساں نہیں۔ کسی جگہ ایک ہی پھل اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ کسی جگہ ادنیٰ درجہ کا۔ کسی کا مزہ کچھ ہوتا ہے۔ کسی کا کچھ۔

کائنات ہستی کے ان تمام کارخانوں کا اس نگرانی اور دقیقہ سنجی کے ساتھ نافع و کار آمد ہونا، اور مخلوقات کی ضروریات زندگی کا اس عجیب و غریب کارفرمائی کے ساتھ انتظام پانا کیا اس حقیقت کا اعلان نہیں ہے کہ ایک پرورش کنندہ اور مدبر ہستی موجود ہے، اور یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، کسی مقصد اور منتہیٰ کے لیے ہو رہا ہے؟

(۹) دونوں کا جاننے والا ہے۔ سب سے بڑا بلند مرتبہ!

تم میں کوئی چپکے سے کوئی بات کہے، یا پکار کے کہے، رات کی تاریکی میں چھپا ہو، یا دن کی روشنی میں راہ چل رہا ہو، ساری حالتیں اس کے لیے یکساں ہیں (اس کے علم سے کوئی بات مخفی نہیں)

(۱۰) انسان کے آگے اور پیچھے ایک کے بعد ایک آنے والی (قوتیں) ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے، جب تک کہ وہ خود ہی اپنی صلاحیت نہ بدل ڈالے۔ اور (پھر) جب اللہ چاہتا ہے، کسی گروہ کو (اس کی تغیر صلاحیت کی پاداش میں) مصیبت پہنچے، تو مصیبت پہنچ ہی کر رہتی ہے۔ وہ) کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی، اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اس کا کارساز ہو۔

(۱۱) وہی ہے جو تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے۔ وہ دلوں میں ہراس بھی پیدا کر دیتی ہے اور امید بھی۔ اور وہی ہے جو بادلوں کو (پانی سے) بوجھل کر دیتا ہے، اور بادلوں کی گرج اس کی ستائش کرتی ہے، اور فرشتے بھی اس کی دہشت سے سرگرم ستائش رہتے

۱۳ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۝ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ
وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ
۱۴ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
۱۵ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ہیں۔ وہ بجلیاں گراتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ان کی زد میں لے آتا ہے، لیکن یہ منکر ہیں کہ اللہ کی قدرت وحکمت کی ان ساری نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے) اُس (کی ہستی ویگانگت) کے بارے میں
۱۳ جھگڑ رہے ہیں، حالانکہ وہ (اپنی قدرت میں) بڑا ہی سخت اور اٹل ہے!

اُسی کو پکارنا سچا پکارنا ہے جو لوگ اُس کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ پکارنے والوں کی کچھ نہیں سنتے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی (پیاس کی شدت میں) دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ بس (اس طرح کرنے سے) پانی اُس کے مُنہ تک پہنچ جائیگا، حالانکہ وہ اُس تک پہنچنے والا نہیں۔ اور (یقین کرو) منکرینِ حق کی پکار اس کے سوا کچھ نہیں کہ ٹیڑھے رستوں میں بھٹکتے پھرنا!

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، اللہ ہی کے آگے سجدہ میں گرا ہوا ہے (یعنے اللہ کے احکام وقوانین کے آگے جھکے بغیر اُسے چارہ نہیں) خوشی سے ہو یا مجبوری سے۔ اور (دیکھو) اُن کے سایے صبح وشام (کس طرح گھٹتے بڑھتے اور کبھی اِدھر کبھی

(۴) آیت (۵) میں فرمایا کائنات ہستی کی ہر بات یقین دلا رہی ہے کہ یہ کارخانہ تدبیر وحکمت بغیر کسی مصلحت ومقصد کے نہیں ہوسکتا، اور ضروری ہے کہ انسان کی زندگی صرف اتنی ہی نہ ہو کہ پیدا ہوا، کھایا پیا، اور فنا ہو گیا، بلکہ اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہو۔ ورنہ تدبیر ومصلحت کا سارا کارخانہ باطل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس پر بھی لوگوں کی غفلت کا یہ حال ہے کہ حیاتِ آخرت کی بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی، تو اس سے زیادہ کونسی بات عجیب ہوسکتی ہے؟ عجیب بات یہ نہیں ہے کہ مرنے کے بعد پھر انسان پر ایک
۱۴ دوسری زندگی طاری ہوگی، کیونکہ اس کی شہادت تو دنیا کی ہر چیز دے رہی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انسان صرف حیات دنیوی پر قانع ومطمئن ہو جائے، اور سمجھ لے، اس کی پیدائش سے جو کچھ مقصود تھا، وہ صرف اتنا ہی تھا کہ ایک مرتبہ پیدا ہوا، اور کچھ دنوں کھا پی کر مر گیا! عقل وبینش کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر کہا جاتا۔ یہ زندگی صرف دنیا ہی کی زندگی ہے۔ تو طبیعتیں کسی طرح مطمئن نہ ہوتیں، اور شک وشبہ میں پڑ جاتیں کہ کیا ایسا ہوسکتا

ف پانی کو مٹھی میں لینا چاہو تو وہ کسی جمی ہوئی چیز کی طرح کبھی مٹھی میں نہیں آئیگا۔ اس لیے عربی میں کہتے ہیں۔ فلاں آدمی قبض علی الماء کی کوشش کرتا ہے۔ یعنے ایسی بات کے درپے ہے جو ہونے والی نہیں۔ اُردو میں بھی کہتے ہیں۔ پانی مٹھی میں بند کرنا چاہتا ہے۔ پس یہاں فرمایا۔ جو لوگ اپنے بنائے ہوئے معبودوں کو پکارتے ہیں، اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پیاسا مٹھی میں پانی بند کرنا چاہے، حالانکہ یہ بات ہونے والی نہیں۔ وہ کتنی ہی مرتبہ پانی کو مٹھی میں لیگا، پانی ٹکیگا نہیں، اور اس کے لب تشنہ کے تشنہ ہی رہجائینگے۔

قُلِ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا

اُدھر ہو جایا کرتے ہیں)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے پوچھو "آسمانوں کا اور زمین کا پروردگار کون ہے؟" تم کہو "اللہ ہی! اس کے سوا کوئی نہیں" پھر اُن سے کہو "جب وہی پروردگار ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ تم نے اُس کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے جو خود اپنی جانوں کا نفع نقصان بھی اپنے اختیار میں نہیں رکھتے؟" نیز اُن سے کہو "کیا اندھا اور دیکھنے والا، دونوں برابر ہیں؟ یا ایسا ہو سکتا ہے کہ اندھیرا اور اُجالا برابر ہو جائے؟ یا پھر یہ بات ہے کہ انکے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اُسی طرح مخلوقات پیدا کی جس طرح اللہ نے پیدا کی ہے، اور اس لیے پیدا کرنے کا معاملہ اُن پر مشتبہ ہوگیا (کہ صرف اللہ ہی کے لیے نہیں ہے۔ دوسروں کے لیے بھی ہو سکتا ہے؟)" تم ان سے کہو "اللہ ہی ہے جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اور وہ (اپنی ساری باتوں میں) یگانہ ہے، سب کو مغلوب رکھنے والا!"

اُس نے آسمان سے پانی برسایا تو اپنی سمائی کے مطابق وادیاں بہہ نکلیں، اور میل کچیل سے جھاگ بن بن کر پانی کی سطح پر اُٹھا، تو سیلاب کی رو اسے بہالے گئی۔ اور دیکھو، اسی طرح کا جھاگ (میل کچیل سے) اُس وقت بھی اُٹھتا ہے جب لوگ زیور یا

ہو؟ لیکن منکرین خیر کی عقل و بینش کا یہ حال ہے کہ انہیں کہا جا رہا ہے، زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے، اور وہ ہیں کہ حیران ہو کر کہتے ہیں جب مرگئے اور گل سڑ کر مٹی ہوگئے تو کیا پھر ہمیں زندگی کا ایک نیا جامہ مل جائیگا!

(۵) آیت (۶) میں انکار و جحود کی اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان بھلائی کی جگہ بُرائی کے لیے جلدی مچانے لگتا ہے۔ یعنے کہنے لگتا ہے، اگر انکار و بدعملی کا بُرا نتیجہ نکلنے والا ہے تو وہ نتیجہ کہاں ہے؟ کیوں پیش نہیں آجاتا؟ فرمایا، اس لیے کہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور درگزر کرنے والا ہے، پس فوراً نتیجۂ بد پیش نہیں آجاتا۔ جستوں پر مہلتیں دی جاتی ہیں، لیکن جب وقت آجائے، تو وہ شدید العقاب بھی ہے۔ کیونکہ پاداشِ عمل کبھی ٹلنے والی نہیں، اور نہ کسی طرح کی نرمی کرنے والی ہے۔

(۶) انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ وہ سچائی کو سچائی میں نہیں ڈھونڈھتا بلکہ دوسری چیزوں میں تلاش کرتا ہے۔ از انجملہ یہ کہ اچنبھوں اور عجائب کاریوں کو سچائی کی دلیل سمجھتا ہے، اور خیال کرتا ہے، سب سے زیادہ سچا انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ عجیب و غریب ہو!

قرآن نے جن بنیادی گمراہیوں کا ازالہ کیا من جملہ اُنکے ایک گمراہی یہ ہے۔ اُس نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ دعوتِ حق کی شناخت خود دعوت ہے، نہ کہ عجائب و غرائب کا ظہور جسے لوگوں نے دلیل صداقت سمجھ رکھا تھا۔

آیت (۷) میں فرمایا۔ یہ لوگ کہتے ہیں، عجیب و غریب قسم کی نشانیاں اس شخص کے لیے کیوں ظاہر نہیں ہوتیں؟ لیکن وہ نہیں جانتے کہ انبیاء کا ظہور عجائب نمائیوں کے لیے نہیں ہوتا۔ ہدایتِ خلق کے لیے ہوتا ہے۔ جس طرح دنیا کی ہر قوم میں ایک ہدایت کرنے والا انسان پیدا ہو چکا ہے، اسی

يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ۝ ۱۷ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ ۱۸ أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ

طرح تم بھی ہدایت کے لیے ظاہر ہوئے ہو۔ تمہارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ میں اچنبھے دکھلانے کے لیے آیا ہوں۔ دعویٰ یہ ہے کہ سعادت کی راہ دکھلانے آیا ہوں پس طالب حق کو دیکھنا چاہیے کہ تمہاری زندگی، تمہاری تعلیم، تمہارا طور طریقہ واقعی ہدایت کا ہے، یا نہیں ہے!

یہی بات آگے چل کر آیت (۲۷) میں بھی فرمائی ہے اور وہاں زیادہ وضاحت ہوگئی ہے۔ فرمایا الذین آمنوا وتطمئن قلوبھم بذکر اللہ جو ایمان لائے ہیں، وہ تو اس طرح لائے ہیں کہ ذکر الٰہی سے اُن کے دلوں کو قرار مل گیا۔ تمام شکوک دور ہوگئے۔ انہیں اس کی ضرورت نہ ہوئی کہ اچنبھوں کی فرمائش کرتے۔

پھر آیت (۸) میں فرمایا اللہ کے علم سے کوئی بات اور کوئی حالت پوشیدہ نہیں، اور اُس نے ہر بات کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اُس سے باہر کوئی بات نہیں جا سکتی پس وہ تمہاری نیتوں اور خیالوں سے بے خبر نہیں۔ اُس نے ہدایت و شقاوت کے معاملہ کے لیے بھی اندازے ٹھہرا دیے ہیں۔ جو ہدایت پائیگا اُسی کے مطابق پائیگا، جو نہیں پائیگا، اُسی کے مطابق نہیں پائیگا۔

کوئی اور چیز بنانے کے لیے (دھاتوں کو) آگ پر تپاتے ہیں۔ حق اور باطل کے معاملہ کی مثال ایسی ہی سمجھو جو اللہ بیان کر دیتا ہے۔ پس (میل کچیل کا) جھاگ (جو کسی کام کا نہ تھا) رائیگاں گیا، اور جس چیز میں انسان کے لیے نفع تھا وہ زمین میں رہ گئی۔ اسی طرح اللہ (لوگوں کی سمجھ بوجھ کے لیے) مثالیں بیان کر دیتا ہے!

۱۷ جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا حکم قبول کیا، تو اُن کے لیے سرتاسر خوبی ہے۔ جنہوں نے قبول نہیں کیا، (اُنکے تمام اعمال رائیگاں جائینگے۔ وہ نامرادی و بدحالی سے کسی طرح بچ نہیں سکتے) اگر کرۂ ارضی کی تمام دولت اُن کے اختیار میں آجائے اور اُسے دوگنا کر دیا جائے، تو یہ لوگ اپنے بدلہ میں

ضرور اُسے بطور فدیہ کے دیدیں (کہ کسی طرح عذاب نامرادی سے بچاؤ ہو جائے، مگر انہیں سننے والا

(۷) ہدایت و شقاوت کا یہ اندازہ یعنے مقررہ قانون کیا ہے؟ آیت (۱۱) میں فرمایا عمل اور صلاحیتِ عمل کا قانون ہے۔ یہی ایک کے بعد ایک آنے والی قوتیں ہیں جو حکم الٰہی سے انسان کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ اس کے گزشتہ اعمال ہیں جن سے اُس کا حال پیدا ہوتا ہے، اور حال کے اعمال ہیں جو اُس کا مستقبل بناتے ہیں۔

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا، خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدل ڈالے۔

نہیں) یہی لوگ ہیں جن کے لیے حساب کی سختی ہے اور ٹھکانا جہنم، اور (جس کا ٹھکانا جہنم ہو تو) کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے!

۱۸ (اے پیغمبر!) کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ دونوں آدمی برابر ہو جائیں؟ وہ، جو یہ بات جان گیا ہے کہ جو بات تجھ پر تیرے پروردگار کی جانب سے اُتری

الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمٰى ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا ۱۹
يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۝ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ ۲۰
يَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوا ۲۱
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنّٰتُ ۲۲
عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُونَ

یعنے اصل اس بارے میں خود انسان کا عمل ہے۔ وہ جیسی حالت چاہے، اپنے عمل اور صلاحیتِ عمل سے حاصل کرلے سکتا ہے۔ اگر ایک قوم بدحال ہے، اور وہ اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کرلیتی ہے جس سے خوشحالی پیدا ہوسکتی ہے، تو خدا کا قانون یہ ہے کہ یہ تبدیلی فوراً اس کی حالت بدل دیگی۔ اور بدحالی کی جگہ خوشحالی میں آجائیگی۔ اسی طرح خوشحالی سے بدحالی کا تغیر بھی سمجھ لو۔

پھر فرمایا جب ایک قوم نے اپنی عملی صلاحیت کھودی، اور اس طرح تبدیل حالت کی مستحق ہوگئی، تو ضروری ہے کہ اُسے بُرائی پہنچے۔ یہ بُرائی کبھی ٹل سکتی نہیں کیونکہ یہ خود خدا کی جانب سے ہوتی ہے۔ یعنے اس کے ٹھہرائے ہوئے قانون کا نفاذ ہوتا ہے، اور خدا کے قانون کا نفاذ کون ہے جو روک سکے، اور کون ہے جو کسی کو اس کی زد سے بچا سکے؟

(۸) لیکن یہ بُرائی جو پہنچتی ہے، تو کیا اس لیے پہنچتی ہے کہ اُس نے بُرائیوں کا سامان کردیا ہے؟ آیت (۱۲) میں فرمایا کہ نہیں۔ اُس نے تو جو کچھ بھی کیا ہے، وہ بجز اچھائی اور خوبی کے اور کچھ نہیں ہے لیکن اچھائی اور خوبی کی بڑی سے بڑی بات بھی تمہاری عاجز اور درماندہ نگاہوں کے لیے خوف و دہشت کی ہولناکی بن جاتی ہے۔ تم اپنی حالت اور اضافت کے لحاظ سے سمجھنے لگتے ہو کہ بُرائی ہے، اور تمہارے لیے بُرائی ہو بھی جاتی ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ وہ فی نفسہ بُرائی ہے بلکہ اس لیے کہ تمہاری حالت اور اضافت کے لحاظ سے بُرائی ہوگئی:

کفر ہم نسبت بہ خالق حکمت ست
چوں بہ ما نسبت کنی، کفر آفت ست

یہ مقام تشریح طلب ہے، اور تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ کا مبحث "ہمہ داں رحمت" دیکھنا چاہیے۔

اتری ہے، حق ہے، اور وہ جو (اس حقیقت کے مشاہدہ سے) اندھا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ سمجھتے بوجھتے ہیں جو دانشمند ہیں! ۱۹

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ کے ساتھ اپنا عہد (عبودیت) پورا کرتے ہیں۔ اپنا قول و قرار توڑنے والے نہیں! ۲۰

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم دیا، اُنہیں جوڑے رکھتے ہیں، اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، حساب کی سختی کے خیال سے اندیشہ ناک رہتے ہیں!

اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے محبت کرتے ہوئے (ہر طرح کی ناگواریوں اور سختیوں میں) صبر کیا، نماز قائم کی، جو کچھ روزی اُنہیں دے رکھی ہے اُس میں سے خرچ کرتے رہے، پوشیدگی میں بھی، اور کھلے طور پر بھی۔ اُنہوں نے بُرائی کے مقابلہ میں بُرائی نہیں کی جب پیش آئے، اچھائی ہی سے پیش آئے۔ تو (بلاشبہ) یہی لوگ ہیں کہ اُن کے لیے عاقبت کا گھر ہے۔ ہمیشگی کے باغ جن میں وہ خود بھی داخل ہونگے، اور اُن کے آباؤ اجداد، بیویوں، اور اولاد میں سے جو نیک کردار ہونگے، وہ بھی جگہ پائینگے اور (وہاں کی زندگی ایسی ہوگی کہ) ہر دروازہ سے

۲۳ عَلَيْهِم مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۞ سَلٰمٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ
عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ
۲۵ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا
۲۶ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ
عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝

۲۳ چنانچہ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے ایک ایسی مثال بیان کی جو ہر انسان کے علم و مشاہدہ میں ہمیشہ آتی رہتی ہے فرمایا: بجلی کا چمکنا مایوسیوں کے لیے پیام امید ہوتا ہے اگر نہ چمکے تو باران رحمت کے ظہور کا پیام بھی نہ ملے لیکن تمہارے
۲۴ لیے یہ معاملہ خوف و امید کا معاملہ بن گیا۔ بارش کی امید سے خوش ہوتے ہو لیکن ساتھ ہی بجلی کی تیزی سے ڈرنے بھی لگتے ہو پھر وہی بجلی جو زمین کے لیے زندگیوں کا پیام ہے جب کسی انسان پر گرتی ہے، تو اُس کے لیے موت کا پیام بن جاتی ہے۔ اسی طرح بادل کا گرجنا تمہارے لیے سرتاسر دہشت و ہولناکی ہے، حالانکہ وہ فی الحقیقت ہولناکی نہیں ہے سرتاسر خدا کی محمودیت کا اعلان ہے۔ وہ گرج گرج کر اُس کی ستائش کا اعلان کرتا، اُس کی تقدیس و تسبیح میں رطب اللسان ہوتا
۲۵ ہے۔ فرشتے اس کے خوف سے نہیں ڈرتے، خدا کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔ مگر تمہارے لیے وہ کائنات جو کی سب بڑی ہولناکی ہو گئی ہے!

"وھم یجادلون فی اللہ" یعنے اللہ کی قدرت و حکمت کی یہ نشانیاں ہمیشہ انسان کے علم و مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں۔ اس پر بھی اُس کی غفلت کا یہ حال ہے کہ اللہ کی ہستی اور اُس کی یگانگت کے بارے میں ہمیشہ جھگڑتا رہتا ہے۔ گویا یہ حقیقتیں ثابت نہیں، یہ نشانیاں کبھی ظہور ہی میں نہیں آئیں!

فرشتے اُن پر آئینگے اور کہینگے "یہ جو تم نے (دنیا کی زندگی میں) صبر کیا، تو اس کی وجہ سے (آج) تم پر سلامتی ہو، پھر کیا ہی اچھا عاقبت کا ٹھکانا ہے جو ان لوگوں کے حصہ میں آیا!

اور جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کا عہد مضبوط کرنے کے بعد پھر اُسے توڑ دیتے ہیں، اور جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُنہیں قطع کر ڈالتے ہیں، اور ملک میں شر و فساد برپا کرتے ہیں، تو ایسے ہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے لعنت ہوئی اور اُن کے لیے برا ٹھکانا!

اللہ جس کی روزی چاہتا ہے، فراخ کر دیتا ہے، (جس کی چاہتا ہے) نپی تُلی کر دیتا ہے۔ لوگ دنیا کی (چند روزہ) زندگی (اور اس کے عارضی فوائد) پر شادمانیاں کرتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کی زندگی تو آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ محض تھوڑا سا برت لینا ہے!

۲۶ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ کہتے ہیں "ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس شخص پر اُس کے پروردگار کی طرف سے کوئی (عجیب و غریب) نشانی اُترتی؟" (اے پیغمبر!) تم کہدو۔ اللہ جسے چاہتا ہے (کامیابی و سعادت کی) راہ سے گم کر دیتا ہے، اور جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے، تو اُسے اپنی
۲۷ طرف بڑھنے کی راہ دکھا دیتا ہے"

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ (۲۸) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (۲۹) كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَیْهِمُ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَهُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ مَتَابِ (۳۰) وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ

۲۸ (جو اُس کی طرف رجوع ہوئے تو یہ) وہ لوگ (ہیں) کہ ایمان لائے، اور اُن کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہو گئے۔ اور یاد رکھو یہ اللہ کا ذکر ہی ہے جس سے دلوں کو چین اور قرار ملتا ہے (اور شک و شبہ اور خوف و غم کے سارے کانٹے نکل جاتے ہیں!)

۲۹ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، تو اُن کے لیے خوش حالیاں ہیں، اور (بالآخر) بہت اچھا ٹھکانا!

۳۰ اور (اے پیغمبر!) اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے تجھے ایک اُمت کی طرف بھیجا جس سے پہلے بہت سی اُمتیں گزر چکی ہیں (اور ان سب میں سچائی کے پیغام بہ اپنے اپنے وقتوں میں ظاہر ہو چکے ہیں) اور اس لیے بھیجا کہ جو بات تجھ پر اُتاری ہے، وہ ان لوگوں کو پڑھ کر سُنا دے، اور ان کا حال یہ ہے کہ سرے سے خدائے رحمٰن ہی کے قائل نہیں۔ تم (ان سے) کہہ دو "وہی میرا پروردگار ہے، کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی۔ اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع ہوتا ہوں!"

اور (دیکھو) اگر ایسا ہو سکتا کہ کسی قرآن سے پہاڑ چلنے لگتے، یا زمین کی (بڑی بڑی) مسافتیں طے

(۹) قرآن کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ توحید ربوبیت و خالقیت سے توحید الوہیت پر استدلال کرتا ہے، چنانچہ یہاں بھی آیت (۱۴) سے سلسلۂ بیان اس طرف پھر گیا ہے۔ فرمایا سچی پکار وہی ہے جس کا خطاب اللہ سے ہو۔ جو لوگ اُس کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مٹھی میں پانی بند کرنا چاہے اور اُسے اپنے تشنہ لبوں تک لیجانا چاہے۔ معلوم ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کبھی کامیاب نہ ہوگا اس کی کوششیں بھٹک بھٹک کر رہ جائینگی!

آیت (۱۵) میں فرمایا، تمام مخلوقات اسی کے آگے چار و ناچار جھکی ہوئی ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن ہر آنکھ دیکھ لے سکتی ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں۔ تم جو احکام الٰہی سے سرتابی کرنی چاہتے ہو، خود اپنے سایے ہی کو دیکھ لو۔ جو اندازہ اس بارے میں بنا دیا گیا ہے اُس سے کبھی وہ باہر نہیں جا سکتا صبح کو چڑھتی دھوپ میں اس کا ایک خاص ڈھنگ ہوتا ہے شام کو ڈھلتی دھوپ میں ایک خاص ڈھنگ۔ اگر غور کرو تو قدرت الٰہی کے احکام و قوانین کے آگے ٹھیک اُسی طرح تمہاری ہستیاں بھی مسخر ہیں۔ خواہ تمہیں اقرار ہو، خواہ انکار۔

(۱۰) آیت (۱۷) مہمات معارف میں سے ہے، اور سورت کے تمام مواعظ کے لیے مرکزی موعظت ہے۔ فرمایا یہ جو کچھ بھی ہے "حق" اور "باطل" کی آویزش ہے لیکن "حق" اور "باطل" کی حقیقت کیا ہے؟ کونسا قانونِ الٰہی ہے جو اس کے اندر کام کر رہا ہے؟ یہاں واضح کیا ہے کہ یہ "بقاء انفع" کا قانون ہے۔ یعنی اللہ نے کائنات ہستی کے قیام و اصلاح کے لیے یہ قانون ٹھہرا دیا ہے کہ یہاں وہی چیز باقی رہ سکتی ہے جس میں نفع ہو جس میں نفع نہیں، وہ ٹھہر نہیں سکتی۔ اُسے نابود ہو جانا ہے۔

اَوْ کُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰی ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا ؕ اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰی یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۳۱ ع وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَیْتُ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫

اس نازک اور دقیق حقیقت کے لیے کیسی صاف اور واضح الوقوع مثال بیان کردی جس کے جاننے سے کوئی انسانی نگاہ بھی محروم نہیں ہوسکتی! فرمایا جب پانی برستا ہے اور زمین کے لیے شادابی و گل ریزی کا سامان مہیا ہونے لگتا ہے، تو تم دیکھتے ہو کہ تمام وادیاں نہروں کی طرح رواں ہوجاتی ہیں، لیکن پھر کیا تمام پانی رُک جاتا ہے؟ کیا میل کچیل اور کوڑا کرکٹ اپنی اپنی جگہ تھمے رہتے ہیں؟ کیا زمین کی گود اُن کی حفاظت کرتی رہتی ہے؟ نہیں، زمین کو اپنی نشو و نما کے لیے جس قدر پانی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ جذب کرلیتی ہے، ندی نالوں میں جس قدر سمائی ہوتی ہے اُتنا پانی وہ روک لیتے ہیں، باقی پانی جس تیزی کے ساتھ گرا تھا، ویسی ہی تیزی سے بہہ بھی جاتا ہے۔ میل کچیل کوڑا کرکٹ جھاگ بن بن کر سمٹتا اور اُبھرتا ہے۔ پھر پانی کی روانی اُسے اس طرح اُٹھا کے لے جاتی ہے، کہ تھوڑی دیر کے بعد وادی کا ایک ایک گوشہ دیکھ جاؤ کہیں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملیگا!

اسی طرح جب چاندی سونا یا اور کسی طرح کی دھات آگ پر تپاتے ہو، تو کھوٹ الگ ہوجاتا ہے، خالص دھات الگ نکل آتی ہے۔ کھوٹ کے لیے نابود ہوجانا ہے۔ خالص دھات کے لیے باقی رہنا!

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ یہاں بقاء انفع کا قانون کام کررہا ہے۔ یہاں باقی رہنا اسی کے لیے ہے جو نافع ہو۔ جو نافع نہیں وہ چھانٹ دیا جائیگا۔ یہی حقیقت "حق" اور "باطل" کی ہے۔ "حق" وہ بات ہے جس میں نفع ہے، پس وہ کبھی مٹنے والی نہیں۔ ٹکنا، ثابت ہونا، باقی رہنا، اس کا قدرتی خاصہ ہے، اور "حق" کے معنی ہی قیام و ثبات کے ہیں۔

۳۱ لیکن "باطل" وہ ہے جو نافع نہیں اس لیے اُس کا قدرتی خاصہ ہی یہ ہوا کہ مٹ جائے، محو ہوجائے، ٹل جائے۔ ان الباطل کان ذھوقا!

اسی حقیقت کا ایک گوشہ ہے جسے ہم نے "بقاء اصلح" کی شکل میں دیکھا ہے لیکن قرآن نے "اصلح" نہیں کہا "انفع"

ہوجاتیں، یا مُردے بول اُٹھتے، (تو ضرور اس قرآن سے بھی ایسا ہی ہوتا) مگر نہیں، ساری باتوں کا اختیار اللہ ہی کو ہے (اور اُس کی یہ سنت نہیں کہ ایسا کرے۔ وہ اپنا کلام ارشاد و ہدایت کے لیے نازل کرتا ہے۔ نہ کہ عجائب آفرینیوں کے لیے) پھر جو لوگ ایمان لائے ہیں، کیا وہ (اس بات سے) مایوس نہیں ہوگئے کہ (نہ ماننے والے کبھی ماننے والے نہیں؟ کیا اُنھوں نے یہ بات نہیں پالی کہ) اگر اللہ چاہتا، تو تمام انسانوں کو (ایک ہی) راہ حق دکھا دیتا؟ (مگر اس نے ایسا نہیں چاہا۔ اُس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ یہاں استعداد و عمل کی آزمائشیں ہوں) اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے (وہ یوں ماننے والے نہیں) اُنھیں اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں کوئی نہ کوئی سخت عقوبت پہنچتی ہی رہیگی، یا ایسا ہوگا کہ اُن کے ٹھکانے کے قریب ہی آنازل ہوگی یہاں تک کہ وہ وقت آجائے، جب اللہ کا وعدہ ظہور میں آنے والا ہے۔ بلاشبہ (اُس کا وعدہ سچا ہی) وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا!

اور (اے پیغمبر!) تجھ سے پہلے بھی ایسا ہی ہوچکا ہے کہ پیغمبروں کی ہنسی اُڑائی گئی، اور ہم نے (اپنے مقررہ قانون کے مطابق) پہلے اُنھیں ڈھیل دی پھر گرفتا

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ ۳۲
قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ○ لَهُمْ عَذَابٌ فِى ۳۳
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ○ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ وُعِدَ ۳۴

کہ کیونکہ صالح وہی ہے جو نافع ہو۔ کارخانۂ ہستی کی نظرت میں بناوٹ اور تکمیل ہے، اور تکمیل جبھی ہو سکتی ہے جبکہ صرف نافع اشیا ہی باقی رکھی جائیں۔ غیر نافع چھانٹ دی جائیں یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے جا بجا "قضاء بالحق" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنے حق کا فیصلہ۔ مزید تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

پھر آیت (۱۸) میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: اسی قانون کا یہ نتیجہ ہے کہ جو لوگ احکام حق قبول کرتے ہیں اُن کے لیے خوبی ہوتی ہے۔ جو نہیں کرتے، اُن کے لیے محرومی ہوتی ہے۔ کیونکہ جنہوں نے قبول کیا، اُن کے اعمال نافع ہو گئے۔ اب نافع عمل مٹ نہیں سکتا۔ جنہوں نے انکار کیا وہ غیر نافع ہو گئے۔ غیر نافع باقی نہیں رہ سکتا!

(۱۱) آیت (۱۹) میں فرمایا: جسے حق کا علم و عرفان حاصل ہو گیا اور جس نے جان لیا کہ یہ بات سچائی ہے، یہ سچائی نہیں کیا اُس کا اور اُس آدمی کا ایک ہی حکم ہو سکتا ہے جو تاریکی میں ہے اور حق کے مشاہدہ سے اندھا ہو رہا ہے؟ یعنے پہلا تو علم و بصیرت پیش کر رہا ہے۔ دوسرے کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ کہتا ہے مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ پس پہلے کی جگہ علم کی ہوئی۔ دوسرے کی جہل و کوری کی ہوئی۔ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ انما یتذکر اولوا الالباب۔ نصیحت پذیر وہی ہو سکتے ہیں جو اصحاب دانش ہیں۔ جنہوں نے دانش و فہم سے منہ موڑ لیا، اُن سے کوئی توقع نہیں۔

(۱۲) اس کے بعد اُن لوگوں کے اعمال گنائے ہیں جنہوں نے احکام حق قبول کیے، اور دنیا کے لیے نافع ہو گئے یہ اعمال کیا کیا ہیں؟

(ل) اللہ کی بندگی کا عہد پورا کرتے ہیں۔ اپنی عبودیت میں سچے اور کامل ہیں

(ب) اللہ نے جو رشتے جوڑ دیے ہیں، انہیں ظلم و ناانصافی سے توڑتے نہیں، بلکہ ہر رشتہ کا پاس کرتے، اور

کر لیا۔ تو دیکھو، ہمارا ٹھہرایا ہوا بدلہ کیسا تھا اور کس طرح ظہور میں آیا!

۳۲ پھر جس ہستی کے علم و احاطہ کا یہ حال ہے کہ ہر جان پر نگاہ رکھتی ہے کہ اُس نے اپنے عملوں سے کیسی کمائی کی! (وہ کیا اُن ہستیوں کی طرح سمجھ لی جا سکتی ہے جنہیں ان لوگوں نے معبود بنا رکھا ہے؟) اور اُنہوں نے اللہ کے لیے شریک ٹھہرا رکھے ہیں۔ (اے پیغمبر!) ان سے پوچھ "وہ کون ہیں؟ اُن کے اوصاف بیان کرو۔ یا پھر تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دینی چاہتے ہو جو خود اُسے بھی معلوم نہیں کہ زمین میں کہاں ہے؟ یا پھر محض ایک دکھاوے کی بات ہے جس کی تہ میں کوئی اصلیت نہیں؟" اصل یہ ہے کہ منکروں کی نگاہوں میں اُن کی مکاریاں خوشنما بن گئیں اور راہِ حق میں قدم اُٹھانے سے رُک گئے، اور جس پر اللہ (کامیابی کی) راہ بند کر دے، تو کون ہے جو اُسے راہ دکھانے والا ہو سکتا ہے؟

۳۳ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت میں بھی، اور آخرت کا عذاب یقیناً بہت زیادہ سخت ہوگا۔ اور کوئی نہیں جو انہیں اللہ (کے قوانین) کی پکڑ سے بچا سکے!

۳۴ متقی انسانوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے

الْمُتَّقُونَ ۖ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا ۚ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوا ۖ وَّعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ○ (۳۵) وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ ۖ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَن يُنكِرُ بَعْضَهُ ۚ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ ○ (۳۶) وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَمَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ ○ (۳۷) ع

اُس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک باغ ہے اور اُس کے تلے نہریں رواں ہیں (جن کی آبیاری اُسے ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھتی ہے) اس کے پھل دائمی ہیں (کبھی ختم ہونے والے نہیں) اُس کے درختوں کی چھاؤں بھی ہمیشگی کی (کبھی بدلنے والی نہیں) یہ ہے ان لوگوں کا انجام، جنہوں نے تقوے کی راہ اختیار کی، اور کافروں کا انجام آگ ہے!

اور (اے پیغمبر!) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (ہدایت) دی ہے (یعنی یہود و نصاریٰ) وہ اس بات سے خوش ہوتے ہیں جو تجھ پر اُتاری گئی ہے، اور اِن جماعتوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں اسکی بعض باتوں سے انکار ہے، تو تم کہہ دو: "مجھے تو بس یہی حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی بندگی کروں اور کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں۔ اسی کی طرف تمہیں بلاتا ہوں، اور اسی کی طرف میرا رُخ ہے!"

اور اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے اُسے (یعنی قرآن کو) ایک عربی فرمان کی شکل میں اُتارا (یعنے عربی زبان میں اُتارا) اگر حصولِ علم کے بعد تو نے اِن لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، تو سمجھ لے کہ پھر اللہ کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی کارساز ہوگا نہ بچانے والا!

اور ہر علاقہ کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس عمل میں تمام حقوق العباد آگئے، جس طرح پہلی بات میں حقوق اللہ آگئے ہیں۔

(ج) آخرت کی فکر سے بے پروا نہیں ہوتے۔ جو کچھ کرتے ہیں انہیں خوفِ آخرت کی کھٹک موجود ہوتی ہے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ سب کے آگے ایک دن حساب آنا ہے، اور حساب کی سختی پیش آنے والی ہے۔

(د) اللہ کی محبت میں ہر طرح کی ناگوار حالتیں صبر و ثبات کے ساتھ جھیل لیتے ہیں۔ شدتوں اور محنتوں سے منہ نہیں موڑتے۔ آزمائشوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے۔

(ہ) نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قائم رکھتے ہیں۔

(و) جو کچھ کماتے ہیں، اسے صرف اپنے نفس ہی پر خرچ نہیں کرتے۔ دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں۔ اور ہر حال میں خرچ کرتے ہیں۔ کھلے طور پر بھی، پوشیدہ طور پر بھی۔

(ز) بدی کے بدلے بدی کرنا اُن کا شیوہ نہیں۔ کوئی اُن کے ساتھ کتنی ہی بُرائی کرے، یہ بھلائی ہی کو پیش آئیں گے۔

(۱۳) آیت (۳۱) میں یہ حقیقت واضح کی کہ اللہ کی کتاب ہدایت خلق کے لیے نازل ہوتی ہے۔ عجائب آفرینیوں کے لیے نازل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کتاب اس لیے نازل ہوئی ہوتی کہ پہاڑوں کو چلادے اور مُردوں سے صدائیں نکال دے، تو تم پر بھی ایسی ہی چیز اُترتی۔ لیکن نہ ایسا ہوا ہے نہ اب ہوگا۔ اس طرح کی عجائب آفرینیوں کی فرمائش اس بات کی دلیل ہے کہ دلوں میں سچائی کی طلب نہیں۔ اگر طلب ہوتی تو پہاڑوں کے چلنے کا انتظار نہ کرتے۔ یہ دیکھتے کہ انسانوں کے دلوں کو کس راہ چلاتی ہے اور مردہ جسموں کی جگہ مردہ روحوں کو کس طرح زندہ کر دیتی ہے؟

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ۚ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن
يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ ۳۸
الْكِتَابِ ۝ وَإِن مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا ۳۹
الْحِسَابُ ۝ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ ۴۰
وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے بھی (بے شمار) پیغمبر قوموں میں پیدا کیے، اور (وہ تیری ہی طرح انسان تھے) ہم نے انہیں بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی اور کسی پیغمبر کے لیے یہ بات نہ ہوئی کہ وہ (خود) کوئی نشانی لا دکھاتا، مگر اسی وقت کہ اللہ کا حکم ہوا ہو۔ ہر وقت کے لیے ایک کتاب ہے۔ ۳۸

اللہ جو بات چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے، جو چاہتا ہے نقش کر دیتا ہے۔ اور کتاب کی اصل و بنیاد اُسی کے پاس ہے! ۳۹

اور ہم نے ان لوگوں سے (یعنے کفار مکہ سے ظہور نتائج کے) جو وعدے کیے ہیں، (کچھ ضرور نہیں کہ بہ یک دفعہ سب ظہور میں آجائیں) ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض باتیں ہم تجھے تیری زندگی ہی میں دکھا دیں۔ ہوسکتا ہے کہ اُن سے پہلے تیرا وقت پورا کر دیں۔ بہرحال جو کچھ تیرے ذمہ ہے، وہ یہی ہے کہ پیام حق پہنچا دینا۔ ان سے (ان کے کاموں کا) حساب لینا ہمارا کام ہے۔ تیرا کام نہیں۔ ۴۰

پھر کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم اس سرزمین کا قصد کر رہے ہیں؟ اسے اطراف سے گھٹاتے ہوئے (اور ظالموں پر عرصۂ حیات تنگ کرتے ہوئے؟) اور اللہ ہے جو فیصلہ کرتا ہے۔ کوئی نہیں جو اُس کا فیصلہ ٹال سکے۔ وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے! ۴۱

(۱۴) آیت (۳۸) میں فرمایا: لکل اجل کتاب۔ اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیا ہے۔ دوسرا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر بات کے مقررہ وقت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔ یعنے طے شدہ میعاد ہے، اور وہ اس سے پہلے ظہور میں نہیں آسکتی۔

(۱۵) آیت (۴۰) سے آخر سورت تک، سورت کے تمام مواعظ کا خلاصہ ہے۔ فرمایا۔ تمہارے ذمے جو کچھ ہے، وہ تو یہ ہے کہ پیام حق پہنچا دو۔ محاسبہ اللہ کا کام ہے، اور وہ حساب لیکر رہیگا۔ ہوسکتا ہے کہ جن جن باتوں کا وعدہ کیا گیا ہے، تمہاری زندگی ہی میں ظاہر ہو جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے بعد ظہور میں آئیں۔ یہ بات کہ اُن نتائج و عواقب کا ظہور تمہارے سامنے نہ ہوا، مواعید الٰہی کی صداقت پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتی۔

یہ بات مختلف سورتوں میں بار بار کہی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس سے مقصود صرف یہی نہیں تھا کہ مستقبل کی خبر دی جائے، بلکہ یہ حقیقت بھی واضح کرنی تھی کہ کوئی شخصیت کتنی ہی اہم ہو، لیکن پھر شخصیت ہے، اور کار و بار حق کا معاملہ اُس کی موجودگی و عدم موجودگی پر موقوف نہیں۔ جو کچھ ہونا چاہیے اور جو کچھ ہونے والا ہے، بہرحال ہو کر رہیگا۔ خواہ پیغمبر اپنی زندگی میں اس کا ظہور دیکھ لے، یا نہ دیکھ سکے۔

پھر غور کرو نتائج کا ظہور بھی ٹھیک ٹھیک اسی طرح ہوا جن باتوں کی خبر دی گئی تھی، اُن کا بڑا حصہ تو خود پیغمبر اسلام کی زندگی ہی میں ظاہر ہو گیا۔ یعنے اُنہوں نے دنیا چھوڑنے سے پہلے تمام جزیرۂ عرب کو حلقہ بگوش اسلام پایا۔ البتہ بعض باتوں کا ظہور آپ کے بعد ہوا۔ مثلاً منافقوں کا استیصال، بیرونی فتوحات

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (۴۲) وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝ (۴۳) ع

کا حصول، اور خلافت ارضی کے وعدہ کی تکمیل۔

آیت (۴۱) میں خبر دی گئی ہے کہ وہ سریع الحساب ہے، اس لیے ظہور نتائج کا وقت دور نہیں۔ نیز یہ کہ دعوت حق کی فتح مندی اس طرح ظہور میں آئیگی کہ بہ تدریج کہ کے اطراف و جوانب، قریش کے تسلط سے کٹتے جائیں گے، اور بالآخر مکہ بھی فتح ہو جائیگا۔

(۴۲) آخری آیت میں واضح کر دیا کہ حق و باطل کی موجودہ آویزش کا نقطہ نزاع کیا ہے؟ فرمایا۔ تمہارا دعوی ہے کہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہو۔ منکر کہتے ہیں، نہیں، تم بھیجے ہوئے نہیں۔ اب قانون قضاء بالحق کے مطابق فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے، اور اس کی شہادت بس کرتی ہے۔

(۴۳) اللہ کی شہادت سے مقصود بھی قضاء بالحق اور بقاء انفع کے قانون کا نفاذ ہے، جو ظاہر ہو کر بتلا دیتا ہے کہ حق کس کے ساتھ تھا، اور باطل کا کون پرستار تھا۔ مزید تشریح کے لئے تفسیر سورۂ فاتحہ کا مطالعہ کرو۔

اور جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں، انہوں نے بھی (دعوتِ حق کے مقابلہ میں) مخفی تدبیریں کی تھیں، سو (یاد رکھو) ہر طرح کی تدبیریں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کیا کمائی کر رہا ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ کافروں کو معلوم ہو جائیگا، کس کا انجام بہ خیر ہونے والا ہے!

(اے پیغمبر!) منکرین حق کہتے ہیں۔ تو خدا کا بھیجا ہوا نہیں۔ تو کہدے، میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی بس کرتی ہے اور اس کی جس کے پاس کتاب کا علم ہے!

سورۃ ابراهیم

مکی - ۵۲ - آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ○ ۱ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ○ ۲ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۗ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ○ ۳ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۗ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ ۴ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى

(۱) اس سورت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انبیاء کے ظہور اور اس کے احوال و ظروف اور نتائج کو مجموعی طور پر پیش کیا گیا ہے۔

بیان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ہے۔ یعنے اس باب میں اُن کی موعظت نقل کی گئی ہے۔ پھر سلسلۂ بیان دعوت قرآن کے ظہور پر متوجہ ہو گیا ہے، اور واضح کیا ہے کہ جو نتائج ہمیشہ نکل چکے ہیں، ویسے ہی نتائج اب بھی نکلینگے۔

آخر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دعوتِ قرآن دراصل دعوت ابراہیمی کی تجدید ہے، اور اسی عہد الٰہی کا ظہور ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا۔

ایک خاص بات یہ بھی نمایاں ہے کہ خطاب کا رُخ زیادہ تر رؤساء قریش کی طرف ہے جن کے ہاتھ میں ملک کی ریاست و پیشوائی کی باگ تھی۔

(۲) ہدایت روشنی ہے اور ضلالت تاریکی۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب تاریکی پھیل جاتی ہے، تو وہ ہدایت وحی کے ذریعہ انسانوں کو تاریکی سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ظہور اسی روشنی کا پیام ہے، اور ایسا ہی پیام حضرت موسیٰ نے بھی دیا تھا۔

الف لام۔ را

یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اُتاری ہے، تاکہ لوگوں کو اُن کے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں، تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے کہ غالب اور ستودہ خدا کی راہ ہے۔ ۱ وہ اللہ، کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اُسی کا ہے (اور سب اُسی کے احکام کے آگے جھکے ہوئے ہیں) اور عذاب سخت کی خرابی ہے اُن منکروں کے لیے، ۲ جنہوں نے آخرت چھوڑ کر دنیا کی زندگی پسند کر لی۔ جو اللہ کی راہ سے انسانوں کو روکتے ہیں، اور چاہتے ہیں، اس میں کجی ڈالیں یہی لوگ ہیں کہ بڑی گہری گمراہی میں جا پڑے۔ ۳

اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا، مگر اس طرح، کہ اپنی قوم ہی کی زبان میں پیام حق پہنچانے والا تھا تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کر دے پس اللہ جس پر چاہتا ہے (کامیابی کی) راہ گم کر دیتا ہے، جس پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے۔ وہ غالب ہے حکمت والا! ۴

اور دیکھو یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰ کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں

بِاٰیٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝

(۳) سورۂ ہود کے آخری نوٹ میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ کیوں گذشتہ اقوام کے وقائع وایام کو "ایام اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں فرمایا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو وحی الٰہی سے ایما ہوا تھا کہ اپنی قوم کو "ایام اللہ" کی عبرتیں اور بصیرتیں یاد دلائیں۔ کیونکہ ان میں صبر و شکر کرنے والوں کے لیے فتح و کامرانی کی بڑی بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ بنی اسرائیل مصر میں عرصہ تک غلامی و مقہوری کی زندگی بسر کر چکے تھے۔ اس لیے طبیعتوں میں مایوسی و بے ہمتی اتر گئی تھی۔ مستقبل کے فتح و اقبال کی بشارتیں سنتے، مگر اپنے دل میں عزم و ثبات کے ولولے نہیں پاتے تھے پس حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ انہیں "ایام اللہ" کے تذکرے سناؤ۔ ان تذکروں میں قوانینِ حق کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنے بڑی بڑی دلیلیں ہیں۔ یہ دلیلیں واضح کر دیں گی کہ جو لوگ مصائب و محن کے مقابلہ میں ہمت نہیں ہار دیتے۔ سچائی کی راہ میں جمے رہتے ہیں، اور سعی و عمل سے گھبراتے نہیں ان کی کامیابی قطعی اور اٹل ہوتی ہے، اور ہمیشہ ایسے ہی لوگ فتح و مراد سے ہم آغوش ہوئے ہیں!

یہی وجہ ہے کہ آیت (۵) میں فرمایا۔ اس تذکرہ میں صبر و شکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

(۴) "صبر" کے معنی یہ ہیں کہ مشکلوں مصیبتوں کے مقابلہ میں جمے رہنا۔ "شکر" کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں کی قدر کرنا، اور انہیں ٹھیک ٹھیک کام میں لانا۔ آیت (۷) میں فرمایا۔ خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم شکر کرتی ہے یعنے خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجا لاتی ہے اور انہیں ٹھیک طور پر کام میں لاتی ہے، خدا اسے اور زیادہ نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ لیکن جو کفرانِ نعمت کرتی ہے یعنے قدر شناسی نہیں کرتی، وہ محرومی و نامرادی کے عذاب میں

سے نکالے اور روشنی میں لائے۔ نیز یہ کہ اللہ کے (فیصلہ کن) واقعات کا تذکرہ کر کے وعظ و نصیحت کرے۔ کیونکہ ہر اُس انسان کے لیے جو صبر و شکر کرنے والا ہے اس تذکرہ میں (عبرت و موعظت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ موسیٰ نے اپنی قوم کو (وعظ و نصیحت کرتے ہوئے) کہا تھا: "اللہ نے تم پر جو احسان کیے ہیں، انہیں نہ بھولو۔ اس نے تمہیں خاندانِ فرعون (کی غلامی) سے نجات دی (اور یہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے!) وہ تمہیں کیسے جانکاہ عذابوں میں ڈالتے تھے؟ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے (تاکہ تمہاری تعداد بڑھنے نہ پائے) تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے (کہ انکی باندیاں بن کر زندگی بسر کریں) دیکھو اس صورتِ حال میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے کیسی سخت آزمائش تھی؟"

"اور کیا وہ وقت بھول گئے جب تمہارے پروردگار نے (اپنے اس قانون کا) اعلان کیا تھا "اگر تم نے شکر کیا، تو میں تمہیں اور زیادہ نعمتیں بخشوں گا اور اگر ناشکری کی، تو پھر یاد رکھو میرا عذاب بھی بڑا

وَقَالَ مُوسَىٰٓ إِن تَكْفُرُوٓا۟ أَنتُمْ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ ٱللَّهَ لَغَنِىٌّ حَمِيدٌ ۝ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا۟ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۛ وَٱلَّذِينَ مِنۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا ٱللَّهُ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِٱلْبَيِّنَٰتِ فَرَدُّوٓا۟ أَيْدِيَهُمْ فِىٓ أَفْوَٰهِهِمْ وَقَالُوٓا۟ إِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ وَإِنَّا لَفِى شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَآ إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۝ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِى ٱللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ قَالُوٓا۟ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ ءَابَآؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ ۝ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

گرفتار ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے جو کسی انسانی گروہ کے حصے میں آتا ہے۔

غور کرو حقیقتِ حال کی کتنی سچی تعبیر ہے؟ جو فرد یا جو گروہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے۔ مثلاً خدا نے اسے فتحمندی و کامرانی عطا فرمائی ہے، وہ اس نعمت کو پہچانتا، اسے ٹھیک طور پر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتا، وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہو جاتا ہے یا نہیں؟ جو ایسا نہیں کرتا، کیا اس کی نامرادی و تباہی میں کوئی شک ہو سکتا ہے!

سخت عذاب ہے!"

اور موسیٰ نے کہا "اگر تم اور وہ سب جو زمین میں بستے ہیں، کفرانِ نعمت کریں، تو (اللہ کو اس کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟) اللہ کی ذات تو بے نیاز اور ستودہ ہے (لیکن محرومی و ہلاکت خود تمہارے لیے ہوگی)"

"پھر کیا تم تک اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں؟ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، اور وہ قومیں جو اُن کے بعد ہوئیں، اور جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے؟ ان تمام قوموں کے پاس اُن کے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ آئے تھے، لیکن اُنہوں نے اُن کی باتیں اُنہی پر لوٹا دیں، اور کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے کہا جو بات لیکر تم آئے ہو، ہمیں اُس سے انکار ہے، اور جس بات کی طرف تم بلاتے ہو، ہمیں اُس پر یقین نہیں۔ ہم شک و شبہ میں پڑ گئے ہیں"

اُن کے رسولوں نے کہا "کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ آسمان و زمین کا بنانے والا ہے! وہ تمہیں بُلا رہا ہے کہ تمہارے گناہ بخشدے، اور ایک مقررہ وقت تک (زندگی و کامرانی کی) مہلتیں دے"

اس پر قوموں نے کہا "تم اس کے سوا کیا ہو کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔ اور پھر چاہتے ہو جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں اُن کی پوجا کرنے سے ہمیں روک دو۔ اچھا۔ (اگر ایسا ہی ہے تو) کوئی واضح دلیل پیش کرو"

اُن کے رسولوں نے جواب میں کہا "ہاں، ہم اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ تمہاری ہی طرح آدمی ہیں"

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ ۱۱ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۞ ۱۲ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۞ ۱۳ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۞ ۱۴ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۞ ۱۵

لیکن اللہ جس بندہ کو چاہتا ہے، اپنے فضل و احسان کے لیے چن لیتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں کہ تمہیں کوئی سند لا دکھائیں، مگر ہاں یہ کہ اللہ کے حکم سے ہو، اور اللہ ہی ہے جس پر ایمان رکھنے والوں کا بھروسہ ہے!(۵) ۱۱

"اور ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر بھروسہ نہ کریں؟ حالانکہ اسی نے ہماری (زندگی و معیشت کی) راہوں میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ ہم اُن ایذاؤں پر صبر کریں گے جو تم ہمیں دے رہے ہو، بس اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے!" ۱۲

اور منکروں نے اپنے رسولوں سے کہا "ہم تمہیں اپنے ملک سے ضرور نکال باہر کریں گے یا پھر تم ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ"

(جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا) تو ہم نے رسولوں پر وحی بھیجی: "اب ایسا ضرور ہوگا کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر ڈالیں، اور ان کے بعد تمہیں اس سر زمین میں جگہ دیں" یہ ہے نتیجہ اُس کے لیے جو ہماری (حکومت و عدالت کی) جگہ سے ڈرا، نیز (یاداش عمل کی) تنبیہ سے! ۱۳، ۱۴

غرضکہ پیغمبروں نے فتح مندی طلب کی، اور ہر سرکش ضدی (جس نے حق کا مقابلہ کیا تھا) نامراد ہوا۔ ۱۵

(۵) سورۂ ہود کے آخری نوٹ میں ایام و وقائع کا بحث گزر چکا ہے۔ اُسے پیش نظر رکھو، اور دیکھو یہاں تمام ایام و وقائع کے مجموعی نتائج و سُنن کس طرح بیان کیے جاتے ہیں، اور کس طرح اُن کے جزئیات کو ایک کلی حقیقت کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے یعنے سب کا ظہور ایک ہی طرح ہوا تھا، سب کے ساتھ ان کی قوموں نے ایک ہی طرح کا سلوک کیا تھا، سب کی دعوت ایک ہی تھی، سب کو جوابات ایک ہی طرح کے ملے تھے، اور پھر نتیجہ بھی ہر واقعہ میں ایک ہی طرح کا نکلا۔ ہر رسول اور اس کے ساتھی کامیاب ہوئے ہر سرکش اور مقابل نامراد ہوا۔

قرآن کے یہی مقامات ہیں جنہوں نے ایام و وقائع کے سُنن و بصائر صاف صاف واضح کر دیے ہیں، اور اس باب میں ہم نے جو مبادی و اصول مرتب کیے ہیں، وہ تمام تر انہی تصریحات سے ماخوذ ہیں۔

(۱) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا۔ کیا پچھلی قوموں کے ایام و وقائع تم تک نہیں پہنچے؟ یعنے تم نہیں سُن چکے ہو! پھر اُن قوموں کا ذکر کیا جن کے حالات سے نہ تو بنی اسرائیل بے خبر تھے، نہ مصر کے باشندے بے خبر ہو سکتے تھے جہاں اُن کی نشوونما ہوئی تھی۔ بقیہ قوموں کا حال چونکہ اس درجہ مشہور نہ تھا، اس لیے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا والذین من بعدھم لایعلمھم الا اللہ۔ لایعلمھم

مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۝ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ۝ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ﹰاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ

الا اللہ میں یہ پہلو بھی موجود ہے کہ بہت سی قومیں تھیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے۔ تم اُن کا احاطہ نہیں کرسکتے۔

(۷) آیت (۱۰) پر غور کرو۔ قوموں کا ہمیشہ یہی جواب رہا کہ ہمیں تمہاری دعوت کی سچائی میں شک ہے۔ ہم نہیں مانتے۔ لیکن پیغمبروں کی پکار بھی یہی رہی کہ افی اللہ شک فاطر السمٰوٰت والارض؟ کس بارے میں تمہیں شک ہو رہا ہے؟ اللہ کے بارے میں جو آسمان و زمین کا بنانے والا؟ یعنے اُس ہستی کے بارے میں جس کا اعتقاد تمہاری فطرت کے خمیر میں موجود ہے اور تمہارے دل کا ایک ایک ریشہ کہہ رہا ہے کہ ایک فاطر السموات والارض ہستی موجود ہے؟ دنیا کی ہر بات میں تم شک کرسکتے ہو، لیکن اس بارے میں تم شک نہیں کرسکتے۔ تم کیونکر جرأت کرسکتے ہو کہ اپنے دل کے یقین سے انکار کردو، اپنی روح کے اعتقاد سے منکر ہو جاؤ، خود اپنی نسبت شک کرنے لگو؟

یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے کہ صرف ایک چھوٹے سے جملے اور استفہام تقریری میں وہ سب کچھ بیان کردیا، جو زیادہ سے زیادہ اس بارے میں کہا جاسکتا ہے، اور جو استدلال کی انتہا، اثبات کی تکمیل، اور سارے برہانوں اور حجتوں کا جامع و مانع خلاصہ ہے۔ یعنے افی اللہ شک، فاطر السمٰوٰت والارض؟ (تفصیل کے لیے دیکھو تفسیر سورۂ فاتحہ)

اُس کے پیچھے دوزخ ہے (یعنے دنیا کی نامرادی کے بعد آخرت کی نامرادی پیش آنے والی ہے) وہاں خون اور پیپ کا پانی پلایا جائیگا وہ ایک ایک گھونٹ کرکے منہ میں لیگا اور گلے سے اُتار نہ سکیگا۔ ہر طرف سے اُس پر موت آئیگی مگر مریگا نہیں۔ اُس کے پیچھے ایک سخت عذاب لگا ہوا ہے!

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، تو اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے، جیسے راکھ کا ڈھیر کہ آندھی کے دن ہوا لے اُڑے۔ جو کچھ اُنھوں نے (اپنے اعمال کے ذریعہ) کمایا ہے، اُس میں سے کچھ بھی اُن کے ہاتھ نہ آئیگا۔ یہی گمراہی کی حالت ہے جو بڑی ہی گہری گمراہی ہے!

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو ایک فعل عبث کی طرح نہیں بنا دیا ہے۔ کسی مصلحت سے بنایا ہے؟ اگر وہ چاہے تو تم سب کو ہٹا دے اور ایک نئی پیدائش نمودار کردے۔ ایسا کرنا اُس پر کچھ دشوار نہیں!

(۸) آیت (۱۲) میں پیغمبروں کا قول نقل کیا ہے کہ وما لنا الا نتوکل علی اللہ وقد ھدانا سبلنا! اس آیت میں ہدایت سبیل" سے مقصود ہدایت وحی اور سبیل دین نہیں ہے جیسا کہ مفسروں اور مترجموں نے سمجھا ہے، بلکہ ہدایت ربوبیت کا عام فیضان ہے، اور اسی میں اسلوب خطاب کا استدلال پوشیدہ

اور (دیکھو، قیامت کے دن) سب لوگ اللہ کے روبرو حاضر ہوگئے، پس ناتوانوں نے سرکشوں سے کہا "ہم (دنیا میں) تمہارے پیچھے چلنے والے تھے پھر کیا آج تم ایسا کرسکتے ہو کہ اللہ کے عذاب سے کچھ

الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۲۱
وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ
وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ

ہے جیسے ہم تمہارے ظلم و تشدد سے کیوں ہراساں ہوں! کیوں اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ نہ کریں؟ جس ہستی نے زندگی و معیشت کی تمام راہوں میں ہماری رہنمائی کا سامان کر دیا ہے، کیا حق و باطل کی اس آویزش میں ہم پر راہِ نجات نہ کھول دیگی؟ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد کہا: ولنصبرن علی ما اذیتمونا۔ ہم ضرور صبر کرینگے، اور ضرور ایسا ہوگا کہ صبر کا نتیجہ ہمارے حصے میں آئے۔

اگر یہاں "ہدایت" کو "ہدایتِ دینی" سمجھا جائے تو خطاب کا سارا زور اور استدلال مفقود ہو جاتا ہے۔

(۹) آیت (۱۸) پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وعظ اور ایام اللہ کا تذکرہ ختم ہو گیا۔ آیت (۱۹) سے نیا خطاب شروع ہوتا ہے۔ البتہ یہ خطاب بھی پچھلے بیان ہی کا تتمہ ہے۔ فرمایا کیا تم تخلیق بالحق کی حقیقت پر غور نہیں کرتے؟ یعنے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کائناتِ ہستی کی ہر چیز اس طرح واقع ہوئی ہے کہ صاف نظر آتا ہے، یہ سب کچھ کسی خاص مصلحت و مقصد سے بنایا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی سوچے سمجھے ہوئے مقصد اور ٹھہرائی ہوئی مصلحت کے ویسے ہی ظہور میں آ گیا ہو۔ پھر اگر تم دیکھ رہے ہو کہ آسمان و زمین کی ہر چیز کسی مصلحت کے ساتھ بنائی گئی ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ خود تمہاری ہستی کی پیدائش میں کوئی خاص مصلحت پوشیدہ نہ ہو، اور کرۂ ارضی کی یہ سب سے بڑی اور اشرف مخلوق محض بیکار و عبث بنا دی گئی ہو؟

اگر وہ چاہے تو تمہیں چھانٹ دے، اور ایک نئی قوم کی تخلیق کا سامان کر دے۔ کیونکہ اس کا ٹھہرایا ہوا قانون یہی ہے کہ جو جماعت غیر نافع ہو جائے، اُسے مٹ جانا ہے، اور اُس کی جگہ نافع و اصلح جماعت کو ظہور میں آنا ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز!

بچاؤ کر دو!" انہوں نے کہا "اگر اللہ ہم پر بچاؤ کی کوئی راہ کھولتا تو ہم بھی تمہیں کوئی راہ دکھاتے۔ (ہم تو خود ہی عذاب میں پڑے ہوئے ہیں) خواہ جھیل لیں، خواہ رو دھو بیٹھیں، ہمارے لیے دونوں حالتیں برابر ہو گئیں۔ ہمارے لیے آج کسی طرح چھٹکارا نہیں!"

اور (دیکھو) جب فیصلہ ہو چکا تو شیطان بولا "بلاشبہ اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ سچا وعدہ (اور وہ پورا ہو کر رہا) اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا مگر اسے پورا نہ کیا۔ مجھے تم پر کسی طرح کا تسلط نہ تھا (کہ تم میری پیروی پر مجبور ہو گئے ہو) جو کچھ پیش آیا، وہ صرف یہ ہے کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میرا بلاوا قبول کر لیا۔ پس اب مجھے ملامت نہ کرو۔ خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔ آج کے دن نہ تو میں تمہاری فریاد کو پہنچ سکتا ہوں، نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو۔ تم نے اب سے پہلے (دنیا میں) جو مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہرا لیا تھا (کہ اس کے احکام کی طرح میرے حکموں کی بھی اطاعت کرنے لگے تھے) تو میں اس سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں۔ بلاشبہ ظلم کرنے والوں کے لیے بڑا ہی دردناک عذاب ہے!"

اور (دیکھو) جو لوگ ایمان لائے تھے اور جنہوں نے

الظّٰلِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي ۲۲
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ ○ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ ۲۳
اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ○ تُؤْتِي أُكُلَهَا ۲۴
كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ○ وَمَثَلُ ۲۵
كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ○ يُثَبِّتُ اللّٰهُ ۲۶
الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِينَ

نیک کام کیے تھے، وہ (نعیم ابدی کے) باغوں میں داخل ہوگئے، اُن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ اُنہی میں رہیںگے (اُن کی راحتوں کے لیے کبھی زوال نہیں)۔ وہاں اُن کے لیے (ہر طرف سے) دعاؤں کی پکار یہی ہے کہ "تم پر سلامتی ہو!" (۲۳)

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے کس طرح ایک مثال بیان کی؟ ایک اچھی بات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھا درخت۔ جڑ اُس کی جمی ہوئی اور ٹہنیاں آسمان میں پھیلی ہوئیں۔ (۲۴) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (اُس کی ٹہنیاں کبھی بغیر پھل کے نہیں رہ سکتیں) اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ سوچیں سمجھیں! (۲۵)

اور نکمی بات کی مثال کیا ہے؟ جیسے ایک نکما درخت۔ زمین کی سطح پر اُس کی جڑ کھلی جب چاہا اُکھاڑ پھینکا۔ اُس کے لیے جماؤ نہیں۔ (۲۶)

(۱۰) آیت (۲۱) میں جماعتوں کی گمراہی کی ایک سب سے بڑی علت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنے اپنے گمراہ سرداروں، امیروں، پادشاہوں، اور پیشواؤں کی اندھی تقلید یا اطاعت کرنا، اور خود اپنی عقل و بصیرت سے کام نہ لینا۔ فرمایا۔ کیا تمہارے یہ پیشوا تمہیں نتائج اعمال کی گرفت سے بچا سکتے ہیں؟ قیامت کے دن جماعتوں کے کمزور افراد یعنے عوام اپنے اپنے پیشواؤں اور سرداروں سے کہیںگے۔ دنیا میں ہم نے تمہاری پیروی کی تھی۔ آج عذاب الٰہی کی پکڑ سے ہمارا بچاؤ کردو۔ وہ کہیںگے۔ ہم خود اپنے کو نہیں بچا سکتے۔ تمہیں کس طرح بچائیں؟

آیت میں قریش مکہ کی طرف اشارہ ہے جو قوم کے سردار و پیشوا تھے۔ اور نہ صرف قبائل حجاز بلکہ تمام باشندگان عرب اُن کے طور طریقہ کی پیروی کرتے تھے۔ جب اُنہوں نے دعوتِ اسلام کی مخالفت میں قدم اُٹھایا، تو تمام قبائل عرب نے اُن کی پیروی کی۔

(۱۱) قرآن نے ہر جگہ ایمان کی خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ سرتاسر سلامتی ہے۔ اور کفر کی پہچان یہ بتلائی ہے کہ سرتا سر اضطراب و محرومی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنت کی زندگی کے مرقع میں بھی سب سے زیادہ نمایاں بات یہی نظر آتی ہے۔ وہ سلامتی کی زندگی ہوگی، اور وہاں ہر طرف سے سلامتی ہی کی پکاریں سنائی دیںگی!

اللہ ایمان والوں کو جمنے اور مضبوط رہنے والی بات کے ذریعہ جماؤ اور مضبوطی دیتا ہے۔ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اور نافرمانوں پر (جماؤ اور مضبوطی کی) راہ گم کردیتا ہے۔

(۱۲) آیت (۲۷) قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے۔ لیکن افسوس ہے ہمارے مفسروں کو اس کی مہلت

۲۷ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ
۲۸-۲۹ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ
۳۰ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ
۳۱ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝ اَللّٰهُ

دل کہ اس کے حقائق کی وسعت کا مشاہدہ کرسکتے۔

۲۷ فرمایا۔ عجائب بادہستی کا کوئی گوشہ دیکھو۔ تمہیں دو طرح کی باتیں نظر آئینگی۔ ایک کو قرار ہے۔ دوسری کو قرار نہیں۔ ایک میں جماؤ ہے۔ دوسری میں جماؤ نہیں۔ ایک اس لیے ہے کہ پھلے پھولے۔ دوسری اس لیے ہے کہ پامال ہو۔ پہلی کلمہ طیبہ ہے۔ دوسری کلمہ خبیثہ ہے۔ یعنے پہلی اچھائی ہے، پاکیزگی ہے، نفع و فیضان ہے۔ دوسری برائی ہے گندگی

۲۸ ہے، ضرر، نقصان ہے۔

پہلی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھا درخت اچھے درخت کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ جڑ کی مضبوطی کہ

۲۹ اکھڑنے والی نہیں۔ شاخوں کی بلندی کہ جھکنے والی نہیں۔ دوسری کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نکما درخت زمین میں جگہ کر نہیں سکتا۔ ٹہنیاں معدوم، پھل نابود، جب چاہو پکڑ کے کھینچ لو، جڑ سمیت اکھڑ آئے۔

اس کے بعد فرمایا۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو ایمان لاتے ہیں، وہ انہیں جمنے والی اور مضبوط باتوں کے ساتھ جماؤ دیدیتا ہے۔ اُن کی یہ خصوصیت دنیا کی زندگی

۳۰ میں بھی نمایاں ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی نمایاں ہوگی لیکن جو لوگ ظلم و نافرمانی کی راہ اختیار کرتے ہیں، انہیں یہ بات نہیں مل سکتی۔ اُن پر جماؤ اور استقرار کی راہ بند ہوجاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی ساری باتیں جماؤ اور مضبوطی کی باتیں ہوتی ہیں ٹلنے والی، اکھڑ جانے والی، اور اپنی جگہ سے ہل جانے والی نہیں ہوتیں۔ اُن کا اعتقاد، اُن کا عمل، اُن کا طور طریقہ، اُن کے دلائل و شواہد، اُن کے تمام کام، القول

۳۱ الثابت ہوتے ہیں، اور اُن کی مثال شجرۂ طیبہ کی ہوتی ہے

اور وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے (اُس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ ایسا کرے!)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے اُن لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جنہیں اللہ نے نعمت عطا فرمائی تھی مگر اُنھوں نے کفرانِ نعمت سے اُسے بدل ڈالا اور اپنے گروہ کو ہلاکت کے گھر میں جا اُتارا؟ یعنے دوزخ میں جا اُتارا جس میں وہ داخل ہونگے؟ (پھر جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا، تو) کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے!

اور اُنھوں نے اللہ کے لیے اُس کے ہم درجہ بنائے کہ لوگوں کو اُس کی راہ سے بھٹکائیں۔

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو "اچھا، (زندگی کے چندروزہ) فائدے برت لو۔ پھر بالآخر تمہاری راہ آتشِ دوزخ ہی کی طرف ہے!"

(اے پیغمبر!) میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں، یہ پیام پہنچا دو "اس سے پہلے کہ وہ (ہولناک) دن آنمودار ہو جبکہ (نجات کے لیے) نہ تو کسی طرح کا لین دین کام دیگا نہ کسی طرح کی دوستی (اپنے لیے نجات کا سامان کرلیں۔ یعنے) نماز قائم کریں، اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ظاہر و پوشیدہ خرچ کرتے رہیں"۔

الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ (۳۲) وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ (۳۳) وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۚ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۚ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ (۳۴) ع ۵ ۱۷ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ (۳۵) رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ

لیکن جو لوگ ایمانِ حق سے محروم ہیں اُن کی کوئی بات بھی القول الثابت کی بات نہیں ہو سکتی۔ اُن کی مثال شجرہ خبیثہ کی ہوتی ہے کہ ما لھا من قرار۔

(۱۳) اس کے بعد آیت (۲۸) میں قریش مکہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملک کی ریاست و پیشوائی کی باگ انہی کے ہاتھ میں تھی، اور عامۃ الناس انہی کے پیچھے چلتے تھے۔ فرمایا اُن کی محرومی دیکھو کہ کس طرح اللہ کی نعمت کی ناشکری کر رہی ہیں، اور کلمۂ طیبہ کی جگہ کلمۂ خبیثہ کو اپنا شعار بنا لیا ہے؟ اللہ نے انہیں قوم کی پیشوائی دی تھی۔ پس اُن کا فرض تھا کہ دعوتِ حق کی قبولیت میں سب سے آگے ہوتے، اور قوم کی سچی رہنمائی کرتے، مگر انہوں نے استبدال نعمت کی راہ پسند کی۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنی قوم کو بھی گمراہی میں دھکیل دیا۔ —

قریش مکہ کے کفرانِ نعمت کے ذکر کے بعد ہی روئے سخن مومنوں کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ آیت (۳۱) میں فرمایا۔ انہیں چاہیئے، نعمت الٰہی کی قدر بجا لائیں اور ناشکری سے بچیں۔ اس شکرگزاریِ نعمت کے سب سے بڑے اعمال کون سے ہیں؟ فرمایا۔ قیام صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ ان دو عملوں میں سرگرم رہیں۔

یہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور زمین پر اوپر سے پانی برسایا جس کی آبیاری سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں کہ تمہارے لیے غذا کا سامان ہیں، اور جہاز تمہارے لیے مسخر کر دیے کہ اس کے حکم سے (یعنے اُس کے ٹھہرائے ہوئے قانون کے ماتحت) سمندر میں چلنے لگیں۔ نیز دریا بھی تمہارے لیے مسخر کر دیے۔ (۳۲) اسی طرح سورج اور چاند بھی مسخر کر دیے ہیں کہ ایک خاص دستور پر برابر چلے جا رہے ہیں، اور رات اور دن کا ظہور بھی مسخر ہے۔ (۳۳) غرضکہ تمہیں (اپنی زندگی کی کاربراریوں اور کامرانیوں کے لیے) جو کچھ مطلوب تھا، سب اُس نے عطا فرما دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو، تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی اُن کا احاطہ نہ کر سکو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی نا انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے! (۳۴)

اور (یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے دعا مانگی تھی "اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کی جگہ بنا دیجیو، اور مجھے اور میری نسل کو اس بات سے دور رکھیو کہ بتوں کی پوجا کرنے لگیں" (۳۵)

(۱۴) آیت (۳۴) میں برہان ربوبیت کا استدلال ہے۔ فرمایا۔ اپنی زندگی کی احتیاجوں کو دیکھو، اور پھر ربوبیت الٰہی کی بخششوں اور کارفرمائیوں پر نظر ڈالو۔ زندگی کی کوئی قدرتی احتیاج ایسی نہیں ہے جس کا قدرتی انتظام

"پروردگار! ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو راہِ حق سے بھٹکا دیا ہے، تو جو میرے پیچھے چلا (اور بت پرستی کی گمراہی میں نہ پڑا) وہ میرا ہوا، جس

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ
٣٧ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ تَعْلَمُ
٣٨ مَا نُخْفِیْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّیْ

نہ کر دیا گیا ہو، اور کارخانۂ عالم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تمہارے لئے افادہ و فیضان نہ رکھتا ہو۔ جس کہ معلوم ہوتا ہے، دنیا کی ہر چیز صرف اسی لیے بنی ہے کہ تمہاری کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرے، اور کسی نہ کسی شکل میں خدمت و نفع رسانی کا ذریعہ ہو۔ پھر کیا ممکن ہے کہ یہ سب کچھ بغیر کسی ارادہ کے ظہور میں آگیا ہو، اور کوئی ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو! اور اگر ایک ایسی ہستی موجود ہے، تو ہر طرح کی عبادتوں کی مستحق اس کی ذات ہے یا اُن کی جو اپنی احتیاجوں میں خود کسی پروردگار کی پروردگاریوں کے محتاج ہیں؟

اس مقام میں اتاکم من کل ماسألتموہ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا کہ کر جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ نہایت اہم اور تشریح طلب ہے۔ تشریح اس کی سورۂ فاتحہ میں ملے گی۔

(١٥) پچھلی آیت میں انسان کی اس غفلت کا ذکر کیا تھا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکرگذار نہیں۔ اور یہی گمراہی اُس کی تمام محرومیوں کا سرچشمہ ہے: ان الانسان لظلوم کفار۔ اب آیت (٣٥) میں اس ناشکری کی ایک مناسب مقام مثال بیان کردی۔ فرمایا۔ اس سے بڑھ کر ناشکری اور کیا ہو سکتی ہے جو قریش کر رہے ہیں؟ وہ وہاں کے ایک ایسے گوشہ میں سکونت رکھتے ہیں جو انسانی آبادی کے لیے زیادہ سے زیادہ ناموزوں مقام تھا۔ کہ ایک بے آب و گیاہ ریگستان، جہاں درندے بھی بھٹ نہ بنائیں، اور پرند بھی ہوا میں اُڑنا پسند نہ کریں لیکن اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اُسے ایسا دلچسپ و پُررونق معمور مقام بنا دیا کہ انسانی گروہوں کے دل بے اختیار اُس کی طرف کھنچنے لگے اور زمین کی ساری پیداواریں جو

٣٦ نے میرے طریقہ سے نافرمانی کی، (اُس سے میرا کوئی رشتہ نہیں، اور) تو بخشنے والا، رحمت فرمانے والا ہے! اے ہم سب کے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں، میں نے اپنی بعض اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے، اور خدایا! اُس لیے بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں (تاکہ یہ محترم گھر عبادت گزارانِ توحید سے خالی نہ رہے) پس تو اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ لوگوں کے دل اُن کی طرف مائل ہو جائیں، اور اُن کے لیے زمین کی پیداوار کی سامانِ رزق مہیا کر دے تاکہ (بے آب و گیاہ ریگستان میں رہ کر بھی ضروریاتِ معیشت سے محروم نہ رہیں اور) تیرے شکرگزار ہوں!"

٣٧ "اے ہمارے پروردگار! ہم جو کچھ چھپاتے ہیں، وہ بھی تو جانتا ہے۔ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، وہ بھی تیرے علم میں ہے۔ آسمان اور زمین کی کوئی چیز نہیں جو تجھ سے پوشیدہ ہو"

٣٨ (اور ابراہیم نے کہا) "ساری ستائش اللہ کے لیے ہے جس نے باوجود بڑھاپے کے مجھے اسمٰعیل اور اسحاق (دو فرزند) عطا فرمائے۔ بلاشبہ میرا پروردگار

لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۚ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ۝ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۖ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ۝ وَأَنذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُم مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَالٍ ۝

کسی سرسبز و شاداب ملک میں مل سکتی ہیں، اس بنجر سرزمین میں مہیا ہوگئیں۔ یہ انقلاب حال کیونکر ظہور میں آیا؟ اس طرح کہ حضرت ابراہیم نے یہاں دین حق کی عبادت گاہ بنائی، اور اس کی پاسبانی اپنی اولاد کے سپرد کی۔ اُنہوں نے دعا مانگی تھی کہ خدایا! اس ویرانے کو آباد کر دیجیو، چنانچہ ان کی دعا مقبول ہوئی اور یہ ویرانہ اس طرح آباد ہوگیا کہ تمام عرب و اطراف عرب کے سالانہ اجتماع کا مرکز بن گیا۔

رؤسار قریش اُنہی کی نسل سے ہیں اور اُنہی کی برکتوں کا ظہور ہیں، لیکن اُنہوں نے اس نعمت کا حق کس طرح ادا کیا؟ یوں ادا کیا کہ ملت ابراہیمی سے منحرف ہوگئے، ظلم و گمراہی کو اپنا شیوہ بنا لیا، وہ دین حق جس کے قیام کے لیے یہ عبادت گاہ بنائی گئی تھی اصنام پرستی سے بدل گیا اور اب اپنی تمام طاقتیں اُس دعوت کی مخالفت میں خرچ کر رہے ہیں، جو اسی ملت ابراہیمی کی تجدید ہے۔

(اپنے بندوں کی) دعائیں سُنتا اور قبول کرتا ہے!" "خدایا! مجھے توفیق دے کہ میں نماز قائم کروں، اور میری نسل کو بھی اس کی توفیق ملے! پروردگارا میری یہ دعا تیرے حضور قبول ہو!"

"پروردگارا! جس دن اعمال کا حساب لیا جائیگا تو مجھے اور میرے ماں باپ کو، اور اُن سب کو جو ایمان لائے (اپنے فضل و کرم سے) بخش دیجیو (اور حساب کی سختی میں نہ ڈالیو!)"

اور (اے پیغمبر!) ایسا خیال نہ کرنا کہ اللہ ان ظالموں کے کاموں سے غافل ہے (یعنے رؤسار مکہ کے کاموں سے) دراصل اللہ نے اُن کا معاملہ اُس دن تک کے لیے پیچھے ڈال دیا ہے جب (نتائج عمل کی ہلاکتیں ظہور میں آئینگی۔ اُس دن ان لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ شدت خوف و حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائینگی۔ حیران، سراسیمہ، نظریں اُٹھائے ہوئے، دوڑ رہے ہونگے۔ نگاہیں ہیں کہ لوٹ کر آنے والی نہیں، اور دل ہیں کہ (خوف و حیرانگی کے سوا ہر خیال سے) خالی ہو رہے ہیں!

اور (اے پیغمبر!) لوگوں کو اس دن کی آمد سے خبردار کر دو جبکہ اُن پر عذاب نمودار ہو جائیگا۔ اُس دن ظلم کرنے والے کہینگے "پروردگار! تھوڑی سی مدت کے لیے ہمیں مہلت دیدے۔ ہم (اب ہرگز انکار و سرکشی نہیں کرینگے اور) تیری پکار کا جواب دینگے اور پیغمبروں کی پیروی کرینگے" (لیکن اُنہیں جواب ملیگا:) "کیا تم وہی نہیں ہو کہ اب سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے، ہمیں کسی طرح کا زوال نہ ہوگا؟

وَسَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ
الْأَمْثَالَ ۝ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِندَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ ۴۵
الْجِبَالُ ۝ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ۝ يَوْمَ تُبَدَّلُ ۴۶-۴۷
الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ ۖ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ ۴۸
مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ ۴۹-۵۰
اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا ۵۱
بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ ۵۲ ع ۱۷

تم انہی لوگوں کی بستیوں میں بسے تھے جنھوں نے اپنی جانوں کے ساتھ ناانصافی کی تھی، اور تم
پر اچھی طرح واضح ہوگیا تھا کہ ہم نے اُن کے ساتھ کیا کیا، نیز تمہیں سمجھانے کے لیے طرح طرح کی
مثالیں بھی ہم نے بیان کردیں (پھر بھی تم سرکشی سے باز نہ آئے) اُن لوگوں نے اپنی ساری تدبیریں ۴۵
کر لی تھیں، اور اگرچہ اُنکی تدبیریں ایسی تھیں کہ پہاڑوں کو جگہ سے ہلا دیں، مگر اللہ کے پاس ان کی
ساری تدبیروں کا جواب تھا۔ (ان کی کوئی تدبیر بھی ظہور نتائج کو نہ روک سکی!) ۴۶
پس ایسا خیال نہ کرنا کہ اللہ اپنے رسولوں سے جو وعدہ کرچکا ہے، اُس کے خلاف کریگا (ایسا
ہونا ممکن نہیں) وہ (سب پر) غالب ہے، اور (اعمال بد کی) سزا دینے والا ہے! ۴۷

وہ دن، کہ جب یہ زمین بدل کر ایک دوسری
ہی زمین ہوجائیگی، اور آسمان بھی بدل جائینگے
اور سب لوگ خدائے یگانہ و غالب کے حضور
حاضر ہونگے: ۴۸

(۱۶) آیت (۴۸) سے معلوم ہوا کہ جس حادثہ کو قرآن نے
قیامت سے تعبیر کیا ہے، وہ اجرام سماویہ کا کوئی ایسا حادثہ
ہوگا جو کرۂ ارضی کو بالکل بدل دیگا۔ نہ تو زمین وہ زمین
رہیگی جیسی کہ اب ہے۔ نہ آسمان ویسا آسمان ہوگا جیسا
اب نظر آرہا ہے۔

تم اُس دن مجرموں کو دیکھوگے کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے کرتے گندھک ۴۹
کے ہونگے اور چہرے آگ کے شعلوں سے ڈھنپے ہوئے۔ یہ اس لیے ہوگا کہ اللہ ہر جان کو اسکی کمائی ۵۰
کے مطابق بدلہ دیدے۔ بلاشبہ وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے! ۵۱
یہ انسانوں کے لیے ایک پیام ہے، اور اس لیے بھیجا گیا ہے کہ لوگوں کو خبردار کیا جائے، اور وہ
معلوم کرلیں کہ اُن کا معبود ایک ہی معبود ہے۔ نیز
اس لیے کہ سمجھ بوجھ والے اس سے نصیحت پکڑیں! ۵۲

(۱۷) آخری آیت میں فرمایا، یہ سورت ایک پیام حق ہے، اور
یہ پیام اس لیے بھیجا گیا ہے کہ:
(ا) لوگ فساد و بدعملی کے نتائج سے متنبہ کیے جائیں۔
(ب) یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (بقیہ نوٹ برصفحہ ۲۹۵)

سُورۃ الحجر ۱۵

مکی - ۹۹- آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۞ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۞ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۞ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۞ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۞

الف - لام - را -

یہ آیتیں ہیں الکتاب کی، اور قرآن کی جو (اپنی ساری باتوں میں) واضح اور روشن ہے! ۱

جن لوگوں نے (اس کتاب کی سچائی سے) انکار کیا ہے، ایک وقت آنے والا ہے کہ آرزوئیں کرینگے، کاش ہم ماننے والوں میں ہوتے! ۲

(اے پیغمبر!) انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ کھائیں، پییں، عیش و آرام کریں، (باطل) اُمیدوں پر بھولے رہیں۔ لیکن وہ وقت دور نہیں کہ انہیں معلوم ہو جائیگا (وہ کیسے دھوکے میں پڑے ہوئے تھے!) ۳

ہم نے کبھی کسی بستی کے باشندوں کو ہلاک نہیں کیا، مگر اسی طرح کہ اُس کے لیے ایک ٹھہرائی ہوئی بات تھی (یعنی ایک مقررہ قانون تھا کہ جب کوئی حالت اس طرح کی ہوگی، اور اس مقدار میں ہوگی، تو ایسا نتیجہ ضرور نکلیگا) کوئی اُمت نہ تو اپنے وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے، نہ پیچھے رہ سکتی ہے! ۴-۵

(۱) قرآن نے جابجا اپنے اس وصف پر زور دیا ہے کہ وہ "مبین" ہے۔ یعنی ظاہر ہے، نمایاں ہے، روشن ہے۔
لیکن کس بات میں!
اپنے مطالب میں، اپنی دعوت میں، اپنے دلائل و آیات میں۔ یعنے اُس کی کوئی بات نہیں جو اُلجھی ہوئی ہو، مشکل ہو، ناقابل فہم ہو۔ ہر ذہن اُسے بوجھ لے سکتا ہے، ہر دل اُسے قبول کر لے سکتا ہے، ہر روح اُس پر مطمئن ہو جا سکتی ہے۔
وہ زیادہ سے زیادہ سیدھی سادی بات ہے جو انسان کے دل و دماغ کے لیے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ سچائی ہے اور سچائی کی کوئی بات مشکل اور اُلجھی ہوئی نہیں ہو سکتی!
یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے کو "النور" بھی کہا ہے۔ یعنی روشنی۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ ہر بات کو نمایاں کر دیتی ہے۔ کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اگر وضاحت اور نمود نہیں ہے۔ تو پھر اُجالا بھی نہیں۔ اُجالا جب کبھی ہوگا، نمود و وضاحت اپنے ساتھ لائیگا!

(۲) جن لوگوں نے اس کے خلاف انکار و سرکشی کی راہ اختیار کی ہے، وہ اپنی ہلاکت کا اپنے ہاتھوں سامان کر رہے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں۔ ایک دن آنے والا ہے جب وہ حسرت و ندامت کے ساتھ کہینگے۔ کاش ہم نے انکار نہ کیا ہوتا!

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹۴) (۳) ارباب فہم و دانش کے لیے سرمایۂ نصیحت ہو۔
اب سورت کے تمام مطالب پر از سر نو نظر ڈالو، اور دیکھو، ان تینوں مقاصد پر وہ مشتمل ہے یا نہیں!

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ ٦
مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ۝ إِنَّا نَحْنُ ٨-٧
نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا ١٠-٩
يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝ ١٢-١١
لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا ١٣
فِيهِ يَعْرُجُونَ ۝ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ ۝ وَلَقَدْ ١٥-١٤ ع
جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا

اور (اے پیغمبر!) ان لوگوں نے تم سے کہا: "اے وہ آدمی کہ تجھ پر نصیحت اُتری ہے، تو (ہمارے خیال میں) یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ فرشتے اُتار کر ہمیں دکھا دے!" ٦-٧

ہم فرشتے بیکار کو نہیں اُتارا کرتے جبھی اُتارتے ہیں کہ کوئی مصلحت ہوتی ہے، اور (جب فرشتے اُتریں گے) تو اُس وقت انہیں مہلتِ عمل نہیں ملیگی (وہ تو فیصلۂ عمل کا دن ہوگا) ٨

بلاشبہ خود ہم نے الذکر (یعنے قرآن کہ سرتاپا نصیحت ہی) اُتارا ہے، اور بلاشبہ خود ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ ٩

اور (اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تم سے پہلے بھی پچھلے گروہوں میں پیغمبر بھیجے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی گروہ میں کوئی پیغمبر آیا ہو اور لوگوں نے اُس کی ہنسی نہ اُڑائی ہو (یہ پہلے سے ہوتا آیا ہے، اور اب بھی ہو رہا ہے) ١٠-١١

تو دیکھو، اس طرح ہم مجرموں کے دلوں میں کلامِ حق کی مخالفت بٹھا دیتے ہیں (یعنے ہمارا ٹھہرایا ہوا قانون ایسا ہی ہے کہ جن دلوں میں جرم ہوتا ہے، ان میں حق کی مخالفت بھی جم جاتی ہے) وہ اس پر ایمان لانے والے نہیں، اور جو پہلے گذر چکے ہیں، اُن کا بھی ایسا ہی دستور رہ چکا ہے۔ ١٢-١٣

اگر ہم ان پر آسمان کا ایک دروازہ کھول دیں اور یہ دن دہاڑے اُس پر چڑھنے لگیں، جب بھی نہیں مانینگے۔ یہ کہنے لگینگے "ضرور ہماری آنکھیں متوالی ہو گئی ہیں، یا ہم پر جادو کردیا گیا ہے" ١٤-١٥

اور (دیکھو) یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ آسمان میں بُرج بنا دیے (یعنے روشن کواکب پیدا کر دیے)

(۳) یہاں آیت (۱۶) میں نیز دو اور مقامات میں بھی، قرآن نے "برج" کا لفظ استعمال کیا ہے ابتک

وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ ۱۶-۱۷
فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ ۱۸
شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ۝ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۝ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ ۱۹-۲۰
اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ

الذی جعل فی السماء بروجا وجعل فیہا سراجا وقمرا منیرا (۲۵: ۶۱) والسماء ذات البروج (۸۵: ۱) چونکہ بعد کو عربی زبان میں "برج" کا لفظ ستاروں کی اُن بارہ فرضی اشکال کے لیے مستعمل ہو گیا جو قدما نے دورۂ شمسی کے انضباط کے لیے قرار دی تھیں، اس لیے سوال پیدا ہوا کہ قرآن میں بھی یہ لفظ اسی مصطلح معنی میں بولا گیا ہے، اور مقصود بارہ برج ہیں؟ یا لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے، اور مقصود بڑے بڑے روشن ستارے ہیں جو بحر و بر کی ظلمتوں میں مسافروں کی رہنمائی کرتے ہیں؟

بارہ برجوں کی تقسیم سب سے پہلے اہل بابل نے کی۔ پھر سریانی اقوام اُن سے آشنا ہوئیں، اور بالآخر یونانیوں نے اختیار کر لیا۔ عربی زبان اپنی ابتدائی شکلوں میں عراق، مصر اور شام کی حکمراں زبان رہ چکی ہے، اور ان ممالک کے ساتھ عربوں کے قدیم تجارتی تعلقات بھی معلوم و مسلّم ہیں پس اگر چاند کی منزلوں کی طرح سورج کے بارہ برجوں سے بھی عربی زبان آشنا ہو چکی ہو، تو یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی لیکن اس میں شک نہیں کہ عرب جاہلیت کے کلام سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ عبدالرحمٰن بن عمر الصوفی نے الکواکب و الصُّوَر میں ان تمام کواکب کے نام جمع کر دیے ہیں جو عرب جاہلیت میں مشہور تھے اور جن کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے، لیکن ان میں بارہ برجوں کی صورتوں کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور تبریزی نے ابو العلاء کا قول نقل کیا ہے "لم تکن العرب تعرفہا فی القدیم"[۱]

پس زیادہ صاف بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں برج سے مقصود روشن کواکب ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس

اور اُسے دیکھنے والوں کے لیے خوشنما کر دیا۔ نیز ہر بھگائے ہوئے شیطان سے اُس کی حفاظت کر دی۔ الّا یہ کہ کوئی گُن سن لینا چاہے تو پھر ایک چمکتا ہوا شعلہ ہے جو اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۱۸

اور (دیکھو) ہم نے زمین (کی سطح) پھیلا دی (یعنی ایسی بنا دی کہ تمہارے لیے بچھے ہوئے فرش کی طرح ہو گئی) اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے نیز جتنی چیزیں اس میں اُگائیں، سب وزن کی ہوئی اُگائیں، ۱۹ اور تمہارے لیے معیشت کا سارا سامان مہیا کر دیا، اور اُن مخلوقات کے لیے بھی کر دیا جن کے لیے تم روزی مہیا کرنے والے نہیں ہو! ۲۰

اور (دیکھو) کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ اُس کے ذخیرے ہمارے پاس نہ ہوں، مگر ہم اُنہیں ایک ٹھہرائے ہوئے اندازہ کے مطابق ہی بھیجتے ہیں۔ ۲۱

اور (دیکھو) ہم نے ہوائیں چلائیں کہ (بادلوں کے ذرّوں سے) باردار تھیں۔ پھر آسمان سے پانی برسا دیا، اور وہ تمہارے پینے کے کام آیا، اور تم نے اُسے ذخیرہ کر کے نہیں رکھا

---

[۱] شرح التبریزی علی الحماسہ جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۵۔ طبع مصر۔ قس بن ساعدۃ الایادی کی طرف جو خطبہ منسوب ہے، اس میں بلاشبہ "برج" کا لفظ آیا ہے: لیل داج، و سماء ذات ابراج۔ لیکن اول تو اس کی صحت بہت مشکوک ہے، ثانیاً اس میں بھی برج کا استعمال لغوی معنی میں ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ مصطلح فلکیین ہو۔ عربی میں "برج" کے اصلی معنی ظہور و نمائش کے ہیں اور اسی سے تبرّج ہے یعنی زینت کی نمائش کرنا۔ پھر اس کا اطلاق قصر، محل، منزل اور شاہراہ پر بھی ہونے لگا کہ یہ تمام چیزیں ظاہر و نمایاں ہوتی ہیں۔

۲۲-۲۳ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ ۚ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ۝ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ۝

۲۴ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۚ

۲۵ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ ع وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ۝ وَ

۲۷ الْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ ۝ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ

۲۸ بَشَرًا مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ۝ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا

---

۲۲ سے ایسی ہی تفسیر منقول ہے اور ترجمہ میں ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

تھا۔

اور یہ ہم ہی ہیں کہ جلاتے ہیں اور موت طاری

۲۳ کرتے ہیں، اور ہمارے ہی قبضہ میں سب کی کمائی آتی ہے

۲۴ اور بلا شبہ ہم نے اُن لوگوں کو بھی جانا جو تم میں پہلے آنے والے تھے، اور اُنہیں بھی جو پیچھے آنے والے ہیں!

اور (اے پیغمبر!) یہ تیرا پروردگار ہی ہے جو ان سب کو (قیامت کے دن اپنے سامنے) جمع کریگا وہ حکمت والا علم والا ہے!

۲۵ اور بلا شبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا، جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے،

۲۶ اور ہم جانّ کو اس سے پہلے جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے۔

۲۷ اور (اے پیغمبر!) جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا "میں خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے، ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں (یعنے نوعِ انسانی پیدا کرنے والا ہوں) تو جب ایسا ہو کہ میں اُسے درست

۲۸ کر دوں (یعنے وہ وجود تکمیل کو پہنچ جائے) اور اُس میں اپنی رُوح پھونک دوں، تو چاہیے کہ تم سب

(۴) اس آیت میں فرمایا۔ وزینّاھا للناظرین ہم نے اس فضا کو جو تمہارے اوپر پھیلی ہوئی ہے، اس طرح بنا دیا کہ دیکھنے والوں کے لیے اس میں خوشنمائی پیدا ہو گئی۔ یہ مقام بھی من جملہ اُن مقامات کے ہے جہاں قرآن نے جمالِ فطرت سے استدلال کیا ہے۔ یعنے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ کائناتِ ہستی کے تمام نظام اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ اُن میں حسن و جمال کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، اور یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ رحمت و فیضان کا کوئی ارادہ یہاں ضرور کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے، حسن و خوبی کے ساتھ بنے، اور اس میں روحوں کے لیے سرور اور نگاہوں کے لیے عیش و نشاط ہو!

اگر ایک صاحبِ رحمت ہستی کی یہ کارفرمائی نہیں ہے، تو پھر کس کی ہے؟ نہیں، تمہاری فطرت کہہ رہی ہے کہ یہ سب کچھ کسی ایسی ہستی کی کاریگری ہے جو حسن و جمال ہے، اور جس نے چاہا ہے کہ حسن و جمال کا فیضان ہو۔ یہاں فرمایا کہ آسمان کو دیکھو۔ عربی میں "سماء" کے معنی بلندی کے ہیں۔ مکان کے لیے اس کی چھت اُس کی "سماء" ہوتی ہے۔ پس یہ جو بلندی تمہیں نظر آ رہی ہے، کس طرح دیکھنے والوں کے لیے حسین و جمیل بنا دی گئی ہے! چاندنی راتوں میں چاند کی شب افروزیاں دیکھو، اندھیری راتوں میں ستاروں کی جلوہ ریزیوں کا نظارہ کرو، صبح جب اپنی ساری دلفریبیوں کے ساتھ آتی ہے، شام جب اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ چھپتی ہے، گرمیوں

۲۹-۳۱ لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝

۳۲ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ

۳۳-۳۴ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ

۳۵-۳۷ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝

۳۸ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ

۳۹-۴۰ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ

۲۹ اُسکے آگے سربسجود ہوجاؤ" چنانچہ جتنے فرشتے تھے سب
۳۰ اُسکے آگے سربسجود ہوگئے۔ مگر ایک ابلیس۔ اس پر
۳۱ یہ بات شاق گزری کہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو
اللہ نے فرمایا "اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ سجدہ
۳۲ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟"
کہا "مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ کروں
۳۳ جسے تو نے خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے"
۳۴-۳۵ حکم ہوا "اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا، کہ تو راندہ ہوا اور جزاء کے دن تک تجھ پر لعنت ہوئی"
اُس نے کہا "خدایا! مجھے اُس دن تک مہلت
۳۶ دے جب انسان (دوبارہ) اُٹھائے جائینگے"
فرمایا "اُس مقررہ وقت کے دن تک تجھے
۳۷-۳۸ مہلت دی گئی"
اس نے کہا "خدایا! چونکہ تو نے مجھ پر (نجات و
سعادت کی) راہ بند کردی، تو اب میں ضرور ایسا
کرونگا کہ زمین میں اُن کے لیے (جھوٹی) خوشنمائیاں
۳۹ بنادوں اور (راہِ حق سے) گمراہ کردوں۔ ہاں اُن
میں جو تیرے مخلص بندے ہونگے، (میں جانتا
۴۰ ہوں) میرے بہکانے میں آنے والے نہیں"
فرمایا "بس یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے

میں صاف شفاف آسمان کا نکھرنا، بارش میں بادلوں کا ہر طرف کو اُمنڈنا، شفق کی لالہ گونی، قوس قزح کی بوقلمونی، سورج کی زرافشانی، غرضکہ آسمان کا کونسا منظر ہے جس میں نگاہوں کے لیے زینت نہیں، جس میں دلوں کے لیے راحت و سکون نہیں؟

یہ استدلال مہماتِ دلائل قرآنی میں سے ہے، اور ضروری ہے کہ تفسیر سورۂ فاتحہ کے مبحث "برہانِ فضل و رحمت" کا مطالعہ کرلیا جائے۔

(۵) آیت (۱۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ اجرام سماوی کی حفاظت کا سامان نہ کردیا گیا ہوتا، تو ایسی شیطانی قوتیں تھیں جو اُن کے اعمال میں خلل انداز ہوتیں۔ نیز یہ کہ جب کوئی ایسی قوت لَو لگانا چاہتی ہے، تو شعلے بھڑکتے ہیں، اور اُنہیں قریب نہیں آنے دیتے۔

آیت میں "شہاب مبین" کا لفظ آیا ہے۔ شہاب شعلہ کو کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا اطلاق اُس ستارے پر بھی ہوتا ہے جو راتوں کو ٹوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اس لیے مفسرین نے خیال کیا، یہاں شہاب سے مقصود وہی ستاروں کا ٹوٹنا ہے، لیکن قرآن میں کوئی ایسی تفصیل نہیں جس سے یہ بات تعین کی جاسکے۔ صرف "شہاب" کا لفظ ہے، اور اس کے معنی شعلے کے ہیں۔ باقی رہی اس معاملہ کی حقیقت، تو یہ عالم غیب کے معاملات میں سے ہے جسے ہم اپنے وسائل علم و ادراک سے معلوم نہیں کرسکتے۔ وحی الٰہی نے جس قدر تصریح کردی ہے، اُس پر یقین کرنا

٤١-٤٢ مُسْتَقِيْمٌ ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَ
٤٣-٤٤ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝
٤٥-٤٦ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ
٤٧-٤٨ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝
٤٩-٥٠ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝ وَنَبِّئْهُمْ
٥١ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ۝

والی ہے۔ جو میرے (مخلص) بندے ہیں، اُن پر تیرا کچھ زور نہیں چلیگا۔ صرف اُنہی پر چلیگا جو (بندگی کی) راہ سے بھٹک گئے، اور (اُن سب کے) لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے (جو کبھی ٹلنے والا نہیں)، اُس کے سات دروازے ہیں۔ اُن کی ہر ٹولی کے حصہ میں ایک دروازہ آئیگا، جس سے جہنم میں داخل ہونگے۔

بلاشبہ متقی انسان (اُس دن) باغوں اور چشموں (کے عیش و راحت) میں ہونگے۔ (اُنہیں کہا جائیگا) سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔ اُن کے دلوں میں جو کچھ (باہمی) رنجشیں تھیں، سب ہم نے نکال دیں۔ وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہونگے۔ وہاں کسی طرح کا صدمہ اُنہیں چھو نہیں سکیگا، نہ وہاں سے کبھی نکالے جائینگے۔

(اے پیغمبر!) میرے بندوں کو آگاہ کر دے کہ بلاشبہ میں ہی ہوں کہ بخشنے والا، رحمت والا ہوں، اور بلاشبہ میرا عذاب بڑا دردناک عذاب ہوتا ہے!

اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کا معاملہ بھی سنا دو

چاہیے اور مزید کاوش میں نہیں پڑنا چاہیے۔

(٦) زمین گیند کی طرح گول ہے، لیکن حکمت الٰہی نے اس کی گردیت کا نشیب و فراز اس طرح پھیلا دیا ہے کہ کوئی آنکھ اُونچ نیچ محسوس نہیں کر سکتی، اور اس کا ہر گوشہ اپنی جگہ ایک بچھے ہوئے فرش کی طرح مسطح ہے۔ اگر سطحیت کی یہ حالت پیدا نہ ہوتی، تو وہ تمام ارضی خصوصیات بھی ظہور میں نہ آتیں، جنہوں نے زمین کو زندگی و معیشت کے لیے خوشگوار بنا دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جابجا اس کی سطح کے پھیلاؤ پر زور دیتا ہے، اور کہتا ہے، خدا نے اسے فرش کی طرح بچھا دیا۔ یہاں بھی آیت (١٩) میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن زمین کے قابل معیشت و سکون ہونے کے لیے صرف اسی قدر کافی نہ تھا۔ اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس میں جابجا ایسی بلندیاں ہوتیں جو پانی کے خزانے جمع کرتیں، اور پھر بلندی سے اس طرح گراتیں کہ سینکڑوں کوسوں تک بہتا ہوا چلا جاتا اور میدانی علاقوں کو سرسبز و شاداب کر دیتا۔ پس فرمایا: والقینا فیہا رواسی۔ ہم نے اس کی سطح پھیلا دی پھر اس میں پہاڑ پیدا کر دیے، جو اس لحاظ سے بھی کہ طرح طرح کی معدنیات کا سرچشمہ ہیں، اور اس لحاظ سے بھی کہ دریاؤں کی روانی کا منبع ہیں، زمین کی افادی نوعیت کے لیے ایک ضروری عنصر تھے۔

(٧) آیت (١٩) میں زمین کی نسبت تین باتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری یہ کہ پہاڑوں کی بلندیاں ہیں۔ تیسری یہ کہ جتنی چیزیں اس میں اُگتی ہیں، سب موزوں ہیں۔

"موزوں" یعنی وزن کی ہوئی۔ اگر کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک

۵۲ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ۝ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ
۵۴-۵۳ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ۝ قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ۝ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ
۵۶-۵۵ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ ۝ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ۝ قَالَ فَمَا
۵۸-۵۷ خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ۝ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُجْرِمِينَ ۝ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا
۵۹ لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا امْرَأَتَهُ

کسی خاص اندازہ پر رکھنا ہوتا ہے، تو اُسے کانٹے میں تول لیا کرتے ہیں کہ رتی بھر بھی ادھر اُدھر نہ ہو جائے۔ پس ہر چیز کے موزوں ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ زمین میں جتنی نباتات اُگتی ہیں، سب کے لیے حکمت الٰہی نے ایک خاص اندازہ ٹھہرا دیا ہے۔ ہر چیز اپنی نوعیت، اپنی کمیت، اپنی کیفیت میں ایک نپی تلی حالت رکھتی ہے، جس سے کبھی باہر نہیں جا سکتی۔ ممکن نہیں کہ گھانس کی ایک شاخ بھی ایسی اُگ آئے جو گھانس کے مقررہ اندازہ اور تناسب کے خلاف ہو۔

طرح طرح کے غلے، طرح طرح کے پھول، طرح طرح کے پھل، طرح طرح کی سبزیاں، طرح طرح کے درخت، طرح طرح کی گھانس ہر طرف اُگ رہی ہیں، اور نہیں معلوم کب سے اُگ رہی ہیں، لیکن کوئی چیز بھی ان میں ایسی ہے جس کی شکل، ڈیل ڈول، رنگت، خوشبو، مزہ، اور خاصہ ایک خاص مقررہ اندازہ پر نہ ہو؟ اور ٹھیک ٹھیک کانٹے کی تول نہ ہو؟ گیہوں کا ایک دانہ اُٹھاؤ، پھول کی ایک کلی توڑ لو، گھانس کی ایک پتی سامنے رکھ لو، اور دیکھو، اُن کی ساری باتیں کس طرح تلی ہوئی اور کس دقیقہ سنجی کے ساتھ سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں! اگر جسم ہے تو اُس کا ایک مقررہ اندازہ ہے۔ لاکھ مرتبہ بوؤ، کروڑ مرتبہ بوؤ، اس اندازہ میں فرق آنے والا نہیں۔ اگر شکل ہے تو اُس کا ایک خاص اندازہ ہے۔ وہ چیز جب اُگیگی اُسی شکل میں اُگیگی۔ اگر رنگت ہے، خوشبو ہے، مزہ ہے، خاصہ ہے، تو سب کا ایک مقررہ اندازہ ہے، اور یہ اندازہ قطعی ہے، دائمی ہے، اٹل ہے، اسٹ ہے، اور ہمیشہ اسی یکسانیت کے ساتھ ظہور میں آتا ہے۔ گویا مٹی کے ایک ایک ذرہ میں ایک ایک ترازو رکھ دیا گیا ہے اور وہ ایک ایک دانے، ایک ایک پتے، ایک ایک پھل کو تول تول کر بانٹ رہا ہے۔ ممکن نہیں اس تول میں کبھی خرابی پڑے!

"موزوں" میں تناسب و اعتدال کا مفہوم بھی داخل ہے۔

جب یہ مہمان اس کے پاس آئے، تو کہا "تم پر سلامتی ہو"

ابراہیم نے کہا "ہمیں تم سے اندیشہ ہے" (کہ تم کون لوگ ہو!) ۵۲

اُنہوں نے کہا "ڈرو مت۔ ہم تو تمہیں ایک علم والے فرزند کی پیدائش کی خوش خبری سُناتے ہیں" ۵۳

ابراہیم نے کہا "تم مجھے اس بات کی خوشخبری دیتے ہو حالانکہ مجھ پر بڑھاپا طاری ہو گیا ہے، کونسی اُمید اب رہ گئی ہے کہ یہ خوشخبری مجھے سناؤ" ۵۴

اُنہوں نے کہا "ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ خوشخبری سُنائی پس تمہیں نا اُمید نہ ہونا چاہیے" ۵۵

ابراہیمؑ نے کہا "نہیں، میں اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہیں ہوں۔ کیونکہ گمراہوں کے سوا کون ہے جو اپنے پروردگار کی رحمت سے مایوس ہو سکتا ہے؟" ۵۶

پھر اُس نے پوچھا "تم لوگ جو بھیجے ہوئے آئے ہو، تو تمہیں (اور) کونسی مہم درپیش ہے؟" ۵۷

اُنہوں نے کہا "ہم ایک مجرم گروہ کی طرف بھیجے گیے ہیں (کہ ہلاک ہونے والا ہے) مگر (ہاں) ایک خاندان وہاں لوط کا ہے۔ اُس کے تمام افراد کو ہم بچا لینگے۔ البتہ اُس کی بیوی نہیں بچیگی۔ اس کے لیے ۵۸ ۵۹

قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ۝ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ۝ وَجَآءَ [60-65]

ہمارا اندازہ ہوچکا۔ وہ پیچھے رہ جانے والوں کا ساتھ دیگی۔"

پھر جب ایسا ہوا کہ یہ بھیجے ہوئے (فرشتے) خاندان لوط کے پاس پہنچے، تو اُنہوں نے کہا "تم لوگ اجنبی آدمی معلوم ہوتے ہو" [61-62]

انہوں نے کہا "نہیں یہ بات نہیں ہے، بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لیکر آئے ہیں، جس میں لوگ شک کیا کرتے تھے (یعنے ہلاکت کے ظہور کی خبر جس کا لوگوں کو یقین نہ تھا) ہمارا آنا ایک امر حق کے لیے ہے، اور اپنے بیان میں سچے ہیں پس چاہیے کہ کچھ رات رہے اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ اور ان کے پیچھے قدم اُٹھاؤ، اور اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی پیچھے مڑ کے نہ دیکھے۔ جہاں جانے کا حکم دیدیا گیا ہے، (اُسی طرف رُخ کیے) چلے جائیں"۔ [63-65]

غرضکہ ہم نے لوط پر حقیقت حال واضح کردی کہ ہلاکت کا ظہور ہونے والا ہے اور باشندگان شہر کی بیخ و بنیاد صبح ہوتے ہوتے اکھڑ جانے والی ہے۔ [66]

اور (اس اثنا میں ایسا ہوا کہ) شہر کے لوگ

یعنے جتنی چیزیں اُگتی ہیں، اپنی ساری باتوں میں تناسب اعتدال کی حالت رکھتی ہیں۔ کوئی شے نہیں جو اپنی کیفیت و کمیت میں غیر متناسب اور غیر معتدل ہو۔

(۸) تفسیر سورۂ فاتحہ میں "نظام ربوبیت" کی بحث گزر چکی ہے۔ آیت (۲۰) کا اسی روشنی میں مطالعہ کرو، اور دیکھو کتنے مختصر اور کیسے سیدھے سادے لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت بیان کردی گئی ہے! فرمایا: جعلنا لکم فیھا معایش۔ ہم نے زمین میں تمہارے لیے زندگی و معیشت کے سارے سروسامان مہیا کر دیے لیکن کس طرح مہیا کیے: اس طرح، کہ اگرچہ ہر چیز کے ہمارے پاس ذخیرے ہیں، لیکن اُن کی بخشش ایک مقررہ اندازے ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بغیر کسی اندازہ اور نظام کے تمام چیزیں بکھیر دی ہوں۔ اور یہ جو ایک مقررہ اندازہ کا نظام ہے۔ یعنے تقدیر اشیاء کا، تو یہی ہے جو بتلا رہا ہے کہ یہاں کوئی اندازہ مقرر کرنے والی اور اسے قائم رکھنے والی ہستی ضرور ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ اس اندازہ شناسی اور انضباط کے ساتھ ہر ضروری چیز کی بخشش کا نظام قائم ہوجاتا۔

پھر اس کے بعد بارش کی مثال دے کر مزید وضاحت فرمادی۔ فرمایا۔ بارش زمین کی شادابی اور روئیدگی کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو، تو زمین کی روئیدگی بھی نہ ہو۔ لیکن دیکھو کس طرح یہ معاملہ ظہور میں آتا ہے، اور کس طرح مقررہ اندازوں اور پیمانوں کا ایک پورا نظام کام کر رہا ہے؟ پہلے سمندر سے بھاپ اُٹھتی ہے۔ وہ پانی کے ذروں سے باردار ہو کر (یعنے انہیں اپنے اندر لے کر) بلندی کی طرف چڑھتی ہے۔ پھر بلندی میں ابر کی چادریں بنتی ہیں، اور چادریں فضا میں پھیل جاتی ہیں پھر وہی چادریں بارش کے قطرے بن کر گرنے لگتی ہیں، اور زمین کے ایک ایک ذرّے کو شاداب کر دیتی ہیں۔ تم نے پانی کے ذخیرے جمع کر کے نہیں رکھے تھے، لیکن آسمان جمع کرتا رہتا ہے، اور پھر ٹھیک ٹھیک تمہاری احتیاج کے مطابق مطلوبہ مقدار تمہیں بخش دیتا ہے!

اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ قَالَ اِنَّ هٰؤُلَاۗءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ○ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ ○ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ قَالَ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ○ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ○ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ○

۶۶-۶۸ ۶۹-۷۰-۷۱ ۷۲-۷۳ ۷۴-۷۵

یہ بات کہ پانی کے جمع ہونے اور ایک خاص ترتیب اور اندازہ کے ساتھ بہتے رہنے کا ایک پورا کارخانہ بنا ہوا ہے، اور وہ زمین کی احتیاج کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے، یہاں استدلال کا اصلی نقطہ ہے۔ کیونکہ تقدیر و نظم کی یہ حالت بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ ربوبیت کا کوئی ارادہ پس پردہ کام کر رہا ہو۔ اسی حقیقت کو ہم نے تفسیر سورۂ فاتحہ میں "نظامِ ربوبیت" سے تعبیر کیا ہے، اور ضروری ہے کہ اس پر نظر ڈال لی جائے۔

اس کے بعد فرمایا۔ ہم ہی ہیں کہ جِلاتے ہیں اور موت طاری کرتے ہیں، اور اس کا علم رکھتے ہیں کہ کون پہلے آنے والوں میں ہوئے، کون پیچھے آنے والوں میں۔ یعنے جس طرح ہم نے تمام چیزوں کی تقدیر کر دی ہے۔ یعنے مقررہ اندازہ ٹھہرا دیا ہے، اسی طرح موت و حیات کا بھی ایک خاص اندازہ ٹھہرا دیا ہے، اور قوموں کے تقدم و تاخر کے لیے بھی مقررہ اندازہ ہے۔ ہر ہستی جو پیدا ہوتی ہے، اپنے مقررہ اندازہ کے مطابق پیدا ہوتی ہے اور ہر ہستی جو مرتی ہے، مقررہ اندازہ کے مطابق مرتی ہے۔ تقدیر اشیاء و اجسام کا قانون عالمگیر قانون ہے۔ ہستی کا کوئی گوشہ نہیں جو اس سے باہر ہو

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قرآن میں "قدر" اور "تقدیر" کا مطلب کیا ہے؟ نیز اُن تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا جو اس بارہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔

(۹) اس کے بعد آیت (۲۵) میں فرمایا: وان ربک ھو یحشرھم۔ انہ حکیم علیم۔ یعنے ایسا ضرور ہونے والا ہے کہ تمہارا پروردگار جزاءِ عمل کے لیے اُنہیں اپنے حضور جمع کرے کیونکہ تمام باتوں کی طرح اس بات کے لیے بھی اُس نے ایک اندازہ ٹھہرا دیا ہے۔ وہ حکیم و علیم ہے۔ اور جب وہ حکیم ہے، تو ممکن نہیں کہ اُس نے انسان کے اعمال کے لیے کوئی اندازہ نہ ٹھہرا دیا ہو، اور جب وہ علیم ہے، تو ممکن نہیں کہ انسان کے اعمال اُس کی نظر سے پوشیدہ رہ سکیں۔

خوشیاں مناتے ہوئے آپہنچے۔ ۶۷

لوط نے کہا "دیکھو یہ (نئے آدمی) میرے مہمان ہیں، تو میری فضیحت نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو۔ تم میری رسوائی کے کیوں درپے ہو گئے ہو؟" ۶۸ ۶۹

اُنھوں نے کہا "کیا ہم نے تجھے اس بات سے نہیں روک دیا تھا کہ کسی قوم کا آدمی ہو، لیکن اپنے یہاں نہ ٹھہراؤ" (اگر ٹھہراؤ گے تو پھر جو کچھ ہمارے جی میں آئیگا کر گزرینگے) ۷۰

لوط نے کہا "اگر ایسا ہی ہے، تو دیکھو، یہ میری بیٹیاں (کھڑی) ہیں (یعنے باشندگان شہر کی بیویاں جن کی طرف وہ ملتفت نہیں ہوتے تھے) اُنکی طرف ملتفت ہو"۔ ۷۱

(تب فرشتوں نے لوط سے کہا) "تمہاری زندگی کی قسم، یہ لوگ تو اپنی بدمستیوں میں کھوئے گئے ہیں" (تمہاری باتیں ماننے والے نہیں) ۷۲

غرض کہ سورج نکلتے نکلتے ایک ہولناک آواز نے اُنہیں آلیا پس ہم نے وہ بستی زیر و زبر کر ڈالی ۷۳ اور پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی اُن پر بارش کی۔ ۷۴

بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو (حقیقت کی) پہچان رکھنے والے ہیں! ۷۵

وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ۝ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ۝ ع وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ۝ وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ۝ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ۝ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

اور (قوم لوط کی) یہ بستی (کسی غیر معروف گوشہ میں نہ تھی وہ) ایسی راہ پر واقع ہے جہاں آمد و رفت کا (اب بھی) سلسلہ قائم ہے (اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لے سکتے ہو) بلاشبہ اس (بستی کی حالت) میں ایمان رکھنے والوں کے لیے ایک بڑی نشانی ہے!

اور (اسی طرح) گھنے جنگل کے باشندے بڑے ظالم تھے (یعنے قبیلۂ مدین کے لوگ) انہیں بھی ہم نے (ظلم و سرکشی کی) سزا دی، اور یہ دونوں بستیاں (یعنے قوم لوط کی اور قبیلۂ مدین کی) شارع عام پر سب کو دکھائی دیتی ہیں۔

اور (دیکھو) حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔ ہم نے اپنی نشانیاں انہیں دکھلائیں مگر وہ روگردانی ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش کے گھر بناتے تھے کہ محفوظ رہیں لیکن (یہ حفاظتیں کچھ بھی کام نہ آئیں) ایک دن صبح کو اٹھے تو ایک ہولناک آواز نے آ پکڑا تھا۔ اور جو کچھ انہوں نے اپنی سعی و عمل سے کمایا تھا، وہ کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔

(۱۰) اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی کہ قدرت الٰہی نے کس طرح ایک حقیر ترین چیز سے جو ہمیشہ تمہارے قدموں سے پامال ہوتی رہتی ہے، انسان کی ہستی پیدا کی، اور اسے اس درجہ تک بلند کیا کہ ملائکہ کی مسجود ہو گئی، اور دنیا کی تمام قوتیں اس کے اختیار و تصرف میں دے دی گئیں۔ البتہ ایک قوت تمہارے آگے نہیں جھکی، وہ ابلیس کی تھی۔ یہ تمہارے آگے جھکتی نہیں، بلکہ تمہیں اپنے آگے جھکانا چاہتی ہے۔ فرمایا جو انسان اس سے مغلوب ہو گیا، اس نے راہ سعادت گم کر دی، جو مغلوب نہیں ہوا بلکہ اُسے اپنے سے مغلوب رکھا، وہ اللہ کا سچا بندہ ہوا۔ یعنی اس نے انسانیت کا وہ بلند ترین مقام پا لیا، جو حکمت الٰہی نے اُسے عطا فرمایا ہے۔

نیز فرمایا جو اللہ کے مخلص بندے ہیں، اُن پر ابلیس کا داؤ چلنے والا نہیں، مغلوب وہی ہوتے ہیں جو راہ عبودیت سے بھٹک گئے۔

قرآن حکیم نے مختلف سورتوں میں نوع انسانی کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ ضروری ہے کہ ان تمام مقامات پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے، اور معلوم کیا جائے کہ اس بارے میں قرآن کی تصریحات کیا کیا ہیں۔ چونکہ آگے چل کر سورہ کہف میں یہ بیان پھر آنے والا ہے، اس لیے یہاں صرف ربط مطالب کی تشریح پر اکتفا کرتے ہیں۔ باقی تمام تشریحات سورۂ مذکورہ کے تفسیری نوٹ میں ملیں گی۔

اس آیت میں "جان" کی پیدائش کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ "جان" اور "جن" کے لیے سورۂ جن کا نوٹ دیکھنا چاہیے۔

(۱۱) پھر آیت (۴۹) میں واضح کر دیا کہ اس بارے میں قانون الٰہی کیا ہے؟ فرمایا بخشش اور رحمت ہے، لیکن جو لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو اُن کے لیے عذاب بھی ہے، اور یہ عذاب بڑا ہی دردناک عذاب ہوتا ہے۔

اس کے بعد گزشتہ قوموں کے ایام و وقائع کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انکار و بدعملی اور شرارت و سرکشی کا نتیجہ کیسے دردناک عذابوں کی شکل میں ظاہر ہوا؟ اس سلسلہ میں صرف تین قوموں کا ذکر کیا ہے جن کی آبادیوں پر سے عرب کے قافلے گزرتے رہتے تھے، اور اُن کی ہولناک ہلاکتوں کے مناظر اُن کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھے۔ یعنی قوم لوط جس کی بستیاں عرب اور فلسطین کے درمیان شاہراہ عام پر واقع تھیں، قبیلۂ مدین جس کی بستی بحر قلزم کے کنارے تھی اور

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ (۸۵-۸۶) وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ (۸۷) لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقُلْ اِنِّىْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ۝ (۸۸-۸۹)

ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ اُن میں ہے، کسی مصلحت ہی سے بنایا ہے (بیکار کو نہیں بنایا ہے) اور یقیناً مقررہ وقت آنے والا ہے پس (اے پیغمبر!) چاہیے کہ حسن و خوبی کے ساتھ (مخالفوں کی مخالفتوں سے) درگزر کرو۔ (۸۵) تمہارا پروردگار ہی ہے جو (سب کا) پیدا کرنے والا اور (سب کی حالت) جاننے والا ہے! (۸۶)

اور بلا شبہ ہم نے تمہیں دُہرائی جانے والی آیتوں میں سے سات آیتوں کی سورت عطا فرمائی ہے (یعنے سورۂ فاتحہ) اور قرآنِ عظیم (اور اُس کا دُہرا دُہرا کر نماز میں پڑھنا تمہارے لیے کفایت کرتا ہے) (۸۷)

(اور) یہ جو ہم نے ان میں سے کئی قسم کے لوگوں کو (فوائد زندگی سے) بہرہ مند کر دیا ہے، تو تم (رشک کی نظر سے) اُنہیں نہ دیکھو، اور نہ ایسا ہو کہ اُن کی حالت پر بیکار کو غم کھانے لگو۔ تم مومنوں کے لیے اپنے بازو پھیلا دو (یعنے اُنہی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاؤ) (۸۸) اور اعلان کر دو کہ میں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کرنے والا ہوں۔ آشکارا۔ (۸۹)

جانے سے فلسطین کی طرف جائیں خواہ مصر کی طرف، اُن کے کھنڈر راہ میں ضرور پڑتے تھے، شہر حِجر میں بسنے والی قوم یعنے قومِ ثمود جس کا مقام بھی اسی شاہراہ پر واقع تھا۔ یعنے حجاز اور شام کی شاہراہ پر۔

(۱۲) قرآن میں "الساعة" کا لفظ کہیں تو روزِ قیامت کے لیے بولا گیا ہے، کہیں ایک ایسے فیصلہ کن دن کے لیے جو دعوتِ حق اور اُس کے مخالفوں کے درمیان فیصلہ کر دیگا آیت (۸۵) میں "الساعة" سے مقصود ایسا ہی دن ہے قیامت کا دن نہیں ہے جیسا کہ اکثر مفسروں اور مترجموں نے قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح پچھلے رسولوں سے مقابلہ کرنے والے ناکام رہے، اسی طرح اب بھی مخالف و سرکش ناکام رہیں گے، اور وہ دن دور نہیں جب حق و باطل کی اس کشمکش کا فیصلہ ہو جائیگا۔

اس کے بعد فرمایا: فاصفح الصفح الجمیل ان ربك هو الخلاق العلیم۔ یعنے جب صورتِ حال ایسی ہے تو چاہیے کہ لوگوں کی سرکشی و شرارت سے آزردہ خاطر نہ ہو۔ اور حسن و خوبی کے ساتھ درگزر کرتے رہو۔ اللہ سب کا پیدا کرنے والا، اور سب کی حالت جاننے والا ہے۔ پس اُس کے بندوں کا معاملہ اُسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔

کسی بات سے درگزر کرنے کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی بے بس ہوتا ہے، اس لیے مجبور ہو کر بدلہ نہیں لیتا۔ درگزر کر دیتا ہے، لیکن دل نفرت و انتقام سے لبریز رہتا ہے۔ یہ "صفح" ہے مگر "صفح جمیل" نہیں ہے۔

"صفح جمیل" یہ ہے کہ مجبور ہو کر نہیں بلکہ خود اپنی مرضی اور خواہش سے درگزر کیا جائے، اور نفرت و انتقام کا کوئی جذبہ دل میں نہ اُٹھے۔ اگر اُٹھے، تو غالب نہ آسکے۔ مغلوب ہو کر رہ جائے پس فرمایا، تمہیں مخالفوں کے ساتھ "صفح جمیل" کرنا چاہیے۔

(۱۳) آیت (۸۷) سے آخر تک سورت کا خاتمہ ہے اور اُس کی تمام موعظت و ارشاد کا خلاصہ۔ خطاب اگرچہ پیغمبرِ اسلام سے ہے، مگر فی الحقیقت مومنوں کی وہ ابتدائی جماعت مخاطب ہے جو مکّہ میں ایمان لائی تھی اور

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۝ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ ۹۰-۹۱
اَجْمَعِيْنَ ۙ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ ۹۲-۹۳-۹۴
اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ ۹۵-۹۶

(اے پیغمبر! ہم نے اُسی طرح یہ کلام تم پر نازل کیا ہے) جس طرح اُن لوگوں پر نازل کیا تھا جنہوں نے (دین حق کے) ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں، اور (اپنے) قرآن کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ تو دیکھو تمہارا پروردگار شاہد ہے کہ ان سب سے ضرور ان کے کاموں کی بازپرس ہوگی۔ پس جو کچھ تمہیں حکم دیا گیا ہے، لوگوں پر آشکار کرو، اور مشرکوں کی کچھ پروا نہ کرو۔ ان ہنسی اڑانے والوں کے لیے ہم تمہاری طرف سے بس کرتے ہیں۔ (یہ ہنسی اڑانے والے) جو اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو بھی معبود بناتے ہیں، عنقریب معلوم کر لینگے کہ حقیقت حال کیا تھی؟

مفلوی و بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ فرمایا: تم دیکھتے ہو کہ مخالفوں کے پاس ہر طرح کی دنیوی سازوسامان اور دنیوی طاقتیں ہیں۔ تمہارے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ لیکن تم بھولتے ہو۔ تمہارے پاس بھی ایک چیز ہے جس سے تمہارے مخالف یک قلم تہی دست ہیں۔ اور وہ اللہ کا کلام ہے: ولقد اٰتینٰك سبعًا من المثانی والقراٰن العظیم۔ اور اگر یہ نعمت تمہارے پاس موجود ہے، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم مخالفوں کی موجودہ خوشحالیوں کو حسرت و رشک کی نظر سے دیکھو۔ یہی ایک نعمت تمہیں دین و دنیا کی تمام نعمتوں سے سرفراز کر دینے والی ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ یہاں سبعًا من المثانی سے مقصود سورۂ فاتحہ ہے۔

یہاں خصوصیت کے ساتھ سورۂ فاتحہ کا اس لیے ذکر کیا کہ وہ قرآن کی تمام تعلیم کا خلاصہ او ایمان و عمل کی زندگی کا روزانہ دستور العمل ہے، اور جس فرد اور جماعت کی زندگی ان سات آیتوں کی وردو مداومت میں بسر ہو رہی ہو، ممکن نہیں کہ وہ دینی و دنیوی سعادتوں سے محروم رہے۔

نیز اس کے اس وصف پر زور دیا کہ وہ دہرائی جانے والی چیز ہے۔ یعنے ایک مومن زندگی کے لیے شب و روز کا ورد اسی میں ہے۔ وہ ہر روز اپنی نمازوں میں اور نماز کی ہر رکعت میں اسے دہراتا رہتا ہے۔ اس پر صبح آتی ہے تو اسی کی صدائیں چھڑتی ہے، شام ہوتی ہے تو اسی کی صدائیں اٹھتی ہیں۔ اس کی دوپہر کا نغمہ بھی یہی ہوتا ہے، اور اس کی راتوں کا ترانہ بھی اس کے سوا کوئی نہیں:

جز نغمۂ محبت سازم نوا نہ دارد!

اس آیت سے سورۂ فاتحہ کی بڑی ہی خصوصیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن تشریح کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ یہ مبحث تفسیر فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

(۱۴) اس آیت سے یہ بات بھی متحقق ہو گئی کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں، اور اس کے کلمات کی کوئی ایسی تقسیم صحیح نہیں ہو سکتی جس سے آیتوں کی یہ تعداد گھٹ جائے یا بڑھ جائے۔ چنانچہ جب اس اعتبار سے دیکھا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے، یا تو بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی اس میں شامل ہے۔ یعنے اس کی پہلی آیت ہے، یا پھر صراط الذین انعمت علیھم اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین دو آیتیں ہیں۔ ایک آیت نہیں ہیں۔ کیونکہ بغیر اس کے سات آیتوں کی تعداد بنتی نہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ و تابعین کی ایک بڑی جماعت اس طرف گئی ہے کہ بسم اللہ اس کی پہلی آیت ہے۔ مفصل بحث البیان میں ملیگی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ ۝ ۹۷-۹۸
وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝ ۹۹ ع ۶

(۹۷) ہم اس سے بے خبر نہیں کہ ان لوگوں کی باتوں سے تمہارا دل رُکنے لگتا ہے۔ سو چاہیے کہ اپنے پروردگار کی ستائش کو (شب و روز) وردِ زبان کر لو، اُس کے حضور سجدے میں گرے رہو۔ (۹۸) اُس کی بندگی میں لگے رہو۔ یہاں تک کہ یقین تمہارے سامنے آجائے!

اور پھر یہی وجہ ہے کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے، آنحضرت (صلعم) سورۂ فاتحہ ہمیشہ سات دفعوں کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، اور ہر آیت کا آخری لفظ کسی قدر کھینچ کر ختم کرتے تھے جو اختتام صوت کی قدرتی صورت ہے۔ ایسا نہیں کرتے تھے کہ صرف تین دفعوں میں پوری سورت ختم کردیں۔ یعنے الحمد سے لیکر یوم الدین تک ایک سانس میں اور پھر اہدنا الصراط المستقیم سے لے کر ولا الضالین تک ایک سانس میں۔ جیسا کہ آج کل قرأت کا عام طریقہ اختیار کر لیا گیا ہے۔ راوی نے صرف اتنی ہی تصریح پر قناعت نہیں کی ہے، بلکہ آیتیں پڑھ کر بتلا بھی دیا ہے کہ آپ اس طرح ہر آیت الگ الگ کر کے پڑھتے تھے، اور اس طرح ہر آیت پر وقفہ کرتے تھے۔ یعنے الحمد للہ رب العلمین (وقف) الرحمن الرحیم (وقف) مالك یوم الدین (وقف) ایاك نعبد و ایاك نستعین (وقف) اهدنا الصراط المستقیم (وقف)

اور فی الحقیقت سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا قدرتی اور صحیح طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے، اور اس کی ہر آیت سائل کی زبان سے نکلی ہوئی طلب و الحاح کی ایک صدا کا حکم رکھتی ہے۔ جب ایک سائل کسی کے آگے کھڑا ہوتا ہے، اور اس کی مدح و ثنا کر کے حرفِ مطلب زبان پر لاتا ہے، تو ایسا نہیں کرتا کہ ایک خطیب کی طرح مسلسل تقریر کرنا شروع کر دے، اور ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ جائے۔ بلکہ طلب و نیاز کے لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر، ایک ایک بات کہیگا۔ طلب و نیاز اور عجز و الحاح کی حالت اُسے مہلت ہی نہ دیگی کہ ایک مرتبہ میں سب کچھ کہہ جائے مثلاً کہیگا۔ آپ فیاض ہیں۔ آپ کریم ہیں۔ آپ کی جود و سخا کی دھوم ہے۔ اگر آپ سے نہ مانگوں تو کس سے مانگوں! اور ان میں سے ہر بول دوسرے بول سے ملا کر نہیں کہیگا، الگ الگ کر کے اور ٹھہر ٹھہر کر کہیگا۔ بلا شبہ ان میں سے ہر جملہ باعتبارِ مطلب کے دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ بات ایک ہی جملہ میں پوری نہیں ہو جاتی۔ لیکن وقف و اتصال کے لیے صرف اتنی ہی بات کافی نہیں ہے۔ طریق خطاب و کلام کا ادا شناس جانتا ہے کہ زورِ کلام اور حسنِ خطاب کے لیے کہاں وقفہ کرنا چاہیے، کہاں نہیں کرنا چاہیے۔

یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب قرآن کے اُن تمام مقامات پر نظر ڈالی جائے، جہاں آنحضرت (صلعم) کا وقف کرنا روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ ان میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں متاخرین قراء کے نزدیک وقف نہیں ہونا چاہیے، لیکن آنحضرت کا وقف کرنا ثابت ہے، اور اگر مقام کی نوعیت پر غور کروگے تو واضح ہو جائیگا کہ طریقِ کلام کا خطیبانہ اسلوب یہی چاہتا ہے کہ یہاں وقفہ ہو۔ بغیر اس کے زورِ کلام اُبھرتا نہیں۔ اور گو آیت میں بات پوری نہیں ہوئی ہے لیکن موقعہ کا قدرتی اسلوبِ خطاب یہی ہے کہ وقفہ کیا جائے۔ اتصالِ صوت نہ ہو۔

سُوْرَۃُ النَّحْل

مکی - ۱۲۸ - آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ یُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ○ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ○ وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ

اللہ کا حکم آپہنچا پس اُس کے لیے جلدی نہ مچاؤ (اور انتظار کرو) (اے مخاطب!) اُس کی ذات اُن باتوں سے پاک اور بلند ہے جو یہ لوگ شرک کی کر رہے ہیں!

وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس غرض سے چن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے فرشتے الروح کے ساتھ اُس پر بھیجے (یعنے وحی کے ساتھ بھیجے) اور اُسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کردو "میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس مجھ سے ڈرو" (اور انکار و بدعملی سے باز آجاؤ)

اُس نے آسمان و زمین کا یہ تمام کارخانہ تدبیر و مصلحت سے پیدا کیا ہے۔ (بیکار کو نہیں بنایا) اُس کی ذات اس بات سے (پاک و) بلند ہے جو یہ لوگ شرک کی کر رہے ہیں!

اُس نے انسان کو نطفہ (کے ایک قطرہ) سے پیدا کیا۔ پھر دیکھو، وہ ایک جھگڑنے والا اور اُبھرنے والا وجود ہوگیا!

اور دیکھو۔ اُس نے چارپائے پیدا کیے۔ اُن

(۱) یہ سورت من جملہ اُن سورتوں کے ہے جو مکی عہد کے آخری ایام میں نازل ہوئیں

"امر اللہ" سے مقصود اللہ کی یہ ٹھہرائی ہوئی بات ہے کہ دعوتِ وحی کامیاب ہوتی ہے، اور اُس کی مخالف قوتیں ناکام رہتی ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے قضاء بالحق اور شہادتِ الٰہی سے بھی تعبیر کیا ہے۔ منکر اس بات کی ہنسی اُڑاتے تھے، اور کہتے تھے، اگر سچ مچ کو ایسا ہونے والا ہے تو کیوں نہیں ہو چکتا؟ یعنے کیوں اللہ کا حکم ظہور میں نہیں آجاتا!؟ ابتدائی عہد کی سورتوں میں کہا گیا تھا کہ قانونِ حق نے ہر بات کے لیے ایک وقت ٹھہرا دیا ہے اور وہ اپنے وقت ہی پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس سورت میں فرمایا۔ وہ وقت آگیا ہے۔ یعنے اب بالکل قریب ہے۔ کیونکہ اب مخالفوں کا ظلم و تشدد انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا، مومنوں پر زندگی دشوار ہوگئی تھی، عنقریب ہجرت مدینہ کا معاملہ ظہور میں آنے والا تھا، اور اُس کا ظہور فیصلۂ امر کا اعلان تھا۔

(۲) قرآن نے جابجا وحی الٰہی کو "الروح" سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں آیت (۲) میں بھی "الروح" سے مقصود وحی ہے، اور ظاہر ہے کہ وحی کے لیے اس سے بہتر تعبیر نہیں ہو سکتی۔ وہ نظر نہیں آتی، لیکن جس جسم پر اُترتی ہے، وہ اُس سے معمور ہو جاتا ہے، اور اُس کے اندر سے اُس کی صدائیں اُٹھنے لگتی ہیں۔ نیز اس اعتبار سے بھی وہ الروح ہے کہ انسانی سعادت کی زندگی اُسی سے قائم ہے۔ استجیبوا للّٰہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸: ۲۴)

فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۚ وَلَوْ شَاءَ

میں (یعنے اُن کی کھال اور اون میں) تمہارے لیے گرم کرنے والی پوشش ہے۔ نیز طرح طرح کے فائدے، اور انہی میں ایسے جانور بھی ہیں جن کا تم گوشت کھاتے ہو۔ ۵

اور دیکھو (انہیں کس طرح پیدا کیا کہ) ان میں تمہاری نگاہوں کے لیے خوش نمائی پیدا ہوگئی ہے۔ جب تم شام کے وقت اُنہیں (میدانوں سے چرا کر) واپس لاتے ہو، اور جب صبح کو (میدانوں میں) چھوڑ دیتے ہو (تو اس وقت اُن کا منظر کیسا خوش نما ہوتا ہے!) ۶

اور (پھر دیکھو) یہی جانور ہیں جو تمہارا بوجھ اُٹھا کر ایسے (دور دراز) شہروں تک لے جاتے ہیں کہ تم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے، مگر بڑی ہی جانکاہی کے ساتھ۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار بڑا ہی شفقت رکھنے والا، بڑا ہی رحمت رکھنے والا ہے! ۷

اور (دیکھو) گھوڑے، خچر، اور گدھے پیدا کر دیے ہیں کہ تم اُن سے سواری کا کام لو، اور ویسے اُن میں خوشنمائی اور رونق بھی ہے۔ وہ اور بہت سی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے، جن کی تمہیں خبر نہیں۔ ۸

اور یہ اللہ کا کام ہے کہ راہِ حق واضح کر دے اور راہوں میں ٹیڑھی راہیں بھی ہیں۔ وہ اگر چاہتا تو تم سب کو (ایک ہی) راہ دکھا دیتا (اور مختلف راہیں یہاں پیدا ہی نہ ہوتیں) لیکن تم دیکھ رہے ہو

حضرت مسیح علیہ السلام نے اسی حقیقت کو "روح القدس" سے تعبیر کیا ہے اور حواریوں نے بھی اسی معنی میں اسے استعمال کیا ہے۔ اگرچہ بعد کو اس کی حقیقت عیسائیوں پر مشتبہ ہوگئی۔

(۳) آیت (۲) میں فرمایا تھا کہ یہ اللہ کی مقررہ سنت ہے کہ وہ ہدایتِ خلق کے لیے کسی بندہ کو چن لیتا ہے اور اُسے وحی کی روح سے معمور کر دیتا ہے۔ اور اس ہدایتِ وحی کی دعوت کیا ہوتی ہے؟ توحیدِ الٰہی کی تلقین یعنے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں پس صرف اُسی کی بندگی کرو۔

اب آیت (۳) سے توحیدِ الٰہی کے دلائل کا بیان شروع ہوتا ہے۔ مبدأ استدلال "تخلیق بالحق" کی حقیقت ہے جس کی تشریح پہلے گزر چکی، اور مزید تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ دیکھنی چاہیے۔

(۴) آیت (۴) میں قدرتِ الٰہی کی اس کرشمہ سازی پر توجہ دلائی ہے کہ نطفہ کے ایک قطرۂ حقیر سے ایک ایسا عقل و فکر وجود پیدا ہو جاتا ہے جس میں بحث و نزاع کی قوت ہوتی ہے، اور جو بال کی کھال نکالنے لگتا ہے۔ پس یہاں "فاذا هو خصيم مبين" سے مقصود بیانِ واقعہ ہے، نہ کہ مذمت و ملامت، جیسا کہ بعض دوسرے مقامات میں ہے۔

(۵) پہلے تخلیق بالحق کی حقیقت پر توجہ دلائی کہ کارخانۂ ہستی کی ہر چیز کسی سوچی سمجھی ہوئی مصلحت سے بنائی گئی ہے، بیکار و عبث نہیں بنی ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ انسان خود اپنی ہستی کو دیکھے اور اپنے چاروں طرف نظر ڈالے کس طرح ہر شے بول رہی ہے کہ مجھے کسی رب و رحیم ہستی نے بنایا ہے جو پرورش کرنا چاہتی ہے، فائدہ پہنچانا چاہتی ہے، ساری

٩ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ
١٠ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ
١١ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ
١٢ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمَا ذَرَاَ
١٣ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ
سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ

ضرورتیں پوری کر رہی ہے، اور سرتاسر بخشش، فضل، احسان، اور رحمت ہے؟

پھر اگر ایک ایسی ربوبیت و رحمت رکھنے والی ہستی موجود ہے، تو ہر طرح کی پرستاریوں کا مستحق اُسے ہونا چاہیے یا انہیں جو خود اپنی پرورش کے لیے اس کی پروردگاری کے محتاج ہیں؟ اور اگر وہ پروردگار ہستی تمہاری تمام جسمانی ضرورتوں اور آسائشوں کا انتظام کر رہی ہے، تو کیا ضروری نہ تھا کہ تمہاری روحانی سعادت و زندگی کا بھی سروسامان کر دیتی؟ یہی سروسامان ہے جو ہدایت وحی اور ترسیل رسل کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ پھر کیوں تمہیں اس پر انکار و تعجب ہو؟

کہ مختلف راہیں ہوئیں، اور اس کی حکمت کا ایسا ہی فیصلہ ہوا!)

٩ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا اس میں سے کچھ تو تمہارے پینے کے کام آتا ہے۔ کچھ زمین کو سیراب کرتا ہے۔ اس سے درختوں کے جنگل پیدا ہو جاتے ہیں، اور تم اپنے مویشی ان میں چراتے ہو!

١٠ اسی پانی سے وہ تمہارے لیے (ہر طرح کے غلوں کی) کھیتیاں بھی پیدا کر دیتا ہے۔ نیز زیتون، کھجور، انگور، اور ہر طرح کے پھل۔ یقیناً اس بات میں اُن لوگوں کے لیے ایک بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرنے والے ہیں!

١١ اور (دیکھو) اُس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند مسخر کر دیے (کہ تمہاری کار برآریوں کے لیے کام کر رہے ہیں) اور اسی طرح ستارے بھی اُس کے حکم سے تمہارے لیے مسخر ہو گئے ہیں۔ یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں!

١٢ اور زمین کی سطح پر طرح طرح کے رنگوں کی پیداوار جو تمہارے لیے پیدا کر دی ہیں (اُن پر غور کرو)۔ بلاشبہ اس میں اُن لوگوں کے لیے ایک نشانی ہے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں!

١٣ اور (دیکھو) وہی ہے جس نے سمندر تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ اُس سے تر و تازہ گوشت نکالو اور کھاؤ اور زیور کی (قیمتی اور خوشنما) چیزیں نکالو جنہیں آرائش کے لیے پہنتے ہو۔ نیز تم دیکھتے ہو کہ جہاز پانی چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، تاکہ اُس کا فضل تلاش کرو (یعنے جہازوں کے ذریعہ تجارت کرو) اور

١٤ (اس کی نعمتوں کی قدر بجا لا کر) شکر گزار ہو!

مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ ۱۴
أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ۝ ۱۵-۱۶
أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۱۷
إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن ۱۸-۱۹
دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۝ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ ۲۰
يُبْعَثُونَ ۝ ع إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ وَهُم ۲۱

ع ۲ / ۱۱ / ۸

اور (دیکھو) اُسی نے زمین میں پہاڑ قائم کر دیے، کہ وہ تمہیں لے کر کسی طرف کو جھک نہ پڑے، اور اُس نے نہریں رواں کر دیں اور راستے نکال دیے تاکہ تم (تری اور خشکی کی راہیں قطع کر کے) اپنی منزل مقصود تک پہنچو۔ ۱۵

اور دیکھو، اُس نے (قطع مسافت کے لیے طرح طرح کی) علامتیں پیدا کر دیں، اور ستاروں سے لوگ رہنمائی پاتے ہیں! ۱۶

پھر بتلاؤ، کیا دونوں ہستیاں برابر ہوگئیں؟ وہ جو پیدا کرتی ہے، (یعنے جس نے ربوبیت و فیضان کا یہ تمام کارخانہ بنا دیا ہے) اور وہ، جو کچھ پیدا نہیں کرتی (بلکہ خود اپنی ہستی کے لیے پروردگار عالم کی ربوبیت کی محتاج ہے!) پھر کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟ ۱۷

اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو، تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی گن نہ سکو۔ بلا شبہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا بڑا ہی رحمت والا ہے! ۱۸

اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ جو کچھ تم چھپاتے ہو، اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو، کوئی بات اُس سے پوشیدہ نہیں! ۱۹

اور اللہ کے سوا جن ہستیوں کو یہ پکارتے ہیں، اُن کا تو حال یہ ہے کہ وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے۔ خود کسی کے پیدا کیے ہوے ہیں۔ ۲۰

وہ مردے ہیں نہ کہ زندگی رکھنے والے۔ انہیں اس کی بھی خبر نہیں کہ کب (موت سے) اُٹھائے جائینگے! ۲۱

تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے (اُس کے سوا کوئی نہیں) پھر جو لوگ آخرت کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے، تو ضرور اُن کے دل انکار میں کڑ

(۹) آیت (۲۰) اور اس کے بعد کی آیتوں میں دلائل سے نتیجہ نکالا ہے۔ ایسا نتیجہ جو خود بخود ابھر رہا اور ہر نگاہ کے سامنے آرہا تھا یعنے جس پروردگار نے اپنی پروردگاری کا یہ تمام کارخانہ پیدا کر دیا ہے، کیا کوئی دوسری ہستی اُس کے

مُّسْتَكْبِرُوْنَ ○ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ○
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۙ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً
يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ○ قَدْ مَكَرَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ
وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ

برابر ہو سکتی ہے؟ کیا وہ ہستی جو یہ سب کچھ پیدا کر رہی ہے، اور وہ جو پیدا نہیں کر سکتی، دونوں برابر ہو سکتی ہیں؟ اگر نہیں ہو سکتیں، تو اس سے بڑھ کر عقل کی کوری اور روح کی موت کیا ہو سکتی ہے کہ تم دوسری ہستیوں کو بھی پروردگار عالم کے ساتھ معبودیت میں شریک کر رہے ہو!

آیت (۱۸) میں فرمایا۔ ان چند اشیاء کی پیدائش ہی پر موقوف نہیں۔ اُس کی نعمتیں تو اتنی ہیں کہ اگر گننا چاہو، تو تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ گن سکو۔ تمہاری زندگی کا ہر سانس اُس کی کسی نہ کسی نعمت کا رہینِ منت ہے۔ کارخانۂ ہستی کا ہر ذرہ، کسی نہ کسی بخشش و کرم کی کرشمہ کاری ہے۔ درختوں کا ہر پھول، دھوپ کی ہر کرن، ہوا کا ہر جھونکا، بارش کا ہر قطرہ، چاندنی کی ہر نمود، تاروں کی ہر چمک، پرندوں کی ہر چہچہاہٹ، اُس کی ربوبیت کی ایک پروردگاری اور اُس کی رحمت کی ایک چارہ سازی ہے۔ تم اگر درختوں کے سبز پتے، پھولوں کے رنگین ورق، اور سورج کی سنہری کرنیں گن سکتے ہو، تو اُس کی نعمتیں بھی گن لو۔ تم درختوں کے ہر پتے سے پوچھو، بارش کے ہر قطرہ سے سوال کرو، سورج کی ہر کرن کا منہ دیکھو، تمہیں یہی جواب ملیگا کہ ان اللہ لغفور رحیم! جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے، وہ بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحمت والا ہے!

ہوئے ہیں۔ وہ (سچائی کے مقابلہ میں) گھمنڈ کر رہے ہیں۔

یقیناً (اللہ ان کے حال سے بے خبر نہیں) یہ جو کچھ (اپنے دل میں) چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ (زبان پر) ظاہر کرتے ہیں، سب اُس کے علم میں ہے وہ گھمنڈ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور جب ان لوگوں سے پوچھا جاتا ہے "وہ کیا بات ہے جو تمہارے پروردگار نے اُتاری ہے؟" تو کہتے ہیں "کچھ نہیں، محض اگلے وقتوں کے افسانے ہیں" (ان کے اس کہنے کا نتیجہ کیا ہے؟) یہ، کہ قیامت کے دن پورا پورا (اپنے گناہوں کا) بوجھ اُٹھائیں، اور اُن لوگوں کے بوجھ کا بھی ایک حصہ، جنہیں (اس طرح کی باتیں کہہ کہہ کر) یہ بغیر علم و روشنی کے گمراہ کر رہے ہیں۔ تو دیکھو، کیا ہی بُرا بوجھ ہے جو یہ اپنے اوپر لادے چلے جا رہے ہیں!

اِن سے پہلے جو گزر چکے ہیں، اُنہوں نے بھی (دعوتِ حق کے خلاف) تدبیریں کی تھیں لیکن (کیا نتیجہ نکلا!) اُنہوں نے اپنی تدبیروں کی جو عمارت بنائی تھی، اللہ نے اس کی بنیاد کی اینٹیں تک ہلا دیں۔ پس اُنکے اوپر (اُنہی کی بنائی ہوئی) چھت آ گری، اور ایسی راہ سے عذاب نمودار ہوا جس کا اُنہیں وہم و گمان بھی نہ تھا!

پھر (اس کے بعد) قیامت کا دن (پیش آنے والا) ہے، جب وہ اُنہیں رسوائی میں ڈالیگا اور

يَقُولُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ ۲۷ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۲۸ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۲۹ وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ ۳۰ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا

پوچھیگا" بتلاؤ، آج وہ ہستیاں کہاں گئیں جنہیں تم نے میرا شریک بنایا تھا، اور جن کے بارے میں تم (اہل حق سے) لڑا کرتے تھے؟" اُس وقت وہ لوگ جنہیں (حقیقت کا) علم دیا گیا تھا، پکار اُٹھینگے "بے شک، آج کے دن کی رسوائی اور خرابی سرتاسر کافروں کے لیے ہے۔ اُن کافروں کے لیے کہ فرشتوں نے جب اُن کی روحیں قبض کی تھیں تو اپنی جانوں پر خود اپنے ہاتھوں ظلم کر رہے تھے" ۲۷

تب وہ اطاعت کا اظہار کرینگے اور کہینگے "ہم نے تو (اپنی دانست میں) کوئی برائی کی بات نہیں کی تھی"۔ (لیکن اہل علم جواب دینگے) "ہاں، تم نے ضرور کی، اور تم جو کچھ کرتے رہے ہو، اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے!" ۲۸

"پس اب تمہارے لیے یہی ہے کہ جہنم کے دروازوں میں (گروہ گروہ ہو کر) داخل ہو جاؤ، تمہیں ہمیشہ کے لیے اسی میں رہنا ہے" تو دیکھو (حق کے مقابلہ میں) گھمنڈ کرنے والوں کا کیا ہی بُرا ٹھکانا ہوا! ۲۹

اور (جب) متقیوں سے پوچھا گیا "وہ کیا بات ہے جو تمہارے پروردگار نے نازل کی ہے؟" تو اُنہوں نے کہا "سرتاسر خیر و برکت کی بات" سو (دیکھو) جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھائی کی، اُن کے لیے اچھائی ہی ہے، اور یقیناً (اُن کے لیے) آخرت کا گھر بھی خیر و برکت ہی کا گھر ہے پس متقیوں کا ٹھکانا کیا ہی اچھا ٹھکانا ہوا! ۳۰

دائمی (راحت و سرور کے) باغ جن میں وہ داخل

(۷) برائی اور معصیت کرنے کو ہر جگہ قرآن نے ظلموا انفسهم اور اسرفوا علی انفسهم سے تعبیر کیا ہے۔ یعنے اُنہوں نے اپنی جانوں کے ساتھ ناانصافی کی اور اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ یہاں بھی آیت (۲۸) میں ایسی ہی تعبیر ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک کفر و بدعملی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ خود اپنے ہاتھوں اپنی جانوں کو نقصان و ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

اس بات کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی آدمی کو ہم سنکھیا کھاتے دیکھتے ہیں، تو بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں کہ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو؟ اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاک کر رہے ہو؟ قرآن کے نزدیک کفر و معصیت بھی ایسی ہی چیز ہے۔ یہ دودھ پینے کی جگہ سنکھیا کھانا ہے، اور جو کھاتا ہے، وہ خود ہی اپنی جان کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے، اور خود اپنے اوپر زیادتی کرنے والا ہوتا ہے۔

(۸) آیت (۲۴) سے آیت (۳۲) تک دو گروہوں کی دو متضاد حالتیں اور متضاد نتیجے بیان کیے ہیں:

تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ○ الَّذِينَ ۳۱
تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ ۳۲
هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ۚ كَذَٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِن
قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا ۳۳
عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○ ۳۴ ع ۴

ہونگے۔ اُن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اس لیے کبھی خشک ہونے والی نہیں) جو کچھ چاہینگے وہاں اُن کے لیے مہیا ہو جائیگا۔ اسی طرح اللہ متقیوں کو (ان کی نیک عملی کا) بدلہ دیتا ہے!

۳۱ وہ (متقی) جنہیں فرشتے اس حال میں وفات دیتے ہیں کہ (دل کے اطمینان اور ایمان کے یقین کی وجہ سے) خوشحال ہوتے ہیں۔ فرشتے اُنہیں کہتے ہیں "تم پر سلامتی ہو! جنت میں داخل ہو جاؤ، یہ نتیجہ ہے اُن کاموں کا جو تم کرتے رہے ہو!"

۳۲ (اے پیغمبر!) یہ لوگ جو انتظار کر رہے ہیں، تو اس بات کے سوا اور کونسی بات اب باقی رہ گئی ہے کہ فرشتے اُن پر اُتر آئیں، یا تیرے پروردگار کا (مقررہ) حکم ظہور میں آجائے؟ ایسا ہی اُن لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (کہ سرکشی و فساد سے باز نہ آئے یہاں تک کہ حکم الٰہی ظہور میں آگیا) اور اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا تھا بلکہ وہ

۳۳ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے!

۳۴ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے کچھ اُن کے کام تھے، ویسے ہی بُرے نتیجے بھی ملے، اور جس بات کی ہنسی اُڑایا کرتے تھے، وہی اُنہیں آلگی!

ایک گروہ منکروں کا ہے ایک متقی انسانوں کا۔ منکروں کے نزدیک وحی الٰہی کی حقیقت کیا ہے؟ قالوا: اساطیر الاولین۔ یہ تو بس اگلوں کے افسانے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں لیکن جو لوگ متقی ہیں، اُن کے نزدیک اس کی حقیقت کیا ہے؟ قالوا خیرا۔ سرتا سر خیر و برکت!

۳۱ پہلے گروہ پر جب موت آتی ہے تو اس حال میں آتی ہے کہ بُرائیوں میں سرگرم ہوتے ہیں: تتوفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم۔ لیکن دوسرے گروہ پر جب آتی ہے تو وہ ایمان و یقین اور پاک عمل کی روح سے خوش حال ہوتے ہیں: تتوفاھم الملائکۃ طیبین!

جزائے عمل کے لحاظ سے بھی دونوں کی حالتیں متضاد ہوئیں۔ پہلے گروہ کو کہا جائیگا: ادخلوا ابواب جھنم۔ دوسرے سے کہا جائیگا: ادخلوا الجنۃ

۳۲ پہلے کے لیے خواری و عذاب کا پیام ہوگا: ان الخزی الیوم والسوء علی الکافرین! دوسرے کے لیے سلامتی کا پیام: سلام علیکم ادخلوا الجنۃ!

پہلے نے گھمنڈ کیا تھا، تو گھمنڈ کرنے والوں کا کیا ہی بُرا ٹھکانا ہوا: فلبئس مثوی المتکبرین! دوسرے نے تقوی کی روش اختیار کی تھی، تو تقوے کی راہ چلنے والوں کا کیا ہی اچھا ٹھکانا ہوا! ولنعم دار المتقین!

پہلے کے لیے عذاب دائمی ہوا: خالدین فیھا۔ دوسرے کے لیے نعیم و سرور کی زندگی دائمی ہوئی: جنات عدن یدخلونھا!

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَ
لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ
اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا ۳۵
الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ ۳۶

اور مشرکوں نے کہا "اگر اللہ چاہتا تو کبھی ایسا نہ ہوتا کہ ہم یا ہمارے باپ دادا اُس کے سوا دوسری ہستیوں کی پوجا کرتے، اور نہ ایسا ہوتا کہ بغیر اس کے حکم کے کسی چیز کو (اپنے جی سے) حرام ٹھہرا لیتے" ایسی ہی روش اُن لوگوں نے بھی اختیار کی تھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ پھر (بتلاؤ) پیغمبروں کے ذمے اس کے سوا اور کیا ہے کہ صاف صاف پیامِ حق پہنچا دیں؟ ۳۵

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا، (تاکہ اس پیامِ حق کا اعلان کر دے) کہ اللہ کی بندگی کرو، اور سرکش قوتوں سے بچو۔ پھر ان اُمتوں میں سے بعض ایسی تھیں جن پر اللہ نے (کامیابی کی) راہ کھول دی۔ بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔ پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو، جو قومیں (سچائی کی) جھٹلانے والی تھیں، اُنہیں بالآخر کیا انجام پیش آیا؟ ۳۶

(اے پیغمبر!) تم ان لوگوں کے ہدایت پانے کے کتنے ہی خواہشمند ہو، لیکن (یہ راہ پانے والے نہیں۔ کیونکہ اللہ اس آدمی پر (کامیابی کی) راہ کبھی نہیں کھولتا جس پر (اُس کے انکار و سرکشی کی وجہ سے) راہ گم کر دیتا ہے، اور ایسے لوگوں کے

(۹) قرآن نے جا بجا مشرکوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اگر شرک برائی ہے، تو خدا کیوں ہمیں برائی کرنے دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا کہ اُس کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کیجائے، تو کبھی ایسا نہ ہو سکتا کہ ہم اور ہمارے آباؤ اجداد ایسی بات کر سکتے۔ اگر وہ چاہے تو اب بھی ہمیں روک دے سکتا ہے۔ اس شور و ہنگامہ کی جگہ جو تم نے بپا کر رکھا ہے، کیوں خدا سے نہیں کہتے کہ ہمیں روک دے؟" چنانچہ یہاں بھی آیت (۳۵) میں اُن کا یہی قول نقل کیا ہے، اور پھر اس کا جواب دیا ہے۔

فرمایا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو انہوں نے کہدی۔ پہلے بھی لوگ ایسی ہی روش اختیار کر چکے ہیں لیکن یہ روش گمراہی اور ہٹ دھرمی کی روش ہے۔ اللہ کے رسول اس لیے نہیں آتے کہ لوگوں سے برائی کرنے کی طاقت سلب کر لیں اور اُنہیں ایسا بنا دیں کہ برائی کر ہی نہ سکیں۔ وہ تو پیامِ حق پہنچانے والے ہیں، اور پیام پہنچانے والے کا کام صرف یہ ہے کہ صاف صاف اور روشن طریقہ پر پیام پہنچا دے۔ اب اُسے ماننا یا نہ ماننا، یہ سننے والوں کا کام ہے۔ پیام پہنچانے والا اس کے لیے ذمہ دار نہیں۔

اور جب اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ انسان کو کسی ایک حالت پر مجبور نہ کر دیا جائے، بلکہ ہر طرح کی حالت اختیار کرنے کی قدرت دی جائے، تو اللہ کے رسولوں سے کیوں اس کی توقع کی جائے کہ لوگوں سے یہ قدرت سلب کر لیں؟

پھر فرمایا۔ دنیا کی کوئی اُمت نہیں جس میں اللہ کا رسول نہ آیا ہو، اور اس نے توحید و خدا پرستی کی تعلیم نہ دی

مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ○ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَنْ يَمُوتُ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ○ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ○ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ

۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱

ہو پھر کسی نے مانا، اور راستہ سے فلاح و سعادت کی راہ اس پر کھول دی، کسی نے نہیں مانا، اور گمراہی کی بات ثابت ہوگئی۔ اور گمراہی کا نتیجہ پیش آگیا۔ بس اللہ کا قانون ہدایت و شقاوت ایسا ہی چلا آیا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ لوگوں کو بغیر ہدایت یا فتنہ بنا دیا گیا ہو۔

ہیے کوئی مددگار بھی نہیں ہوتا کہ انہیں نتائج عمل سے بچالے)

اور (دیکھو) ان لوگوں نے اللہ کی سخت سے سخت قسمیں کھائیں کہ "جو مر جاتا ہے، اُسے اللہ کبھی دوبارہ نہیں اُٹھائیگا" ہاں ضرور اُٹھائیگا۔ یہ اُس کا وعدہ ہے، اور اُس کا پورا کرنا اُس پر لازم ہے، لیکن اکثر آدمی ہیں جو اِس بات کا علم نہیں رکھتے!

(۱۰) یہ اعتقاد کہ انسان کی زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی دنیا میں بسر کرتا ہے، بلکہ اس کے بعد بھی ایک زندگی ہے، اور اُس زندگی میں جزائے عمل کا معاملہ پیش آنے والا ہے، تمام مذاہب عالم کا عالمگیر اعتقاد ہے۔ لیکن مشرکین عرب اس سے بے خبر تھے۔ اس لیے جب قرآن نے آخرت کی زندگی اور حشر اجساد کا اعلان کیا تو انہیں بڑی ہی عجیب بات معلوم ہوئی۔ وہ کہتے تھے، جب آدمی مرگیا تو مرگیا پھر اس کے بعد زندگی کیسے ہو سکتی ہے؟ چنانچہ قرآن نے جابجا ان کے اقوال نقل کیے ہیں اور جواب دیا ہے۔ یہاں آیت (۳۸) میں فرمایا۔ یہ لوگ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اللہ مُردوں کو دوبارہ زندہ نہیں کریگا، لیکن نہیں جانتے کہ اللہ کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ اس کا وعدہ ہے، یعنے اُس کی ٹھہرائی ہوئی بات ہے، اور ضروری ہے کہ ظہور میں آئے۔

یہ اُس کا وعدہ کیونکر ہے؟ اس طرح کہ خود دنیوی زندگی کی ہر بات کہہ رہی ہے کہ اُسے ایسا کرنا ہے، اور وہ ضرور کریگا چنانچہ اس کے بعد فرمایا: لیبین لھم الذی یختلفون فیہ، ولیعلم الذین کفروا انھم کانوا کاذبین۔ تاکہ جن حقیقتوں کا انسان دنیوی زندگی میں فیصلہ نہیں کر سکتا

(اور پھر کیوں اُٹھائیگا؟) اس لیے کہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، اُن کی حقیقت کھول دے، اور اس لیے کہ منکر جان لیں، وہ (اپنی روش میں) جھوٹے تھے۔

جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کوئی چیز پیدا کردیں، تو اس کے سوا ہمیں اور کچھ کہنا نہیں ہوتا کہ کہہ دیتے ہیں "ہوجا" اور بس وہ ہوجاتا ہے!

اور (یاد رکھو) جن لوگوں پر (اُن کے ایمان لانے کی وجہ سے) ظلم ہوا، اور ظلم سہنے کے بعد انہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، تو ہم ضرور انہیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دینگے اور آخرت کا بدلہ تو کہیں بڑھ کر ہے اگر یہ لوگ جان لیتے!

یہ لوگ جو (ہر طرح کی مصیبتوں میں) ثابت قدم رہے اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں!

۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲

يَتَوَكَّلُونَ ۝ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن ۴۲
كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ ۴۳
إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَن يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ ۴۴
الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ ۴۵
فَمَا هُم بِمُعْجِزِينَ ۝ ۴۶

اور (اے پیغمبر!) تجھ سے پہلے ہم نے جتنے رسولوں کو بھیجا، تو اسی طرح بھیجا کہ آدمی تھے۔ اُن پر ہم وحی بھیجتے تھے۔ (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان کے فرشتے اُتر آئے ہوں) پس (اے منکرینِ حق!) اگر خود تمہیں (یہ بات) معلوم نہیں تو اُن لوگوں سے دریافت کرلو جو (آسمانی کتابوں کی) سمجھ بوجھ رکھتے ہیں (یعنے یہودیوں اور عیسائیوں سے) ۴۲

ہم نے اُن رسولوں کو روشن دلیلوں اور کتابوں کے ساتھ بھیجا تھا، اور (اسی طرح) تجھ پر بھی "الذکر" (یعنے قرآن) نازل کیا، تاکہ جو تعلیم لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے، وہ اُن پر واضح کردے نیز اس لیے کہ وہ غور وفکر کریں (اور ہدایت کی راہ پالیں) ۴۴

پھر جن لوگوں نے (اپنے) بُرے مقصدوں کے لیے تدبیریں کی ہیں، کیا وہ اس بات سے مطمئن ہوگئے ہیں کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دے؟ یا ایک ایسی راہ سے عذاب آ نازل ہو جس کا انہیں وہم وگمان بھی نہ ہو؟ ۴۵

یا ایسا ہو کہ عین اُس وقت جب وہ (اپنی کوششوں میں) تگ ودو کر رہے ہوں، عذابِ الٰہی اُنہیں آ پکڑے؟ کہ وہ اللہ کو (اپنی تدبیروں سے) عاجز نہیں

اور اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اُن کا فیصلہ ہو جائے اور حقیقت سب کے سامنے آجائے۔ نیز اس لیے کہ گمراہ اور بدعمل اپنی گمراہی و بدعملی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یعنے دنیوی زندگی میں پردوں کا نہ اُٹھنا اور مشاہدۂ حقیقت کا نہ ہونا، بتلا رہا ہے کہ کوئی اور زندگی ضرور ہے جہاں بالآخر پردے اُٹھینگے۔ پس یہ صورت حال گویا خالقِ ہستی کی طرف سے ایک وعدہ ہوئی کہ اب نہیں، لیکن آئندہ ایسا ہونے والا ہے، اور ضروری ہے کہ یہ وعدہ پورا ہو کر رہے۔

(۱۱) آیت (۴۰) میں فرمایا، تمہیں انسان کے دوبارہ زندہ ہونے پر اس لیے تعجب ہو رہا ہے کہ اللہ کی قدرت کا صحیح اندازہ نہیں۔ تم اسی ترازو سے اُس کے کام بھی تولنا چاہتے ہو، جس سے اپنے کام تولا کرتے ہو۔ وہ کسی چیز کے ظہور میں لانے کے لیے نہ تو کسی سروسامان کا محتاج ہے نہ کسی دوسری ہستی کی موجودگی کا۔ صرف اُس کا ارادہ ہی ہر طرح کی علت ہے، ہر طرح کا سروسامان ہے، ہر طرح کا مواد ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کہ ایک چیز ظہور میں آجائے، تو بس اُس کا چاہنا ہی سب کچھ ہے۔ جونہی اُس کی مشیت کا فیصلہ ہوا، ہر چیز ظہور میں آگئی! یاد رہے کہ "ان یقول لہ کن" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عربی کا لفظ "کن" جو کاف اور نون سے مرکب ہے، بولنے میں آتا ہے یا کلمۂ خطاب وامر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیزیں وجود میں آجاتی ہیں، بلکہ صاف مطلب یہ ہے کہ صرف اُس کا ارادہ تخلیق کے لیے کافی ہے، اور اُس کی قدرت کا یہ حال ہے کہ جس بات کا حکم دیدیتا ہے، وہ بمجردِ حکم ظہور میں

۴۷ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ○ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِن
۴۸ شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِّلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ○ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا
۴۹ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ○ يَخَافُونَ رَبَّهُم
۵۰ مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ○ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ
۵۱ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ○ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا
۵۲ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ○ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا

(الربع ۱۲ ۱۵)

۴۶ آجاتی ہے۔ وہ اپنے ارادہ اور حکم کے نفاذ میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں۔

پس بعض مفسرین نے یہاں جس قدر فلسفیانہ تعبیریں کی ہیں اور خطاب بہ معدوم وغیرہ کے سوالات اٹھائے ہیں، سب بے محل اور بے معنی ہیں، اور درخور التفات نہیں۔

۴۷ غور کرو کس طرح چند لفظوں کے اندر اللہ کی خالقیت و قدرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے! ایسی تصویر کہ اس سے زیادہ انسانی تصور نہ تو کچھ سوچ سکتا ہے، نہ سوچ سکنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس نے تمام کارخانۂ ہستی کیونکر پیدا کیا؟ وہ جو کچھ پیدا کرنا چاہتا ہے کس طرح ظہور میں آجاتا ہے؟ اس طرح کہ اس کا حکم ہوتا ہے، اور اس کا حکم ہی ساری علتوں کی علت اور سارے سببوں کا آخری سبب ہے!

کر دے سکتے۔

یا ایسا ہو کہ انہیں (پہلے) ڈرا دے پھر پکڑے، کیونکہ بلاشبہ تمہارا پروردگار بڑا ہی شفقت والا بڑا ہی رحمت والا ہے!

کیا ان لوگوں نے اللہ کی مخلوقات میں سے کسی چیز پر بھی غور نہیں کیا؟ (انہوں نے نہیں دیکھا) کہ ہر چیز کا سایہ دہنی طرف سے اور بائیں طرف سے ڈھلتا رہتا ہے اور اللہ کے آگے سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتا رہتا ہے؟ اور یہ کہ سب اس کے آگے عاجز و درماندہ ہیں؟

۴۸ اور آسمانوں میں جتنی چیزیں ہیں، اور زمین میں جتنے جانور ہیں، سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔ نیز فرشتے، اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔

۴۹ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں جو ان کے اوپر موجود ہے۔ اور جو کچھ حکم انہیں دیا جاتا ہے، اس کی تعمیل کرتے ہیں!

۵۰ اور اللہ نے فرمایا۔ دو دو معبود اپنے لیے نہ بناؤ۔ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہی ایک معبود ہے۔ تو دیکھو صرف میں ہی ہوں پس صرف مجھی سے ڈرو!

۵۱ اسی کے لیے ہے، جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، اور اسی کے لیے دین ہے دائمی۔ پھر کیا تم اللہ کے سوا دوسری ہستیوں سے ڈرتے ہو؟

۵۲ اور نعمتوں میں سے جو کچھ تمہارے پاس ہے، سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب تمہیں کوئی دکھ

مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْـَٔرُونَ ○ ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ ۵۳
يُشْرِكُونَ ○ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ○ وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا ۵۴-۵۵
يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ ○ وَيَجْعَلُونَ ۵۶
لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ ○ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ ۵۷

(۱۲) جب دشمنوں کا ظلم و تشدد اس حد تک پہنچ گیا کہ مسلمانوں پر زندہ رہنا دشوار ہو گیا، تو پیغمبر اسلام نے اجازت دیدی کہ حبش (ابی سینا) کی طرف ہجرت کر جائیں چنانچہ پہلے بارہ مرد اور چار عورتوں کا قافلہ مکہ سے نکلا، جس کے رئیس حضرت عثمان بن عفان تھے۔ اس کے بعد اور لوگ نکلے جن کی تعداد ۸۳ مردوں اور ۱۸ عورتوں تک پہنچ گئی۔

تاریخ اسلام کی یہ پہلی ہجرت ہے۔ دوسری ہجرت یثرب کی ہجرت تھی۔

آیت (۴۱) میں جن مہاجرین کا ذکر کیا ہے اُس سے مقصود ابی سینا کے مہاجرین ہیں۔ فرمایا۔ اُنہوں نے اللہ کی سچائی کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا ہے اور ہجرت کی مصیبتیں برداشت کی ہیں، تو ضروری ہے کہ اللہ اُن کا مددگار ہو، اور ان کے لیے دنیا میں اچھا ٹھکانا پیدا کردے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ابی سینا کا دارغربت ان کے لیے امن و عزت کا مہماں سرا بن گیا۔ یہ وہی ابی سینا ہے جس کے ایک سپہ سالار ابرہہ نے پچاس برس پہلے مکہ پر حملہ کیا تھا، لیکن اب اسی مکہ کے مظلوموں کا اخلاص و محبت کے ساتھ استقبال کر رہا ہے!

اتنا ہی نہیں بلکہ مظلومیت کی یہ ہجرت تبلیغ حق کی کامرانیوں کا ایک عجیب و غریب وسیلہ بن گئی یعنے ابی سینا کے بادشاہ کا دل قبولیت حق کے لیے کھل گیا اور دعوت اسلام پر ایمان لے آیا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ کی آیۃ (۸۳) میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

(۱۳) قوانین الٰہی کی عجائب آفرینیوں میں سے ایک عجیب و غریب منظر "ظل" یعنے اجسام کے سایے کا ہے۔ نظام شمسی کے تمام کرشمے اس چیز میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ یہ

پہنچتا ہے، تو اُسی کے آگے زار نالی کرتے ہو! ۵۳

پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ وہ تم سے دُکھ دور کر دیتا ہے، تو دیکھو، تم میں سے ایک گروہ معاً اپنے پروردگار کے ساتھ دوسری ہستیوں کو شریک بنانے لگتا ہے تاکہ جو نعمت ہم نے اُسے دی تھی، اُس کی (پوری طرح) ناشکری کرے! ۵۴

اچھا، (زندگی کے چند روزہ) فائدے اُٹھالو۔ پھر ایک وقت آئیگا کہ (اپنی اِن ناشکریوں کا نتیجہ) معلوم کر لوگے! ۵۵

اور پھر (دیکھو) ہم نے جو کچھ رزق انہیں عطا کیا ہے، اُس میں یہ ان ہستیوں کا بھی حصہ ٹھہراتے ہیں جن کی حقیقت کی انہیں خبر نہیں۔ بخدا تم سے ضرور اس بارے میں بازپرس ہوگی کہ (حقیقت کے خلاف) کیسی کیسی افترا پردازیاں کرتے رہتے ہو! ۵۶

اور یہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں! اُس کے لیے پاکی ہو! (بھلا اللہ کے لیے بیٹیاں!) اور خود اِن کے لیے کیا؟ وہ، جس کے یہ بڑے خواہشمند ہیں! (یعنے بیٹے) ۵۷

جب ان لوگوں میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے، تو (مارے رنج کے) اُس کا

۵۸ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ
۵۹ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۖ
۶۰ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ
عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلَٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ
۶۱ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ وَ

ع

ہمارے جسم کے ساتھ ساتھ رہتا اور ساتھ ساتھ چلتا ہے، لیکن لاکھوں میل فاصلہ کی خبر دیدیتا ہے۔ سورج کا طلوع، عروج، زوال، غروب، ساری حالتیں ہم اس آئینہ میں دیکھ لے سکتے ہیں!

کبھی بڑھتا ہے، کبھی گھٹتا ہے۔ کبھی اُبھرتا ہے، کبھی غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی کھڑا ہوتا ہے، کبھی جھکتا ہے۔ کبھی دہنے ہوتا ہے، کبھی بائیں۔ اُس کی ان تمام حالتوں کا قانون اس درجہ قطعی، اس درجہ یکساں، اس درجہ منظم ہے، کہ اس میں فتور پڑنے کا ہیں وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ جس وقت تک گھڑیاں ایجاد نہیں ہوئی تھیں، یہی سایہ گھڑی کا کام دیتا تھا، اور اسی کو دھوپ گھڑی بنی تھی۔ آج کل بھی میدانوں اور دیہاتوں میں جہاں گھڑیاں نہیں ہوتیں، دہقان سایہ دیکھ کر معلوم کر لیتا ہے کہ کتنا دن چڑھ چکا ہے، کتنا ڈھل چکا ہے۔ سایہ جب مساوی ہو جائے تو دوپہر کا وقت ہے۔ جب گھٹنے بڑھنے لگو تو اُس کی ہر مقدار گھڑی کی سوئی ہے!

یہی وجہ ہے کہ قرآن قوانین الٰہی کے احاطہ و نفاذ کا ذکر کرتے ہوئے سایے کی طرف توجہ دلاتا ہے، اور کہتا ہے یہ تم سے دور نہیں۔ ہر وقت تمہارے جسم کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے، ہمیشہ اس پر تمہاری نگاہیں رہتی ہیں کیونکہ اسی سے وقت کا اندازہ لگایا کرتے ہو۔ پس غور کرو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کس طرح یہ شہادت دے رہا ہے کہ یہاں کی ہر چیز کسی مدبر و حکیم ہستی کے احکام کے آگے سربسجود ہے اور اُس نے جس چیز کے لیے جو حکم نافذ کر دیا ہے، ممکن نہیں کہ اُس کی تعمیل میں بال برابر بھی انحراف ہو! یہاں بھی آیت (۴۸) میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا: وللّٰہ یسجد ما فی السماوات

۵۸ چہرہ کالا پڑ جاتا ہے، اور وہ غم میں ڈوب جاتا ہے۔ جس بات کی اُسے خوش خبری دی گئی ہے، وہ ایسی بُرائی کی بات ہوئی کہ (شرم کے مارے) لوگوں سے چھپتا پھرے، (اور سوچ میں پڑ جائے کہ) ذلت قبول کر کے بیٹی کو لیے رہے یا مٹی کے تلے گاڑ دے۔ افسوس اُن پر! کیا ہی بُرا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں!

۵۹ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، اُن کے لیے یہی ہے کہ (اللہ کی صفتوں کا) بُرا تصور کریں، حالانکہ اللہ کے لیے تو (ہر اعتبار سے) بلند ترین تصور ہے، وہ سب پر غالب ہے، حکمت والا ہے!

۶۰ اور اگر ایسا ہوتا کہ اللہ لوگوں کو اُن کے ظلم پر (فوراً) پکڑتا، تو ممکن نہ تھا کہ زمین کی سطح پر ایک حرکت کرنے والی ہستی بھی باقی رہتی، لیکن وہ انہیں ایک خاص ٹھہرائے ہوئے وقت تک ڈھیل دیتا ہے۔ پھر جب وہ مقررہ وقت آپہنچا، تو نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، نہ ایک گھڑی آگے!

۶۱ اور (دیکھو) یہ اللہ کے لیے ایسی باتیں ٹھہراتے ہیں جنہیں خود (اپنے لیے) پسند نہیں کرتے، انکی

تَصِفُ اَلۡسِنَتُهُمُ الۡكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الۡحُسۡنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمۡ مُّفۡرَطُوۡنَ ○ ٦٢
تَاللّٰهِ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيۡطٰنُ اَعۡمَالَهُمۡ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ
الۡيَوۡمَ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ○ ٦٣ وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا
فِيۡهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ○ ٦٤ وَاللّٰهُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡيَا بِهِ
الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ ع ○ ٦٥ وَاِنَّ لَكُمۡ فِى الۡاَنۡعَامِ

ع ٩

وما فی الارض من دابۃ۔

زبانیں جھوٹے دعوؤں میں بے باک ہیں (یہ کہتے ہیں) کہ اُن کے لیے (ہر حال میں) اچھائی ہی اچھائی ہے۔ ہاں، البتہ ان کے لیے (دوزخ کی) آگ ہے۔ البتہ یہ سب سے پہلے اس میں پہنچنے والے ہیں! ٦٢

(اے پیغمبر!) اس بات کی سچائی پر ہم شاہد ہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے کتنی ہی اُمتوں کی طرف رسول بھیجے۔ پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے لوگوں کو اُن کی بدعملیاں اچھی کر دکھائیں (اور وہ سچائی کی دعوت پر کاربند نہ ہوئے) سو وہی حال آج بھی ہو رہا ہے۔ وہی شیطان ان منکروں کا رفیق ہے، اور (بالآخر) ان کے لیے عذاب دردناک ہے! ٦٣

اور ہم نے تجھ پر الکتاب نہیں اُتاری ہے مگر اس لیے کہ جن باتوں میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں، اُن کی حقیقت اُن پر واضح کر دے۔ اور ایمان والوں کے لیے یہ ہدایت ہے اور رحمت! ٦٤

اور (دیکھو) اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اُس کی آب پاشی سے زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی (از سرِ نو) زندہ کر دیا۔ بلاشبہ اس صورت حال میں اُن لوگوں کے لیے ایک نشانی ہے، جو (صدائے) حق کو جی لگا کر سنتے ہیں! ٦٥

اور بلاشبہ تمہارے لیے چارپایوں میں سوچنے

(١٤) انسان میں مرد اور عورت کا امتیاز ہے۔ لوگوں نے خیال کیا کہ اسی طرح روحانی قوتوں میں بھی دونوں جنسیں ہونی چاہییں۔ مرد دیوتا ہیں، عورتیں دیبیاں ہیں۔ چنانچہ دنیا کی تمام اصنام پرست اقوام کی دیو مالاؤں میں یہ خیال عام طور پر نمایاں رہا ہے۔

مشرکین عرب میں بھی یہ تخیل پیدا ہو گیا تھا۔ قبیلہ خزاعہ اور کنانہ کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ فرشتوں کا تصور دیبیوں کی شکل میں کرتے تھے، اور کہتے تھے، یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن نے جابجا یہ خیال نقل کیا ہے، اور اس کی سخافت پر توجہ دلائی ہے۔ یہاں (۵۷) میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔

وہ فرشتوں کو تو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے، لیکن خود عورتوں کی جنس کے لیے اُن کے تصورات کیا تھے؟ یہ، کہ زیادہ سے زیادہ ذلیل و حقیر مخلوق ہے۔ جب کسی کے یہاں بیٹی پیدا ہوتی، تو اسے بڑی غمگینی اور بدنصیبی کی بات سمجھتا۔ بعض قبائل جنہیں اپنے نسلی شرف کا بڑا گھمنڈ تھا، بیٹی کے باپ ہونے میں ایسی ذلت سمجھتے کہ اکثر حالتوں میں اُسے خود اپنے ہاتھ سے زندہ گاڑ کر مار ڈالتے۔ جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر ملتی، تو مارے شرم کے لوگوں کے سامنے نہ آتا، اور سوچنے لگتا کہ ذلت گوارا کر کے بیٹی والا بن جائے، یا ایک باعزت آدمی کی طرح اُسے زمین میں زندہ دفن کر دے!

یہاں ایک طرف تو اُن کے عقیدے کی سخافت

۶۶ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ ۝ وَمِن ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ

۶۷ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ

۶۸ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ۝ ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِن بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ

۶۹ يَتَفَكَّرُونَ ۝

سمجھنے کی بڑی عبرت ہے۔ ہم اُن کے جسم سے خون اور کثافت کے درمیان، دودھ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ پینے والوں کے لیے ایسی لذیذ چیز ہوتی ہے کہ بے غل و غش اُٹھا کر پی لیتے ہیں۔

اسی طرح کھجور اور انگور کے درختوں کے پھل ہیں کہ اُن سے نشہ اور عرق اور اچھی غذا، دونوں طرح کی چیزیں تم حاصل کرتے ہو، بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لیے (فہم و بصیرت کی) ایک نشانی ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں!

اور (دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں، اور اُن ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلندی میں بنا دی جاتی ہیں، اپنا چھتہ بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوستی پھرے، پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقہ پر پوری فرماں برداری کے ساتھ گامزن ہو جائے۔ (تو دیکھو) اُس کے پیٹ سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا ہے۔ اس میں انسان کے لیے شفا ہے۔ بلاشبہ اس صورتِ حال میں اُن لوگوں کے لیے ایک نشانی

دکھلائی ہے کہ جس بات کو خود اپنے لیے ذلت کی بات سمجھتے ہیں، اُسے خدا کے لیے تجویز کرنے میں انہیں باک نہیں۔ دوسری طرف اس گمراہی کا ابطال کیا ہے کہ عورت کی جنس کو جو مرد ہی کی طرح ایک انسانی جنس ہے، ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو خود اپنے ہاتھوں قتل کر دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں! چنانچہ آیت (۵۹) میں فرمایا: الا ساء ما یحکمون! دیکھو، کیا ہی بُرا فیصلہ ہے جو انہوں نے اس معاملہ میں کیا!

مردوں کا عورتوں کے ساتھ معاملہ ظلم و معصیت کی ایک مسلسل سرگزشت ہے اور اس سرگزشت کا ایک سب سے زیادہ وحشیانہ واقعہ دختر کشی کی رسم ہے۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو عرب کے اکثر قبیلوں میں یہ رسم اسی طرح جاری تھی جس طرح ہندوستان کی مختلف قوموں میں پچھلی صدی تک جاری رہ چکی ہے۔ لوگ اس پر فخر کرتے تھے، اور کہتے تھے ہمارے قبیلہ کے افراد بیٹی کے باپ ہونے کا ننگ گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن اسلام نے نہ صرف یہ رسم مٹا دی بلکہ وہ ذہنیت بھی مٹا دی جو ان تمام وحشیانہ مظالم کے اندر کام کر رہی تھی۔ اُس نے اعلان کیا کہ مرد اور عورت کا جنسی اختلاف کسی فضیلت اور محرومی کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ دونوں کو اللہ نے بحیثیت انسان ہونے کے ایک ہی درجہ میں رکھا ہے، اور دونوں کے آگے یکساں طریقہ پر ہر طرح کی فضیلتوں کی راہ کھول دی ہے: للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن، وسئلوا اللہ من فضلہ۔ (۴: ۳۲)

سورۂ تکویر میں جہاں قیامت کے دن کی ہولناکیوں کا نقشہ کھینچا ہے، وہاں پرسشِ اعمال میں سب سے زیادہ نمایاں

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ ۷۰ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ ۷۱ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ

ع ۱۵

جگہ اسی ظلم کو دی ہے: واذا الموءدۃ سئلت، بای ذنب قتلت؟ (۸۱:۸)

ہے جو غور و فکر کرنے والے ہیں!

اور (دیکھو) اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا، پھر وہی ہے جو تمہاری زندگی پوری کر دیتا ہے۔ اور تم میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو (بڑھاپے کی) بدترین عمر تک پہنچ جاتا ہے کہ (ذہن و عقل کی) سمجھ بوجھ رکھنے کے بعد پھر نادان ہو جائے۔ بے شک اللہ (سب کچھ) جاننے والا، ہر بات کی قدرت رکھنے والا ہے! ۷۰

اور (دیکھو) اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر باعتبار روزی کے برتری دی ہے (کہ کوئی زیادہ کماتا ہے، کوئی کم کماتا ہے) پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی گئی ہے، وہ اپنی روزی اپنے زیردستوں کو لوٹا دے حالانکہ سب اس میں برابر کے حقدار ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں سے صریح منکر ہو رہے ہیں؟ ۷۱

اور (دیکھو) اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کر دیے (یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد) اور تمہارے جوڑوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کر دیے (کہ ان سے تمہاری زندگی ایک وسیع خاندان کی نوعیت اختیار کر لیتی ہے) نیز تمہاری روزی کے لیے اچھی اچھی چیزیں مہیا کر دیں۔ پھر کیا یہ لوگ جھوٹی باتیں تو مان لیتے ہیں

(۱۵) انسان کے لیے اس بات کے تصور سے بڑھ کر اور کوئی تصور قدرتی اور حقیقی نہیں ہو سکتا کہ ایک خالق و پروردگار ہستی موجود ہے، لیکن وہ ہستی کیسی ہے؟ اس کی صفتوں کا بھی تصور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کیا جا سکتا ہے، تو وہ صفتیں کیا کیا ہیں اور کس نوعیت کی ہیں؟ یہاں سے انسانی عقل کی درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں اور پھر کوئی گمراہی ایسی نہیں ہے جس میں وہ گم ہو جانے کے لیے مستعد نہ ہو جاتا ہو۔ حتیٰ کہ بعض اوقات بھٹکتے بھٹکتے اتنا دور چلا جاتا ہے کہ جس درجہ پر خود کھڑا ہے اس سے بھی خدا کا تصور نیچے گرا دیتا ہے: ویجعلون للہ مایکرھون!

مشرکین عرب کی سخافت تصور کا ذکر کرنے کے بعد آیت (۶۰) میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۱۶) آیت (۶۱) میں قانون امہال کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی تشریح پچھلی سورتوں کے نوٹوں میں گزر چکی ہے، اور مزید تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ دیکھنی چاہیے۔

(۱۷) قرآن نے جا بجا کہا ہے کہ ہدایت وحی کا ظہور تبیین حقیقت اور رفع اختلاف کے لیے ہوتا ہے۔ یعنے جن باتوں کو انسان اپنی عقل و ادراک سے نہیں پا سکتا، اور اس لیے طرح طرح کے اختلافات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کوئی کچھ سمجھنے لگتا ہے کوئی کچھ، وحی الٰہی نمودار ہوتی ہے، تاکہ ان اختلافات کو دور کر دے، اور بتلا دے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی آیت (۶۴) میں قرآن کے نزول کا ایک مقصد یہ بتلایا کہ لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ۔

وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ (۷۱)
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ (۷۲)
وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ (۷۳)
مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى (۷۵)
مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ

اور اللہ کی نعمتوں کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں؟

یہ اللہ کے سوا اُن ہستیوں کی پوجا کرتے ہیں جو آسمان و زمین سے رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ اُنہیں کسی بات کا مقدور ہے۔

پس (دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرکے) اللہ کے لیے مثالیں نہ گڑھو۔ اللہ جانتا ہے۔ اور تم کچھ نہیں جانتے!

اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے (اس پر غور کرو) ایک غلام ہے کسی دوسرے آدمی کی ملک۔ وہ خود کسی بات کی قدرت نہیں رکھتا، اور ایک دوسرا آدمی ہے (خود مختار) ہم نے اپنے فضل سے اُسے اچھی روزی دے رکھی ہے اور وہ ظاہر و پوشیدہ (جس طرح چاہتا ہے) اُسے خرچ کرتا ہے۔ اب بتلاؤ، کیا یہ دونوں آدمی برابر ہوسکتے ہیں؟ ساری ستائش اللہ کے لیے ہے! (اُس کے برابر کوئی نہیں) مگر اکثر آدمی ہیں جو نہیں جانتے!

اور (دیکھو) اللہ نے ایک (اور) مثال بیان فرمائی: دو آدمی ہیں۔ ایک گونگا ہے کسی بات کے کرنے کی قدرت نہیں، اپنے آقا پر ایک بوجھ۔ جہاں کہیں بھیجے، کوئی خوبی کی بات اس سے بن نہ آئے

(۷۱) یہ باتیں کونسی ہیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، اور جن کا اختلاف بغیر اس کے دور نہیں ہوسکتا کہ کتاب الٰہی آئے اور پردہ اٹھا دے؟ وہ تمام باتیں جو انسان کے عقل و ادراک کی سرحد سے ماوراء ہیں۔ اللہ کی صفات، (۷۳) مرنے کے بعد کی زندگی، عالم معاد کے احوال و واردات (یعنے عمل کا قانون)، عالم غیب کے حقائق یعنے وہ ساری باتیں جن کے اعتقاد و عمل کی درستگی سے روحانی سعادت کی زندگی پیدا ہوسکتی ہے۔ انسان جب کبھی اس راہ میں (۷۴) وحی الٰہی کی روشنی سے الگ ہوکر قدم اٹھاتا ہے اختلافات کی تاریکیوں میں گم ہوجاتا ہے لیکن جونہی اس روشنی کی نمود میں آجاتا ہے، حقیقت واضح ہوجاتی ہے، اور ہر طرح کے اختلافات و شکوک معدوم ہوجاتے ہیں!

(۱۸) آیت (۶۴) میں فرمایا تھا کہ الکتاب کا نزول ہدایت و رحمت ہے۔ آیت (۶۵) میں فرمایا۔ یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسے باران رحمت کا نزول۔ وہ مردہ زمین کو زندہ کردیتی ہے۔ یہ مردہ دلوں کو زندہ کردیتا ہے۔ اس اسلوب عظمت کی تشریح پچھلی سورتوں کے نوٹوں میں گزر چکی ہے نیز تفسیر فاتحہ میں۔ (۷۵)

(۱۹) آیت (۶۶) سے (۶۹) تک ربوبیت الٰہی کی بخششوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ساتھ ہی اُس کی صنعت و حکمت کی کرشمہ سازیوں پر بھی توجہ دلائی ہے، اور بہ حیثیت مجموعی ربوبیت، رحمت، اور حکمت کا استدلال

هَلْ يَسْتَوِي هُوَ ۙ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ ۷۶

وَالْأَرْضِ ۚ وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ ۷۷

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَ

الْأَفْئِدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ ۷۸

إِلَّا اللَّهُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّن بُيُوتِكُمْ سَكَنًا ۷۹

بی. فرمایا تمہاری غذا میں تین چیزیں سب سے زیادہ مفید اور لذیذ ہیں: دودھ، پھلوں کا عرق، اور شہد۔ تم میں سے کوئی نہیں جو ان تین نعمتوں سے آشنا نہ ہوا ہو۔ یہ تمہاری روزانہ غذا کا جوہر، لذت طعم کا ذریعہ، اور جسمانی شفا کا نسخہ ہے:

(ا) لیکن یہ دودھ جو طفولیت سے لے کر بڑھاپے تک تمہاری سب سے زیادہ دل پسند غذا ہوتی ہے، کس طرح اور کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ تم نے کبھی غور کیا؟ اگر غور کرتے، تو تمہارے فہم و عبرت کے لیے صرف یہی ایک بات کافی تھی۔ یہ اسی جسم میں بنتا ہے، جس جسم میں غلاظت بنتی ہے، جو طرح طرح کی آلائشوں سے بھرا ہوا ہے۔ پھر جس میں اگر کوئی سیال شے موجود ہوتی ہے تو خون ہے جسے کبھی ہونٹوں سے لگانا پسند نہ کرو۔ پھر دیکھو جانوروں میں اس کے اترنے کا مخرج کہاں ہے! وہیں جس کے قریب ہی بول و براز کا مخرج ہے۔ یعنی ایک ہی کارخانہ میں، ایک ہی مادے سے، اور ایک ہی طرح کے ظروف میں ایک طرف تو غلاظت بنتی اور نکلتی رہتی ہے جسے تم دیکھنا بھی پسند نہ کرو۔ دوسری طرف ایک ایسا جوہر غذا و لذت بھی بنتا اور نکلتا ہے، جسے تم دیکھتے ہی اٹھا لو، اور بے قل و غش ایک ایک قطرہ پی جاؤ!

کون ہے جس کی حکمت نے یہ عجیب و غریب کارخانہ بنا دیا؟ کون ہے جو ایسے عجیب طریقوں سے زندگی کے بہترین وسائل بخش رہا ہے؟ اور پھر کیا ممکن ہے کہ قدرت کی یہ کارفرمائی، حکمت کی یہ صنعت طرازی، ربوبیت کی یہ چارہ سازی، بغیر کسی قدرت حکیم، اور رب العالمین ہستی کے ظہور میں آ گئی ہو؟

(ب) پھلوں میں طرح طرح کے خوش ذائقہ عرق پیدا ہوتے ہیں جنہیں مختلف طریقوں سے تم کام میں لاتے ہو۔ مثلاً کھجور اور انگور کے

دوسرا ایسا ہے کہ (گونگے ہونے کی جگہ) لوگوں کو عدل و انصاف کی باتوں کا حکم دیتا ہے، اور خود بھی (عدل و راستی کے) سیدھے راستے پر ہے۔ کیا پہلا آدمی اور یہ، دونوں برابر ہو سکتے ہیں! ۷۶

اور آسمانوں اور زمین کی جتنی مخفی باتیں ہیں سب کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور (آنے والے) مقررہ وقت کا معاملہ بس ایسا سمجھو جیسے آنکھ کا جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلد تر۔ بے شک اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں! ۷۷

اور (دیکھو) اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکم سے نکالا، اور اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے (یعنی علم و ادراک سے محروم تھے) پھر تمہارے لیے شنوائی، بینائی، اور عقل کی قوتیں پیدا کر دیں تاکہ تم شکر گزار ہو! ۷۸

کیا پرندوں کو نہیں دیکھتے جو آسمان کی فضا میں مطیع و منقاد (اُڑ رہے) ہیں؟ اللہ کے سوا کون ہے جو انہیں تھامے ہوئے ہے؟ بلا شبہ ایمان والوں کے لیے اس بات میں (قدرت حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں! ۷۹

اور (دیکھو) اللہ نے تمہارے گھروں کو

وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ۝ ٨٠ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُم بَأْسَكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ ۝ ٨١ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ

درخت ہیں۔ ان کے عرق سے نشہ کی چیز بنا لیتے ہو، اور اچھی اور جائز غذائیں بھی اس سے بنتی ہیں۔ لیکن یہ پھل پیدا کس طرح ہوئے؟ کھجور اور انگور کا ہر دانہ شیرینی اور غذائیت کی ایک سر بمہر شیشی ہے جو درختوں میں لٹکنے لگتی ہے اور تم ہاتھ بڑھا کر لے لیتے ہو، لیکن یہ شیشی کس کا کارخانہ ہیں ہے؟ زمین اور مٹی میں، یعنے اسی مٹی میں جس کا ایک ذرہ بھی تمہارے منہ میں پڑ جاتا ہے، تو بے اختیار ہو کر تھوکنے لگتے ہو!

تم خشک گٹھلیاں مٹی میں پھینک دیتے ہو۔ مٹی ہی گٹھلی ان نعمتوں کی شکل میں تمہیں واپس دیدیتی ہے! ٨٠ کون ہے جس کی ربوبیت و حکمت مٹی کے ذروں سے یہ خزانے اگلوا رہی ہے؟ خوشبو، ذائقہ، اور غذائیت کے خزانے؟

(ج) پھر شہد کے چھتوں کو دیکھو۔ یہ کارخانے ہیں جن میں تمہارے لیے شب و روز شہد طیار ہوتا رہتا ہے۔ تم دنیا کے سارے پھول اور پھل جمع کر کے چاہو کہ شہد کا ایک قطرہ بنا لو، تو کبھی نہ بنا سکوگے، لیکن ایک چھوٹی سی مکھی بناتی رہتی ہے اور اس نظم و انضباط، محنت و استقلال، تحسین و تدقیق، ترتیب و تناسب، اجتماع و اشتراک، اور یکسانیت و ہم آہنگی کے ساتھ بناتی رہتی ہے کہ اس کی ہر بات ہماری عقلوں کو درماندہ کر دینے والی، اور ہماری فکروں کی ساری توجیہوں اور تعلیلوں پر دروازہ بند ٨١ کر دینے والی ہے!

قرآن کے الفاظ پر غور کرو۔ کس طرح معاملہ کے دقائق واضح کر دیے ہیں! چونکہ شہد کی مکھی کی یہ صنعت گری جدو جہد، نظم و انضباط، اور سرگرمی و باقاعدگی کا ایک پورا سلسلہ ہے جو عرصہ تک جاری رہتا ہے، اور یکے بعد دیگرے

تمہارے لیے سکونت کی جگہ بنا دیا۔ نیز تمہارے لیے چارپایوں کی کھالوں سے گھر بنا دیے (یعنی خیمے، جنہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے ساتھ لیے پھرتے ہو) کوچ کر دیا اقامت کی حالت میں ہو، دونوں حالتوں میں نہایت سبک۔ اور پھر چارپایوں کی اون سے اور رؤوں سے اور بالوں سے کتنے ہی سامان اور مفید چیزیں بنا دیں کہ ایک خاص وقت تک کام دیتی ہیں!

اور اللہ نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں سے تمہارے لیے سایے پیدا کر دیے (کہ جنہیں خیمے میسر نہیں ہوتے وہ درختوں، مکانوں، اور پہاڑوں کے سایے میں پناہ لیتے ہیں) اور پہاڑوں میں پناہ لینے کی جگہیں بنا دیں، اور لباس پیدا کر دیا کہ (لوہ کی) گرمی سے بچاتا ہے۔ نیز آہنی لباس جو (ہتھیاروں کی) زد سے بچاتا ہے (سو دیکھو) اس طرح اللہ اپنی نعمتیں پوری طرح بخش رہا ہے تاکہ اس کے آگے (اطاعت میں) جھک جاؤ!

پھر (اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی لوگ اعراض کریں (اور سمجھنے بوجھنے کے لیے طیار نہ ہوں) تو (ان کی فکر چھوڑ دو) تمہارے ذمے جو کچھ ہے، وہ صرف

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۞ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ○ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ○ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۞ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىٕذِ ٟالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

٨٢-٨٣ ع ١١/١٧ — ٨٤ — ٨٥ — ٨٦-٨٧

بہت سی منزلوں سے گزر کر مکمل ہوتا ہے، اس لیے اُس کے کاموں کو "سبل" سے تعبیر کیا۔ یعنے عمل کی راہوں سے۔ فاسلکی سبل ربك، اور پھر چونکہ اس بات پر توجہ دلانا مقصود تھا کہ جو راہ عمل ٹھہرا دی گئی ہے، اس پر ٹھیک ٹھیک چلتی رہتی ہے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ذرا بھی ادھر اُدھر ہو، اس لیے فرمایا "ذللا" حکم الٰہی کے آگے جھکی ہوئی کام کیے جا۔ چنانچہ اُس کا ہر فرد اس طرح حکم الٰہی کے آگے جھک گیا ہے کہ ممکن نہیں، کسی کو راہ عمل سے منحرف ہوتا ہوا پاؤ!

یاد رہے کہ جس وقت تک ہندوستان کا گنّا دوسرے ملکوں میں نہیں پہنچا تھا میٹھی غذاؤں کے بنانے کا تمام تر دار و مدار شہد ہی پر تھا۔ یا پھر ایسے پھلوں پر جو بہت زیادہ میٹھے ہوتے ہیں جیسے کھجور۔ سکندر اعظم جب ہندوستان آیا تھا اور یونانیوں نے یہاں کی قند کھائی تھی، تو خیال کیا تھا یہ کھجور کی طرح کوئی معدنی چیز ہے جس کا مزہ شہد کی طرح میٹھا ہوتا ہے۔ غالباً سب سے پہلے عربوں نے ہندوستانی گنّے کی کاشت مصر میں کی، اور پھر مصر سے "مصری" یورپ پہنچی۔

پس شہد کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے کیا گیا کہ دنیا کے اکثر حصّوں میں مٹھاس کا مادّہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ نیز یہ محض لذیذ غذا ہی نہیں ہے۔ بلکہ کتنی ہی بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا بھی ہے۔

"وحی" مخفی اشارہ کو کہتے ہیں، اور یہاں لغوی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ فرمایا۔ یہ ربوبیت الٰہی کی وحی ہے جو تمام مخلوقات کو اُن کے کاموں پر لگاتی ہے اور جس نے ایک حقیر سے جانور میں سعی و عمل کی ایسی حیرت انگیز قوت پیدا کر دی ہے۔

یہی ہے کہ صاف صاف پیغام حق پہنچا دینا! ٨٢

یہ اللہ کی نعمتیں پہچانتے ہیں۔ پھر بھی اس سے انکار کرتے ہیں، اور اکثر ایسے ہیں جنہیں سچائی سے (قطعاً) انکار ہے! ٨٣

اور جس دن ایسا ہوگا کہ ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہی دینے والا (یعنے پیغمبر) اُٹھا کھڑا کرینگے، پھر کافروں کو اجازت نہ دی جائیگی (کہ زبان کھولیں) نہ ہی ان سے کہا جائیگا کہ توبہ کریں۔ ٨٤

جن لوگوں نے ظلم کیا ہے، جب وہ عذاب اپنے سامنے دیکھینگے، تو ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ اُن پر عذاب ہلکا کر دیا جائے۔ نہ ہی اُنھیں مہلت دی جائیگی! ٨٥

اور جن لوگوں نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے ہیں، جب (قیامت کے دن) اپنے بنائے ہوئے شریکوں کو دیکھینگے، تو پکار اُٹھینگے "اے پروردگار! یہ ہیں ہمارے (بنائے ہوئے) شریک جنہیں ہم تیرے سوا پکارا کرتے تھے" اس پر وہ بنائے ہوئے شریک اِن کی طرف اپنا جواب پھینکینگے "نہیں، تم سراسر جھوٹے ہو!" ٨٦

اور اُس دن سب اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینگے۔ وہ ساری افترا پردازیاں اُن سے کھوئی جائینگی جو (دنیا میں) کیا کرتے تھے! ٨٧

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ۝ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ

جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، تو اُن کی شرارتوں کی پاداش میں ہم نے اُن کے عذاب پر ایک اور عذاب بڑھا دیا (کہ ایک عذاب کفر کا ہوا. دوسرا راہِ حق سے روکنے کا)

اور وہ (آنے والا) دن جب ہم ہر ایک اُمت میں ایک گواہ (یعنے پیغمبر) اُٹھا کھڑا کرینگے جو انہی میں سے ہوگا (اور جو تبلائیگا کہ کس طرح اُس نے پیامِ حق پہنچایا، اور کس طرح لوگوں نے اُس کا جواب دیا) اور (اے پیغمبر!) تجھے ان لوگوں کے لیے (جو آج تجھے جھٹلا رہے ہیں) گواہ بنائینگے۔

(یہی بات ہے کہ) ہم نے تجھ پر الکتاب نازل کی (دین کی) تمام باتیں بیان کرنے کے لیے، اور اس لیے کہ مسلمانوں کے لیے راہنمائی ہو، اور رحمت، اور خوش خبری!

(مسلمانو!) اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملہ میں) انصاف کرو، (سب کے ساتھ) بھلائی کرو، اور

(۱۹) دنیا میں انسانی معیشت کا کارخانہ اس طرح چل رہا ہے کہ ہر طرح کے فوائد و وسائل کے حصول کا دروازہ ہر انسان اور ہر گروہ پر کھول دیا گیا ہے، مگر کوئی چیز کسی کو خود نہیں مل جاتی۔ اُسی کو ملتی ہے جو اُس کے لیے جد وجہد کرے اور وہ تمام طریقے کام میں لائے جو حصولِ مقصد کے لیے ضروری ہیں

لیکن ہر انسان کی ذہنی و جسمانی استعداد یکساں نہیں ہوتی، اور چونکہ یکساں نہیں ہوتی، اس لیے وسائلِ معیشت کے حصول کے اعتبار سے بھی سب کی حالت یکساں نہیں ہوئی۔ کسی نے وسائلِ معیشت پر زیادہ قابو پا لیا کسی نے کم۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع حاصل ہو گئے کسی کو تھوڑے۔ پہلے جسمانی قوت میں مقابلہ ہوا اور طاقتور نے کمزور کو مغلوب کر لیا۔ پھر ذہن و جسم کا مقابلہ شروع ہوا اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کر لیا۔

آیت (۷۱) بھی قرآن کی اُن آیتوں میں سے ہے جن سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ اس بارے میں قرآن کی تعلیم کا رُخ کس طرف ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن اس صورتِ حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ معیشت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں۔ کسی کے پاس زیادہ سامانِ معیشت ہے۔ کسی کے پاس کم۔ لیکن وہ یہ صورتِ حال برداشت نہیں کر سکتا کہ حصولِ رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو۔ کسی کو ملے۔ کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا، دنیا کے سامان و رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے اور کسی فرد اور گروہ کو حق نہیں کہ اس سے اُسے محروم کر دے۔ خواہ وہ طاقتور ہو یا کمزور، تندرست ہو یا بیمار، قابل ہو یا ناقابل، دولت مندوں کے گھر پیدا ہو یا فقیروں کے، لیکن اگر انسان ہے، تو ماں کے پیٹ سے وہ یہ حق لے کر آیا ہے کہ زندہ رہے اور زندگی کا سروسامان پائے!

لیکن ہر فرد زندگی کا سروسامان کیونکر پا سکتا ہے! جو کمزور رہ گیا یا جو ایسے حالات میں پڑ گیا ہے کہ کمانے کا موقعہ نہیں پاتا، یا جو معذور اور لاچار ہو گیا ہے، وہ سروسامانِ معیشت کہاں سے پائیگا؟ قرآن کہتا ہے، اس طرح کہ جن لوگوں کو

إِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ ۹۰ وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ○ ۹۱ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ

قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو۔ اور تمہیں روکتا ہے۔ (کن باتوں سے؟) بے حیائی کی باتوں سے، ہر طرح کی برائیوں سے، اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ (سمجھو اور) نصیحت پکڑو! ۹۰

اور جب تم آپس میں قول قرار کرو تو (سمجھ لو کہ یہ اللہ کے نزدیک ایک عہد ہو گیا تو) چاہیے کہ اللہ کا عہد پورا کرو، اور ایسا نہ کرو کہ قسمیں پکی کر کے انہیں توڑ دو، حالانکہ تم اللہ کو اپنے اوپر نگہبان ٹھہرا چکے ہو (یعنے اس کے نام کی قسم کھا کر اُسے شاہد قرار دے چکے ہو) یقین کرو تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ سے پوشیدہ نہیں۔ اُس کا علم ہر بات کا احاطہ کیے ہوئے ہے! ۹۱

اور دیکھو تمہاری مثال اُس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا۔ پھر توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم آپس کے معاملہ میں اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو۔ اس لیے کہ

کمائی کا زیادہ موقعہ ملا ہے، اُن کے ذمے خرچ کرنے کا فرض بھی زیادہ عائد ہو گیا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ کمزوروں کو لوٹا دیں۔ لوٹا دیں، کیونکہ فی الحقیقت کمائی کی یہ زیادہ مقدار اُن افراد کے لیے تھی جو کمزوری کی وجہ سے حاصل نہ کر سکے۔ اب چلی گئی ہے طاقتور افراد کے پاس۔ اس لیے چاہیے کہ حقداروں کو لوٹا دی جائے۔ یعنے جو اُن کا حق ہے، وہ اُنہیں مل جائے۔

وہ کہتا ہے، یہ بات کہ تمہیں سامانِ معیشت کے زیادہ کمانے کا موقعہ مل گیا ہے، تمہیں اس بات کا حقدار نہیں بنا دیتی کہ اپنی ساری کمائی صرف اپنی انفرادی زندگی ہی کے لیے روک لو۔ کیونکہ دنیا کے وسائل زندگی کسی خاص انسان کی حقیقی ملکیت نہیں ہو جا سکتے۔ یہاں جو کچھ ہے تمام نوع کے لیے ہے۔ پس اگر ایک فرد نے زیادہ کما لیا، تو کما لے سکتا ہے، لیکن ایسا نہیں سمجھ سکتا کہ ساری کمائی اُسی کی ہو گئی۔ جو کچھ اُس نے کمایا ہے، دراصل نوع انسانی کی ایک امانت ہے، جو اُس کے قبضہ میں آ گئی ہے۔ وہ اس پر قابض رہ سکتا ہے، لیکن اسے صرف اپنے ہی لیے خاص نہیں کر لے سکتا۔ اُس کا فرض ہے کہ خود بھی کھائے اور اُن کمزوروں کو بھی کھلائے جو حصولِ معیشت سے محروم رہ گئے ہیں۔

دراصل قرآن کی اس تعلیم کی تہ میں یہ بنیادی اصل کام کر رہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور منقطع تسلیم نہیں کرتا، بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے شریک حال ہیں، اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے والے ہیں۔ بلا شبہ ان میں کا ہر فرد اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی استعداد کے مطابق جد و جہد معیشت میں لگا ہوا ہے، اور کوئی زیادہ کامیاب ہوتا ہے، کوئی کم، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک فرد دوسرے فرد کی حالت سے بے پروا ہو جائے۔ جو زیادہ کماتا ہے، وہ اپنی کمائی دوسرے کو اُٹھا کر نہیں دے دیتا، لیکن ایسا بھی نہیں کر سکتا کہ دوسرے کی یک قلم محرومی برداشت کر لے، اور اس کے لیے اپنے کو ذمہ دار نہ سمجھے۔ جو زیادہ کماتا ہے، اُس کے پاس زیادہ کمائی رہتی ہے، جو کم کماتا ہے، اُس کے پاس کم رہتی ہے، لیکن کھاتے پیتے سب ہیں۔ بھوکا

أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۚ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۚ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ ٩٢ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ ٩٣

ایک گروہ (کسی) دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یاد رکھو) اللہ اس معاملہ میں تمہاری (راست بازی و استقامت کی) آزمائش کرتا ہے (کہ تم طاقتور گروہ کا پاس کرنے لگتے ہو یا اپنے قول و قرار کا) جن جن باتوں میں تمہارے اختلافات ہیں، ضرور ایسا ہوگا کہ وہ قیامت کے دن (حقیقتِ حال) تم پر آشکارا کر دے!

اور (دیکھو) اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا (یعنے مختلف گروہوں اور مختلف طریقوں کا اختلاف ظہور ہی میں نہ آتا) لیکن (تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں چاہا) وہ جس کسی پر چاہتا ہے (کامیابی کی) راہ گم کر دیتا ہے جس کسی پر چاہتا ہے، کھول دیتا ہے، اور (پھر) ضرور ایسا ہونا ہے کہ تم سے اُن کاموں کی باز پرس ہو جو (دنیا میں) کرتے رہتے ہو!

کوئی نہیں رہ سکتا۔ کمائی میں سب الگ الگ جدوجہد کرینگے، کھانے میں سب ایک دوسرے کے شریک ہو جائینگے۔

دنیا میں نسل و توارث کے تو ہی رشتوں نے خاندانوں کی بنیاد ڈال دی ہے۔ یہ خاندانی زندگی ٹھیک اُس زندگی کا ایک نمونہ ہے جو قرآن چاہتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ہو جائے۔ ایک خاندان میں مختلف افراد ہوتے ہیں، اور استعداد کار کے لحاظ سے تمام افراد کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ کوئی فرد زیادہ کماؤ ہوتا ہے، کوئی کم۔ کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ نہیں کماتا، یا کچھ نہیں کما سکتا۔ جو زیادہ کماتا ہے، وہ اپنی کمائی اپنے ہی پاس رکھتا ہے۔ ایسا نہیں کرتا کہ اُٹھا کر دوسرے کو دیدے۔ لیکن باہمی رشتہ داری نے باہمی اشتراک و تعاون کا جو فرض عائد کر دیا ہے، اُسے خاندان کا کوئی فرد نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ خاندان کا ایک فرد خود تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے، لیکن دوسروں کو فقر و فاقہ کی حالت میں ہلاک ہونے کے لیے چھوڑ دے۔ کمانے میں سب کی راہیں الگ ہوتی ہیں، اور نتائج بھی سب کے ایک طرح کے پیش نہیں آتے۔ لیکن کھانے میں سب ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی فکر سے غافل نہیں ہو سکتے۔ اگر خاندان کا ایک فرد زیادہ کماتا ہے، تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری بھی اس پر زیادہ عائد ہو گئی ہے، اور دوسرے بھی سمجھتے ہیں، کہ یہ زیادہ کماتا ہے، تو اُسے ہماری خبر گیری بھی دوسروں سے زیادہ کرنی چاہیے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد ہوتے ہیں، مگر باہمی تعاون و اشتراک کا فرض بھلا دیتے ہیں۔ ایک بھائی لاکھوں کماتا ہے۔ دوسرا بھائی بھوکا مرتا ہے۔ لیکن دنیا ایسے آدمی کو ملامت کریگی وہ کہیگی یہ ننگِ خاندان ہے۔ اس نے یہ بات کیسے گوارا کرلی کہ خود تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے اور اُس کا بھائی ایک ایک دانہ کو ترسے۔

قرآن چاہتا ہے۔ ایسا ہی اعتقاد نوعِ انسانی کے تمام افراد میں پیدا ہو جائے۔ وہ کہتا ہے۔ تمام افرادِ انسانی دراصل ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد ہیں۔ انسانیت ان کی نسل ہے اور کرۂ ارضی ان کا وطن ہے۔ بلا شبہ ان میں کا ہر فرد حق رکھتا ہے کہ اپنی اپنی حالت اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق معیشت کے وسائل حاصل کرے لیکن اس کا حق نہیں رکھتا کہ اپنی کمائی کو صرف اپنے ہی لیے سمجھ لے اور اپنے کمزور بھائی کے لیے کچھ نہ نکالے۔

وَلَا تَتَّخِذُوٓا أَيۡمَٰنَكُمۡ دَخَلَۢا بَيۡنَكُمۡ فَتَزِلَّ قَدَمُۢ بَعۡدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا ٱلسُّوٓءَ بِمَا صَدَدتُّمۡ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ وَلَكُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ وَلَا تَشۡتَرُوا بِعَهۡدِ ٱللَّهِ ثَمَنٗا قَلِيلًا ۚ إِنَّمَا عِندَ ٱللَّهِ ۹۴

اور (دیکھو) آپس کے معاملات میں اپنی قسموں کو مکروفریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ لوگوں کے پاؤں جمنے کے بعد اُکھڑ جائیں، اور اس بات کی پاداش میں کہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکا، بُرے نتیجوں کا تمہیں مزہ چکھنا پڑے، اور (بالآخر) ایک بڑے عذاب کے سزاوار ہو! ۹۴

اور اللہ کے نام پر کیے ہوئے عہد (دنیا کے) بہت تھوڑے فائدے کے بدلے نہ بیچو۔ (راست بازی کا) جو اجر اللہ کے پاس ہے، وہی تمہارے حق

میں سب کی راہیں الگ ہونگی۔ قبضہ و تصرف میں بھی سب الگ الگ رہینگے، لیکن کھانے میں الگ نہیں رہ سکتے۔ یہ خدا کے اس عالمگیر گھرانے کے ہر فرد کا قدرتی حق ہے سو وہ کما سکے یا نہ کما سکے، لیکن اسے زندہ رہنے کا سامان ملنا چاہیے۔

وہ کہتا ہے۔ کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تم انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اُٹھائی جائے۔ اگر تم کچھ نہیں کما سکتے، تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ جونہی تم کمانے لگے، تم پر ذمہ داری عائد ہو گئی۔ اب یہ جتنی بڑھتی جائیگی انفاق کی ذمہ داری بھی بڑھتی جائیگی۔ ہر پیسہ جو تمہاری جیب میں آئیگا، انفاق کی ایک تازہ ذمہ داری اپنے ساتھ لائیگا تمہاری کمائی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔ تم جس قدر کما سکتے ہو کماؤ۔ بلکہ چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ کماؤ، لیکن یہ نہ بھولو کہ زیادہ سے زیادہ کمانا، زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں!

وہ کہتا ہے، افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے۔ افراد جتنا کما سکتے ہیں، کمائیں، لیکن ڈھیر لگانے کے لیے نہیں۔ خرچ کرنے کے لیے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ "اکتناز" کو رد کرنا چاہتا ہے۔ یعنے چاندی سونے کے ڈھیر لگانے کو، اور کہتا ہے، اُن کے لیے عذابِ الیم کی بشارت ہے جو ڈھیر لگاتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے: والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا (۹: ۳۴) شرح اس کی سورۂ توبہ میں گزر چکی۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ جہاں تک نظامِ معیشت کا تعلق ہے، قرآن نے اکتسابِ مال کا معاملہ انفاقِ مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ وہ فرد کے حقِ اکتساب سے تعرض نہیں کرتا، لیکن اس حق کو انفاق کی ذمہ داری کے ساتھ باندھ دیتا ہے۔ جس قدر کما سکتے ہو کماؤ، لیکن کوئی کمائی جائز تسلیم نہیں کی جا سکتی، اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض "اکتناز" کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے، قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک، اور مستحقِ عقوبت ہے!

چنانچہ یہاں آیت (۱۷) میں فرمایا واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق۔ سروسامانِ رزق کے اعتبار سے سب کی حالت یکساں نہ ہوئی۔ کسی کے پاس زیادہ ہے۔ کسی کے پاس کم ہے، کوئی بالکل محروم ہے۔ فما الذین فضلوا برادّی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم۔ پھر جن لوگوں کو رزق میں برتری دی گئی ہے، وہ ایسا کرنے والے نہیں کہ اپنی کمائی ہوئی رزق اپنے غلاموں اور زیردستوں کو دیدیں۔ فھم فیہ سواء۔ حالانکہ جو رزق اُنہوں نے کمائی ہے، وہ کچھ اُن کی خلق کی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔ اور اس لیے رزق کے حقدار ہونے میں وہ سب برابر ہیں۔ خواہ کوئی زیردست ہو کر محروم ہو گیا ہو، خواہ کوئی زبردست ہو کر خوشحال ہو گیا ہو۔ افبنعمۃ اللہ یجحدون؟ پھر کیا یہ اللہ کی نعمت کے منکر ہیں! اللہ کی نعمت کے۔ کیونکہ دنیا میں جس قدر سروسامانِ معیشت ہے، وہ دراصل فطرت ہی کی پیداوار ہے۔ کسی فردِ انسانی کی پیدا

۹۵ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ
۹۶ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ فَاِذَا

میں بہتر ہے بشرطیکہ تم سمجھتے بوجھتے ہو!

جو کچھ تمہارے پاس ہے، (ایک نہ ایک دن) ختم ہو جائیگا، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ ختم ہونے والا نہیں۔ جن لوگوں نے صبر کیا (اور زندگی کی عارضی مشکلیں جھیل گئے) ہم ضرور انہیں اُن کا اجر عطا فرمائینگے۔ انہوں نے جیسے جیسے اچھے کام کیے ہیں اُسی کے مطابق ہمارا اجر بھی ہوگا:

جس کسی نے اچھا کام کیا، خواہ مرد ہو خواہ عورت، اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے، تو (یاد رکھو) ہم ضرور اسے (دنیا میں) اچھی زندگی بسر کرائینگے اور آخرت میں بھی ضرور اُسے اجر دینگے۔ انہوں نے جیسے جیسے اچھے کام کیے ہیں، اُسی کے مطابق ہمارا اجر بھی ہوگا۔

۹۵ کی ہوئی نہیں ہے، اور اگر ایک فرد کے قبضہ میں آجاتی ہے، تو یہ ایک اللہ کا فضل ہے، پس چاہیے کہ اس کی شکرگزاری بجا لائی جائے۔ نہ یہ کہ کفرانِ نعمت کیا جائے۔ اس کی شکرگزاری کیا ہے؟ اُن افراد پر خرچ کرنا جو اس کے حصول سے محروم ہیں۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ سروسامانِ معیشت سب کے پاس یکساں نہیں، اور یہ اختلافِ حال قدرتی ہے۔ اسی لیے اسے اللہ نے براہ راست اپنی طرف منسوب کیا۔ دوسری یہ کہ رزق کے مقدار ہونے میں سب برابر ہوئے۔ خواہ کوئی آقا ہو، کوئی مملوک، کوئی طاقتور ہو، کوئی زبردست۔ چونکہ یہ دونوں باتیں یکجا ہو کر اس

۹۶ سوال پر روشنی ڈالتی ہیں کہ نظامِ معیشت کے معاملہ پر قرآن کا رُخ کس طرف ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ مندرجہ صدر تشریحات اسی محل میں کر دی جائیں۔

اس آیت میں "فھم فیہ سواء" کا مطلب قرار دیتے ہوئے بعض مفسرین نے اسے عدم تساوی حال پر محمول کیا ہے اور تقدیرِ عبارت یوں قرار دی ہے کہ "أفھم فیہ سواء"؟ بعضوں نے فھم کی فا، کو حتیٰ کے معنوں میں لیا ہے، لیکن جملہ کا صاف صاف مطلب وہی ہے جو ہم نے قرار دیا ہے یعنے یہ صریح تساوی حال کی خبر ہے نہ کہ اُس کی نفی، اور جب مطلب ٹھیک ٹھیک بیٹھ رہا ہے تو پھر کونسی وجہ ہے کہ جگہ سے ہٹنے کے لیے مضطرب ہوں۔

---

(۲۰) آیت (۷۲) میں ربوبیتِ الٰہی کی نعمتوں میں سے تین نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک یہ کہ اس نے انسان کی زندگی دو مختلف جنسوں مرد اور عورت میں تقسیم کر دی۔ اور پھر ایک کو دوسرے کا ساتھی بنا دیا یعنے ازدواجی زندگی کا نظام قائم کر دیا۔ دوسری یہ کہ ازدواجی زندگی سے خاندانی زندگی پیدا ہو گئی۔ اولاد پیدا ہوتی ہے، پھر اُن کی اولاد ہوتی ہے، اور اس طرح ایک دائرہ قریبی رشتہ داروں کا بن جاتا ہے، جس کا ہر فرد دوسرے فرد سے وابستہ ہوتا ہے، اور اسی وابستگی سے اجتماعی زندگی کی ساری برکتیں اور راحتیں حاصل ہوتی ہیں۔ تیسری یہ کہ اس کی غذا کے لیے اچھی چیزیں پیدا کر دیں، جو نہ صرف مفید ہیں، بلکہ خوشگوار ہیں، خوش رنگ ہیں، خوشبو ہیں۔
اس مقام کی تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ کا مبحث "تسکین حیات" دیکھنا چاہیے۔

---

(۲۱) آیت (۷۴) میں فرمایا لاتضربوا للّٰہ الامثال۔ اپنے جی سے اللہ کے لیے مثالیں نہ گڑھو۔
انسان کی ساری درماندگی اس راہ میں یہ ہے کہ اپنے معیارِ خیال سے اللہ کا تصور آراستہ کرنا چاہتا ہے، اور اس کے

قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ ۹۸
اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ⓭ ۹۹-۱۰۰

پس جب تم قرآن پڑھنے لگو، تو چاہیے کہ شیطان مردود (کے وسوسوں سے) اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ ۹۸ جو لوگ ایمان والے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اُن پر اُس کا زور چلے۔ ۹۹

اُس کا زور تو اُنہی پر چلتا ہے جو اُسے اپنا رفیق بناتے ہیں، اور جو اُس کی وجہ سے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ۱۰۰

لیے مثالیں تراشتا ہے، حالانکہ اس کے سارے تصور اُس کے سارے قیاسات، اس کی ساری تمثیلیں، اس کے لیے ٹھوکروں پر ٹھوکریں اور گمراہیوں پر گمراہیاں ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی سوچی ہوئی تمثیلوں میں جتنا بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی حقیقت سے دور ہوتا جاتا ہے، کیونکہ وہ جتنی بھی تمثیلیں بناتا ہے، اپنے ادراک و احساسات کے اندر رہ کر بناتا ہے، اور ذاتِ مطلق اس دائرہ کی رسائی سے ماوری ہے:

اے بروں از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من!

جہاں تک تصورِ الٰہی کی تنزیہہ کا تعلق ہے، قرآن کی دو چھوٹی سی چھوٹی آیتوں میں سب کچھ کہہ دیا گیا ہے، ان میں سے ایک آیت یہ ہے، دوسری لیس کمثلہ شیءٌ (۴۲ : ۱۱) تنزیہہ کے بارے میں تم جو کچھ بھی کہو، اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے۔ اس کے لیے تمثیلیں نہ گڑھو۔ وہ اُن ساری چیزوں میں سے کسی چیز کے بھی مثل نہیں ہے جس کا تم تصور کر سکتے ہو!

لیکن اگر قرآن کے تصورِ الٰہی کی تنزیہہ کا یہ حال ہے، تو پھر کیوں اُس نے صفات کا اثبات کیا؟ صفات کے اثبات کا لازمی نتیجہ تشخص[1] ہے، اور تشخص پیدا ہوا، تو اطلاق باقی نہ رہا، اور اطلاق باقی نہیں رہا، تو تنزیہہ بھی اپنی بلندی سے نیچے اُتر آئی۔

اس لیے کہ اگر تنزیہہ کا مطلب یہ سمجھا جائے، تو انسان کے تصور کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ خدا کا تصور محض ایک سلبی[2] تصور ہو جاتا ہے، اور سلبی تصور سے خدا پرستی کی زندگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ خدا کا ایسا تصور اس کی فطرت کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہو جائیگا۔ وہ وجدانی طور پر ایک خالق و پروردگار ہستی کا یقین رکھتا ہے، اور جب یقین رکھتا ہے تو ناگزیر ہے کہ اُس کا تصور بھی کرے۔ اور جب تصور کریگا، تو تشخص کے ساتھ ہی کریگا۔ غیر متشخص اور سلبی حقیقت کا تصور اُس کی فطری طاقت سے باہر ہو، اور اگر بہ تکلف وہ ایسا تصور پیدا بھی کرنا چاہے، تو یہ اس کے لیے کوئی زندہ اور عامل تصور نہیں ہو سکتا۔

یہ بات کہ اُس کی فطرت میں ایک ایسی ہستی کا وجدانی اعتقاد موجود ہے، اس بات کا بھی فطری ثبوت ہے کہ اُسے اُس کا تصور کرنا چاہیے۔ یعنے فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ تصور کرے، وہ وجدانی طور پر مجبور ہے کہ تصور کرے۔ لیکن جب وہ تصور کریگا تو یہ ایک انسان ہی کا تصور ہو گا۔ ماورائے انسانیت تصور نہیں ہو گا، اور انسانی تصور تشخص کی پرچھائیں سے منزہ نہیں ہو سکتا۔

اس تصور کا ولولہ انسان کی فطرت میں کیوں اُبل رہا ہے؟ اس لیے کہ اُس کے معنوی ارتقاء کے لیے ایک نصب العین کی ضرورت تھی، اور یہ نصب العین اللہ کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مخلوقات میں جتنی چیزیں ہیں،

[1] "تشخص" سے یہاں مقصود تصور کی وہ نوعیت ہے جسے انگریزی میں "پرسنل گاڈ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
[2] سلبی تصور سے مقصود یہ ہے کہ صرف نفی کی جائے، اثبات نہ ہو۔ یعنے کہا جائے، وہ ایسا نہیں ہے، ایسا نہیں ہے، ایسا نہیں ہے۔ مگر یہ نہ کہا جائے کہ اس میں یہ یہ صفتیں ہیں۔ مثلاً وہ رحیم ہے، علیم ہے، پروردگار ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ۱۰۱ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى ۱۰۲

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں، اور اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے، تو یہ لوگ کہتے ہیں "تم تو اس اپنے جی سے گڑھ لیا کرتے ہو" حالانکہ ان میں سے اکثروں کو معلوم نہیں کہ حقیقت حال کیا ہے۔

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو ("یہ میرے جی کی بناوٹ نہیں ہے، اور نہ ہو سکتی ہے) یہ تو فی الحقیقت تمہارے پروردگار کی طرف سے روح القدس نے اتاری ہے اور اس لیے اتاری ہے کہ ایمان والوں کے دل جما دے،

سب اس سے پست ہیں۔ وہ بلند ہونے کے لیے اس کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ اسے ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہے جو سب سے بلند تر ہو، اور زیادہ سے زیادہ بلندیوں تک اسے کھینچنے والی ہو۔ یہ صرف اللہ کا تصور ہے۔ یہی تصور ہے جو اس کے لیے اڑنے اور اونچے ہونے کا ایک ایسا نصب العین بہم پہنچا دیتا ہے جس سے بلند تر کوئی نصب العین نہیں ہو سکتا اور یہاں جو کچھ ہے، سب اس کی فرد تر ہے۔ یہ اس کے آگے مقام انسانیت کی غیر محدود ترقیوں کی شاہراہ کھول دیتا ہے پس ضروری ہے کہ وہ اپنے سامنے ایک تصور رکھے۔ اور تصور رکھے تو یہ ایک ایجابی تصور ہو۔ محض نفی و سلب نہ ہو نفی و سلب اسے کچھ نہیں دے سکتا۔ اسے کھینچ نہیں سکتا، اسے اپنی آغوش میں لے نہیں سکتا۔ اور اس کا وجدان ایک ایسی ہستی کے لیے تشنہ ہے جو دینے والی ہو، بلانے والی ہو، کھینچنے والی ہو، اپنے حسن و جمال کی صفتوں کے اندر سے جھانکنے والی ہو!

اس کی پیاس صرف اس سے نہیں بجھ سکتی کہ اسے بتلا دیا جائے، خدا کی ذات ایسی نہیں ہے، ایسی نہیں ہے، اس کی طلب و احتیاج تو کسی ایسے کو ڈھونڈھ رہی ہے جو بتلائے میں ایسا ہوں، اور مجھ میں ایسی ایسی صفتیں ہیں!

پھر تمام کائناتِ ہستی کی پکار کیا ہے جو انسان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے؟ اور خود اس کی ہستی کا ایک ایک لمحہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا ممکن ہے کہ انسان اس کی طرف سے کان بند کر لے؟ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ آنکھیں کھولنے سے انکار کر دے؟ یہاں کی ہر چیز گواہی دے رہی ہے کہ کسی بنانے والے میں بنانے اور سنوارنے کی صفتیں ہیں، اور اس کی صفتوں کے ہم نقش و نگار ہیں۔ انسان یہ سارے نقش و نگار دیکھتا ہے، اور ان میں حقیقتیں پاتا ہے پس ان کا تصور اسے کرنا ہی پڑیگا۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہاں حسن و جمال ہے، اس لیے اسے تصور کرنا ہی پڑیگا کہ اس میں حسن و جمال ہے؛ وہ دیکھتا ہے کہ یہاں پروردگاری ہے، اس لیے اسے تصور کرنا ہی پڑیگا کہ وہ پروردگار ہے!

پس اس راہ کی ٹھوکر اثباتِ صفات میں نہ ہوئی۔ اس میں ہوئی کہ صفات کیسی ہونی چاہئیں؟ ذہن انسانی نے جب کبھی نقشہ کھینچنا چاہا تو اپنی رسائی فکر کے مطابق تمثیلیں بنائیں، اور اسی میں گمراہ ہوا۔ انبیاء کرام کی دعوت کا مقصد یہ رہا کہ اس گمراہی سے دنیا کو نجات دلائیں اور صفاتِ الٰہی کا صحیح تصور پیدا کر دیں۔ قرآن کا تصور الٰہی اسی تصور کی تکمیل ہے کہ اس نے تنزیہہ کا مقصد بھی پورا کر دیا، اور صفاتِ الٰہی کا کامل نقشہ بھی کھینچ دیا۔ اس نے ایک طرف تو ہر طرح کے تمثّل و تجسّم کا دروازہ بند کر دیا کہ لا تضربوا للہ الامثال اور لیس کمثلہ شیء۔ اور دوسری طرف اس کی صفتوں سے بھی ہمیں آشنا کر دیا جو تمام تر "حسنیٰ" ہیں۔ یعنے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں، اور جنہیں ہم کائناتِ ہستی کے ایک ایک ذرہ سے پوچھ لے سکتے ہیں اور ایک ایک ذرہ کے منہ سے سن لے سکتے ہیں! شہد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو، و الملائکۃ، و اولوا العلم، قائما بالقسط، لا الٰہ الا ھو العزیز الحکیم! (۳: ۱۸)

اس کی تنزیہہ بھی کامل ہے کیونکہ تشبہ اور تجسم کی پرچھائیں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی بتلائی ہوئی صفتیں بھی

وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ○ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ○ ۱۰۲ ۱۰۳

اعلیٰ ہیں۔ کیونکہ سرتا سر حسن، سرتا سر کبریائی، سرتا سر عظمت و جلال ہیں!

اسی سورت کی آیت (۶۰) میں گزر چکا ہے: الذین لا یومنون بالاٰخرۃ مثل السوء، وللہ المثل الاعلیٰ

افسوس ہے کہ اس آیت کا مطلب لوگوں نے نہیں سمجھا۔ اس میں بھی یہی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ قرآن اس سے نہیں روکتا کہ انسان خدا کے تصور کے لیے ایک بات عیاں میں لائے، لیکن وہ بات کیسی ہونی چاہیے؟ یہیں اُسے ہمیشہ ٹھوکر لگی۔ وہ اُسے نہیں پا سکا۔ وہ حسن و جمال، کبریائی و کمال، اور علو و عظمت کی بات تھی، لیکن اُس نے گمراہی

فرماں بردار بندوں کے لیے رہنمائی ہو، اور (نجات و سعادت کی) خوش خبری! ۱۰۲

اور بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ (قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ یہ) کہتے ہیں "اس شخص کو تو ایک آدمی (یہ باتیں) سکھا دیتا ہے" حالانکہ اُس آدمی کی زبان جس کی طرف اُسے منسوب کرتے ہیں عجمی ہے، اور یہ صاف اور آشکارا عربی زبان ہے! ۱۰۳

فکر سے بُری باتیں، گری ہوئی باتیں، ناسزا باتیں گڑھ لیں یعنے "مثل السوء" سے کام لیا۔ "المثل الاعلیٰ" نہ پاسکا۔ حالانکہ اللہ کے لیے جو بات ہوگی، "المثل الاعلیٰ" ہی کی ہوگی "مثل السوء" کی نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے اسی "المثل الاعلیٰ" کا جمالِ حقیقت نمایاں کر دیا ہے۔ اور یہی "المثل الاعلیٰ" ہے جسے سورۂ اعراف میں "الاسماء الحسنیٰ" سے تعبیر کیا، اور مثل السوء کے لیے الحاد فی الاسما کی تعبیر اختیار کی: وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا و ذروا الذین یلحدون فی اسمائہ، سیجزون ما کانوا یعملون (۷: ۱۸۰)

ایک دوسری جگہ فرمایا: لہ الاسماء الحسنیٰ، یسبح لہ ما فی السمٰوٰت والارض، وھو العزیز الحکیم (۵۹: ۲۴) اُس کے لیے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں، اور آسمانوں میں اور زمین میں جتنی مخلوقات ہیں، سب اُس کی تسبیح کر رہی ہیں یعنے تمام کائنات ہستی ان صفتوں کی شہادت دے رہی ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز ان صفتوں کا اعتراف ہے، ان صفتوں کی نمود ہے، اُس کی پاکی و کبریائی کے اعلان میں تسبیح کی زبان ہے۔ تقدیس کی پکار ہے!

بہرحال اثباتِ صفات ایک ایسی حقیقت ہے جس کی وجدانی طلب فطرتِ انسانی میں موجود ہے، اور اس لیے اس حد تک تشخص کا ہونا فطری مطالبہ پورا کرنا ہے۔ اگر اس سے اعراض کیا جائیگا، تو غیر فطری بات ہوجائیگی اور انسان کی وجدانی پیاس کبھی نہیں بجھیگی۔ ہندوستان کے فلسفۂ ویدانت نے اور اس کے بعد بودھ مذہب کے حکماء نے نفیِ صفات

ک انیسویں صدی میں جن مستشرقین نے بودھ مذہب کی تحقیقات کی، اُن میں سے اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ گوتم بُدھ کے عقیدہ میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، لیکن اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ مذہب کی زیادہ سے زیادہ غلط تعبیر ہے۔ جہاں تک خدا کے اعتقاد و تصور کا تعلق ہے، گوتم بُدھ نے بھی وہی راہ اختیار کی جو اُپنشد کی ہے، لیکن اس پر حقیقت کے اطلاق کا استغراق اس درجہ طاری ہوگیا تھا کہ کوئی مثبت بات اس بارے میں نہ کہہ سکا۔ اس کا مسلک انکارِ ذات کا نہ تھا، نفیِ صفات کا تھا۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ اُس نے زندگی میں رنج و عذاب کے سوا کچھ نہ دیکھا، اور نجات کی راہ اُس کے نزدیک ترکِ فنا میں ہے۔ وہ زندگی کے رنج و عذاب کا یقین ضرور پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن اس لیے کہ رنج و عذاب سے نکلنے اور طمانیت و سعادت حاصل کرنے کی طلب پیدا کرے۔ اُس نے نجات کی راہ ترکِ خواہشات نہیں قرار دی ہے بلکہ "درمیانی راہ" پر زور دیا ہے۔ یعنے نہ تو خواہشوں کا استغراق اور نہ ترکِ محض کی راہ۔

میں خود بھی عرصہ تک اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا لیکن اب مطالعہ و تحقیق کے بعد اس رائے کی غلطی واضح ہوگئی ہے۔

۱۰۴ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ إِنَّمَا يَفْتَرِي

۱۰۵ الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ○

اصل یہ ہے کہ جو لوگ (دیدہ و دانستہ) اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں کرتے، اللہ انہیں کامیابی کی راہ کبھی نہیں دکھاتا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہونا ہے۔

اپنے جی سے جھوٹ گڑھنا تو انہی کا کام ہے جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے (اللہ پر ایمان رکھنے والا تو کبھی افترا پردازی نہیں کرسکتا) یہی ہیں کہ سرتاسر جھوٹے ہیں!

کا مسلک اختیار کیا اور تشخص کو مٹانا چاہا، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ یہ نکلا کہ نہ صرف تشخص کی بلکہ تجسم تک کی لوگوں کو اجازت دے دینی پڑی۔ کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ غیر مشخص تصور سے خدا پرستی کی پیاس بجھ نہیں سکتی، اور ۱۰۴ ضروری ہے کہ فکر انسانی کے سامنے ایک چیز لائی جائے اس کا وجدان بغیر اس کے مطمئن نہیں ہوسکتا کہ کوئی نہ کوئی صورت سامنے دیکھے۔ اگر صفات کی صورت نہ ہوگی تو پتھر کی مورتی تراش لیگا:

کہے کیا کعبہ ہیں، جو تیرہ بت خانہ سے آگے ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے، واں اللہ ہی اللہ ہے!

۱۰۵ یا تو تنزیہ میں اس قدر بلند ہونا چاہا تھا کہ اثباتِ صفات بھی ان پر شاق گزرا حتی کہ اس کے بھی روادار نہ ہوئے کہ اس کی طرف "وہ" کہہ کے اشارہ کریں، کیونکہ ہمارا "وہ" کہنا بھی تشخص کی آلودگی سے منزہ نہیں ہوسکتا۔ یا پھر تجسم کی پستی میں گرے تو ایسے گرے کہ نہ صرف تشخص کو اس کی ساری تمثیلوں اور جسمانیتوں کے ساتھ جائز کر دیا، بلکہ اس کے سب سے زیادہ ادنیٰ اور اسفل درجہ کی بھی اجازت دیدی۔ یعنی مورتی پوجا کی! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ویدانت کی توحید وجودی کا مسلک اور بودھسٹ حکمائے سلب و نفی کا تصور فلسفہ کا ایک مذہب بن گیا، لیکن انسان کا عملی مذہب نہ بن سکا۔ عملی مذہب کے لیے اصنام پرستی ہی اختیار کرنی پڑی۔

نفی صفات اور استغراقِ اطلاق کا یہی مسلک ہے جسے اصحاب حدیث نے "تعطیل" سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کی تعلیم تنزیہ پر مبنی ہے۔ تعطیل پر نہیں ہے۔

تاریخ اسلام میں سب سے پہلے نفی صفات کی صدا جہم بن صفوان نے بلند کی، جس کی طرف جہمیہ منسوب ہیں۔ پھر متکلمین و نظامیہ کے مختلف گروہ اس سے کم و بیش متاثر ہوئے۔ باطنیہ کا مذہب اثبات و نفی بھی اسی پر مبنی تھا۔ یعنے وہ اثبات کے ساتھ نفی بھی کر دیتے تھے، اور کہتے تھے "النور لا نور" اور "الحکیم لا حکیم" توجیہ اس کی یہ کرتے تھے کہ اثبات حقیقتِ صفات کے لیے ہے۔ نفی تشبہ کے لیے۔

---

(۲۲) اس آیت کے بعد دو مثالیں بیان کی ہیں۔ ضرب اللہ مثلاً عبداً مملوکاً اور وضرب اللہ مثلاً رجلین احدھما ابکم:

(ا) پہلی مثال میں فرمایا۔ اگر تمہیں احتیاج ہو، تو تم کس کے پاس جاؤ گے؟ ایک غلام کے پاس جو کسی دوسرے کے اختیار میں ہے اور خود کوئی اختیار نہیں رکھتا، یا اس کے پاس جو مالک و مختار ہو اور جس طرح چاہے اپنا مال خرچ کرسکتا ہو؟ کیا دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ ایک بے بس غلام اور ایک مالک و مختار آقا! اگر نہیں ہوسکتے، تو اس سے بڑھ کر عقل کی ہلاکت اور کیا ہوسکتی ہے کہ تم اپنی حاجتوں اور مصیبتوں میں ان کے آگے جھکتے ہو جو خود اللہ کے بندے ہیں اور اپنی ساری احتیاجوں میں اس کی بخشائش کے محتاج، اور اس کی طرف سے گردن موڑ لیتے ہو جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑنے والا ہو؟

(ب) دوسری مثال ایمان اور کفر کی مثال ہے۔ فرمایا۔ فرض کرو، دو آدمی ہوں۔ ایک گونگا بہرا، اپنے

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

جو کوئی ایمان لانے کے بعد پھر اللہ سے منکر ہوا اور اس کا دل اس انکار پر رضامند ہو گیا، تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے، اور اُن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ مگر ہاں جو کوئی کفر پر مجبور کیا جائے (اور بے بس ہو کر بخوف جان کوئی ایسی بات کہدے) اور اُس کا دل اندر سے ایمان پر مطمئن ہو، (تو ایسے لوگوں سے مواخذہ نہیں)

ساتھیوں کے لیے بوجھ۔ کوئی کام بھی اُس سے بن نہ پڑے دوسرا مستقیم اور رہنما۔ فلاح و کامیابی کی راہ چلنے والا اور دوسروں کو بھی راہ دکھانے والا۔ تو کیا ان دونوں کی حالت میں تمہیں کوئی فرق نہیں دکھائی دیگا؟ تمہاری نگاہ میں دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا؟ اگر نہیں ہوگا اور تم بے اختیار بول اٹھوگے کہ کہاں ایک گونگا بہرا، اور کہاں ایک گویا و کارفرما، تو پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایمان کی زندگی پر کفر کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو؟ ایمان کی زندگی کیا ہے؟ عقل و بصیرت کی زندگی، جو خدا کے دیے ہوئے حواسوں سے کام لیتی، خود بھی سیدھی راہ چلتی اور دوسروں کی بھی رہنمائی کرتی ہو۔ کفر کی زندگی کیا ہے؟ بہری گونگی زندگی، عقل و حواس تاراج کر دینے والی جس راہ میں قدم اٹھائے، کوئی خوبی کی بات حاصل نہ کر سکے۔

قرآن ہر جگہ ایمان کو عقل و بصیرت اور ہدایت و رہنمائی کی راہ قرار دیتا ہے، اور کفر کو جہل و کوری اور تعطل و ہیچ کاری سے تعبیر کرتا ہے۔

---

(۲۳) آیت (۸۷) میں فرمایا۔ وہ کون ہے جس نے عقل و حواس کا چراغ تمہارے نہاں خانۂ دماغ میں روشن کر دیا ہے؟ جب تم پیدا ہوتے ہو، تو تمہاری تمام ذہنی قوتیں بظاہر معدوم ہوتی ہیں، لیکن پھر جوں جوں بڑھتے جاتے ہو، حواس کی قوتیں اُبھرنے لگتی ہیں، ادراک کا جوہر کھلنے لگتا ہے، اور عقل کا چراغ روشن ہو جاتا ہے۔

اس آیت اور اس کی ہم معنی آیات میں ربوبیت الٰہی کی معنوی پروردگاری سے استدلال کیا ہے، اور یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اللہ کی ربوبیت نے انسان کے لیے عقلی ہدایت کا سر و سامان کر دیا، اور یہی ہدایت ہے جس نے اسے تمام مخلوقات ارضی میں سب سے بلند مقام پر پہنچا دیا ہے۔ تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ کے مبحث "برہان ربوبیت" کا مطالعہ کرو۔

اس کے بعد کی آیات میں بھی ربوبیت الٰہی کی بخششوں پر توجہ دلائی ہے کہ کس طرح کرۂ ارضی کی ہر پیداوار میں تمہارے لیے افادہ و فیضان کی نوعیت پیدا ہو گئی ہے، اور کوئی شے نہیں جو تمہاری کسی نہ کسی کاربرآری کا ذریعہ نہ ہو۔ اس مقام کی تشریح تفسیر فاتحہ کے مبحث "افادہ و فیضان فطرت" میں ملیگی۔

---

(۲۴) آیت (۸۹) میں سلسلۂ بیان نے یہ رُخ اختیار کیا تھا کہ نزلنا علیک الکتاب۔ ہم نے تجھ پر ایک کتاب نازل کی جو دین کی تمام باتیں واضح کرتی ہے، اور مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت، اور بشارت ہے۔

لیکن وہ مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت، اور بشارت کیونکر ہوئی؟ اس طرح ہوئی کہ انہیں فلاح و سعادت کی راہ پر چلاتی ہے۔ بدعملیوں کی راہوں سے روکتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی سلسلۂ بیان مسلمانوں کی طرف متوجہ ہو گیا، اور فرمایا: ان اللہ یامر بالعدل والاحسان۔ اللہ کا تمہارے لیے فرمان یہ ہے کہ عدل کو اپنا شیوہ بناؤ، نیک کرداری میں سرگرم رہو، قرابت والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، فحش کاموں سے بچو۔ ہر طرح کی برائیوں

۱۰۷ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○

۱۰۸ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○

یہ اس وجہ سے کہ اُنہوں نے آخرت چھوڑ کر دنیا کی زندگی سے محبت کی۔ نیز اِس وجہ سے کہ اللہ (کا قانون ہے۔ وہ) منکروں پر (فلاح وسعادت کی) راہ نہیں کھولتا!

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے اُن کے دلوں پر، کانوں پر، اور آنکھوں پر مہر کردی (کیونکہ اُس کا مقررہ قانون ہے کہ جو عقل وحواس سے کام نہیں لیتے وہ اُس کی روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں) اور یہی ہیں کہ غفلت میں ڈوب گئے ہیں:

سے اجتناب کرو۔ ظلم وزیادتی سے کبھی آلودہ نہ ہو۔

جو لوگ مسلمان ہوچکے تھے، اُن کے لیے اب آزمائش عقائد میں نہ تھی، اعمال میں تھی، اس لیے اس آیت میں عملی زندگی کی تمام مہمات بیان کردیں۔ یہ گویا قرآن کے اس وسعت کی تفسیر ہے جو پچھلی آیت میں بیان کیا گیا تھا کہ تبیانا لکل شیئ۔ اسی لیے مفسرین نے اسے جوامع آیات میں شمار کیا ہے۔

عدل تمام محاسن اعمال کی اصل ہے جس انسان کے اندر یہ بات پیدا ہوگئی کہ جو بات کرنی چاہیے، انصاف کے ساتھ کرنی چاہیے، اس نے سب کچھ پالیا۔ احسان سے یہاں مقصود حسن عمل ہے۔ جو بات کرو حسن وخوبی کی کرو، نیکی اور بھلائی کی کرو یعنے بنیاد عمل بھلائی ہو۔ برائی نہ ہو۔ جس نے یہ بات پالی، اُس کے لیے اور کیا باقی رہا؟

پھر جو تم سے قریب کا رشتہ رکھتے ہیں، وہ ہمارے حسن سلوک کے زیادہ حقدار ہیں، اس لیے ایتاء ذی القربیٰ کی رعایت بھی ضروری ہوئی، اور اس حکم پر اوامر کا معاملہ پورا ہوگیا۔ پھر فحشاء، منکر، اور بغی سے روک کر نواہی کے سارے مقاصد پورے کردیے۔ فحش سے مقصود وہ برائیاں ہیں جو حد درجہ کی برائیاں تسلیم کرلی گئی ہیں۔ مثلاً زنا، کنجوسی، افترا پردازی۔ منکر میں ہر طرح اور ہر قسم و درجہ کی برائیاں آگئیں۔ بغی میں ہر طرح کی زیادتی آگئی۔ کسی گوشہ اور کسی شکل میں کی گئی ہو۔

جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو، جس سے ایسے اعمال ڈھلتے ہوں، جو ایسی زندگیاں بناتی ہو، اگر وہ ہدایت، رحمت، اور بشارت نہیں ہے، تو اور کس نام سے اُسے پکارا جاسکتا ہے؟

---

(۲۵) اس کے بعد خصوصیت کے ساتھ ایک خاص معاملہ پر زور دیا جو عموماً طرح طرح کی لغزشوں کا باعث ہوتا ہے، اور مسلمانوں کو بحیثیت ایک جماعت کے سب سے زیادہ اس میں سرگرم واستوار ہونے کی ضرورت تھی۔ یعنے ایفاء عہد پر۔ جب تم نے کسی فرد سے یا جماعت سے کوئی قول وقرار کرلیا۔ تو اب یہ قرآن کے نزدیک "عہد اللہ" ہوگیا۔ یعنے ایسا عہد جس کے لیے تم اللہ کے آگے ذمہ دار ہوگئے۔ اگر تم نے اسے پورا نہیں کیا، تو اللہ کے آگے جوابدہ ہوگے۔ چنانچہ فرمایا: واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم۔

عہد ومیثاق کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ نازک معاملہ جماعتوں کے معاہدوں کا ہے۔ اور اسی میں اُس کی اصلی آزمائش ہے۔ افراد بحیثیت فرد کے بہت کم عہد شکنی کرتے ہیں، اور کریں تو اُس کے نتائج شخصی دائرہ سے باہر نہیں جاتے، لیکن جماعتیں بحیثیت جماعت کے اکثر عہد شکن ہوتی ہیں، اور اُس کے نتائج سینکڑوں ہزاروں افراد کے حصے میں آتے ہیں۔ بسا اوقات ایک جماعت کے افراد کبھی گوارا نہیں کریںگے کہ اپنی انفرادی زندگی کے معاملات میں عہد شکنی کا عار گوارا کریں۔ لیکن اگر انہی لوگوں کو بحیثیت ایک جماعت، قوم، اور حکومت کے

۱۰۹ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا
۱۱۰ ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ع

لامحالہ، یہی لوگ ہیں کہ آخرت میں تباہ حال ہونگے!
اور پھر جن لوگوں کا یہ حال ہوا کہ (کفر و ایمان کی) آزمائشوں میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، اور پھر (راہ حق میں) جہاد بھی کیا اور (ہر طرح کی مصیبتوں میں) صابر رہے، تو بلاشبہ تمہارا پروردگار ان اعمال کے بعد ضرور بخشنے والا، ضرور رحمت فرمانے والا ہے!

بدعہدی کرنی پڑے، تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں تامل نہیں کرینگے، اور اسے جماعتی کام جوئی و فتح مندی کی ایک ہشیاری اور دانشمندی سمجھینگے۔ خصوصاً اگر بدعہدی کسی ایسے گروہ کے ساتھ کرنی پڑے جس سے دشمنی اور لڑائی ہو۔ آج، بیسویں صدی میں دنیا کی متمدن اقوام کا سیاسی اخلاق ہمارے سامنے ہے۔ اُن کے جو افراد چھوٹی سی چھوٹی بات میں بھی یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ وعدہ خلاف ثابت ہوں قومی اور سیاسی معاملات میں ہر طرح کی بدعہدیاں اور خلاف ورزیاں جائز سمجھتے ہیں، اور تاریخ کے اوراق کو آج تک اس کی مہلت نہیں ملی ہے کہ سیاسی معاہدوں کی شکست کی افسانہ سرائی سے فارغ ہوجائے!

ایک انگریز، ایک فرنچ، ایک جرمن کی انفرادی زندگی کی سیرت (کیرکٹر) دیکھو، وہ اپنے وعدوں میں سچا اور اپنے قول و قرار میں بے داغ ہوگا۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر توہین کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ اُس کے وعدہ میں شک کیا جائے۔ لیکن انہی افراد کا مجموعہ جب ایک جماعتی ذہنیت کی شکل اختیار کرلیتا ہے، اور قومی اور سیاسی معاہدوں کی پابندی اُس کی خودغرضانہ کام جوئیوں کی راہ میں حائل ہونے لگتی ہے، تو پھر کیا ہوتا ہے؟ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی یہ انفرادی سیرت جماعتی بدعہدی کی راہ روک سکتی ہے؟ نہیں، بلکہ سب سے بڑا مدبر انسان وہی سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ عہد شکنیوں میں بیباک ہو!

جس جماعت کے افراد ایک فرد واحد کے ساتھ بدعہدی کرنا گوارا نہیں کرسکتے، وہ لاکھوں کروڑوں افراد کے ساتھ بدعہدی کرنے میں کوئی بداخلاقی محسوس نہیں کرتے!

ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی تخم ریزی اُس وقت شروع ہوئی، جب کہ انگریزی قوم کی قومی سیرت اپنی بہترین سانچوں میں ڈھل رہی تھی، اور اُن کا اخلاقی پیمانہ روز بروز اونچا ہو رہا تھا۔ یعنی اٹھارہویں صدی کے اوائل میں۔ لیکن ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں، ہم صرف ہندوستان کی گزشتہ دو صدیوں کی تاریخ ہی میں دیکھ لے سکتے ہیں کہ اس بارے میں انگریزی قوم کے جماعتی اخلاق کا معیار کیا رہا ہے؟ ہر معاہدہ جو طاقتور فریق کے ساتھ کیا گیا اور وہ طاقتور رہا، معاہدہ تھا۔ ہر معاہدہ جو کمزور فریق کے ساتھ کیا گیا اور وہ کمزور ہی رہا، معاہدہ نہ تھا۔ امی چند، میر جعفر، میر قاسم، شاہ عالم، راجہ چیت سنگھ، نواب فیض اللہ، سعادت علی خاں، نظام علی خاں، برار، جے پور، میران سندھ کے لیے معاہدے کچھ مفید نہ ہوسکے لیکن حیدر علی، ہلکر، اور رنجیت سنگھ کے معاہدوں کی اخلاقی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا گیا۔ جماعتی معاہدے اگر پورے کیے جاتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ معاہدے ہیں، اور معاہدوں کا پورا کرنا ضروری ہے، بلکہ اس لیے کہ طاقتور فریق سے کیے گئے ہیں، اور اُن کی شکست مفید ہونے کی جگہ مضر ہوگی!

عہد جاہلیت میں عربوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ وفاء عہد کی اخلاقی قیمت سے بے خبر نہ تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے اور اپنے قبیلہ کے مفاخر میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ وفاء عہدی کو دیتے تھے، لیکن جہاں تک جماعتی معاہدوں کا تعلق ہے، وفاء عہد کا عقیدہ کوئی عملی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک قبیلہ ایک قبیلہ سے معاہد

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ

وہ (قیامت کا) آنے والا دن، جب ہر جان صرف اپنے ہی لیے سوال جواب کرتی ہوئی آئیگی (یعنے کسی کو کسی کی فکر نہ ہوگی) اور جس دن ہر جان کو اُس کے عمل کا پورا پورا نتیجہ مل جائیگا کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی!

اور (دیکھو) اللہ نے ایک مثال بیان کی۔ ایک بستی تھی جہاں ہر طرح کا امن چین تھا۔ ہر جگہ سے سامانِ رزق آتا رہتا اور ہر شخص فراغت سے

کرتا تھا۔ کل دیکھتا تھا کہ اُس کے مخالف زیادہ طاقتور ہوگئے ہیں، تو بے دریغ اُن سے جاملتا تھا، اور معاہد و حلیف پر حملہ کر دیتا تھا۔ اگر کسی دشمن فریق کو امن کا معاہدہ کرتے، اور پھر دیکھتے کہ اُس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ پیدا ہو گیا ہے، تو ایک لمحہ کے لیے بھی معاہدہ کا احترام انہیں حملہ کر دینے سے نہیں روک سکتا تھا اور بے خبر دشمن پر جا گرتے۔

لیکن قرآن راست بازی کی جو روح پیدا کرنی چاہتا تھا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ بداخلاقی گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے وفاء عہد اور احترام مواثیق کا جو معیار قائم کیا ہے، وہ اس درجہ بلند، قطعی، بے لچک، اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی گوشہ بھی اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے، فرد ہو یا جماعت، ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہو یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہو یا غیر قوم و مذہب، دوست ہو یا دشمن امن کی حالت ہو یا جنگ کی، لیکن کسی حال میں بھی عہد شکنی جائز نہیں۔ وہ ہر حال میں جرم ہے، معصیت ہے، اللہ کے ساتھ ایک بات کرکے اُسے توڑ دینا ہے، عذاب عظیم کا اپنے کو مستحق ثابت کرنا ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا وفاء عہد پر زور دیا ہے، اور جہاں کہیں مومنوں کے ایمانی خصائل کی تصویر کھینچی ہے، یہ وصف سب سے زیادہ اُبھرا ہوا نظر آتا ہے۔ والموفون بعهدهم اذا عاهدوا (۲: ۱۷۷) والذين هم لاماناتهم وعهدهم راعون (۲۳: ۸) اور احادیث میں ہر جگہ منافق کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے کہ اذا وعد اخلف (صحیحین) جب وعدہ کریگا، پورا نہیں کریگا۔

یہاں خصوصیت کے ساتھ جماعتی عہد و قرار کے احترام پر زور دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا تتخذون ايمانكم دخلا بينكم ان تكون امة هي اربى من امة۔ اگر تم نے ایک گروہ سے معاہدہ کیا ہے، اور کل کو اُس کا مخالف گروہ زیادہ طاقتور نظر آئے، تو محض اس لیے کہ طاقتور کا ساتھ دینا تمہارے لیے زیادہ مفید ہوگا، نہ کہ کمزور کا، بدعہدی پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔ جب تم نے ایک گروہ سے قول و قرار کرلیا تو ہر حال میں اس کا پورا کرنا لازمی ہوگیا۔ خواہ وہ کمزور ہوگیا ہو، خواہ طاقتور۔ اگر اس کے مخالف طاقتور ہوگئے ہیں، اور اُن کے خلاف جانے میں تمہارے لیے خطرات ہیں، تو تمہارا فرض ہے کہ خطرات برداشت کرو۔ کیونکہ تم عہد کر چکے ہو۔

پھر اس طرح کی بدعہدی کی مثال کیا ہے؟ فرمایا: كالتي نقضت غزلها من بعد قوة انكاثا۔ اس عورت کی سی ہے جس نے بڑی جانفشانی سے سوت کاتا، اور پھر خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کرکے برباد کر دیا یعنے جب ایک شخص یا ایک گروہ کوئی معاہدہ کرتا ہے، تو اُس کی پختگی کے لیے بڑی بڑی باتیں کرتا ہے، اور ہر طرح دوسرے فریق کو یقین دلاتا ہے پھر اگر ایک بات اتنی کوشش کے بعد پختہ کی گئی ہے، تو کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے کل پختہ کی تھی وہی آج اُسے اپنے ہاتھوں سے توڑ کر رکھ دے؟

اس کے بعد آیت (۹۴) میں فرمایا۔ اپنی قسموں کو لوگوں کے لیے ٹھوکر نہ بناؤ۔ کیونکہ اگر تم نے بدعہدی کی تو لوگوں

مَّكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ١١٢
وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ○ فَكُلُوْا مِمَّا ١١٣
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ اِنَّمَا حَرَّمَ ١١٤
عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا
عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ ١١٥
وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

کا یقین تم سے اُٹھ جائیگا۔ وہ کہینگے ایسے لوگوں کا دین کیا جو اپنی بات کے پکے نہیں۔ اس طرح تم نہ صرف بدعہدی کے مجرم ہوگے، بلکہ راہ حق سے لوگوں کو روکنے کا باعث ہوگے

کھاتا پیتا تھا لیکن پھر ایسا ہوا کہ اُنھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ تو اللہ نے بھی اُن کے کاموں کی پاداش میں اُنہیں نعمتوں سے محروم کردیا۔ (تنعم کی جگہ) فاقہ اور (اطمینان کی جگہ) خوف اُن پر چھا گیا! ١١٢

اور پھر خود اُنہی میں سے ایک رسول بھی اُن کے سامنے آیا (اور کامیابی و سعادت کی راہ کی دعوت دی) مگر اُنھوں نے اُسے جھٹلایا۔ پس عذاب میں گرفتار ہوگئے، اور وہ (خود اپنے اوپر) ظلم کرنے والے تھے! ١١٣

پس چاہیے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے، اُسے شوق سے کھاؤ۔ حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں۔ اور (ساتھ ہی) چاہیے کہ اللہ کی نعمت کا شکر بھی بجالاؤ، اگر فی الحقیقت تم صرف اُسی کے پجاری ہو۔ ١١٤

جو کچھ تم پر حرام کیا گیا ہے، وہ تو صرف یہ ہے کہ مُردار جانور، لہو، سور کا گوشت، اور وہ جانور جسے خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کے لیے پکارا جائے۔ پھر جو کوئی (حلال غذا نہ ملنے کی وجہ سے) ناچار ہوجائے، اور نہ تو (حکم الٰہی سے) سرتابی کرنے والا ہو۔ نہ (حد ضرورت سے) گزر جانے والا اور وہ جان بچانے کے لیے کچھ کھالے) تو اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے! ١١٥

اور (دیکھو) ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبانوں پر جو جھوٹی بات آجائے، بے دھڑک نکال دیا کرو(٢٦) اور اپنے جی سے ٹھہرا کر حکم لگا دو: یہ چیز حلال ہے۔ یہ چیز حرام ہے۔ اس طرح حکم لگانا اللہ پر افترا پردازی کرنا ہے۔ (اور یاد رکھو) جو لوگ اللہ پر افترا پردازیاں

(٢٦) سورۂ انعام میں گزر چکا ہے کہ مشرکین عرب نے اپنے اوہام سے طرح طرح کی چیزیں حرام ٹھہرا دی تھیں۔ یہودیوں نے بھی کھانے پینے میں طرح طرح کی رُکاوٹیں اختیار کرلی تھیں اور سمجھتے تھے، یہ شریعت کا حکم ہے۔

لَا يُفْلِحُونَ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝

کرتے ہیں، وہ کبھی فلاح پانے والے نہیں!

(یہ دنیا کے) بہت تھوڑے فائدے ہیں جو اُٹھائیں۔ (آخر کار) اُنہیں عذابِ دردناک پیش آنے والا ہے!

اور (اے پیغمبر!) یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں جن کی سرگزشت تجھے پہلے سُنا چکے ہیں۔ اور (یہ پابندیاں جو اُن پر لگائی گئیں، تو خود انہی کی گمراہیوں کا نتیجہ تھیں)، ہم نے اُن پر زیادتی نہیں کی (کیونکہ یہ ہمارا شیوہ نہیں) وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔

ہاں، جو لوگ نادانی سے بُرائیوں میں پڑ گئے، لیکن اس کے بعد تائب ہو گئے، اور توبہ کے بعد اپنی حالت بھی سنوار لی، تو تمہارا پروردگار، ہاں، بلاشبہ تمہارا پروردگار اس صورتِ حال کے بعد، ضرور بخشنے والا، رحمت فرمانے والا ہے!

بلاشبہ ابراہیم (اپنی شخصیت میں) ایک پوری اُمت تھا۔ اللہ کے آگے جھکا ہوا، تمام (بناوٹی) راہوں سے ہٹا ہوا، اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر بجا لانے والا تھا۔ اللہ نے اُسے برگزیدگی کے لیے چن لیا، اور (سچائی کی) سیدھے راستے پر لگا دیا!

آیت (۱۱۶) میں فرمایا: اپنی زبانوں کو کذب سرائی کے لیے بے لگام نہ چھوڑ دو کہ جس چیز کو چاہا اپنی رائے اور قیاس سے حرام ٹھہرا دیا، جس کو چاہا حلال کہہ دیا۔ حلال و حرام ٹھہرانے کا حق تو صرف وحی الٰہی کو ہے، اور تمہارے پاس اپنے اوہام و آراء کے سوا کوئی وحی کی روشنی نہیں جو قرآن کے خلاف پیش کر سکو۔

یہ آیت اُن لوگوں کے خلاف حجت قاطع ہے جو محض اپنے گڑھے ہوئے قیاسوں کی بنا پر جس چیز کو چاہتے ہیں حرام ٹھہرا دیتے ہیں، اگرچہ کوئی نص قطعی موجود نہ ہو۔ اصل قرآنی اس بارے میں یہ ہے (جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت (۳۲) میں تصریح گزر چکی ہے) کہ خدا کی تمام پیدا کی ہوئی چیزیں انسان کے برتنے کے لیے ہیں، اِلّا وہ جو مضر ہیں، اور وحی الٰہی نے اُن سے روک دیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر چیز مباح ہے جب تک کہ شریعت اُسے حرام نہ ٹھہرا دے۔ اور شریعت کے معنی قرآن و سنت کے نصوص قطعیہ ہیں، نہ کہ کسی فرد یا گروہ کی مجرد رائے اور قیاس۔

(۲۷) مشرکین عرب اپنے اوہام و خرافات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ آیت (۱۲۰) میں اس نسبت کی تغلیط کی ہے اور واضح کیا ہے کہ ان کی راہ وہی راہ تھی جس کی طرف پیغمبر اسلام دعوت دے رہے ہیں۔

ایک اور شبہ جو حلت و حرمت کے بارے میں کیا گیا تھا، یہ تھا کہ سبت کے دن کا شکار یہودیوں پر حرام کر دیا گیا تھا۔

وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

۱۲۲ ۱۲۳ ۱۲۴ ۱۲۵

پس کیوں قرآن اس سے نہیں روکتا؟ فرمایا۔ یہودیوں کو جو اس سے روکا گیا تھا، تو اس لیے نہیں کہ سبت کے دن حلال جانور شکار کیا جائے تو وہ حرام ہو جاتا ہے، بلکہ یہ اُن کے اختلاف اور عدم اطاعت کی ایک سزا تھی۔ یعنے جب اُنہوں نے احکامِ سبت کی تعمیل نہ کی اور حیلے بہانے نکال کر شکار کرنے لگے تو سداً للذریعہ سبت کے شکار کا گوشت ممنوع قرار دیا گیا۔

اسے دنیا میں بھی بہتری دی، اور بلاشبہ آخرت میں بھی اس کی جگہ صالح انسانوں میں ہوگی! ۱۲۲

اور پھر (اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ (اسی) ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو۔ ہر طرف سے ہٹا ہوا (صرف دینِ حق ہی پر کاربند رہنے والا) اور جو مشرکوں میں سے نہ تھا۔ ۱۲۳

"سبت" منانے کا حکم تو صرف اُنہی لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس بارے میں اختلاف کرنے لگ گئے تھے۔ اور بلاشبہ تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کر دیگا کہ جن جن باتوں میں اختلافات کرتے رہے، اُن کی اصل حقیقت کیا تھی۔ ۱۲۴

(۲۸) آیت (۱۲۵) میں واضح کیا ہے کہ دعوت الی الحق کا طریقہ کیا ہے؟ فرمایا سرتاسر حکمت اور موعظہ حسنہ۔ "حکمت" یعنے دانائی کی باتیں۔ "موعظہ حسنہ" یعنے پند و نصیحت کی باتیں جو حسن و خوبی کے ساتھ کی جائیں۔ اس کے بعد فرمایا: وجادلھم بالتی ھی احسن۔ اور اگر بحث و نزاع کرنی پڑے، تو کر سکتے ہو، لیکن ایسی ہی بحث و نزاع جو نہایت اچھے طریقہ پر ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوتِ حق کا طریقہ حکمت اور موعظہ حسنہ کا طریقہ ہے۔ اور بحث و نزاع کی اجازت صرف اس صورت میں ہے، کہ احسن طریقہ پر ہو۔ پس ہر بحث و نزاع جو احسن طریقہ پر نہ ہو، دعوت کا طریقہ نہیں ہوگی۔

(اے پیغمبر!) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ اس طرح، کہ حکمت کی باتیں بیان کرو، اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو، اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حُسن و خوبی کا طریقہ ہو۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹک گیا ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہے۔ ۱۲۵

احسن طریقہ سے مقصود کیا ہے؟ یہ کہ مقصود طلبِ حق ہو، اپنی بات کی پچ نہ ہو۔ مخالف کے اندر یقین پیدا کرنا ہو، اُسے باتوں سے ہرانا نہ ہو۔ اگر وہ چپ ہو گیا اور دل کا کانٹا نہ نکلا، تو بحث سے کیا فائدہ ہوا! ایسا اسلوب، ایسا طریقِ خطاب، ایسا لب و لہجہ، اس طرح کے الفاظ اختیار نہ کیے جائیں جو مخالف کے دل کو دُکھ پہنچانے والے ہوں، یا اُسے سننے والوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا کرنے والے ہوں۔ کیونکہ اگر بحث سے مقصود دعوت

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝ ۱۲۶

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ ۱۲۷

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝ ع ۱۲۸

اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو، تو چاہیے کہ ویسی ہی اور اُتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی ہے، اور اگر تم نے صبر کیا (یعنے جھیل گئے، اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لیے صبر ہی بہتر ہے!

(اے پیغمبر!) صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے، اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا، نہ ہی اُن کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ اُنہی کا ساتھی ہے جو متقی ہیں اور نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں!

حق ہے، تو مخاطب کے دل کو نرمی و محبت سے حق کی طرف متوجہ کرنا چاہیے، نہ یہ کہ صدمہ پہنچانا، ضد میں لانا اور دل نفرت سے بھر دینا۔ بدقسمتی سے دنیا میں طلب حق کی راہ بھی محض جدل و نزاع کی راہ بن گئی ہے۔ ہم اپنے دنیوی اغراض و مقاصد کے لیے لڑنے جھگڑنے کے عادی ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا جھگڑا پیش آجاتا ہے تو صرف اپنی جیت ہی کے لیے لڑتے ہیں۔ اس خیال سے نہیں لڑتے کہ حق و انصاف کیا ہے؟ اکثر اوقات خود ہمارا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ ہم برسرِ حق نہیں ہیں اور انصاف مخالف کے ساتھ ہے، لیکن چونکہ اپنا مطلب کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لیے کبھی اعترافِ حقیقت کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حق اور انصاف ہم سے جس قدر الگ ہوتا جاتا ہے، بحث و نزاع کی سرگرمی اُتنی ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اگر ہمارا مقدمہ سب سے زیادہ کمزور ہوگا، تو ہم خیال کرینگے کہ ہماری بحث و نزاع کی سرگرمی سب سے زیادہ ہونی چاہیے!

چاہیے تو یہ تھا کہ کم از کم دین کے معاملہ میں ہم ایسا نہ کرتے۔ دنیوی معاملات میں کچھ نہ کچھ لینا دینا ہوتا ہے، اس لیے غرض پرست آدمی اپنی بات کی پچ کرتا ہی رہیگا۔ لیکن دین کی راہ لین دین کی راہ نہیں ہے، سچ کو سچ مان لینے کی راہ ہے۔ اور جونہی ہم نے کسی بات کو سچ نہ سمجھ کر بھی سچ ثابت کرنا چاہا، دین کی راہ نہ رہی، عین اُس کی ضد ہوگئی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم نے سچائی کے کام کو بھی جھوٹ کا کاروبار بنا دیا ہے۔ ہم دین کے بارے میں بھی ٹھیک اسی طرح جھگڑتے ہیں جس طرح دنیا کے معاملات میں۔ ہم جب کبھی کسی سے بحث کرینگے، تو ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ خیال نہیں گزریگا کہ اس راہ میں اصل مقصود طلبِ حق ہے، اور جونہی حق سامنے آجائے ہمارا فرض ہے کہ اعتراف کرلیں، بلکہ بحث کرینگے ہی اس لیے کہ اپنی اور اپنے فریق کی بات منوانی ہے، اور خواہ کچھ ہو، فریق مخالف کو ہرانا ہے۔ اگر دیکھینگے کہ حق اور معقولیت ہمارے ساتھ نہیں ہے، تو غیر متعلق باتوں پر زور دینے لگینگے، بدزبانی پر اُتر آئینگے، مارنے مرنے کے لیے تیار ہوجائینگے، اور پھر کہینگے، ہم جیت گئے!

قرآن کہتا ہے۔ یہ "جدل" کا طریقہ ہے۔ "دعوت" کا طریقہ نہیں ہے، اور دین کی راہ دعوت کی راہ ہے۔ جدل کی نہیں ہے۔ اگر جدل کرنا ہی پڑے، تو صرف اسی حالت میں کیا جاسکتا ہے کہ احسن طریقہ پر ہو یعنے راست بازی، دیانت، شیریں زبانی، اور شائستگی کے ساتھ کیا جائے۔ آگے چل کر سورۂ عنکبوت میں بھی ہمیں یہی حکم ملیگا: ولا تجادلوا اھل الکتاب، الا، بالتی ھی احسن (۴۶)

اس کے بعد فرمایا: وان عاقبتم، فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ، ولئن صبرتم، لھو خیر للصابرین!

اگر مخالف ناحق کوشش میں سرگرم ہے اور سختی و زبان درازی پر اُتر آیا ہے، تو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم بھی آپے سے باہر ہو جاؤ۔ ایسا کرنا راست بازی کا طریقہ نہ ہوگا۔ ایک بُرائی کے جواب میں دوسری بُرائی کا ارتکاب ہوگا، بلکہ ممکن ہے کہ پہلی سے بھی زیادہ سخت بُرائی ہو جائے۔ بہتری تو اس میں ہے کہ سختی کا جواب سختی سے نہ دو، جھیل جاؤ۔ پروا نہ کرو، بخش دو۔ اسی میں تمہاری اصلی جیت ہے۔ لیکن اگر طبیعت پر قابو نہیں پاتے اور سختی کا جواب سختی سے دینا ہی چاہتے ہو، تو پھر انصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ جتنی اور جیسی سختی تمہارے ساتھ کی گئی ہے، ویسی ہی اور اُتنی ہی تم بھی کر لو۔ اس سے آگے نہ بڑھو۔ ذرا بھی بڑھے، تو یہ ظلم ہوگا، اور ظلم راستی کے ساتھ جمع نہیں سکتا۔

غور کرو۔ قرآن کا محض ایک لفظ یا محض ایک ترکیب کس طرح مقاصد و مسائل کے فیصلے کر دیا کرتی ہے؟ پہلے بصیغۂ امر دعوت کا حکم دیا گیا تھا: ادع الیٰ سبیل ربک۔ پس چاہیے تھا کہ یہاں بھی بدلہ لینے کا حکم دیا جاتا اور کہا جاتا۔ اگر تمہارے ساتھ سختی کی گئی ہے، تو تم بھی ویسی ہی سختی کرو۔ مگر نہیں ایسا نہیں فرمایا، بلکہ کہا: وان عاقبتم۔ اگر ایسا ہو کہ تم مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرنا چاہو، تو چاہیے کہ حد سے نہ بڑھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سختی کے جواب میں سختی کا حکم نہیں ہے، محض اجازت ہے۔ یعنی اگر ایک آدمی وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا جو اس بارے میں بہتری اور خوبی کا اصلی مقام ہے، یعنی جھیل جانا اور بخش دینا، تو پھر اسے بدلے کی اجازت دیدی گئی ہے، لیکن اجازت کو بمثل ما عوقبتم سے مقید کر دیا ہے، تاکہ زیادتی کا دروازہ بالکل بند ہو جائے۔ اب دو ہی راہیں کھلی رہ گئیں: عزیمت تو اس میں ہوئی کہ جھیل جاؤ اور بخش دو۔ رخصت اس کی ہوئی کہ جتنی سختی کی گئی ہے، اتنی ہی تم بھی کر لو۔ اس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک تقریر بہت مقبول ہوئی ہے، جو انہوں نے قسطاس المستقیم میں لکھی ہے، اور بعد کے مفسرین نے عموماً اسے اختیار کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، استعداد و فہم کے لحاظ سے ہر انسان کی طبیعت یکساں نہیں، اور ہر ذہنی حالت ایک خاص طرح کا اسلوب خطاب چاہتی ہے۔ ارباب دانش کے لیے استدلال کی ضرورت ہوتی ہے، عوام کے لیے موعظت کی، اور اصحاب خصومت کے لیے جدل کی۔ پس اس آیت میں قرآن نے تینوں جماعتوں کے لیے تینوں طریقے بتلا دیے ہیں۔ ارباب دانش کو حکمت کے ساتھ مخاطب کرو۔ عوام کو موعظت کے ساتھ۔ اور ارباب خصومت کے لیے جدل کی بھی اجازت ہے مگر بطریق احسن۔

---

(۲۹) آخر میں سورت ختم کرتے ہوئے پیغمبر اسلام کو مخاطب کیا ہے کہ:

(ا) صبر کر، اور تیرا صبر کرنا اللہ ہی کی مدد و توفیق سے ہے۔

(ب) منکروں کی محرومی پر غم نہ کھا۔ جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ کبھی نہیں مانیں گے۔

(ج) دعوتِ حق کی مخالفت میں وہ جو کچھ مخفی تدبیریں اور سازشیں کر رہے ہیں، ان پر بھی دلتنگ نہ ہو۔

(د) یہ قانونِ الٰہی یاد رکھ کہ اللہ کی نصرت انہی کا ساتھ دیتی ہے، جو برائیوں سے بچتے ہیں اور جن کی زندگی نیک کرداروں کی زندگی ہوتی ہے!

سُوْرَۃُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۱۷

مکی - ۱۱۱ - آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ○ ۱ وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ○ ۲ ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ○ ۳ وَ قَضَیْنَاۤ اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَ ۴

پاکی ہے اُس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے کو (یعنے پیغمبر اسلام کو) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ اُس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے، سیر کرائی، اور اس لیے سیر کرائی، کہ اپنی نشانیاں اُسے دکھا دیں۔ بلاشبہ وہی ذات ہے جو سُننے والی، دیکھنے والی ہے!

اور (اسی طرح) ہم نے موسیٰ کو کتاب (شریعت) دی اور اُسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کا ذریعہ ٹھہرایا (اور حکم دیا) کہ (دیکھو!) میرے سوا اور کسی کو اپنا کارساز نہ ٹھہراؤ!

تم اُن لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا۔ اور وہ ایک شکرگزار بندہ تھا!

اور (دیکھو) ہم نے کتاب میں (یعنے تورات میں) بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دیدی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤگے اور

(۱) ہجرت مدینہ سے تقریباً ایک سال پہلے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اسریٰ کا معاملہ پیش آیا جو عام طور پر معراج کے نام سے مشہور ہے۔ اس سورت کی ابتدا اسی واقعہ کے ذکر سے کی گئی ہے، اور واضح کیا ہے کہ اس معاملہ سے مقصود کیا تھا لنریه من اٰیتنا - تاکہ اللہ کی نشانیاں اُن کے مشاہدہ میں آجائیں۔ یعنے دلائل حقیقت کا عینی مشاہدہ کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ معاملہ وحی کی تکمیل تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا: واٰتینا موسیٰ الکتاب۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کا معاملہ وحی بھی کوہ طور کے اعتکاف میں مکمل ہوا تھا کہ ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا وکلمه ربه (۷: ۱۴۳) اور انہیں کتاب شریعت دی گئی تھی۔

"انه هو السمیع البصیر" وہی ہے جو سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ پس جسے چاہے اس سے زیادہ سنادے، جتنا سب سن رہے ہیں، اور اس سے زیادہ دکھلادے، جتنا سب دیکھ رہے ہیں!

یہاں مسجد حرام سے مقصود کعبہ ہے، اور مسجد اقصیٰ سے بیت المقدس کا ہیکل۔ اسے اقصیٰ اس لیے فرمایا کہ عرب کے لیے قریب کی عبادت گاہ خانۂ کعبہ تھی، اور دور کی عبادت گاہ ہیکل۔

(۲) آیت (۴) میں کتاب سے مقصود انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے ہیں۔ چنانچہ یسعیاہ، یرمیاہ، اور حزقیل کی کتابوں میں بنی اسرائیل کے دو بڑے فسادوں اور دو بڑی بربادیوں

لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ○ ۴ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ○ ۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنٰكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ○ ۶ إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ○ ۷ عَسٰى رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِينَ حَصِيرًا ○ ۸ إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ

کی خبر دی گئی تھی۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ بنوکدزر (بخت نصر) کے حملے سے ہوئی، دوسری، رومیوں کے حملہ سے جوٹیٹس کے زیر قیادت ہوئی تھی۔

بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔ پھر جب اُن دو وقتوں میں سے پہلا وقت آگیا، تو (اے بنی اسرائیل) ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے بھیج دیے جو بڑے ہی خوفناک تھے۔ پس وہ تمہاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے، اور (اللہ کا وعدہ تو اسی لیے تھا کہ پورا ہو کر رہے! ۵

پھر (دیکھو) ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے موافق کر دی، اور مال و دولت اور اولاد کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور تمہیں (پھر) ایسا بنا دیا کہ بڑے جتھے والے ہو گئے۔ ۶

اگر تم نے بھلائی کے کام کیے، تو اپنے ہی لیے کیے، اور اگر بُرائیاں کیں، تو بھی اپنے ہی لیے کیں۔

پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا (تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیج دیا) تاکہ تمہارے چہروں پر رسوائی پھیر دیں، اور اُسی طرح (ہیکل کی) مسجد میں داخل ہو جائیں جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور گھسے تھے، اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں۔ ۷

کچھ عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی باز آجاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی و فساد کی طرف لوٹے، تو (اللہ فرماتا ہے) ہماری طرف سے بھی پاداشِ عمل لوٹ آئیگی، اور (یاد رکھو) ہم نے منکرینِ حق کے لیے جہنم کا قید خانہ طیار کر رکھا ہے! ۸

بلاشبہ یہ قرآن اُس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے

(۳) بابل کے حملے نے صرف یہودیا کی آبادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا، بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی لیکن ایک صدی کے بعد گردش زمانہ نے پھر پلٹا کھایا، اور کارساز قدرت نے وقت کی سب سے بڑی فاتح شہنشاہیت کو ان کی اعانت و دستگیری کے لیے کھڑا کر دیا یعنے شہنشاہِ فارس کو۔ اب یہودیا کی تمام اُجڑی بستیاں پھر آباد ہو گئیں، اور یہودی جمعیت کا جسم مردہ پھر زندہ ہو گیا۔ آیت (۶) میں اسی عہد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرمایا اگر تم نے اچھے کام کیے تھے تو اپنے ہی لیے کیے تھے۔ یعنے اُس کے نتائج تمہارے ہی حصہ میں آئے، اور بدعملیاں کی تھیں تو وہ بھی اپنے ہی لیے کی تھیں۔ اس کی پاداش بھی تمہارے ہی حصہ میں آئی۔ چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اس دوسری مہلت کی بھی تم نے قدر نہ کی، اور اپنی توبہ و انابت کے وہ تمام عہد بھلا دیے

يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصّٰلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ○ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ○ وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ○ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ

جو بابل کی اسیری کے زمانہ میں کیے تھے، تو پھر دوسری ہلاکت کا وقت نمودار ہو گیا، یعنے رومی حملہ کا، یہ بنی اسرائیل کی آخری ہلاکت تھی۔ اس کے بعد پھر نہ سنبھل سکے۔

(۴) آیت (۸) نے دو لفظوں کے اندر وہ سب کچھ کہہ دیا جو جزائے عمل کے بارے میں کہا جا سکتا ہے، اور اس سے قرآن کی معجزانہ بلاغت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: وان عدتم، عدنا۔ اگر تم پھر انہی شرارتوں کی طرف لوٹے، تو ہم بھی لوٹینگے۔ یعنے اگر تم بدعملیوں کی طرف لوٹو گے تو اللہ کا قانون مجازات بھی پاداش و عقوبت کی طرف لوٹیگا۔ یونہی تم نے برائی کا رخ کیا، نتائج عمل کا قانون بھی پاداش و عقوبت میں سرگرم ہو گیا۔ "عمل" اور "نتیجہ" دو ایسی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جو کسی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ "نتیجہ" عمل کا سایہ ہے۔ جہاں عمل آیا، اس کا سایہ بھی ساتھ آ گیا۔ تم نے اچھے عمل کی طرف رخ کیا، اور اچھے نتائج بھی تمہاری طرف تکنے لگے۔ تم نے برے عمل کی طرف قدم اٹھایا، برے نتائج کے بھی قدم اٹھ گئے۔ اس راہ میں جتنے بڑھتے جاؤ، اور جس قدر بھی غور کرو، حقیقت ہر جگہ یہی نظر آئیگی کہ ان عدتم، عدنا! آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو ہلاکتیں ہو چکیں۔ اب تیسری مہلت تمہیں ملی ہے۔ یعنے دعوت حق کے ظہور نے رحمت الٰہی کی بخشائشوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اگر انکار و سرکشی سے باز آ جاؤ تو تمہارے لیے سعادت و کامرانی ہے۔ باز نہ آؤگے، تو پھر جس طرح دو مرتبہ نتائج عمل کا قانون اپنی عقوبتیں دکھلا چکا ہے، تیسری مرتبہ بھی دکھلائیگا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہودیوں نے جس طرح اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور نے انہیں دی تھی، اسی طرح دعوت اسلام سے بھی

جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے، اور ایمان والوں کو جو نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں، بشارت دیتا ہے کہ انہیں بہت بڑا اجر ملنے والا ہے!

اور (نیز اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ) جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے، ان کے لیے ہم نے عذاب دردناک طیار کر رکھا ہے!

اور (دیکھو) جس طرح انسان اپنے لیے بھلائی کی دعائیں مانگتا ہے، اسی طرح (بسا اوقات) برائی بھی مانگنے لگتا ہے (اگرچہ نہیں جانتا کہ یہ اس کے لیے برائی ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی جلد باز ہے!

اور (دیکھو) ہم نے رات اور دن کو ایسا بنایا کہ (ہماری قدرت و حکمت کی) دو نشانیاں ہو گئیں۔ سو رات کی نشانی دھیمی کر دی (کہ راحت و سکون کا وقت بن جائے) اور دن کی نشانی روشن کر دی کہ (اس کے اجالے میں) اپنے پروردگار کا فضل ڈھونڈو (یعنے معیشت کا سر و سامان مہیا کرو) نیز (رات دن کے اختلاف سے) برسوں کی گنتی اور (برسوں کی گنتی سے ہر طرح کا) حساب بھی معلوم کر لو۔ ہم نے (قرآن میں) ہر چیز کا بیان

۱۲ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
۱۳-۱۴ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ مَنِ اهْتَدٰى
فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا
۱۵ كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا
۱۶ فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ
۱۷ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا
مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا

بھی فائدہ نہ اُٹھایا، اور محرومی و نامرادی کی مہر ہمیشہ کے لیے اُن کی قسمت پر لگ گئی!

کھول کھول کر، الگ الگ، واضح کر دیا ہے! ۱۲

اور ہم نے ہر انسان کی شامت خود اُس کی گردن سے باندھ دی ہے (کہیں باہر سے اُس پر آکر نہیں گرتی) قیامت کے دن ہم اُس کے لیے (نامۂ اعمال کی) ایک کتاب نکال کر پیش کر دینگے۔ وہ اُسے اپنے سامنے کھُلا دیکھ لیگا۔ (ہم کہینگے) "اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے۔ آج کے دن خود تیرا وجود ہی تیرے احتساب کے لیے بس کرتا ہے!" ۱۳-۱۴

جو سیدھے رستے چلا، تو اپنے ہی لیے چلا، اور جو بھٹک گیا تو بھٹکنے کا خمیازہ بھی وہی اُٹھائیگا، کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا (ہر جان کو خود اپنے ہی اعمال کا بوجھ اُٹھانا ہے) اور ہم کبھی ایسا نہیں کرتے کہ (کسی قوم کو) عذاب دیں، مگر اُسی وقت جبکہ اُس میں ایک رسول پیدا کر دیتے ہیں (اور پھر بھی لوگ سرکشی و فساد سے باز نہیں آتے) ۱۵

اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (یعنے وحی کے ذریعہ احکامِ حق پہنچا دیتے ہیں) پھر وہ بجائے اس کے کہ اس کی تعمیل کریں، نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں، پس اُن پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے، اور (پاداشِ عمل میں) اُنہیں برباد و ہلاک کر ڈالتے ہیں! ۱۶

اور (دیکھو) نوح کے بعد قوموں کے کتنے ہی دور گزر چکے ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا، اور (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی خبرداری اور نگرانی اُس کے بندوں کے (گناہوں کے) لیے بس کرتی ہے! ۱۷

جو کوئی فوری فائدہ (اسی دنیا میں) چاہتا ہے، تو جس کسی کو ہم دینا چاہیں، اور جتنا دینا چاہیں، اسی دنیا میں دے دیتے ہیں۔ پھر آخرکار اس کے لیے جہنم بنا دی ہے۔ اُس میں داخل ہوگا۔ بدحال،

۱۸ مَدْحُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم
۱۹-۲۰ مَّشْكُورًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا
۲۱ انظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ۝ لَّا
۲۲ تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخْذُولًا ۝ ع وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا
إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ

۱۸ (۵) آیت (۸) میں فرمایا تھا۔ عجب نہیں کہ پروردگار تم پر رحم فرمائے، اگر سرکشی و فساد سے باز آجاؤ، اور دعوتِ حق پر لبیک کہو پس آیت (۹) میں اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا: ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم۔ قرآن ہدایت کی ایسی راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے اور ان لوگوں کے لیے جو اس راہ پر چلیں ہر طرح کی کامیابیوں کی بشارت ہے:

۱۹ قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیے ہیں اُن سب میں جامع ترین وصف یہی ہے۔ زندگی اور سعادت کے ہر گوشہ میں اُس کی راہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لیے ہے۔ کسی طرح کی کجی کسی طرح کا پیچ و خم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اُس کی رہنمائی میں نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ صراطِ مستقیم اور دین القیم سے تعبیر کی گئی ہے۔

۲۰ (۶) آیت (۱۱) میں انسان کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ خیر و شر میں امتیاز نہیں کرتا۔ اور بسا اوقات شر کا اس طرح طالب ہو جاتا ہے جس طرح اُسے خیر کا خواستگار ہونا چاہیے۔

یہ حالت اُسے کیوں پیش آتی ہے؟ اس لیے کہ اس کی طبیعت میں جلد بازی ہے۔ یعنے ایسی خواہشیں ہیں جو فوراً پورا ہونا چاہتی ہیں، اور جب چھا جاتی ہیں تو ایک لمحہ کے لیے بھی صبر و انتظار نہیں کر سکتیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اچھائی کی طلبگاری کرتے ہوئے بُرائیوں کا طلبگار ہو جاتا ہے، اور نہیں جانتا کہ اسکی طلبگاری اُسے بُرائیوں کی طرف لے جا رہی ہے۔

۲۲ پس معلوم ہوا کہ اُسے ایک ایسی رہنمائی کی ضرورت ہے

ٹھکرایا ہوا!

لیکن جو کوئی آخرت کا طالب ہوا اور اس کے لیے جیسی کچھ کوشش کرنی چاہیے، ویسی کوشش کی، نیز ایمان بھی رکھتا ہے، تو (اُس کے لیے دائمی کامیابیاں ہیں اور) ایسے ہی لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول ہوگی!

ہم ہر فریق کو اپنی پروردگاری کی بخشائشوں سے (دنیا میں) مدد دیتے ہیں۔ اُن کو بھی (کہ صرف دنیا ہی کے پیچھے پڑ گئے) اور اُن کو بھی (کہ آخرت کے طالب ہوئے اور راہِ حق پر چلے) اور (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی بخشش عام کسی پر بند نہیں!

دیکھو! ہم نے کس طرح (یہاں) بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر برتری دیدی ہے (کہ کوئی کسی حال میں نظر آتا ہے، کوئی کسی میں) اور حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے درجے سب سے بڑھ کر ہیں، اور سب سے برتر!

اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ۔ ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے!

اور تمہارے پروردگار نے یہ بات ٹھہرا دی کہ

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا
قَوْلًا كَرِيمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا ٢٣
رَبَّيَانِي صَغِيرًا ○ رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِن تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ ٢٤
غَفُورًا ○ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ○ إِنَّ ٢٥-٢٦
الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ○ وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ٢٧

جو خیر و شر کا امتیاز سکھلائے، اور خواہشوں کی ٹھوکروں سے اس کی حفاظت کرے۔ یہی رہنمائی ہدایتِ وحی کی رہنمائی ہوئی، اور اسی لیے انسان کسی ایسی رہنمائی کا بالطبع محتاج ہوا۔

(۷) اس کے بعد آیت (۱۲) میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح ربوبیتِ الٰہی نے تمہاری ہدایت کا فطری سامان کر دیا ہے، اور کس طرح کارخانۂ ہستی کا ہر معاملہ تمہاری کار برآریوں کا ذریعہ ہے۔ اور جب ربوبیتِ الٰہی کی یہ کارفرمائیاں شب و روز دیکھ رہے ہو، تو اسے تمہیں کیوں انکار ہو اگر وہ وحی و نبوت کے قیام کے ذریعہ تمہاری ہدایت کا مزید سامان کردے؟

اس کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو، اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہاری زندگی میں بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جائیں (اور ان کی خدمت کا بوجھ تم پر آپڑے) تو ان کی کسی بات پر اف نہ کرو (یعنی کوئی بات کتنی ہی ناگوار گزرے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لاؤ) اور نہ (تیزی میں آکر) جھڑکنے لگو، ان سے بات چیت ادب و عزت کے ساتھ کرو؛ ٢٣

ان کے آگے محبت اور مہربانی کے ساتھ عاجزی کا سر جھکائے رکھو۔ ان کے حق میں (ہمیشہ) دعا کرو کہ پروردگار! جس طرح انہوں نے مجھے صغر سنی میں پالا پوسا اور بڑا کیا، تو اسی طرح تو بھی ان پر رحم کیجیو! ٢٤

تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے جی میں ہوتا ہے۔ اگر تم نیک کردار ہوئے (اور بغیر قصد کے تم سے کوئی فروگزاشت ہوگئی) تو (اس کی وجہ سے تمہیں مضطرب نہیں ہونا چاہیے) وہ بلاشبہ توبہ کرنے والوں کے لیے بڑا ہی بخشنے والا ہے! ٢٥

اور (دیکھو) جو لوگ تمہارے قرابت دار ہیں، جو مسکین ہیں، جو (بے یار و مددگار) مسافر ہیں، ان سب کا تم پر حق ہے۔ ان کا حق ادا کرتے رہو، اور مال و دولت کو بے محل خرچ نہ کرو جیسا کہ بے محل خرچ کرنا ہوتا ہے۔ ٢٦

بے محل خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی بند ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا ہے۔ ٢٧

اور اگر ایسا ہو کہ تم اپنے پروردگار کی مہربانی کی راہ دیکھ رہے ہو (یعنی تنگ دستی کی حالت میں ہو)

ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى ۲۸
عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ ۲۹
يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ ۳۰ ع ۳
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ ۳۱
فَاحِشَةً ؕ وَسَاءَ سَبِيْلًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ ۳۲
مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا ۳۳

اور رزق کی جستجو کر رہے ہو) اور اس لیے تمہیں (ان حقداروں سے) منہ پھیرنا پڑے، تو چاہیے کہ نرمی سے انہیں سمجھا دو (سختی سے پیش نہ آؤ) ۲۸

اور (دیکھو) نہ تو اپنا ہاتھ اتنا سکیڑ لو کہ گردن میں بندھ جائے، اور نہ بالکل ہی پھیلا دو۔ دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر طرف سے ملامت پڑے اور درماندہ ہو کر رہ جاؤ! ۲۹

تمہارا پروردگار جس کسی کی روزی چاہتا ہے، فراخ کر دیتا ہے، اور جس کی چاہتا ہے، نپی تُلی۔ وہ اپنے بندوں (کی حالت) کی خبر رکھنے والا اور (سب کچھ) دیکھنے والا ہے! ۳۰

اور دیکھو، افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو ہلاک نہ کرو۔ ہم ہی ہیں کہ انہیں بھی اور تمہیں بھی روزی دیتے ہیں۔ انہیں ہلاک کرنا بڑے ہی گناہ کی بات ہے! ۳۱

اور زناکاری کے قریب بھی نہ جاؤ، یقین کرو وہ بڑی ہی بے حیائی کی بات اور بڑی برائی کا چلن ہے! ۳۲

اور کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو، جسے قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ جو کوئی ظلم سے مارا جائے، تو ہم نے اس کے وارث کو (قصاص کے مطالبہ کا) اختیار دے دیا ہے۔ پس چاہیے کہ خوں ریزی میں زیادتی نہ کرے (یعنی حق سے زیادہ بدلہ لینے کا قصد نہ کرے) وہ (حد کے اندر رہنے میں) فتح مند ہے۔ ۳۳

اور یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر ایسے

(۸) آیت (۱۲) سے آیت (۱۷) تک یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج سے بندھا ہوا ہے اور جو برائی بھی اسے پیش آتی ہے، خود اسی کے اعمال کی پیداوار ہے۔ یہ مقام تشریح طلب ہے۔ اس کی تشریح سورت کے آخری نوٹ میں ملے گی۔

(۹) آیت (۱۸) میں فرمایا کہ نتائج عمل کے لحاظ سے انسان کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک وہ ہے جس کی ساری طلب دنیا کی چند روزہ زندگی ہی کے پے ہے۔ دوسرا وہ ہے جو یقین رکھتا ہے کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے، اور اس لیے اس دوسری زندگی کی سعادت کا بھی طالب ہے۔ جہاں تک دنیا کی زندگی کا تعلق ہے، ہمارا قانون یہ ہے کہ دونوں کے آگے یکساں طریقہ پر دنیوی نتائج کا دروازہ کھول دیا ہے، اور سب کو کارخانۂ ربوبیت کا فیضان مل رہا ہے۔ انہیں بھی جو صرف دنیا کے ہو رہے، انہیں بھی جو آخرت کے بھی طالب ہوئے۔ لیکن جہاں تک آخرت کی سعادتوں کا تعلق ہے، پہلے کے لیے محرومیاں ہوں گی۔ دوسرے کے لیے کامرانیاں!

الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ
مَسْئُولًا ۝ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ ۳۴
تَأْوِيلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ ۳۵
مَسْئُولًا ۝ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝ كُلُّ ۳۶-۳۷
ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ۝ ذٰلِكَ مِمَّا ۳۸

آیت (۱۹) نے یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ سعادتِ اُخروی کی شرائط کیا ہیں۔ فرمایا دو شرطیں ہیں۔ اول یہ کہ سعادت اُخروی کے لیے کوشش کرے۔ لیکن کیسی کوشش؟ ویسی کوشش جو اس کے لیے صحیح کوشش ہوسکتی ہے۔ یعنے جو اللہ کی وحی نے بتلادی ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ پر اور اس کی صداقتوں پر ایمان ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی سعادت کی کوئی سعی بغیر ان دو شرطوں کے مقبول نہیں ہوسکتی۔

اُسے خرچ کرنے کا ارادہ بھی نہ کرنا) مگر ہاں ایسے طریقہ پر جو بہتر ہو۔ یہاں تک کہ یتیم جوان ہوجائیں (اور تم اُن کی امانت اُن کے حوالہ کردو) اور (دیکھو) اپنا عہد پورا کیا کرو۔ عہد کے بارے میں تم سے بازپرس کی جائیگی! ۳۴

اور جب کوئی چیز ماپو، تو پیمانہ بھرپور رکھا کرو۔ (اس میں کمی نہ کرو) اور جب تولو تو درست ترازو سے تولو (یعنے نہ تو ترازو غلط ہو، نہ تولنے میں ڈنڈی دبائی جائے) یہ (معاملہ کا) بہتر طریقہ ہے اور (اچھا انجام لانے والا ہے! ۳۵

(۱۰) آیت (۲۲) سے سلسلۂ بیان اوامر ونواہی کی طرف متوجہ ہوا ہے، اور واضح کیا ہے کہ طالب آخرت کے اعمال کیسے ہونے چاہئیں۔ طالبین آخرت کی کامیابی اس سے مشروط کردی تھی کہ وسعیٰ لھا سعیھا، اب اس کی تشریح کی ہے کہ سعادت اُخروی کے لیے سعی اس طرح کرنی چاہیے۔ سب سے پہلے توحید فی العبادت کی تلقین کی کہ اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو۔ کیونکہ نفسِ توحید کا اعتقاد تو تمام پیروانِ مذاہب میں موجود تھا، لیکن توحید فی العبادت کی حقیقت مفقود ہوگئی تھی۔ پھر والدین کے حقوق پر توجہ دلائی۔ کیونکہ انسان کے لیے والدین کی ربوبیت ربوبیت الٰہی کا پرتو ہے، اور اس لیے عبودیت الٰہی کے بعد جو عمل اس کے لیے مقدم ہوسکتا ہے وہ یہی ہے کہ والدین کے حقوق پرورش سے غافل نہ ہو۔

اور دیکھو، جس بات کا تمہیں علم نہیں، اُس کے پیچھے نہ پڑو (اپنی حد کے اندر رہو) یاد رکھو، کان، آنکھ، عقل، ان سب کے بارے میں بازپرس ہونے والی ہے! ۳۶

اور زمین پر اکڑ کے نہ چلو۔ یقیناً تم زمین میں شگاف نہیں ڈال سکتے، اور نہ پہاڑوں کی لمبان تک پہنچ جاسکتے ہو! ۳۷

ان ساری باتوں کا یہ حال ہے کہ ان کی بُرائی تمہارے پروردگار کے نزدیک بڑی ہی ناپسندیدہ ہے! ۳۸

(اے پیغمبر!) یہ اُن دانائی کی باتوں میں سے

ذٰلِكَ مِمَّآ أَوْحَىٰٓ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ ۳۹
أَفَأَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝ وَلَقَدْ ۴۰
صَرَّفْنَا فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ وَمَا يَزِيْدُهُمْ إِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ ۴۱
كَمَا يَقُوْلُوْنَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا ۴۲
كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَإِنْ مِّنْ شَىْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ ۴۳
بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ ۴۴

والدین کی خدمت و اطاعت کی آزمائش کا اصلی وقت اُن کے بڑھاپے کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ بڑھاپے کی کمزوریاں انہیں دوسروں کی خدمت و اعانت کا محتاج بنا دیتی ہیں اور اولاد اپنی جوانی کی اُمنگوں اور عیش پرستیوں میں اس کی بہت کم مہلت پاتی ہے کہ اپنے محتاج اور معذور ماں باپ کی خبرگیری کرے۔ پس یہاں سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیا کیونکہ جو اولاد اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت و اطاعت میں کوتاہی نہیں کرے گی، وہ دوسرے وقتوں میں کب کوتاہی گوارا کر سکتی ہے۔

انسان کی احتیاج کے دو ہی وقت ہوتے ہیں۔ طفولیت اور بڑھاپا۔ طفولیت میں ماں باپ نے خدمت کی تھی بڑھاپے میں اولاد کو کرنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا!

۳۹ (یہ حکمت کی باتیں) ہیں جو تیرے پروردگار کی جانب سے تجھ پر وحی کی گئی ہیں، اور (تمام باتوں کی جڑ یہ ہے کہ) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ کہ بالآخر دوزخ میں ڈالے جاؤ، ملامت کے مستوجب اور ٹھکرائے ہوئے!

۴۰ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں تو اس برگزیدگی کے لیے چن لیا ہو کہ بیٹے والے ہو اور خود اپنے لیے یہ پسند کیا ہو کہ فرشتوں کو بیٹیاں بنائے؟ (افسوس تم پر!) کیسی سخت بات ہے جو تم کہہ رہے ہو!

اور (دیکھو) ہم نے اس قرآن میں طرح طرح کے طریقوں سے (مطالبِ حق) بیان کیے تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں

۴۱ لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جو ہوا تو یہ ہوا کہ (سچائی سے) اور زیادہ نفرت بڑھ گئی!

۴۲ (اے پیغمبر!) تم کہہ دو "اگر اللہ کے ساتھ اور بہت سے معبود ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو اس صورت میں ضروری تھا کہ وہ فوراً صاحبِ تختِ ہستی تک (مقابلہ کی) راہ نکال لیتے" (اور کارخانۂ ہستی میں فساد پڑ جاتا)

۴۳ ان ساری باتوں سے جو یہ کہتے ہیں، اُس کی ذات پاک اور بلند ہے بے حد بلند ہے!

۴۴ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے، سب اُس کی پاکی و کبریائی کا زمزمہ بلند کر رہے ہیں۔ یہاں کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج نہ ہو۔ مگر تم اُن کی زمزمہ سنجیاں سمجھتے نہیں۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی بردبار ہے، بڑا ہی بخشنے والا!

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۙ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤی اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۴۸﴾

(اے پیغمبر!) جب تو قرآن پڑھتا ہے، تو ہم تجھ میں اور اُن لوگوں میں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے، ایک پوشیدہ پردہ حائل کر دیتے ہیں (یعنے ہمارا ٹھہرایا ہوا قانون یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں اور صدائے حق میں ایک پردہ سا حائل ہو جاتا ہے) ۴۵

اور ہم نے اُن کے دلوں پر غلاف ڈال دیے کہ سمجھ کام نہیں دیتی، اور کانوں میں گرانی کہ کچھ سنائی نہیں دیتا جب تو قرآن میں تن تنہا، صرف اپنے پروردگار ہی کا ذکر کرتا ہے (اور یہ اپنے ٹھہرائے شریکوں کا ذکر نہیں پاتے) تو پیٹھ پھیر کے بھاگنے لگتے ہیں نفرت میں بھرے ہوئے! ۴۶

جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جو کچھ ان کا سننا ہوتا ہے، اُسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور جب یہ ظالم باہم سرگوشیاں کرتے ہیں، اور سرگوشیاں کرتے ہوئے کہتے ہیں "تم جس آدمی کے پیچھے پڑے ہو، وہ اس کے سوا کیا ہے کہ جادو سے مارا ہوا ہے" تو اس سے بھی ہم بے خبر نہیں ہیں! ۴۷

(اے پیغمبر!) غور کر! ان لوگوں نے تیری نسبت کیسی کیسی باتیں بنائی ہیں جس کی وجہ سے گمراہی میں پڑ گئے، پس اب راہ نہیں پا سکتے۔ ۴۸

(۱۱) ماں باپ کے بعد قرابت داروں کے حقوق ہیں، اور پھر اُن سب کے ہیں جو ہماری خبرگیری کے محتاج ہوں۔ پس آیت (۲۶) میں اس کا حکم دیا، اور فرمایا ولا تبذر تبذیرا تمہارے خرچ کرنے کا صحیح محل یہ ہے۔ پس مال و دولت بے محل خرچ نہ کرو۔

پھر فرمایا جو لوگ تبذیر کرتے ہیں۔ یعنے خدا کی دی ہوئی دولت بے محل خرچ کر ڈالتے ہیں۔ مثلاً محض اپنے نفس کی عیش پرستیوں میں اُڑا دیتے ہیں۔ تو وہ شیطان کے بھائی بندوں میں سے ہیں کیونکہ شیطان کی راہ کفران کی راہ ہے، اور اُنہوں نے بھی کفران نعمت کی راہ اختیار کی۔

مال و دولت کے بیجا استعمال کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی نہ تو اپنے اوپر خرچ کرے نہ دوسروں پر محض جمع کر کے رکھے۔ دوسری یہ کہ صرف اپنے اوپر خرچ کرے۔ دوسروں پر خرچ نہ کرے۔ قرآن نے دونوں صورتوں کو معصیت قرار دیا ہے۔ پہلی صورت "اکتناز" کی ہے: والذین یکنزون الذھب والفضۃ (۹:۳۴) دوسری تبذیر کی۔ یہاں تبذیر سے روکا ہے۔

(۱۲) آیت (۲۹) جوامع مواعظ میں سے ہے۔ فرمایا، مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو کسی ایک ہی طرف کو جھک نہ پڑو۔ مثلاً خرچ کرنے پر آئے تو سب کچھ اُڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو اتنی کی کہ کنجوسی پر اُتر آئے۔

دراصل تمام محاسن و فضائل کی بنیادی حقیقت توسط و اعتدال ہے، اور جتنی بُرائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، افراط تفریط سے پیدا ہوتی ہیں۔

۴۹ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً
۵۰ اَوْ حَدِيْدًا ۝ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ
فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ
۵۱-۵۲ قَرِيْبًا ۝ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ع ۵

اور (دیکھو) اُنہوں نے کہا "جب ہم (مرنے کے بعد) محض چند ہڈیوں کی شکل میں رہ گئے اور گل سڑ گئے، تو پھر کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ از سر نو اُٹھا کھڑے کیے جائیں؟"

تم کہدو "ہاں تم (مرنے کے بعد) کچھ ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ پتھر ہو جاؤ، لوہا ہو جاؤ، یا کوئی اور چیز جو تمہارے خیال میں (دوبارہ زندہ ہونے کے لیے) بہت ہی سخت ہو" (لیکن قدرتِ الٰہی تمہیں دوبارہ زندہ کرکے رہیگی)

یہ سُن کر وہ کہینگے "لیکن کون ہے جو اس طرح ہمیں دوبارہ زندہ کر دیگا؟"

تم کہو "وہی جس نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا!"

اس پر یہ لوگ تیرے آگے سر مٹکانے لگینگے، اور کہینگے "ایسا کب ہوگا؟" تم کہو "عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہو"

وہ دن کہ اللہ تمہیں بلائیگا، اور تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کا جواب دوگے، اور ایسا خیال کروگے کہ (دونوں زندگیوں کے درمیان) تم نے جو وقت گزارا، وہ کوئی بڑی مدت نہ تھی تھوڑا سا وقت تھا!

(۱۳) قرآن نے قتل نفس کو انسان کی سب سے بڑی معصیت قرار دیا ہے۔ شرک کے بعد اگر کوئی بُرائی ہو سکتی ہے تو وہی ہے: والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق (۲۵: ۶۸) اس بارے میں طبیعت انسانی کے لیے اصلی آزمائش کا وقت وہ ہوتا ہے جب انتقام کا جوش اُبھر آتا ہے، اور بسا اوقات ایک قتل کے بدلے سینکڑوں جانوں کا خون بہا دیا جاتا ہے۔ پس یہاں آیت (۳۳) میں خصوصیت کے ساتھ اس نقطہ پر توجہ دلائی: فلا یسرف فی القتل۔ جو شخص ظلم سے مارا جائے، تو اس کے وارثوں کو قصاص کے مطالبہ کا حق دیا گیا ہے، لیکن اس حق کا بیجا استعمال نہیں ہونا چاہیئے کہ ایک خونریزی کے بدلے بہت سی خوں ریزیاں ہو جائیں۔

(۱۴) آیت (۳۶) مہمات معارف قرآنی میں سے ہے۔ اس کی تشریح آخری نوٹ میں ملیگی۔

(۱۵) آیت (۴۴) میں فرمایا۔ کائنات ہستی میں کوئی چیز نہیں جو اللہ کی حمد و تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم میں سمجھ نہیں کہ اُن کی تسبیح و تقدیس پر غور کرو۔

یہ تسبیح جو کائنات ہستی کی ہر چیز کر رہی ہے، کیا محض صداؤں کی تسبیح ہے؟ نہیں، وہ اپنی ہستی میں، اپنی بناوٹ میں، اپنی صورت میں، اپنے افعال و خواص میں مجسم تسبیح و تقدیس ہیں۔ اُن کی ہستی ہی تسبیح کا ترانہ اور ان کی موجودگی ہی سرتاسر حمد و ثنا ہے۔ وہ اپنی ہر بات میں کسی بنانے والے کی صنعت، کسی پرورش کرنے والے کی پرورش، اور کسی سرچشمۂ حسن و کمال کی حسن افروزیاں ہیں، اور اس لیے زبان حال سے اس کی خالقیت و حکمت اور ربوبیت و رحمت کی تحمید و

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ

۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶

تسبیح کر رہی ہیں۔

عربی میں من ذوی العقول کے لیے آتا ہے، اس لیے پہلے فرمایا، آسمان اور زمین میں جتنی ذوی العقول ہستیاں ہیں سب تسبیح الٰہی میں سرگرم ہیں۔ پھر فرمایا۔ وان من شیءٍ۔ اور کائنات ہستی میں کوئی شے نہیں جو اس تسبیح میں اُن کی شریک نہ ہو۔ عربی میں "شے" کا اطلاق نہ صرف اُن چیزوں پر ہوتا ہے جو جسم و حجم رکھتی ہوں، بلکہ ہر بات اور ہر حادثہ پر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ دروازہ کھلنے کی آواز کو بھی شے کہینگے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ کائنات ہستی کا ہر وجود، ہر ہستی، ہر چیز، ہر حالت، ہر حادثہ اپنے بنانے والے کی یکتائی اور صنعت گری کی تصویر ہے، اور خود تصویر سے بڑھ کر اور کس کی زبان ہو سکتی ہے جو مصور کے صنعت و کمال کا اعلان کرے؟

اگر ایک باکمال سنگ تراش موجود ہے، تو اس کی صناعی و کمال کی تعریف تم زبانوں سے نہیں کر سکتے۔ اُس کی مجسم تعریف و توصیف خود اُس کی بنائی ہوئی مورتی ہوتی ہے۔ اُس مورتی کا حُسن، اُس کا تناسب، اُس کا انداز، اُس کی ساری باتیں اپنے سنگ تراش کے دستِ صناعی کی اُبھرتی ہوئی تعریف اور اُبلتی ہوئی مدح و ثنا ہوتی ہے!

اس آیت نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ کارخانۂ ہستی میں جو کچھ ہے سرتا سر حسن و خوبی ہی ہے۔ کیونکہ حمد کے معنی ثنائے جمیل کے ہیں، اور تمام چیزوں کا صدائے حمد ہونا، اس امر کا ثبوت ہے کہ بنانے والے نے جتنی چیزیں بنائی ہیں حُسن و خوبی ہی کی بنائی ہیں، اگرچہ تمہاری کوتاہ بینی اُسے نہ پا سکے۔ اس مقام کی تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ کا مبحث برہانِ رحمت دیکھنا چاہیے۔

لیکن کیا کائنات ہستی کی یہ تسبیح محض صدائے حال ہی کی تسبیح ہے، صدائے مقال کا اس میں کوئی حصہ نہیں؟ کون ہے

اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو (یعنے اُن سے جو دعوتِ حق پر ایمان لائے ہیں۔ مخالفوں سے گفتگو کرتے ہوئے) جو بات کہو، ایسی کہو کہ خوبی کی بات ہو۔ شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔ یقیناً شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔ (۵۳)

تمہارا پروردگار تمہارے حال سے خوب واقف ہے، وہ چاہے تو تم پر رحم کرے، چاہے تو عذاب میں ڈالے اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھے ان لوگوں پر پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ تو ان کے ہدایت پانے نہ پانے کے لیے جوابدہ ہو) (۵۴)

آسمان و زمین میں جو کوئی ہے، تیرا پروردگار سب کا حال بہتر جاننے والا ہے۔ ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر برتری دی، اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمایا۔ (۵۵)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہہ دو "تم نے اپنے خیال میں اللہ کے سوا جن ہستیوں کو معبود سمجھ رکھا ہے، انہیں (اپنی حاجتوں اور مشکلوں میں) پکار دیکھو۔ نہ تو وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں کہ تمہارا کوئی دکھ دور کر دیں اور نہ تمہاری حالت بدل سکتے ہیں" (۵۶)

یہ لوگ جن ہستیوں کو پکارتے ہیں، (اور اللہ کے

يَبْتَغُونَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُونَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ

حضور (انہیں وسیلہ تقرب سمجھتے ہیں) وہ تو خود اپنے پروردگار کے حضور (بندگی و اطاعت کے ذریعہ) وسیلہ ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ کون اس راہ میں زیادہ قریب ہوتا ہے۔ نیز اُس کی رحمت کے متوقع رہتے ہیں، اور اُس کے عذاب سے ترساں۔ فی الحقیقت تمہارے پروردگار کا عذاب بڑے ہی ڈرنے کی چیز ہے!

اور روزِ قیامت سے پہلے ضرور ایسا ہونے والا ہے کہ (نافرمانوں کی) جتنی بستیاں ہیں، ہم انہیں ہلاک کر دیں، یا عذاب سخت میں مبتلا کر دیں۔ یہ بات (قانونِ الٰہی کے) نوشتہ میں لکھی جا چکی ہے!

اور (جو نشانیاں منکر طلب کرتے ہیں، ان) نشانیوں کے بھیجنے سے ہمیں کون روک سکتا ہے؟ مگر یہ، کہ ہم جانتے ہیں، پچھلے عہد کے لوگ ایسی ہی نشانیاں جھٹلا چکے ہیں۔ ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی دی کہ ایک آشکارا نشانی تھی، لیکن انہوں نے اس پر ظلم کیا (اور نشانی سے عبرت نہ پکڑی) اور ہم نشانیاں تو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ لوگ (انکار و سرکشی کے نتائج سے) ڈریں۔

اور (اے پیغمبر! وہ وقت یاد کر) جب تیرے پروردگار نے تجھ سے کہا تھا یقین کر تیرے پروردگار

جا یسا کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ ابھی چند آیتوں کے بعد اسی سورت میں تم پڑھو گے، وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

(۴۱) پچھلی آیت میں منکرینِ حق کی یہ حالت بیان کی تھی کہ لا یفقھون تسبیحھم، اب آیت (۴۵) میں فرمایا۔ یہی حال اُن کا قرآن کے بارے میں ہے۔ کہ اس کی طرف رُخ نہیں کرتے اُسے سُننا نہیں چاہتے، اسے سمجھنے کے لیے طیار نہیں۔ اللہ کا مقررہ قانون یہ ہے کہ اگر تم آنکھیں نہیں کھولو گے، تو تمہارے آگے ایک سیاہ پردہ حائل ہو جائیگا۔ اگر تم سُننا نہیں چاہو گے، تو تمہارے کان بہروں کے کان ہو جائینگے۔ اگر تم سوچنے سے انکار کر دو گے، تو تمہاری عقل پر پردے پڑ جائینگے اُس کی روشنی کام نہیں دے سکیگی۔ قرآن نے انکار و اعراض کی یہ حالت جابجا بتلائی ہے، اور یہاں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

منکروں کی یہ حالت خود اُنہی کی پسند کی ہوئی حالت تھی یہ قانون اللہ کا ٹھہرایا ہوا ہے کہ نہ دیکھنے والے کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے، لیکن اسی وقت پڑتا ہے جب دیکھنے والا دیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہاں تین باتیں بیان کی گئی ہیں آنکھوں کے آگے حجاب، کانوں میں گرانی، اور عقل پر تہ در تہ غلافوں کا چڑھ جانا۔ لیکن یہ وہی تین حالتیں ہیں جو خود منکروں نے اپنے لیے پسند کر لی تھیں، وقالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ، وفی اذاننا وقر، ومن بیننا وبینک حجاب (۴۱:۵)

حجاباً مستوراً۔ یعنے ایسا پردہ جو حائل تو ہو جاتا ہے مگر

أَحَاطَ بِالنَّاسِ ۚ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ
فِي الْقُرْآنِ ۚ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ۝ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ ۶۰
فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ۝ قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ ۶۱
عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ ۶۲
فَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ

دکھائی نہیں دیتا اور دکھائی دے کس طرح؟ وہ لکڑی کا یا دھات کا پردہ تو ہوتا نہیں۔ وہ تو اعراض و غفلت کا پردہ ہوتا ہے جسے تمہاری ظاہر بیں نگاہیں پا نہیں سکتیں۔

(۱۵) قرآن حکیم نے جابجا نشأۃ اولیٰ سے نشأۃ ثانیہ پر استدلال کیا ہے یعنے جس خالق و قدیر نے تمہیں پہلی مرتبہ زندگی دی، کیا وہ تمہیں دوبارہ زندگی نہیں دے سکتا! پھر اس پر اچنبھا کیوں ہو!

یہاں بھی آیت (۵۱) میں یہی استدلال ہے۔ پہلی زندگی سے مراد نوع کی زندگی بھی ہو سکتی ہے، اور فرد کی بھی۔ ہر فرد اپنی ہستی میں غور کر سکتا ہے۔ اس کا وجود نہ تھا مگر ظہور میں آگیا، اور کس طرح ظہور میں آیا؟ محض نطفے کے ایک خوردبینی کیڑے سے جو "علقہ" کی طرح ہوتا ہے۔ یعنے جونک کی طرح۔ پھر اگر کیڑے کے ایک ذرہ سے اس کا وجود بن جا سکتا تھا، تو کیا اس کے پورے وجود کے ذرات سے دوبارہ وجود نہیں بن سکتا؟ ما لکم کیف تحکمون؟

نے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا ہے (یعنے اب وہ دعوتِ حق کے دائرے سے باہر نکل نہیں سکتے) اور رؤیا جو ہم نے تجھے دکھائی تو اسی لیے دکھائی کہ لوگوں کے لیے ایک آزمایش ہو۔ اسی طرح اُس درخت کا ذکر جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔ ہم اُنہیں (طرح طرح پر) ڈراتے ہیں، لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پڑتا ہے تو صرف یہی کہ اپنی سرکشیوں میں اور زیادہ بڑھتے جاتے ہیں!

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا "آدم کے آگے جھک جاؤ!" اس پر سب جھک گئے مگر ایک ابلیس نہ جھکا۔ اُس نے کہا "کیا میں ایسی ہستی کے آگے جھکوں جسے تو نے مٹی سے بنا لیا ہے؟"

نیز اُس نے کہا "کیا تیرا یہی فیصلہ ہوا کہ تو نے اس (حقیر سا) ہستی کو مجھ پر بڑائی دی؟"

(۱۶) آیت (۵۳) میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ منکرین اسلام سے گفتگو کرو، تو پسندیدہ طریقہ پر کرو۔ اس طرح کی باتیں نہ کہو جس سے باہم فتنہ و فساد پیدا ہو، اور بجائے سمجھنے کے اور زیادہ لوگ متنفر ہو جائیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے بعض مشرکوں کو کہا تھا "انکم من اھل النار" تم جہنمی ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور مسلمانوں کو اس بات سے روکا گیا کہ تعین کے

"اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دیدے تو میں ضرور اس کی نسل کی بیخ بنیاد اُکھاڑ کے رہوں۔ تھوڑے آدمی اس ہلاکت سے بچیں، اور کوئی نہ بچے"

اللہ نے فرمایا "جا۔ اپنی راہ لے۔ جو کوئی بھی ان میں سے تیرے پیچھے چلیگا، تو اس کے لیے اور تیرے لیے

۶۳ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُورًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُم بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ
۶۴ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝
۶۵ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝ رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ
۶۶ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ
ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ فَلَمَّا

ساتھ کسی انسان یا جماعت کو ایسا نہ کہیں کہ تم جہنمی ہو۔ کیونکہ کوئی نہیں جانتا، کس آدمی کا خاتمہ کس حال پر ہونے والا ہے! بہت ممکن ہے جسے تم جہنمی کہہ رہے ہو، اُسے ہدایت کی توفیق ملنے والی ہو، اور اس کی جگہ جنتیوں میں ہو۔ بلاشبہ تم کہہ سکتے ہو یہ بات حق ہے اور یہ حق نہیں۔ لیکن کسی خاص جماعت یا فرد کی نسبت حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ ضرور جہنمی ہے۔ ایسا کہنے کا کسی انسان کو حق نہیں۔

اس موقع پر سورۂ انعام کی یہ آیت بھی یاد کر لو کہ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ، فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم کذلک زینا لکل امۃ عملھم، ثم الی ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعملون (۶: ۱۰۸) اور یہ حکم بھی نہ بھولو کہ وجادلھم بالتی ھی احسن جو پچھلی سورت کے خاتمہ میں گزر چکا ہے۔

غور کرو، کس طرح قرآن قدم قدم پر یہ بات یاد دلاتا رہتا ہے کہ فکر میں رواداری ہونی چاہیے، حکم میں احتیاط ہونی چاہیے۔ تم جس بات کو حق سمجھتے ہو اس پر جم جاؤ اور دوسروں کو بھی اُس کی دعوت دو، مگر یہ نہ بھولو کہ انسان کی نجات و عدم نجات کی ٹھیکہ داری تمہیں نہیں دیدی گئی ہے۔ کون نجات پانے والا ہے، اور کس کے لیے بالآخر محرومی ہے؟ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ تمہیں حق نہیں کہ اس طرح کے حکم لگاتے پھرو۔ علاوہ ازیں اگر ایک انسان غلط راہ چل رہا ہے تو تمہارے جہنمی کہہ دینے سے وہ جنتی نہیں بن جائیگا، بلکہ بہت ممکن ہے، اور زیادہ اپنی غلطی میں ضدی ہو جائے پس جو کچھ بھی زبان سے نکالو، حُسن و خوبی کی بات ہو۔ سختی و خشونت کی بات نہ ہو۔

چنانچہ فرمایا۔ ان الشیطٰن ینزغ بینھم۔ شیطان چاہتا ہے، لوگوں میں تفرقہ و فساد ڈالے۔ سو یہ اس طرح کا طرزِ کلام تفرقہ و فساد پیدا کرتا ہے اور یہی اصل مقصود کہ

جہنم کی سزا ہوئی پوری پوری سزا"

"ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کر لے، اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، اُن کے مال اور اولاد میں شریک ہو جا، ان سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سر تا سر دھوکا"

"جو میرے (سچے) بندے ہیں، اُن پر تو قابو پانے والا نہیں تیرا پروردگار کارسازی کے لئے بس کرتا ہے"

(اے لوگو!) تمہارا پروردگار تو وہ ہے جو تمہاری کاربراریوں کے لیے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم (سیر و سیاحت کے ذریعہ) اُس کا فضل تلاش کرو۔ بلاشبہ وہ تم پر بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے!

اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم سمندر میں ہوتے ہو اور مصیبت آلگتی ہے، تو اُس وقت وہ تمام ہستیاں تم سے کھوئی جاتی ہیں جنہیں تم پکارا کرتے ہو۔ صرف ایک اللہ ہی کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ پھر جب وہ تمہیں مصیبت سے نجات دیدیتا

نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ ۶۷
اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى ۶۸
فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ۝ وَ ۶۹
لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا
تَفْضِيْلًا ۝ ع يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ ۷۰ ع

اور خشکی پر پہنچا دیتا ہے، توتم اس سے گردن موڑ لیتے ہو
حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے! ۶۷
پھر کیا تمہیں اس سے امن مل گیا ہے کہ وہ تمہیں
خشکی کے کسی گوشے میں دھنسا دے یا تم پر پتھر برسانے
والی آندھیاں بھیج دے، اور تم اس حال میں کسی کو اپنا
مددگار نہ پاؤ؟ یا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو ۶۸
کہ اللہ تمہیں دوبارہ ویسی ہی مصیبت میں ڈال دے، اور ہوا کا ایک سخت طوفان بھیج دے، اور تمہاری
ناشکری کی پاداش میں تمہیں غرق کر دے، اور پھر کسی
کو نہ پاؤ جو اس کے لیے ہم پر دعویٰ کرنے والا ہو؟ ۶۹
اور (البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی، اور خشکی اور
تری، دونوں کی قوتیں اُس کے تابع کردیں کہ اُسے
اُٹھائے پھرتی ہیں، اور اچھی چیزیں اُس کی روزی
کے لیے مہیا کردیں، نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں
اُن میں سے اکثر پر اُسے برتری دیدی، پوری برتری
جیسی کہ ہونی چاہیئے! ۷۰
وہ (آنے والا) دن، جبکہ ہم تمام انسانوں کو اُن
کے پیشواؤں کے ساتھ بلائینگے (اور اپنے حضور جمع
کرینگے) پھر جو کوئی اپنا نوشتہ (اعمال) اپنے
دہنے ہاتھ میں پائیگا، تو وہ اُن لوگوں میں ہوگا جو اپنا
نوشتہ پڑھینگے، اور (اُن پر رائی برابر بھی زیادتی

ہدایت دارشاد ہے، مفقود ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا، ربکم
اعلم بکم، یہ اللہ کا کام ہے کہ جسے چاہے نجات دے۔ جسے چاہے
عذاب میں ڈالے۔ وما ارسلناک علیھم وکیلا۔ اے پیغمبر! ہم نے
تجھے لوگوں پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ لوگوں کی نجات و عدم
نجات کے لیے ذمہ دار ہو اور جب خود پیغمبر کو یہ منصب حاصل نہیں
تو اور کسی کے لیے کب جائز ہوسکتا ہے کہ اپنے کو جنت و دوزخ کا
داروغہ سمجھ لے

(۷۱) آیت (۵۸) میں افراد کا ذکر نہیں ہے۔ جماعتوں اور قوموں
کی بستیوں کا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ہر بد اعمال گروہ
کو اس کے اعمال بد کی پاداش کا مل جانا ضروری ہے۔ خواہ ہلاکت
کی صورت میں ہو خواہ کسی دوسرے عذاب کی صورت میں۔
(۸۱) آیت (۵۹) نے قطعی طور پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ پیغمبروں
نے جو نشانیاں دکھائی تھیں، اُن کی حقیقت کیا تھی! فرمایا: وما
نرسل بالآیات، الا تخویفا۔ نشانیاں اس لیے نہیں دی گئیں
کہ سچائی کی دلیل تھیں، یا ہدایت کا معاملہ ان پر موقوف ہوتا ہے،
بلکہ صرف اس لیے کہ وہ ظہور عذاب کا مقدمہ تھیں۔ یعنی جو قومیں
سرکشی سے باز نہیں آئیں، انہیں ظہور نتائج کی خبر دیدی گئی، اور
اس خبر کا ظہور ایک نشانی کی صورت میں ہوا چنانچہ قوم ثمود
جب سرکشی سے باز نہ آئی، تو اونٹنی کا معاملہ اس کے لیے ایک
فیصلہ کن نشانی ہوگئی، اور اس نشانی کے بعد موعودہ عذاب
ظہور میں آگیا۔
آیت میں خطاب منکرین عرب سے ہے جو اپنی بات بنانے
کے لیے نشانیوں کی فرمائشیں کرتے تھے۔ فرمایا جو طالب حق
ہیں اُن کے لیے سچائی کی دعوت ہی سب سے بڑی نشانی ہے

۷۲-۷۱ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝
وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ

۷۴-۷۳ خَلِيلًا ۝ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ

۷۵ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝ وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ

۷۶ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا

۷۷ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ۝ ع

---

۷۱ اور وہ ماننے والے نہیں، ان کے لیے کوئی نشانی سودمند نہیں ہوتی چنانچہ پچھلے عہدوں میں ہمیشہ ایسا ہی ہو چکا ہے۔ کوئی نشانی بھی سرکشوں کے لیے سودمند نہ ہو سکی۔

نیز فرمایا ہمارا قانون یہ ہے کہ اس طرح کی نشانیاں تخویف و انذار ہی کے لیے نمودار ہوتی ہیں پس اگر اب بھی اُن تک نوبت پہنچی، تو منکروں کے لئے ظہورِ عذاب ناگزیر ہوگا، اور مشیتِ الٰہی

۷۲ کا یہ فیصلہ نہیں ہے کہ عذاب ظہور میں آئے۔

اس کے بعد آیت (۶۰) میں دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسریٰ کا واقعہ، اور اُس درخت کا معاملہ جس کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی ان شجرۃ الزقوم طعام الاثیم ( ) جہنم میں تھوہر کا درخت مجرموں کی غذا ہوگی۔ منکروں نے ان دونوں باتوں کی ہنسی اُڑائی تھی، جیسا کہ روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ اسریٰ کا معاملہ جب بیان کیا گیا تو کہنے لگے یہ جنون کی اتہام ہے، اور جہنم کے احوال و شدائد کی جب آیتیں

۷۳ سُنائی گئیں تو کہنے لگے، جہنم بھی عجیب جگہ ہوئی جہاں آگ کے شعلوں میں درخت پیدا ہونگے!

فرمایا، ان دونوں باتوں میں ان لوگوں کے لیے آزمائش

۷۴ ہوئی۔ اگر طالبِ حق ہوتے تو ہنسی اُڑانے کی جگہ عقل و بصیرت سے کام لیتے۔

نہیں ہوگی

اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا رہا اور اُس نے اللہ کے دیے ہوئے ہوش و حواس سے کام نہیں لیا) تو یقین کرو۔ آخرت میں بھی وہ اندھا ہی رہیگا، اور راستے سے یکقلم بھٹکا ہوا!

اور (اے پیغمبر!) ان لوگوں نے تو اس میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی کہ تجھے فریب دیکر اُس کلام کی تبلیغ) سے باز رکھیں جو ہم نے بذریعہ وحی نازل کیا ہے، اور مقصود ان کا یہ تھا کہ اس کلام کی جگہ دوسری باتیں کہہ کر تو ہم پر افتراپردازی کرے۔ اور پھر اس سے خوش ہو کر یہ تجھے اپنا دوست بنا لیں۔

اور اگر (راہِ حق میں) ہم نے تجھے جما نہ دیا ہوتا، تو تو ضرور اُن کی طرف کچھ نہ کچھ میلان کر ہی بیٹھتا، اور اس صورت میں ضرور ایسا ہوتا کہ ہم تجھے زندگی کا بھی دوہرا عذاب

۷۵ چکھاتے اور موت کا بھی، اور پھر تجھے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ ملتا۔

اور اُنہوں نے اس میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی کہ تجھے اس سرزمین سے عاجز کرکے نکال دیں۔

۷۶ اور اگر ایسا کر بیٹھتے، تو (یاد رکھ) تیرے (نکالے جانے کے) پیچھے مہلت نہ پاتے مگر بہت تھوڑی ہی۔ ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے ہیں، اُن سب کے معاملہ میں ہمارا ایسا ہی قاعدہ رہا ہے، اور ہمارے ٹھہرائے ہوئے

۷۷ قاعدوں کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیگا!

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ ۷۸
وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ۝ ۷۹ وَقُلْ رَّبِّ
أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا ۝ ۸۰
وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ ۸۱ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ

(اے پیغمبر!) نماز قائم کر سورج کے ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے تک (یعنے ظہر، عصر، مغرب، اور عشا کے وقتوں میں) نیز صبح کی تلاوتِ قرآن (یعنے صبح کی نماز) بلاشبہ صبح کی تلاوتِ قرآن ایک ایسی تلاوت ہے جو (خصوصیت کے ساتھ) دیکھی جاتی ہے! ۷۸

اور (اے پیغمبر!) رات کا کچھ حصہ (یعنے پچھلا پہر) شب بیداری میں بسر کر۔ یہ تیرے لیے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تجھے ایک ایسے مقام میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو! ۷۹

اور تیری دعا یہ ہونی چاہیے کہ "اے پروردگار! مجھے (جہاں کہیں پہنچا، تو) سچائی کے ساتھ پہنچا، اور (جہاں کہیں سے نکال، تو) سچائی کے ساتھ نکال، اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ (ہر حال میں) مددگاری کرنے والی ہو!" ۸۰

اور تیرا اعلان یہ ہو کہ "دیکھو، حق ظاہر ہوگیا، اور باطل نابود ہوا، اور باطل اسی لیے تھا کہ نابود ہو کر رہے!" ۸۱

اور ہم نے جو کچھ قرآن میں سے نازل کیا ہے، تو وہ یقین کرنے والوں کے لیے (روح کی ساری بیماریوں

(۱۷) آیت (۶۱) میں ابلیس کی سرکشی کا تذکرہ کیا تاکہ واضح ہو جائے، احکامِ حق کے مقابلہ میں سرکشی کی چال چلنا ابلیس کی چال ہے، اور یہ قدیم سے چلی آتی ہے۔ پھر آیت (۶۶) سے سلسلہ بیان انسان کی غفلت و گمراہی کے تذکرہ پر متوجہ ہوگیا ہے، اور جن حالات کی طرف اشارہ کیا ہے، اُن کی تشریحات گذشتہ سورتوں کے نوٹوں میں گزر چکی ہیں۔

(۱۸) آیت (۷۳) میں فرمایا۔ اگر وحی الٰہی کی روشنی تیری رہنمائی کے لیے موجود نہ ہوتی، تو وقت کی تاریکی اتنی شدید تھی کہ ممکن نہ تھا، اس بے لاگ ثبات و استقامت کے ساتھ اپنی راہ چلتا رہتا۔ کام کی دشواریاں ضرور تجھے مغلوب کر لیتیں، لوگوں کی مقاومتیں ضرور تجھے تھکا دیتیں، طاقتور افراد کی منتیں اور التجائیں ضرور تجھے متوجہ کر لیتیں، طرح طرح کی مصلحتیں ضرور دامنگیر ہو جاتیں۔ لغزشیں ٹھوکریں قدم قدم پر نمودار ہوتیں۔ لیکن اب کوئی چیز بھی تیری راہ نہیں روک سکتی۔ کوئی فتنہ بھی تجھے قابو میں نہیں لا سکتا۔ یہ وحی الٰہی کی رہنمائی ہے، اور وحی الٰہی کی رہنمائی پر کوئی انسانی طاقت غالب نہیں آسکتی۔

(۱۹) آیت (۷۸) نے نماز کے اوقات معین کر دیے۔ فرمایا، سورج کے ڈھلنے سے لیکر رات کے اندھیرے تک نماز کے اوقات ہیں یعنے ظہر، عصر، مغرب، اور عشا کے اوقات۔ نیز صبح کی تلاوت ہے یعنے صبح کی نماز ہے۔

"نفل" کے معنی کسی ایسی بات کے ہیں جو اصل مطلوب سے زیادہ ہو۔ پس فرمایا نافلة لك رات کا بھی کچھ حصہ جاگنے اور عبادت میں صرف کیا کرو۔ یہ تمہارے لیے عبادت کی مزید زیادتی ہوگی۔ اس آیت میں خطاب اگرچہ پیغمبر اسلام کو ہے، لیکن حکم عام ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ شب بیداری کی عبادت یعنے تہجد ایک مزید عبادت ہے اگر بن پڑے۔

(۲۰) آیت (۷۹) میں مقامِ محمود سے مقصود ایسا درجہ ہے جس

٨٢ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ
٨٣ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ۝ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ
٨٤ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ
٨٥ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ
٨٦، ٨٧ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝

کی عام طور پر ستائش کی جائے۔ فرمایا: کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہیں اپنے مقام پر پہنچا دے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو۔

٨٢ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب پیغمبر اسلام کی مکی زندگی کے آخری سال گزر رہے تھے اور مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی۔ حتیٰ کہ مخالف قتل کی تدبیروں میں سرگرم تھے۔ ایسی حالت میں کون امید کرسکتا تھا کہ انہی مظلومیتوں سے فتح و کامرانی پیدا ہوسکتی ہے!

٨٢ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی۔ بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسانی کے لیے عظمت و ارتفاع کی سب سے آخری بلندی ہے یعنی عسیٰ

٨٤ ان یبعثک ربک مقامًا محمودًا۔ حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیتِ خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرزیت حاصل ہوجائیگی۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو، لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہوگی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی محمودیت سرتاسر ممدوح ہستی ہو جائیگی:

ما شئت قل فیہ، فانت مصدق
فالحب یقضی والمحاسن تشھد

٨٥ یہ مقام، انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی سعی و ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ جاسکتی ہے، لیکن یہ بات نہیں پاسکتی کہ روحوں کی ستائش

٨٦ اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد و ملک کی ستائش لے سے نہ دوا سکیں، اور نپولین کی ساری جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کرسکیں کہ کورسیکا کے چند ہزار باشندوں ہی کو اسے محمود و ممدوح بنا دیتیں جہاں وہ پیدا

٨٧ ہوا تھا۔ محمودیت اسی کو حاصل ہوسکتی ہے جس میں حسن و کمال ہو۔

کی) شفا اور رحمت ہے، اور جو نافرمان ہیں، تو انہیں کچھ فائدہ ہونے والا نہیں بجز اس کے کہ (انکار و شقاوت کی وجہ سے) اور زیادہ تباہ ہوں!

اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں، تو ہم سے منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرتا ہے، اور جب اسے دکھ پہنچ جائے، تو دیکھو، بالکل مایوس ہو کر بیٹھ رہتا ہے:

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو "ہر انسان اپنے طور طریقہ کے مطابق عمل کرتا ہے پس تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے، کون سب سے زیادہ ٹھیک راہ پر ہے!

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تجھ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ تو کہہ دے "روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے۔ اور تمہیں (اسرارِ کائنات کا) علم جو کچھ دیا گیا ہے، وہ بہت تھوڑا ہے (اس سے زیادہ تم نہیں پاسکتے)"

اور (اے پیغمبر!) جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کی ہے، اگر ہم چاہیں، تو اسے بھی سلب کرلیں۔ پھر تجھے کوئی نہ ملے جو اس کے لیے ہم پر اپنی وکالت چلائے۔

مگر یہ محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ وہ ایسا نہیں کرتا) اس میں شک نہیں کہ اس کا تجھ پر بڑا ہی فضل ہے!

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ ع

کیونکہ وہ صرف حُسن ہی سے عشق کر سکتی ہیں، اور زبانیں کمال ہی کی ستائش میں کھل سکتی ہیں۔ لیکن حسن و کمال کی مملکت، وہ مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کر سکیں!

غور کرو، جس وقت سے نوعِ انسانی کی تاریخ معلوم ہے، نوعِ انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستائشیں کن انسانوں کے حصے میں آئی ہیں؟ شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصے میں یا خدا کے اُن رسولوں کے حصے میں جنہوں نے جسم و ملک کو نہیں بلکہ دلوں کو فتح کیا تھا؟

یہی مقام محمود ہے جس کی خبر ہمیں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے، اور خبر کے ساتھ امر بھی ہے: ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی۔ یا ایہا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما (٣٣: ٥٦)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا ایک مشہد وہ معاملہ ہوگا جو قیامت کے دن پیش آئیگا۔ جبکہ اللہ کی حمد و ثناء کا علم آپ بلند کرینگے، اور بلاشبہ محمودیت کا مقام دنیا و آخرت دونوں کے لیے ہے۔ جو ہستی یہاں محمودِ خلائق ہے، وہاں بھی محمود و ممدوح ہوگی۔

۸۸ (اے پیغمبر!) اس بات کا اعلان کر دے کہ "اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام پیش کر دیں، تو کبھی پیش نہیں کر سکینگے۔ اگرچہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار ہی کیوں نہ ہو"!

۸۹ اور ہم نے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بار بار لوٹا کر بیان کیں (کہ لوگ سمجھیں بوجھیں) لیکن ان میں سے اکثروں نے کوئی بات قبول نہیں کی، اور قبول کی تو صرف ناسپاسی!

۹۰ اور اُنہوں نے کہا "ہم تو اُس وقت تک تجھے ماننے والے نہیں، جب تک کہ تو اس طرح کی باتیں کر کے نہ دکھا دے۔ (مثلاً) ایسا ہو کہ تو حکم کرے اور زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے۔ یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اُس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کر کے دکھا دے،

۹۱ یا جیسا کہ تو نے خیال کیا ہے، آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر آگرے، یا اللہ اور اُس کے فرشتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوں،

۹۲ یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لیے مہیّا ہو گیا ہے، یا ایسا ہو کہ تو بلند ہو کر آسمان پر چلا جائے۔ اور اگر تو آسمان پر چلا بھی گیا، تو ہم یہ بات ماننے والے نہیں، جب تک تو ایک (لکھی لکھائی) کتاب ہم پر نہ اُتار لائے، اور ہم خود اُسے پڑھ کر جانچ نہ لیں"

۹۳ (اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہہ دے "سبحان اللہ! (میں نے کچھ خدائی کا دعوا تو کیا نہیں) میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک آدمی ہوں پیغامِ حق پہنچانے والا"!

وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جاءهم الهدی الا ان قالوا ابعث الله بشرا رسولا ۝ قل لو ۹۴
کان فی الارض ملائکة یمشون مطمئنین لنزلنا علیهم من السماء ملکا رسولا ۝ قل کفی ۹۵
بالله شهیدا بینی وبینکم انه کان بعباده خبیرا بصیرا ۝ ومن یهد الله فهو المهتد ومن ۹۶
یضلل فلن تجد لهم اولیاء من دونه ونحشرهم یوم القیامة علی وجوههم عمیا وبکما وصما
مأواهم جهنم کلما خبت زدناهم سعیرا ۝ ذلک جزاؤهم بانهم کفروا بایاتنا وقالوا ءاذا ۹۷
کنا عظاما ورفاتا ءانا لمبعوثون خلقا جدیدا ۝ اولم یروا ان الله الذی خلق السموت ۹۸
والارض قادر علی ان یخلق مثلهم وجعل لهم اجلا لا ریب فیه فابی الظلمون الا کفورا ۹۹

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی، تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہوکر) کہنے لگے "کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے!" ۹۴

(اے پیغمبر!) کہہ دے "اگر ایسا ہوا ہوتا کہ زمین میں (انسانوں کی جگہ) فرشتے بسے ہوتے، اور اطمینان سے چلتے پھرتے، تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے" ۹۵

(نیز) کہہ دے "میرے اور تمہارے درمیان (اب) اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔ یقیناً وہ اپنے بندوں کے حال سے واقف اور سب کچھ دیکھنے والا ہے!" ۹۶

جس کسی کو اللہ (سعادت و کامیابی کی) راہ پر لگا دے، فی الحقیقت وہی راہ پر ہے، اور جس کسی پر اس نے (کامیابی کی) راہ گم کردی، تو تم اللہ کے سوا اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ قیامت کے دن ہم ایسے لوگوں کو ان کے منہ کے بل اٹھائیں گے۔ اندھے، گونگے، بہرے۔ ان کا آخری ٹھکانا دوزخ ہوگا جب کبھی اس کی آگ بجھنے کو ہوگی، اسے اور زیادہ بھڑکا دیں گے؟ ۹۷

یہ ان کی سزا ہوئی۔ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیتوں سے انکار کیا تھا، اور کہا تھا "بھلا جب (مرنے کے بعد گل سڑ کر) محض ہڈیاں ہی ہڈیاں ہو گئے، اور ریزہ ریزہ، تو ایسا ہو سکتا ہے کہ از سر نو پیدا کرکے اٹھائے جائیں!؟" ۹۸

کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمان و زمین کی یہ تمام کائنات پیدا کر دی ہے، ضرور اس پر قادر ہے کہ ان کی موجودہ زندگی کی طرح ایک دوسری زندگی پیدا کر دے! نیز یہ بات، کہ ضرور اس نے ان کے لیے (آخری فیصلہ کی) ایک میعاد مقرر کر رکھی ہے جس میں کسی طرح کا شک نہیں کیا جا سکتا؟ اس پر بھی دیکھو، ان ظالموں نے کوئی چال چلنی نہ چاہی، مگر انکار حقیقت کی! ۹۹

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰي مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۝ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَي

(اے پیغمبر!) کہدے "اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے اختیار میں ہوتے، تو تم ضرور خرچ ہوجانے کے ڈر سے اُنہیں روک رکھتے (لیکن وہ اپنی رحمت کا فیضان روکنے والا نہیں۔ اُس کی بخششیں اتنی نپی تلی نہیں ہیں کہ صرف دنیا کی چند روزہ زندگی ہی میں خرچ ہوجائیں) حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی تنگ دل ہے (وہ رحمتِ الٰہی کی وسعت کا اندازہ نہیں کرسکتا!) ۱۰۰

اور (اے پیغمبر!) ہم نے موسیٰ کو نو آشکارا نشانیاں دی تھیں جب وہ بنی اسرائیل میں ظاہر ہوا تھا، تو بنی اسرائیل سے دریافت کرلے (کہ کیا ماجرا گزر چکا ہے) فرعون نے اُس کو کہا تھا "اے موسیٰ! میں خیال کرتا ہوں، ضرور تجھ پر کسی نے جادو کردیا ہے" ۱۰۱

موسیٰ نے اس پر کہا تھا "تو یقیناً جان چکا ہے کہ یہ نشانیاں مجھ پر کسی اور نے نہیں اُتاری ہیں مگر اُسی نے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے، اور (ان میں عبرت و تذکیر کے لیے) سمجھنے بوجھنے کی روشنی ہے۔ اور اے فرعون! میں تو سمجھتا ہوں، تو نے اپنے کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے!" ۱۰۲

تو (دیکھو) فرعون نے چاہا تھا کہ بنی اسرائیل پر ملک میں رہنا دشوار کردے، لیکن ہم نے اُسے اور اُن سب کو جو اُس کے ساتھ تھے (سمندر) میں غرق کردیا! ۱۰۳

اور ہم نے اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل سے کہا تھا "اب اس سرزمین میں (فارغ البال ہوکر) بسو (تمہارے لیے کوئی کھٹکا نہیں رہا) پھر جب آخرت کا وعدہ وقوع میں آجائیگا تو ہم تم سب کو اپنے حضور اکٹھا کرلینگے" ۱۰۴

اور ہم نے قرآن کو سچائی کے ساتھ اُتارا، اور وہ سچائی ہی کے ساتھ اُترا بھی، اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر صرف اسی حیثیت سے کہ (ایمان و عمل کے نتائج کی) بشارت دینے والا اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کردینے والا ہے۔ ۱۰۵

اور ہم نے قرآن کو الگ الگ ٹکڑوں میں منقسم کردیا، تاکہ تم ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو سُناتے رہو، اور یہی وجہ ہے کہ

۱۰۶ النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ

۱۰۷ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا

۱۰۸-۱۰۹ لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (سجدہ)

۱۱۰ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝

۱۱۱ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ

الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ ۱۱۱ (ع)

---

۱۰۶ اُسے بیک دفعہ نہیں اُتار دیا۔ بہ تدریج اُتارا۔

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہدے "تم قرآن کو (کلام الٰہی) مانو یا نہ مانو لیکن جن لوگوں کو پچھلی کتابوں

۱۰۷ کا علم دیا گیا ہے (یعنے اہل کتاب) اُنھیں جب یہ کلام سُنایا جاتا ہے، تو وہ بے اختیار سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور

۱۰۸ پکار اُٹھتے ہیں کہ ہمارے پروردگار کے لیے پاکی ہو! بلاشبہ ہمارے پروردگار کا وعدہ اسی لیے تھا کہ پورا ہو کر رہے!"

وہ ٹھوڑیوں کے بل (اُس کے آگے) گر پڑتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ کلامِ حق کی

۱۰۹ سماعت ان کی عاجزی اور زیادہ کر دیتی ہے!

(اے پیغمبر!) کہدے "تم اللہ کہہ کر (اُسے) پکارو یا رحمان کہہ کر جس نام سے پکارو، اُس کے سارے نام حسنٌ

خوبی کے نام ہیں" اور (اے پیغمبر!) تو جب نماز میں مشغول ہو تو نہ تو چلّا کر پڑھ، نہ بالکل چپکے چپکے۔ چاہیے کہ

۱۱۰ درمیان کی راہ اختیار کی جائے۔

اور کہہ "ساری ستائشیں اللہ کے لیے ہیں جو نہ تو اولاد رکھتا ہے، نہ اُس کی فرمانروائی میں کوئی اُس کا

شریک ہے، اور نہ کوئی ایسا ہے کہ اُس کی درماندگی کی وجہ سے اُس کا مددگار ہو۔ (وہ ان ساری باتوں سے

۱۱۱ بے نیاز ہے) اس کی بڑائی کی پکار بلند کر جیسی پکار بلند کرنی چاہیے!

---

(۱۹) اس سورت کے بعض مقامات کی تشریحات رہ گئی ہیں۔ ضروری ہے کہ ان پر ایک نظر ڈال لی جائے:

واقعۂ اسریٰ

(ل) واقعۂ اسریٰ کی نوعیت کیا تھی؟ یہ عالم بیداری میں پیش آیا یا عالم خواب میں؟ صرف روح پر طاری ہوا تھا، یا جسم بھی اس میں شریک تھا؟ اس بارے میں صحابہ وسلف کا اختلاف معلوم ہے۔ اکثر صحابہ وتابعین اس طرف گئے ہیں کہ روح وجسم دونوں پر طاری ہوا، لیکن حضرت عائشہ، حذیفہ بن الیمان، حسن، معاویہ، ابن اسحاق وغیرہم سے مروی ہے کہ یہ ایک روحانی معاملہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے احوال وواردات ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے لیے ہماری عام تعبیرات کام نہیں دے سکتیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کر دیگی جو عام طور پر ہمیں پیش آتی رہتی ہیں، لیکن انبیاء کرام کو جو حالات پیش آتے ہیں، اُن کی نوعیت ہی دوسری ہوتی ہے۔ وہ ہمارے محسوسات ومفہومات کے دائرہ سے باہر کے معاملات ہیں۔

خود نبوت کی حقیقت کیا ہے؟ وحی کا معاملہ کیونکر انجام پاتا ہے؟ کیا اس بارے میں ہماری کوئی تعبیر بھی حقیقت حال کی کامل

تعبیر ہو سکتی ہے؟ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: جب وحی آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے صلصلۃ الجرس کی آواز ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک تمثیل ہے جو اس لیے اختیار کی گئی کہ اس معاملہ کا ایک تقریبی تخیل ہمارے اندر پیدا ہو جائے۔ ورنہ وحی کی آمد محض گھنٹیوں کی آواز کی طرح نہیں ہو سکتی۔

پس اسرٰی کے معاملہ کا بھی ہماری محدود تعبیرات کام نہیں دے سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کے تاثرات مختلف ہوئے۔ جن لوگوں نے اس کیفیت کی اس بیداری میں پیش آیا تھا، وہ اس طرف گئے کہ یہ ہماری جسمانی نقل و حرکت کی طرح کا معاملہ نہ تھا۔ جن لوگوں نے اس پر زور دیا کہ بیداری میں پیش آیا تھا، وہ اس طرف گئے کہ اسے محض خواب کی طرح کا معاملہ نہیں کہہ سکتے۔ اور اس میں شک نہیں، دونوں اپنے تاثرات میں برسر حق تھے۔ خود صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: میں اُس وقت ایک ایسے عالم میں تھا کہ نہ تو سوتا تھا، نہ جاگتا تھا۔ بین النائم والیقظان۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اس معاملہ کو نہ تو ایسا معاملہ قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے میں پیش آیا کرتا ہے، نہ ایسا، جیسا سوتے میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ان دونوں حالتوں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی، اور ہماری تعبیرات میں اس کے لیے کوئی تعبیر نہیں ہے

اس مقام کی مزید تشریح البیان میں ملیگی۔

(ب) آیت (۶۰) وما جعلنا الرؤیا التی اریناك الا فتنة للناس میں "رؤیا" سے مقصود یہی واقعہ ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس، سعید بن جبیر، حسن، مسروق، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج وغیرہم سے ایسا ہی مروی ہے اور حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس پر محققین تفسیر کا اجماع ہو چکا ہے۔ پس جن مفسروں نے یہاں رؤیا سے مراد کوئی دوسری رؤیا لی ہے۔ مثلاً فتح مکہ کی رویا، وہ قابل اعتنا نہیں۔ کیونکہ سورت بالاتفاق مکی ہے، اور وہ معاملہ ایک عرصہ کے بعد مدینہ میں پیش آیا تھا، اور تطبیق کے لیے طرح طرح کے تکلفات کرنا قرآن کو چیستان بنا دینا ہے۔ ان مفسروں نے یہ تکلفات اس لیے کیے کہ رؤیا کا اطلاق خواب پر ہوتا ہے، اور اگر اس رؤیا سے مقصود واقعۂ اسرٰی ہو، تو پھر اُن صحابہ کا قول تسلیم کر لینا پڑیگا جو اس کے بیداری میں ہونے کے قائل نہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عباس کی تفسیر پر نظر نہ ڈالی۔ حضرت عبداللہ بن عباس ان صحابہ میں ہیں جو معراج کو عالم بیداری کا معاملہ سمجھتے تھے، اور اس مذہب کے سب سے بڑے پیشرو تھے۔ بایں ہمہ انہوں نے بھی اس آیت میں "رؤیا" کی یہی تفسیر کی ہے کہ واقعۂ اسرٰی مراد ہے۔ رؤیا عین اریھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری) ایک آنکھوں سے دیکھی ہوئی رؤیا جو لیلۃ الاسرٰی میں آنحضرت کو دکھائی گئی تھی۔ اگر حضرت ابن عباس کو اس آیت کی اس تفسیر میں کوئی دقت پیش نہ آئی، جو اس مذہب کے سب سے بڑے قائل تھے، تو پھر اور لوگوں کو کیوں دور از کار توجیہوں کی ضرورت پیش آئے؟

اور یہ جو حضرت ابن عباس نے فرمایا "رؤیا عین، اریھا" تو اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا، اور وہ حقیقت آشکارا ہو گئی جس کی طرف ابھی ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنے یہ جو کچھ پیش آیا، تھا تو رؤیا، لیکن کیسی رؤیا؟ ویسی ہی رؤیا، جیسی عالم خواب میں ہم دیکھا کرتے ہیں؟ نہیں۔ رؤیا عین۔ ایسی رؤیا جس میں آنکھیں غافل نہیں ہوتیں۔ بیدار ہوتی ہیں۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے، جیسے آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہو۔ ما زاغ البصر وما طغی، ولقد رای من اٰیات ربه الکبرٰی (۵۳ : ۱۸)

اعراض اور مایوسی دونوں میں ہلاکت ہے

(ج) آیت واذا انعمنا علی الانسان، اعرض ونا بجانبه، واذا مسه الشر، کان یؤسا (۸۳) میں انسان کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب اسے خوش حالی ملتی ہے تو غافل ہو جاتا ہے، اور جب رنج و غم پہنچتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں حالتوں میں اس کے لیے نامرادی ہے۔ سعادت کی راہ یہ ہے کہ خوش حالی میں غافل نہ ہو۔ کیونکہ غفلت کا نتیجہ محرومی ہے۔ بدحالی میں مایوس ہو کر بیٹھ نہ رہے کیونکہ مایوسی کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

غور کرو، طبیعت انسانی کی کیسی سچی تصویر ہے! انسان جب اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتا ہے، تو خوش حالی کا گھمنڈ اسے غافل و سرشار کر دیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے، اب میرے لیے کوئی کھٹکا نہیں رہا۔ حالانکہ نہیں جانتا، کتنا ہی خوش حال ہو جائے، اگر غفلت میں پڑ گیا ہے تو اس کے لیے کھٹکا ہی کھٹکا ہے۔ اس کی خوش حالیاں کبھی پائدار نہیں ہو سکتیں۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ اس کی کوششیں کامیاب نہیں ہوتیں، تو بجائے اس کے کہ اپنی طلب و سعی میں اور زیادہ سرگرم ہو جائے، یک قلم مایوس ہو جاتا ہے، اور سمجھنے لگتا ہے، اب میرے لیے کچھ نہیں رہا۔ حالانکہ نہیں جانتا کہ اس کے لیے سب کچھ ہے بشرطیکہ ہمت نہ ہارے، اور اللہ کے فضل و کرم سے مایوس نہ ہو۔

کتنے ہی انسان ہیں جنھوں نے خوش حالیاں پائیں، لیکن ان کی خوش حالیاں بدحالیوں سے بدل گئیں، کیونکہ غفلت میں پڑ گئے اور خوشحالی کی قدر نہ کی۔ کتنے ہی ناکام انسان ہیں جو بالآخر کامیاب ہوگئے کیونکہ ناکامیاں انہیں مایوس نہ کرسکیں، وہ کسی حال میں بھی اللہ کے فضل سے نا امید نہ ہوئے!

فی الحقیقت انسانی سعی و طلب کی ساری نامرادیاں انہی دو دروازوں سے آتی ہیں: غفلت اور مایوسی۔ کامرانیوں اور خوش حالیوں کے متوالے غفلت کے زہر سے مرتے ہیں، اور ناکامیوں اور بدحالیوں کے نامراد مایوسی کے زہر سے۔ جس فرد اور گروہ نے ان دو ہلاکتوں سے اپنی نگرانی کرلی، اُس نے فلاح و سعادت کی ساری دولتیں پالیں۔ اس کی کامرانیوں کے لیے کبھی زوال نہ ہوگا۔ اس کی سعی و طلب ضرور بار آور ہوکر رہے گی!

ٹھیک اسی طرح روحانیات میں بھی یہی قانون کام کر رہا ہے۔ دنیا کی طرح آخرت کی محرومیاں بھی انہی دو مہلک راہوں سے آتی ہیں۔ عابدوں اور پارساؤں کے لیے گھمنڈ میں موت ہے، اور گناہگاروں کے لیے مایوسی میں۔ جو نیک و پارسا ہو کر غرور میں مبتلا ہوگیا، اُس نے اپنی پارسائی کی ساری کمائی ضائع کردی۔ جو گناہوں کے بوجھ سے دب کر مایوسی میں پڑ گیا، اُس نے رحمت الٰہی کی چارہ سازیوں سے اپنے کو محروم کردیا۔ جس فرد نے ان دونوں ہلاکتوں سے اپنی نگہداشت کرلی، پارسائی کی کمائی پر مغرور نہ ہوا، نافرمانی و گناہ کی حالت میں مایوس نہ ہوا، اُس نے جاودانی سعادت پالی، اور اُس کے لیے نامرادی کا کوئی کھٹکا باقی نہ رہا!

تعبیر [illegible] علی شاکلتہ

(د) عربی میں "شِکل" بکسرے معنی ہیئت کے ہیں، اور "شَکل" بالنصب کے معنی طریقہ کے۔ چنانچہ ایسے راستے کو جس سے بہت سی راہیں اِدھر اُدھر نکلی ہوں طریق ذو شواکل کہتے ہیں، اور بول چال میں عام طور پر کہا جاتا ہے: لست علی شکلی ولا علی شاکلتی۔ پس آیت "کل یعمل علی شاکلتہ، فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا" (۸۴) کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں ہر انسان کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہے اور وہ اُسی کے مطابق کام کر رہا ہے۔ کوئی اس طرف جا رہا ہے، کوئی اُس طرف۔ کسی نے ایک ڈھنگ اختیار کیا ہے، کسی نے دوسرا۔ کسی کو ایک طرح کی بات بھاتی ہے، کسی کو دوسری طرح کی۔ اور اللہ جانتا ہے کون سیدھی راہ پر ہے۔ کون کامیاب ہونے والا ہے۔

بعض مفسرین نے "شاکلتہ" کو "جبلت" کے معنوں میں لیا ہے۔ یعنی ہر آدمی کی ایک فطری بناوٹ ہے اور وہ اُسی کے مطابق کام کرتا ہے۔ لیکن مندرجۂ صدر تصریح سے واضح ہوگیا کہ "شاکلۃ" کے معنی جبلت کے نہیں ہوسکتے۔ طریقہ اور مسلک کے ہیں۔

قل الروح من امر ربی

(ہ) ترمذی، نسائی اور مسند میں ہے کہ قریش نے علماء یہود سے سن کر یہ سوال کیا تھا کہ روح کیا ہے؟ اُس پر یہ آیت اُتری: ویسئلونک عن الروح، قل الروح من امر ربی (۸۵) تورات اور انجیل میں "روح" کا لفظ فرشتہ کے لیے بولا گیا ہے، اور قرآن نے فرشتہ اور وحی، دونوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ پس یہاں "الروح" سے مقصود جسم انسانی کی روح ہے، یا فرشتہ؟ اس بارے میں ائمہ تفسیر کی رائیں مختلف ہوئیں، لیکن اکثر مفسر اس طرف گئے ہیں کہ یہاں "الروح" سے مقصود جسم انسانی کی روح ہے۔ نہ کہ فرشتہ۔ بہرحال سوال دونوں کی نسبت ہوسکتا ہے، اور جواب بھی دونوں کے لیے مطابقت رکھتا ہے، اور آیت کی اصلی موعظت سوال کی تفصیل میں نہیں ہے جواب کی نوعیت میں ہے۔ فرمایا من امر ربی، اس معاملہ کے لیے جو کچھ بھی تمہیں بتلایا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کا حکم کام کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ تم پا نہیں سکتے۔ اور اس سے زیادہ پانے کی کاوش کیوں کرو؟ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ تمہارا دائرۂ علم نہایت محدود ہے۔ تم اپنے علم و ادراک میں ایک خاص حد سے آگے بڑھ نہیں سکتے۔ تم علم میں سے جو کچھ پا سکتے ہو، وہ اصل حقیقت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑا ہے۔ علم کے سمندر میں چند قطروں سے زیادہ نہیں، اور تمہیں اسی پر قناعت کرنا ہے!

انسان کے علم و ادراک کی حقیقت کیا ہے؟ یہی کہ اُسے حواس دیے گئے ہیں۔ انہی کے ذریعہ وہ محسوسات کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ لیکن خود محسوسات کے دائرہ کا کیا حال ہے؟ وہ کائنات ہستی کے سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ نہیں۔ پھر اگر انسان تمام عالم محسوسات کا علم حاصل بھی کرلے، تو اس کی مقدار حقیقت کے مقابلہ میں کیا ہوگی؟ ایک قطرہ کا علم، اس سے زیادہ نہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ انسان محسوسات

بھی کامل علم کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ وہ ہمیشہ اسی ایک قطرہ کے لیے پیاسا رہا اور آج تک پیاسا ہے!

اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ فرمایا من امر ربی۔ میرے پروردگار کے حکم سے۔ یعنے وہ پروردگار ہے، اور پروردگاری ہی چاہتی تھی کہ یہ جوہر

اچنبھوں کی فرمائش اور قرآن کا جواب

(۵) آیت (۸۹) سے (۹۶) تک جو بات بیان کی گئی ہے، وہ اگرچہ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے اور آئندہ بھی آئیگی لیکن یہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے، اور صاف صاف بیان سے ہے۔

قرآن نے جابجا منکرین حق کے عقائد و اقوال نقل کرکے دو خاص گمراہیوں پر توجہ دلائی ہے:

ایک یہ کہ لوگ سمجھتے ہیں، روحانی ہدایت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو محض ایک انسان کے ذریعہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔ ضروری ہے کہ انسانیت سے کوئی بالاتر ہستی ہو۔ اسی خیال نے دیوتاؤں کے ظہور اور ان کی عجائب آفرینیوں کا اعتقاد پیدا کیا۔ چنانچہ سورۂ اعراف اور ہود میں گزر چکا ہے کہ ہر داعی حق کے منکروں نے یہ بات ضرور کہی: ما نراک الا بشرا مثلنا تم تو ہماری ہی طرح کے ایک بشر ہو۔ پھر تمہارا یہ دعویٰ کیسے مان لیں۔ مشرکین مکہ بھی یہی کہتے تھے مال ھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق۔ یہ کیسا خدا کا فرستادہ ہے کہ ہماری طرح کھاتا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

دوسری یہ کہ سچائی کو خود سچائی میں نہیں ڈھونڈھتے۔ اچنبھوں اور کرتبوں کی ڈھونڈھ میں رہتے ہیں، اور سمجھتے ہیں، جو آدمی سب کو زیادہ عجیب قسم کی باتیں کر دکھائے، وہی سب سے زیادہ سچائی کی بات بتلانے والا ہے! گویا سچائی اس لیے سچائی نہ ہوئی کہ وہ سچائی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ عجیب عجیب طرح کے کرشمے اُس کے پیچھے کھڑے ہیں!

چنانچہ یہاں بھی فرمایا۔ ولقد صرفنا فی ھذا القرآن من کل مثل فابی اکثر الناس الا کفورا۔ ہم نے قرآن میں عبرت و موعظت کی تمام باتیں دہرا دہرا کر بیان کردیں، مگر یہ باتیں انہی کے دلوں کو پکڑ سکتی ہیں جنہیں سچائی کی طلب ہو۔ ورنہ اکثروں کا یہ حال ہے کہ انکار و سرکشی میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ پھر ان کی انکار و سرکشی کی باتیں نقل کی ہیں۔ فرمایا، وہ کہتے ہیں، ہم تو جبھی مانیں گے جب تم ہمیں اس اس طرح کی باتیں کر دکھاؤ۔ مثلاً مکہ کی ریگستانی زمین میں اچانک ایک نہر پھوٹ نکلے۔ آسمان کے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں۔ اللہ اور اس کے فرشتے ہمارے سامنے آجائیں۔ سونے کا ایک بنا بنایا محل نمودار ہو جائے۔ تم ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ دوڑو اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لاکر ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دو۔ پھر پیغمبر اسلام کو حکم دیا ہے کہ ان فرمائشوں کے جواب میں کہہ دو: سبحان ربی! ھل کنت الا بشرا رسولا! میرے پروردگار کے لیے پاکی ہو! میری حیثیت اس کے سوا کیا ہے کہ ایک آدمی ہوں خدا کا بھیجا ہوا!

دعویٰ اور دلیل کی مطابقت

سبحان اللہ قرآن کی معجزانہ بلاغت، کہ اس جملہ کے اندر وہ سارے دفتر آگئے جو انکار و سرکشی کی ان صداؤں کے جواب میں کہے جاسکتے تھے۔ ھل کنت الا بشرا رسولا۔ میں نے کچھ خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ آسمان کو زمین اور زمین کو آسمان بنا دینے والا ہوں اور دنیا کی ساری قوتیں میرے تصرف و اختیار میں ہیں۔ میرا دعویٰ جو کچھ ہے وہ تو یہ ہے کہ ایک آدمی ہوں پیام حق پہنچانے والا۔ پھر تم مجھ سے یہ فرمائشیں کیوں کرتے ہو؟ کیوں میرے لیے ضروری ہو کہ میں سونے کا محل دکھاؤں اور آسمان پر سیڑھی لگا کر چڑھ جاؤں!

اس پہلو پر غور کرو جس پر جواب کا اصلی زور پڑ رہا ہے۔

اگر ایک شخص نے کسی بات کا دعویٰ کیا ہے، تو ہم دیکھینگے، اُس کا دعویٰ کیا ہے، اور اُسی کے مطابق اُس سے دلیل مانگینگے۔ اگر اُس شخص نے دعویٰ کیا ہے کہ لوہار ہے۔ تو ہم دیکھینگے کہ وہ لوہے کا سامان بنا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص نے دعویٰ کیا ہے کہ طبیب ہے، تو ہم دیکھینگے کہ علاج میں ماہر ہے یا نہیں اور بیماروں کو اُس سے شفا ملتی ہے یا نہیں۔ یہ نہیں کرینگے کہ کسی نے دعویٰ تو کیا ہو طبابت کا اور ہم اُس سے دلیل وہ مانگنے لگیں جو ایک لوہار سے مانگنی چاہیے۔ یعنے کہیں، ہمیں لوہے کے شمشیر بنا کر دکھا دو۔ اگر ایسا کرینگے تو یہ صریح بے عقلی کی بات ہوگی۔ یہ بات، یعنے دعویٰ اور دلیل کی مطابقت، ایک ایسی عام اور قدرتی بات ہے کہ ہر آدمی خواہ کتنی ہی موٹی عقل کا ہو، خود بخود اُسے پالیتا ہے۔ جو نہی ایک آدمی کہیگا میں لوہار ہوں، وہ سنتے ہی فرمائش کردیگا کہ قفل بنا دو۔ کبھی اُس کی زبان سے یہ نہیں نکلیگا کہ شستی کا پیرہن بنا دو۔

اچھا، ایک انسان آتا ہے، اور کہتا ہے میں رسول ہوں، پیام حق پہنچانے والا ہوں۔ اب اُس کا دعویٰ کیا ہوا؟ یہ کہ خدا نے اُس پر سچائی کی راہ کھول دی ہے اور وہ دوسروں کو بھی اُسی راہ چلانا چاہتا ہے۔ جب دعویٰ یہ ہوا تو اسی کے مطابق دلیل بھی ہونی چاہیے۔ قدرتی طور پر اس کی دلیل یہی ہو سکتی ہے کہ دیکھا جائے، وہ سچائی کی راہ پر ہے یا نہیں، اور اس کی بتلائی ہوئی راہ پر چل کر سچائی ملتی ہے یا نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دعویٰ تو اس نے سچائی کی راہ دکھلانے کا کیا ہو، اور ہم دلیل یہ مانگنے لگیں کہ پہاڑ کو سونا بنا دے یا آسمان پر اُڑ کر چلا جائے!

طبیب کہتا ہے، میں بیماروں کو چنگا کر دیتا ہوں، اور ہم دیکھتے ہیں، اُس کے علاج سے بیمار چنگے ہوتے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح خدا کا رسول کہتا ہے، میں روح و دل کی بیماریاں دور کر دیتا ہوں۔ اور اگر ہم طالب حق ہیں تو ہمیں دیکھنا چاہیے، اُس کے علاج سے روح و دل کے بیماروں کو شفا ملتی ہے یا نہیں؟ اگر ہم طبیب سے کہیں، تیرا دعویٰ ہم جبھی مانینگے جب تو آسمان پر اُڑ کر چلا جائے، تو یقیناً وہ کہیگا، میں نے طبابت کا دعویٰ کیا ہے۔ آسمان پر اُڑنے کا نہیں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا مجھے اُڑنے کی بھی طاقت دیدے، لیکن طبابت کے دعوے کا اُس سے کیا واسطہ؟ اگر میرا دعویٰ پرکھنا چاہتے ہو، تو آؤ تمہارا علاج کر کے اپنی طبابت کا ثبوت دیدوں۔

ٹھیک یہی معنی اس جواب کے ہیں کہ ھل کنت الا بشرا رسولا۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دونگا؟ میرا دعویٰ تو صرف یہ ہے کہ پیام حق پہنچانے والا ہوں۔ پس اگر طالب حق ہو تو میرا پیام پرکھ لو۔ میرے پاس نسخۂ شفا ہے کہ نہیں؟ میں صراط مستقیم پر چلا دے سکتا ہوں کہ نہیں؟ میں سرتاسر ہدایت اور رحمت ہوں کہ نہیں!

پھر اس جواب میں صرف یہی نہیں کہا کہ میں رسول ہوں، بلکہ "بشرا" کے لفظ پر بھی زور دیا، کیونکہ جو بات منکروں کے دماغ میں کام کر رہی تھی، وہ یہی تھی کہ ایک آدمی جس میں کوئی مافوق انسانیت کرشمہ نہیں پایا جاتا، خدا کا فرستادہ کیسے ہو سکتا ہے اور کیوں ہم اس پر ایمان لائیں؟ فرمایا، میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ ایک آدمی ہوں۔ پیام حق پہنچانے والا آدمی۔ میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ فرشتہ ہوں، یا کوئی ماوراء انسانیت مخلوق ہوں۔

اس کے بعد فرمایا: وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جاءھم الھدیٰ، الا ان قالوا ابعث اللہ بشرا رسولا؟ "جب کبھی دنیا میں خدا کی ہدایت نمودار ہوئی، تو ہمیشہ اس خیال فاسد نے لوگوں کو قبولیتِ حق سے روکا کہ کہنے لگے "کیا خدا نے ایک آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے؟" بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک کھانے پینے والا آدمی خدا کا پیغمبر ہو جائے۔ پھر اس کا جواب دیا ہے کہ قل لو کان فی الارض ملائکۃ یمشون مطمئنین، لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا۔ اگر زمین میں انسانوں کی جگہ فرشتے بسے ہوتے، تو اُن کی ہدایت کے لیے فرشتے ہی آتے، لیکن یہاں تو انسان بستے ہیں اور انسانوں ہی کی ہدایت مقصود ہے، پس ان کی ہدایت کی صدائیں انسانوں ہی کی زبان سے نکلینگی۔ فرشتے نہیں اُتر سکتے، اور نہ کبھی فرشتے اُترے ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ منکروں کی یہ فرمائشیں حجت و برہان کے طلب میں نہ تھیں، بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس لیے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے سہارا پیدا کیا جائے۔ اور ہمیشہ راست بازوں کے مقابلہ میں نہ ماننے والوں کا ایسا ہی طرز عمل رہا ہے۔ جب کبھی سچائی کی کوئی بات کہی جاتی ہے، تو طلب حق رکھنے والی طبیعتیں اور کسی طرف نہیں جاتیں۔ خود اسی بات پر غور کرتی ہیں، اور جب سچائی پالیتی ہیں تو فوراً قبول کر لیتی ہیں۔ لیکن ایک سرکش اور ہٹ دھرم آدمی کبھی ایسا نہیں کرتا۔ وہ پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ کبھی ماننے والا نہیں، پھر کوشش کرتا ہے کہ اپنے نہ ماننے کے لیے کوئی بات بنائے، وہ طرح طرح کی باتیں ادھر اُدھر کی نکالیگا۔ کبھی ایک بات کبھی دوسری۔ پہلے کسی ایک بات پر زور دیگا کہ اس کا جواب کیا ہے؟ جب اُس کا جواب مل جائیگا تو کوئی دوسری بات ڈھونڈھ نکالیگا اور کہیگا، اس کا جواب تمہارے پاس کوئی نہیں۔ یہاں تک کہ اگر تم اُس کی ساری کٹ حجتیوں کا جواب دیدو، اور ساری شرطیں اور فرمائشیں پوری کر دو، جب بھی وہ کوئی نہ کوئی اور بات ڈھونڈھ نکالیگا، اور راست بازی کی راہ کبھی نہیں چلیگا۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا منکروں کی اس حالت کا ذکر کیا ہے۔ اور واضح کیا ہے کہ وہ کبھی ماننے والے نہیں، اگر ماننے والے ہوتے تو اس طرح کی روش کبھی اختیار نہ کرتے۔ سورۂ انعام کی آیت (۱۱۱) میں گزر چکا ہے: ولو اننا نزلنا الیھم الملائکۃ، وکلمھم الموتیٰ، وحشرنا علیھم کل شیء قبلا، ما کانوا لیؤمنوا، الا ان یشاء اللہ، ولکن اکثرھم یجھلون!

ان آیات میں اُن کے جو اقوال نقل کیے ہیں، اُن پر غور کرو، چاہا تھا زمین سے چشمہ جاری ہو، باغ اُگا دو، سونے کا محل لا دکھاؤ، خود اللہ اور اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرو، پھر کہا آسمان پر چڑھ جاؤ لیکن کیا آسمان پر چڑھ جانا کافی ہوگا؟ نہیں، اس پر بھی وہ ماننے والے نہیں، یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب اپنی بغل میں دبائے ہوئے واپس آؤ، اور پھر وہ لکھی ہوئی بھی ایسی ہو کہ وہ خود پڑھ کر جانچ سکیں۔ تب کہیں جا کر اُن کی شرط پوری ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کسی راست باز آدمی کی زبان سے ایسی باتیں نہیں نکل سکتیں اس کے معنی صرف یہی تھے کہ وہ کبھی ماننے والے نہیں۔

برہان رحمت اور حیات اُخروی

(۲) آیت (۱۰۰) میں حیات اُخروی پر رحمت الٰہی کی وسعت سے استدلال کیا ہے۔ اس کی حقیقت سمجھ لینی چاہیے۔

انسان کی زندگی کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، اللہ کی رحمت کا فیضان ہے۔ یہ رحمت ہے، جو چاہتی تھی کہ وجود ہو، بناؤ ہو، حسن ہو، کمال ہو، اور اس لیے سب کچھ ظہور میں آگیا۔

اچھا، اگر رحمت الٰہی کا یہ تقاضا ہوا کہ انسان کو زندگی ملی، تو کیا اسی رحمت کا مقتضیٰ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ زندگی صرف اتنی ہی نہ ہو، اس کے بعد بھی ہو، اور رحمت کا فیضان برابر جاری رہے؟ اُس کی رحمت ابدی ہے۔ پھر کیا اُس کا فیضان دائمی نہ ہوگا؟ اگر دائمی ہونا چاہیے، تو کیوں انسانی زندگی اس سے محروم رہ جائے؟ کیوں اس گوشہ میں کہ مخلوقات ارضی کا سب سے بلند گوشہ ہے، وہ ایک بہت ہی محدود اور حقیر حد سے آگے نہ بڑھے؟

انسان کی دنیوی زندگی کی مقدار کیا ہے؟ محض چند گنے ہوئے دنوں کی زندگی۔ پھر کیا خدا کی رحمت کا فیضان اتنا ہی تھا کہ چار دن کی زندگی پیدا کر دے۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے؟ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں دے سکتی تھی!

چنانچہ فرمایا۔ قل لو انتم تملکون خزائن رحمۃ ربی، اذا لامسکتم خشیۃ الانفاق! ان منکروں سے کہہ دو۔ اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضہ میں ہوتے تو ضرور تم ہاتھ روک روک کے خرچ کرتے کہ کہیں خرچ نہ ہو جائے لیکن وہ تمہارے قبضہ میں نہیں ہیں۔ وہ اُس کے قبضہ میں ہیں جس کی بخشش کی کوئی انتہا نہیں جس کے خزانے کبھی ختم ہونے والے نہیں جس کا فیضان دائمی اور لگاتار ہے!

اس مقام کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تفسیر فاتحہ کے مبحث "برہان فضل و رحمت" کا مطالعہ کر لیا جائے۔ تفسیروں میں یہ چیز نہیں ملیگی۔

وحدت معنی اور کثرت اسماء

(۳) آیت (۱۱۰) قل ادعوا "اللہ" او ادعوا "الرحمٰن" ایا ما تدعوا، فلہ الاسماء الحسنیٰ میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اور افسوس ہے کہ لوگوں کی نظر بحث و تفسیر میں اُس طرف نہیں گئی۔

دنیا میں انسان کے اکثر اختلافات محض لفظ و صورت کے اختلافات ہیں۔ وہ معنی پر نہیں لڑتا۔ لفظ پر لڑتا ہے۔ بسا اوقات ایک ہی حقیقت سب کے سامنے ہوتی ہے، لیکن چونکہ نام مختلف ہوتے ہیں، صورتیں مختلف ہوتی ہیں، اسلوب اور ڈھنگ مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ہر انسان دوسرے انسان سے لڑنے لگتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ یہ ساری لڑائی لفظ کی لڑائی ہے۔ معنی کی لڑائی نہیں ہے۔ مولانا روم نے چار دوستوں کی نزاع کا قصہ سنایا ہے جن میں سے ہر شخص انگور کا خواہشمند تھا لیکن چونکہ ایک آدمی "عنب" کہتا تھا، دوسرا "انگور" اس لیے تلواریں نیام سے نکل آئی تھیں۔

اگر دنیا صرف اتنی بات پالے، تو نوع انسانی کے دو تہائی اختلافات جنہوں نے دائمی نزاعوں اور جنگوں کی صورت اختیار کر لی ہے، ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

اس آیت میں اور اس کی ہم معنیٰ آیات میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مشرکین عرب "اللہ" کے لفظ سے آشنا تھے، کیونکہ یہ پروردگار عالم کے لیے بطور اسم ذات کے قدیم سے مستعمل رہا ہے۔ لیکن دوسرے ناموں سے آشنا نہ تھے جن کا قرآن نے اس کی صفتوں کے لیے اعلان کیا تھا، مثلاً "الرحمٰن"۔ رحمٰن کا لفظ بولا جاتا تھا، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اسے اللہ کے لیے بولنا چاہیے۔ پس جب ایسی

ہا۔ سنتے تو متعجب ہوتے اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے۔ قرآن کہتا ہے، تم "اللہ" کہہ کر پکارو یا "الرحمٰن" کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، پکارنا اسی کے لیے ہے، اور ناموں کے تعدد سے حقیقت متعدد نہیں ہو جا سکتی۔ اُس کا نام ایک ہی نہیں بہت سے نام ہیں، لیکن جتنے نام ہیں حسن و خوبی کے نام ہیں، کیونکہ وہ سرتاسر حسن و کمال اور یکتائی و جلال ہے۔ تم ان ناموں میں سے کوئی نام بھی لو، تمہارا مقصود و مطلوب وہی ہوگا۔

عباراتنا شتّٰی وحسنک واحد
وکلٌّ الٰی ذاک الجمال یشیرُ!

سُورۃ الکہف (۱۸)

مکی۔ ۱۱۰۔ آیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتب و لم یجعل لہ عوجا ۝ قیما لینذر باسا شدیدا من لدنہ و یبشر المؤمنین الذین یعملون الصلحت ان لہم اجرا حسنا ۝ ماکثین فیہ ابدا ۝ و ینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولدا ۝ ما لہم بہ من علم و لا لابائہم کبرت کلمۃ تخرج من افواہہم ان یقولون الا کذبا ۝ فلعلک باخع نفسک علی اثارہم ان لم یؤمنوا بہذا الحدیث اسفا ۝ انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لہا لنبلوہم ایہم احسن عملا ۝

ساری ستائشیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر الکتاب اُتاری (یعنے قرآن اُتارا) اور اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہ رکھی۔ بالکل سیدھی بات! (ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک!) اور اس لیے اُتاری کہ لوگوں کو خبردار کردے اللہ کی جانب سے ایک سخت ہولناکی (اُن پر) آسکتی ہے، اور مومنوں کو جو اچھے اچھے کام کرتے ہیں، خوش خبری دیدے کہ یقیناً اُن کے لیے بڑی ہی خوبی کا اجر ہے ہمیشہ اُس میں خوش حال رہینگے:

نیز اُن لوگوں کو متنبہ کردے جنہوں نے (ایسی سخت بات مُنہ سے نکالی کہ) کہا، اللہ بھی اولاد رکھتا ہے! اس بارے میں انہیں کوئی علم نہیں، نہ اُن کے باپ دادوں کے پاس کوئی علم تھا کیسی سخت بات ہے جو اِن کی زبانوں سے نکلتی ہے! یہ کچھ نہیں کہتے مگر سرتا سر جھوٹ!

(اے پیغمبر!) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے پیچھے مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے (حالانکہ یہ ماننے والے نہیں)

روئے زمین میں جو کچھ بھی ہے، اُسے ہم نے زمین کی خوشنمائی کا موجب بنایا ہے۔ اور اس لیے بنایا ہے کہ لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں، کون ایسا ہے جس کے کام سب سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔

(۱) سچائی کی یہ دنیا کی عالمگیر تعبیر ہے کہ وہ سیدھی بات ہو۔ اس میں ٹیڑھ پن نہیں۔
جس بات میں کجی ہو، پیچ و خم ہو، اُلجھی ہوئی ہو، وہ سچائی کی بات نہیں ہو سکتی

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سعادت کی راہ کو صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا، اور ہر جگہ وہ اپنا وصف یہ بیان کرتا ہے کہ اس میں کوئی بات بھی کجی کی بات نہیں ہے۔ وہ اپنی ہر بات میں دنیا کی زیادہ سے زیادہ سیدھی بات ہے!

چنانچہ اس سورت کی ابتدا میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد اُس کے نزول کا مقصد واضح کیا کہ "تبشیر" اور "تنذیر" ہے۔ کیونکہ ہدایت وحی جب کبھی ظاہر ہوئی ہے، اسی لیے ظاہر ہوئی ہے کہ ایمان و عمل کے نتائج کی بشارت دے اور بدعملی کے نتائج سے متنبہ کردے۔

لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ۝ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِیْمِ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْیَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ

اور پھر یہ ہم ہی ہیں کہ جو کچھ زمین پر ہے، اُسے نابود کر کے چٹیل میدان بنا دیتے ہیں۔

(اے پیغمبر!) کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب نشانی تھے!

جب ایسا ہوا تھا کہ چند جوان غار میں جا بیٹھے تھے، اور انہوں نے دعا کی تھی "پروردگار! تیرے حضور سے ہم پر رحمت ہو۔ اور تو ہمارے اس کام کے لیے کامیابی کا سامان مہیا کر دے!" پس غار میں کئی برسوں تک ہم نے ان کے کان (دنیا کی طرف سے) بند کر رکھے۔ پھر انہیں اٹھا کھڑا کیا تا کہ واضح ہو جائے، دونوں جماعتوں میں سے کون ہے، جو گزری ہوئی مدت کا زیادہ بہتر طریقہ پر احاطہ کر سکتا ہے۔

(اے پیغمبر!) ہم ان لوگوں کی خبر ٹھیک ٹھیک تیرے آگے بیان کر دیتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے۔ ہم نے انہیں ہدایت میں زیادہ مضبوط کر دیا، اور ان کے دلوں کی (صبر و استقامت میں) بندش کر دی۔ وہ جب راہِ حق میں کھڑے ہوئے، تو انہوں نے (صاف صاف) کہہ دیا "ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکارنے والے نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں، تو یہ بڑی ہی بے جا بات ہوگی"

"یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جو اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کو پکڑے بیٹھے ہیں۔ وہ اگر معبود ہیں تو کیوں اس کے

(۱) یہ سورت مکی عہد کی آخری سورتوں میں سے ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ منکروں کی سرکشی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی، اور پیغمبر اسلام کا قلب مبارک لوگوں کی شقاوت و محرومی کے غم سے بڑا ہی دلگیر ہو رہا تھا۔ ان کے جوش دعوت و اصلاح کا یہ حال تھا کہ چاہتے تھے، ہدایت گھونٹ بنا کر پلا دیں۔ اور منکروں کا یہ حال تھا کہ سیدھی سے سیدھی بات بھی ان کے دلوں کو نہیں پکڑتی تھی۔

انبیاء کرام ہدایت و اصلاح کے صرف طالب ہی نہیں ہوتے۔ عاشق ہوتے ہیں۔ انسان کی گمراہی ان کے دلوں کا ناسور ہوتی ہے اور انسان کی ہدایت کا جوش ان کے دل کے ایک ایک ریشہ کا عشق۔ اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی غمگینی نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان سچائی سے منہ موڑ لے۔ اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی شادمانی نہیں ہو سکتی کہ ایک گمراہ قدم راہ راست پر آ جائے!

قرآن میں اس صورتِ حال کی جا بجا شہادتیں ملتی ہیں۔ یہاں آیت (۶) میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی یہ گمراہی عجب نہیں تجھے شدتِ غم سے بے حال کر دے۔ لیکن جو گمراہی میں ڈوب چکے ہیں، وہ کبھی ابھرنے والے نہیں۔ پھر اس کے بعد آیت (۷) میں واضح کیا ہے کہ قانونِ الٰہی اس بارے میں ایسا ہی واقع ہوا ہے۔ یہ دنیا آزمائش گاہِ عمل ہے۔ یہاں جو چیز کارآمد نہیں ہوتی، چھانٹ دی جاتی ہے۔ پس جن لوگوں نے اپنی ہستی خراب کر دی ہے، ضروری ہے کہ وہ چھانٹ دیے جائیں۔ ان کی محرومی پر غم کرنا لاحاصل ہے۔

لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝ وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا ۝ وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ ۚ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا

۱۵ ۱۶ ۱۷ ع ۵

لیے کوئی روشن دلیل پیش نہیں کرتے ! (ان کے پاس تو کوئی دلیل نہیں) پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ کہہ کر بہتان باندھے ؟" ۱۵

(پھر وہ آپس میں کہنے لگے کہ) جب ہم نے ان لوگوں سے اور اُن سے جنہیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کنارہ کشی کر لی، تو چاہیے کہ غار میں چل کر پناہ لیں۔ ہمارا پروردگار اپنی رحمت کا سایہ ہم پر پھیلائیگا، اور ہمارے اس معاملہ کے لیے (سامنے) سروسامان مہیا کر دیگا" ۱۶

اور وہ جس غار میں جا کر بیٹھے، وہ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ جب سورج نکلے تو تم دیکھو کہ اُن کے دہنے جانب سے ہٹا ہوا رہتا ہے، اور جب ڈوبے تو بائیں طرف کترا کر نکل جاتا ہے (یعنے کسی حال میں بھی اس کی شعاعیں اندر نہیں پہنچتیں) اور وہ اس کے اندر ایک کشادہ جگہ میں پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے (کہ اُنھوں نے حق کی خاطر دنیا اور دنیا کے سارے علاقے چھوڑ دیے) جس کسی پر وہ (کامیابی کی) راہ کھول دے، تو وہی راہ پر ہے، اور جس پر گم کر دے، تو تم کسی کو اُس کا کارساز اُس کا راہ دکھانے والا نہ پاؤگے ! ۱۷

اور تم انہیں دیکھو تو خیال کرو یہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ ہم انہیں دہنے بائیں پلٹتے رہتے ہیں (یعنے اُن کی کروٹ بدلتی رہتی ہے) اور اُن کا کتا بیٹھک کی جگہ اپنے دونوں بازو پھیلائے بیٹھا ہے۔ اگر تم اُنہیں جھانک کر دیکھو تو اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو۔

(۳۳) آیت (۹) سے اصحاب کہف کی سرگزشت شروع ہوئی اس کی تشریح سورت کے آخری نوٹ میں ملیگی۔

فرمایا یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کیا تھا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا چھپے تھے۔ کئی برسوں تک یہ اُس میں پوشیدہ رہے، آبادی سے ان کا کوئی علاقہ نہیں رہا۔ زندگی کی کوئی صدا اُن کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ پھر وہ اُٹھائے گئے۔ یعنے ظاہر ہوئے، اور یہ سارا معاملہ اس لیے ہوا کہ واضح ہو جائے دو نوں جماعتوں میں سے کونسی جماعت ایسی تھی جو وقت کے واقعات اور اُن کے نتائج کا بہتر اندازہ کر سکتی تھی۔

دو جماعتوں سے مقصود اصحاب کہف اور اُن کی قوم و ملک کے لوگ ہیں۔

یہ گویا اس تمام معاملہ کا ماحصل ہے۔ اس کے بعد اس کی ضروری تفصیلات آتی ہیں۔ چنانچہ آیت (۱۳) میں فرمایا نحن نقص علیك نبأهم بالحق۔

(۱) ایک گمراہ اور ظالم قوم سے چند حق پرست نوجوانوں کا کنارہ کشی کر لینا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پوشیدہ ہو جانا۔ اُن کی قوم چاہتی تھی، اُنہیں سنگسار کر دے، یا جبراً اپنے دین میں واپس لے آئے۔ اُنھوں نے دنیا چھوڑ دی مگر حق سے مُنہ نہ موڑا۔

۱۸ وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ○ وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ

۱۹ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ○ إِنَّهُمْ إِن

۲۰ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَن تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ○ وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ ۖ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا ۖ رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ۚ قَالَ

۱۸ تم پر (ان کے منظر سے) دہشت چھا جائے!

(ب) وہ جب غار میں اُٹھے تو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ کتنے عرصہ تک یہاں رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنا ایک آدمی شہر میں کھانا لانے کے لیے بھیجا، اور کوشش کی کہ کسی کو خبر نہ ہو، لیکن حکمت الٰہی کا فیصلہ دوسرا تھا۔ خبر ہو گئی، اور یہ معاملہ لوگوں کے لیے تذکیر و عبرت کا موجب ہوا۔

اور (دیکھو) اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے اُنھیں پھر اُٹھا کھڑا کیا تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کریں ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا "ہم یہاں کتنی دیر تک رہے ہوں گے؟" سب نے کہا "ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ" پھر (جب ٹھیک ٹھیک مدت معلوم نہ کر سکے تو) بولے "ہمارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کتنی دیر تک یہاں پڑے رہے ہیں۔ اچھا ایک آدمی کو یہ سکہ[1] دے کر شہر میں بھیجو۔ جا کر دیکھے، کس کے یہاں اچھا کھانا ملتا ہے،

۱۹ اور جہاں کہیں سے ملے تھوڑی بہت غذا لے آئے۔ اور ہاں، چپکے سے لائے۔ کسی کو ہماری خبر نہ ہونے پائے۔ اگر لوگوں نے خبر پا لی، تو وہ چھوڑنے والے نہیں۔ یا تو سنگسار کریں گے، یا مجبور کریں گے کہ پھر اُن کے دین میں واپس

۲۰ چلے جائیں، اگر ایسا ہوا تو پھر کبھی تم فلاح نہ پا سکو گے"

اور (پھر دیکھو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو اُن کے حال سے واقف کر دیا۔ (ان کی بات پوشیدہ نہ رہ سکی) اور اس لیے واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں، اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں!

اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے لگے، ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے۔ لوگوں نے کہا "اس غار پر ایک عمارت بنا دو (کہ یادگار رہے، اس سے زیادہ اس معاملہ کے پیچھے نہ پڑو) ان پر جو کچھ گزری، ان کا پروردگار ہی اُسے بہتر جانتا ہے" تب اُن لوگوں نے

(ج) جس قوم کے ظلم سے عاجز ہو کر اُنھوں نے غار میں پناہ لی تھی، مری اُنکی اس درجہ معتقد ہوئی کہ اُنکے مرقد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا۔
(د) اس واقعہ کی تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں۔ طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ بعض کہتے ہیں، وہ تین آدمی تھے۔ بعض کہتے ہیں،

[1] قرآن میں "ورق" کا لفظ ہے۔ "ورق" چاندی کے ٹکڑے کو کہتے ہیں، خواہ مسکوک ہو خواہ مسکوک نہ ہو، لیکن قرینہ کہہ رہا ہے کہ مقصود سکہ تھا، اس لیے ہم نے ترجمہ میں یہی لفظ اختیار کیا۔

۲۱ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ۝ سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ
سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ
۲۲ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ۝ ع ۳ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ
۲۳ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي
۲۴-۲۵ لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ۝ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ۝ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا

بعض کہتے ہیں سات تھے۔ مگر یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے، اور غور کرنے کی بات یہ نہیں ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی! دیکھنا چاہیے کہ ان کی حق پرستی کا کیا حال تھا!
آیت (۲۲) میں فرمایا، جو کھلی ہوئی اور پکی بات ہے وہ تذکیر و عبرت کے لیے کفایت کرتی ہے۔ اس سے زیادہ کاوش میں نہ پڑو اور نہ بحث و نزاع کرو، اور نہ کبھی کسی ایسی بات کے لیے جس کا علم اللہ ہی کو ہے زور دے کر کہو کہ میں ضرور ایسا کر کے رہونگا یہ اللہ کے ہاتھ ہے کہ جتنی باتیں چاہے، وحی کے ذریعہ تبلادے۔ غیبی امور میں انسان کی کاوشیں کچھ کام نہیں دے سکتیں۔
(۵) آیت (۲۳) میں اس طرف اشارہ ہے کہ عنقریب ایسا ہی معاملہ تمہیں بھی پیش آنے والا ہے یعنے اپنی قوم سے راہ حق میں کنارہ کشی کروگے اور غار ثور میں کئی دن تک مقیم رہوگے پھر تم پر فتح و کامرانی کی ایسی راہ کھولی جائیگی جو اس معاملہ سے بھی کہیں عظیم تر ہوگی۔

۲۱ کہ معاملات پر غالب آگئے تھے، کہا "ٹھیک ہے۔ ہم ضرور ان کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائینگے"
کچھ لوگ کہینگے، غار والے تین آدمی تھے۔ چوتھا اُن کا کتا تھا۔ کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں نہیں پانچ تھے، چھٹا اُن کا کتا تھا۔ یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں، سات تھے۔ آٹھواں اُن کا کُتا۔ (اے پیغمبر!) کہدے "اُن کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے، کیونکہ اُن کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے" (اور جب صورتِ حال یہ ہے) تو لوگوں سے اس بارے میں بحث و نزاع نہ کر۔ مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو۔ (یعنے باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کتنے آدمی تھے، کتنے دنوں تک رہے تھے)
۲۲ اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر۔
۲۳ اور کوئی بات ہو، مگر کبھی ایسا نہ کہو "میں کل اُسے ضرور کر کے رہونگا" اِلّا یہ کہ سمجھ لو، ہوگا وہی جو اللہ چاہیگا

(۴) آیت (۲۷) میں فرمایا اللہ کی کتاب کی تلاوت میں مشغول رہو۔ کلمات وحی نے جن باتوں کا اعلان کیا ہے اُنہیں کوئی بدل نہیں سکتا، اور انقلاب حال کا وقت اب دور نہیں ہے، جو ماننے والے نہیں، اُن کی فکر نہ کرو، جو ایمان لائے ہیں اور شب و روز اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، وہی تمہارے لیے بہت ہیں۔ انہی میں جی لگاؤ۔ یہی دعوتِ حق کے چند بیج ہیں جو عنقریب ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرلینگے۔

اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کرلو تم کہو "اُمید ہے، میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دیگا" ۲۴
اور (کہتے ہیں) وہ غار میں تین سو برس تک رہے،
۲۵ اور لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیے ہیں (اے پیغمبر!) تو کہدے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، وہ کتنی مدت تک رہے،

لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ
اَحَدًا ○ وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ
عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ
اَمْرُهٗ فُرُطًا ○ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ
نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ
وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ○ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ○ اُولٰٓئِكَ
لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا

وہ آسمان و زمین کی ساری پوشیدہ باتیں جاننے والا ہے۔ بڑا ہی دیکھنے والا، بڑا ہی سننے والا! اُس کے سوا لوگوں کا کوئی کارساز نہیں، اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے! ٢٦

آیت (۲۸) میں مزید تشریح کی۔ فرمایا، آخری اعلان کردو کہ خدا کی سچائی سب کے سامنے آگئی۔ اب جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے نہ مانے۔ جو مانینگے، اُن کے لیے ان کا اجر ہوگا۔ جو نہیں مانینگے، اُن کے لیے اُن کا عذاب!

اور (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی کتاب جو تجھ پر وحی کی گئی ہے، اُس کی تلاوت میں لگا رہ۔ اللہ کی باتیں کوئی بدل نہیں سکتا، اور تجھے اُس کے سوا کوئی پناہ کا سہارا ملنے والا نہیں! ٢٧

اور جو لوگ صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں اور اُس کی محبت میں سرشار ہیں، تو اُنہی کی صحبت پر اپنے جی کو قانع کرلو۔ ان کی طرف سے کبھی تمہاری نگاہ نہ پھرے کہ دنیوی زندگی کی رونقیں ڈھونڈھنے لگو۔ جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا (یعنے ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانونِ نتائج کے مطابق جس کا دل غافل ہوگیا) اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے پڑگیا، تو ایسے آدمی کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ اُس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔ ٢٨

اور کہہ دو "یہ سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے۔ اب جو چاہے، مانے۔ جو چاہے، نہ مانے۔" ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ طیار کر رکھی ہے جس کی چادریں چاروں طرف سے اُنہیں گھیر لینگی۔ وہ (پانی کے لیے) فریاد کرینگے، تو ان کی فریاد کے جواب میں ایسا پانی ملیگا جیسے پگھلا ہوا سیسہ ہو! وہ اُن کے منہ (گرمی سے) پکادیگا۔ تو دیکھو، پینے کی کیا ہی بُری چیز اُنہیں ملی، اور بیٹھنے کی کیا ہی بُری جگہ! ٢٩

مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے، تو (ان کے لیے کوئی اندیشہ نہیں) جس نے اچھے کام کیے ہوں، ہم کبھی اُس کا اجر ضائع نہیں کرتے! ٣٠

یہ لوگ ہیں، جن کے لیے ہمیشگی کے باغ ہونگے۔ اور باغوں کے تلے نہریں بہہ رہی ہونگی۔ یہ (بادشاہوں

مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝ ٣١ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ ٣٢ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ ٣٣ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝ ٣٤ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۝ ٣٥ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ ٣٦

کی طرح) سونے کے کنگن پہنے ہوئے، سبز ریشم کے باریک اور دبیز کپڑوں سے آراستہ مسندوں پر تکیہ لگائے، بیٹھے ہونگے! تو کیا ہی اچھا ان کا ثواب ہوا، اور کیا ہی اچھی انہوں نے جگہ پائی! ٣١

اور (اے پیغمبر!) ان لوگوں کو ایک مثال سنا دو۔ دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ مہیا کر دیے۔ گرداگرد کھجور کے درختوں کا احاطہ تھا۔ بیچ کی زمین میں کھیتی تھی۔ ٣٢ پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے۔ پیداوار میں کسی طرح کی بھی کمی نہ ہوئی ہم نے ان کے درمیان (آب پاشی کے لیے) ایک نہر جاری کر دی تھی۔ ٣٣ نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی دولت مند ہو گیا۔

تب ایک دن (گھمنڈ میں آکر) اپنے دوست سے (کہ جسے یہ خوشحالیاں میسر نہ تھیں) باتیں کرتے کرتے بول اٹھا، "دیکھو! میں تم سے زیادہ مالدار ہوں، اور میرا جتھا بھی بڑا طاقتور جتھا ہے" ٣٤

پھر وہ (یہ باتیں کرتے ہوئے) اپنے باغ میں گیا، اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے۔ ٣٥ مجھے توقع نہیں کہ (قیامت کی) گھڑی برپا ہو۔ اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لیے کیا کھٹکا ہے؟) مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانا ملیگا۔" ٣٦

(٥) پہلے فرمایا تھا جس کا جی چاہے، مانے جس کا جی چاہے، نہ مانے۔ جو نہ مانینگے، انہیں اپنی بدعملیوں کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ جو مانینگے ان کے لیے ان کی نیک عملیوں کا اجر ہے۔ پھر اخروی عذاب و ثواب کا نقشہ کھینچا تھا کہ منکروں کے لیے آگ کی جلن ہوگی۔ مومنوں کے لیے ہمیشگی کے باغ۔ اب یہ حقیقت واضح کی ہے کہ آخرت کی طرح دنیا میں بھی منکرین دعوت کو محرومیاں ملنے والی ہیں۔ وہ اپنی موجودہ خوشحالیوں پر مغرور نہ ہوں اور نہ مومن اپنی موجودہ بے سروسامانیاں دیکھ کر دل تنگ ہو جائیں۔ دنیا کی خوشحالیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ جب مٹنے پر آتی ہیں، تو لمحوں میں مٹ جاتی ہیں، اور انسان کی کوئی سعی و تدبیر انہیں بچا نہیں سکتی۔

چنانچہ اس حقیقت کے لیے ایک مثال بیان کی۔ فرض کرو، دو آدمی تھے۔ ایک کو سب کچھ میسر تھا۔ دوسرے کو کچھ میسر نہ تھا۔ پہلا گھمنڈ میں آکر دوسرے کو حقیر سمجھتا، اور کہتا میں تم سے زیادہ خوش حال ہوں اور میری خوشحالی کبھی بگڑنے والی نہیں۔ دوسرا اسے سمجھاتا کہ دنیا کی خوش حالیوں پر مغرور نہ ہو۔ کون جانتا ہے، پل کے پل میں کیا سے کیا ہو جائے؟ چنانچہ ایک دن کیا ہوا کہ اس کے سارے باغ جن کی شادابیوں پر اسے ناز تھا، اچانک اجڑ گئے، اور وہ اپنی نامرادی پر کف افسوس ملتا رہ گیا!

اس مثال میں خوشحال آدمی سے مقصود رؤسائے مکہ ہیں، اور دوسرے آدمی سے مقصود مومنوں کی جماعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوشحالیوں کے لیے باغوں کا تصور پیدا کیا گیا۔ عرب میں اس سے بڑھ کر تمول و خوشحالی کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ شام کے نخلستانوں کی طرح باغ ہوں۔ گرداگرد کھجور کے درختوں کا احاطہ ہو، وسط میں قدرتی نہر، نہر کے دونوں طرف لہلہاتی ہوئی کھیتیاں۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا
لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ○ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ
اِلَّا بِاللّٰهِ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ○ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ
عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ○ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ○
وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ
لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ○ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ○ هُنَالِكَ
الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ○ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ

یہ سن کر اس کے دوست نے کہا، اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا "کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا، اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا؟ لیکن میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے، اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اس کی شادابیاں دیکھیں) تو کیوں تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اس کی مدد بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا! اور یہ جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے کہ میں تم سے مال اور اولاد کمتر رکھتا ہوں، تو (اس پر مغرور نہ ہو) کیا عجب ہے، میرا پروردگار تمہارے اس باغ سے بھی بہتر (باغ) مجھے دیدے، اور تمہارے باغ پر آسمان سے کوئی ایسی اندازہ کی ہوئی بات اتار دے، کہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا پھر (بربادی کی کوئی اور ناگہانی صورت نکل آئے مثلاً) اس کی نہر کا پانی بالکل نیچے اتر جائے، اور تم کسی طرح بھی اس تک نہ پہنچ سکو"

اور پھر (دیکھو) ایسا ہی ہوا کہ اس کی دولت (بربادی کے) گھیرے میں آگئی۔ وہ ہاتھ مل مل کر افسوس کرنے لگا کہ ان باغوں کی درستگی پر میں نے کیا کچھ خرچ کیا تھا وہ سب برباد گیا! اور باغوں کا یہ حال ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر ہو گئیں۔ اب وہ کہتا ہے، اے کاش! میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا! اور دیکھو کوئی جتھا نہ ہوا کہ اللہ کے سوا اس کی مدد کرتا، اور نہ خود اس نے یہ طاقت پائی کہ بربادی سے جیت سکتا!

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا ہے اور اسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے!

اور (اے پیغمبر!) انہیں دنیا کی زندگی کی مثال سنا دو۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے (زمین کی روئیدگی کا معاملہ) آسمان سے ہم نے پانی برسایا، اور زمین کی روئیدگی اس سے مل جل کر ابھر آئی اور خوب پھلی

(۶) پھر جو کچھ بھی ہو، دنیا کی یہ عیش حالیاں ہیں کیا؟ محض چار گھڑی کی دھوپ! اس سے زیادہ انہیں قرار نہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں!

دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے زمین کی روئیدگی، آسمان سے پانی برستا ہے، اور طرح طرح کی سبزیوں اور ریالیوں سے زمین کا

نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝ الْمَالُ وَ (۴۵)
الْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا ۝ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ (۴۶)
الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝ وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ (۴۷)
صَفًّا لَّقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّن نَّجْعَلَ لَكُم مَّوْعِدًا ۝ وَوُضِعَ الْكِتَابُ (۴۸)
فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ

گوشہ گوشہ بہشت زار ہو جاتا ہے جس طرف نگاہ اٹھاؤ، پھولوں کا حسن و جمال ہے یا دانوں اور پھلوں کا فیضان و نوال! لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ وہی کھیت جن کا ایک ایک درخت زندگی کا سرمایہ اور بخشش و نوال کا کارخانہ تھا، اچانک کس عالم میں نظر آنے لگتے ہیں؟ هشيما تذروه الرياح! بھوسے کے ذرّے جنہیں ہوا کے جھونکے اڑا کے منتشر کر دیتے ہیں! نہ کوئی انہیں بچانا چاہتا ہے، نہ وہ کسی مصرف کے ہوتے ہیں۔ بہت کام دینگے، تو چولہے میں جلنے کے لیے ڈال دیے جائینگے!

انسان کی دنیوی زندگی اور اس کی جد و جہد کی یہ کیسی جامع مثال ہے! جس پہلو سے بھی دیکھوگے، اس سے بہتر مثال نہیں ملیگی:

(ا) دنیوی زندگی کی دلفریبیاں جب نکھرتی ہیں، تو ٹھیک ٹھیک ان کا ایسا ہی حال ہوتا ہے۔

(ب) لیکن عارضی ہوتی ہیں۔ پائدار نہیں۔ قدرت نے جو وقت مقرر کر رکھا ہے جونہی وہ پورا ہوا، پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا:

(ج) زمین ایک ہے، پانی بھی ایک ہی طرح کا ہے، روئیدگی بھی ایک ہی طرح پر ہوتی ہے مگر پھل یکساں نہیں۔ یہی حال دنیوی زندگی کا ہے۔ زندگی ایک طرح کی ہے، مگر ہر زندگی کا پھل یکساں نہیں۔ فطرت کی بخشش سب کی یکساں طور پر رکھوالی کرتی ہے، مگر سب ایک طرح کا پھل نہیں لاتے۔ کوئی اچھا ہوتا ہے، کوئی ناقص، کوئی بالکل نکما!

(د) عذاب و ثواب اور سعادت و محرومی کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ تم زمین میں کاشت کرتے ہو، لیکن کیوں کرتے ہو؟ دانے اور پھل کے لیے۔ پتوں اور شاخوں کے لیے نہیں۔ جب فصل پکتی ہے تو دانے لے لیتے ہو جو ہی تمہارے لیے نفع ہے۔ باقی سب کچھ چھانٹ دیتے ہو جس میں نفع نہیں۔ یہی حال دنیوی زندگی کا بھی ہے۔ فطرت نے وجود انسانی کی کاشت کی ہے، اور اس لیے کی ہے کہ ایکم احسن عملاً کون درخت ہے جو اچھے عمل کا پھل لاتا ہے۔ پس وہ پھل لے لیتی ہے باقی

پھولی پھر (کیا ہوا؟ یہ کہ) سب کچھ سوکھ کر چورا چورا ہو گیا۔ ہوا کے جھونکے اسے اڑا کے منتشر کر رہے ہیں! اور کونسی بات ہے جس کے کرنے پر اللہ قادر نہیں؟

مال و دولت اور آل اولاد دنیوی زندگی کی دلفریبیاں ہیں، (مگر چند روزہ، ناپائدار) اور جو نیکیاں باقی رہنے والی ہیں، تو وہی تمہارے پروردگار کے نزدیک باعتبار ثواب کے بہتر ہیں، اور وہی ہیں جن کے نتائج سے بہتر امید رکھی جا سکتی ہے! (۴۶)

اور (دیکھو وہ آنے والا) دن، جب ہم پہاڑوں کو چلا دینگے، اور زمین کو تم دیکھوگے کہ اپنی اصلی حالت میں ابھر آئی ہے، اور (اس وقت) ہم تمام انسانوں کو (اپنے حضور) اکٹھا کر دینگے۔ کوئی نہ ہوگا جسے چھوڑ دیا ہو! (۴۷)

اور ان کی صفیں (ایک کے بعد ایک) تمہارے پروردگار کے سامنے پیش ہونگی۔ (تب ان سے کہا جائیگا) "جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، اسی طرح تمہیں آج ہمارے سامنے حاضر ہونا پڑا۔ مگر تم نے خیال کیا تھا، ہم نے تمہارے لیے اس کا کوئی وقت نہیں ٹھہرایا ہے!" (۴۸)

اور (اس وقت) نوشتے لائے جائیں گے۔ تو تم دیکھوگے جو کچھ ان میں لکھا ہے، اس سے مجرم ہراساں ہو رہے ہیں۔

وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ۗ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۚ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝ مَا أَشْهَدْتُهُمْ خَلْقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا ۝ وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَائِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَوْبِقًا ۝ وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا ۝
وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ

جو کچھ جاتا ہے، بھاٹ دیتی ہے۔ تم سوکھی شاخوں اور پتوں کو کیا کرتے ہو؟ چولھے میں جلاتے ہو۔ اس نے بھی ایک چولھا گرم کر رکھا ہے اُسی کا نام دوزخ ہے!

وہ بول اُٹھینگے "افسوس ہم پر! یہ کیسا نوشتہ ہے کہ کوئی بات چھوٹی ہوئی نہیں۔ بڑی ہو یا چھوٹی، سب کو اس نے ضبط کرلیا ہے!" غرضکہ جو کچھ اُنہوں نے (دنیا میں) کیا تھا، سب اپنے سامنے موجود پائینگے، اور تمہارا پروردگار کسی پر زیادتی نہیں کرتا (جو جس نے کیا ہی، ٹھیک ٹھیک وہی اُس کے آگے آئیگا) ۴۹

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے آگے جھک جاؤ" اور سب جھک گئے تھے، مگر ابلیس نہیں جھکا تھا۔ وہ جن میں سے تھا پس اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہوگیا۔ پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر (کہ تمہارا پروردگار ہوں) اُسے اور اُس کی نسل کو اپنا کارساز بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ تو دیکھو ظلم کرنے والوں کے لیے کیا ہی بُری تبدیلی ہوئی! ۵۰

میں نے انہیں اپنے ساتھ شریک نہیں کیا تھا جب آسمان و زمین کو پیدا کیا، اور نہ اس وقت وہ شریک ہوئے جب خود انہیں پیدا کیا (اور جب وہ خود مخلوق ہیں تو اپنی خلقت کے وقت کیسے موجود ہوسکتے تھے؟) میں ایسا نہ تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بناتا! ۵۱

اور (دیکھو) وہ دن، جب اللہ فرمائیگا "جن ہستیوں کو تم سمجھتے تھے، میرے ساتھ شریک ہیں، اب انہیں بلاؤ" وہ پکارینگے، مگر کچھ جواب نہیں پائینگے۔ ہم نے اِن دونوں کے درمیان آڑ کردی ہے۔ (ایک دوسرے کی سُننے والے نہیں) ۵۲

اور مجرم دیکھینگے، آگ بھڑک رہی ہے، اور سمجھ جائینگے اس میں انہیں گرنا ہے۔ وہ کوئی گریز کی راہ نہ پائینگے! ۵۳

اور (دیکھو) ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لیے ہر طرح کی مثالیں لوٹا لوٹا کر بیان کردیں، مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے! ۵۴

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا ۵۴
رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ ۵۵
وَمُنْذِرِينَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ ۖ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنْذِرُوا هُزُوًا ۵۶
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۚ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ۝ وَرَبُّكَ ۵۷
الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ لَنْ يَجِدُوا

اور جب لوگوں کے سامنے ہدایت آگئی، تو ایمان لانے اور طلب گار مغفرت ہونے سے انہیں کونسی بات روک سکتی ہے؟ مگر یہی کہ اگلی قوموں کا سا معاملہ انہیں بھی پیش آجائے، یا ہمارا عذاب سامنے آکھڑا ہو! ۵۵

اور ہم تو پیغمبروں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ (ایمان و عمل کی کامرانیوں کی) بشارت دیں اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کردیں، مگر جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ جھوٹی باتوں کی آڑ پکڑ کے جھگڑنے لگتے ہیں کہ اس طرح سچائی کو متزلزل کردیں۔ انہوں نے ہماری نشانیوں کو اور اُس بات کو جس سے انہیں خبردار کیا گیا ہے، تمسخر کی بات بنا رکھا ہے! ۵۶

اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے، جسے اُس کے پروردگار کی آیتیں یاد دلائی جائیں، اور وہ اُن سے گردن موڑ لے، اور اپنی بدعملیاں بھول جائے جو پہلے کر چکا ہے؟ بلاشبہ ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ کوئی بات پا نہیں سکتے اور کانوں میں گرانی (کہ صدائے حق سُن نہیں سکتے)[۱] تم انہیں کتنا ہی سیدھی راہ کی طرف بلاؤ، مگر وہ کبھی راہ پانے والے نہیں! ۵۷

مگر (اے پیغمبر!) تیرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا ہے، بڑا ہی رحمت والا ہے۔ اگر وہ اِن لوگوں کو ان کے عمل کی کمائی پر پکڑنا چاہتا تو فوراً عذاب نازل کر دیتا، لیکن ان کے لیے ایک میعاد ٹھہرا دی گئی ہے۔ اس کے سوا کوئی پناہ

(۷) قرآن کا یہ اسلوب کیوں ہوا کہ ایک ہی مطلب بار بار دہرایا جاتا ہے، اور مختلف موقعوں پر اور مختلف شکلوں میں ایک ہی بات لوٹ لوٹ کر آتی ہے؟ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہماری علمی کتابوں کی طرح ضبط و ترتیب کے ساتھ تمام مطالب مدوّن کر دیے جاتے!

قرآن خود اس بات کو جابجا آیتوں، مثالوں، اور نصیحتوں کی تصریف سے تعبیر کرتا ہے، یعنے لوٹا لوٹا کر بیان کرنے سے۔ چنانچہ یہاں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے، اور ان مقامات پر غور کرنے سے اس کے اسلوب بیان کی علت واضح ہو جاتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۴۱) میں گزر چکا ہے: ولقد صرفنا فی ھذا القرآن لیذکروا۔ یعنے قرآن میں مطالب کا لوٹ لوٹ کر بیان میں آنا اس لیے ہے کہ تذکیر و موعظت کا ذریعہ ہو۔ پس معلوم ہوا اس اسلوب بیان کی علت تذکیر ہے۔ اس بات پر غور کرتے جاؤ، قرآن کے اسلوب بیان کے سارے بھید کھلتے جائیں گے۔ قرآن کا مقصد تذکیر تھا۔ اور تذکیر کا مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا تھا کہ اسلوب بیان ایک واعظ و خطیب کی موعظت کا ہو، ایک فلسفی کے درس کا نہ ہو۔

[۱] یعنے ہم نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا ہے کہ جو سچائی سے اعراض کرتا ہے، اُس کے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ تشریح اس کی پچھلی سورتوں کے نوٹوں میں بار بار گزر چکی ہے۔

مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ○ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ○ وَاِذْ قَالَ
مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ○ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا
فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ○ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا
نَصَبًا ○ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ
وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ○ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ○ فَوَجَدَا عَبْدًا

۵۸ کی جگہ نہیں پائینگے (یعنے سب کو بالآخر اُس مقررہ میعاد کی جگہ پہنچنا ہے)

اور دیکھو یہ (پرانی) بستیاں ہیں۔ جب اُن کے باشندوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کیا تو ہم نے انہیں ہلاک ۵۹ کردیا۔ ہم نے اُن کی ہلاکت کے لیے ایک میعاد ٹھہرا دی تھی۔

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ موسیٰ نے اپنے ساتھی خادم سے کہا تھا "میں اپنی کوشش سے باز آنے والا نہیں جب تک اُس جگہ نہ پہنچ جاؤں جہاں دونوں سمندر آملے ہیں۔ میں تو (اپنی راہ) چلتا ہی رہونگا" ۶۰

پھر جب وہ دونوں سمندروں کے ملنے کی جگہ پہنچ گئے، تو اُس مچھلی کا انہیں خیال نہ رہا جو اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔ اُس نے سمندر میں جانے کے لیے سُرنگ کی طرح ایک راہ نکال لی۔ ۶۱

جب وہ آگے بڑھے، تو موسیٰ نے اپنے آدمی کو کہا "آج کے سفر نے ہمیں بہت تھکا دیا۔ لاؤ، صبح کا کھانا کھالیں" ۶۲

اس نے کہا "کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ جب ہم (سمندر کے کنارے) چٹان کے پاس ٹھہرے تھے، تو مجھے مچھلی کا کچھ خیال نہیں رہا تھا۔ اُس نے عجیب طریقہ پر سمندر میں جانے کی راہ نکال لی۔ اور یہ شیطان ہی کا کام ہے کہ میں اس کا ذکر کرنا بالکل بھول گیا" ۶۳

موسیٰ نے کہا "جو بات ہم چاہتے تھے، وہ یہی ہے" پس وہ اپنے پاؤں کا نشان دیکھتے ہوئے لوٹ گئے۔ ۶۴

(۸) آیت (۵۴) سے (۵۷) تک فرمایا تھا کہ منکرین قرآن کی شقاوت انتہائی حد تک پہنچ چکی ہے۔ طلب حق کی جگہ جدل و نزاع اور عبرت پذیری کی جگہ تمسخر و استہزا اُن کا شیوہ ہے۔ اُن کی عقلیں ماری گئی ہیں اور حواس معطل ہو چکے ہیں۔ تم کتنی ہی رہنمائی کرو، راہ پانے والے نہیں!

پھر آیت (۵۸) میں فرمایا۔ منکروں کی ان سرکشیوں کا نتیجہ کیوں اچانک ظہور میں نہیں آجاتا؟ کیوں اُن کے لیے خوشحالیاں ہیں اور پیروانِ حق کے لیے درماندگیاں؟ اس لیے کہ تمہارا پروردگار رحمت والا ہے، اور یہاں رحمت کا قانون کام کر رہا ہے۔ رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ ایک خاص وقت تک سب کو مہلت کار ملے۔ چنانچہ مہلت کی رسی ڈھیل دے رہی ہے۔ لیکن جونہی مقررہ وقت آگیا، پھر نتائج کا ظہور ٹلنے والا نہیں!

اب آیت (۶۰) میں اسی معاملہ کا ایک دوسرا پہلو واضح کیا ہے، اور یہ فی الحقیقت کائناتِ ہستی کے مسائل میں سے ایک نہایت اہم مسئلہ کا حل ہے۔

فرمایا۔ بلاشبہ موجودہ حالت ایسی ہی ہے کہ سرکشوں کے لیے کامرانیاں دکھائی دیتی ہیں، مومنوں کے لیے محرومیاں، لیکن صرف اتنی ہی بات دیکھ کر حقیقت حال کا فیصلہ نہ کرلو۔ یہاں معاملات کی حقیقت وہی نہیں ہوا کرتی جو بظاہر دکھائی دیا کرتی ہے۔ کتنی ہی اچھائیاں ہیں جو فی الحقیقت بُرائیاں ہوتی ہیں، اور کتنی ہی بُرائیاں ہیں جو فی الحقیقت اچھائیاں ہوتی ہیں۔ تمہاری عقل صرف ظواہر دیکھ کر حکم لگا دیتی ہے مگر نہیں جانتی، ان ظواہر کی تہہ میں کیسے بواطن پوشیدہ ہیں!

مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ ۶۵
تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ ۶۶-۶۷
خُبْرًا ۝ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ۝ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ ۶۸-۶۹
عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا ۷۰
لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ لَا ۷۱
تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ ۷۳

سرکشوں کے لیے اس وقت کامرانیاں ہیں، مومنوں کے لیے محرومیاں۔ لیکن کیا فی الحقیقت سرکشوں کی کامرانیاں، کامرانیاں ہیں، اور مومنوں کی محرومیاں، محرومیاں؟ اس کا تم فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جب پردہ اٹھیگا، تو دیکھ لوگے کہ حقیقتِ حال کیا تھی۔
اس حقیقت کی وضاحت کے لیے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش آیا تھا

(پھر جب چٹان کے پاس پہنچے) تو انہیں ہمارے (خاص) بندوں میں سے ایک بندہ مل گیا۔ اس شخص پر ہم نے خصوصیت کے ساتھ مہربانی کی تھی۔ اُسے اپنے پاس سے (براہ راست) ایک علم عطا فرمایا تھا۔ ۶۵

موسیٰ نے اُس سے کہا "آپ اجازت دیں تو آپ کے ساتھ رہوں۔ بشرطیکہ جو علم آپ کو اس خوبی کے ساتھ سکھایا گیا ہے، اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھا دیں" ۶۶

اُس نے جواب دیا "ہاں، مگر تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکو گے۔ جو بات تمہاری سمجھ کے دائرہ سے باہر ہے، تم دیکھو اور صبر کرو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ۶۷-۶۸

موسیٰ نے کہا "اگر خدا نے چاہا، تو آپ مجھے صابر پائینگے میں آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرونگا" ۶۹

اُس نے کہا "اچھا، اگر تمہیں میرے ساتھ رہنا ہی ہے، تو اس بات کا خیال رکھو کہ جب تک میں خود تم سے کچھ نہ کہوں، تم کسی بات کی نسبت سوال نہ کرنا" ۷۰

پھر ایسا ہوا کہ دونوں سفر میں نکلے۔ یہاں تک کہ سمندر کے کنارے پہنچے، اور کشتی میں سوار ہوئے۔ اب موسیٰ کے ساتھی نے یہ کیا کہ کشتی میں ایک جگہ ڈرار نکال دی۔ یہ دیکھتے ہی موسیٰ بول اُٹھا "آپ نے کشتی میں ڈرار نکال دی کہ مسافر غرق ہو جائیں؟ آپ نے کیسی خطرناک بات کی" اُس نے کہا "کیا میں نے نہیں کہا تھا، تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے؟" موسیٰ نے کہا "بھول ہو گئی۔ اس پر نہ پکڑیے۔ اگر ایک بات بھول چوک میں ہو جائے تو آپ سخت گیری کیوں کریں؟" ۷۱-۷۳

(۹) حضرت موسیٰ کی ملاقات جس شخص سے ہوئی، اُس کی نسبت فرمایا "ہم نے اُسے اپنے پاس سے ایک علم عطا فرمایا تھا" قرآن جب کبھی کسی ایسی بات کو اس طرح بولتا ہے، تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ بات براہ راست علم میں آئی تھی۔ یعنے وہبی

پھر وہ دونوں آگے چلے۔ یہاں تک کہ (ایک بستی کے قریب پہنچے، اور) انہیں ایک لڑکا ملا۔ موسیٰ کے ساتھی نے اُسے قتل کر ڈالا۔ اس پر موسیٰ بول اُٹھا "آپ نے

أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ۝ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝
قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۝ فَانْطَلَقَا حَتَّى
إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ
فَأَقَامَهُ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝ قَالَ هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ
مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا
وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝

ایک بے گناہ کی جان لیلی، حالانکہ اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی۔ آپ نے کیسی بُرائی کی بات کی!" اس نے کہا "کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا، تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے؟" موسیٰ نے کہا "اگر پھر میں نے کچھ پوچھا، تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیےگا۔ اس صورت میں آپ پوری طرح معذور سمجھے جائینگے"

وہ دونوں اور آگے بڑھے۔ یہاں تک کہ ایک گاؤں کے پاس پہنچے۔ گاؤں والوں سے کہا، ہمارے کھانے کا انتظام کر دو۔ انہوں نے مہمان نوازی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر ان دونوں نے دیکھا، گاؤں میں ایک (پرانی) دیوار ہے اور گرا چاہتی ہے۔ یہ دیکھ کر موسیٰ کے ساتھی نے (اس کی مرمت شروع کر دی، اور) اُسے از سرِ نو مضبوط کر دیا۔ اس پر موسیٰ (سے نہ رہا گیا) بول اُٹھا "اگر آپ چاہتے تو اس محنت کا کچھ معاوضہ اِن لوگوں سے وصول کرتے" (بغیر معاوضہ کے بیکار کی محنت کیوں کی؟) تب موسیٰ کے ساتھی نے کہا "بس، اب مجھ میں اور تم میں جُدائی کا وقت آگیا۔ ہاں، جن باتوں پر تم سے صبر نہ ہو سکا، اُن کی حقیقت تمہیں بتلا دیتا ہوں"

"سب سے پہلے کشتی کا معاملہ لو۔ وہ چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ وہ جس طرف بڑھ رہے تھے، وہاں ایک بادشاہ ہے ظالم، جس کسی کی (اچھی) کشتی پاتا ہے، زبردستی لے لیتا ہے۔ میں نے چاہا، اس کی کشتی میں ایک عیب نکال دوں؟

وسائل کو اس میں دخل نہ تھا۔ پس معلوم ہوا، وہ شخص صاحبِ وحی تھا۔ اور اللہ نے اسے براہِ راست علم عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ آگے چل کر اس کا قول آتا ہے۔ مافعلتہ عن امری۔ میں نے جو کچھ کیا، اللہ کے حکم سے کیا، اپنی سمجھ سے نہیں کیا۔

یہ علمِ خاص جو اسے دیا گیا تھا، یقیناً یہ تھا کہ بعض امور کے بواطن و اسرار اُس پر کھول دیے گئے تھے۔

(۱۰) حضرت موسیٰ نے ارادہ کیا تھا کہ خاموش رہینگے لیکن اُن کا ارادہ چل نہ سکا۔ ہر مرتبہ بول اُٹھے۔ اس سے معلوم ہوا، انسانی عقل مجبور ہے کہ ظواہر پر حکم لگائے۔ وہ اس سے رُک نہیں سکتی، مگر یہیں ٹھوکر کھاتی ہے۔ کیونکہ بواطن و حقائق تک نہیں پہنچ سکتی!

(۱۱) حضرت موسیٰ کے ساتھی نے تین باتیں کیں۔ تینوں کا ظاہر بُرا تھا، لیکن تینوں کی تہ میں بہتری ہی بہتری تھی۔ حضرت موسیٰ ظاہر دیکھ رہے تھے، لیکن اُن کے ساتھی پر اللہ نے باطن روشن کر دیا تھا۔ اگر اسی طرح ظواہر کا پردہ اُٹھ جائے، اور وہ حقیقتیں سب کے سامنے آجائیں جو حضرت موسیٰ کے ساتھی کے سامنے کھلی تھیں، تو دنیا کا کیا حال ہو؟ سارے احکام کس طرح بدل جائیں!

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۝ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا ٨٠
خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ۝ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ ٨١
كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ
وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝ وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ ٨٢ ع
سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۝ إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝ فَأَتْبَعَ سَبَبًا ۝ ٨٣-٨٤-٨٥
حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ

(تاکہ عیبی دیکھ کر بادشاہ کے آدمی چھوڑ دیں) ٧٩

"باقی رہا لڑکے کا معاملہ، تو اُس کے ماں باپ مومن ہیں۔ میں یہ دیکھ کر ڈرا کہ انہیں سرکشی اور کفر کر کے اذیت پہنچائیگا پس ہم نے چاہا کہ اُن کا پروردگار اس لڑکے سے بہتر انہیں لڑکا دے۔ دینداری میں بھی اور محبت کرنے میں بھی" ٨٠ ٨١

"اور وہ جو دیوار درست کر دی گئی، تو (اُس کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ وہ) شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ہے، جس کے نیچے اُن کا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا پس تمہارے پروردگار نے چاہا، دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پا کر نکال لیں۔ (اگر وہ دیوار گر جاتی تو ان کا خزانہ محفوظ نہ رہتا اس لیے ضروری ہوا کہ اُسے مضبوط کر دیا جائے) یہ ان لڑکوں کے حال پر پروردگار کی ایک مہربانی تھی جو اس طرح ظہور میں آئی۔ اور یاد رکھو، میں نے جو کچھ کیا، اپنے اختیار سے نہیں کیا (اللہ کے حکم سے کیا) یہ ہے حقیقت اُن باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے!" ٨٢

(اے پیغمبر!) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں۔ تم کہدو میں اُس کا کچھ حال تمہیں (کلام الٰہی میں) پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔ ٨٣

ہم نے اُسے زمین میں حکمرانی دی تھی۔ نیز اس کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔ ٨٤

تو (دیکھو) اُس نے (پہلے) ایک مہم کے لیے ساز و سامان کیا (اور پچھم کی طرف نکل کھڑا ہوا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا سو اُسے سورج ایسا دکھائی دیا، جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل ٨٥

لیکن نہیں، حکمتِ الٰہی یہی ہے کہ پردہ نہ اُٹھے، کیونکہ اسی پردہ سے عمل کی ساری آزمائش قائم ہے، اور ضروری ہے کہ آزمائش ہوتی رہے۔

(۱۲) اہل کتاب سے معلومات حاصل کر کے لوگوں نے بعض سوالات کیے تھے۔ انہی میں ایک سوال ذوالقرنین کی نسبت تھا۔ یہاں اس کا جواب دیا ہے۔ فرمایا ہم نے اُسے زمین میں حکمرانی دی تھی، اور فتوحات کے سارے ساز و سامان مہیا کر دیے تھے۔

پھر اُس کی تین مہموں کا ذکر کیا ہے:

(۱) وہ پچھم کی طرف بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک سمندر کے کنارے پہنچ گیا جس کا پانی کیچڑ سے ملا ہوا گدلا تھا، اور معلوم ہوتا تھا روز سورج اسی پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ کیونکہ حدِ نگاہ تک خشکی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

(ب) پھر وہ اُتر کی طرف چلا یہاں تک کہ وحشی قبائل کی منزلیں آ گئیں۔ وہ کھلے میدانوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔

(ج) پھر وہ نکلا، اور ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں دو پہاڑوں نے دو دیواروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یاجوج اور ماجوج اسی

فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۚ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ
٨٦-٨٧ حُسْنًا ۝ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلٰى رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَأَمَّا
٨٨-٨٩ مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَآءً الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ۝
٩٠ حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُونِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ
٩١-٩٢ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰى إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا
٩٣ قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ۝ قَالُوا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي
٩٤ الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰى أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ

میں ڈوب جاتا ہے، اور اُس کے قریب ایک گروہ کو بھی آباد پایا۔ ہم نے کہا "اے ذوالقرنین! (اب یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں) تو چاہے انہیں عذاب میں

رہتے تھے اور اس طرف کی بستیوں میں لوٹ مار کرتے تھے وہاں کے باشندوں کی استدعا پر اُس نے وہاں ایک دیوار بنادی جس کی وجہ سے حملہ آوروں کا راستہ بالکل بند ہوگیا۔

٨٦ ڈالے، چاہے اچھا سلوک کرکے اپنا بنالے۔

ذوالقرنین نے کہا "ہم ناانصافی کرنے والے نہیں۔ جو سرکشی کریگا، اُسے ضرور سزا دینگے۔ پھر اُسے اپنے پروردگار
٨٧ کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کریگا۔ اور جو ایمان لائیگا اور اچھے کام کریگا، تو اُس
٨٨ کے بدلے اُسے بھلائی ملیگی، اور ہم اُسے ایسی ہی باتوں کا حکم دینگے جس میں اُس کے لیے آسانی و راحت ہو"

٨٩ اُس کے بعد پھر اُس نے طیاری کی اور (پورب کی طرف) نکلا۔ یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد
٩٠ تک پہنچ گیا۔ اُس نے دیکھا، سورج ایک گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔ اُن کی حالت
٩١ ایسی ہی تھی، اور جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا، اُس کی ہمیں پوری خبر ہے!

٩٢ اُس نے پھر سازوسامان طیار کیا (اور تیسری مہم میں نکلا) یہاں تک کہ وہ (پہاڑوں کی) دیواروں کے
درمیان پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے دیکھا، پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم آباد ہے۔ جس سے بات کہی جائے
٩٣ تو بالکل نہیں سمجھتی۔ اس قوم نے (اپنی زبان میں) کہا "اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس ملک میں لوٹ
مار کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ ہمارے اور اُن کے درمیان ایک روک بنادیں، اور اس غرض سے ہم
٩٤ آپ کے لیے کچھ خراج مقرر کردیں؟" ذوالقرنین نے کہا "میرے پروردگار نے جو کچھ میرے قبضہ میں دے رکھا ہے
وہی میرے لیے بہتر ہے (تمہارے خراج کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں) میری مدد کرو۔ میں
٩٥ تمہارے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کردونگا۔"

(اُس کے بعد اُس نے حکم دیا) "لوہے کی سلیں میرے لیے مہیا کردو"

فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ ۹۵
قَالَ انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا ۹۶
اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ۝ قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ ۹۷
رَبِّي حَقًّا ۝ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ ۖ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ۝ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ ۹۸-۹۹
يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۝ الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَن ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ ۱۰۰
سَمْعًا ۝ أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۱۰۱ ع

پھر جب (تمام سامان مہیا ہوگیا، اور) دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اُٹھا کر اُن کے برابر بلند کر دی، تو حکم دیا "(بھٹیاں سلگاؤ اور) اُسے دھونکو" پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ (کی طرح لال) ہوگئی تو کہا "گلا ہوا تانبا لاؤ۔ اس پر اُنڈیل دیں" ۹۶

چنانچہ (اس طرح) ایک ایسی سد بن گئی کہ (یاجوج اور ماجوج) نہ تو اُس پر چڑھ سکتے تھے، نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے! ۹۷

ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا "یہ (جو کچھ ہوا، تو فی الحقیقت) میرے پروردگار کی مہربانی ہے جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئیگی، تو وہ اُسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دیگا (مگر اس سے پہلے کوئی اُسے ڈھا نہیں سکتا) اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے۔ ٹلنے والی نہیں!" ۹۸

(۱۳) جب دیوار طیار ہوگئی، تو ذوالقرنین نے کہا، یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ ایسا عظیم الشان کام میرے ہاتھوں انجام پا گیا۔ اب سے کوئی ڈھا نہیں سکتا۔ ہاں جب وہ مقررہ وقت آئیگا، جس کی اللہ نے خبر دیدی ہے، تو بلاشبہ یہ ریزہ ریزہ ہو کر رہ جائیگی، اور یہاں ہر چیز کو بالآخر فنا ہونا ہے!

ذوالقرنین کے اس قول پر اُس کی سرگزشت ختم ہوگئی۔ اب آیۃ (۹۹) میں فرمایا، مقررہ وقت آئیگا، تو یہ قومیں نکلینگی، اور سمندر کی موجوں کی طرح ایک دوسرے پر آ پڑینگی۔ پھر ایک وقت آئیگا جب سب کو اکٹھا ہو جانا ہے، اور اُس وقت منکرین حق دیکھ لینگے کہ دوزخ اُن کے سامنے ہے!

جب لوگوں کو جمع کرنا مقصود ہوتا ہے، تو نرسنگھا پھونکا جاتا ہے، اور اُس کی آواز سنتے ہی ہر گوشہ سے لوگ نکل آتے ہیں۔ فرمایا۔ ایک ایسی ہی بات اُس دن بھی ہونے والی ہے۔ نرسنگھا پھونکا جائیگا کہ سب اکٹھے ہو جائیں!

اور جس دن وہ بات ظہور میں آئیگی، تو اُس دن ہم ایسا کرینگے کہ (سمندر کی لہروں کی طرح ان قوموں میں سے) ایک (قوم) دوسری (قوم) کے درمیان بہنے لگیگی، اور نرسنگھا پھونکا جائیگا، اور ساری قوموں کی بھیڑ اکٹھی ہو جائیگی! ۹۹

اُس دن ہم منکروں کے سامنے دوزخ اس طرح نمودار کر دینگے، جیسے ایک چیز بالکل سامنے دکھائی دے ۱۰۰

وہ منکر جن کی نگاہوں پر، ہمارے ذکر سے، پردہ پڑ گیا تھا، اور (کانوں میں ایسی گرانی کہ) کوئی بات سُن نہیں سکتے تھے! ۱۰۱

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، کیا اُنہوں نے

(۱۴) آیت (۱۰۲) سے سلسلۂ خطاب پھر منکرین دعوت کی طرف

(۱۰۲) أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ○ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ

(۱۰۳-۱۰۴) بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ○ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا

(۱۰۵) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ○ ذَٰلِكَ

(۱۰۶) جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ○ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ

(۱۰۷-۱۰۸) لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ○ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ○ قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ

(۱۰۹) رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ○ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ

متوجہ ہوگیا ہے، اور اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اُن کی تمام کوششیں اکارت جانے والی ہیں، اور کلمۂ حق کی کامیابی اٹل ہے۔

آیت (۱۰۳) میں انسان کی نامرادیوں کی کیسی کامل تصویر کھینچ دی ہے؟ "جن لوگوں کی کوششیں اس زندگی میں کھوئی جاتی ہیں، اور وہ اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ ہم بڑے بڑے کارخانے بنا رہے ہیں!"

غور کرو! کتنی ہی زندگیاں ہیں جن کا ہر لمحہ طرح طرح کی کوششوں میں بسر ہوتا ہے، لیکن اُن کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہیں ہوتی اور جب پردۂ غفلت ہٹتا ہے تو صاف دیکھ لیتے ہیں کہ جدوجہد کی ساری زندگی رائیگاں گئی! وہ ہمیشہ اسی دھوکے میں رہتے ہیں کہ ہم نے فلاں بات بنالی، اور فلاں کارخانہ درست کرلیا، حالانکہ بنتا ونتا کچھ بھی نہیں، سرتاسر بگڑتا ہی جاتا ہے!

خیال کیا ہے، ہمیں چھوڑ کر ہمارے بندوں کو اپنا کارساز بنا لیں؟ (اُنہیں معلوم ہونا چاہیے کہ) ہم نے کافروں کی مہمانی کے لیے دوزخ طیار کر رکھی ہے!

(اے پیغمبر!) تو کہہ دے "ہم تمہیں خبر دیدیں، کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے؟ وہ، جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں، اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں!"

یہی لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور اُس کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہوئے۔ پس اُن کے سارے کام اکارت گئے، اور اس لیے قیامت کے دن ہم اُن (کے اعمال) کا کوئی وزن تسلیم نہیں کرینگے۔ اُنہوں نے جیسی کچھ کفر کی راہ اختیار کی تھی، اور ہماری آیتوں اور رسولوں کی ہنسی اُڑائی تھی، تو عذابِ دوزخ، اُس کا (لازمی) نتیجہ ہے!

لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے، تو اُن کی مہمانی کے لیے فردوس کے باغ ہونگے۔ وہ ہمیشہ اُن میں رہینگے۔ کبھی نہیں چاہینگے کہ اپنی جگہ بدلیں!

(اے پیغمبر!) اعلان کر دے، اگر میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لیے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں، تو سمندر کا پانی ختم ہو جائیگا، مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہونگی۔ اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لیے ویسے ہی سمندر اور بھی پیدا کردیں، جب بھی وہ کفایت نہ کریں!

(نیز) کہہ دے "میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے مجھ

إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ۱۱۰

پر وحی کی ہے کہ "تمہارا معبود وہی ایک ہے۔ اُس کے سوا کوئی نہیں" پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے، چاہیے کہ اچھے کام انجام دے اور اپنے پروردگار کی بندگی میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرے (بس، اس کے سوا میری کوئی پکار نہیں!) ۱۱۰

اصحاب کہف

(۵) مسیحی مذہب کے ابتدائی قرنوں میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم و وحشت سے عاجز آکر پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لے لی اور آبادیوں سے کنارہ کش ہوگئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پاگئے، اور ایک عرصہ کے بعد اُن کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گزرا تھا۔ ایک انطاکیہ کی طرف منسوب ہے۔ ایک افسس میں بیان کیا جاتا ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ کہاں پیش آیا تھا؟

قرآن نے "کہف" کے ساتھ "الرقیم" کا لفظ بھی بولا ہے، اور بعض ائمۂ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے، لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا، اس لیے اکثر مفسّر اس طرف چلے گئے کہ یہاں "رقیم" کے معنی کتاب کے ہیں۔ یعنے اُن کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا۔ اس لیے کتبہ والے مشہور ہوگئے۔

الرقیم

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ "رقیم" وہی لفظ ہے جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر "پیٹرا" کے نام سے مشہور ہوا، اور عرب اُسے "بطرا" کہنے لگے۔

عالمگیر جنگ کے بعد آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں، اُن میں ایک پیٹرا بھی ہے، اور اُس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں، تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں، اور سطح زمین بلندی کی طرف اُٹھنے لگتی ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا، اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر "راقیم" نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا، تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نوآبادی کی حیثیت اختیار کر لی، اور یہی زمانہ ہے جب پیٹرا کے نام سے اُس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ ۶۴۱ء میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا، تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا تھا۔ یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا بطرا تھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی از سر نو اثری پیمائش کی جا رہی ہے، اور نئی نئی باتیں روشنی میں آرہی ہیں۔ ازاں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں۔ نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔ ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہوگا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا، اور قرآن نے صاف صاف اُس کا نام "الرقیم" بتلا دیا ہے۔ اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کیے جائیں، اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبہ پر محمول کیا جائے۔

علاوہ بریں، دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی، لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے، اور اسے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات تصور کرتے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائل

معلومات محدود تھے۔ بہت کم امکان ہے کہ دور کی باتیں اُن کے علم میں آئی ہوں پس ضروری ہے کہ یہ قرب وجوار ہی کی کوئی بات تھی اور ان لوگوں کی زبانی سُنی جاسکے جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے پیٹرا کا واقعہ قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اوّل تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنے عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلہ پر۔ ثانیاً نبطیوں کی وہاں آبادی تھی، اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز میں آتے رہتے تھے۔ یقیناً نبطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہوئی، اور انہی سے عربوں نے سُنا ہوگا۔

خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے، اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی جو رومیوں نے ساحل خلیج سے لے کر ساحل مارمورا تک تعمیر کردی تھی۔[1] پیٹرا اسی شاہراہ پر واقع تھا۔ بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی۔ اس لیے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آگیا ہو۔

اس سلسلہ میں چند باتیں اور تشریح طلب ہیں:

اصل واقعہ

(ا) آیت (۹) ام حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من اٰیتنا عجبا؟ کا اسلوب خطاب صاف کہہ رہا ہے کہ کچھ لوگ "اصحاب الکھف والرقیم" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا معاملہ قدرت الٰہی کا ایک عجیب وغریب کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں نے پیغمبر اسلام سے اُن کا ذکر کیا ہے، اور اب وحی الٰہی اس معاملہ کی حقیقت واضح کر رہی ہے۔ چنانچہ پہلے مجملاً اس کا خلاصہ اور نتیجہ بتلا دیا کہ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ اس سے زیادہ نہیں ہے، اور جو کچھ عبرت وتذکیر کی بات ہے، وہ یہ ہے پھر آیت (۱۳) میں فرمایا نحن نقص علیك نبأھم بالحق۔ اب ہم تجھے اُن کی سچی خبر سُنا دیتے ہیں۔ یعنے واقعہ کی چند ضروری تفصیلات بیان کر دیتے ہیں چنانچہ اس کے بعد تفصیلات بیان کی ہیں۔

یہ مجمل خلاصہ جو آیت (۱۰) سے (۱۲) تک بیان کیا ہے، تمام سرگزشت کا ماحصل ہے۔ اسی کی روشنی میں بقیہ تفصیلات پڑھنی چاہییں۔ فرمایا۔ چند نوجوان تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے منہ موڑا اور ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے۔ اُن کے پیچھے ظلم وستم کی قوتیں تھیں، سامنے غار کی تاریکی ودحشت۔ تاہم وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا "خدایا! تیری ہی رحمت کا آسرا ہے، اور تیری ہی چارہ سازی پر بھروسہ!" چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صداؤں کی طرف سے اُن کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انہیں اُٹھا کھڑا کیا، تاکہ واضح ہو جائے، ان دونوں جماعتوں میں سے کون گروہ تھا جس نے اس عرصہ میں نتائج عمل کا بہتر اندازہ کیا ہے؟ یعنے صورتِ حال نے دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں۔ ایک اصحاب کہف تھے۔ ایک اُن کے مخالف۔ ایک نے حق کی پیروی کی۔ دوسرے نے ظلم وتشدد پر کمر باندھی یہ چند برسوں کی مدت دونوں جماعتوں پر گزری تھی۔ اُس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی، اور اس پر بھی جس نے غار میں پناہ لینے کے لیے انہیں مجبور کیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دونوں میں سے کس نے کمایا ہے؟ اور کس نے کھویا ہے؟ کون ان دونوں میں وقت کا بہتر اندازہ شناس تھا؟

ای الحزبین احصیٰ؟

چنانچہ آگے چل کر جو تفصیلات آتی ہیں، اُن سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظالم جماعت کے ظلم کی عمر بہت تھوڑی تھی، اور بالآخر وہی راہ فتح مند ہونے والی تھی جو اصحاب کہف نے اختیار کی تھی۔ کیونکہ بالآخر مسیحی دعوت تمام ملک میں پھیل گئی، اور جب کچھ عرصہ کے بعد وہ غار سے نکلے اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا، تو اب مسیحی ہونا کوئی ناقابل معافی جرم نہیں تھا۔ عزت وسربراہی کی سب سے بڑی عظمت تھی!

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان پرستارانِ حق کی استقامت ہی تھی جس نے دعوتِ حق کو فتح مند کیا۔ اگر وہ مظالم سے تنگ آکر اتباع حق سے دست بردار ہو جاتے، تو یقیناً یہ انقلاب ظہور میں نہیں آتا۔

(ب) اس کے بعد واقعہ کی بعض تفصیلات واضح کر دی ہیں۔ جو لوگ خدا پرستی کی راہ اختیار کرتے تھے انکی مخالفت میں تمام باشندے

[1] جنگ کے بعد اس شاہراہ کا سُراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں ہو گئی۔ اب یہ اپنے اصل خط پر دوبارہ تعمیر کی جا رہی ہے، اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے، وہاں پہلے تریس آباد تھا، جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے، اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا۔

غار کی وسعت

...ہوجاتے۔ اور اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آتے، تو سنگسار کرتے۔ یہ حالت دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا، آبادی سے منہ موڑیں اور کسی غار میں معتکف ہو کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائیں۔ چنانچہ ایک غار میں مقیم ہو گئے۔

ان کا ایک وفادار کتا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ غار میں چلا گیا۔ جس غار میں انہوں نے پناہ لی، وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ گو اندر سے کشادہ ہے اور دہانہ کھلا ہوا، لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پا سکتیں۔ نہ تو چڑھتے دن میں، نہ ڈھلتے میں۔ جب سورج نکلتا ہے تو دہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے۔ یعنی غار اپنی طول میں شمال و جنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسری طرف منفذ۔ روشنی اور ہوا دونوں طرف سے آتی ہے، لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پا سکتی۔

اس صورت حال سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ زندہ رہنے کے لیے وہ نہایت محفوظ اور موزوں مقام ہے۔ کیونکہ ہوا اور روشنی کی راہ موجود ہے مگر دھوپ کی تپش پہنچ نہیں سکتی۔ پھر اندر سے کشادہ ہے۔ جگہ کی کمی نہیں۔ دوسری یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کے لیے اندر کا منظر بہت ڈراؤنا ہو گیا ہے۔ کیونکہ روشنی کے منافذ موجود ہیں اس لیے بالکل اندھیرا نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت سامنے آتا نہیں، اس لیے بالکل اجالا بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیری کی ملی جلی حالت رہتی ہے، اور جس غار کی اندرونی فضا ایسی ہو، اُسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے، تو اندر کی ہر چیز ضرور ایک بھیانک منظر پیش کرے گی۔

انقلاب حال

یہ لوگ کچھ عرصہ تک غار میں رہے۔ اس کے بعد نکلے تو انہیں کچھ اندازہ نہ تھا، کتنے عرصہ تک اس میں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے، باشندوں کا وہی حال ہوگا، جس حال میں انہیں چھوڑا تھا، لیکن اس عرصہ میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا۔ اب غلبہ ان لوگوں کا تھا جو اصحاب کہف ہی کی طرح خدا پرستی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ جب ان کا ایک آدمی شہر میں پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اب وہی لوگ جنہوں نے انہیں سنگسار کرنا چاہا تھا، ان کے ایسے معتقد ہو گئے کہ ان کی غار نے زیارت گاہ عام کی حیثیت اختیار کر لی اور امراءِ شہر نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ہیکل تعمیر کیا جائے۔

ضرب علی الآذان

(ج) اصحاب کہف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟ اس بارے میں قرآن نے صرف اس قدر اشارہ کیا ہے کہ فضربنا علیٰ اٰذانھم فی الکھف سنین عددا (۱۱) "ضرب علی الآذان" کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے یعنی دنیا کی کوئی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی لیکن مفسرین نے اسے نیند پر محمول کیا ہے یعنی ان پر نیند طاری ہو گئی تھی اور چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا، اس لیے اس حالت کو "ضرب علی الآذان" سے تعبیر کیا گیا۔ اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لیے "ضرب علی الآذان" کی تعبیر ملتی نہیں، لیکن وہ کہتے ہیں، یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو ضرب علی الآذان کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ففی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ التبعیہ۔

اصل یہ ہے کہ اصحاب کہف کا جو قصہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا، وہ یہی تھا کہ غار میں برسوں تک سوتے رہے، اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ بعد کو بھی اسی طرح کی روایتیں مشہور ہو گئیں۔ عرب میں قصہ کے اصلی راوی شام کے نبطی تھے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصہ کی اکثر تفصیلات تفسیر کے انہی راویوں پر جا کر منتہی ہوتی ہیں جو اہل کتاب کے قصوں کی روایت میں مشہور ہو چکے ہیں مثلاً ضحاک اور سدی۔ بہرحال اگر یہاں ضرب علی الآذان سے مقصود نیند کی حالت ہو، تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے، اور ثم بعثناھم کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے، طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربہ میں آتی رہتی ہیں۔ پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سُلائے رکھا، تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔ البتہ قرآن حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ جزم و یقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔

(د) آیت (۱۸) وتحسبھم ایقاظا وھم رقود الخ میں اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی، یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک رہی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انقلاب حال کے بعد اصحاب کہف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ اسی میں رہے۔ یہاں تک کہ انتقال

کرگئے، ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہوگئی کہ باہر سے کوئی دیکھے، تو معلوم ہو، زندہ آدمی موجود ہیں سو جانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کیے بیٹھا ہے۔ حالانکہ نہ تو آدمی زندہ ہیں نہ کتا ہی زندہ ہے!

تعبیر تحسبہم ایقاظا و ہم رقود

لیکن باہر سے دیکھنے والا انہیں زندہ اور جاگتا کیوں سمجھے؟ اگر ان کی نعشیں پڑی ہیں تو نعشوں کو کوئی زندہ تصور نہیں کر سکتا اگر "رقود" سے مقصود سونے کی حالت ہے، اور وہ لیٹے ہوئے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک لیٹا ہوا آدمی دیکھنے والے کو جاگتا دکھائی دے۔

مفسرین نے یہ اشکال محسوس کیا لیکن اس کا کوئی حل دریافت نہ کر سکے۔ بعضوں نے کہا، وہ اس لیے جاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ لیکن اگر ایک بے حس و حرکت نعش پڑی دکھائی دے اور اس کی آنکھیں کھلی ہوں تو دیکھنے والا اسے ہشیار و بیدار کیوں سمجھنے لگا؟ یہی سمجھیگا کہ مرا پڑا ہے گر آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ بعضوں نے کہا تقلبھم ذات الیمین وذات الشمال کی وجہ سے وہ بیدار دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی چونکہ دہنے بائیں کروٹ بدلتی رہتی ہے، اس لیے دیکھنے والا خیال کرتا ہے یہ بیدار ہیں۔ لیکن یہ توجیہ پہلے سے بھی زیادہ بے معنی ہے۔ اول تو کروٹ بدلنا بیداری کی دلیل نہیں۔ آدمی گہری سے گہری نیند میں ہوتا ہے اور کروٹ بدلتا ہے۔ ثانیاً اگر کروٹ بدلتے ہونگے تو کچھ وقفہ کے بعد بدلتے ہونگے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہر آن کروٹ بدلتے ہی رہتے ہوں، اور جب کبھی کوئی جھانک کر دیکھے انہیں کروٹ بدلتا ہی پائے! لطف یہ ہے کہ تقلبھم ذات الیمین، وذات الشمال کی تفسیر میں یہی مفسرین بتلاتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک سال میں دو دفعہ کروٹ بدلتی ہے۔ بعضوں کے نزدیک ایک مرتبہ۔ بعض کہتے ہیں تین سال بعد۔ بعض کہتے ہیں نو سال بعد!

علاوہ بریں قرآن نے یہ بات جس اسلوب و شکل میں بیان کی ہے، اُس پر ان نکتہ سنجوں نے غور نہیں کیا۔ لواطلعت علیھم، لولیت منھم فرارا ولملئت منھم رعبا۔ یعنے غار کے اندر کا منظر اس درجہ دہشت انگیز ہے کہ اگر تم جھانک کر دیکھو تو خوف کے مارے کانپ اٹھو اور اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو۔ اس سے معلوم ہوا، غار کے اندر اصحاب کہف کے اجسام نے ایسا منظر پیدا کر دیا ہے جو بیحد دہشت انگیز ہے۔ اگر کوئی آدمی باہر سے دیکھے، تو دیکھنے کے ساتھ ہی اُس پر دہشت چھا جائے۔ معاً اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہو۔ اب اگر اندر کا منظر صرف اتنا ہی تھا کہ چند آدمی لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی، جس سے اس درجہ دہشت انگیزی پیدا ہو سکے۔ علاوہ بریں جو آدمی باہر سے جھانکیگا، وہ اتنا باریک بیں نہیں ہو سکتا کہ غار کی تاریکی میں لیٹے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں بھی بہ اول نظر دیکھ لے، اور وہ بھی اس حالت میں کہ دہنے یا بائیں کروٹ پر لیٹے ہوئے ہوں!

مفسرین کی حیرانیاں اور انکشاف حقیقت

دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے، اور جب تک مفسرین کے پیدا کیے ہوئے تخیل سے بالکل الگ ہو کر تحقیق نہ کی جائے، اصلیت کا سُراغ نہیں مل سکتا۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے، وہ کس وقت کی ہے؟ اُس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جا کر مقیم ہوئے تھے؟ یا اُس وقت کی جب انکشاف حال کے بعد دوبارہ معتکف ہوگئے؟ مفسرین نے خیال کیا، اس کا تعلق پہلے وقت سے ہے، اور یہی بنیادی غلطی ہے جس نے سارا اُلجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ دراصل اس کا تعلق بعد کے حالات سے ہے یعنی جب وہ ہمیشہ کے لیے غار میں گوشہ نشین ہوگئے، اور پھر کچھ عرصہ کے بعد وفات پا گئے، تو غار کے اندرونی منظر کی یہ نوعیت ہوگئی تھی۔ تحسبہم ایقاظا وھم رقود میں "ایقاظ" سے مقصود اُن کا زندہ ہونا ہے، اور "رقود" سے مردہ ہونا۔ نہ کہ بیداری اور خواب۔ چنانچہ عربی میں زندگی موت کے لیے یہ تعبیر عام و معلوم ہے۔

پھر یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے، اور جنہیں پیش آیا تھا وہ عیسائی تھے۔ صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زہد و انزوا کی ایک خاص زندگی شروع ہوگئی تھی جس نے آگے چل کر رہبانیت (Monasticism) کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ ترک علائق کے بعد کسی پہاڑ کی غار میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں معتکف ہو جاتے تھے۔ اور پھر اُن پر استغراق عبادت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ وضع و نشست کی جو حالت اختیار کر لیتے اُسی میں پڑے رہتے۔ یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی۔ مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہوئے تھے، تو برابر کھڑے ہی رہتے اور اسی حالت میں جان دیدیتے۔ اگر گھٹنے کے بل رکوع کی حالت اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی۔ اگر سجدے میں سر رکھ دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے، اور مرنے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے۔ زیادہ تر گھٹنے کے بل رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی۔ کیونکہ

عیسائیوں میں تعبد و تضرع کے لیے یہی وضع رائج ہو گئی تھی۔[1]
غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پروا ہوتے تھے۔ اگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی اور پانی پہنچا دیا کرتے، نہیں ہوتی تو پیاس کی تکلیف نہیں کرتے۔ عبادت کا استغراق جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے ان کی حالت ویسی ہی تھی، جیسی ہندوستان کے جوگیوں کی رہ چکی ہے اور اب بھی گاہ گاہ نظر آجاتی ہے۔

جس طرح زندگی میں انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا، اُسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی اس کی جرأت نہ کرتا۔ مدتوں تک اُن کی نعشیں اسی حالت میں باقی رہتیں جس حالت میں اُنہوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کیے تھے۔ اگر موسم موافق ہوتا اور درندوں سے حفاظت ہوتی، تو صدیوں تک ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلے سے دیکھنے والا انہیں زندہ انسان تصور کرتا۔ چنانچہ ویٹیکان کے تہ خانوں میں بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں جو اسی طرح کے مقامات سے برآمد ہوئے تھے اور اپنی اصلی وضع و ہیئت پر باقی تھے۔

ابتدا میں اس غرض سے زیادہ تر پہاڑوں کی غاریں یا پرانی عمارتوں کے کھنڈر اختیار کیے گئے تھے، لیکن آگے چل کر یہ طریقہ اس درجہ عام ہو گیا کہ خاص خاص عمارتیں اس غرض سے تعمیر کی جانے لگیں۔ یہ عمارتیں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ان میں آمد و رفت کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ جو جاتا تھا، وہ پھر باہر نہیں نکلتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی سلاخدار کھڑکی رکھی جاتی تھی جو ہوا اور روشنی کا ذریعہ ہوتی اور اُسی کے ذریعہ لوگ غذا بھی پہنچا دیتے۔

بعد کو جب مناسٹک ازم (رہبانیت) کے باقاعدہ ادارے قائم ہو گئے تو اس طرح کے انفرادی انزوا کی مثالیں کم ہو گئیں۔ تاہم تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ تک یہ طریقہ عام طور پر جاری تھا، اور یورپ کی کوئی آبادی ایسی نہ تھی جو اس طرح کی عمارتوں سے خالی ہو۔ ان مقامات کو عام طور پر Logotte کہتے تھے، اور جب ایک راہب یا راہبہ کا ان میں انتقال ہو جاتا تو اُن پر یہ لاطینی لفظ کندہ کر دیا جاتا کہ TU-ORA یعنے اس کے لیے دعا کرو!

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ مسیحی رہبانیت سب سے پہلے مشرق میں شروع ہوئی، اور اس کا مرکز فلسطین اور مصر تھا۔ پھر چوتھی صدی مسیحی میں یہ یورپ پہنچی، اور سینٹ بینی ڈکٹ (Benedict) نے سب سے پہلے اس کے قواعد و ضوابط منضبط کیے۔ سینٹ بینی ڈکٹ نے بھی ایک پہاڑ کی غار ہی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔

مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا اضطراری حالات سے ہوئی تھی۔ آگے چل کر اُس نے ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کر لی۔ یعنے ابتدا میں لوگوں نے مخالفوں کے ظلم و تشدد سے مجبور ہو کر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ یہ اضطراری طریقہ زہد و تعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔ مزید تشریح اس مقام کی سورۂ حدید کی تشریحات میں ملیگی۔

بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کا معاملہ بھی تمام تر اسی نوعیت کا تھا۔ ابتدا میں قوم کے ظلم نے انہیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں، لیکن جب کچھ عرصہ تک وہاں مقیم رہے، تو زہد و عبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے پر آمادہ نہ ہو سکے، اور گو ملک کی حالت بدل گئی تھی لیکن وہ بدستور غار ہی میں معتکف رہے۔ یہاں تک کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر و عبادت کی جو وضع اختیار کر لی تھی وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ اُن کے وفادار کتے نے بھی آخر تک اُن کا ساتھ دیا۔ وہ پاسبانی کے لیے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ جب اُس کے مالک مر گئے، تو اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔

اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کر لی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے

---

[1] عیسائیوں نے عبادت کی یہ وضع غالباً رومیوں سے لی۔ کیونکہ یہودیوں کے اوضاع نماز میں اس وضع کا پتہ نہیں چلتا۔ اُن کا رکوع تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہم نماز میں کیا کرتے ہیں۔
دنیا کی مختلف قوموں نے بندگی و نیازمندی کے اظہار کے لیے مختلف وضعیں اختیار کر لی تھیں۔ رومی گھٹنا ٹیک کر جھک جاتے تھے اور پادشاہ کے قدموں کو یا دامن کو بوسہ دیتے۔ مجرموں کے لیے بھی ضروری تھا کہ مجسٹریٹ کا فیصلہ گھٹنے ٹیک کر سنیں۔ مصر و بابل، اور ایران میں سجدہ کی رسم پیدا ہوئی اور ہندوستان میں اوندھے منہ ہو کر بالکل لیٹ جانے کی۔ وکل حزب بما لدیھم فرحون!

تو اُسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دیگا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے۔ کوئی سجدے میں ہے۔ کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کتا ہے۔ وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف منہ کیے ہوئے بیٹھا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اُٹھے۔ کیونکہ اُس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مردوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا وہ زندہ انسانوں کا ہے:

(ز) یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو۔ ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام قفلوں کو کھلنے کے لیے صرف اسی ایک کنجی کا انتظار تھا۔ تحسبهم ایقاظا وهم رقود کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور ازکار توجیہہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ اس طرح کا منظر یہی خیال پیدا کریگا کہ لوگ زندہ ہیں حالانکہ زندہ نہیں۔ لو اطلعت علیهم لولیت منهم فرارا ولملئت منهم رعبا کی علت بھی سامنے آگئی، اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں جن پر امام رازی مجبور ہوئے ہیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر جھانک کر دیکھو اور تمہیں مردہ نعش کی جگہ ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے، تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ یقیناً مارے دہشت کے چیخ اُٹھو گے! اسی طرح و نقلبهم ذات الیمین و ذات الشمال کی تفسیر میں بھی کسی تکلف کی احتیاج باقی نہ رہی۔ غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا۔ اور ان دونوں جانبوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے جیسا کہ آیت وتری الشمس اذا طلعت سے متبادر ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برابر چلتی رہتی تھی، اور اُن کے ڈھانچے دہنے سے بائیں اور بائیں سے دہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے، جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے۔

تفہیم ذات الیمین و ذات الشمال

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کرنیں غار کے اندر نہیں پہنچتیں جیسا کہ آیت (۱۷) میں ہے، اور کیوں اسے قدرت الٰہی کی ایک نشانی فرمایا کہ ذلك من آيات الله؟ معلوم ہو گیا کہ یہ دراصل اُس بات کی تمہید تھی جو بعد کو آیت (۱۸) میں بیان کی گئی ہے کہ تحسبهم ایقاظا وهم رقود۔ چونکہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد ان کی نعشیں عرصہ تک باقی رہیں حتی کہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہوتا تھا، اس لیے پہلے اس کی علت واضح کر دی کہ جس غار میں معتکف ہوئے تھے، وہ اس طرح کی غار تھی کہ انسانی جسم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اس میں قائم رہ سکتا تھا کیونکہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی لیکن سورج کی تپش کا اس میں گزر نہ تھا۔ جو چیز نعش کو جلد گلا سڑا دیتی ہے، وہ سورج کی تپش ہے، اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے، وہ ہوا اور روشنی ہے۔ ہوا چلتی رہتی تھی۔ روشنی پہنچتی رہتی ہے، مگر تپش سے پوری حفاظت تھی۔ ذلك من آيات الله!

ذلك من آيات الله

(ح) ولبثوا في كهفهم ثلاث مائة سنين وازدادوا تسعا (۲۵) کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے کہ وہ لوگ اتنی مدت تک غار میں پڑے رہے؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ قل الله اعلم بما لبثوا؟ مفسرین کو اس اشکال کے دور کرنے میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے، حالانکہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یعنی جس طرح پہلے ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال نقل کیے تھے، اسی طرح یہاں مدت بقا کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں غار میں تین سو برس تک رہے۔ بعضوں نے اس پر نو برس اور بڑھا دیے۔ تم کہدو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی ہے۔ پس یہ قرآن کی تصریح نہیں ہے۔ لوگوں کا قول ہے اور "سیقولون" سے نقل اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اسی سلسلہ کی یہ آخری کڑی[1] ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے[2]۔

ثلاث مائة سنین کی تفسیر

(ط) امام قرطبی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اولئك قوم فنوا وعدموا منذ مدة طويلة یعنی اصحاب کہف کی موت پر ایک مدت گزر چکی ہے۔ ان کے اجسام فنا ہو گئے جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کی غزوۂ

---

[1] اخرج ابن ابی حاتم و ابن مردویه عن ابن عباس قال ان الرجل ليفسر الآية، يرى انها كذلك فيهوى ابعد ما بين السماء والارض ثم تلا ولبثوا في كهفهم ثم قال كم لبث القوم؟ قالوا ثلاث مائة وتسع سنين۔ قال لو كانوا لبثوا كذلك، لم يقل الله "قل الله اعلم بما لبثوا" ولكنه حكى مقالة القوم فقال سيقولون ثلاثة الى قوله رجما بالغيب۔ فاخبر انهم لا يعلمون۔ ثم قال سيقولون "ولبثوا في كهفهم ثلاث مائة سنين وازدادوا تسعا" (فتح القدير) اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ جو لوگ اس آیت کو قرآن کی تصریح قرار دیتے تھے، حضرت ابن عباس کے نزدیک [illegible] ہو گئے تھے۔

[2] اخرج ابن جرير عن قتادة في حرف ابن مسعود: وقالوا "ولبثوا في كهفهم" يعني انما قاله الناس۔ الا ترى انه قال قل الله اعلم

میں بعض صحابہ کا گزر اصحاب کہف کی غار پر ہوا تھا اور انہیں اُن کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے اس کی بھی مزید تصدیق ہوگی کہ یہ واقعہ پیٹرا میں پیش آیا تھا۔

(یحی رہبانیت کے طریقہ کی نسبت مندرجہ صدر بیان میں جو اشارات کیے گئے ہیں، ان کی تفصیلات کے لیے حسب ذیل کتابیں دیکھنی چاہییں:

The Paradise or Garden of the Holy Fathers By E.A.W. Budge.

The Evolution of The Monastic Ideal, By H. Workman.

Five Centuries of Religion, By G. G. Coulton

The Medieval Mind, By H. O. Taylor

صاحب موسیٰ علیہ السلام

(۱۶) آیت (۶۵) میں حضرت موسیٰ کے جس شخص سے ملنے کا ذکر کیا گیا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم عطا فرمایا تھا، وہ کون تھا؟ اس بارے میں قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی ہے لیکن صحیحین کی روایت سعید بن جبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا نام خضر تھا۔

اس بارے میں بہت سی روایتیں مفسرین نے نقل کر دی ہیں جن کی صحت محل نظر ہے اور تصریحات متناقض، اور زیادہ تر اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔

ذوالقرنین

(۱۷) اس سورت میں تیسرا واقعہ جو بیان کیا گیا ہے، وہ ذوالقرنین کا ہے۔ کیونکہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا۔ تمام مفسرین متفق ہیں کہ سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگرچہ غالباً مشرکین مکہ کی زبانی ہوا کیونکہ سورت مکی ہے۔

(ل) قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے، اُس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے، تو حسب ذیل امور سامنے آجاتے ہیں:

اولاً جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے، وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا یعنے ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے، پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے کیونکہ فرمایا ویسئلونک عن ذی القرنین (۸۳)

ثانیاً اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اُسے حکمرانی عطا فرمائی تھی، اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمراں کے لیے ہو سکتا تھا، اس کے لیے فراہم ہو گیا تھا۔

ثالثاً اس کی بڑی مہمیں تین تھیں۔ پہلے مغربی ممالک فتح کیے۔ پھر مشرقی۔ پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا جہاں پہاڑی درہ تھا، اور اُس کی دوسری طرف سے یاجوج اور ماجوج آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

رابعاً، اُس نے وہاں ایک نہایت محکم سد تعمیر کر دی اور یاجوج و ماجوج کی راہ بند ہو گئی۔

خامساً، وہ ایک عادل حکمراں تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا، تو ایک قوم ملی جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کریگا۔ لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جو لوگ نیک عملی کی راہ چلینگے، اُن کے لیے ویسا ہی اجر بھی ہوگا۔ البتہ ڈرنا انہیں چاہیے جو جرم و بدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں (۸۵)

سادساً، وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا، اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔ (۸۷) (۹۸)

سابعاً، وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا۔ جب ایک قوم نے کہا، یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے اور اُن کے درمیان ایک سد تعمیر کر دیں، ہم خراج دینگے، تو اس نے کہا ما مکنی فیہ ربی خیر، جو کچھ خدا نے مجھے

سے رکھا ہے وہی میرے لیے بہتر ہے۔ میں تمہارے خراج کا طامع نہیں۔ یعنی میں خراج کی طمع سے یہ کام نہیں کروں گا بلکہ اپنا فرض سمجھ کر انجام دوں گا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف و اعمال پائے جائیں، وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

مفسرین کی حیرانی

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس کے لقب کا تھا۔ عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے صاف معنی سینگ کے ہیں۔ یعنی "ذوالقرنین" کا مطلب ہوا دو سینگوں والا۔ لیکن چونکہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب رہا ہو، اس لیے مجبوراً "قرن" کے معنی میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے۔ پھر چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے، اس لیے متاخرین کی نظریں اسی کی طرف اٹھیں۔ چنانچہ امام رازی نے سکندر ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ اور اگرچہ حسب عادت وہ تمام اعتراضات نقل کر دیے ہیں جو اس تفسیر پر وارد ہوتے ہیں، لیکن پھر حسب عادت ان کے بے محل جوابات پر مطمئن بھی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو وہ خدا پرست تھا۔ نہ عادل تھا۔ نہ مفتوح قوموں کے لیے فیاض تھا، اور نہ ہی اس نے کوئی سد بنائی۔

بہرحال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگا سکے۔

دانیال نبی کا خواب

اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا، تو وہ صرف ایک دور کا اشارہ تھا جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے۔ یعنی ایک خواب جو انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانے میں دیکھا تھا۔

بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لیے نہایت مایوسی کا زمانہ تھا۔ ان کی قومیت پامال ہو چکی تھی، ان کا ہیکل منہدم ہو چکا تھا، ان کے شہر اجاڑ تھے، اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس ہلاکت کے بعد ان کی زندگی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں حضرت دانیال کا ظہور ہوا جو اپنے علم و حکمت کی وجہ سے شاہان بابل کے دربار میں نہایت مقرب ہو گئے تھے۔ انہی کی نسبت تورات میں بیان کیا گیا ہے کہ بیلشضر شاہ بابل کی سلطنت کے تیسرے برس انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا، اور اس خواب میں انہیں آنے والے واقعات کی بشارت دی گئی تھی۔

چنانچہ کتاب دانیال میں ہے "میں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا کہ پچھم، اتر، اور دکھن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھو پچھم کی طرف سے ایک بکرا آ کے تمام روئے زمین پر پھر گیا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا، اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے" (دانیال ۱:۸) پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اس نے اس خواب کی یہ تعبیر بتلائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا مادہ اور فارس کی بادشاہت ہے۔ اور بال والا بکرا یونان کی۔ جو بڑا سینگ اس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے، وہ اس کا پہلا بادشاہ ہوگا (۸: ۱۵)

دو سینگوں والی شہنشاہی

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میڈیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی، اور چونکہ یہ دونوں مملکتیں مل کر ایک شہنشاہی بننے والی تھیں، اس لیے شہنشاہ مادہ و فارس کو دو سینگوں والے مینڈھے کی شکل میں ظاہر کیا گیا۔ پھر جس مینڈھے کو جس نے شکست دی، وہ یونان کے بکرے کا پہلا سینگ تھا یعنی سکندر مقدونی تھا جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیانی شہنشاہی کا خاتمہ ہو گیا۔

اس خواب میں بنی اسرائیل کے لیے بشارت یہ تھی کہ ان کی آزادی و خوشحالی کا نیا دور اسی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا یعنی شہنشاہ فارس بابل پر حملہ کر کے فتح مند ہونے والا تھا، اور پھر اسی کے ذریعہ بیت المقدس کی از سر نو تعمیر اور یہودی قومیت کی دوبارہ شیرازہ بندی ہونے والی تھی چنانچہ چند برسوں کے بعد سائرس کا ظہور ہوا۔ اس نے میڈیا اور پارس کی مملکتیں ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قائم کر دی، اور پھر بابل پر پے در پے حملے کر کے اسے مسخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی، اس لیے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لیے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تخیل پیدا ہو گیا ہو۔ یعنے دو سینگوں والی شہنشاہی، اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں۔ تاہم یہ محض ایک قیاس تھا۔ اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔

سائرس کے مجسمہ کا اکتشاف

لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظر عام پر آئے، اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا، اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگان فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔

اس انکشاف نے شک و تخمین کے تمام پردے اٹھا دیے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو اصطخر (Pasargadae) کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا۔ اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اوپر خط میخی میں جو کتبہ کندہ تھا، اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے مگر جس قدر باقی ہے، وہ اس کے لیے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے[۱]۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مادا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول و عام تخیل تھا، اور یقیناً سائرس کو "ذوالقرنین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پروں کا ہونا اس کے ملکوتی صفات و فضائل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔

دو سینگوں کا تخیل ابتدا میں کیونکر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد دانیال نبی کا خواب تھا یا بطور خود سائرس نے یا باشندگان پارس نے یہ تخیل پیدا کیا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے، لیکن اگر تورات کی روایات تسلیم کر لی جائیں تو سائرس سے لیکر آرٹا زرکسیز[۲] (ارتخششت اول) تک، تمام شہنشاہان پارس انبیاء بنی اسرائیل سے عقیدت رکھتے تھے، اور اس لیے ہو سکتا ہے کہ اسی خواب سے "ذوالقرنین" کا لقب پیدا ہو گیا ہو۔ بہرحال اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ سائرس کو ذوالقرنین سمجھا جاتا تھا، اور یقیناً عرب کے یہودی بھی اسے اسی لقب سے پکارا کرتے تھے۔

(ب) اس حقیقت کی وضاحت کے بعد جب سائرس کے ان حالات پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی مورخوں کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بیان کی ہو بہو تصویر ہے، اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کا وہم و گمان بھی کیا جا سکے۔

سائرس کے حالات کے تاریخی مصادر

زمانۂ حال کے محققین تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عہد حملۂ اسکندر سے پہلے کا ہے۔ دوسرا پارتھوی یا ملوک الطوائف کا۔ تیسرا ساسانی سلاطین کا۔ فارسی شہنشاہی کی عظمت کا اصلی عہد وہی ہے جو حملۂ اسکندر سے پہلے گزرا اور جس کی تاریخ سائرس کے ظہور سے شروع ہوتی ہے، لیکن بدقسمتی سے اس عہد کے حالات معلوم کرنے کے براہ راست ذرائع مفقود ہو گئے ہیں[۳]۔ جس قدر بھی حالات روشنی میں آئے ہیں، تمام تر یونانی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ان میں زیادہ معتمد تین مورخ ہیں: ہیروڈوٹس (Herodotus) ٹی سیاز (Ctesias) اور زینوفن (Xenophon)

فتح ایران کے بعد جب عرب مورخین نے ایران کی تاریخ مرتب کرنی چاہی تو انہیں جس قدر مواد ہاتھ آیا، وہ تمام تر پارسیوں کی

---

[۱] اس تمثال کے لیے فرنچ مصنف Marcel Dieulafoy کی L'art antique en Perse دیکھنی چاہیے۔

[۲] یاد رکھنا چاہیے کہ شاہان فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں، اور اس کی وجہ سے مورخوں نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ سائرس کا اصلی نام غالباً گورو یا گوروش تھا جیسا کہ دارا کے کتبۂ بے ستون سے معلوم ہوتا ہے، لیکن یونانی اسے سائرس Cyrus کہنے لگے اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا، چنانچہ یسعیاہ، ارمیاہ، اور دانیال کے صحائف میں جا بجا یہ نام آیا ہے۔ اور یہی گورش ہے جس نے عربی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی چنانچہ عرب مورخ اسے کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔ سائرس کا لڑکا کیمبی سیز Cambyses ہوا۔ یہ بھی یونانی تلفظ ہے۔ اس کا پارسی نام کمبوجیہ تھا۔ جس نے یہودیوں اور عربوں کی زبان پر کیقباد کی شکل اختیار کر لی۔ شاہنامہ نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ کیونکہ اس کی بنیاد عربی تراجم پر تھی۔ کیقباد کے بعد دارا یودوش ہوا جسے عام طور پر دارا کے نام سے پکارا جاتا ہے اور تورات میں بھی یہی نام آیا ہے۔ دارا کے بعد ارٹازرکسیز ہے۔ اسے تورات میں ارتخششت کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور عربوں میں اردشیر مشہور ہو گیا۔

[۳] دارا اور دارا دوم کے چند کتبوں کو اس سے مستثنیٰ کر دینا چاہیے جو مرودشت کے گرد و نواح میں موجود ہیں جہاں قدیم دارالحکومت اصطخر آباد تھا۔ ان کتبوں سے خصوصاً دارا کے کتبہ بے ستون سے بعض اہم تاریخی انکشافات ہوئے ہیں، اور ہیروڈوٹس کے بعض بیانات کی تصدیق بھی ہو گئی ہے۔

قومی روایات پر مشتمل تھا۔ ان روایات میں حملۂ اسکندر سے پہلے کا زمانہ اسی طرح کے قومی افسانوں کی نوعیت رکھتا ہے جس طرح ہندوستان میں پرانوں کے افسانے یا مہابھارت اور رامائن کے قصے ہیں۔ البتہ پچھلے دو عہدوں کی روایتیں تاریخی بنیادوں پر مبنی تھیں جب دقیقی اور فردوسی نے شاہنامہ نظم کرنا چاہا تو انہیں عربی میں یہی مواد ملا، اور اسی کو انہوں نے نظم کا جامہ پہنا دیا۔ پس یہ تمام ذخیرہ قبل از اسکندر عہد کے لیے کچھ سودمند نہیں ہے۔ اور سائرس کے حالات کے لیے ہمیں تمام تر یونانی مورخین کی شہادت ہی پر اعتماد کرنا

پارس اور میڈیا

حضرت مسیح سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے ایران کی سرزمین دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا، اور شمال مغربی میڈیا[1]۔ چونکہ ان کے ہمسایہ میں آشوری اور بابلی حکومتیں انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھیں، اس لیے قدرتی طور پر یہ اُن سے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں مملکتوں میں مختلف قبائل کے امرا تھے جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے تھے۔ ۱۲ ۶ قبل مسیح میں جب نینوی تباہ ہوگیا اور آشوری فرماں روائی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی، تو میڈیا کے باشندے آزاد ہوگئے، اور بتدریج ایک قومی حکومت نشوونما پانے لگی۔ اسی طرح پارس کے امرا قبائل میں سے بھی بعض امیروں کو سر اُٹھانے کا موقعہ ملا، اور حکمراں خاندان پیدا ہوگیا۔ تاہم یہ دونوں مملکتیں وقت کی بے اثر حکومتیں تھیں، اور بابل کی شہنشاہی جسے نبوکدریزر (بخت نصر) کی قاہرانہ فتح مندیوں نے تمام ایشیا میں سربلند کر دیا تھا سب پر چھائی ہوئی اور سب کو مقہور کیے ہوئے رہتی۔

سائرس کا ظہور

لیکن ۵۵۹ قبل از مسیح میں ایک غیر معمولی شخصیت غیر معمولی حالات کے اندر اُبھری اور اچانک تمام دنیا کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ یہ پارس کے ایک حکمراں خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا جسے یونانیوں نے سائرس، عبرانیوں نے خورس، اور عربوں نے کے خسرو کے نام سے پکارا۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ پھر بغیر کسی خوں ریزی کے میڈیا کی مملکت پر فرماں روا ہوگیا، اور اس طرح دونوں مملکتوں نے مل کر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت اختیار کرلی!

پھر اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ فتوحات نہیں جو ظلم و قہر کی خوں ریزیوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھیں بلکہ انسانیت و عدالت کی فتوحات جو تمام تر اس لیے تھیں کہ مظلوم قوموں کی دادرسی اور پامال ملکوں کی دستگیری ہو۔ چنانچہ ابھی بارہ برس کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحر اسود سے لے کر بکٹریا (باختر) تک ایشیا کی تمام عظیم الشان مملکتیں اُس کے آگے سربسجود ہوچکی تھیں!

ابتدائی زندگی

دنیا کی تمام غیر معمولی شخصیتوں کی طرح سائرس کے ابتدائی حالات نے بھی ایک پُراسرار افسانہ کی نوعیت اختیار کرلی ہے، اور یہیں اُس کی جھلک شاہنامہ کے افسانوں میں صاف صاف نظر آجاتی ہے۔ اُس کا اُٹھان زندگی کے عام اور معمولی حالات میں نہیں ہوا، بلکہ ایسے عجیب حالات میں جو ہمیشہ پیش نہیں آتے، اور جب کبھی پیش آتے ہیں تو یہ قدرت کی ایک غیر معمولی کرشمہ سنجی ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ پیدا ہو، اُس کے نانا استیاگس (Astyages) نے اس کی موت کا سامان کر دیا تھا، لیکن وہ ایک حیرت انگیز طریقہ پر بچا لیا جاتا ہے، اور اس کی ابتدائی زندگی جنگلوں اور پہاڑوں میں بسر ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس کی غیر معمولی قابلیتیں اور اعلیٰ اخلاق و خصائل اُسے ملک میں نمایاں کرتے ہیں اور اُس کی خاندانی شخصیت پہچان لی جاتی ہے۔ اب اُسے پورا موقعہ حاصل تھا کہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے لیکن اُسے ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا خیال نہیں گزرتا حتیٰ کہ خود استیاگس کی زندگی بھی اس کے ہاتھوں محفوظ رہتی ہے۔

لیڈیا کی فتح

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اُسے پیش آئی، وہ لیڈیا (Lydia) کے پادشاہ کروئسس (Croesus) سے تھی۔ لیکن تمام مورخین متفق ہیں کہ حملہ کروئسس کی طرف سے ہوا تھا، اور اس نے سائرس کو دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ لیڈیا سے مقصود ایشیائے کوچک کا مغربی اور شمالی حصہ ہے، جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا، اور اس کی حکومت بھی اپنے تمام خصائص میں ایک یونانی حکومت تھی۔ جنگ میں سائرس فتح یاب ہوا۔ لیکن رعایا کے ساتھ کسی طرح کی بدسلوکی نہیں کی گئی۔ کہنیر

[1] دارا کے کتبۂ بےستون میں اس کا نام مادا آیا ہے، اس سے میڈیا یونانی تلفظ بن گیا ہے۔ عرب مورخوں نے اسے ماہات سے تعبیر کیا ہے۔

[2] دارا نے بےستون کے کتبہ میں اپنا سلسلۂ نسب ہخامنش نامی پادشاہ تک پہنچایا ہے یہی ہخامنش یونانی میں (Achaemenes) ہوگیا۔ ہیروڈوٹس کی روایت کے مطابق یہ سائرس کا پردادا تھا، یعنے ایکی مینز سے ٹیسپیز (چاش پش) پیدا ہوا۔ اس سے کمبی سیز (کمبوجیا کیقباد) اول اور کمبی سیز سے سائرس۔ سائرس نے اپنے بیٹے کا نام بھی کمبی سیز رکھا تھا۔

محسوس بھی نہیں ہوا کہ ملک ایک انقلاب جنگ کی حالت سے گزر رہا ہے۔ البتہ کروسس کی نسبت یونانی روایت یہ ہے کہ اس کے عزم وہمت کی آزمائش کے لیے سائرس نے حکم دیا تھا، چتا طیار کی جائے اور اُسے جلا دیا جائے، لیکن جب اُس نے دیکھا وہ مردانہ وار چتا پر بیٹھ گیا ہے، تو فوراً اُس کی جاں بخشی کر دی، اور اُس نے بقیہ زندگی عزت و احترام کے ساتھ بسر کی۔

مشرقی فتوحات

اس جنگ کے بعد اُسے مشرق کی طرف متوجہ ہونا پڑا، کیونکہ گیڈروسیا (مکران) اور بکٹریا (بلخ) کے وحشی قبائل نے سرکشی کی تھی۔ یہ مہم ۵۴۵ء اور ۵۴۰ء قبل مسیح کی درمیانی مدت میں واقع ہوئی ہوگی۔

فتح بابل

تقریباً یہی زمانہ ہے جب باشندگانِ بابل نے اس سے درخواست کی تھی کہ بیل شازار[۱] (Belshazzar) کے مظالم سے انہیں نجات دلائے۔

نینویٰ کی تباہی نے ایک نئی بابلی شہنشاہی کی بنیادیں استوار کر دی تھیں اور نبوکد رزار (بخت نصر) کی قاہرانہ فتوحات نے تمام مغربی ایشیا کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کا حملۂ بیت المقدس تاریخ کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے۔ وہ صرف بادشاہوں کو مسخر ہی نہیں کرتا تھا بلکہ قوموں کو غلام بناتا اور ملکوں کو تباہ کر ڈالتا تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس کی جنگ جویانہ قوتوں کی جانشین ہوتی۔ اس کے بعد بابل کے مندروں کے پوجاریوں نے (جو ملک میں سب سے زیادہ اثر و مقبولیت رکھتے تھے) نابونی دس (Nabonidus) کو تخت نشین کیا تھا، لیکن اس نے حکومت کا تمام کاروبار بیل شازار کے ہاتھ چھوڑ دیا جو ظلم و عیاشی کا مجسمہ تھا۔ اسی کی نسبت دانیال نبی کے صحیفہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ بیت المقدس کے ہیکل کے مقدس پیالوں میں اس نے شراب پی تھی، اور ایک غیبی ہاتھ نے نمایاں ہو کر "منے منے تقیل ادفرسین" کے الفاظ دیوار پر لکھ دیے تھے (دانیال ۵: ۱)

تمام مورخین متفق ہیں کہ اُس عہد میں بابل سے زیادہ مستحکم اور ناقابلِ فتح کوئی شے نہ تھی۔ اس کی چار دیواری اتنی موٹی، تہ در تہ، اور اونچی تھی، کہ اُسے مسخر کرنے کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بایں ہمہ سائرس نے باشندگانِ بابل کی فریاد پر لبیک کہا اور رودآبہ کا تمام علاقہ فتح کرتا ہوا شہر کے سامنے نمودار ہو گیا۔ چونکہ خود باشندگانِ شہر بیل شازار کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے اور سائرس کے لیے چشم براہ تھے، اس لیے انہوں نے ہر طرح اس کا ساتھ دیا۔ خود بابلی مملکت کا ایک سابق گورنر گوب ریاس (Gobryas) اُس کی فوج کے ساتھ تھا۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ اسی شخص نے دریا میں نہریں کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری طرف ڈال دیا، اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ قبل اس کے کہ خود سائرس شہر میں پہنچے شہر فتح ہو چکا تھا!

بنی اسرائیل کی رہائی اور ہیکل کی تعمیر

تورات کی شہادت یہ ہے کہ سائرس کا ظہور اور بابل کی فتح بنی اسرائیل کے لیے زندگی و خوشحالی کا نیا پیام تھا، اور یہ ٹھیک اُسی طرح ظہور میں آئی جس طرح یسعیاہ نبی نے ایک سو ساٹھ برس پہلے اور یرمیاہ نے ساٹھ برس پہلے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خبر دیدی تھی۔ چنانچہ سائرس نے دانیال نبی کی نہایت توقیر کی، یہودیوں کو یروشلم میں بسنے کی اجازت دیدی نیز اپنی تمام مملکت میں اعلان کیا کہ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یروشلم میں اُس کے لیے ایک ہیکل بناؤں (یعنے قدیم برباد شدہ ہیکل سلیمان کو ازسرِنو تعمیر کروں) پس تمام لوگوں کو ہر طرح کا ساز و سامان اس کے لیے مہیا کرنا چاہیے۔" اُس نے سونے چاندی کے وہ تمام ظروف جو نبوکد رزار ہیکل سے لوٹ کر لایا تھا، بابل کے خزانہ سے نکلوائے اور یہودیوں کے ایک امیر شیش بضر کے حوالے کر دیے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد اس میں بدستور رکھ دیے جائیں (عزرا۔ باب اول)

بابل کی فتح کے بعد سائرس کی عظمت تمام مغربی ایشیا میں مسلم ہو گئی۔ ۵۳۹ء قبل مسیح میں صرف اسی کی تنہا شخصیت عظمت و حکمرانی کے عالمگیر تخت پر نمایاں نظر آتی ہے۔ بارہ برس پہلے وہ پارس کے پہاڑوں کا ایک گمنام انسان تھا، لیکن اب ان تمام

---

[۱] دانیال نبی کی کتاب میں اسے جا بجا بیلشضر کے نام سے پکارا گیا ہے، لیکن بابل کے کتبوں سے اس کا صحیح نام جو معلوم ہوا ہے وہی ہے۔ علاوہ بریں معلوم ہوتا ہے کہ نوشتہ کے لکھنے والوں نے سائرس اور دارا کے دو مختلف حملوں کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا ہے، اور کہیں سائرس کی جگہ دارا کا نام آ گیا ہے کہیں دارا کی جگہ سائرس کا۔ تاریخی حیثیت سے جو واقعہ ثابت ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ بابل پر فارس کے دو حملے ہوئے ہیں۔ پہلا سائرس نے کیا، دوسرا دارا نے۔ سائرس نے بابل فتح کر کے اس کی اندرونی حکومت وطنی امراء کے ہاتھ چھوڑ دی تھی۔ پھر تقریباً بیس برس بعد امراء بابل نے بغاوت کی، اور دارا مجبور ہوا کہ دوبارہ بابل کو فتح کرے۔

مملکتوں کا تنہا فرمانروا تھا، جو صدیوں تک قوموں کی ابتدائی عظمتوں اور فتح مندیوں کا مرکز رہ چکی ہیں۔ فتح بابل کے بعد وہ تقریباً دس برس تک زندہ رہا اور ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال کر گیا۔

سائرس کے ظہور کی پیشین گوئیاں

(۱۰) لیکن قبل اس کے کہ قرآن کے بیان کردہ حالات پر نظر ڈالی جائے اس بات پر غور کر لینا چاہیے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں اس شخصیت کے بارے میں کیا تھیں، اور یہودیوں کے اعتقاد میں کس طرح وہ حرف بہ حرف پوری ہوئیں!

اس سلسلہ میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسعیاہ نبی کی ہے، جن کا ظہور سائرس کے فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے بیت المقدس کی تباہی کی خبر دی ہے کہ بابل کے ہاتھوں ظہور میں آئیگی۔ اس کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی ہے، اور اس سلسلہ میں خورس (سائرس) کے ظہور کا ذکر کیا ہے: "خداوند تیرا نجات دینے والا یوں فرماتا ہے کہ..... یروشلم پھر آباد کیا جائیگا۔ یہوداہ کے شہر بنائے جائینگے۔ میں اُس کے ویران مکانوں کو تعمیر کرونگا۔........ میں خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے۔ وہ میری ساری مرضی پوری کریگا.......... خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اُس کا دہنا ہاتھ پکڑا تاکہ قوموں کو اُس کے قابو میں کردوں اور پادشاہوں کی کمریں کھلوا دوں، اور دوہرے دروازے اس کے لیے کھول دوں۔ ہاں، میں تیرے آگے چلونگا۔ میں ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کرونگا۔ میں پیتل کے دروازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دونگا۔ میں گڑے ہوئے خزانے اور چھپے ہوئے مکانوں کے گنج تجھے عطا کرونگا اور یہ سب کچھ اس لیے کرونگا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا ہے" (یسعیاہ ۲۱: ۲۴)

اس پیشین گوئی میں خدا کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ خورس (سائرس) میرا چرواہا ہوگا، اور میں نے اُسے اس لیے پکارا ہے کہ بنی اسرائیل کو بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے۔ نیز اُسے "خدا کا مسیح" بھی کہا ہے۔

اسی طرح یرمیاہ نبی نے ساٹھ برس پہلے پیشین گوئی کی تھی "قوموں کے درمیان منادی کرو اور اسے مت چھپاؤ۔ تم کہو، بابل لے لیا گیا۔ بعل رسوا ہوا۔ مرودک سراسیمہ کیا گیا۔ اُس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیونکہ اُتر سے ایک قوم اُس پر چڑھتی ہوئی آرہی ہے جو اس کی سرزمین اُجاڑ دیگی یہاں تک کہ اس میں کوئی نہیں رہیگا" (۵۰: ۱)

یرمیاہ نبی نے اس کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی کہ ستر برس تک یہودی بابل میں قید رہینگے، اور اس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر ہوگی "خداوند کہتا ہے۔ جب بابل پر ستر برس گزر چکینگے تو میں تمہاری خبر لینے آؤنگا۔ تب تم مجھے پکاروگے اور میں جواب دونگا۔ تم مجھے ڈھونڈھوگے اور مجھے پاؤگے۔ میں تمہاری اسیری ختم کر دونگا۔ تمہیں تمہارے مکانوں میں واپس لے آؤنگا" (۲۹: ۱۰)

اس پیشین گوئی میں خدا نے اپنی رحمت کی واپسی کو فتح بابل کے واقعہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ گویا سائرس کا ظہور اُس کی رحمت کا ظہور ہوگا جو بنی اسرائیل پر پھر لوٹ آئیگی۔

پیشین گوئیوں کی تاریخی حیثیت

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا، تو دانیال نبی نے (جو شاہان بابل کے وزراء میں داخل ہوگئے تھے) اسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھائی کہ ایک سو ساٹھ برس پہلے اُس کے ظہور کی خبر دیدی گئی تھی۔ یہ بات دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا، اور بیان کیا جاتا ہے کہ اسی کا نتیجہ وہ فرمان تھا جو اس نے تعمیر ہیکل کے لیے جاری کیا۔

زمانۂ حال کے نقادان پیشین گوئیوں کی اصلیت پر مطمئن نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہوسکتا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں واقعات کے ظہور کے بعد بڑھادی گئی ہوں۔ خصوصاً یسعیاہ کی پیشین گوئی جس میں صریح خورس (سائرس) کا نام موجود ہے۔ لیکن وہ اس اشتباہ کی تائید میں عقلی استغراب کے سوا اور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے، اور محض عقلی استغراب ان صحائف کے خلاف حجت نہیں ہوسکتا جن کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ الہام سے لکھے گئے تھے۔ علاوہ بریں تورات کے آخری صحائف جو فتح بیت المقدس کے اثناء میں یا اسیری بابل کے زمانے میں لکھے گئے ہیں تاریخی حیثیت سے محفوظ تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت سے برابر یہودیوں میں متداول رہے، اور کوئی حادثہ ایسا رونما نہیں ہوا کہ ان کے نسخے نابود ہوگئے ہوں۔ ممکن ہے کہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں بھی دانیال نبی کے خواب کی طرح خورس کا نام نہ بتلایا گیا ہو۔ صرف قوم و ملک کا ذکر ہو، اور بعد کو یہ نام بڑھا دیا گیا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد برابر یہی رہا کہ سائرس کا ظہور نبیوں کی پیشین گوئی کے مطابق ہوا تھا، اور وہ خدا کی ایک فرستادہ

ہستی تھی جو اسی لیے پیدا کی گئی تھی کہ مظلوموں کی دادرسی ہو، اور بابلیوں کے ظلم و شرارت سے قوموں کو نجات ملے۔

قرآن کی تصریحات اور سائرس

(۱۹) اب غور کرو۔ قرآن کی تصریحات نے جو جامہ طیار کیا ہے، وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک صرف سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے؟ ہم نے اس بحث کے آغاز میں تصریحاتِ قرآنی کا خلاصہ دیدیا ہے جو سات دفعات پر مشتمل ہیں۔ ان پر پھر ایک نظر ڈال لو۔

(۱) سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاسکتی تھی، تو وہ صرف سائرس ہی کی تھی نبیوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق، دانیال نبی کے خواب کا ظہور، رحمتِ الٰہی کی واپسی کی بشارت، بنی اسرائیل کا نجات دہندہ، خدا کا فرستادہ چرواہا اور مسیح، یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ! پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسی کی نسبت ان کا سوال ہو؟

سدی کی ایک روایت میں بھی جو قرطبی وغیرہ نے نقل کی ہے، اس طرف صریح اشارہ ملتا ہے: قال، قالت الیھود۔ اخبرنا عن نبی لم یذکرہ اللہ فی التوراۃ الا فی مکان واحد۔ قال ومن؟ قالوا ذوالقرنین۔ یعنے یہودیوں نے آنحضرت سے کہا اُس نبی کی نسبت ہمیں خبر دیجیے جس کا نام تورات میں صرف ایک ہی مقام پر آیا ہے۔ آپ نے فرمایا، وہ کون؟ کہا ذوالقرنین۔ چونکہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا اشارہ صرف دانیال نبی کے خواب ہی میں آیا ہے، اس لیے یہودیوں کا یہ بیان ٹھیک ٹھیک اسی طرف اشارہ تھا۔

علاوہ بریں سائرس کے تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکارا کردی ہے کہ اس کے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا، اور یہ فارس اور ماد کی مملکتوں کے اجتماع و اتحاد کی علامت تھی۔

تفسیر انا مکنا لہ فی الارض

(۲) اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لاؤ۔ سب سے پہلا وصف جو اس کا بیان کیا ہے، یہ ہے کہ انا مکنا لہ فی الارض، واتیناہ من کل شئی سببا (۸۴) ہم نے اُسے زمین میں قدرت دی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کردیا تھا۔ قرآن جب کبھی انسان کی کسی کامرانی و خوشحالی کو براہ راست خدا کی طرف منسوب کرکے کہتا ہے جیسا کہ یہاں کہا ہے، تو اس سے مقصود عموماً کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو عام حالات کے خلاف محض اس کے فضل و کرم سے ظہور میں آئی ہو۔ مثلاً حضرت یوسف کی نسبت فرمایا۔ کذالک مکنا لیوسف فی الارض (۱۲:۵۶) اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کو حکومت دیدی۔ "ہم نے دیدی" کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کو ہر طرح کے ناموافق حالات میں محض فضل الٰہی سے ایک غیر معمولی بات حاصل ہوئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ عام حالات کے مطابق ظہور میں آئی ہو۔ پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو بھی حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں، اور انہیں محض توفیق الٰہی کی کرشمہ سازی سمجھا جاسکے۔ کیونکہ اس کے تمکن فی الارض کو براہ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے۔

لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس آیت کی تصویر ہے۔ اُس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دیدی ہے۔ قبل اس کے کہ پیدا ہو، خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہشمند ہوگیا تھا۔ ایک وفادار آدمی کی زندگی بچاتا ہے، اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہوکر ایک گمنام گڈریے کی طرح پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر اچانک نمایاں ہوتا ہے، اور بغیر کسی جنگ و مقابلہ کے میڈیا کا تخت اس کے لیے خالی ہوجاتا ہے! یقیناً یہ صورتِ حال واقعات و حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو۔ نوادر ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے، اور صاف نظر آرہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی خاص مقصد سے ایک خاص ہستی طیار کر رہا ہے، اور زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے تاکہ اُس کی راہ صاف ہوجائے!

تین مہمیں

(۳) اس کے بعد اُس کی تین بڑی مہموں کا ذکر آتا ہے۔ ایک مغرب الشمس کی طرف یعنے پچھم کی طرف۔ ایک مطلع الشمس کی طرف یعنے پورب کی طرف[1]۔ تیسری ایک ایسے مقام تک جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی اور یاجوج اور ماجوج وہاں آکر لوٹ مار مچایا کرتے

[1] یاد رہے کہ پچھم اور پورب کے لیے مغرب الشمس اور مطلع الشمس کی تعبیر تورات میں بھی جابجا آئی ہے۔ مثلاً ذکریا نبی کی کتاب میں ہے "رب الافواج فرماتا ہے۔ میں اپنے لوگوں کو سورج نکلنے کے ملک اور اُس کے ڈوبنے کے ملک سے چھڑا لونگا (۸:۷)"

تھے۔ اب دیکھو یہ تمام تفصیلات کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں؟

مغربی مہم

اوپر پڑھ آئے ہو کہ سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر رکھا ہی تھا کہ ایشیائے کوچک کے بادشاہ کروسس نے حملہ کر دیا۔ ایشیائے کوچک کی یہ بادشاہت جو لیڈیا کے نام سے مشہور ہوئی پچھلی صدی کے اندر ابھری تھی۔ اس کا دارالحکومت سارڈیس (Sardis) تھا۔ سائرس کی تخت نشینی سے پہلے میڈیا اور لیڈیا میں کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ بالآخر کروسس کے باپ نے سائرس کے نانا استیاگس کے باپ سے صلح کر لی، اور باہمی اتحاد کے استحکام کے لیے باہمی ازدواج کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ لیکن کروسس نے یہ تمام عہد و پیمان اور باہمی علائق بھلا دیے۔ وہ سائرس کی یہ کامرانی برداشت نہ کر سکا کہ فارس اور میڈیا کی مملکتیں متحد ہو کر ایک عظیم مملکت کی حیثیت اختیار کر رہی ہیں۔ اس نے پہلے بابل، مصر اور اسپارٹا کی مملکتوں کو اس کے خلاف ابھارا، اور پھر اچانک حملہ کر کے سرحدی شہر پٹیریا (Pteria) پر قبضہ کر لیا۔

اب سائرس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف اس حملہ کا مقابلہ کرے۔ وہ میڈیا کے دارالحکومت اگ متانہ سے[1] (جو اب ہمدان کے نام سے پکارا جاتا ہے) نکلا، اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد جو پٹیریا اور سارڈیس کے قریب واقع ہوئی تھیں لیڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا!

ہیرو ڈوٹس نے اس جنگ کی سرگزشت پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے، اور اس کی بعض تفصیلات نہایت دلچسپ اور اہم ہیں لیکن یہ موقعہ ان کا نہیں[2] ... یہ سائرس کی فتح مندی ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پٹیریا کے معرکہ کے بعد صرف چودہ دن کے اندر لیڈیا کا مستحکم دارالحکومت مسخر ہو گیا، اور کروسس ایک جنگی قیدی کی حیثیت میں سائرس کے آگے سرنگوں کھڑا تھا!

وجدها تغرب في عين حمئة

اب تمام ایشیائے کوچک، بحر شام سے لیکر بحر اسود تک اس کے زیر نگین تھا۔ وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر اسی طرح رک گئے جس طرح بارہ سو سال بعد طارق کے قدم افریقہ کے شمالی ساحل پر رک جانے والے تھے۔ اس کے فتح مند قدموں کے لیے صحراؤں کی وسعتیں اور پہاڑوں کی بلندیاں روک نہ ہو سکیں۔ اس نے فارس سے لے کر لیڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن سمندر کی موجوں پر چلنے کے لیے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حد نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا، اور سورج اس کی لہروں میں ڈوب رہا تھا!

یہ لشکر کشی جو اسے پیش آئی، صریح مغرب کی لشکر کشی تھی۔ کیونکہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کے مغربی کنارہ تک پہنچ گیا۔ یہ اس کے لیے مغرب الشمس کی آخری حد تھی۔

ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالو۔ تم دیکھو گے کہ تمام ساحل اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں، اور سمرنا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی سی شکل دیدی ہے۔ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل سے قریب تھا، اور اس کا محل موجودہ سمرنا سے بہت زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔ پس جب سائرس سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہوگا تو یقیناً بحر ایجین کے اسی ساحلی مقام پر پہنچا ہوگا، جو سمرنا کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے، ساحل کی کیچڑ سے پانی گدلا ہو رہا ہے، اور شام کے وقت اسی میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ وجدها تغرب في عين حمئة (۸۶) اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے!

ظاہر ہے کہ سورج کسی مقام میں بھی ڈوبتا نہیں لیکن ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں، تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ ایک سنہری تھالی آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہی ہے۔

مشرقی مہم

دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی، چنانچہ ہیرو ڈوٹس اور ٹی سیاز[3] دونوں اس کی مشرقی لشکر کشی کا ذکر کرتے ہیں۔ جو لیڈیا کی

---

[1] دانیال کے صحیفوں میں اس کا نام یہی آیا ہے مگر ہیرو ڈوٹس وغیرہ یونانی مورخوں نے اسے اک بتانا (Acbatana) لکھا ہے، اور یہی نام یورپ میں مشہور ہو گیا تھا۔

[2] ہیرو ڈوٹس ترجمہ اے۔ ڈی گاڈلی Godley (Loeb edition)

[3] ٹی سیاز (Ctesias) ایک یونانی تھا جو ۴۱۶ قبل مسیح سے لیکر ۳۹۸ قم تک شہنشاہ فارس کا درباری طبیب رہا۔ اور اس زمانہ کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی مشہور تاریخ لکھی۔ بعد کے یونانی مورخوں نے اس کے بعض بیانات شبہ کی نگاہ سے دیکھے ہیں، اور اس لیے اسے استناد کا وہ درجہ (بقیہ بر صفحہ ۴۰۷)

نتیجہ کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی، اور دونوں نے تصریح کی ہے کہ مشرق کے بعض وحشی اور صحرا نشین قبائل کی سرکشی اس کا باعث ہوئی تھی" یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس اشارہ کی تصدیق ہے کہ حتیٰ اذا بلغ مطلع الشمس وجدھا تطلع علیٰ قوم لم نجعل لھم من دونھا ستراً (۹۰) جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لیے کوئی آڑ نہیں رکھتی تھی۔ یعنی خانہ بدوش قبائل تھے۔

یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے؟ ان مورخین کی صراحت کے مطابق گیڈروسیا یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے۔ نقشہ پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائیگا کہ گیڈروسیا ٹھیک ٹھیک ایران کے لیے مشرق اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔ اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ گیڈروسیا کے وحشی قبیلوں نے اس کی مشرقی سرحد میں بدامنی پھیلائی تھی اور ان کی گوشمالی کے لیے اسے نکلنا پڑا۔ گیڈروسیا سے مقصود وہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہلاتا ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان کی طرف ہمیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ مکران سے نیچے اس کے قدم نہیں اترے ہونگے۔ اور اگر اترے ہونگے تو دریائے سندھ سے آگے نہیں بڑھے ہونگے۔ کیونکہ دارا کے زمانہ میں بھی اس کی جنوب مشرقی سرحد دریائے سندھ ہی تک معلوم ہوتی ہے۔

شمالی مہم

تیسری لشکرکشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یاجوج ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے۔ یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کاسپین) کو دہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا (Caucasus) کے سلسلۂ کوہ تک پہنچ گیا تھا، اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا۔ اسی راہ سے یاجوج ماجوج آکر اس طرف کے علاقہ میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے، اور یہیں اس نے سد تعمیر کی۔

قرآن نے اس مہم کا حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ حتیٰ اذا بلغ بین السدین، وجد من دونھما قوما لا یکادون یفقھون قولا (۹۳) یہاں تک کہ وہ دو (پہاڑی) دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ ان کے اس طرف اسے ایک قوم ملی جو کوئی بات بھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ پس صاف معلوم ہوتا ہے "سدین" سے مقصود کاکیشیا کا پہاڑی درہ ہے۔ کیونکہ اس کے دہنی طرف بحر خزر ہے جس نے شمال اور مشرق کی راہ روک دی ہے۔ بائیں جانب بحر اسود ہے جو شمال مغرب کے لیے قدرتی روک ہے۔ درمیانی علاقے میں اس کا سر بفلک سلسلۂ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے پس اگر شمالی قبائل کے حملوں کے لیے کوئی راہ باقی رہی تھی، تو وہ صرف اس سلسلۂ کوہ کا ایک عریض درہ یا وسطی وادی تھی، اور یقیناً وہیں سے یاجوج ماجوج کو دوسری طرف پہنچنے کا موقعہ ملتا تھا۔ اس راہ کے بند ہو جانے کے بعد نہ صرف بحر خزر سے لے کر بحر اسود تک کا علاقہ محفوظ ہو گیا بلکہ سمندروں اور پہاڑوں کی ایک ایسی دیوار قائم ہو گئی جس نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے لیا، اور شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا اب ایران، شام، عراق، عرب، ایشیائے کوچک، بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا

نقشہ میں یہ مقام دیکھو۔ تمام مغربی ایشیا نیچے ہے۔ اوپر شمال میں بحر خزر ہے۔ اس سے بائیں جانب شمال مغرب میں بحر اسود ہے۔ درمیان میں بحر خزر کے مغربی ساحل سے بحر اسود کے مشرقی ساحل تک کاکیشیا کا سلسلۂ کوہ چلا گیا ہے۔ ان دو سمندروں اور درمیان کے سلسلۂ کوہ نے مل کر سینکڑوں میلوں تک ایک قدرتی روک پیدا کر دی ہے۔ اب اس روک میں اگر کوئی شگاف رہ گیا تھا جہاں سے شمالی اقوام کے قدم اس روک کو لانگ سکتے تھے، تو وہ صرف یہی دو پہاڑوں کے درمیان کی راہ تھی۔ ذوالقرنین نے اسے بھی بند کر دیا، اور اس طرح شمال اور مغربی ایشیا کا یہ درمیانی پھاٹک پوری طرح مقفل ہو گیا!

شمالی قوم

باقی رہا یہ سوال کہ وہاں جو قوم ذوالقرنین کو ملی تھی اور جو بالکل ناسمجھ تھی، وہ کونسی قوم تھی؟ تو اس سلسلہ میں دو قومیں نمایاں ہوتی ہیں، اور دونوں کا اس زمانہ میں وہاں قریب قریب آباد ہونا تاریخ کی روشنی میں آچکا ہے۔ پہلی قوم وہ ہے جو بحر خزر کے مشرقی ساحل پر آباد تھی۔ اسے یونانی مورخوں نے "کاسپین" کے نام سے پکارا ہے، اور اسی کے نام سے بحر خزر کا نام بھی "کاسپین" پڑ گیا ہے۔ دوسری قوم وہ ہے جو اس مقام سے آگے بڑھ کر عین کاکیشیا کے دامن میں آباد تھی۔ یونانیوں نے اسے "کولچی" یا "کول شی" کے نام سے پکارا ہے

بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰۶:

حاصل نہ ہو سکا جو ہیروڈوٹس (المتوفی [illegible] قبل مسیح) کی تاریخ کو حاصل ہوا ہے، گو موجودہ زمانے کے محققین تاریخ کا ایسا خیال نہیں ہے۔

اور دارا کے کتبۂ اصطخر میں اس کا نام "گوشیہ" آیا ہے[1]۔ انہی دو قوموں میں سے کسی نے یا دونوں قوموں نے ذوالقرنین سے یاجوج ماجوج کی شکایت کی ہوگی، اور چونکہ یہ غیر متمدن قومیں تھیں، اس لیے ان کی نسبت فرمایا کہ لا یکادون یفقهون قولا۔

سائرس کے غیر معمولی فضائل

(۳) اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے آتا ہے وہ اس کی عدالت گستری اور خدمت انسانی کی فیاضانہ سرگرمی ہے، اور یا بعصاف سائرس کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مورخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھ ہی نہیں سکتی!

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی، اس کی نسبت حکم الٰہی ہوا تھا: یا ذاالقرنین! اما ان تعذب، واما ان تتخذ فیهم حسنا (۸۶) یعنی یہ قوم اب تیرے بس میں ہے۔ جس طرح چاہے تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ خواہ سزا دے، خواہ انہیں اپنا دوست بنا لے۔ یقیناً یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی۔ اس کے پادشاہ کروسس نے تمام عہد و پیمان اور باہمی رشتے داریاں بھلا کر بلا وجہ سائرس پر حملہ کر دیا تھا، اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ وقت کی تمام طاقتور حکومتوں کو بھی اس کے خلاف ابھار کر اپنے ساتھ کر دیا تھا۔ اب جب تائید الٰہی نے اپنا کرشمہ دکھایا اور تمام لیڈیا مسخر ہو گیا، تو حکم الٰہی ہوا۔ یہ لوگ بالکل تیرے رحم پر ہیں۔ تو جو چاہے ان کے ساتھ کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہر طرح سزا کے مستحق ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ تائید الٰہی نے تیرا ساتھ دیا۔ دشمنوں کو مسخر کر دیا۔ اب وہ بالکل تیرے اختیار میں ہیں، لیکن تجھے بدلہ نہیں لینا چاہیے۔ وہی کرنا چاہیے، جو نیکی و فیاضی کا مقتضیٰ ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے ایسا ہی کیا: قال اما من ظلم فسوف نعذبه ثم یرد الی ربه فیعذبه عذابا نکرا۔ واما من امن وعمل صالحا فله جزاء الحسنیٰ وسنقول له من امرنا یسرا (۸۸) اس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جرم کی بنا پر کسی کو سزا نہیں دینا چاہتا۔ میری جانب سے عام بخشش کا اعلان ہے۔ البتہ آئندہ جو کوئی برائی کریگا، بلاشبہ اُسے سزا دونگا۔ پھر اُسے مرنا ہے اور آخرت کا عذاب سخت جھیلنا ہے۔ اور جو لوگ میرے احکام مانینگے اور نیک کردار ثابت ہونگے تو اُن کے لیے ویسا ہی بہتر اجر بھی ہوگا (۱) وہ میرے احکام بھی بہت آسان پائینگے۔ میں بندگانِ خدا پر سختی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہو بہو اُس طرزِ عمل کی تصویر ہے جس کی تفصیل ہمیں یونانی تاریخوں کے صفحات میں ملتی ہے، اور جسے زمانۂ حال کے تمام محققین تاریخ نے ایک مسلمہ تاریخی حقیقت تسلیم کر لیا ہے۔

تمام یونانی مورخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ سائرس نے فتح کے بعد باشندگان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ وہ فیاضانہ تھا۔ وہ اگر اپنے دشمنوں کے ساتھ سختی کرتا، تو یہ انصاف ہوتا، کیونکہ زیادتی اُنہی کی تھی۔ لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانع نہیں ہوا۔ اُس نے رحم و بخشش کا شیوہ اختیار کیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ سائرس نے اپنی فوج کو حکم دیدیا تھا کہ دشمن کی فوج کے سوا اور کسی انسان پر ہتھیار نہ اٹھائیں، اور دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے، اُسے ہرگز قتل نہ کیا جائے۔ کروسس شاہ لیڈیا کی نسبت صریح حکم تھا کہ کسی حال میں بھی اُسے گزند نہ پہنچائی جائے۔ اگر وہ مقابلہ کرے جب بھی اُس پر تلوار نہیں اُٹھانی چاہیے۔ اس حکم کی فوج نے اس دیانت داری کے ساتھ تعمیل کی کہ باشندوں کو جنگ کی مصیبت ذرا بھی محسوس نہ ہوئی۔ یہ گویا محض فرماں روا خاندان کا ایک شخصی انقلاب تھا کہ کروسس کی جگہ سائرس نے لے لی۔ اس سے زیادہ کوئی انقلاب ملک و قوم کو محسوس ہی نہیں ہوا!

کروسس کا واقعہ اور یونانی روایات

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سائرس کی فتح یونانی دیوتاؤں کی شکست تھی، کیونکہ وہ اس مصیبت سے اپنے پرستار کروسس کو نہ بچا سکے، حالانکہ حملے سے پہلے اُس نے مندروں کے ہاتف[2] سے استصواب کر لیا تھا، اور ڈیلفی کے ہاتف نے فتح و کامرانی کی بشارت دی تھی۔ پس قدرتی طور پر واقعات کی یہ رفتار یونانیوں کے لیے خوشگوار نہ ہو سکی، اور اس امر کی کوشش شروع ہو گئی کہ اس شکست میں بھی اخلاقی اور مذہبی فتح مندی کی شان پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کروسس کا معاملہ اچانک ایک پراسرار افسانہ کی شکل

---

[1] دارا یوش اول کا یہ کتبہ تاریخ قدیم کا ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ اس میں اس نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور زیر حکومت صوبوں کے نام گنا دیے ہیں جو تعداد میں ۲۸ ہیں۔ ان میں سے اکثر ناموں کا جغرافیائی محل روشنی میں آچکا ہے۔ صرف ایک دو ناموں کی حقیقت اب تک محل غور و بحث ہے۔

[2] ہم نے Oracle کے لیے ہاتف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے مرادف لفظ نہیں ہے، لیکن اصطلاح کا مطلب بہتر طریقہ پر واضح کرتا ہے۔

یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ مندروں میں ہاتف غیبی کی صدائیں سُنی جاتی ہیں، اور خاص پجاریوں پر دیوتاؤں کا الہام ہوتا ہے۔ اس غرض سے خاص خاص مندروں کی شہرت تھی۔ لوگ چڑھاوے چڑھا کر اپنے سوالات پیش کرتے، اور مجاور دیوتاؤں کی طرف سے جوابات سُنا دیتے۔

اختیار کر لیتا ہے، اور یونانی دیوتا اپنے سارے معجزوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہیروڈوٹس لیڈیا کے باشندوں کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ ڈلفی کے ہاتف کا جواب غلط نہ تھا، مگر کروسس نے جنگ کے جوش و طلب میں اُس کا صحیح مطلب نہیں سمجھا۔ ہاتف نے کہا تھا "اگر اُس نے پارسیوں پر حملہ کیا تو وہ ایک بڑی مملکت تباہ کر دیگا" یعنے خود اپنی مملکت تباہ کر دیگا، مگر اُس نے خیال کیا، بڑی مملکت سے مقصود پارسیوں کی مملکت ہے۔ نیز وہ کہتا ہے۔ پہلے سائرس نے حکم دیا تھا کہ لکڑیوں کی چتا طیار کی جائے اور اُس پر کروسس کو بٹھا کر آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آگ لگا دی گئی، لیکن پھر جب کروسس کی بعض باتیں سنیں، تو بے حد متاثر ہوا اور آگ بجھانے کا حکم دیا۔ لیکن اب آگ پوری طرح مشتعل ہو گئی تھی ممکن نہ تھا کہ اُسے فوراً بجھا دیا جائے۔ یہ حال دیکھ کر کروسس نے اپالو دیوتا کو پکارا، اور باوجودیکہ آسمان بالکل صاف تھا، اچانک بارش شروع ہو گئی، اور اس طرح اس معجزے نے بروقت ظاہر ہو کر اُس کی جان بچا لی!

لیکن خود ہیروڈوٹس اور زینوفن کی تصریحات سے جو حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ سائرس یا تو کروسس کے عزم و صبر کا امتحان لینا چاہتا تھا، یا یہ بات آشکارا کر دینی چاہتا تھا کہ یونانیوں کے خود ساختہ دیوتا اپنے عبادت گزاروں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے، اور جن دیوتاؤں کی مزعومہ بشارت پر اعتماد کر کے جنگ کی گئی تھی، اُن میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے پرستار کو زندہ جلنے کے عذاب سے بچا لیں یعنے مقصود یہ تھا کہ پہلے اُسے چتا پر بٹھایا جائے، آگ بھی لگا دی جائے، لیکن جب وہ خود اور تمام لوگ دیکھ لیں کہ دیوتاؤں کا کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا، تو پھر اُسے بخشدے، اور عزت و احترام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جائے۔ دوسری علت زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کیونکہ خود ہیروڈوٹس کی روایت میں اس کی جھلک موجود ہے، اور یونانی افسانہ میں اپالو کے معجزہ کی نمود بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سائرس نے اپنے عمل سے جو حقیقت آشکارا کر دی تھی یونانی افسانہ نے اسی کا توڑ کرنے کے لیے اپالو کا معجزہ گڑھ لیا۔

سائرس کے احکام و قوانین

قرآن نے ذوالقرنین کا یہ اعلان نقل کیا ہے کہ آئندہ جو ظلم کریگا، سزا پائیگا، جو حکم مانیگا اور نیک عمل ہوگا اُسے انعام ملیگا بعینہ زینوفن کی بھی ایسی ہی روایت ہے۔ قرآن میں ہے کہ وسنقول لہ من امرنا یسرا۔ اگر لوگوں نے نیک عملی اختیار کی تو دیکھ لینگے میرے احکام و قوانین میں اُن کے لیے سختی نہ ہوگی۔ تمام مورخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسی ہی تھے۔ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے لیے سراسر شفقت و مرحمت تھا۔ اُس نے اُن تمام بوجھل ٹیکسوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دیدی جو اُس عہد کے تمام حکمران وصول کیا کرتے تھے۔ اُس نے جس قدر احکام و فرامین نافذ کیے وہ زیادہ سے زیادہ نرم زیادہ سے زیادہ ہلکے تھے!

(۵) یہ تو صرف اُس کی مغربی فتح مندی کی سرگزشت تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اُس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی؟ اور قرآن کا بیان کردہ وصف کہاں تک اُس پر راست آتا ہے؟

مورخین کی عام شہادت

لیکن قبل اس کے کہ ہم یونانی مورخوں کی شہادتوں پر متوجہ ہوں، یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یونانی مورخ سائرس کے ہم قوم نہیں تھے۔ ہم وطن نہیں تھے۔ ہم مذہب نہیں تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دوست بھی نہیں تھے۔ سائرس نے لیڈیا کو شکست دی تھی، اور لیڈیا کی شکست یونانی قومیت، یونانی تہذیب، اور سب سے زیادہ یہ کہ یونانی مذہب کی شکست تھی۔ پھر سائرس کے جانشینوں نے براہ راست یونانیوں کو زیر کیا تھا، اور ہمیشہ کے لیے دونوں قومیں ایک دوسرے کی حریف ہو گئی تھیں۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ یونانی دماغ اپنے حریف کی مدحت سرائی کا شائق ہوگا۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مورخ اس کی غیر معمولی عظمتوں اور ملکوتی صفتوں کی مدحت سرائی میں رطب اللسان ہے، اور اس لیے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے محاسن نے ایک ایسے عالمگیر اعتراف و تاثر کی نوعیت اختیار کر لی تھی کہ دوست و دشمن کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا سب کے دلوں میں ان کا اعتقاد پیدا ہو گیا تھا، سب کی زبانوں پر ان کی مدحت سرائی تھی اور محاسن وہی ہیں جن کی حریفوں کو بھی شہادت دینی پڑی:

ومليحة، شهدت بها ضراتها والفضل ما شهدت به الاعداء!

زینوفن لکھتا ہے "سائرس ایک نہایت دانشمند، سنجیدہ، اور ساتھ ہی رحم دل فرمانروا تھا۔ اس کی شخصیت ہر طرح کے شاہی اوصاف

اور حکیمانہ فضائل کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اس کی شوکت و حشمت سے کہیں زیادہ اس کی عالی حوصلگی اور سیر چشمی تھی، اور اس کی فیاضی اور رحم دلی اپنی کوئی دوسری مثال نہیں رکھتی۔ انسان کی خدمت اور ہمدردی اُس کی شاہانہ ہیبت کا سب سے بڑا جوہر تھا۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ مصیبت زدہ انسانوں کی خبر گیری کرے، مظلوموں کو ظلم سے نجات دلائے، درماندہ انسانوں کا ہاتھ پکڑے، غم زدوں کے دُکھ درد میں شریک ہو۔ پھر ان تمام عالی صفتوں کے ساتھ عاجزی و انکساری اُس کے حسن و کمال کا سب سے بڑا زیور تھی۔ اس نے ایک ایسے تخت پر بیٹھ کر جس کے آگے تمام قوموں کے سر جُھک گئے تھے، اور ایک ایسے خزانہ کا مالک ہو کر جس میں تمام دنیا کی دولت سمٹ آئی تھی، کبھی گوارا نہیں کیا کہ فخر و غرور کو اپنے دماغ میں جگہ دے۔"

ہیروڈوٹس لکھتا ہے "وہ ایک نہایت ہی فیاض بادشاہ تھا۔ اُسے دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح دولت جمع کرنے کی حرص نہیں تھی، بلکہ جود و سخاوت کا شوق تھا۔ وہ کہتا تھا سب سے بڑی دولت یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی بھلائی کا موقعہ ملے اور مظلوموں کی داد رسی ہو!"

ڈی سیاز لکھتا ہے "اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ رفاہِ عام کے کاموں میں خرچ کی جائے، اور ماتحتوں کو اس سے فیض پہنچے۔ چنانچہ اس کی اسی فیض رسانی نے اُس کی تمام رعایا کے دل اُس کے ہاتھوں میں دے دیے تھے۔ وہ اُس کے لیے خوشی خوشی اپنی گردنیں کٹوا دیتے!"

سائرس کی شخصیت کی غیر معمولی نمود

سب سے زیادہ نمایاں بات جو ان تمام مورخوں کے صفحات پر ملتی ہے، وہ سائرس کی شخصیت کی غیر معمولی نمود ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ جس عہد میں پیدا ہوا، اُس کی مخلوق نہیں تھا۔ ایک بالاتر شخصیت تھی جسے قدرت نے اپنا کرشمہ دکھانے کے لیے نمودار کر دیا تھا۔ دنیا کے کسی حکیم نے اُس کی تربیت نہیں کی۔ وقت کے متمدن ملکوں میں سے کسی ملک میں اس کی پرورش نہیں ہوئی۔ وہ محض قدرت کا پروردہ تھا، اور قدرت ہی کے ہاتھوں نے اُسے اُٹھایا تھا۔ اُس کی تمام ابتدائی زندگی صحراؤں کی گود اور پہاڑوں کی آغوش میں بسر ہوئی۔ وہ فارس کے مشرقی پہاڑوں کا چرواہا تھا۔ تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چرواہا جب دنیا کے سامنے آیا، تو حکمرانی کا سب سے بڑا جلوہ، دانش کا سب سے بڑا پیکر، فضیلت کا سب سے بڑا نمونہ اُن کے سامنے تھا!

سائرس اور سکندر

سکندرِ اعظم کو ارسطو کی تعلیم و تربیت نے طیار کیا تھا، اور بلاشبہ وہ بہت بڑا فاتح نکلا، لیکن کیا انسانیت و اخلاق کا بھی کوئی گوشہ فتح کر سکا؟ سائرس کے لیے ہمیں کوئی ارسطو نہیں ملتا۔ اُس نے انسانی حکمت کی درسگاہ کی جگہ قدرت کی درسگاہ میں پرورش پائی تھی، تاہم اُس نے سکندر کی طرح صرف ملکوں ہی کو نہیں، بلکہ انسانیت و فضائل کی مملکتوں کو بھی مسخر کر لیا تھا!

سکندر کی تمام فتوحات کی عمر اس سے زیادہ نہ تھی، جتنی خود اس کی عمر تھی، لیکن سائرس کی فتوحات نے جو اینٹیں چن دی تھیں، وہ دو سو برس تک نہ ہل سکیں۔ سکندر کے دم توڑتے ہی اُس کی مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، لیکن سائرس نے جب دنیا چھوڑی تو اُس کی مملکت روز بروز وسیع و مستحکم ہونے والی تھی۔ اس کی فتوحات میں صرف مصر کا خانہ خالی رہ گیا تھا۔ اس کے فرزند کیقباد نے اسے بھی بھر دیا، اور پھر چند برسوں کے بعد دنیا کی وہ عالمگیر سلطنت ظہور میں آگئی جو ایشیا، افریقہ، اور یورپ کے اٹھائیس ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی اور اس پر سائرس کا جانشین دارا یوش تنِ تنہا حکمراں تھا!

سکندر کی فتوحات صرف جسم کی فتوحات تھیں جنہیں قہر و طاقت نے سر کیا تھا لیکن سائرس کی فتوحات روح و دل کی فتوحات تھیں جنہیں انسانیت و فضیلت نے سر کیا تھا۔ پہلی سر اُٹھاتی ہے لیکن جُھک نہیں سکتی۔ دوسری جُھک جاتی ہے اور پھر ٹلتی نہیں!

سائرس فتح بابل کے بعد دس برس تک زندہ رہا۔ اب اُس کی حکومت عرب سے لیکر بحرِ اسود تک اور ایشیائے کوچک سے بلخ تک پھیلی ہوئی تھی، اور ایشیا کی تمام قومیں اس کے ماتحت آگئی تھیں، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس تمام عرصہ میں بغاوت اور سرکشی کا ایک حادثہ بھی نہیں ہوا، کیونکہ زینوفن کے لفظوں میں "وہ صرف بادشاہ ہی نہ تھا بلکہ انسانوں کا شفیق مربی اور قوموں کا رحیم باپ تھا" اور رعایا سخت گیر حکمرانوں سے بغاوت کر سکتی ہے لیکن اولاد اپنے شفیق باپ سے باغی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ زمانے کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت تھی، یہ ایسی خصوصیت تھی جو آگے چل کر رومن امپائر کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

سب متفقہ شہادت دیتے ہیں کہ اُس عہد کے بادشاہوں کی سخت گیری، قساوتِ قلبی، اور ہیبت انگیز طریقِ تعذیب کی چھوٹی سی چھوٹی مثال بھی سائرس کے عہد میں نہیں ملتی۔

زمانۂ حال کے محققین کی شہادت

واضح رہے کہ یہ محض قدیم یونانی مورخوں کی روایات ہی نہیں ہیں، بلکہ موجودہ زمانے کے تمام محققین تاریخ کی تاریخی مسلّمات ہیں۔ بالاتفاق یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ سائرس تاریخ قدیم کی سب سے بڑی شخصیت ہے جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت، فرمانروائی کی عظمت، اور اخلاق وانسانیت کی فضیلت جمع ہوگئی تھی، اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا، اُس عہد میں اُس کی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی نجات تھی!

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جی۔ بی گرنڈی (G.B.Grundy) جو موجودہ زمانہ میں تاریخ قدیم کے ایک مستند ماہر ہیں اور جن کی کتاب "گریٹ پرشین وار" نہایت مقبول ہوچکی ہے، لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت بالکل آشکارا ہے کہ سائرس کی شخصیت اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ اُس نے اپنی تمام معاصر قوموں کے دلوں پر اپنا حیرت انگیز تاثر نقش کردیا۔ اس کی ابتدائی نشوونما بالائی فارس کے غیر آباد اور دور دراز گوشوں میں ہوئی، جس کی سرگزشت نے ایک افسانہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس کی ابتدائی تربیت کی روایتیں اس سے ڈیڑھ سو برس بعد زینوفن نے مدون کیں جو سقراط کا شاگرد تھا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں میں اس کے فضائل انسانیت کا جوہر عام طور پر نمایاں ہے۔ خواہ ہم ان روایتوں کو اہمیت دیں، خواہ نہ دیں، تاہم یہ حقیقت ہر حال میں غیر متزلزل رہتی ہے کہ اُس کی تدبیر و سیاست کا دامن اُس کی انسانیت و فضیلت کے جوہر سے بندھا ہوا تھا، اور جب یہ خصوصیت آشوری اور بابلی شہنشاہوں کی بدعملیوں کے مقابلہ میں لائی جاتی ہے، تو اُس کی شریفانہ نمود اور زیادہ درخشندہ ہوجاتی ہے۔"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"یہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز کامیابی تھی۔ بارہ برس پہلے وہ ایک چھوٹی سی ریاست انشان کا ایک گمنام رئیس تھا اور اب ایشیا کی وہ تمام مملکتیں اس کے زیر فرمان تھیں جہاں پچھلی قوموں کی بڑی بڑی عظمتیں ظہور میں آچکی تھیں۔ ان تمام پادشاہتوں میں جنہوں نے زمین کے مالک ہونے کے دعوے کیے، ایک پادشاہت بھی ایسی نہ تھی جو اب اپنی ہستی کا کوئی موثر ظہور رکھتی ہو۔ اکاڈی مملکت کے نیم اصنامی سارگون سے لے کر نبوکد رزار (بخت نصر) تک، سب کی مملکتیں اُس کے آگے سربسجود ہوگئی تھیں۔ .... وہ صرف ایک بڑا فاتح ہی نہیں تھا۔ وہ ایک بڑا حکمراں تھا۔ قوموں نے یہ نیا دور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کا استقبال کیا۔ اُن دس برسوں میں جو فتح بابل کے بعد گزرے اس کی تمام وسیع مملکت میں ایک بغاوت کا واقعہ بھی نظر نہیں آتا۔ بلاشبہ اس کی رعایا پر اُس کی طاقت کا رعب چھایا ہوا تھا، لیکن وہ کوئی وجہ نہیں رکھتی تھی کہ اُس کی سخت گیری سے ہراساں ہو۔ اس کی حکومت قتل وصلب کی سزاؤں سے بالکل ناآشنا رہی۔ اب تازیانوں سے مجرموں کو نہیں پیٹا جاتا تھا، اب قتل عام کے احکام صادر نہیں ہوتے تھے، اب قوموں اور قبیلوں کو جلاوطن نہیں کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے آشوری اور بابلی پادشاہوں کے تمام مظالم کے اثرات یک قلم محو کردیے۔ جلاوطن قومیں اپنے وطنوں میں لوٹائی گئیں، اُن کے معبد اور معبود انہیں واپس دیدیے گئے، قدیم رسموں اور عبادتوں کے خلاف کوئی جبر و تشدد باقی نہیں رہا، ہر قوم کے ساتھ پوری طرح دادرسی کی گئی، ہر مذہب کے پیرؤں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی، دنیا کی گزشتہ عالمگیر دہشتناکی کی جگہ ایک عالمگیر رواداری اور عفو و بخشش کا مبارک دور شروع ہوگیا!"[1]

غور کرو، قرآن نے چند لفظوں کے اندر جو اشارات کردیے ہیں، آج تاریخ کا داستانسرا کس طرح اُس کے ایک ایک حرف کی شرح و تفصیل سنا رہا ہے!

صحائف تورات کی تصریحات

(۶) اب چند لمحوں کے لیے اُن تصریحات پر غور کرو جو تورات کے صحائف میں مندرج ہیں۔ کس طرح وہ سائرس کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت واضح کررہے ہیں، اور کس طرح قرآن کے اشارات بھی ٹھیک ٹھیک اُن کی تصدیق ہیں؟ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے کہ "خداوند کہتا ہے، خورس میرا چرواہا ہے" اور پھر یہ بھی کہا ہے کہ "وہ میرا مسیح ہے" اور یرمیاہ نبی کا بیان اوپر گزر چکا ہے کہ وہ بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائیگا۔ اب دیکھو اس کی شخصیت ٹھیک ٹھیک ایک موعود اور منتظر نجات دہندہ کی

[1] پروفیسر موصوف کے اس مقالہ کے لیے یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ کی دوسری جلد (صفحہ ۱۰۰۵) کا مطالعہ کرنا چاہیے جو جے۔ اے۔ ہمرٹن J.A.Hammerton نے مرتب کی ہے اور حال میں شائع ہوئی ہے۔

شخصیت تھی یا نہ تھی؛

موعود منتظر ہستی

جب ہم اُس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سائرس کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں، تو بہ اول نظر یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ سائرس کا ظہور ٹھیک ٹھیک ایک ایسی شخصیت کا ظہور تھا جس کے لیے وقت کی تمام قومیں چشم براہ ہوں۔ قوموں کا انتظار اُن کی زبانوں پر نہیں ہوتا۔ اُن کے حالات کے قدرتی تقاضے میں ہوتا ہے۔ غور کرو، اُس عہد کی رفتارِ زمانہ کا قدرتی تقاضہ کیا تھا؟ یہ تاریخ کے صبح تمدن کی وہ نمود تھی، جس کی روشنی میں ہم انسانی حکمرانی کی ساری تاریکیاں پھیلی ہوئی دیکھتے ہیں۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ اُس وقت تک انسانی فرمانروائی کی عظمت صرف قہر و غضب ہی کی نقاب میں رونما ہوئی تھی، اور سب سے بڑا حکمراں وہی سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ انسانوں کے لیے خوفناک ہو۔ آشور بنی پال نینوا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اس لیے کہ وہ شہروں کے جلانے اور آبادیوں کے ویران کرنے میں سب سے زیادہ بے باک تھا۔ بابل کی نشاۃ ثانیہ میں بنوکد رزار سب سے بڑا فاتح تھا۔ اس لیے کہ قوموں کی ہلاکت اور مملکتوں کی ویرانی میں سب سے زیادہ قہرمان تھا۔ مصریوں، آکادیوں، ایلامیوں، آشوریوں اور بابلیوں، سب میں انسانی حکومت و عظمت کے مظاہر خوفناکی اور دہشت انگیزی کے مظاہر تھے، اور ان کی شخصیتوں نے دیوتائی الوہیت کی تقدیس سے مل کر انسانوں کے قتل و تعذیب کا ہولناک استحقاق حاصل کر لیا تھا۔ سائرس کے ظہور سے پچاس برس پہلے بنوکدرزار کی شہنشاہی کا ظہور ہوا، اور ہمیں معلوم ہے کہ اُس نے بیت المقدس پر پے بہ پے تین حملے کیے کہ نہ صرف دنیا کا سب سے بڑا زرجسیم علاقہ تاراج و ویران کر دیا، بلکہ فلسطین کی پوری آبادی کو اس طرح ہنکا کر بابل لے گیا کہ جوزیفس کے لفظوں میں "کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لیجاتا!" پھر کیا ان حالات کا قدرتی تقاضہ یہ نہ تھا کہ دنیا ایک نئی شخصیت کے لیے چشم براہ ہو؟ قومیں ایک نجات دہندہ کی راہ تک رہی ہوں؟ ایک ایسے نجات دہندہ کی جو انسانوں کے گلّہ کے لیے خدا کا بھیجا ہوا "چرواہا" ہو، جو اُن کی بیڑیاں کاٹنے اور اُن کے سروں کا بوجھ ہلکا کر دے، جو دنیا کو اس ربانی صداقت کا سبق دیدے کہ انسانی حکمرانی نوعِ انسانی کی خدمت کے لیے ہونی چاہیے۔ دہشت انگیزی اور خوفناکی کے لیے نہیں؛

خدا کا بھیجا ہوا "چرواہا"

دنیا بادشاہوں کے ہاتھوں سے تنگ آچکی تھی۔ اب وہ ایک چرواہے کے لیے مضطرب تھی، اور یسعیاہ نبی کے لفظوں میں خدا کا وہ فرستادہ چرواہا نمودار ہو گیا!

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زینوفن کے لفظوں میں "قوموں نے اسے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کے استقبال کے لیے بے اختیار لپکیں" کیونکہ وہ وقت کی جستجو کا قدرتی سراغ اور زمانہ کی طلب کا قدرتی جواب تھا، اور اگر رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، تو ممکن نہ تھا کہ انسانی شقاوت کی اس طولانی تاریکی کے بعد صبحِ سعادت کی اس جہاں تابی کا استقبال نہ کیا جاتا!

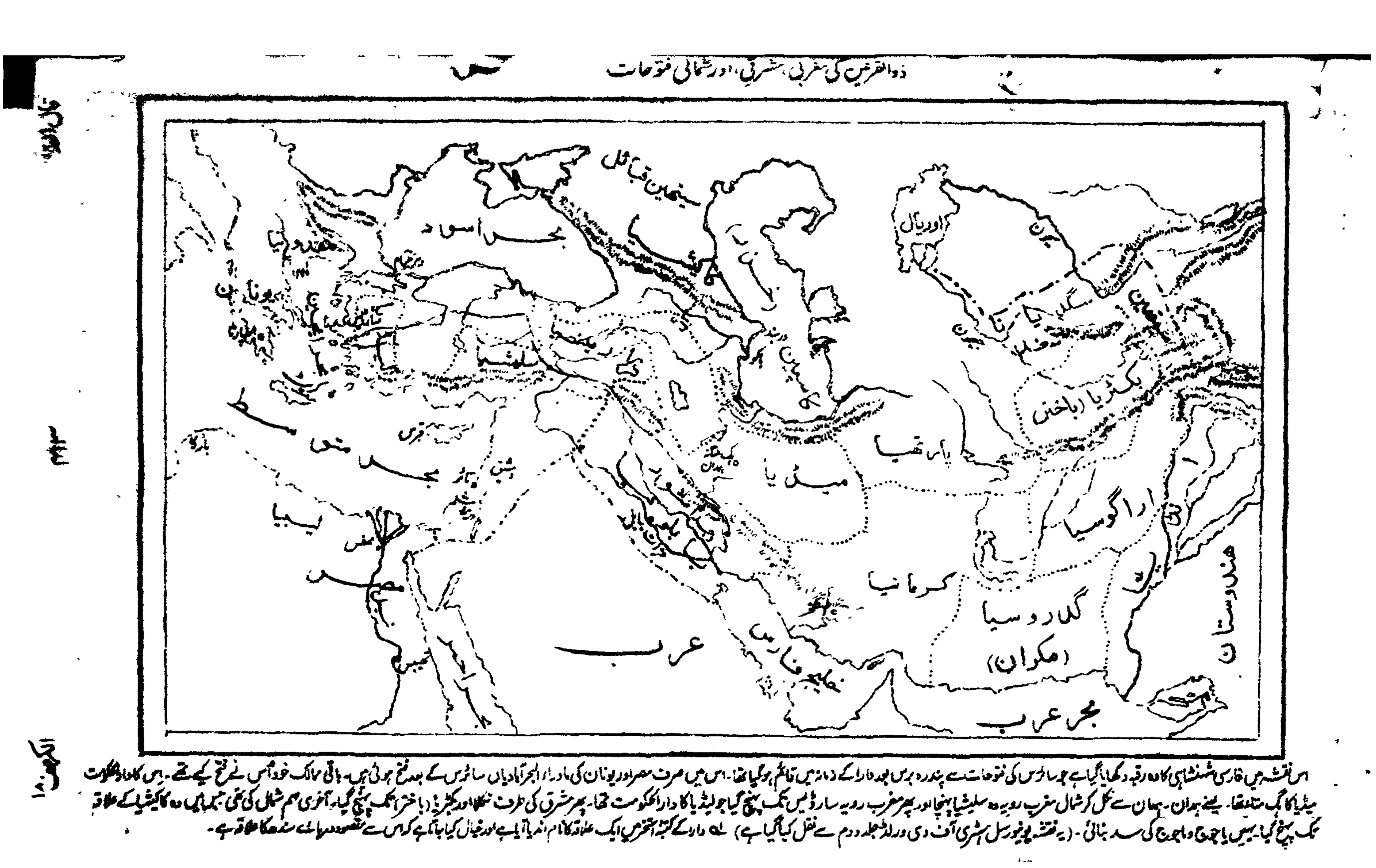
غور کرو، یسعیاہ نبی کا یہ جملہ صورتِ حال کی کیسی ہو بہو تصویر ہے کہ "وہ میرا چرواہا ہوگا۔ وہ میری ساری مرضی پوری کریگا۔ میں اس کا دہنا ہاتھ پکڑ کے قوموں کو اُس کے قابو میں دیدونگا، اور بادشاہوں کی کمریں اُس کے آگے کھلوا ڈالونگا۔ میں اُس کے آگے چلونگا، میں ٹیڑھے راستے اُس کے لیے سیدھے کر دونگا" (۴۴ : ۲۸) سارے مورخ گواہی دے رہے ہیں کہ وہ ایک چرواہے کی طرح آیا اور اُس نے بندگانِ خدا کی رکھوالی کی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ اس نے جس ملک کا رُخ کیا، اُس کی شقاوت ختم ہوگئی، وہ جس قوم کی طرف بڑھا، اُس کی بیڑیاں کٹ گئیں، اُس نے جس گروہ کے سر پر ہاتھ رکھا، اُس کے سارے بوجھ ہلکے ہوگئے۔ وہ صرف بنی اسرائیل ہی کا نہیں بلکہ تمام قوموں کا نجات دہندہ تھا!

خدا کا مسیح

یاد رہے کہ یسعیاہ نبی کی اسی پیشین گوئی میں اُسے "خدا کا مسیح" بھی کہا ہے، اور تورات کی اصطلاح میں "مسیح" وہ ہوتا ہے جسے خدا اپنی برکتوں کے ظہور کے لیے برگزیدہ کرلے، اور خدا کے براہِ راست مسموح ہونے کی وجہ سے مقدس ہو۔ چنانچہ حضرت داؤد کی نسبت بھی آیا ہے کہ "مسیح" تھے، سائرس کی نسبت بھی یہی کہا ہے، اور اسی طرح بنی اسرائیل کی نجات کے لیے ایک آخری مسیح کی بھی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔

سائرس کو مسیح کہنا، اس میں شک نہیں کہ اُس کے تقدس اور الٰہی برگزیدگی کی سب سے زیادہ واضح اور قطعی اسرائیلی شہادت ہے۔

(۷) اس سلسلہ میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے، وہ اس کا ایمان باللہ ہے۔ قرآن کی آیتیں اس بارے



اس نقشہ میں فارسی شہنشاہی کا وہ رقبہ دکھایا گیا ہے جو سائرس کی فتوحات سے پندرہ برس بعد دارا کے زمانہ میں قائم ہو گیا تھا۔ اس میں صرف مصر اور یونان کی ماوراء البحر آبادیاں سائرس کے بعد فتح ہوئی ہیں۔ باقی ممالک خود اس نے فتح کیے تھے۔ اس کا دارالحکومت میڈیا کا ایک مقام تھا۔ یعنی ہمدان۔ یہاں سے نکل کر شمال مغرب رویہ وہ سلیشیا پہنچا اور پھر مغرب رویہ سارڈیس تک پہنچ گیا جو لیڈیا کا دارالحکومت تھا۔ پھر مشرق کی طرف نکلا اور بکٹریا (باختر) تک پہنچ گیا۔ آخری مہم شمال کی تھی جس میں وہ کاکیشیا کے علاقہ تک پہنچ گیا۔ یہیں یاجوج و ماجوج کی سد بنائی۔ (یہ نقشہ یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ جلد دوم سے نقل کیا گیا ہے) [1] دارا کے کتبۂ اصطخر میں ایک علاقہ کا نام اندیا آیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے مقصود دریائے سندھ کا علاقہ ہے۔

میں ظاہر قطعی ہیں کہ وہ ایک خدا پرست انسان تھا، آخرت پر یقین رکھتا تھا، احکامِ الٰہی کے مطابق عمل کرتا تھا اور اپنی تمام کامرانیوں کو اللہ کا فضل و کرم سمجھتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد و عمل تھا؟

لیکن تمام پچھلی تفصیلات پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں تھا؟

یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اُسے اپنا فرستادہ اور "مسیح" کہا، اور وہ نبیوں کا موعود و منتظر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان ہستی نہیں ہو سکتی۔ جس کا "دہنا ہاتھ خدا نے پکڑا ہو" اور جس کی ٹیڑھی راہیں وہ درست کر دیتا ہو، وہ خدا کا ناپسندیدہ بندہ نہیں ہو سکتا۔ خدا صرف اُنہی کا ہاتھ پکڑتا ہے جو برگزیدہ اور مقدس ہوتے ہیں، اور صرف اُنہی کو اپنا فرستادہ کہتا ہے جو اُس کے چنے ہوئے اور اُس کی ٹھہرائی ہوئی راہوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔

اسرائیلی نبیوں کی شہادت

آج کل کے اصحاب نقد و نظر یسعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی کو مشتبہ سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ سائرس سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی گئی تھی۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے، جب بھی صورتِ حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ خود سائرس کے عہد میں جو اسرائیلی نبی موجود تھے، اُن کی شہادتیں موجود ہیں، اور وہ صاف کہہ رہی ہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد یہی تھا۔ اور اسی حیثیت سے اس کا استقبال کیا تھا۔ حزقیل اور دانیال سائرس کے معاصر تھے۔ اور دانیال دارا کے عہد تک زندہ رہے۔ ان دونوں کی تصریحات سائرس کی نسبت موجود ہیں۔ پھر دارا کے زمانہ میں حجی اور ذکریاہ کے صحیفے مرتب ہوئے، اور زرکسیس (اردشیر یا آرتخششت) کے عہد میں عزرا اور نحمیاہ کا ظہور ہوا۔ ان سب کی شہادتیں بھی موجود ہیں، اور ان سب سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائرس بنی اسرائیل کی ایک موعود ہستی تھی، اور خدا نے اُسے برگزیدگی کے لیے چن لیا تھا۔

اگر یہودیوں کا عام اعتقاد یہ تھا، تو کیا ایک لمحہ کے لیے یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک بت پرست انسان کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنے کی جرأت کرے؟ فرض کرو، یہ تمام پیشین گوئیاں سائرس کے ظہور کے بعد بنائی گئیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے بنائیں اور یہودیوں ہی میں پھیلیں، حتیٰ کہ اُن کی مقدس کتاب میں داخل ہو گئیں۔ پھر کیا ممکن تھا کہ ایک بت پرست انسان کے لیے ایسی پیشین گوئیاں بنائی جا سکتیں؟ کیا ممکن تھا کہ ایک بت پرست کو اسرائیلی وحی کا ممدوح اور اسرائیلی نبیوں کا موعود بنا دیا جاتا؟

یہودیوں کا اعتراف

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اجنبیوں اور غیر اسرائیلیوں کے خلاف یہودیوں کا تعصب بہت ہی سخت تھا۔ اُن کے نسلی غرور پر اس سے زیادہ اور کوئی بات شاق نہیں گزرتی تھی کہ کسی غیر اسرائیلی انسان کی بزرگی کا اعتراف کریں۔ ظہورِ اسلام کے وقت بھی یہی عصبیت انہیں اعترافِ حق سے روکتی تھی کہ ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم (۳: ۷۳)، تاہم وہ سائرس کی فضیلت کے آگے جھک گئے جو اُن کے لیے ہر اعتبار سے اجنبی تھا، اور نہ صرف اس کی بزرگی ہی کا اعتراف کیا، بلکہ نبیوں کا موعود اور خدا کا برگزیدہ تسلیم کر لیا۔ یہ صورتِ حال اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سائرس کی شخصیت اُن کے لیے بڑی ہی محبوب شخصیت تھی، اور اس کی فضیلتیں ایسی قطعی اشکار تھیں کہ اُن کے اعتراف میں نسلی عصبیت کا جذبہ بھی حائل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ایک بت پرست انسان کے لیے جو اجنبی بھی ہو، یہودیوں میں ایسی محبوبیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر ایک بت پرست بادشاہ نے انہیں نجات دلائی تھی، تو وہ اس کی شاہانہ عظمتوں کی مداحی کرتے مگر خدا کا مسیح اور برگزیدہ کبھی نہ سمجھتے۔ ضروری ہے کہ اُس کی فضیلتیں مذہبی ہوں۔ ضروری ہے کہ مذہبی حیثیت سے بھی عقائد کا توافق موجود ہو۔ یہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں غیر اسرائیلی فضیلت کے اعتراف کا تنہا واقعہ ہے، اور ممکن نہیں کہ ایک ایسے انسان کے لیے ہو، جسے وہ مذہبی حیثیت سے محترم نہ سمجھتے ہوں۔

سائرس کے دین کا تعین

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائرس کے دینی عقائد کے بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں!

تاریخی حیثیت سے یہ قطعی ہے کہ سائرس زردشت کا پیرو تھا، جسے یونانیوں نے زاروستر کے نام سے پکارا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ غالباً اسی کی شخصیت ہے جو اس نئی دعوت کی تبلیغ و عروج کا ذریعہ ہوئی۔ اس نے فارس اور میڈیا میں نئی شہنشاہی کی بنیاد ہی نہیں رکھی تھی بلکہ قدیم مجوسی دین کی جگہ نئے زردشتی دین کی بھی تخم ریزی کی تھی۔ وہ ایران میں نئی شہنشاہی اور نئے دین، دونوں کا بانی تھا۔

زردشت کے ظہور کا زمانہ

زردشت کی ہستی کی طرح اس کے ظہور کا زمانہ اور محل بھی تاریخ کا ایک مختلف فیہ موضوع بن گیا ہے، اور انیسویں صدی

کا پہلا زمانہ مختلف نظریوں اور قیاسوں کے رد وکد میں بسر ہو چکا ہے۔ بعضوں کو اس کی تاریخی ہستی ہی سے انکار رہا۔ بعضوں نے شاہنامہ کی روایت کو ترجیح دی اور گشتاسپ والا قصہ تسلیم کر لیا۔ بعضوں نے اس کا زمانہ ایک ہزار برس قبل مسیح قرار دیا۔ بعضوں نے ہمت دو ہزار برس قبل مسیح تک بڑھا دی۔ اسی طرح محل کے تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر، بعضوں نے خراسان، بعضوں نے میڈیا اور شمالی ایران قرار دیا۔ لیکن اب بیسویں صدی کی ابتدا سے اکثر محققین تاریخ گلڈنر کی رائے پر متفق ہو گئے ہیں، اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زردشت کا زمانہ وہی تھا جو سائرس کا تھا۔ اور گشتاسپ[1] والی روایت اگر صحیح ہے تو اس سے مقصود وہی گشتاسپ ہے جو دارا کا باپ اور ایک صوبہ کا گورنر تھا۔ زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران یعنی آذربائیجان میں ہوا جسے اوستا کے حصّہ "وندی داد" میں "ایرانہ ویجو" سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ کامیابی باختر میں ہوئی جس کا گورنر گشتاسپ تھا۔

اس تحقیق کے مطابق زردشت کا سال وفات تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح سے لیکر ۵۸۳ قبل مسیح تک ہونا چاہیے، اور سائرس کی تخت نشینی بالاتفاق ۵۵۸ ق م میں ہوئی۔ یعنے زردشت کی وفات کے بیس سال بعد، یا عین اُسی سال۔

سائرس دین زردشتی کا پہلا حکمراں تھا

لیکن اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا، تو کیا کوئی براہ راست تاریخی شہادت موجود ہے جس سے اس کا دین زردشتی قبول کرنا ثابت ہو؟ نہیں ہے، لیکن اگر وہ تمام قرائن جمع کیے جائیں جو خود تاریخ کی روشنی نے مہیا کر دیے ہیں، تو یقیناً ایک بالواسطہ شہادت نمایاں ہو جاتی ہے، اور اس میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ سائرس نہ صرف دین زردشتی پر عامل تھا، بلکہ اس کا پہلا حکمراں داعی تھا، اور اسی نے یہ ورثہ اپنے جانشینوں کے لیے چھوڑا جو دو سو برس تک بلا استثنا دین زردشتی پر عمل پیرا رہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ روشنی جن واقعات سے پڑتی ہے، وہ دو ہیں، اور دونوں کی تاریخی نوعیت مسلم ہے۔ پہلا واقعہ "گوماتہ" کی بغاوت کا ہے جو سائرس کی وفات کے آٹھ برس بعد ظہور میں آئی۔ دوسرا دارا کے کتبے ہیں جن سے اُس کے دینی عقائد کی نوعیت آشکارا ہو گئی ہے۔

سائرس کا بالاتفاق ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال ہوا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا کم بی سیز (کمبوجیہ یا کیقباد) تخت نشین ہوا۔ اس نے ۵۲۵ ق م میں مصر فتح کیا لیکن ابھی مصر ہی میں تھا کہ معلوم ہوا، ایران میں بغاوت ہو گئی ہے اور ایک شخص "گوماتہ" نامی نے اپنے آپ کو سائرس کا دوسرا لڑکا سمرڈیز (فارسی: بردیہ) مشہور کر دیا ہے جو بہت پہلے مر چکا تھا یا مار ڈالا گیا تھا۔ یہ خبر سُن کر وہ مصر سے لوٹا لیکن ابھی شام میں تھا کہ ۵۲۲ ق م میں اچانک انتقال کر گیا۔ اب چونکہ سائرس کی براہ راست نسل سے کوئی شہزادہ موجود نہ تھا، اس لیے اُس کا عم زاد بھائی دارا ابن گشتاسپ تخت نشین ہو گیا۔ دارا نے بغاوت فرو کی، گوماتہ کو قتل کیا، اور نئی مملکت کو اُس کے عروج و کمال تک پہنچا دیا۔ دارا کی تخت نشینی بالاتفاق ۵۲۱ ق م میں ہوئی ہے۔ پس اُس کا عہد سائرس کے انتقال سے آٹھ برس بعد شروع ہو گیا تھا۔

یونانی مورخوں کی شہادت موجود ہے کہ یہ بغاوت میڈیا کے قدیم مذہب کے پیروؤں کی بغاوت تھی، اور خود دارا اپنے کتبہ بے ستون میں "گوماتہ" کو "موگوش" لکھتا ہے۔ یعنے مجوس، اور مجوسی مذہب سے مقصود قدیم مذہب ہے[3]۔ تاریخ میں اس کا بھی سُراغ ملتا ہے کہ پُرانے مذہب کے پیروؤں کی سرکشی اس کے بعد بھی جاری رہی چنانچہ دوسری بغاوت "پراورتیش" نامی مجوس نے کی تھی جسے دارا نے ہمدان میں قتل کیا، اور تیسری "چترت خمہ" نامی نے جو اربیل میں قتل ہوا۔

دوسرا واقعہ دارا کے کتبوں سے روشنی میں آیا ہے۔ یہ دنیا کی خوش قسمتی ہے کہ دارا نے بعض کتبے پہاڑوں کی محکم چٹانوں پر نقش کرائے جنہیں سکندر کا حملہ بھی برباد نہ کر سکا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم کتبہ بے ستون کا ہے۔ جس میں دارا نے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنی تخت نشینی کی سرگزشت قلمبند کی ہے۔ دوسرا اصطخر کا ہے جس میں اپنے تمام ماتحت ممالک کے نام گنوائے

---

[1] گشتاسپ کو یونانیوں نے ہسٹاس پیز (Hystaspes) لکھا ہے۔

[2] اے۔ وی۔ ولیم جیکسن پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی کی کتاب "انشینٹ پرشیا اینڈ پرسپرافٹ" کا مطالعہ اس باب میں کفایت کریگا۔

[3] موگوش کا لفظ ایک جگہ اوستا میں بھی آیا ہے، اور یہ بات اب قطعی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ "موگوش" سے مقصود میڈیا کے اُس مذہب کے پیرو ہیں جو زردشت کے ظہور سے پہلے وہاں رائج تھا۔ چونکہ میڈیا کے باشندے بابل اور شام میں موگوش مشہور ہو گئے تھے اس لیے عربوں میں بھی یہی نام مشہور ہو گیا اور موگوش نے مجوس کی شکل اختیار کر لی۔ پھر تمام ایرانیوں کو مجوس کہنے لگے۔ زردشتی اور غیر زردشتی کا امتیاز باقی نہیں رہا حالانکہ اصلاً مجوس زردشتیوں کے مخالف تھے

ہیں۔ ان دونوں میں وہ بار بار "اہورمزدہ" کا نام لیتا ہے، اور اپنی تمام کامرانیوں کو اُس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ "اہورمزدہ" زردشت کی تعلیم کا "اللہ" ہے۔

ان دو واقعوں پر ایک تیسرے واقعہ کا بھی اضافہ کر دینا چاہیے۔ یعنے تاریخ میں کوئی اشارہ اس کا نہیں ملتا کہ کم بی سیز نے کوئی نیا دین قبول کیا تھا، یا دارا کو اس طرح کا کوئی معاملہ پیش آیا تھا۔ ہیروڈوٹس نے دارا کی وفات سے پچاس ساٹھ برس بعد اپنی تاریخ لکھی تھی[1]۔ اس کے لیے دارا کے عہد کے واقعات بالکل قریبی زمانے کے واقعات تھے، اور لیڈیا میں فارسی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے یونانیوں اور فارسیوں کے تعلقات بھی روز بروز بڑھ رہے تھے۔ تاہم وہ کسی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ پس سائرس کی وفات اور دارا کی تخت نشینی کے درمیان آٹھ برس کی جو مدت گزری ہے، ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصہ میں کسی نئی مذہبی دعوت کے ظہور و قبول کا کوئی واقعہ نہیں گزرا۔

اب غور کرو، ان واقعات کا لازمی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اگر سائرس کے بعد کم بی سیز اور دارا نے کوئی نئی دعوت قبول نہیں کی تھی، اور دارا دین زردشتی پر عامل تھا، تو کیا اس سے ثابت نہیں ہو رہا ہے کہ دارا اور کم بی سیز سے پہلے زردشتی دین خاندان میں آ چکا ہے؟ اگر سائرس کی وفات کے چند سال بعد قدیم مذہب کے پیرو اس لیے بغاوت کرتے ہیں کہ کیوں ایک نیا مذہب قبول کر لیا گیا ہے تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ سائرس نیا مذہب قبول کر چکا تھا، اور تبدیلِ مذہب کا معاملہ نیا نیا پیش آیا تھا؟ پھر اگر زردشت سائرس کا معاصر تھا، تو کیا یہ اس بات کا مزید ثبوت نہیں ہے کہ سب سے پہلے سائرس ہی نے یہ دعوت قبول کی تھی، اور وہ فارس اور میڈیا کا نیا شہنشاہ بھی تھا اور نئی دعوت کا پہلا حکمراں داعی بھی؟

زردشت اور سائرس

اتنا ہی نہیں بلکہ ہم غور کرتے ہیں تو اس زنجیر کی کڑیاں اور آگے تک بڑھتی جاتی ہیں۔ البتہ ہم اسے ایک قیاس سے زیادہ کہنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا، اور سائرس کا ابتدائی زمانہ خاندان سے الگ اور گمنامی میں بسر ہوا، تو کیا اُسی زمانہ میں دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے قریب نہیں پہنچ جاتیں؟ اور کیا ایسا نہیں سمجھا جا سکتا کہ اسی زمانہ میں سائرس زردشت کی تعلیم و صحبت سے بہرہ مند ہوا؟ سائرس کی ابتدائی زندگی کی سرگزشت تاریخ کی ایک گم شدہ داستان ہے۔ پھر کیا اس داستان کا سُراغ ہمیں ان دونوں شخصیتوں کی معاصرت کے واقعہ میں نہیں ملجاتا؟

مورخ زینوفن نے سائرس کی ابتدائی زندگی کا افسانہ ہمیں سنایا ہے۔ اس افسانہ میں ایک پُراسرار شخص کی پرچھائیں صاف نظر آ رہی ہے جو دشت و جبل کے اس پروردۂ قدرت کو آنے والے کارناموں کے لیے طیار کر رہا تھا۔ کیا اس پرچھائیں میں ہم خود زردشت کی مقدس شخصیت کی نمود نہیں دیکھ رہے؟ اگر زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران میں ہوا تھا، اور اگر سائرس کی ابتدائی گمنامی کا زمانہ بھی شمالی کوہستانوں میں بسر ہوا، تو کیوں یہ دونوں کڑیاں باہم مل کر ایک گم شدہ داستان کا سُراغ نہ بن جائیں؟

سائرس کی شخصیت وقت کے تمام ذہنی اور اخلاقی رجحانات کے برخلاف ایک انقلاب انگیز شخصیت تھی۔ ایسی شخصیت کسی انقلاب انگیز داعی کی دعوت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، اور صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ داعی شخصیت زردشت ہی کی تھی۔

بہرحال سائرس نے اپنی ابتدائی گمنامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی ہو، یا تخت نشینی کے بعد، لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دینِ زردشتی پر عامل تھا۔

دینِ زردشتی کی حقیقی تعلیم

لیکن اگر ذوالقرنین دینِ زردشتی پر عامل تھا، اور قرآن ذوالقرنین کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا اثبات کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُسے ملہم من اللہ قرار دیتا ہے، تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زردشت کی تعلیم دینِ حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس لزوم سے بچنے کی ہم کوشش کریں، کیونکہ یہ حقیقت اب پوری طرح روشنی میں آ چکی ہے کہ زردشت کی تعلیم سرتاسر خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم تھی، اور آتش پرستی اور ثنویت کا اعتقاد اس کا پیدا کیا ہوا اعتقاد نہیں ہے، بلکہ قدیم میدوی مجوسیت کا ردِّ عمل ہے۔

جس طرح روم کی مسیحیت قدیم رومی بُت پرستی کے ردِّ عمل سے محفوظ نہ رہ سکی، اُسی طرح زردشت کی خالص خدا پرستانہ تعلیم بھی قدیم مجوسیت کے ردِّ عمل سے نہ بچ سکی۔ خصوصاً ساسانی عہد میں جب اَز سرِ نو مدوّن ہوئی، تو اصل تعلیم سے بالکل ایک مختلف چیز

[1] دارا کی وفات باتفاق ۴۸۶ قبل مسیح میں ہوئی، اور ہیروڈوٹس ۴۸۴ ق م میں پیدا ہوا تھا یعنی دارا کی وفات کے صرف دو سال بعد۔

رہ چکی تھی۔

میڈیا کا قدیم مذہب

زردشت کے ظہور سے پہلے فارس اور میڈیا کے باشندوں کے عقائد کی بھی نوعیت وہی تھی جو انڈو یوروپین آریاؤں کی تمام دوسری شاخوں کی رہ چکی ہے۔ ہندوستان کے آریوں کی طرح ایران کے آریوں میں بھی پہلے مظاہر قدرت کی پرستش شروع ہوئی۔ پھر سورج کی عظمت کا تصور پیدا ہوا، پھر زمین میں آگ نے سورج کی قائم مقامی پیدا کرلی کیونکہ تمام مادی عناصر میں روشنی اور حرارت کا سرچشمہ وہی تھی۔ یونانیوں میں ایسے دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوا جن سے اچھائی اور برائی، دونوں ظہور میں آتی تھیں لیکن ایرانیوں کے تصور نے دیوتاؤں کو دو متقابل قوتوں میں تقسیم کردیا۔ ایک قوت پاک روحانی ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں بخشتی تھی، دوسری قوت برائی کے عفریتوں کی تھی جو نوع انسانی کے جانی دشمن تھے۔ روحانی ہستیوں کی نمود روشنی میں ہوئی، اور شیطانوں کی تاریکی میں۔ نور و ظلمت کی یہی کشمکش ہے جس سے تمام اچھے برے حوادث ظہور میں آتے ہیں۔ چونکہ روشنی پاک روحانیتوں کی نمود ہے اس لیے ہر طرح کی عبادتیں اور قربانیاں اسی کے لیے ہونی چاہییں۔ اس روشنی کا مظہر آسمان میں سورج اور زمین میں آگ تھی۔

اچھائی برائی کا جس قدر تصور تھا، وہ یونانیوں کی طرح صرف مادی زندگی کی راحتوں اور محرومیوں ہی میں محدود تھا۔ روحانی زندگی اور اس کی سعادت و شقاوت کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔

آگ کی پرستش کی قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں، اور اس کے خاص پجاریوں کا ایک مقدس گروہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔ اس کے افراد "موگوش" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آگے چل کر اسی لقب نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کرلیا۔

زردشت کی تعلیم

لیکن زردشت نے ان تمام عقائد سے انکار کردیا، اس نے خدا پرستی، روحانی سعادت و شقاوت اور آخرت کی زندگی کا عقیدہ پیدا کیا۔ اس نے کہا۔ یہاں نہ تو خیر کی بہت سی روحانی ہستیاں ہیں۔ نہ شر کے بہت سے عفریت۔ یہاں صرف ایک "اہورمزدہ" کی ہستی ہے، جو یگانہ ہے، نور ہے، قدوس ہے، حق ہے، حکیم ہے، قدیم ہے، اور تمام کائنات ہستی کی خالق ہے۔ کوئی ہستی نہیں جو اس کے مثل ہو، یا اس کے ہمتا ہو، یا اس کی شریک ہو۔ تم نے جن روحانی قوتوں کو خیر کا خالق سمجھ رکھا ہے، وہ خالق و قادر نہیں ہیں بلکہ "اہورمزدہ" کے پیدا کیے ہوئے "امش سپند" ہیں۔ یعنے ملائکہ ہیں، اور شر کا ذریعہ دیوؤں کی خوفناک قوت نہیں ہے، بلکہ "انزدمین" (اہرمن) کی ہستی ہے۔ یعنے شیطان کی ہستی ہے۔ یہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے انسان کو تاریکی کی طرف لے جاتی ہے۔

تعلیم کی عملی خصوصیت

زردشت کی تعلیم کا عملی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے۔ یونانیوں کی طرح اس کا اخلاقی تصور مذہب سے الگ نہیں تھا، بلکہ عین مذہب ہیں تھا۔ اس نے مذہب کو محض ایک قومی اور ملکی مذہب کی شان نہیں دی، بلکہ انفرادی زندگی کا روزانہ دستورالعمل بنادیا۔ نفس کی طہارت اور اعمال کی درستگی اس کی تعلیم کا اصلی محور ہے۔ انسانی زندگی کا ہر خیال، ہر قول، ہر فعل ضروری ہے کہ اس معیار پر پورا اترے۔ "فکر کی راستی، گفتار کی راستی، اور کردار کی راستی" پرستاران اہورمزدہ کے لیے تین بنیادی اصول تھے۔ پروفیسر گرنڈی کے لفظوں میں "اس کا مذہب حقیقت اور عمل کا مذہب تھا۔ یونانی مذہب کی طرح محض رسموں اور ریتوں کا مذہب نہ تھا۔ اس نے مذہب کو ایرانیوں کی روزانہ زندگی کی ایک حقیقت بنادیا، اور اخلاق اس مذہب کا مرکزی عنصر تھا"[۱]

عبادت کا تصور

اس کی عبادت کا تصور ہر طرح کے اصنامی اثرات سے پاک تھا۔ عبادت ہمیں اس لیے نہیں کرنی چاہیے کہ خدا کے غضب و انتقام سے بچیں، بلکہ اس لیے کہ برکتیں اور سعادتیں حاصل کریں۔ اگر ہم اہورمزدہ کی عبادت نہیں کرینگے تو وہ ہمیں یونانی اور ہندوستانی دیوتاؤں کی طرح اپنے غضب کا نشانہ نہیں بنائیگا، لیکن خود ہم سعادت سے محروم رہجائینگے۔

آخرت کی زندگی

اس کی تعلیم کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو آخرت کی زندگی کا اعتقاد ہے۔ وہ کہتا ہے، انسان کی زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی اس دنیا میں گزرتی ہے۔ اس کے بعد بھی ایک زندگی پیش آئیگی۔ اس زندگی میں دو عالم ہونگے۔ ایک اچھائی اور سعادت کا۔ دوسرا برائی اور شقاوت کا۔ جن لوگوں نے اس زندگی میں نیک عمل کیے ہیں، وہ پہلے عالم میں جائینگے۔ جنھوں نے برے عمل کیے ہیں، وہ دوسرے عالم میں، اور اس کا فیصلہ اس دن ہوگا جسے وہ "آخری فیصلہ" کا دن قرار دیتا ہے۔

---

۱ دیکھو پروفیسر گیلڈنر کا مقالہ۔ یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۱۱۳۰۔

تھا، روح کا مسئلہ اُس کے مذہب کی بنیادی چٹان ہے۔ انسان فانی ہے مگر اُس کی روح فانی نہیں۔ وہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اور ثواب و عقاب کے دو عالموں میں سے کسی عالم میں داخل ہو جاتی ہے۔

پیروانِ زردشت کا اخلاقی تقدم

موجودہ عہد کے تمام محققین تاریخ متفق ہیں کہ زردشت کی تعلیم نے انسان کے اخلاقی اور فکری ارتقا میں نہایت مؤثر حصہ لیا ہے، اس نے پانچ سو برس قبل مسیح ایرانیوں کو اخلاقی پاکیزگی کی ایک ایسی سطح پر پہنچا دیا تھا جہاں سے اُن کے معاصر یونانیوں اور رومیوں کی زندگی بہت ہی پست دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسا مذہب جس کی تعلیم کا رُخ سرتاسر انفرادی زندگی کی پاکیزگی کی طرف تھا اور جو اپنے پیروؤں کی اخلاقی روش کے لیے نہایت بلند مطالبے رکھتا تھا، ضروری تھا کہ اعمال و خصائل کے بہتر سانچے ڈھال دے، اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ اُس نے ڈھال دیے تھے۔ یہ شہادت کن لوگوں کے قلم سے نکلی ہے؟ ان لوگوں کے قلم سے جو کسی طرح بھی ایرانیوں کے دوست نہیں سمجھے جا سکتے۔ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کا تمام زمانہ ایرانیوں اور یونانیوں کی مسلسل آویزش کا زمانہ رہا ہے، اور ہیروڈوٹس اور زینوفون نے جب تاریخیں لکھی ہیں، تو یونان کے حریفانہ جذبات پوری طرح اُبھرے ہوئے تھے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایرانیوں کی اخلاقی فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے۔ اُنہیں ماننا پڑتا ہے کہ "ان میں بعض ایسی عظیم فضیلتیں ہیں جو یونانیوں میں نہیں پائی جاتیں" ہم یہاں پروفیسر گرنڈی کے الفاظ مستعار لیں گے کہ "ایرانی سچائی اور دیانت کی ایسی فضیلتیں رکھتے تھے جو اُس عہد کی قوموں میں عام طور پر دکھائی نہیں دیتی"

ان کی راست بازی، رحم دلی، شجاعت، اور بلند نظری کا سب اعتراف کرتے ہیں، اور یہ یقیناً زردشت کی تعلیم کے لازمی نتائج تھے۔

دارا کے فرامین

دارائے اول کا زمانہ اس مذہب کی بلند آہنگی کا شاندار زمانہ ہے۔ اُس کے کتبوں میں ہمیں زردشتی تعلیم کی صدائیں صاف سُنائی دے رہی ہیں، اور ان سے ہم حقیقت حال معلوم کر سکتے ہیں۔ اصطخر کا کتبہ ڈھائی ہزار برس پیشتر کی یہ منادی آج تک بلند کر رہا ہے:

"خدائے برتر اہورمزدہ ہے۔ اسی نے زمین پیدا کی، اُسی نے آسمان بنایا، اُسی نے انسان کی سعادت بنائی، اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمراں اور آئین ساز بنایا"

"دارا اعلان کرتا ہے کہ اہورمزدہ نے اپنے فضل سے مجھے بادشاہت دی، اور اُسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن و امان قائم کیا۔ میں اہورمزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے، میرے خاندان کو، اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے۔ اے اہورمزدہ! میری دعا قبول کر!"

صراطِ مستقیم کی دعوت

"اے انسان! اہورمزدہ کا تیرے لیے حکم یہ ہے کہ بُرائی کا دھیان نہ کر۔ صراط مستقیم کو نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچتا رہ!"[1]

یاد رہے کہ دارا سائرس کا معاصر تھا، اور اُس کی وفات سے صرف آٹھ برس بعد تخت نشین ہوا۔ پس دارا کی صداؤں میں ہم خود سائرس کی صدائیں سُن رہے ہیں۔ اس کا بار بار اپنی کامرانیوں کو اہورمزدہ کے فضل و کرم سے منسوب کرنا ٹھیک ٹھیک ذوالقرنین کے اس طریقِ خطاب کی تصدیق ہے کہ ھٰذا رحمۃ من ربی (۹۸)

زردشتی مذہب کا انحطاط و تغیر

لیکن چوتھی صدی قبل مسیح کے بعد زردشتی مذہب کا تنزل شروع ہو گیا۔ ایک طرف قدیم مجوسی مذہب نے آہستہ آہستہ سر اُٹھایا، دوسری طرف خارجی اثرات بھی کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انٹائنین (Antonine) شہنشاہ روم کے زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائرس اور دارا کے عہد کے زردشتی مذہب نے بالکل ایک دوسری ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ پھر سکندر اعظم کی فتوحات کا سیلاب اُٹھا اور وہ ایران کی دو صد سالہ شہنشاہی ہی نہیں بلکہ اُس کا مذہب بھی بہا لے گیا۔ ایرانیوں کا قومی افسانہ کہتا ہے کہ زردشت کا مقدس صحیفہ اوستا بارہ ہزار بیلوں کی مدبوغ کھالوں پر آب زر سے لکھا ہوا تھا جو سکندر کے حملۂ اصطخر میں جل کر راکھ ہو گیا۔ بارہ ہزار بیلوں کی کھال کا قصہ تو محض مبالغہ ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس نے جو سلوک تورات کے ساتھ کیا تھا، وہی سکندر کے حملۂ ایران نے اوستا کے ساتھ کیا۔ یعنے دونوں جگہ مذہب کا اصل نوشتہ مفقود ہو گیا۔

پھر جب پانچ سو پچاس برس کے بعد ساسانی دورِ حکومت شروع ہوا تو مذہب زردشت کی ازسرِنو تدوین کی گئی، اور جس

---

[1] جی۔ راولین سن (Rawlinson) "فائو گریٹ مونارکیز آف دی اینشینٹ ایسٹرن ورلڈ"

طرح قید بابل کے بعد عزرا نے نئی تورات مرتب کی تھی، اسی طرح اردشیر بابکانی نے از سر نو اوستا کا نسخہ مرتب کرایا لیکن اب مذہب کی تمام حقیقی خصوصیات طرح طرح کی تبدیلیوں، تحریفوں، اور اضافوں سے یک قلم مسخ ہو چکی تھیں۔ چنانچہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ ساسانی عہد کا مذہب قدیم مجوسیت، زردشتیت، اور یونانیت کا ایک مخلوط مرکب ہے۔ اور اس کا بیرونی رنگ و روغن تو تمام تر مجوسیت ہی نے فراہم کیا ہے۔ اسی ساسانی اوستا کا ایک ناقص اور محرف ٹکڑا ہے جو ہندوستان کے پارسیوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اور جس کے لیے ہم ایک فرنچ مستشرق آنک تیل کی اولوالعزمیوں اور علمی قربانیوں کے شکر گزار ہیں۔

اہورموزدہ کی مزعومہ شبیہ

اس سلسلہ میں ایک بحث طلب سوال اور ہے، اور ضروری ہے کہ اس پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ یہ مسلم ہے کہ پیروانِ زردشت میں بت پرستی کی کوئی شکل بھی سر نہ اٹھا سکی۔ قدیم مجوسی مذہب میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن ایران میں دارا اور اس کے بعد کے عہد کے جو آثار ملے ہیں اُن میں ایک خاص صورت کا نقش پایا جاتا ہے۔ یہ بادشاہ کی تصویر نہیں ہو سکتی کیونکہ بادشاہ کی شخصیت مرقع میں الگ نمایاں ہے۔ اس کا محل ہر جگہ بلندی میں اور سب سے اوپر واقع ہوا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ خود بادشاہ سے بھی ایک بلند تر ہستی ہو۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ کون ہستی ہے؟ سب سے پہلے یہ صورت بے ستوں کے مرقع میں زیر بحث ہوئی، جب ۱۸۴۶ء میں کرنیل رالین سن نے اپنی شرح و حل کے ساتھ اصل مرقع کا چربہ شائع کیا۔ پھر یہی صورت متعدد نقوش میں ملی۔ مثلاً دارا کی سرکاری مُہر کے مرقع میں نقش رستم میں جو در اصل دارا کی قبر ہے۔ استخر کے محل شاہی کے دروازہ پر جو غالباً درمیانی دروازہ ہے۔

رالین سن سے پہلے سر رابرٹ کیر پورٹر نے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ یہ کوئی مافوق انسانیت ہستی ہونی چاہیے جو خود بادشاہ سے بھی اوپر اپنی جگہ رکھتی ہے۔ رالین سن ایک قدم اور آگے بڑھا، اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ اہورموزدہ کی ہستی ہے، یعنے خدا کی۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ رائے برابر مقبول ہوتی گئی۔ اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایرانی اگرچہ بت پرستی سے مجتنب رہے، لیکن انھوں نے اہورموزدہ کی ہستی کے لیے ایک مرموز (یعنے Symbolic) تشخص کا تصوّر ضرور قائم کر لیا تھا جو ان تصویروں میں نمایاں ہے، اور یہ مصریوں اور آشوریوں کے مرموز تجسّم کا اثر تھا جس سے وہ بھی متاثر ہو گئے[1]

لیکن ۱۹۱۲ء سے (جبکہ میں نے پہلے پہل ایرانی آثار قدیمہ کا بغور مطالعہ کیا) میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ قیاس اوّل دن سے غلط رُخ پر چلا ہے، اور تمام تاریخی اور عقلی قرائن اس کے خلاف ہیں:

اولاً، تمام تاریخی شہادتیں اور خود پارسیوں کا مسلسل تعامل ثابت کر رہا ہے کہ انھوں نے الوہیت کا تصور کبھی کسی انسانی جسم و صورت میں نہیں کیا، اور کبھی کسی مجسّمہ کو تقدیس کی نظر سے نہیں دیکھا۔

ثانیاً اگر امتدادِ زمانہ سے یہ چیز پیدا بھی ہو گئی ہو، جب بھی کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ خود دارا کے عہد میں پیدا ہو گئی ہو، جو زردشت کی تعلیم کا ابتدائی عہد تھا، اور جب یونانی مورخوں کی شہادت کے مطابق، ایرانی یونانی بت پرستی کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔

ثالثاً اس شبیہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو معبودیت و الوہیت کی کوئی خاص شان رکھتی ہو۔ ہر جگہ اس کی ایک ہی صورت اور وضع ہے، اور وہ ایک معمولی انسان کی ہے جس نے اُس زمانہ کا عام لباس پہن رکھا ہے۔ وہی لباس جو خود دارا اور اُس کے جانشینوں کی تصویروں میں دکھایا گیا ہے۔ صرف اتنی بات اس میں زیادہ ہے کہ ایک حلقہ اُس کی کمر سے نیچے چاروں طرف بنا دیا گیا ہے، اور عقب میں ایک ایسا طولانی نقش ہے جس میں لہروں کی سی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس حلقہ اور لہروں کو سورج کی مرموز شکل قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ رائے تسلیم بھی کر لی جائے، جب بھی یہ اس کے لیے کافی نہیں کہ محض یہ مشتبہ حلقہ اور مشتبہ لہریں ایک خالق ہستی کے تصور کے لیے پیروانِ زردشت کا منتہائے خیال تھا۔

---

[1] عام رائے یہی ہو گئی ہے، لیکن ایسی صدائیں برابر اُٹھتی رہی ہیں جنھیں اس رائے سے اختلاف ہوا۔ کرنیل رالین سن کی اشاعات کے چند سال بعد فنات شرقیہ کے ایک عالم ریونڈ چارلس فاسٹر (Forster) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ تصویر اُس نقاش کی ہے جس نے مرقع نقش کیا تھا اور جو حلقہ اس کی کمر کے گرد نظر آرہا ہے یہ معماروں کی ٹوکری ہے جس میں بیٹھ کر بلندی پر کام کیا کرتے تھے۔ (دیکھو مصنف مذکور کی کتاب One Primeval Language جلد سوم صفحہ ۱۶۹)

ثانیاً اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ اس حلقہ اور لہروں میں ایک ماوراء انسانیت ہستی کا تصور مرموز تھا جب بھی یہ اہورمزدہ کی ہستی کیوں ہو، جس کی نسبت زردشت نے تقدیس و علو کا اس درجہ بلند تصور قائم کیا ہے؟ کیوں یہ کسی ایسے انسان کی صورت نہ ہو جو اگرچہ انسان تھا مگر نبی یا انسانیت کی رفعت و تقدیس کی وجہ سے ایک غیر معمولی ہستی سمجھا جاتا تھا؟ مثلاً خدا کی ایک فرستادہ ہستی؟ بہرحال اس پہلو پر جس قدر بحثیں ہیں، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسے اہورمزدہ کی ہستی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ یا تو خود زردشت کی تصویر ہے جو ایرانی مذہب کا بانی تھا، یا سائرس کی ہے جو اس مذہب کا حکمراں پیغمبر اور ہخامنشی شہنشاہی کا پہلا تاجدار تھا۔

چونکہ اس صورت کے بائیں ہاتھ میں ہر جگہ ایک صحیفہ دکھلایا گیا ہے، اور قدیم تصورات میں حلقہ کی شکل حکومت و مالکیت کی علامت سمجھی جاتی تھی، اس لیے زیادہ قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سائرس کی تصویر ہو[1]۔

کیا ذوالقرنین نبی تھا؟

(۸) جہاں تک قرآن کی تصریحات کا تعلق ہے، ایک اہم سوال اور باقی رہ گیا ہے۔ قرآن میں ہے قلنا یا ذا القرنین۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین۔ اس خطاب کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین براہ راست وحی الٰہی سے مخاطب تھا؟ مفسرین نے اس پر طبع آزمائیاں کی ہیں، اور چونکہ امام رازی سکندر مقدونی کو ذوالقرنین بنانا چاہتے ہیں اور وہ بنتا نہیں، اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں قلنا کے منطوق پر اس کے مفہوم کو ترجیح دیں۔

اس میں شک نہیں کہ قلنا کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بالواسطہ خطاب ہو۔ یعنے اُس عہد کے کسی پیغمبر کے ذریعہ ذوالقرنین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ جیسا کہ فقلنا اضربوہ ببعضہا (۲: ۷۳) میں ہے۔ یا خطاب قولی نہ ہو، تکوینی ہو۔ جیسا کہ قیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی (۱۱: ۴۴) اور قلنا یا نار کونی برداً وسلاماً علی ابراهیم (۲۱: ۶۹) وغیرہ آیات میں ہے۔ لیکن اس طرح کا مطلب جب ہی قرار دینا چاہیے کہ اس کے لیے قوی وجوہ موجود ہوں۔ اور یہاں کوئی وجہ موجود نہیں۔ آیت کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ ذوالقرنین کو اللہ نے براہِ راست مخاطب کیا، اور اس پر اللہ کی وحی نازل ہوتی تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ وحی نبوت کی وحی تھی، یا اُس طرح کی وحی تھی جیسی حضرت موسیٰ کی والدہ کی نسبت بیان کی گئی ہے کہ واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه (۲۸: ۷) تو صحابہ و سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا، اور متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد حافظ ابن کثیر بھی اسی تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

اور غور کرو، قرآن کا یہ بیان سائرس کی شخصیت پر کس طرح ٹھیک ٹھیک منطبق ہو رہا ہے؟ تاریخ اُس کی پیغمبرانہ شخصیت کی شہادت دے رہی ہے، اور عہد عتیق کے انبیاء اُسے صریح خدا کا برگزیدہ، اُس کا مسیح، اور اس کی مرضی پوری کرنے والا کہہ رہے ہیں۔ عزرا نبی کی کتاب میں اُس کا جو فرمان تعمیر بیت المقدس کے لیے نقل کیا گیا ہے، اس میں وہ خود اعلان کرتا ہے "خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہودیا کے ملک میں اس کی عبادت کے لیے ایک ہیکل تعمیر کروں" اُس کا یہ کہنا کہ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے" ٹھیک ٹھیک قلنا یا ذا القرنین کی تصدیق ہے۔ ہم اس سے پہلے اس کی خدا پرستی کے اثبات میں جو کچھ لکھ چکے ہیں، اس میں سے ہر بات ٹھیک ٹھیک اس کی نبوت کے ثبوت میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

یاجوج و ماجوج

(۹) اب صرف ایک معاملہ کی تشریح باقی رہ گئی ہے یعنے یاجوج اور ماجوج سے کون سی قوم مراد ہے؟ اور جو سد سائرس نے بنائی تھی، اُس کی تاریخی نوعیت کیا ہے؟

قرآن مجید نے یاجوج اور ماجوج کا دو جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک تو یہاں ہے۔ دوسرا سورۂ انبیاء میں ہے: حتیٰ اذا فتحت یاجوج وماجوج وهم من کل حدب ینسلون (۲۱: ۹۶)

یاجوج اور ماجوج کا نام سب سے پہلے عہد عتیق میں آیا ہے۔ حزقیل نبی کی کتاب میں جنہیں بخت نصر اپنے آخری حملہ

[1] سنہ ۱۹۱۳ء میں میں نے اپنا یہ خیال مسٹر ایڈورڈ براؤن (پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی و مصنف لٹریری ہسٹری آف پرشیا وغیرہ) کو لکھا تھا۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا تھا، اور بہت اصرار کے ساتھ لکھا تھا کہ بعض مستشرقین جرمنی سے اس بارے میں مراسلت کروں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے لکھا، وہ خود اس بارے میں خط و کتابت کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جنگ عظیم شروع ہو گئی اور میری خط و کتابت کا سلسلہ سنسر کی سخت گیریوں نے بالکل مسدود کر دیا۔ پھر میں نظربند ہو گیا، اور جب چھوٹا تو اس کے چند دنوں بعد اُن کے انتقال کی خبر آ گئی۔

بیت المقدس میں گرفتار کرکے بابل لے گیا تھا، اور جو سائرس کے ظہور تک زندہ رہے، یہ پیشین گوئی ملتی ہے:

حزقیل نبی کی پیشین گوئی

"اور خداوند کا کلام مجھ تک پہنچا۔ اس نے کہا، اے آدم زاد! تو جوج کی طرف اپنا منہ کرکے اس کے برخلاف نبوت کر۔ جوج کی طرف، جو ماجوج کی سرزمین کا ہے، اور روس، مسک، اور توبال کا سردار ہے۔ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ میں تیرا مخالف ہوں میں تجھے پھرا دونگا۔ تیرے جبڑوں میں بنسیاں مارونگا، تیرے سارے لشکر اور گھوڑوں اور سواروں کو جو جنگی پوشاک پہنے جو پھریاں اور سپریں لیے ہوئے ہیں اور سب شمشیر بکف ہیں، کھینچ نکالونگا۔ اور میں اُن کے ساتھ فارس اور کوش اور فوط کو بھی کھینچ نکالونگا جو سپر لیے ہوئے اور خود پہنے ہونگے۔ نیز جومر اور شمال بعید کے اطراف کے باشندگان تجرمہ اور اُن کا سارا لشکر"

اس کے بعد دور تک تفصیلات چلی گئی ہیں۔ اور چار باتیں خصوصیت کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جوج شمال کی طرف سے آئیگا تاکہ لوٹ مار کرے۔ دوسری یہ کہ "ماجوج پر اور اُن پر جو جزیروں میں سکونت رکھتے ہیں، تباہی آئیگی"۔ تیسری یہ کہ جو لوگ اسرائیل کے شہروں میں بسنے والے ہیں، وہ بھی ماجوج کے مقابلہ میں حصہ لینگے اور اُن کے بے شمار ہتھیار اُن کے ہاتھ آئینگے۔ چوتھی یہ کہ ماجوج کی تباہی کا گورستان "مسافروں کی وادی" میں بنے گا جو "سمندر کے پورب میں ہے" اُن کی لاشیں عرصہ تک وہاں پڑی رہینگی۔ لوگ انہیں گاڑتے رہینگے تاکہ رہگذر صاف ہوجائے۔ (باب ۳۸-۳۹)

یہ واضح رہے کہ اس پیشین گوئی سے پہلے سائرس کے ظہور اور یہودیوں کی آزادی و خوش حالی کی پیشین گوئی بیان کی جاچکی ہے اور اس پیشین گوئی کا محل ٹھیک اُس مکاشفہ کے بعد ہے جس میں حزقیل نبی نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں کو زندہ ہوتے دیکھا تھا، اور جسے قرآن نے بھی سورۂ بقرہ کی آیت اوکالذی مرّ علیٰ قریۃ وھی خاویۃ علیٰ عروشہا (۲:۲۵۹) میں بیان کیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ جوج اور ماجوج کا معاملہ بھی اُسی زمانے کے لگ بھگ پیش آنے والا ہو یعنے سائرس کے زمانہ میں۔ اور یہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا ایک مزید ثبوت ہے۔ کیونکہ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ اُسی نے یاجوج و ماجوج کے حملوں کی روک تھام کے لیے ایک سد تعمیر کی تھی۔

عہد عتیق کے بعد یہ نام ہمیں مکاشفات یوحنا میں بھی ملتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ "جب ہزار برس پورے ہوچکینگے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائیگا، اور وہ ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہونگی، یعنے یاجوج و ماجوج کو گمراہ کرنے اور لڑائی کے لیے جمع کرنے نکلیگا۔ ان کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا۔ وہ تمام زمین کی وسعتوں پر چڑھ جائینگی" (۲۰:۷)

گاگ اور مے گاگ

یاجوج اور ماجوج کے لیے یورپ کی زبانوں میں Gog اور Magog کے نام مشہور ہوگئے ہیں، اور شارحین تورات کہتے ہیں کہ یہ نام سب سے پہلے تورات کے ترجمۂ سبعینی[1] میں اختیار کیے گئے تھے۔ لیکن کیا اس لیے اختیار کیے گئے کہ جوج اور ماجوج کا یونانی تلفظ یہی ہوسکتا تھا، یا خود یونانی میں پہلے سے یہ نام موجود تھے؟ اس بارے میں شارحین کی رائیں مختلف ہیں لیکن زیادہ قوی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں نام اسی طرح یا اس کے قریب قریب یونانیوں میں بھی مشہور تھے۔

شمال مشرقی قبائل

اب سوال یہ ہے کہ یہ کون قوم تھی؟ تمام تاریخی قرائن متفق طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سے مقصود صرف ایک ہی قوم ہوسکتی ہے۔ اُس کے سوا کوئی نہیں۔ یعنے شمال مشرقی میدانوں کے وہ وحشی مگر طاقتور قبائل جن کا سیلاب قبل از تاریخ عہد سے لیکر نویں صدی مسیحی تک برابر مغرب کی طرف اُمنڈتا رہا، جن کے مشرقی حملوں کی روک تھام کے لیے چینیوں کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانی پڑی تھی، جن کی مختلف شاخیں تاریخ میں مختلف ناموں سے پکاری گئی ہیں۔ اور جن کا آخری قبیلہ یورپ میں میگر کے نام سے روشناس ہوا، اور ایشیا میں تاتاریوں کے نام سے۔ اسی قوم کی ایک شاخ تھی جسے یونانیوں نے سیتھین Scythian کے نام سے پکارا ہے، اور اسی کے حملوں کی روک تھام کے لیے سائرس نے سد تعمیر کی تھی۔

منگولیہ

شمال مشرق کے اس علاقہ کا بڑا حصہ اب "منگولیا" کہلاتا ہے۔ لیکن "منگول" لفظ کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس کے لیے جب ہم چین کے تاریخی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں، (اور ہمیں اسی طرف رجوع ہونا چاہیے کیونکہ وہ منگولیا کے ہمسایہ میں ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم نام "موگ" تھا۔ یقیناً یہی "موگ" ہے جو چھ سو برس قبل مسیح یونانیوں میں "میگ" اور "مے گاگ" پکارا جاتا ہوگا، اور یہی عبرانی میں "ماجوج" ہوگیا۔

[1] ترجمۂ سبعینی سے مقصود تورات کا وہ پہلا یونانی ترجمہ ہے جو اسکندریہ میں شاہی حکم سے ہوا تھا، اور جس میں ستر علماء یہود شریک تھے۔

سنہ ۶۰۰ قبل مسیح میں یاجوج وماجوج کے مغربی ایشیا پر حملے اور سد ذوالقرنین کی تعمیر



چین کی تاریخ میں ہمیں اس علاقے کے ایک اور قبیلہ کا ذکر بھی ملتا ہے جو "یواچی" (Yueh-Chi) کے نام سے پکارا جاتا تھا یہی "یواچی" ہے جس نے مختلف قوموں کے مخارج و تلفظ سے گزر کر کوئی ایسی شکل اختیار کرلی تھی کہ عبرانی میں "یاجوج" ہوگیا۔

اس امر کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ اُن نتائج پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے جو مختلف قوموں کے نسلی جغرافیائی اور لغوی علائق کی بحث و تنقیب سے پیدا ہوئے ہیں، اور جو موجودہ زمانے میں تاریخ اقوام کے طے شدہ مبادیات ہیں۔

منگولیا کا قبائلی سرچشمہ اور اقوام قدیم کا انشعاب

کرۂ ارضی کی بلند سطح کا وہ حصہ جو شمال مشرق میں واقع ہے، اور جسے آج کل منگولیا اور چینی ترکستان کے نام سے پکارا جاتا ہے، تاریخ قدیم کی بے شمار قوموں کا ابتدائی گہوارہ رہ چکا ہے۔ یہ نسل انسانی کا ایک ایسا سرچشمہ تھا جہاں پانی برابر اُبلتا اور جمع ہوتا رہتا، اور جب بہت بڑھ جاتا تو مشرق و مغرب کی طرف اُمنڈنا چاہتا۔ اس کے مشرق میں چین تھا، مغرب و جنوب میں مغربی اور جنوبی ایشیا، اور شمال مغرب میں یورپ۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے قوموں اور قبیلوں کے سیلاب اُمڈتے رہے۔ کچھ وسط ایشیا میں آباد ہوگئے۔ کچھ آگے بڑھے اور شمالی یورپ تک پہنچ گئے۔ کچھ وسط ایشیا سے نیچے اتر گئے، اور جنوبی اور مغربی ایشیا پر قابض ہوگئے۔ یہ قبائل جو اس علاقے سے نکلتے تھے، مختلف ملکوں میں بس کر وہاں کی خصوصیات اختیار کرلیتے تھے، اور رفتہ رفتہ ایک مقامی قوم بن جاتے تھے، لیکن اُن کا وطنی سرچشمہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہتا۔ یہاں تک کہ پھر قبائل کا ایک نیا سیلاب اُٹھتا اور کسی نئے علاقہ میں پہنچ کر نئی مقامی قومیت کی تخلیق کردیتا۔

یہ علاقہ صدیوں تک اپنی اصلی وحشیانہ حالت پر باقی رہا، لیکن جو قبائل یہاں سے نکل نکل کر مختلف ملکوں میں بستے گئے اُنہوں نے مقامی خصوصیات اختیار کرکے تہذیب و تمدن کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ چند صدیوں کے بعد اُن کی حالت اس درجہ مختلف ہوگئی کہ ان میں اور ان کے قدیم ہم وطنوں میں کوئی بات بھی مشترک باقی نہیں رہی۔ وہ اب مہذب ہو رہے تھے۔ یہ بدستور وحشی تھے۔ وہ تہذیب کے صناعی ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یہ وحشت کی قدرتی بہیمیت اور درندگی سے۔ ان میں زراعت، صناعت، اور ذہنی ترقی کی مختلف شاخیں اُبھر رہی تھیں۔ وہ ان سب سے ناآشنا تھے۔ سرد علاقہ کی صحرائی زندگی اور وحشیانہ خصائل کی خشونت نے اُنہیں وقت کی شائستہ اقوام کے لیے ایک خوفناک ہستی بنادیا تھا۔

قبل اس کے کہ تاریخی عہد کی صبح طلوع ہو، شمال مغربی قبائل کی یہ مہاجرت شروع ہوچکی تھی، اور اس کا سلسلہ تاریخی عہد میں بھی بدستور جاری رہا۔

آریا

انہی قبائل کا ایک ابتدائی گروہ وہ تھا جو آرین نسل کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ وسط ایشیا سے یورپ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک نیچے اتر کر پنجاب میں آباد ہوگیا۔ ایک مغرب کی طرف بڑھا اور فارس اور میڈیا اور اناتولیا میں بس گیا۔ اسے اب انڈو یوروپین آریا کے نام سے شناخت کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ ہندوستان اور یورپ، دونوں کی آریائی اقوام کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کا جو حصہ شمالی ہند میں بس گیا تھا، اُس نے اپنا نسلی خطاب برابر یاد رکھا اور اپنے کو آریاورتہ کہتا رہا۔ جو فارس اور میڈیا میں بسا اُس نے اپنی ابتدائی قیام گاہ کو ایریانہ کے نام سے موسوم کیا (جسے اوِستا میں ایریانہ ویگو کہا گیا ہے) اور یہی ایریانہ ایران ہوگیا۔ جو قبائل اناتولیا تک پہنچ گئے تھے، وہ (غالباً) ہٹی (Hittite) کے نام سے پکارے گئے جنہیں تورات کی کتاب پیدائش میں "حتی" کہا گیا ہے، اور مصر کے قدیم نوشتوں میں "ختی" پایا جاتا ہے۔

یورپ کے قبائل

جو قبائل یورپ میں پہنچے، وہ گوتھ، افرانک، الامان، ونڈال، ٹیوٹان، اور ہن کے نام سے مشہور ہوئے، اور انہی کی ایک وسیع شاخ وہ تھی جو بحر اسود سے لے کر دریائے ڈینیوب کی بالائی وادی تک پھیل گئی اور سیتھین کے نام سے پکاری گئی۔ وسط ایشیا کے مشرقی قبائل بھی جو کبٹریا (بلخ) پر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے، سیتھین ہی تسلیم کیے گئے ہیں، اور خود دارا نے اپنے کتبۂ اصطخر میں اُنہیں اسی نام سے پکارا ہے۔

اقسام ثلاثہ

ان قبائل کی جو تین شاخیں شمالی ہند، اناتولیا (ایشیائے کوچک) اور ایران میں بس گئی تھیں، اُنہیں ایسا ماحول ملا جو زراعت کے لیے موزوں تھا۔ اس لیے بہت جلد اُنہوں نے زراعتی زندگی اختیار کرلی، اور پھر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگیں، لیکن جو شاخیں یورپ کی طرف بڑھیں اُنہیں ایسا ماحول میسر نہیں آیا۔ اس لیے صحرائی زندگی کی تمام خصوصیات اُن میں بدستور باقی رہیں اور صدیوں تک متغیر نہ ہوئیں۔ اب گویا ان قبائل کی تین حالتیں ہوگئی تھیں

اولاً، منگولیا کے اصلی باشندے جو یک قلم وحشی اور صحرائی تھے، اور ان کی یہ حالت بغیر کسی تغیر کے برابر قائم رہی۔

ثانیاً، بحرِ اسود کے شمالی ساحل اور شمالی یورپ کے قبائل، جو گو اپنے مولدِ اصلی سے الگ ہو گئے تھے، لیکن ان کی وحشیانہ خصوصیات نہیں بدلی تھیں۔

ثالثاً، ہندوستان، ایران، اور اناتولیا کے قبائل جو بہ تدریج شہریت و حضارت میں ترقی کرنے لگے، اور پھر آگے چل کر تین قدیم تہذیبوں کے بانی ہوئے۔

یاجوج ماجوج کا اطلاق

تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح سے لیکر پانچویں صدی مسیحی تک یاجوج اور ماجوج یا گوگ اور میگگ کا اطلاق پہلی دو قسموں پر ہوتا رہا۔ پہلی پر اس لیے کہ قومیت اور مقام کے لحاظ سے وہی یاجوج و ماجوج تھی۔ دوسری پر اس لیے کہ گو اپنے مولد و مقام سے الگ ہو چکی تھی لیکن اپنی وحشیانہ خصوصیات میں بالکل متغیر نہیں ہوئی تھی۔ تیسری قسم چونکہ یک قلم منقلب ہو چکی تھی، اس لیے اب وہ یاجوج و ماجوج نہیں رہی تھی۔ بلکہ خود یاجوج و ماجوج کی غارت گریوں کا نشانہ بن گئی تھی۔ البتہ جب پانچویں صدی مسیحی میں یورپ کے قبائل کی حالت بھی منقلب ہونا شروع ہو گئی، اور مسیحیت اختیار کر کے تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگے، تو قوموں کے حافظے سے ان کا نام بھی اتر گیا، اور یاجوج و ماجوج کا اطلاق صرف اسی خطہ میں سمٹ آیا، جہاں سے پھیلنا شروع ہوا تھا۔ یعنے صرف منگولیا کے صحرانورد قبائل ہی یاجوج و ماجوج سمجھے جانے لگے۔ چنانچہ قرآن نے سورۂ انبیاء میں ان کے جس خروج کی خبر دی ہے، وہ منگولیا کے تاتاریوں کا آخری خروج تھا۔

یورپ کی تمام موجودہ قومیں (لاطینی نسل مستثنےٰ کر دینے کے بعد) براہ راست انہی قبائل کی نسل سے ہیں۔ جیسا کہ معلوم و مسلم ہے۔

صحرانوردی اور توطن کا اختلافِ معیشت

اس موقعہ پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نسلِ انسانی نے اکثر حالتوں میں پہلے صحرانوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی ہے پھر توطن اور اقامت گزینی اختیار کی ہے، اور اس اختلافِ حالت نے ہمیشہ دو طرح کے انسانی گروہوں سے دنیا کو آباد رکھا ہے۔ صحرانورد قبائل کے گروہ اور اقامت گزین قبائل کے گروہ۔ معیشت کی یہ دونوں حالتیں اس درجہ مختلف تھیں کہ ایک ہی نسل کے دو قبیلوں میں سے ایک قبیلہ اگر صحرانورد رہتا تھا اور دوسرا اقامت گزین ہو جاتا تھا، تو چند صدیوں کے بعد نہ صرف ایک دوسرے سے اجنبی ہو جاتے تھے بلکہ بالکل متضاد قسم کی مخلوق بن جاتے تھے۔ صحرانورد قبائل کو غذا کے لیے جانوروں کے دودھ اور شکار کے گوشت پر اعتماد کرنا پڑتا تھا۔ اقامت گزین قبائل کو اناج پر۔ وہ گھوڑوں کی برہنہ پیٹھ پر زندگی بسر کرتے۔ یہ کھیتوں میں اور مکانوں کی چار دیواری میں۔ ان کی زندگی کا ماحول صحرائیت تھی۔ ان کا ماحول شہریت۔ ان کو نشو و نما کے لیے جنگ کی ضرورت تھی۔ ان کو امن کی۔ ان کا جسم روز بروز طاقتور اور محنت پسند ہوتا جاتا تھا۔ ان کا روز بروز کمزور اور راحت پسند۔ وہ روز بروز وحشت و خونخواری میں بڑھتے جاتے تھے۔ یہ روز بروز تہذیب و حضارت میں۔ تہذیب و حضارت کا لازمی نتیجہ تھا کہ جذبات و خصائل میں لطافت اور نرمی پیدا ہو۔ صحرائیت و خانہ بدوشی کا لازمی نتیجہ تھا کہ جذبات تند اور خصائل میں وحشت و خشونت ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ جوں جوں اقامت گزیں قبائل شائستہ ہوتے جاتے، صحرانورد قبائل کی ہستی ان کے لیے ہولناک اور ناقابل مزاحمت ہوتی جاتی۔ جب کبھی دونوں میں مقابلہ ہوتا، تو شہری قبائل دیکھتے کہ صحرانورد قبائل عفریتوں کی طرح خوفناک اور درندوں کی طرح خونخوار ہیں، اور صحرانورد قبائل معلوم کر لیتے کہ ان کی غارت گریوں کے لیے شہری آبادیوں سے زیادہ کوئی سہل شکار نہیں!

البتہ صحرانورد قبائل متفرق تھے، اور اقامت گزینی کے طریقوں سے ناآشنا، اقامت گزین قبائل باہم مربوط تھے اور معیشت کے منظم طریقوں سے آشنا، اس لیے قدرتی طور پر صحرانوردوں کے حملے ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ وہ خوفناک درندوں کی طرح آبادیوں پر گرتے، اور قتل و غارت کر کے نکل جاتے لیکن جم کر ٹک نہیں سکتے تھے، اور نہ علاقے فتح کر کے اپنے قبضے میں رکھ سکتے تھے۔ مگر جب کبھی صدیوں کے بعد ان میں کوئی حکمراں قائد پیدا ہو جاتا، اور وہ بہت سے قبیلوں کو متحد کر کے ایک فوج کی نوعیت دے دیتا، تو پھر قتل و غارتگری کی ایک ایسی منظم طاقت پیدا ہو جاتی جو صرف وقتی حملوں ہی پر قانع نہیں رہتی بلکہ مملکتوں اور قوموں پر قابض ہو جاتی اور شہری آبادیوں کی بڑی سے بڑی قوتیں بھی اس کی راہ نہیں روک سکتیں!

تاریخ شاہد ہے کہ صحرانورد اور غیر متمدن اقوام کے مقابلہ میں شہری اور متمدن اقوام کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا۔ یہاں تک کہ علم و صناعت نے ایسے ہتھیار اور جنگی وسائل پیدا کر دیے جن کے مقابلے سے غیر متمدن اقوام عاجز آ گئیں۔

یاجوج ماجوج صحرانوردی کی خوفناک قوت تھی

چنانچہ ان شمال مشرقی قبائل کی پوری تاریخ اسی حقیقت کا افسانہ ہے۔ ان کی جن شاخوں نے اقامت گزینی کی زندگی اختیار کرلی تھی، وہ بالکل ایک دوسری قوم بن گئیں، اور جنہیں ایسے حالات میسر نہیں آئے، وہ بدستور صحرانورد رہیں۔ اقامت گزین قبائل کے لیے صحرانورد قبائل صرف اجنبی ہی نہیں ہوگئے تھے بلکہ خوفناک بھی ہوگئے تھے، کیونکہ اُن کی روزافزوں شہرت ان کی صحرائی دہشت ناکیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ یہ جب کبھی موقعہ پاتے، قرب وجوار کی آبادیاں غارت کرتے، اور اگر قبائل کا کوئی قائد نکل آتا تو اُن کی غارت گریاں دور دور تک بھی پہنچ جاتیں۔ صدیوں تک ان کی حالت ایسی ہی رہی۔ پھر جب چوتھی صدی مسیحی سے ان کے اندر ایسے قائد پیدا ہونے لگے جنہوں نے نظم واطاعت کا راز پالیا تھا، تو اچانک ان کی طاقت کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانچویں صدی میں اٹیلا (Attila) نے جو ہن قبیلہ کا قائد تھا، ایک عظیم فاتح کی حیثیت اختیار کرلی اور رومن امپائر کی دونوں مشرقی ومغربی مملکتوں کو لرزہ براندام کردیا۔ پھر یہی قبائل ہیں جو بالآخر اس طرح تمام یورپ پر چھاگئے کہ نہ صرف رومن امپائر کو بلکہ رومی تمدن کو ہمیشہ کے لیے پامال کردیا۔

چند صدیوں کے بعد تاریخ یہ منظر پھر دہراتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خود منگولیا میں ایک نیا منگولی قائد چنگیز خاں پیدا ہوگیا ہے، وہ تمام تاتاری قبائل کو اپنے ماتحت ایک قوم بنادیتا ہے، اور پھر فتح وتسخیر کا ایک ایسا ہولناک سیلاب اُمنڈتا ہے جسے اسلامی ممالک کی کوئی متمدن قوت بھی نہ روک سکی۔ وسط ایشیا سے لے کر عراق تک، جو ملک اُس کے سامنے آیا خس وخاشاک کی طرح بہہ گیا!

منگولی نسل کے انشعاب کے مختلف دور

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج و ماجوج سے مقصود یہی منگولین قوم اور اس کی تمام صحرانورد اور وحشی شاخیں ہیں۔ اب ہم چاہتے ہیں، ان کے خروج وظہور کے مختلف دور تاریخی ترتیب سے منضبط کرلیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ سائرس کے زمانہ میں یہ قوم کہاں تھی، اور کیوں اسے سد تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ اس بارے میں تاریخ کی شہادتوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) پہلا دور تاریخی عہد سے پہلے کا ہے جب شمال مشرق سے ان قبائل کے ابتدائی گروہ نکلے اور وسط ایشیا میں آباد ہوگئے۔ پھر جنوب اور مغرب میں پھیلنے لگے۔ اس خروج وانشعاب کی رفتار بہت سست رہی ہوگی اور بے شمار منزلیں پیش آئی ہونگی۔

(۲) دوسرا دور صحیح تاریخ کا ہے، لیکن روشنی ابھی دھندلی ہے۔ اب اقامت گزینی اور صحرانوردی کی دو مختلف اور متوازی معیشتوں کا سُراغ لگایا جاسکتا ہے۔ شمالی ہند، ایران، اور اناتولیا کے قبائل اقامت گزینی کی زندگی میں بدل چکے ہیں، مگر وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود تک صحرانورد قبائل کے جتھے پھیلتے جاتے ہیں، اور مشرق سے نئے نئے قبیلوں کے اقدام کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ زمانہ تقریباً ۳۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۵۰۰ قبل مسیح تک کا تصور کرنا چاہیئے[۱]۔

(۳) تیسرا دور تاریخ کی روشنی میں پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اب بحر خزر اور بحر اسود کا علاقہ ایک وحشی اور خونخوار قوم کا مرکز بن چکا ہے، اور وہ مختلف ناموں میں اور مختلف جہتوں سے نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ پھر اچانک تاریخ کے افق پر "سیتھین" قوم کا نام اُبھرتا ہے۔ یہ وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود کے شمالی کناروں تک آباد ہے، اور اطراف وجوانب میں برابر حملہ آور ہوتی رہتی ہے۔ یہ زمانہ اشوری تمدن کے ظہور اور بابل اور نینوی کے عروج کا تھا اور ہیروڈوٹس کی زبانی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آشورین کی شمالی سرحد پر سیتھین قبائل کی غارت گریاں برابر جاری ہیں۔ یہ شمالی سرحد بحر خزر کے جنوبی ساحل اور آرمینیا کے سلسلۂ کوہ تک پہنچی ہوئی تھی، اور وہ کاکیشیا کے درے سے اُتر کر آشوری آبادیوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ پھر ۶۲۳ قبل مسیح میں اچانک اُن کا ایک عظیم گروہ اسی راہ سے اُترتا ہے اور ایران کا تمام مغربی حصہ پامال کردیتا ہے۔ یونانی

[۱] یہ تعین اس طرح کے تمام تعینات کی طرح محض تاریخی قیاسات پر مبنی ہے، اور اسی لیے اس بارے میں نظارِ تاریخ کی رائیں مختلف ہوئیں۔ البتہ حال کے انکشافات سے ایک بات تقریباً پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ یعنے ڈھائی ہزار سال قبل مسیح اناتولیا میں "حتی" یا "ختی" تمدن شروع ہو چکا تھا اور قدیم مصری تمدن کا معاصر تھا۔ بوغاز کوئی میں جو حتی کتب خانہ برآمد ہوا ہے اور جس میں بیس ہزار کے قریب منقوش تختیاں نکلی ہیں اس نے انیسویں صدی کے تاریخی تخمینے بہت کچھ بدل دیئے ہیں، اور اب یہ رجحان کہ اس زمانے کی مدت گھٹائی جائے، تقریباً مفقود ہو رہا ہے۔

مورخ کہتے ہیں کہ آشوری مملکت کی تباہی کا ایک بڑا باعث یہی غارت گری تھی[1]۔

(۴) چوتھا دور ۵۵۰ قبل مسیح کا قرار دینا چاہیے جب سائرس کا ظہور ہوا اور فارس اور میڈیا کی متحدہ شہنشاہی کی بنیاد پڑی۔ اس عہد میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین حملوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور صدیوں تک اُن کے حملوں کی کوئی صدا تاریخ کی سماعت تک نہیں پہنچتی۔ اس عہد میں صرف دو موقعوں پر ان کا ذکر آتا ہے۔ پہلا سائرس کے زمانہ میں جب وہ فتح بابل سے پہلے سیتھین قبائل کے سرحدی حملوں کا تدارک کرتا ہے۔ دوسرا دارا کے زمانے میں جب وہ باسفورس عبور کر کے دریائے ڈینیوب کی وادیوں میں پہنچ جاتا ہے اور ان قبائل کو دور تک بھگا دیتا ہے۔

دارا کے حملے کے بعد ان کا دباؤ شمالی یورپ کی طرف بڑھنے لگا۔

(۵) پانچواں دور تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس عہد میں منگولین قبائل کا ایک نیا سیلاب اٹھتا ہے اور پہلے چین کی آبادیوں پر ٹوٹتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وسط ایشیا کی قدیم شاہراہ اختیار کرتا ہے۔ چین کی تاریخ میں انہیں ہیونگ نو (Hiung-nu) کے نام سے پکارا گیا ہے، اور یہی نام آگے چل کر ہن ہو گیا ہے۔

یہی زمانہ ہے جب شہنشاہ چین شین ہوانگ ٹی نے ان حملوں کے روکنے کے لیے وہ عظیم الشان دیوار تعمیر کی جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے اور پندرہ سو میل تک چلی گئی ہے۔ اس کی تعمیر ۲۱۴ قبل مسیح میں شروع ہوئی، اور بیان کیا جاتا ہے کہ دس برس میں ختم ہوئی۔ اس نے شمال اور مغرب کی طرف سے منگولین قبائل کے حملوں کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ اس لیے ان کا رخ پھر وسط ایشیا کی طرف مڑ گیا۔

(۶) چھٹا دور تیسری صدی مسیحی کا ہے جب ان قبائل نے یورپ میں ایک نئی کروٹ لی اور بالآخر رومی مملکت اور رومی تمدن کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

(۷) ساتواں اور آخری دور بارہویں صدی مسیحی اور چھٹی صدی ہجری کا ہے جب منگولیا میں تازہ دم قبائل کی ایک بڑی تعداد پھر طیار ہو گئی، اور چنگیز خاں نے انہیں متحد کر کے ایک نئی فتح مند طاقت پیدا کر دی۔

ذو القرنین کے عہد میں یاجوج ماجوج

مندرجۂ صدر خلاصے سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین قبائل کے حملوں سے غارت ہو رہا تھا، اور جس ہاتھ نے اچانک ظاہر ہو کر ان کے حملے روک دیے اور پھر ہمیشہ کے لیے مغربی ایشیا یک قلم محفوظ ہو گیا، وہ سائرس کا ہاتھ تھا۔ پس یقیناً منگولین نسل کے یہی سیتھین قبائل تھے جو یاجوج ماجوج کے نام سے پکارے جاتے تھے، اور ذو القرنین یعنے سائرس نے انہی کی راہ روکنے کے لیے سد تعمیر کی۔ جس طرح تین صدیوں کے بعد چینی مجبور ہوئے کہ انہیں روکنے کے لیے ایک دیوار تعمیر کریں۔

سیتھین قبائل اور درہ کاکیشیا

اب غور کرو سیتھین قبائل کے یہ حملے کس جانب سے ہوتے تھے؟ ہیروڈوٹس وغیرہ یونانی مورخ بتلاتے ہیں کہ صرف ایک راہ سے یعنے کاکیشیا کے درہ سے۔ یہی مقام صدیوں تک دونوں علاقوں میں درمیان کا پھاٹک رہا ہے۔ اب اگر سائرس ان حملوں سے محفوظ ہونا چاہتا تھا تو کیا اس کے لیے ضروری نہ تھا کہ یہ پھاٹک بند کر دے؟ قدرتی طور پر ضروری تھا، اور اس لیے اس نے سد تعمیر کر کے یہ راہ مسدود کر دی۔ چونکہ ان حملوں کی صرف یہی ایک راہ تھی اور وہ اس طرح بند کر دی گئی، اس لیے یاجوجی حملوں کا بھی یک قلم خاتمہ ہو گیا۔

حزقیل کی پیشین گوئی کا مصداق

اب پھر حزقیل نبی کی پیشین گوئی پر ایک نظر ڈال لو۔ اس میں جوج کو روش، مسک، اور توبال کا سردار کہا ہے، اور یہ ٹھیک ٹھیک انہی قبائل کے نام ہیں۔ "روش" وہی ہے جس سے "رشیا" نکلا۔ "مسک" وہی ہے جو "موسکوؤ" ہوا، اور "توبال" بحر اسود کا بالائی علاقہ تھا۔ پھر کہا ہے کہ "میں تجھے پھرا دونگا" اور "تیرے جبڑوں میں بنسیاں مارونگا" یہ وہی واقعہ ہے کہ سائرس نے سیتھین قبائل کے منہ پھرا دیے اور سد تعمیر کر کے ان پر ان کی راہ روک دی۔ پھر کہا ہے، "ایسا معاملہ واقع ہوگا کہ ان کے تمام ہتھیار جلا دیے جائینگے" اور "رہگذروں کی ایک وادی میں جو سمندر کے پورب میں ہے ان قوموں کا گورستان بنیگا، نیز عرصہ تک لوگ لاشیں گاڑتے رہینگے تاکہ راہ صاف کریں" یہ وہ واقعہ ہے جو دارا کے حملۂ یورپ میں پیش آیا۔ دارا کی فوج مملکت کی تمام اقوام سے مرکب

[1] ہیروڈوٹس، ۱۰۲۔۱۰۶۔

تھی۔ اس میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ وہ باسفورس عبور کر کے مشرقی یورپ میں پہنچ گیا تھا، اور اگرچہ یونانیوں کی بے وفائی کی وجہ سے اسے واپس ہونا پڑا، لیکن اس لشکر کشی میں بے شمار سیتھین مارے گئے، اور ان کی قوت عرصہ تک کے لیے مضمحل ہو گئی۔

مکاشفات یوحنا کا تتمہ

باقی رہی وہ پیشین گوئی جو مکاشفات یوحنا میں ملتی ہے، تو مکاشفات کے اکثر مقامات کی طرح اس مقام کی بھی کوئی سمجھی ہوئی تفسیر شارحین انجیل نہ کر سکے۔ اس میں ایک ہزار برس کی مدت بتلائی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مدت سے مقصود کونسی مدت ہے اور کب سے شروع ہوتی ہے؟ اگر حضرت مسیح سے شروع ہوتی ہو، تو ظاہر ہے کہ دسویں صدی مسیحی میں کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ ہزار برس سے مقصود وہ مدت ہو، جو سقوط بابل سے شروع ہوتی ہے کیونکہ اس معاملہ سے پہلے بابل کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو پھر ایک بات بن سکتی ہے۔ بابل کا سقوط چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا ہے اور چوتھی صدی مسیحی میں یورپ کے منگولین قبائل نے رومی مملکت پر حملے شروع کر دیے ہیں۔ پس یاجوج و ماجوج کا یہ خروج سقوط بابل کے ہزار برس بعد ضرور ہوا ہے۔

کتاب پیدائش کی تصریح

"ماجوج" کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بھی آیا ہے، جہاں حضرت نوح کے تین لڑکوں سام، حام، اور یافث سے اقوام عالم کا پیدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ یافث کی نسبت لکھا ہے کہ اس سے "جمر، ماجوج، مادی، یونان، توبال، مسک اور تیراز پیدا ہوئے" (۱۰: ۲) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج سے مقصود منگولین نسل ہے۔ کیونکہ قدیم مورخوں نے اسی تصریح کی بنا پر انہیں یافثی نسل قرار دیا ہے۔ علاوہ بریں اگر یہ صحیح ہے کہ کتاب پیدائش کا مواد قید بابل کے زمانے میں طیار ہوا ہے، تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُس زمانہ میں ماجوج اور مادیوں کو ہم نسل سمجھا جاتا تھا۔

یہ یاد رہے کہ اگرچہ دنیا عرصہ تک کتاب پیدائش کے اس بیان پر مطمئن رہی، اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ تمام قومیں حضرت نوح علیہ السلام کے تین لڑکوں ہی سے پیدا ہوئی ہیں، لیکن اب اس کی علمی قدر و قیمت یک قلم مشتبہ ہو گئی ہے، اور اسے کوئی بھی اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے ایک تاریخی بیان کو دیکھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک ایسا نوشتہ ہے جس میں ہمیں ۵۰۰ قبل مسیح کے یہودی تصورات نظر آ جاتے ہیں۔ بلاشبہ ان میں ایک عنصر اُن مقدس روایتوں کا بھی ہے جو قومی حافظہ نے محفوظ رکھی تھیں، لیکن ساتھ ہی بابلی اور آشوری روایتوں کا بھی ایک عنصر شامل ہو گیا ہے جو قیام بابل کی طویل مدت کا قدرتی نتیجہ تھا۔

سدِ یاجوج

(۱۰) اب ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ سائرس نے جو سد تعمیر کی تھی اُس کا صحیح محل کیا تھا، اور موجودہ زمانہ کے نقشہ میں اُسے کہاں ڈھونڈنا چاہیے؟

بحر خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے، یہ ٹھیک اُس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلۂ کوہ ختم ہوتا اور بحر خزر سے ملجاتا ہے۔ اس مقام پر قدیم زمانے سے ایک عریض و طویل دیوار موجود ہے جو سمندر سے شروع ہو کر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی گئی ہے، اور اس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں کاکیشیا کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ اس طرح اس دیوار نے ایک طرف بحر خزر کا ساحلی مقام بند کر دیا تھا، دوسری طرف پہاڑ کا تمام وہ حصہ بھی روک دیا تھا جو ڈھلوان ہونے کی وجہ سے قابل عبور ہو سکتا تھا۔

دیوارِ دربند

ساحل کی طرف یہ دیوار دُہری ہے یعنے اگر آذربائجان سے ساحل ہوتے ہوئے آگے بڑھیں، تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے۔ اس میں پہلے ایک دروازہ تھا۔ دروازہ سے جب گزرتے تھے تو شہر دربند ملتا تھا۔ اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔ دربند سے آگے پھر اُسی طرح کی ایک دیوار ملتی ہے لیکن یہ دُہری دیوار صرف دو میل تک گئی ہے۔ اُس کے بعد اکہری دیوار کا سلسلہ ہے۔ دونوں دیواریں جہاں جا کر ملی ہیں، وہاں ایک قلعہ ہے۔ قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں رہتا لیکن ساحل کے پاس پانچ سو گز ہے، اور اسی پانچ سو گز کے عرض میں دربند آباد ہے۔ اس دُہری دیوار کو ایرانی قدیم سے "دوبارہ" کہتے آئے ہیں۔ یعنے دُہرا سلسلہ۔

قطعی ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے، ساسانی عہد میں یہ مقام موجود تھا، اور اسے "دربند" کہا جاتا تھا۔ یعنے "بند دروازہ" کیونکہ مقدسی، ہمدانی، مسعودی، اصطخری، یاقوت، اور قزوینی، وغیرہ تمام مسلمان مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے اسی نام سے اس کا ذکر کیا ہے، اور سب لکھتے ہیں کہ ساسانی عہد میں یہ مقام شمالی سرحد کا سب سے زیادہ اہم مقام تھا کیونکہ اسی راہ سے شمال کے حملہ آور ایران کی طرف بڑھ سکتے تھے

یا یوں کہنا چاہیے کہ پوری مملکت کی کنجی تھی جس کے ہاتھ یہ کنجی آجاتی۔ وہ پوری مملکت کا مالک ہوجاتا۔ اسی لیے ضروری ہوا کہ اُس کی حفاظت کا اس درجہ اہتمام کیا جائے۔[1]

باب الابواب

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں جب یہ علاقہ فتح کیا، تو ساسانیوں کی طرح انہوں نے بھی اس مقام کی اہمیت محسوس کی۔ وہ اسے "باب الابواب" اور "الباب" کے نام سے پکارنے لگے۔ کیونکہ مملکت کے لیے یہی مقام شمال کا دروازہ تھا، اور اُن بہت سے دروازوں میں سے آخری دروازہ جو اس دیوار کے طول میں بنائے گئے تھے۔ بعضوں نے اسے "باب الترک"، اور "باب الخزر" کے نام سے بھی پکارا ہے، کیونکہ تاتاریوں اور تاتاری النسل کاکیشین قبیلوں کی آمد و رفت کی راہ یہی تھی۔

درۂ داریال کی دیوار

اس مقام سے جب مغرب کی طرف، کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں، تو ایک اَور مقام ملتا ہے جو درۂ داریال (Darial Pass) کے نام سے مشہور ہے، اور موجودہ زمانہ کے نقشہ میں اُس کا محل ولاڈی کیوکز (Vladi kaukaz)[5] اور تفلس کے درمیان، دکھایا جاتا ہے۔ یہ کاکیشیا کے نہایت بلند حصوں میں سے ہوکر گزرا ہے اور دو رتک دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے، اور ارمنی روایتوں میں اسے "آہنی دروازہ" کے نام سے پکارا گیا ہے۔

نوشیرواں کا انتساب

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دیوار کس نے تعمیر کی تھی؟ تمام عرب مورخوں کا بیان ہے کہ نوشیرواں نے تعمیر کی تھی۔ چنانچہ مسعودی نے اس کی تعمیر کی بعض تفصیلات بھی بیان کی ہیں[2] اور بعد کے تمام مصنف اسے نقل کرتے آئے ہیں لیکن جب ہم قبل از اسلام عہد کے تاریخی نوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نوشیراں کے عہد سے بہت پہلے یہاں ایک دیوار موجود تھی اور اُس نے شمال سے جنوب کا راستہ روک رکھا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے پہلی صدی مسیحی میں مشہور عبرانی مورخ جوزیفس اس کا ذکر کرتا ہے۔ پھر پروکوپیس (Procopius) چھٹی صدی مسیحی کے اوائل میں خود اپنا عینی مشاہدہ نقل کرتا ہے۔ کیونکہ ۵۲۰ء مسیحی میں جب رومن جنرل بلی ساریوس Belisarius نے اس علاقہ پر حملہ کیا ہے تو یہ اس کے ہمراہ تھا۔ نوشیرواں کا زمانہ ۵۳۱ء سے ۵۷۹ء تک تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ استحکامات اس کے بنائے ہوئے نہیں ہوسکتے۔

سکندر کا انتساب

اب یہاں ایک اَور الجھاؤ پڑتا ہے۔ جوزیفس اور پروکوپیس دونوں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ان استحکامات کا بانی سکندر تھا۔ حالانکہ سکندر کی فتوحات کا کوئی واقعہ تاریخ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے، اور کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس علاقہ میں آیا ہو، یا یہاں کوئی جنگ کی ہو۔

زمانۂ حال کے ایک امریکن مورخ مسٹر اے وی ولیمس جیکسن (پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی) نے اس علاقہ کی سیاحت کی ہے اور اس کے تفصیلی حالات اپنے سفرنامہ میں بیان کیے ہیں۔ وہ اس مشکل کا یہ حل تجویز کرتے ہیں کہ سکندر کے کسی جنرل نے یہ استحکامات تعمیر کیے ہونگے۔ کم از کم درۂ داریال کے استحکامات۔ بعد کو ساسانی فرمانرواؤں نے انہیں اَور زیادہ وسیع اور مکمل کردیا۔ چونکہ ابتدائی تعمیر سکندر کے عہد کی تھی، اس لیے سکندر کی طرف منسوب ہوگئی۔[3][4]

لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلمبند کردیے ہیں، اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کی لڑائی یا کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا، تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابل اطمینان تسلیم کرلی جائیں؟

اس طرح کے غیر معمولی استحکامات جبھی تعمیر کیے جاسکتے ہیں جبکہ امن و حفاظت کی ضرورت نے انہیں ناگزیر کردیا ہو۔ لیکن سکندر کو اپنی تمام فتوحات میں اس طرح کی کوئی ضرورت پیش ہی نہیں آئی۔ اس کے زمانے میں یہ علاقہ ایران کی قدیم شہنشاہی

---

[1] عرب جغرافیہ نویس دربند ہی کے نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں، لیکن چونکہ عام نام باب الابواب پڑگیا تھا، اس لیے عنوان کے لیے اکثروں نے باب الابواب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں اس مقام کا حال "باب الابواب" ہی کے نام سے لکھا ہے۔ پس حرف "با" میں دیکھنا چاہیے نہ کہ "دال" میں۔

[2] مروج الذہب صفحہ ۲۰

[3] بہت ممکن ہے کہ سکندر کی نسبت یہ خیال اس بنا پر پیدا ہوگیا ہو کہ بعد کے بعض مورخوں نے غلطی سے اُس سلسلۂ کوہ کو کاکیسس لکھ دیا ہے جو بحر خزر کے مشرق جانب واقع ہے اور جسے سکندر نے وسط ایشیا سے ہندوستان جاتے ہوئے طے کیا تھا۔ اسٹرابو نے اس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[4] دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب "فروم کونسٹنٹی نوپل ٹو دی ہوم آف عمر خیام" صفحہ ۶۲۔ ہم ان کی ایک دوسری تصنیف کا زردشت کے حالات میں حوالہ دے چکے ہیں۔ [5] یونانی کاکیشیا، روسی کیوکز، اور فارسی قفقاز ایک ہی لفظ ہے۔

کے ماتحت تھا۔ اس نے شام کی راہ سے ایران پر حملہ کیا، اور پھر وسط ایشیا ہوتا ہوا ہندوستان چلا گیا۔ ہندوستان سے واپسی پر بھی بابل کا ہی تھا کہ انتقال کر گیا۔ ایسی حالت میں وہ کونسے حالات ہو سکتے ہیں جو کاکیشیا کے استحکامات پر اسے مجبور کر سکتے تھے؟ اور اگر پیش آئے تو کب؟

سکندر کا انتساب صحیح نہیں

اصل یہ ہے کہ یہ استحکامات سکندر سے دو سو برس پہلے سائرس نے تعمیر کیے تھے، اور درۂ داریال کی سد، وہی سد ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔

حسب ذیل وجوہ و قرائن سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے:۔

اولاً، سائرس اور سکندر کی دو باتیں تاریخ کی قطعی روشنی میں آ چکی ہیں۔ سائرس کے زمانے میں یہاں سے سیتھین قوم کے حملے ہو رہے تھے۔ سکندر کے زمانے میں کوئی حملہ آور نہیں تھا۔ سائرس کے لیے ضروری تھا کہ یہ راہ روکے۔ سکندر کو کوئی ایسی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سائرس کی نسبت ہیروڈوٹس اور زینوفن کی شہادت موجود ہے کہ فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کی۔ سکندر کی نسبت کوئی ایسی شہادت موجود نہیں۔ ان دو باتوں کے جمع کرنے سے جو تاریخی قرینہ پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ سد سائرس نے تعمیر کی ہوگی۔ نہ کہ سکندر کے حکم سے اُس کے کسی افسر نے۔

ثانیاً، پروکوپیس کے علاوہ دوسرے قدیم مورخوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ٹیسی ٹس (Tacitus) اور لیڈس (Lydus) نے۔ وہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ رومی اسے "کاسپین پورٹا" کے نام سے پکارتے تھے۔ یعنے "باب کاسپین"۔ لیکن اس طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے کہ یہ سکندر کے عہد کی تعمیر ہے۔

ثالثاً، ایک مثبت شہادت بھی موجود ہے جو سائرس کی طرف ذہن منتقل کر دیتی ہے۔ یہ ارمنی نوشتوں کی شہادت ہے جسے قربِ محل کی وجہ سے مقامی شہادت تصور کرنا چاہیئے۔ ارمنی زبان میں اس کا قدیم نام "پھاک کورائی" اور "کاپان کورائی" چلا آتا ہے۔ دونوں ناموں کا مطلب یہ ہے کہ "کور کا درہ"[1] سوال یہ ہے کہ "کور" سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ "گورش" کی بدلی ہوئی شکل نہیں ہے جو سائرس کا اصلی نام تھا، جیسا کہ دارا کے کتبۂ اصطخر میں پڑھا جا چکا ہے؟

پروفیسر جیکسن اس ارمنی نام کا ذکر کرتے ہیں، لیکن وہ "کور" کا تلفظ "سور" کرتے ہیں، اور پھر عربی کے ایک نام "سول" کا اُسے ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح لفظ کی حقیقت گم ہو جاتی ہے۔

مذکرۂ قرآن سد درۂ داریال کی ہے نہ کہ دربند کی

اب ایک سوال اور غور طلب ہے ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی تھی، وہ درۂ داریال کی سد ہے، یا دربند کی دیوار؟ یا دونوں؟ قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا، اُس نے آہنی تختیوں سے کام لیا، اُس نے درمیان کا حصہ پاٹ کے برابر کر دیا، اُس نے پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا۔ تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی دربند کی دیوار پر صادق نہیں آتیں۔ یہ پتھر کی بڑی بڑی سلوں کی دیوار ہے، اور دو پہاڑی دیواروں کے درمیان نہیں ہے بلکہ سمندر سے پہاڑ کے بلند حصے تک چلی گئی ہے۔ اس میں آہنی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ پس یہ قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

البتہ درۂ داریال کا مقام ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے۔ یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے اور جو سد تعمیر کی گئی ہے اُس نے درمیان کی راہ بالکل مسدود کر دی ہے۔ چونکہ اس کی تعمیر میں آہنی سلوں سے کام لیا گیا تھا، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جارجیا میں "آہنی دروازہ" کا نام قدیم سے مشہور چلا آتا ہے۔ اسی کا ترجمہ ترکی میں "دامرکپو" مشہور ہو گیا۔[2]

بہر حال ذوالقرنین کی اصلی سد یہی سد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد خود اُس نے یا اُس کے جانشینوں نے دیکھا کہ کاکیشیا کا مشرقی ڈھلوان بھی خطرہ سے خالی نہیں، دربند کی دیوار تعمیر کر دی ہو، اور نوشیرواں نے اُسے اور مضبوط کیا ہو۔ یا ممکن ہے کہ کوئی حقیقت

---

[1] دربند نامہ صفحہ ۲۱۔ دربند کی تاریخ میں یہ ایک نہایت جامع کتاب ہے جو ۱۸۴۵ء میں ایک ترک مصنف کاظم بک نے لکھی ہے۔ یہ سینٹ پیٹرزبرگ یونیورسٹی میں ترکی و فارسی کا پروفیسر تھا، اور خود دربند کا باشندہ تھا۔ ۱۸۵۱ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہسٹری آف دربند کے نام سے شائع ہوا۔

[2] ترجمہ دربند نامہ کاظم بک صفحہ ۱۲۔ پروفیسر جیکسن نے بھی اس نام کا ذکر کیا ہے، اور اسے قدیم ایام کے نام سے تعبیر کیا ہے (فروم کونسٹنٹی نوپل ٹو ہوم آف عمر خیام صفحہ ۶۱)

نوشیرواں ہی کی تعمیر ہو۔

دیوارِ دربند کی موجودہ حالت

دربند کی دُہری دیوار ۱۷۹۶ء تک موجود تھی جس کی تصویر ایک روسی سیاح کی بنائی ہوئی اِیچ والڈ (Eichwald) نے اپنی کتاب کوکیسس میں نقل کی ہے۔ لیکن ۱۹۱۰ء میں جب پروفیسر جیکسن نے اس کا معائنہ کیا، تو گو آثار باقی تھے لیکن دیوار گر چکی تھی۔ البتہ اگر ی دیوار اکثر حصوں میں اب تک باقی ہے۔

(۱۱) موجودہ زمانہ کے شارحین توراۃ میں بھی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے کہ یاجوج وماجوج سے سیتھین قوم مراد تھی۔ لیکن وہ حزقیل کی پیشین گوئی کا محل انکا وہ حملہ قرار دیتے ہیں جو ہیرو ڈوٹس کے قول کے مطابق ۶۳۰ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ لیکن اس صورت میں یہ مشکل پیدا ہوجاتی ہے کہ حزقیل کی کتاب بابل کی اسیری کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی بخت نصر کے اسیروں میں سے تھے، اور سیتھین حملہ اس سے بہت پہلے ہوچکا تھا۔ اس باب میں مزید تفصیلات کے لیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور جیویش انسائیکلوپیڈیا میں لفظ Gog کا مقالہ دیکھنا چاہیے۔

(۱۲) ہم نے ذوالقرنین کے مبحث میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔ کیونکہ زمانۂ حال کے معترضین قرآن نے اس مقام کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ استہزاء کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ذوالقرنین کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں ہے۔ یہ محض عرب یہودیوں کی ایک کہانی تھی جو پیغمبرِ اسلام نے اپنی خوش اعتقادی سے صحیح سمجھ لی اور نقل کردی۔ اس لیے ضروری تھا کہ ایک مرتبہ یہ مسئلہ اس طرح صاف کردیا جائے کہ شک و تردد کا کوئی پہلو باقی نہ رہے۔

استدراک

(۱) ہم نے سائرس کے جس مجسمہ کا اوپر ذکر کیا ہے، اور جس سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ "ذوالقرنین" اُسی کا لقب تھا، وہ قدیم سنگ تراشی کی صناعیوں کا ایک نہایت نادر نمونہ ہے، اور موجودہ عہد کے تمام اہلِ نظر کا فیصلہ ہے کہ یونانی سنگ تراشی کے نمونوں کی صف میں اگر کوئی ایشیائی نمونہ رکھا جاسکتا ہے تو وہ یہی سائرس کا مرمری مجسمہ ہے۔ یہ ایران کے قدیم دارالحکومت اصطخر سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دارا نے شاہی محل تعمیر کیا تھا۔ اب اُس کا بقیہ صرف چند مرمری ستون رہ گئے ہیں۔ انہی میں سے ایک مربع ستون پر یہ مجسمہ اُبھارا گیا تھا۔

سب سے پہلے ۱۸۱۲ء میں جیمس موریر (Morier) نے اس کی موجودگی سے علمی دنیا کو روشناس کیا۔ پھر چند سال بعد سر رابرٹ کیر پورٹر Rabert Kerr Porter نے اس مقام کی کلی پیمائش و تحقیق کرکے مفصل معلومات بہم پہنچائی، اور اپنے سفرنامہ جارجیا و ایران میں مجسمہ کی وہ نقل بھی شائع کردی جو اُس نے پنسل سے طیار کی تھی۔ اُس وقت تک قدیم پہلوی زبان اور میخی خطوط کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ مجسمہ سائرس ہی کا ہے۔ بعد کی تحقیقات نے مزید تصدیق کردی۔ پھر ۱۸۸۴ء میں ڈی لافو Dieulafoy نے اپنی مشہور کتاب L'art antique en Perse میں اس کا اصلی عکس شائع کردیا، اور اس طرح مجسمہ کی اصلی نوعیت دنیا کے سامنے آگئی۔

اُس وقت سے لے کر یہ مجسمہ تاریخِ قدیم کے مباحث کا ایک عام موضوع رہا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج تک کسی یورپین مستشرق کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ اس کی نوعیت میں قرآن کے "ذوالقرنین" کی صریح اور قطعی تصدیق نمایاں ہوگئی ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ تغافل مذہبی تعصب کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ان میں کافی تعداد ایسے اہلِ علم کی ہے جو یقیناً ان تعصبات کی آلودگیوں سے اپنی حفاظت کرسکتے ہیں۔ تاہم اس میں شک نہیں، یہ تغافل علم و نظر کے عجائب مستثنیات میں سے ہے۔

(۲) اس مجسمہ میں سائرس کے سر پر دو سینگ نکلے ہوئے ہیں، اور اطراف میں عقاب کے پر۔ سینگوں کا مطلب واضح ہوچکا لیکن عقاب کے پر کیوں بنائے گئے؟ اس کا جواب بھی ہمیں یسعیاہ نبی کے صحیفہ کو مل جاتا ہے۔ اس میں جہاں سائرس کے ظہور کی خبر دی گئی ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ:

"دیکھو، میں ایک عقاب کو پورب سے بلاتا ہوں، اُس شخص کو جو ایک دور کے ملک سے آکر میری ساری مرضی پوری کریگا" (باب ۴۶: ۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح دو سینگوں کا معاملہ دانیال نبی کے مکاشفہ سے تعلق رکھتا ہے، اُسی طرح عقاب کی تشبیہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں آچکی ہے۔ خواہ یہ پیشین گوئیاں بعد کو بنائی گئی ہوں، خواہ فی الحقیقت پیشتر کی ہوں، لیکن یہ ظاہر ہوگیا کہ سائرس کے لیے دو سینگوں کا اور عقاب کا تخیل پیدا ہوچکا تھا اور ٹھیک یہی تخیل ہے جو اس مجسمہ میں متشکل ہوگیا ہے

سُوْرَةُ مَرْيَمَ ۱۹

مکی - ۹۸ آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝

کاف - ہا - یا - عین - صاد۔

(اے پیغمبر!) تیرے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر جو مہربانی کی تھی، یہ اُس کا بیان ہے۔

جب ایسا ہوا تھا کہ زکریا نے چپکے چپکے اپنے پروردگار کو پکارا۔ اُس نے عرض کیا "پروردگار! میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے، میرے سر کے بال بڑھاپے سے بالکل سفید ہو گئے۔ خدایا! کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تیری جناب میں دعا کی ہو اور محروم رہا ہوں۔ مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے (کہ نہیں معلوم وہ کیا کریں) اور میری بیوی بانجھ ہے (اس لیے بظاہر حالات اولاد کی اُمید نہیں) پس تو اپنے خاص فضل سے مجھے ایک وارث بخش دے۔ ایسا وارث جو میرا بھی وارث ہو اور خاندان یعقوب (کی برکتوں) کا بھی اور پروردگار! اُسے ایسا کر دیجیو کہ (تیرے اور تیرے بندوں کی نظر میں) پسندیدہ ہو!"

(اس پر حکم ہوا) "اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی (پیدائش کی) خوشخبری دیتے ہیں۔ اُس کا نام یحییٰ رکھا جائے۔ اس سے پہلے ہم نے کسی کے لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے"۔

زکریا نے (متعجب ہو کر) کہا "پروردگار! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بیوی بانجھ ہو چکی اور میرا بوڑھاپا دور تک پہنچ چکا"

نزول کے اعتبار سے یہ پہلی سورت ہے جس میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے حالات بتفصیل بیان کیے گئے ہیں، اور اُن گمراہیوں کا ازالہ کیا ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں میں اس مقدس شخصیت کے بارے میں پھیلی ہوئی تھیں۔

تمام انجیلیں متفق ہیں کہ حضرت یحییٰ (یوحنا) کا ظہور دعوتِ مسیحی کے ظہور کا مقدمہ تھا۔ چنانچہ لوقا کی انجیل میں پہلے حضرت یوحنا کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا ہے۔ پھر اس کے بعد حضرت مسیح کا۔ قرآن نے بھی یہاں اسی طریقہ پر بیان شروع کیا ہے۔

(۲) لوقا کی انجیل میں ہے کہ "ابیاہ کی جماعت میں سے زکریاہ نام ایک کاہن تھا۔ اس کی بیوی الیشبع ہارون کی اولاد میں سے تھی۔ دونوں راست باز اور خداوند کے حکموں پر بے عیب چلنے والے تھے۔ اُن کے اولاد نہ تھی۔ کیونکہ الیشبع بانجھ تھی، اور دونوں عمر رسیدہ تھے" (۱:۵) ہیکل کی مقدس رسوم ادا کرنے کے لیے کاہن مقرر تھے، اور ہر جماعت کے آدمی کی نوبت مقرر تھی۔ ایک مرتبہ جب حضرت زکریاہ کی نوبت آئی اور وہ قربان گاہ میں خوشبو جلانے کے لیے داخل ہوئے تو خداوند کا فرشتہ اُنہیں نظر آیا۔ اُس نے کہا "تیری دعا قبول ہوئی، تیری

۹ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ
۱۰ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى
۱۱-۱۲ اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ
۱۳-۱۴ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ
۱۵-۱۶ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ

ارشاد ہوا "ایسا ہی ہوگا۔ تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ ایسا

| بیوی بیٹا جنیگی۔ تو اُس کا نام یوحنا رکھیو" (لوقا ۱: ۸)

۹ کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ میں نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان نہ تھا"

اس پر زکریا نے عرض کیا "خدایا! میرے لیے (اس بارے میں) ایک نشانی ٹھہرا دے"

۱۰ فرمایا "تیری نشانی یہ ہے کہ تین رات لگا تار لوگوں سے بات نہ کر"

پھر وہ قربان گاہ سے نکلا اور اپنے لوگوں میں آیا (جو حسب معمول اُس کا انتظار کر رہے تھے) اُس نے (زبان نہ کھولی) اشارہ سے کہا "صبح شام خدا کی پاکی و جلال کی صدائیں بلند کرتے رہو!"

"اے یحییٰ!" (خدا کا حکم ہوا، کیونکہ وہ خوشخبری کے مطابق پیدا ہوا اور بڑھا) "کتاب الٰہی کے پیچھے مضبوطی کے ساتھ لگ جا" چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اُسے علم و فضیلت بخشدی۔ نیز اپنے فضلِ خاص سے دل کی نرمی اور نفس کی پاکی عطا فرمائی۔ وہ پرہیزگار اور ماں باپ کا خدمت گزار تھا۔ سخت گیر اور نافرمان نہ تھا۔ اُس پر سلام ہو! یعنی سلامتی ہو! جس دن پیدا ہوا، اور جس دن مرا، اور جس دن پھر زندہ اُٹھایا جائیگا!

(۱۳) انجیل میں ہے "زکریاہ نے کہا، میں یہ بات کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے! جبریل نے کہا.... جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہوں تو چپکا رہیگا اور بول نہ سکیگا .... جب زکریاہ باہر آیا تو وہ لوگوں سے اشارے کرتا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا" (لوقا ۱: ۸)

۱۱ قرآن نے یہ نہیں کہا ہے کہ حضرت زکریا گونگے ہوگئے تھے۔ یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں جو حسب معمول پیدا ہوگئیں۔ صاف بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت زکریا کو روزہ رکھنے اور مشغول عبادت رہنے کا حکم ہوا اور یہودیوں کے یہاں روزہ کے اعمال میں سے ایک عمل خاموشی بھی تھی۔

۱۲ چنانچہ حضرت یحییٰ پیدا ہوئے۔ لڑکپن ہی سے اُن کی زندگی زہد عبادت اور گوشہ نشینی و اعتکاف کی زندگی تھی۔

۱۳ انجیل میں ہے کہ اُن کی تمام ابتدائی زندگی صحرا میں بسر ہوئی۔

۱۴ پھر جب اُن پر اللہ کا کلام نازل ہوا، تب اُنھوں نے دریائے یردن کے نواح میں توبہ و انابت کی منادی شروع کردی۔ وہ پکارتے تھے کہ آنے والے وقت کے لیے تیار ہو جاؤ۔

۱۵ (لوقا باب ۳)

اور (اے پیغمبر!) کتاب میں مریم کا معاملہ بیان کر۔ اُس وقت کا معاملہ جب وہ ایک مکان میں کہ پورب کی

۱۶ طرف تھا اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوگئی۔

پھر اس نے اُن لوگوں کی طرف سے پردہ کرلیا پس ہم نے اُس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا، اور وہ ایک بھلے

(۱۴) انجیل میں ہے کہ مندرجہ صدر واقعہ کے چھ ماہ بعد جبریل مریم پر نمودار ہوا جس کی منگنی یوسف نامی ایک نوجوان کر ہو چکی تھی، اور اُسے کہا "تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنیگی۔ اُس کا نام یسوع رکھیو" (لوقا ۱: ۲۶)

حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ (17)
تَقِيًّا ○ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ○ قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ (18-19)
يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ○ قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً (20)
مِّنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ○ فَحَمَلَتْهُ فَانتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ○ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ (21-22)
النَّخْلَةِ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنتُ نَسْيًا مَّنسِيًّا ○ فَنَادَاهَا مِن تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ (23)
جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ○ وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ (24)

چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہوگیا۔ مریم اُسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ (وہ) بولی "اگر تو نیک آدمی ہے، تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں!" (17-18)

فرشتہ نے کہا "میں تو تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں، اور اس لیے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند دیدوں" (19)

مریم بولی "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں؟" (20)

فرشتہ نے کہا "ہوگا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرمادیا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے، یہ اس لیے ہوگا کہ اُسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دوں، اور میری رحمت کا اُس میں ظہور ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پاچکا!" (21)

پھر اُس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا۔ وہ (اپنی یہ حالت چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہوکر دور چلی گئی۔ (22)

پھر اُسے دردِ زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (وہ اُس کے تنہ کے سہارے بیٹھ گئی۔) اُس نے کہا "کاش میں اس سے پہلے مرچکی ہوتی! میری ہستی لوگوں کو یکقلم بھول گئی ہوتی!" (23)

اُس وقت (ایک پکارنے والے فرشتہ) نے اُسے نیچے کر پکارا (یعنی نخلستان کے نشیب سے پکارا) "غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے تلے ایک بڑی ہستی پیدا کردی ہے۱؎۔ تو کھجور کے درخت کا تنہ پکڑ کے اپنی طرف ہلا۔ تازہ اور پکی ہوئی (24)

نیز یہ کہ "مریم زکریا کی بیوی الیشبع کی رشتہ دار تھی" اور بشارت کے بعد اس سے ملنے گئی (۱: ۳۹)

(۵) آیت (۱۶) میں مکاناً شرقیاً کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم ہیکل چھوڑ کر جہاں اُن کی پرورش ہوئی تھی، اپنے آبائی وطن ناصرہ میں چلی گئیں۔ یہ یروشلم کے شمال مشرق میں واقع ہے، اور باشندگانِ یروشلم کے لیے مشرق کا حکم رکھتا ہے۔ انجیل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ وہ اس معاملہ کا محلِ وقوع ناصرہ ہی بتلاتے ہیں۔ (لوقا ۱: ۲۶)

(۶) آیت (۲۱) میں حضرت مسیح کی نسبت دو باتیں فرمائی ہیں۔ اللہ کی نشانی ہونگے اور اُس کی رحمت۔ غور کرو۔ ان دو لفظوں نے کس طرح ان کی شخصیت کی پوری تصویر نمایاں کردی ہے! وہ اپنی ساری باتوں میں کرشمہ سازِ قدرت کی ایک نشانی تھے۔ اُن کے ظہور کا تمام تر پیام نوعِ انسانی کے لیے رحم و محبت کا پیام تھا!
گویا اُن کی شخصیت کی پوری تاریخ ان دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے: آیۃ للناس ورحمۃ منا!

۱؎ اصل میں "سریا" ہے۔ عربی میں "السری" عظیم الشان انسانوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ من قولہم فلان سری ای عظیم۔ (بقیہ برصفحہ ۴۴۴)

۲۵ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ

۲۶ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۝ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا

۲۷-۲۸ فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ

۲۹-۳۰ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا

۳۱-۳۲ اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ

۲۵ پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگینگے۔ کھا پی، (اپنے بچے کے نظارہ سے) آنکھیں ٹھنڈی کر (اور سارا غم و ہراس بھول جا)۔
پھر اگر کوئی آدمی نظر آجائے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہدے میں نے خدائے رحمان کے حضور روزہ

۲۶ کی منت مان رکھی ہے۔ میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کرسکتی"

پھر ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے
پاس آئی۔ لڑکا اُس کی گود میں تھا۔ لوگ (دیکھتے ہی)

۲۷ بول اُٹھے "مریم! تو نے بڑی ہی عجیب بات کر دکھائی۔
اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا۔ نہ تیری

۲۸ ماں بدچلن تھی" (یہ تو کیا کر بیٹھی!)
اس پر مریم نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمہیں

۲۹ بتلا دیگا، حقیقت کیا ہے) لوگوں نے کہا "بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے"

۳۰ (مگر لڑکا بول اُٹھا) "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔ اُس نے مجھے بابرکت کیا،

۳۱ خواہ میں کسی جگہ ہوں۔ اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا، کہ جب تک زندہ رہوں، یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے

۳۲ اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا۔ ایسا نہیں کیا کہ خودسر اور نافرمان ہوتا۔ مجھ پر اُس کی طرف سے سلامتی کا پیام

۳۳ ہے جس دن پیدا ہوا، جس دن مرونگا، اور جس دن (پھر) زندہ اُٹھایا جاؤنگا!"

(۷) آیت (۲۶) سے واضح ہوگیا کہ ایک طرح کا یہودی روزہ یہ بھی تھا کہ آدمی خاموش رہے۔ چنانچہ حضرت زکریا کو بھی ایسا ہی روزہ رکھنے کا حکم ہوا تھا۔

یہودیوں کے یہاں روزہ کی یہ صورت اب بھی تسلیم کی جاتی ہے۔

(۸) آیت (۲۸) میں "اُخت ہارون" سے مقصود حضرت مریم کا ایک رشتہ دار ہے جو نہایت پارسا شخص تھا۔ اس لیے ملامت کرنے والوں نے اس کی طرف نسبت دے کے ملامت کی۔ مسلم و ترمذی کی حدیث مغیرہ بن شعبہ میں یہ تفسیر خود آنحضرت سے منقول ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

ومن قوم سراۃ۔ ای عظام (ابن سیدہ) لیکن چونکہ "سریا" کے ایک معنی چھوٹی نہر کے بھی ہیں، اس لیے عام طور پر یہاں سریا کا ترجمہ نہر اور چشمہ کیا گیا ہے۔ ہم نے پہلے مطلب کو ترجیح دی۔ کیونکہ محل بیان کا مقتضیٰ ایسی ہی کوئی بات چاہتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت مریم کا غم پانی نہ ملنے کی وجہ سے نہ تھا اُس حالت کی وجہ سے تھا جس میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ پس فرشتہ کا یہ کہنا کہ "غمگین نہ ہو، تیرے لیے ایک نہر جاری کردی ہے" بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ جب پانی کا فقدان غم کا سبب ہی نہ تھا تو اُس کی موجودگی کیوں وجہ تسکین ہو؟ البتہ جو مطلب ہم نے اختیار کیا ہے، اُس سے وجہ تسکین بالکل واضح ہو جاتی ہے یعنی غمگین نہ ہو، تیری گود میں ایک عظیم انسان پیدا کر دیا گیا ہے۔

ائمۂ تابعین میں سے ایک جماعت نے یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ (فتح القدیر جلد سوم صفحہ ۳۲۴)

يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ○ ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ ٣٣
يَمْتَرُونَ ○ مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحَانَهُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ○ ٣٥-٣٤
وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ○ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ ٣٦
لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ○ أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا لَٰكِنِ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ٣٧
ضَلَالٍ مُبِينٍ ○ وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○ إِنَّا نَحْنُ ٣٩-٣٨
نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ

یہ ہے مریم کے بیٹے عیسیٰ کی سرگزشت۔ سچائی کی بات جس میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں۔ ٣٤

اللہ کے لیے کبھی یہ بات نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ اُس کے لیے پاکی ہو۔ (وہ کیوں مجبور ہونے لگا کہ کسی فانی ہستی کو اپنا بیٹا بنائے!) اُس کی شان تو یہ ہے کہ جب کوئی کام کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے، تو بس حکم کرتا ہے کہ ہوجا! اور اُس کا حکم کرتا ہی ہوجاتا ہے! ٣٥

اور (مسیح کی تو ساری پکار یہ تھی:) بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا، سب کا پروردگار ہے۔ بس اُسی کی بندگی کرو۔ یہی (سچائی کا) سیدھا راستہ ہے!" ٣٦

مگر پھر اُس کے بعد مختلف فرقے آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ تو جن لوگوں نے حقیقت حال سے انکار کیا، اُن کی حالت پر افسوس! اُس دن کے منظر پر افسوس جو آنے والا ہے، اور (جو) بڑا ہی سخت دن ہوگا! ٣٧

جس دن یہ ہمارے حضور حاضر ہونگے، اُس دن ان کے کان کیسے سُننے والے اور ان کی آنکھیں کیسی دیکھنے والی ہونگی! لیکن آج کے دن ان ظالموں کا کیا حال ہے؟ آشکارا گمراہی میں کھوئے ہوئے! ٣٨

اور (اے پیغمبر!) انہیں اُس (آنے والے) دن سے بھی خبردار کردے جو بڑا ہی پچھتانے کا دن ہوگا، اور جب ساری باتوں کا فیصلہ ہوجائیگا۔ اس وقت تو یہ لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور (اس بات پر) یقین لانے والے نہیں۔ ٣٩

ہم ہی زمین کے (بالآخر) وارث ہونگے، اور اُن تمام

(٩) آیت (٣٣) تک حضرت مسیح کے ظہور اور دعوت کا بیان تھا اب فرمایا اس بارے میں قول حق صرف یہ ہے۔ اس کو زیادہ عیسائیوں نے جو کچھ بنا لیا ہے، وہ جہل و گمراہی ہے چنانچہ اس کے بعد عیسائیوں کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اُنہوں نے حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔

سینٹ پال کی طرف ابنیت کی جو تعلیم منسوب ہے اُس کی تمام تر بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ نوعِ انسانی کی سرشت میں گناہ ہے، پس اُس کی نجات کے لیے ضروری تھا کہ کفارہ ہو۔ کفارہ کی یہی صورت ہوسکتی تھی کہ خدا کی صفتِ رحمت ابن اللہ کی شکل میں اُترے، اور اپنی قربانی کے خون سے اولادِ آدم کا گناہ دھوڈالے قرآن اس اصنامی تخیل کا رد کرتے ہوئے خدا کی بے نیازی اور قدرت کا اثبات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم نے خدا کو اتنا بے بس اور محتاج کیوں سمجھ لیا کہ جب تک ایک انسان کو اپنا بیٹا بنا کر سولی پر نہ چڑھا دے وہ اپنے بندوں کو نجات دینے کی راہ نہیں پاسکتا؟ یہ تو وہ کرے جو اپنے کاموں کی انجام دہی میں دوسروں کا محتاج ہو لیکن تم خود مانتے ہو کہ خدا محتاج نہیں ہوسکتا۔ صرف اُس کا چاہنا ہی کاموں کا انجام پا جانا ہے۔

(١٠) آیت (٣٧) اور (٣٨) میں قیامت کے دن کا ذکر ہوچکا ہے کہ

عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ۝ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ۝ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ۝ يٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓأَبَتِ إِنِّيٓ أَخَافُ أَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِي يٰٓإِبْرٰهِيمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ

من مشھد یوم عظیم اور یوم یاتوننا۔ اس کے بعد (۳۹) میں فرمایا "وانذرھم یوم الحسرۃ" اور انہیں یوم الحسرت کے دن سے بھی خبردار کردے۔" اس سے معلوم ہوا کہ اس "یوم الحسرت" سے مقصود قیامت کا دن نہیں ہے۔ یہ کوئی دوسرا آنے والا دن ہے۔ چنانچہ بعد کی آیت نے اس دن کی نوعیت ظاہر کر دی ہے۔

یہ کونسا دن تھا؟ یقیناً کوئی ایسا دن جو عیسائیوں کو عنقریب پیش آنے والا تھا، اور جس میں اُن کے لیے بڑی ہی حسرت و مایوسی تھی!

چنانچہ سورۂ مریم کے نزول پر ابھی پچیس برس بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ دن نمودار ہو گیا، اور تمام عیسائی دنیا یہ سُن کر ششدر رہ گئی کہ مسیحیت کا صدر مقام اور قبلہ و مرکز اچانک اُس کے ہاتھوں سے نکل کر ایک نئی قوم کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں "تمام مسیحی دنیا پر سکتہ کی حالت طاری ہوگئی۔ کیونکہ مسیحیت کی اس بڑی توہین کو نہ تو مذہب کا کوئی متوقع معجزہ روک سکا۔ نہ بازنطینی شہنشاہی کا لشکر جرار۔"

پھر یہ صرف بیت المقدس ہی کی فتح نہ تھی، تمام ایشیا اور افریقہ میں مسیحی فرمانروائی کا خاتمہ تھا۔ ہرقل (ہرکولس) کے یہ الفاظ جو اُس نے تختۂ جہاز پر لبنان کی چوٹیوں کو مخاطب کر کے کہے تھے، آج تک مورخوں کی زبانوں پر ہیں "الوداع سرزمین شام! ہمیشہ کے لیے الوداع!"

غور کرو، کیا یہ دن اپنے کامل معنوں میں مسیحیت کے لیے یوم الحسرۃ نہ تھا!

پھر آیت کے اس ٹکڑے پر غور کرو کہ وھم فی غفلۃ وھم لا یؤمنون۔ "اے پیغمبر! یہ لوگ اس وقت اپنی کامرانیوں کی غفلت میں سرشار ہیں۔ یقین کرنے والے نہیں۔ تاہم تم اعلان کر دو" نیز بعد کی آیت کہ انا نحن نرث الارض ومن علیھا کس طرح یہ تمام مطلب آشکارا کر رہی ہے؟

افسوس! ہمارے مفسروں کو اس عالم کی خبر ہی نہیں۔ وہ جہاں "یوم" کا لفظ دیکھتے ہیں، جھٹ اُسے یوم القیامۃ سمجھ لیتے ہیں!

لوگوں کے بھی جو زمین پر بسے ہوئے ہیں، اور ہماری ہی طرف سب کو لوٹ کر آنا ہے!

اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں ابراہیم کا ذکر کر یقیناً وہ مجسم سچائی تھا اور (اللہ کا) نبی تھا۔

اُس وقت کا ذکر جب اُس نے اپنے باپ سے کہا "اے میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ تو سُنتی ہے، نہ دیکھتی ہے، نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے؟ اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے، جو تجھے نہیں ملی پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤنگا۔ اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کر شیطان تو خدائے رحمان سے نافرمان ہو چکا۔ اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو خدائے رحمان کی طرف سے کوئی عذاب تجھے آلگے اور تو شیطان کا ساتھی ہو جائے!"

باپ نے (یہ باتیں سُن کر) کہا "ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ، اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑونگا۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لیکر مجھ سے الگ ہو جا"

ابراہیم نے کہا "اچھا، میرا سلام قبول ہو۔ (میں الگ ہو جاتا ہوں) اب میں اپنے پروردگار سے تیری بخشش کی

رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ○ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ ۴۷
بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ○ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا ۴۸
جَعَلْنَا نَبِيًّا ○ وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ○ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ ۴۹-۵۰
إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ○ وَنَادَيْنَاهُ مِن جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ○ وَ ۵۱-۵۲
وَهَبْنَا لَهُ مِن رَّحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا ○ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ ۵۳
كَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ○ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِندَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ○ وَاذْكُرْ فِي ۵۴-۵۵
الْكِتَابِ إِدْرِيسَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ○ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا ○ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ ۵۶-۵۷

دعا کرونگا۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں نے تم سب کو چھوڑا، اور اُنہیں بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پکارا کرتے ہو۔ میں اپنے ۴۷
پروردگار کو پکارتا ہوں۔ اُمید ہے، اپنے پروردگار کو پکار کے میں محروم ثابت نہیں ہونگا!" ۴۸

پھر جب ابراہیم ان لوگوں سے اور اُن سب سے جن کی اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے، الگ ہوگیا، تو ہم نے (اُس کی نسل میں برکت دی، اور) اُسے اسحٰق اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب عطا فرمایا۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبوت دی تھی، اور اپنی رحمت کی بخشش سے سرفراز کیا تھا۔ نیز ان سب کے لیے سچائی کی صدائیں بلند کردیں (جو کبھی خاموش ۴۹
ہونے والی نہیں!) ۵۰

اور (اے پیغمبر!) کتاب میں موسیٰ کا ذکر کر۔ بلاشبہ وہ ایک بندۂ خاص اور فرستادہ نبی تھا۔ ۵۱

ہم نے اُسے کوہ طور کی دہنی جانب سے پکارا، اور (وحی کی) سرگوشیوں کے لیے اپنے سے قریب کیا نیز اپنی ۵۲
رحمت سے (رفاقت و مددگاری کے لیے) ہارون عطا فرمایا کہ اُس کا بھائی تھا اور نبی تھا۔ ۵۳

اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں (یعنے قرآن میں) اسمٰعیل کا ذکر کر۔ بلاشبہ وہ اپنے قول کا سچا تھا، اور (اللہ کا) فرستادہ نبی تھا۔ وہ اپنے گھر کے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا، اور ۵۴
وہ (اپنی ساری باتوں میں) اپنے پروردگار کے حضور پسندیدہ تھا۔ ۵۵

اور (اے پیغمبر!) کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کر۔ بلاشبہ وہ بھی سچائی میں پورا اور نبی تھا، اور ہم نے اسے بڑے ہی اونچے ۵۶
مقام تک پہنچا دیا تھا! ۵۷

یہ ہیں وہ لوگ، جو اُن نبیوں میں سے ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدم کی نسل میں سے، اور اُن کی نسل سے

(۱) اس کے بعد آیت (۴۱) سے (۵۷) تک حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب، موسیٰ، ہارون، اسمٰعیل، اور ادریس (علیہم السلام) کی نبوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اور پھر آیت (۵۸) میں اس تمام تذکرہ کا نتیجہ نکالا ہے۔

حضرت ابراہیم کی زندگی کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ انعام کی آیت ۷۴ میں گزر چکا ہے، اور آئندہ سورتوں میں بھی آئیگا۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ اُور کے تمام باشندوں کی طرح اُن کا چچا بھی بت پرست تھا۔ اُس نے غیظ و غضب میں آکے اُنہیں نکال دیا۔ اُنہوں نے بھی راہ حق میں تمام ملک و قوم سے کنارہ کشی کرلی اور کنعان آکر مقیم ہوگئے۔ پھر اللہ نے اُن کی نسل میں برکت دی اور اسرائیلی اور اسمٰعیلی سلسلوں کے بانی ہوئے۔

جزیرہ نمائے سینا کے دہنی جانب عرب ہے۔ بائیں جانب مصر۔

مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۝ (۵۸) فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (۵۹) إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝ (۶۰) جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ۝ (۶۱) لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝ (۶۲) تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا

جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا، نیز ابراہیم اور اسرائیل (یعنی یعقوب) کی نسل سے، اور اُن گروہوں میں میں سے جنہیں ہم نے راہ راست دکھائی اور (کامرانیوں کے لیے) منتخب کرلیا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خدائے رحمان کی آیتیں انہیں سُنائی جاتی تھیں تو بے اختیار سجدے میں گرجاتے تھے اور اُن کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی تھیں! (۵۸)

لیکن پھر اِن کے بعد ایسے ناخلف اُن کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز (کی حقیقت) کھودی اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑگئے۔ سو قریب ہے کہ ان کی سرکشی اُن کے آگے آئے! (۵۹)

ہاں، جو کوئی باز آگیا، ایمان لایا، اور نیک عملی میں لگ گیا، تو بلاشبہ ایسے لوگوں کے لیے کوئی کھٹکا نہیں۔ وہ جنت میں داخل ہونگے۔ اُن کے حقوق میں ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی۔ (۶۰)

ہمیشگی کی جنت، جس کا اپنے بندوں سے خدائے رحمان نے وعدہ کر رکھا ہے، اور وعدہ ایک غیبی بات کا کہ جسے وہ اِس زندگی میں محسوس نہیں کرسکتے۔ مگر یقیناً اُس کا وعدہ ایسا ہے جیسے ایک بات وقوع میں آگئی! (۶۱)

اُس زندگی میں کوئی ناشائستہ بات اُن کے کانوں میں نہیں پڑیگی۔ جو کچھ سُنیںگے وہ سلامتی ہی کی صدا ہوگی۔ وہاں صبح و شام اُن کا رزق اُن کے لیے برابر مہیا رہیگا! (۶۲)

سو (دیکھو) یہ جنت ہے جس کا ہم نے وارث کردیتے ہیں، جو ہمارے بندوں میں سے متقی[۱] ہوتا ہے! (۶۳)

اسی وہی جانب کے ساحل پر قبیلہ مدین کی بستی آباد تھی جہاں حضرت موسیٰ مصر سے نکل کر مقیم ہوگئے تھے۔ پس من جانب الطور الایمن کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ طور کی مشرقی جہت میں پیش آیا تھا، نہ کہ مغربی میں جو مصر کے مقابل ہے۔

(۱۲) آیت (۵۸) اور اس کے بعد کی آیتیں اس تذکرہ کا خلاصہ ہیں۔ فرمایا، ان تمام نبیوں نے خداپرستی اور نیک عملی کی دعوت دی تھی۔ وہ ان میں سے تھے جن پر خدا کا انعام ہوا اور کامیابیوں کے لیے چُن لیے گئے لیکن اُن کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوگئے جنہوں نے حقیقت ضائع کردی اور اپنی خواہشوں کے پرستار ہوگئے۔ اب اُن کے نام لیواؤں کے جتنے گروہ ہیں سب کا یہی حال ہے، اور سب کو اپنی بدعملیوں کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ ہاں، جو گمراہیوں سے باز آجائیںگے اور دعوتِ حق پر عمل کرینگے اُن پر ہر طرح کی کامرانیوں کی راہ کھل جائیگی۔ اُسی طرح جس طرح پہلے کھل چکی ہے۔

آیت (۵۹) میں پچھلوں کی گمراہی بیان کرتے ہوئے صرف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشہوات فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز یعنی عبادت جوہر ایمان ہے۔ اس کی حقیقت گئی تو سب کچھ چلا گیا۔

دراصل ایک خداپرست اور ایک غیر خداپرست میں عملی امتیاز اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ پہلا کسی کی بندگی میں لگا رہتا اور کسی کو پکارتا رہتا ہے۔ دوسرا اس سے بے پروا رہتا ہے۔ اسی لیے دعا و عبادت ایمان باللہ کی اصلی علامت ہوئی، اور اسی لیے تمام مذاہب نے اسی عمل پر مذہبی زندگی کی ساری عمارتیں اٹھائیں۔ جونہی یہ عمل بگڑا

[۱] متقی کے معنی سورۂ بقرہ کے نوٹ ھدی للمتقین (۲) میں دیکھو۔

مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝ ع وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْــًٔا ۝ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ۝ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ۝ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ

۶۳ — ۶۵-۶۴ ع — ۶۶ — ۶۸-۶۷ — ۷۰-۶۹

یہی زندگی کی ساری بنیادیں ہل گئیں۔

اور (فرشتے جنتی سے کہینگے) ہم (تمہارے پاس) نہیں آتے مگر تمہارے پروردگار کے حکم سے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے، جو کچھ ہمارے پیچھے گزر چکا ہے، اور جو کچھ ان دونوں وقتوں کے درمیان ہوا، سب اُسی کے حکم سے ہے۔ اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ بھول جانے والا ہو! ۶۳

آسمان اور زمین کا پروردگار، اور اُن سب کا پروردگار جو آسمان و زمین میں ہیں، سو (اے پیغمبر!) اُسی کی بندگی کر اور اُس کی بندگی کی راہ میں جو کچھ پیش آئے جھیلتا رہ۔ کیا تیرے جانتے کوئی دوسرا بھی اس کا ہم نام ہے! (یعنے اُس جیسا ہے؟) ۶۵

اور (حقیقت سے غافل) انسان کہتا ہے "جب میں مرگیا، تو پھر کیا ایسا ہونے والا ہے کہ زندہ اُٹھایا جاؤں؟" ۶۶

(افسوس اس پر!) کیا انسان کو یہ بات یاد نہ رہی کہ ہم اُسے پہلے پیدا کر چکے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟ ۶۷

سو (اے پیغمبر!) تیرا پروردگار شاہد ہے کہ ہم ان سب کو اور ان کے ساتھ سارے شیطانوں کو ضرور اکٹھا کرینگے۔ پھر ان سب کو دوزخ کے گرد حاضر ہونے کا حکم دینگے۔ زانوؤں پر گرے ہوئے! ۶۸

پھر ہر گروہ میں سے اُن لوگوں کو (چُن چُن کر) الگ کر لینگے جو (اپنی زندگی میں) خدائے رحمان سے بہت ہی سرکش تھے، اور پھر یہ بات بھی ہم ہی جانتے والے ہیں کہ کون دوزخ میں جانے کا زیادہ سزاوار ہے۔ ۶۹ ۷۰

اور (یاد رکھو) تم میں کوئی نہیں جو اس منزل سے

(۱۳) آیت (۶۲) میں فرمایا تھا کہ جنت کی زندگی سلامتی اور طہارت کی زندگی ہوگی۔ وہاں سلام کی صداؤں کے سوا اور کوئی صدا سُننے میں نہیں آئیگی۔ پھر آیت (۶۴) میں فرمایا جنتیوں پر فرشتوں کا نزول ہوگا جو سلامتی کا پیام پہنچائینگے۔ وہ کہینگے، تمہارا پروردگار بھول جانے والا نہ تھا۔ دیکھ لو جو کچھ تم نے ماضی میں کیا تھا، آج اُس کے نتائج تمہارے دامن میں ہیں، اور قانونِ نتائج کے حافظے نے کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی نہیں بھلایا ہے!

وما کان ربك نسیا کی حقیقت پر غور کرو۔ علم و قدرت کے جو الٰہی قوانین ہیں چاروں طرف کو گھیرے ہوئے ہیں، اُن کا حافظہ کیسا اٹل اور اُن کا حساب و کتاب کیسا بے داغ ہے! کیا ممکن ہے کہ ایک پل کے لیے بھی اُن پر سہو و نسیان طاری ہو جائے؟

(۱۴) آیت (۶۵) میں خطاب پیغمبر اسلام اور اُن کے ساتھیوں

ؔ اس ترجمہ پر یہ شبہ وارد نہ ہو کہ حضرت ابن عباس نے روایت مسند و بخاری میں اس قول کا مخاطب خود آنحضرت کو قرار دیا ہے۔ اس میں صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے وحی کے جوشِ طلب میں مزید تنزیل کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس پر یہ جواب ملا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیت کا ابتدائی شانِ نزول یہی ہو، چونکہ آیت میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ملائکہ کا ورود بغیر حکم الٰہی کے نہیں ہو سکتا، اس لیے جب آنحضرت نے جوشِ تنزیل کا ہوش ظاہر فرمایا تو جواب میں یہی آیت دُہرا دی گئی۔

۷۱-۷۲ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ

۷۳ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا ۝ وَكَمْ أَهْلَكْنَا

۷۵ قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا ۝ قُلْ مَن كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ

۷۶ جُندًا ۝ وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ

سے ہے۔ فرمایا دو باتوں میں لگے رہو۔ ساری کامیابیاں انہی پر مبنی، اُس کی عبادت کرو۔ اُس کی عبادت کی راہ میں جتنی بھی مشکلات پیش آئیں جھیلتے رہو

۷۱ گزرنے والا نہ ہو۔ ایسا کرنا تمہارے پروردگار نے ضروری ٹھہرا لیا۔ یہ ایک طے شدہ فیصلہ ہے!

پھر ہم ایسا کرینگے کہ جو متقی ہیں، انہیں نجات دیدیں

۷۲ جو ظالم ہیں، اُنہیں دوزخ میں چھوڑ دیں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے!

(۱۵) آیت (۷۱) میں "وان منکم الا واردھا" کا خطاب تمام نوعِ انسانی سے نہیں ہے، بلکہ اُن منکرینِ حق سے ہے جن کا ذکر پہلے سے چلا آتا ہے، اور جن کی نسبت پچھلی آیت میں فرمایا "الذین ھم اولی بھا صلیا" اور اسی لیے اس درجہ زور دیکر فرمایا "کان علی ربك حتما مقضیا" جزائے عمل کا قانون طے شدہ قانون ہے کبھی ٹلنے والا نہیں۔

۷۳ اور (دیکھو) جب ہماری روشن آیتیں لوگوں کو سنائی جاتی ہیں، تو جو لوگ کفر میں پڑے ہیں، وہ ایمان والوں سے کہتے ہیں "یہ تو بتلاؤ، ہم دونوں فریقوں میں کون ہے جو بہتر جگہ رکھتا ہے، اور بہتر جگمگاتا ہے؟"

حالانکہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے

۷۴ جو ان سے کہیں بہتر ساز و سامان رکھتی تھیں، اور اُن سے کہیں بہتر اُن کی نمود تھی!

(۱۶) سورۂ مریم مکی عہد کی وسطی تنزیلات میں سے ہے اُس وقت پیروانِ دعوت کمزور اور بے سر و سامان تھے۔ منکروں کو ہر طرح کی دنیوی خوشیاں حاصل تھیں۔ پیغمبرِ اسلام مومنوں کے ساتھ بیٹھتے، تو فقیروں اور بے نواؤں کی مجلس ہوتی۔ منکرینِ حق دارالندوہ میں جمع ہوتے، تو سرداروں اور امیروں کا مجمع ہوتا۔ اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کی بشارتیں سُن کر کفار ہنسی اُڑاتے۔ وہ کہتے، بتلاؤ، ہم دو دلوں میں سے کس کا مقام بلند ہے اور کس کی مجلس معزز؟

آیت (۷۳) سے (۷۶) تک منکروں کی اسی سرکشی کا بیان ہے۔ فرمایا، انہیں خدا کے قانون کی خبر نہیں، اس نے نتائجِ عمل کا قانون ایسا ٹھہرا دیا ہے کہ گمراہوں کو ڈھیل پر ڈھیل دیجاتی ہے۔ راہروؤں کو رہنمائی پر رہنمائی ملتی ہے۔ جس نے آنکھیں بند کرلیں اُس کے لیے تاریکی ہی ہوگی۔ لیکن فوراً انہیں گرایگا یکے بعد دیگرے مہلتیں پائینگے

(اے پیغمبر!) تو کہدے، جو کوئی گمراہی میں پڑا، تو خدائے رحمان کا قانون یہی ہے کہ اُسے برابر ڈھیل دیا جاتا ہے۔ وہ اسی حال میں رہیگا۔ یہاں تک کہ اپنی آنکھوں سے وہ بات دیکھ لے جس کا اُس سے وعدہ کیا گیا تھا یعنی عذاب یا قیامت کی گھڑی، تو اُس وقت اُسے پتہ چلیگا، کون تھا جس کی جگہ سب سے زیادہ بدتر ہوئی اور جس کا جتھا سب سے زیادہ بودا نکلا!

۷۵ اور جن لوگوں نے راہ پالی، تو وہ اُن پر اور زیادہ راہ کھول دیتا ہے (یعنے ان کی فلاح و سعادت بڑھتی ہی جاتی

مَرَدًّا ○ اَفَرَءَيْتَ الَّذِیْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ○ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ ۷۶-۷۷

الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ○ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ○ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا ۷۸-۷۹

فَرْدًا ○ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ○ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ ۸۰-۸۱

عَلَيْهِمْ ضِدًّا ○ اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ○ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ ۸۲-۸۳ ع

لَهُمْ عَدًّا ○ ۸۴

جس نے آنکھیں کھلی رکھیں، اُسے راہ ملیگی، لیکن فوراً منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ جائیگا، درجہ بدرجہ رہنمائی پائیگا۔ یہاں اچھائی اور بُرائی، دونوں کے لیے تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے پس ایک خاص وقت کی حالت دیکھ کر مغرور نہیں ہوجانا چاہیے۔ ظہورِ نتائج کا انتظار کرنا چاہیے۔

تفصیل کے لیے تفسیر فاتحہ میں "قانونِ امہال" کا مبحث پڑھنا چاہیے یہ مقام مہاتِ معارف میں سے ہے۔

ہیں) اور تمہارے پروردگار کے حضور تو باقی رہنے والی نیکیاں ہی بہتر ہیں۔ ثواب کے اعتبار سے بھی، اور نتیجہ کے اعتبار سے بھی! ۷۶

(اے پیغمبر!) تو نے دیکھا، اُس آدمی کا کیا حال ہے، جس نے ہماری آیتوں سے انکار کیا اور کہا "خدا کی قسم! میں ضرور مالُ دولت پاؤنگا۔ میں ضرور صاحبِ اولاد ہونگا"! ۷۷

وہ جو ایسا کہتا ہے، تو کیا اُس نے غیب کو جھانک کے دیکھ لیا ہے؟ یا خدا سے کوئی عہد لے لیا ہے کہ اُسے ایسا کرنا ہی پڑیگا؟ ہرگز نہیں (ایسا کبھی نہیں ہوسکتا) اچھا، وہ جو کچھ کہتا ہے، ہم اُسے لکھ لینگے (یعنے اُس کی یہ بات بھلائی نہیں جائیگی۔ اُس کے آگے آئیگی) اور اُس کے عذاب کی رسّی لمبی کرتے جائینگے۔ ۷۸ یہ جس مال و اولاد کا دعویٰ کرتا ہے (اگر اُسے میسر بھی آجائے، تو بالآخر) ہمارے ہی قبضہ میں آئیگا، اور اُسے تو ہمارے سامنے تن تنہا حاضر ہونا ہے! ۷۹-۸۰

اور ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنالیا ہے کہ ان کے مددگار ہوں لیکن ہرگز ایسا ہونے والا نہیں۔ وہ (قیامت کے دن) ان کی بندگی سے صاف انکار کر جائینگے۔ ۸۱ وہ اُلٹے اُن کے مخالف ہونگے! ۸۲

(اے پیغمبر!) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے۔ وہ اُنہیں برابر اُکساتے رہتے ہیں! ۸۳

پس تو اُن کے بارے میں جلدی نہ کر۔ (فیصلۂ امر میں جو دیر ہو رہی ہے، تو) یہ صرف اس لیے ہے کہ ہم اُن کے دن گن رہے ہیں (قریب ہے کہ مقررہ وقت ظہور میں آجائے) ۸۴

(۱۷) آیت (۷۷) میں انسان کی غفلت اور سرکشی کی اُس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ وہ اپنی عارضی خوشحالیوں کے گھمنڈ میں سمجھنے لگتا ہے، ہر طرح کی خوش حالیاں میرے ہی حصہ میں آنے والی ہیں، اور بھول جاتا ہے کہ زندگی اور زندگی کے حوادث کا ایک پل بھی اُس کے اختیار میں نہیں!

یہاں فرمایا، کیا اس سرکش نے غیب کی باتیں دیکھ لی ہیں، یا خدا سے کوئی پٹہ لکھوا لیا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، تو پھر کیا ہے جس پر بھولا بیٹھا ہے؟

(۱۸) آیت (۸۴) کے چند لفظوں نے جزاءِ عمل کے قانون کی ساری حقیقت کس طرح واضح کر دی ہے؟ فرمایا فلا تعجل علیہم انما نعد لهم عدا۔ جلدی نہ کر۔ یہ دیر صرف اس لیے ہے کہ اُن کے دن گنے جا رہے ہیں۔ یعنے ہر حالت کی تکمیل و ظہور کے لیے ایک مقررہ مدت ہے، اور نتائجِ عمل کا قانون بھی اس سے باہر نہیں۔ کفار کو جو ڈھیل مل رہی ہے، وہ صرف اس لیے ہے کہ دن گنے جا رہے ہیں۔ وقت قریب آگیا ہے مگر دن ابھی پورے نہیں ہوئے۔ جونہی

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ۝ وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۝ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ أَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝

پورے ہونگے، نتیجہ خود بخود ابھر کر آشکارا ہو جائیگا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دشمنانِ حق کی خوش حالیوں کے صرف گنے ہوئے دن باقی رہ گئے تھے۔ سورۂ مریم کے نزول پر پورے دس برس بھی نہیں گزرے تھے کہ سارے معاملہ کا فیصلہ ہو گیا!

(١٩) اب کہ سورت ختم ہو رہی ہے، سلسلۂ بیان پھر اسی مطلب کی طرف رجوع ہو گیا ہے، جو اوائلِ سورت میں چھڑ گیا تھا یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں عیسائیوں کی گمراہی۔

چنانچہ آیت (۸۵) میں فرمایا۔ قیامت کے دن تمام انسان دو گروہوں میں بٹ جائینگے۔ ایک متقیوں کا ہوگا۔ دوسرا مجرموں کا۔ متقی اپنے ایمان و عمل کی جزا میں نجات پائینگے۔ مجرم اپنے انکار و بدعملی کی پاداش میں عذاب۔ یہ بات کسی کے اختیار میں نہ ہوگی کہ دنیا کے درباروں کی طرح جسے چاہے، اپنی سفارش سے چھڑا لے۔ پس عیسائیوں نے جو حضرت مسیح کو نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ دینے والا اور اس کا شفیع و منجی تصور کر لیا ہے، وہ صریح گمراہی نہیں ہے تو کیا ہے!

پھر الوہیت اور ابنیتِ مسیح کی گمراہی کی طرف اشارہ کیا، اور فرمایا۔ انسانی گمراہی کی یہ انتہا ہے اس سے زیادہ سخت گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ فاطر السماوات والارض کو ایک بیٹے کی ہستی کا محتاج تصور کر لیا جائے

اس کے بعد صرف ایک آیت کے اندر وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو اس عقیدے کے رد میں کہا جا سکتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ واضح اور فیصلہ کن حجت ہے، مگر منطقی طریقہ کی نہیں، جو دلوں کو نہیں پکڑ سکتی۔ قرآنی طریقہ کی، جو دل کے ایک ایک ریشہ میں اتر جاتی ہے:

ان کل من فی السموات والارض، الا اتی الرحمٰن عبدا!

تم خود تسلیم کرتے ہو کہ کائناتِ خلقت میں جو کوئی بھی ہے، اس کے حضور بندہ ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یعنے یہاں آقائی و معبودیت صرف خدا کے لیے ہے۔ باقی سب کے لیے بندگی و نیازمندی ہے۔ اچھا، اگر اس سے تمہیں انکار نہیں تو پھر مسیح کو بھی عبد ہونا چاہیے۔ نہ کہ معبود۔ غلام ہونا چاہیے۔ نہ کہ آقا۔

وہ دن، کہ متقی انسانوں کو اپنے حضور مہمانوں کی طرح جمع کرینگے، اور مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح ہنکائینگے۔ اس دن شفاعت کرنا کرانا کسی کے اختیار میں نہ ہوگا۔ ہاں جس کسی نے خدا کے حضور سے وعدہ پا لیا (تو وہ وعدہ ضرور اس کے کام آئیگا)

اور ان لوگوں نے (یعنے عیسائیوں نے) کہا "خدائے رحمان نے اپنا ایک بیٹا بنا رکھا ہے" بڑی ہی سخت بات ہے جو تم گڑھ لائے ہو! قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین کا سینہ چاک ہو جائے، پہاڑ جنبش میں آ کر گر پڑیں! لوگ اللہ کے لیے بیٹا ہونے کا دعوی کر رہے ہیں!

اللہ کی یہ شان کب ہو سکتی ہے کہ اپنے لیے ایک بیٹا بنائے۔ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، وہ اسی لیے ہے کہ اس کے آگے بندگی کا سر جھکائے حاضر ہو۔ اس نے (اپنی قدرت سے) انہیں گھیر رکھا ہے، اور (اپنے علم سے) ایک ایک کی ہستی گن رکھی ہے۔ قیامت کے دن سب اس کے حضور تن تنہا آ کر کھڑے ہونگے۔ (کوئی ان کا ساتھی اور مددگار نہ ہوگا!)

(اے پیغمبر!) جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عملوں میں لگ گئے ہیں، یقینی ہے کہ خدائے رحمان ان کے لیے (دلوں میں) محبت پیدا کر دے (یعنے لوگ ان کی طرف کھنچینگے

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۹۷

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۝ ۹۸ ع (۷)

اور انہیں پسندیدگی نظر سے دیکھینگے) اسی غرض سے ہم نے قرآن تیری زبان (عربی) میں اُتار کر آسان کر دیا کہ متقی انسانوں کو (کامیابی کی) خوش خبری دیدے، اور جو گروہ سچائی کے مقابلہ میں ہٹ کرنے والا اور اڑ جانے والا ہے، اُسے (انکار و سرکشی کے نتیجہ سے) خبردار کر دے۔ ۹۷

ان (سرکشوں) سے پہلے قوموں کے کتنے ہی دَور گزر چکے ہیں جنہیں ہم نے (پاداش بدعملی میں) ہلاک کر دیا۔ کیا ان میں سے کسی کی ہستی بھی اب تم محسوس کرتے ہو؟ کیا اُن کی بھنک بھی سُنائی دیتی ہے؟ ۹۸

محکوم ہونا چاہیے۔ نہ کہ حکم فرما۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کے آگے سب تو بندے ہوں، مگر مسیح بندہ نہ ہو!

(۲۰) آیت (۹۶) سے آخر تک سورت کی اختتامی موعظت ہے۔ اس میں دو باتوں کی خبر دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ جو لوگ ایمان و عمل کی راہ اختیار کرینگے، عنقریب خدا اُن کے لیے انسانوں کے دل کھول دیگا، اور وہ قوموں اور ملکوں کے محبوب ہو جائینگے۔ سیجعل لھم الرحمٰن ودا۔ دوسری یہ کہ حق کے مقابلہ میں ہٹ دھرمی کرنے والوں کو وہی نتیجہ پیش آنے والا ہے جو پچھلی تباہ شدہ جماعتوں کو پیش آچکا ہے کہ آج اُن کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ ھل تحس منھم من احد او تسمع لھم رکزا!

شرح سیجعل لھم الرحمٰن ودا

تاریخ کا داستان سرا شہادت دیتا ہے کہ دنیا نے یہ دونوں باتیں چند برسوں کے اندر دیکھ لیں۔

ایمان و عمل کی اس دعوت نے مسلمانوں کا جو گروہ پیدا کر دیا تھا، انسانوں نے اسے قبول ہی نہیں کیا، بلکہ اس کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ خوف و دہشت کی طاقت نہ تھے جس سے لوگ بھاگتے، نیکی و عدالت کا پیام تھے جس کی طرف لوگ دوڑتے تھے۔ قوموں نے انہیں بلاوے بھیجے، شہروں نے اُن کے لیے پھاٹک کھولے، قلعوں نے اپنی کنجیاں آگے رکھ دیں، اور وقت کی ساری مظلوم آبادیوں نے اُنہیں نجات دہندہ سمجھا۔

اجنادین اور یرموک کے میدانوں میں بازنطینی شہنشاہی اُن سے لڑ رہی تھی، لیکن شام کی آبادیاں محبت کے پیام بھیج رہی تھیں۔ بصرا نے اپنے دروازے خود کھول دیے تھے، حمص کے باشندوں نے منتیں کی تھیں، طرابلس پہلے سے چشم براہ تھا، صور کے پھاٹک بند ہی نہیں کیے گیے۔ اسی طرح جب اُنہوں نے مصر کا رُخ کیا، تو خود مصر کے عیسائی ہی تھے جنہوں نے بڑھ کر ان استقبال کیا تھا۔ وہ جن جن راستوں سے گزرتے، سڑکوں کو درست اور پلوں کو طیار پاتے، اور ہر طرح کی رسد فوج کے لیے مہیا ہوتی!

باقی رہی دوسری بات، تو محتاج تشریح نہیں۔ اس آیت کے نزول پر پورے پندرہ برس بھی نہیں گزرے تھے کہ دعوتِ قرآن کی تمام معاند قومیں بے نام و نشان ہو چکی تھیں!

حضرت مریم کی ابتدائی سرگزشت اور انجیل

(۲۱) حضرت مسیح (علیہ السلام) اور مسیحیت کی نسبت بعض مہمات مباحث ہیں جن کے اشارات آئندہ سورتوں کی تشریحات میں ملینگے، لیکن یہاں دو باتوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے:

(الف) قرآن نے حضرت مسیح کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا ہے۔ یہاں، اور سورۂ آلِ عمران کی آیات (۳۵-۶۳) میں۔ یہاں یہ ذکر حضرت زکریا کی دعا اور حضرت یحییٰ کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے، اور اناجیل اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے۔ لیکن سورۂ آلِ عمران میں یہ تذکرہ اس سے بھی پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے۔ یعنے حضرت مریم کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے، اور اس بارے میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں۔

لیکن اُنیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا، اُس نے حضرت مریم کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگزشت کا یہ ٹکڑا بھی اُسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے ہیں۔

"متروک اناجیل" سے مقصود وہ کئی سے زیادہ انجیلیں ہیں جو پہلی صدی سے لیکر چوتھی صدی کے اوائل تک عیسائیوں میں رائج اور معمول بہا تھیں، لیکن ۳۲۵ء میں نائسیا کی کونسل نے چار منتخب کر لیں، اور باقی متروک سمجھی گئیں۔ یہ انتخاب کسی تاریخی یا علمی اصل کی بنا پر نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ایک طرح کی فال دیکھی گئی تھی، اور اُس کا اشارہ فیصلہ کن تھا۔

قرآن اور حضرت مسیح کی پیدائش

(ب) قرآن کا جب نزول ہوا، تو حضرت مسیح کے بارے میں عیسائیوں کے عام بنیادی عقائد یہ تھے:

اولاً۔ بغیر باپ کے پیدائش

ثانیاً۔ مصلوب ہونے کے بعد پھر زندہ ہو جانا۔

ثالثاً۔ الوہیت مسیح اور اقانیم ثلاثہ۔

رابعاً۔ کفارہ، اور یہ اعتقاد کہ اب نجات کی راہ عمل نہیں، بلکہ مسیح کے کفارہ پر ایمان ہے۔

قرآن نے واقعہ صلیب کا رد کیا، اور کہا کہ وہ مصلوب نہیں ہوئے بلکہ حقیقت حال لوگوں پر مشتبہ ہو گئی۔ الوہیت اور ابنیت کا بھی رد کیا اور کہا، ایسا کہنا صریح کفر ہے۔ کفارہ کا بھی رد کیا، اور جا بجا اس پر زور دیا کہ نجات کی بنیاد ایمان باللہ اور عمل ہے نہ کہ مسیح کے کفارہ کا اعتقاد۔ اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بغیر باپ کے پیدائش کا اعتقاد بھی انہی عقائد کی طرح باطل تھا، تو کیا ضروری نہ تھا کہ قرآن اسی صراحت کے ساتھ اس کا بھی رد کر دیتا جس صراحت کے ساتھ دوسرے عقائد کا کیا ہے؟ یقیناً ضروری تھا۔

لیکن قرآن نے اس کے رد میں ایک حرف نہیں کہا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس پر نظر ڈالی جائے اور یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھی جائے کہ تذکرہ ایک ایسی پیدائش کا ہو رہا ہے جو بغیر باپ کے تسلیم کر لی گئی ہے، تو بغیر کسی تامل کے تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ بیان کی صاف روح یہی ہے کہ قرآن اس عام اعتقاد کا منکر نہیں کم از کم اُس کا رجحان اس کے خلاف نہیں جا رہا۔

بلاشبہ قرآن میں یہ الفاظ کہیں نہیں ملتے کہ حضرت مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ یعنے کوئی ایسی مثبت تصریح نہیں جو اپنے منطوق پر ظاہر و قطعی ہو۔ اُس کی جتنی آیتوں سے اس طرح کے اشارات نکل رہے ہیں، اگر انہیں ایک دوسرے سے الگ کر لیا جائے، تو ہر آیت کے مطلب کے لیے ایک دوسرا جامہ بھی تراش لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ مرحوم سید احمد خاں اور ڈاکٹر توفیق صدقی وغیرہما نے کوشش کی ہے لیکن جب تمام بیان پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے اور محل کے قدرتی مقتضیات اور قرائن بھی پیش نظر ہوں، تو بلا تامل تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ قرآن اس اعتقاد کے حق میں ہے۔ اس سے منکر نہیں۔

پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش کا معاملہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بالکل متضاد سمتوں کا انتہائی گوشہ بن گیا تھا۔ یہودی اُن کی پیدائش کو ناجائز تعلق کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ برخلاف اس کے عیسائی نہ صرف جائز بلکہ ایک ربانی معجزہ تصور کرتے تھے۔ قرآن کا فرض تھا کہ بہ حیثیت ایک ثالث کے دونوں میں فیصلہ کر دے۔ چنانچہ اُس نے فیصلہ کر دیا۔ اُس نے حضرت مریم کی پاکی کا اعلان کیا: ان اللہ اصطفاكِ وطهركِ واصطفاكِ على نساء العالمين (۳: ۴۲) یہودیوں کے الزام کو افترائے عظیم قرار دیا: و بکفرهم وقولهم على مريم بهتانا عظيما (۴: ۱۵۶) اور پیدائش مسیح کی سرگزشت ٹھیک اسی طرح بیان کر دی جس طرح انجیل میں بیان کی گئی ہے۔ قالت انّى يكون لى غلام ولم يمسسنى بشر، ولم اك بغيا؟ قال كذالك، قال ربك: هو على هين، ولنجعله اية للناس ورحمة منا، وكان امرا مقضيا (۲۱) "مریم نے فرشتہ سے کہا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں مرد سے واقف نہیں؟ اُس نے کہا ایسا ہی ہوگا۔ روح القدس تجھ پر نازل ہوگی، اور خدا کی قدرت تجھے اپنے سایہ میں لے لیگی" (لوقا ۱: ۳۴) اب اگر یہودیوں کی طرح مسیح عیسائیوں کا اعتقاد بھی قرآن کے نزدیک غلط تھا، تو کیا ضروری نہ تھا کہ جس طرح اُس نے یہودیوں کے الزام کا رد کیا، اسی طرح عیسائیوں کے غلو کا بھی صاف صاف رد کر دیتا؟ لیکن وہ اس کے رد میں ایک حرف نہیں کہتا، بلکہ پیدائش کی جس روداد سے عیسائیوں نے یہ اعتقاد پیدا کیا تھا، اُسے حرف بحرف انجیل ہی کی طرح بیان کر دیتا ہے۔

اگر اُس کے نزدیک حقیقت نہ تو وہ تھی جو یہودیوں نے بنائی، اور نہ وہ جو عیسائیوں نے سمجھی، بلکہ ایک تیسری ہی بات تھی۔ یعنے مریم کا اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہونا، تو کیونکر اُس کے لیے جائز ہو سکتا تھا کہ وہ سب کچھ کہہ دے، لیکن اس بارے میں کچھ نہ کہے؟ وہ اُس فریق کا صاف صاف رد کر دے جو اس میں تفریط کر رہا ہے، مگر اُس کا رد نہ کرے جو افراط کا مرتکب ہو رہا ہے؟ اور پھر اصل حقیقت پر اُسی طرح

یہ چناہ ہوئے جس طرح پہلے سے بنا ہوا تھا، اور اپنا یہ وصف یک قلم بھول جائے کہ وہ تمام پچھلے اختلافات کے لیے حَکَم اور تمام ظنونُ شکوک کے لیے علم وحقیقت کا اعلان ہے؟

یہودیوں اور عیسائیوں کی نزاع صرف اسی باب میں نہیں ہوئی بلکہ حضرت مسیح کی ساری باتوں میں ہوئی۔ دونوں نے تفریط وافراط کی دو انتہائی جہتیں اختیار کرلی تھیں۔ یہودی انکار میں اتنے دور نکل گئے کہ انہیں شعبدہ باز اور فریبی سمجھ لیا۔ عیسائی اعتقاد میں اتنے دور نکل گئے کہ اُنہیں خدا بنالیا۔ قرآن دونوں کا رد کرتا ہے، اور کہتا ہے، دونوں افراط وتفریط میں کھوئے گئے پھر اگر پیدائش مسیح کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا، تو کیا ضروری نہ تھا کہ جس طرح اس بارے میں دونوں کا رد کیا، اور صاف صاف کہہ دیا کہ دونوں حقیقت سے محروم ہیں، اُسی طرح پیدایش کے بارے میں بھی یکساں طور پر دونوں کا رد کر دیتا اور صاف صاف بتلا دیتا کہ حقیقت سے دونوں محروم ہیں؟

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عیسائیوں نے ابنیت کے اعتقاد کے لیے جو سہارے ڈھونڈے تھے، اُن میں سب سے بڑا سہارا اسی پیدائش کے اچنبھے کا تھا۔ اسکندریہ کے فلسفہ آمیز صنامی تخیل سراپیز (Serapis) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی، اور ایزیز (Isis) کی جگہ حضرت مریم کو اور ہورَس (Horus) کی حضرت مسیح کو دی گئی پس اگر قرآن کے نزدیک یہ اعتقاد بے اصل ہوتا، تو وہ الوہیّت وابنیت کا رد کرتے ہوئے سب سے پہلی ضرب اسی سہارے پر لگاتا کیونکہ اس کے گرنے کے بعد صنامی مسیحیت کی ساری عمارت خود بخود گر جاتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ وہ صرف ایک لفظ کہہ کر کہ یوسف مسیح کا باپ تھا سارا کارخانہ درہم برہم کر دے سکتا تھا مگر وہ یہ نہیں کہنا چاہتا۔ وہ اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتا۔ اُس کے بحث واحتجاج کا اُسلوب ہر جگہ ایسا دکھائی دیتا ہے، جیسے اُسے غیر معمولی پیدایش کے معاملہ سے تو انکار نہیں لیکن وہ کہتا ہے، اِس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ ایک بندہ، خدا یا خدا کا بیٹا ہو جائے؟ ایک انسان، جو تمام انسانوں کی طرح انسان تھا، اور اپنی پیدایش کے لیے ماں کے پیٹ کا محتاج، بہرحال انسان ہی ہوگا۔ خدا یا خدا کا بیٹا کیوں مانا جائے؟

جو لوگ قرآن کو غیر معمولی پیدایش کا منکر ثابت کرنا چاہتے ہیں، اُنہوں نے اپنی توجیہات کی ساری بنیاد اس مقدمہ پر رکھی ہے کہ رخصتی سے پہلے یوسف اور مریم میں زوجیت کا تعلق قائم ہو گیا تھا، اور یہ اگرچہ شریعت موسوی کے خلاف نہ تھا لیکن وقت کے رواج کے خلاف ضرور تھا۔ اسی لیے لوگوں پر بچہ کی پیدایش گراں گزری۔ وہ اسے ناجائز حمل کا نتیجہ قرار دینے لگے، لیکن اول تو یہ محض ایک ظنی بنیاد ہے، جس کے لیے تاریخی قرائن کا کوئی سہارا موجود نہیں، ثانیاً خود یہودیوں کی قدیم روایات بالکل اس کے خلاف جارہی ہیں۔ اُنہوں نے حضرت مریم کو متہم کرتے ہوئے یوسف کا نام نہیں لیا تھا، بلکہ پنتھرا نامی کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

بہرحال قرآن کو اس بارے میں منکر قرار دینا، شرح وتفسیر کا ایک ایسا اقدام ہے، جس پر کسی طرح ایک دیانت دار شارح کا ضمیر مطمئن نہیں ہو سکتا۔

ہمیں قرآن کا مطالعہ نہ تو اس طرح کرنا چاہیے کہ اُسے عجائب پرستیوں کی داستان بنانے کے خواہشمند ہوں۔ نہ عجائب پرستی کے الزام سے بچنے کے لیے اس درجہ مضطرب ہونا چاہیے کہ ہر بے محل سے بے محل توجیہہ قبول کرلیں۔ قرآن عربی زبان کی ایک کتاب ہے، اور دنیا کی تمام زبانوں کی طرح عربی الفاظ وتراکیب کے بھی ڈھلے ہوئے سانچے ہیں، اور اسلوب بیان کے معین اور قطعی دلالات ہیں ہمیں چاہیے کہ علم ودیانت کے ساتھ اُس کا مطالعہ کریں، اور جو مطلب صاف صاف نکل رہا ہو اُسے بغیر کسی جھجک کے قبول کرلیں۔ اگر ہم نے بہ تکلف ایک بات اُس کے مُنہ میں رکھ دی جسے خود اُس کی زبان قبول نہیں کررہی، تو گو ہم نے اپنے خیال میں ایک بات بنالی ہو مگر فی الحقیقت بننے والی نہیں۔ یہاں علم وحقیقت کی بے لاگ عدالت موجود ہے۔ وہ ہر بناوٹ کو اصلیت سے جُدا کرلیگی!

باقی رہا یہ سوال کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے معاملات کیونکر عقلاً تسلیم جا سکتے ہیں؟ تو یہ ایک اصولی بحث ہے، اور اس کا محل ترجمان القرآن نہیں، مقدمہ تفسیر ہے۔

Encyclopaedia Biblica ۞

سُورۃ طٰہٰ

مکی - ۱۳۵ - آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

طٰهٰ ○ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى ○ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى ○ تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ○ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ○ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰى ○ وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ○ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ○ وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰى ○ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ

طاہا (یعنے اے شخص مخاطب[1]!) ہم نے تجھ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ رنج و محنت میں پڑ۔ وہ تو اس لیے نازل ہوا ہے کہ جو دل (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرنے والا ہو اس کے لیے نصیحت ہو۔ (جو ڈرنے والے نہیں، وہ کبھی اس کی صداؤں پر کان نہیں دھرینگے)

یہ اُس ہستی کا اُتارا ہوا ہے جس نے زمین پیدا کی اور بلندی کے آسمان۔ الرحمان، کہ (جہانداری کے) تخت پر متمکن ہے! جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، جو کچھ مٹی کے نیچے ہے (یعنی زمین کے نیچے ہے) سب اُسی کا ہے اور اُسی کے لیے ہے!

اور اگر تم پکار کے بات کہو (تو اُس کی سماعت اس کی محتاج نہیں) کیونکہ وہ بھیدوں کا جاننے والا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چھپے بھیدوں کو بھی! وہی اللہ ہے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف وہی۔ اُس کے لیے حُسن و خوبی کے نام ہیں!

اور (اے پیغمبر!) موسیٰ کی حکایت تو نے سُنی؟ جب اُس نے (دور سے) آگ دیکھی، تو اپنے گھر کے لوگوں

(۱) بالاتفاق یہ سورت سورۂ مریم کے بعد نازل ہوئی ہے، اور مکی عہد کی وسطی تنزیلات میں سے ہے

یہ زمانہ تاریخ دعوت کا سب سے زیادہ پُرآشوب زمانہ تھا۔ انکار و جحود کا ہر طرف سے ہجوم تھا، اور قبولیت کی رفتار بہت ہی دھیمی اور محدود تھی۔ قدرتی طور پر یہ صورت حال پیغمبر اسلام پر گراں گزرتی تھی جو دل تمام نوع انسانی کی ہدایت کے لیے پھنک رہا تھا، وہ اپنے قریبی ابنائے وطن کو بھی قبولیت کے لیے آمادہ نہ پاتا تھا۔ کون ہے جو اس غم و اضطراب کا اندازہ کرسکتا ہے جس کی مقدس آگ آپ کے قلب مبارک میں سُلگ رہی ہوگی!

یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی تمام تنزیلات تسکین و تشفی کی روح سے معمور ہیں، اور یہی روح اس سورت میں بھی بول رہی ہے۔ خطاب براہ راست آپ سے ہے اور بالواسطہ آپ کے ساتھیوں سے۔

فرمایا۔ قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا ہے کہ تم اپنے کو رنج و محنت میں ڈالو۔ وہ تو نصیحت کی بات ہے۔ جو مستعد ہیں قبول کرینگے جنہوں نے استعداد کھو دی، وہ سُننے والے نہیں۔ اور نتیجہ کا ظہور اپنے وقت پر ہوگا۔

---

[1] عربی میں "طاھا" ایک کلمۂ ندا ہے۔ کسی کو مخاطب کرنا ہو تو پکارتے ہیں "طاہا" یعنے اے شخص! چنانچہ ابن جریر نے اس شعر سے استشہاد کیا ہے:

دعوت بطاھا فی القتال فلم یجب ۔۔۔ فخفت علیہ ان یکون موائلا

کلبی اور قطرب اس طرف گئے ہیں کہ یہ قبائل عکل، عک، اور طے کی زبان میں بولا جاتا ہے، اور ابن الانباری نے تصریح کی ہے کہ لغۃ قریش وافقت تلک اللغۃ فی ہذا المعنی۔ حضرت ابن عباس اور اکثر ائمہ تابعین سے بھی ایسا ہی منقول ہے (ابن جریر)

امْكُثُوٓا إِنِّىٓ ءَانَسْتُ نَارًا لَّعَلِّىٓ ءَاتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى ٱلنَّارِ هُدًى ۝ فَلَمَّآ أَتَىٰهَا نُودِىَ يَـٰمُوسَىٰٓ ۝ ۱۰-۱۱
إِنِّىٓ أَنَا۠ رَبُّكَ فَٱخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِٱلْوَادِ ٱلْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَأَنَا ٱخْتَرْتُكَ فَٱسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰٓ ۝ ۱۲-۱۳
إِنَّنِىٓ أَنَا ٱللَّهُ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدْنِى وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكْرِىٓ ۝ إِنَّ ٱلسَّاعَةَ ءَاتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا ۱۴
لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعَىٰ ۝ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَن لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَٱتَّبَعَ هَوَىٰهُ فَتَرْدَىٰ ۝ وَمَا تِلْكَ ۱۵-۱۶
بِيَمِينِكَ يَـٰمُوسَىٰ ۝ قَالَ هِىَ عَصَاىَ أَتَوَكَّؤُا۟ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِى ۱۷

سے کہا "ٹھہرو، مجھے آگ دکھائی دی ہے۔ میں جاتا ہوں۔ ممکن ہے تمہارے لیے ایک انگارا لے آؤں، یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی راہ دکھلانے والا ہی مل جائے"۔ ۱۰

پھر جب وہ وہاں پہنچا، تو اُس وقت پکارا گیا (ایک آواز اٹھی کہ) "اے موسیٰ! میں ہوں تیرا پروردگار! ۱۱ پس اپنی جوتی اُتار دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔ ۱۲ اور دیکھ! میں نے تجھے (اپنی رسالت کے لیے) چن لیا ہے۔ پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے، اُسے کان لگا کر سن۔ ۱۳ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی بندگی کر، اور میری ہی یاد کے لیے نماز قائم کر۔ ۱۴ بلاشبہ (مقررہ) وقت آنے والا ہے۔ میں اُسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں۔ تاکہ (لوگوں کے یقین و عمل کی آزمائش ہو جائے، اور) جس شخص کی جیسی کچھ کوشش ہو، اُسی کے مطابق بدلہ پائے"۔ ۱۵

"پس دیکھ! ایسا نہ ہو کہ جو لوگ اس وقت کے ظہور پر یقین نہ رکھتے ہوں اور اپنی خواہش کے بندے ہوں، وہ تجھے بھی (قدم بڑھانے سے) روک دیں، اور نتیجہ یہ نکلے کہ تو تباہ ہو جائے!" ۱۶

"اور (صدائے غیبی نے پوچھا:) اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟" ۱۷

عرض کیا "میری لاٹھی ہے۔ چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا

(۲) آیت (۹) میں فرمایا کیا حضرت موسیٰ کی سرگزشت پر تم نے غور نہیں کیا! ان کی پوری سرگزشت کس طرح اس حقیقت کی مجسم شہادت ہے!

پھر حضرت موسیٰ کی ابتدائی زندگی کا وہ واقعہ بیان کیا ہے جب وہ مدین کی بستی میں مقیم تھے، اور اپنے خسر کا گلہ چرایا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں اُن کا گزر سینا کے قرب و جوار میں ہوا، اور وہیں یہ معاملہ پیش آیا۔ تورات میں اس جگہ کو "حورب" کہا ہے۔ یہ سینا کا مشرقی گوشہ تھا۔

تورات میں ہے کہ انہوں نے درخت میں آگ دیکھی اور متعجب ہو کر قریب گئے (خروج ۳:۲) لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے محض رفع تعجب کے لیے نہیں گئے تھے بلکہ آگ کی جستجو میں تھے۔ سورۂ نمل کی آیت (۷) سے مزید وضاحت ہو گئی ہے۔ وہ مع اہل و عیال کے بیابان میں تھے۔ رات ٹھنڈی تھی، اور سوچ رہے تھے کہیں سے آگ مل جائے تو تاپنے کے لیے الاؤ جلائیں۔ اتنے میں دور پر ایک روشنی آگ کی طرح نظر آئی۔ یہ سمجھے وہ آگ ہے لیکن جب قریب پہنچے تو کار فرمائے قدرت نے پکارا "اے موسیٰ! تو اس آگ کی چنگاری نے کر کیا کرے گا، تیرے ہاتھوں ایک دوسری ہی آگ روشن ہونے والی! انا اخترتک فاستمع لما یوحیٰ۔"

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن!
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسے!

(۳) جوتی اُتار دینے کا حکم اس لیے ہوا کہ تعظیم کی جگہ ننگے پاؤں ہو جانا قدیم اور عام رسم تھی۔ چنانچہ بابل اور مصر میں بادشاہ کے حضور برہنہ پا ہو کر آتے تھے۔ تورات میں بھی اس حکم کا ذکر ہے۔ (خروج ۳:۶)

(۴) آیت (۱۵) میں "الساعۃ" سے مقصود روزِ قیامت نہیں ہے جیسا کہ مفسروں نے سمجھا ہے، بلکہ وہ وقت ہے جو بنی اسرائیل کی نجات

وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ○ قَالَ أَلْقِهَا يَا مُوسَىٰ ○ فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ○ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۱۸-۱۹-۲۰
سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ○ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً ۲۱
أُخْرَىٰ ○ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ○ اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ○ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي
صَدْرِي ○ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ○ يَفْقَهُوا قَوْلِي ○ وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا ۲۵-۲۶ ۲۷-۲۸
مِنْ أَهْلِي ○ هَارُونَ أَخِي ○ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ○ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ○ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ○ وَ ۲۹-۳۰ ۳۱-۳۲-۳۳
نَذْكُرَكَ كَثِيرًا ○ إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيرًا ○ ۳۴-۳۵

۱۸ ہوں۔ میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں"۔¹

۱۹ حکم ہوا "اے موسیٰ! اسے ڈال دے"

۲۰ موسیٰ نے ڈال دیا، اور کیا دیکھتا ہے، ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے!

۲۱ حکم ہوا "اسے اب پکڑ لے۔ خوف نہ کھا۔ ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کیے دیتے ہیں"

۲۲ اور (نیز حکم ہوا) "اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ، اور پھر نکال بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو، چمکتا ہوا نکلیگا۔ یہ (تیرے لیے) دوسری نشانی ہوئی (اور یہ دونوں نشانیاں اس لیے (دی گئی ہیں) کہ آیندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی

۲۳ نشانیاں دکھائیں"

۲۴ (نیز حکم ہوا) "اے موسیٰ! تو فرعون (یعنے بادشاہ مصر) کی طرف جا۔ وہ بڑا سرکش ہوگیا ہے"

۲۵ موسیٰ نے عرض کیا "اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے (کہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کے لیے مستعد ہوجاؤں)

۲۶ میرا کام میرے لیے آسان کردے (کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آسکے) میری زبان کی گرہ کھول دے کہ

۲۷-۲۸ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہوجائے، اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے نیز میرے گھر

۲۹-۳۰-۳۱ والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنادے۔ اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہوجائے۔ وہ

۳۲-۳۳ میرے کام میں میرا شریک ہو۔ ہم (دونوں یک دل ہوکر) تیری پاکی اور بڑائی کا بہ کثرت اعلان کریں تیری یاد میں

۳۴-۳۵ زیادہ سے زیادہ لگے رہیں۔ اور بلاشبہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے (ہم سے کسی حال میں غافل نہیں)

اور فرعون کی شکست کے لیے ظہور میں آنے والا تھا چنانچہ سیاق و سباق صاف اس کی شہادت دے رہا ہے۔

(۵) مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل کے اخلاق و عواطف بالکل پژمردہ کردیے تھے۔ عزم و ہمت کا کوئی ولولہ ان میں باقی نہیں رہا تھا جب حضرت موسیٰ نے فتح و اقبال کے آنے والے وقت کی بشارت سنائی تو اکثروں کو یقین نہیں آیا۔ چونکہ یہ بات علم الٰہی میں تھی، اس لیے یہاں آیت (۱۶) میں پہلے سے خبردار کردیا کہ کہیں ایسا نہ ہو، ایسے لوگوں کی محرومیاں تمہیں بھی اقدام عمل سے روک دیں۔

(۶) لاٹھی کے سانپ بننے، ہتھیلی کے چمک اٹھنے اور ہارونؑ کے وزیر و شریک ہونے کا ذکر تورات میں بھی ہے (خروج ۴) نیز یہ کہ فرمایا "اب تو جا میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں (خروج ۳: ۱۰) "رب اشرح لی صدری" کی تشریح سورۂ الم نشرح میں ملیگی۔

¹ و للّٰہ درّ ما قال: لذیذ بود حکایت دراز ترگفتم ☆ چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور!

قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يٰمُوسٰى ۝ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰى ۝ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلٰى أُمِّكَ مَا يُوحٰى ۝ (۳۶-۳۷-۳۸)
أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۚ
وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِي ۝ إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ (۳۹)
يَكْفُلُهُ ۖ فَرَجَعْنٰكَ إِلٰى أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ
فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يٰمُوسٰى ۝ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۝ (۴۰-۴۱)
اذْهَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِآيٰتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي ۝ (۴۲)

(۳۶) ارشاد ہوا "اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی۔ اور (تجھے معلوم ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ کیسا احسان کر چکے ہیں؟ ہم تجھے بتاتے ہیں، اُس وقت کیا ہوا تھا، (۳۷-۳۸) جب ہم نے تیری ماں کے دل میں بات ڈال دی تھی ہم نے اُسے سمجھایا تھا کہ بچے کو ایک صندوق میں ڈال دے، اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے۔ دریا اُسے کنارے پر دھکیل دیگا۔ پھر اسے وہ اُٹھا لیگا جو میرا (یعنے میری قوم کا) دشمن ہے۔ نیز اس بچہ کا بھی دشمن۔ اور (اے موسیٰ!) ہم نے اپنے فضلِ خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا (کہ اجنبی بھی تجھ سے محبت کرنے لگے) اور یہ اس لیے تھا کہ ہم چاہتے تھے، تو ہماری نگرانی میں پرورش پائے۔ (۳۹) تیری بہن جب وہاں سے گزری، تو (یہ ہماری ہی کارفرمائی تھی کہ اُس نے فرعون کی لڑکی سے) کہا میں تمہیں ایسی عورت بتلا دوں جو اسے پالے پوسے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچے کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔ پھر دیکھ! ایسا ہوا کہ تو نے (مصر میں) ایک آدمی مار ڈالا۔ ہم نے تجھے اس معاملہ کے غم سے نجات دی، اور تجھے ہر طرح کی حالتوں میں ڈال کر آزمایا۔ پھر تو کئی برس تک مدین کے لوگوں میں رہا۔ بالآخر (وہ وقت آگیا) کہ اے موسیٰ! تو (۴۰) (مقررہ) اندازہ پر پورا اُتر آیا"

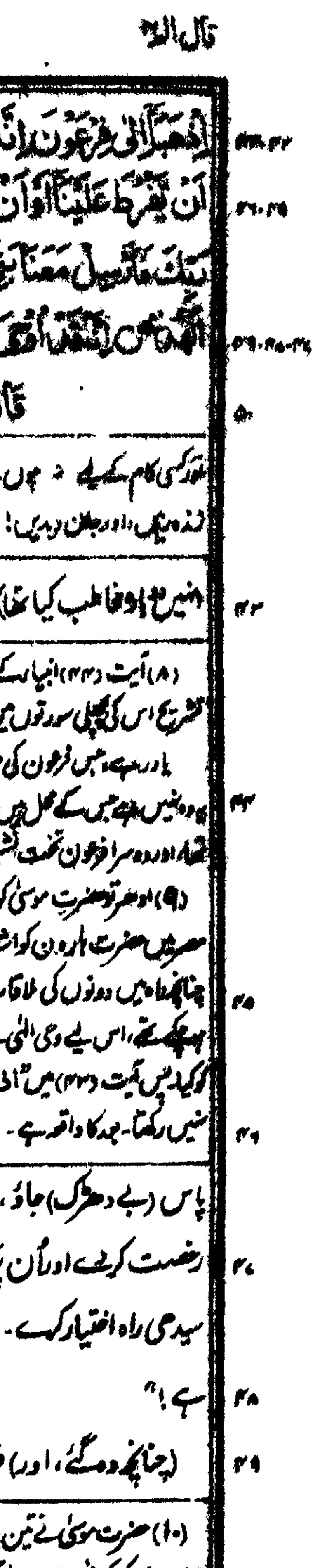
(۴۱) "اور (دیکھ اس طرح) میں نے تجھے اپنے لیے (یعنے اپنے خاص کام کے لیے) بنایا اور تیار کیا ہے۔ اب تو اور تیرا بھائی دونوں میری نشانیاں لیکر جائیں اور میری یاد میں کوتاہی (۴۲) نہ کریں"

(۱۱) حضرت موسیٰ کو اُن کی پیدایش کا واقعہ اس لیے یاد دلایا گیا کہ انہیں معلوم ہو جائے مشیتِ الٰہی کا ہاتھ اول دن سے انہیں چُن چکا ہے، اور ایسے عجیب و غریب حالات میں اُنکی پرورش ہوئی ہے، جو بغیر قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ظہور میں نہیں آسکتے۔ پھر اُن کا مصر سے نکلنے پر مجبور ہونا اور مدین کے بیابانوں میں صحرا کی زندگی بسر کرنا بھی اسی لیے تھا کہ پیش آنے والے معاملہ کے لیے ان ساری باتوں کی ضرورت تھی۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور شخصیت طیار ہو گئی، تو پردۂ غیب چاک ہوا، اور ندائے حق نے نمودار ہو کر کام پر لگا دیا۔ چنانچہ اسی لیے فرمایا وفتنٰك فتونا ہم نے تجھے ہر طرح کی حالتوں میں ڈال کر آزمایا۔ ثم جئت علی قدر یا موسیٰ (۴۰) پھر بالآخر تم اُس اندازہ پر ٹھیک اُتر آئے جو تمہاری تکمیل کے لیے ٹھہرا دیا گیا تھا۔

اس کے بعد فرمایا۔ واصطنعتك لنفسی۔ میں نے تجھے اپنے لیے بنایا اور تیار کیا۔ "اپنے لیے" یعنے اپنے کام کے لیے۔ کائنات کی ہر چیز اللہ ہی کے لیے بنی ہے، لیکن جن انسانوں کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ اُس کی سچائی اور عدالت کے قیام کا ذریعہ ہوں، انہیں وہ خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور یہ اللہ کی عام اصطلاح ہے۔ گویا قدرت انہیں اس لیے بنانی ہے کہ

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ قَالَ فَمَا بَالُ

۴۳-۴۴ ، ۴۵-۴۶ ، ۴۷-۴۸-۴۹ ، ۵۰



اور کسی کام کے لیے نہ ہوں، صرف اسی ایک کام کے لیے پیدا ہوں، زندہ رہیں، اور جان دے دیں!

(۸) آیت (۴۴) انبیاء کے طریق دعوت کی اصل الاصول ہے۔ تشریح اس کی پچھلی سورتوں میں گزر چکی۔

یاد رہے، جس فرعون کی طرف اب حضرت موسیٰ جا رہے ہیں، یہ وہ نہیں ہے جس کے محل میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ وہ مر چکا تھا اور دوسرا فرعون تخت نشین ہو چکا تھا۔

(۹) ادھر تو حضرت موسیٰ کو یہ حکم ہوا، اور مصر کی طرف چلے، ادھر مصر میں حضرت ہارون کو اشارۂ غیبی ہوا کہ موسیٰ کی جستجو میں نکلیں۔ چنانچہ راہ میں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ اب چونکہ دونوں یک جا ہو چکے تھے، اس لیے وحی الٰہی نے دوسری مرتبہ مخاطب کیا تو خطاب دونوں کو کیا۔ پس آیت (۴۳) میں "اذھبا" کا خطاب پہلے واقعہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ بعد کا واقعہ ہے۔

(۱۰) حضرت موسیٰ نے تین چار لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا، کیا اس سے زیادہ دنیا کی کوئی زبان خدا کے بارے میں کچھ کہہ سکتی ہے؟ "پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کا وجود بخشا اور پھر اس کی زندگی و بقا کے لیے جن جن باتوں کی ضرورت تھی ان سب کی راہ انہیں دکھا دی" یعنے ایسا وجدان، ایسے حواس، ایسی معنوی قوتیں دے دیں جو

۴۳ "ہاں، تم دونوں (یعنے موسیٰ اور ہارون، کیونکہ اب دونوں اکٹھے ہو گئے تھے، اور مصر کے قریب وحی الٰہی نے انہیں (یوں) مخاطب کیا تھا) فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ سرکشی میں بہت بڑھ چلا ہے۔ پھر جب اس کے پاس پہنچو تو

۴۴ (سختی کے ساتھ پیش نہ آنا) نرمی سے بات کرنا (تمہیں کیا معلوم؟) ہو سکتا ہے کہ نصیحت پکڑ لے، یا (عواقب سے) ڈر جائے"

۴۵ دونوں نے عرض کیا "پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے، فرعون ہماری مخالفت میں جلدی نہ کرے، یا سرکشی سے پیش آئے"

۴۶ ارشاد ہوا "کچھ اندیشہ نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میں سب کچھ سنتا ہوں۔ سب کچھ دیکھتا ہوں! تم اس کے پاس (بے دھڑک) جاؤ، اور کہو۔ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ

۴۷ رخصت کر دے اور ان پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آ گئے۔ اس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔ جو کوئی جھٹلائے اور سرتابی کرے، تو ہم پر وحی اتر چکی اس کے لیے عذاب کا پیام

۴۸ ہے!"

۴۹ (چنانچہ وہ گئے، اور) فرعون نے پوچھا "اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟"

۵۰ موسیٰ نے کہا "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی، پھر اس پر (زندگی و عمل کی) راہ کھول دی"

فرعون نے کہا "پھر ان کا کیا حال ہونا ہے جو پچھلے زمانوں

الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ○ قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى ○ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ
الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ
شَتَّىٰ ○ كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ع ○ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ
وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ○ وَلَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ○ قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ
أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ○ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ
وَلَا أَنتَ مَكَانًا سُوًى ○

میں گزر چکے ہیں؟" یعنے انہیں تو تمہارے اس پروردگار کی خبر بھی نہ تھی

موسیٰ نے کہا "اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے۔ یا بھول میں پڑ جائے"

"وہ پروردگار جس نے تمہارے لیے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی، نقل و حرکت کے لیے اس میں راہیں نکال دیں، آسمان سے پانی برسایا، اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیے۔ خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ۔ اس بات میں عقل والوں کے لیے کیسی کھلی نشانیاں ہیں؟ اُس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں لوٹاتا ہے، اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اُٹھائے جاؤ گے"

اُن کی راہنمائی کرتی ہیں: من نطفۃ خلقہ، فقدرہ ثم السبیل یسرہ (۸۰: ۱۹) الذی خلق فسوی، والذی قدر فھدی (۸۷: ۲) مزید تشریح کے لیے دیکھو تفسیر فاتحہ۔

(۱۱) پھر اُن کا کیا حال ہونا ہے جو پچھلے زمانوں میں گزر چکے ہیں؟" (۵۱) یعنے اگر پروردگارِ عالم وہی ہے جس کا تم نام لے رہے ہو، تو یہ بات پہلوں نے کیوں نہ کہی؟ کیا وہ سب گمراہی میں پڑے؟ "علمھا عند ربی فی کتاب" حضرت موسیٰ نے کہا "مجھے کیا معلوم اُن کا کیا حال تھا، اور انہیں کیا پیش آئیگا؟ اور تمہیں اس کی فکر کیوں ہو؟ اس کا علم اللہ کے نوشتہ میں ہے ہر فرد اور ہر گروہ اپنی حالت کے مطابق اپنا نتیجہ پائیگا۔ ہم اپنی فکر کریں۔ پہلوں کی فکر میں کیوں پڑیں؟۔ لھا ماکسبت ولکم ما کسبتم، ولا تسئلون عما کانوا یعملون! (۲: ۱۳۴)

اس مکالمہ سے اندازہ کرو کہ انبیاء کا طریق موعظت، مجادلہ و مناظرہ کے طریقے سے کس درجہ مختلف ہے!

اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے فرعون کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں، مگر اس پر بھی اُس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ اُس نے کہا "اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال باہر کرے؟ اچھا ہم بھی اسی طرح کے جادو کا کرتب تجھے لا دکھائینگے ہمارے اور اپنے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) مقرر کردے۔ نہ تو ہم اُس سے پھریں نہ تو۔ دونوں کی جگہ برابر ہو[1]"

[1] اصل میں "مکانا سوی" ہے۔ اس کا ترجمہ مفسروں نے ہموار جگہ کیا ہے، لیکن اسلوب کلام اس ترجمہ کے حق میں ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ قال سیبویہ یقال سوی و سوی، ای عدل۔ یعنے عدلا بین المکانین۔ قال زہیر:

اروناخطۃ لاضیم فیھا   یسوی بیننا فیھا السواء

ع ۷۶ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَلَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ

۷۷ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِیَهُمْ

۷۸-۷۹ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ قَدْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ

۸۰ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

۸۱ وَلَا تَطْغَوْا فِیْهِ فَیَحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبِیْ ۚ وَمَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْهِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰى ۝ وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ

۸۲-۸۳ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝ وَمَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ

---

۷۶ کی تصدیق کی ہے، اور واضح کیا ہے کہ عذابِ اُخروی اُنہی کے لیے ہے جو زندگی میں مجرم ہے۔ جو ایمان لے آئے اور نیک عمل اختیار کر لی، تو اُن کے لیے درجوں کی بلندی اور روحانی زندگی کی کامرانیاں ہوں گی۔

اس میں اشارہ ہے کہ سحرۂ فرعون کا اللہ کے حضور بڑا درجہ ہوا۔ کیونکہ انہوں نے قبولیتِ حق کی استعداد اور اُس کی استقامت دونوں کا ثبوت دیدیا۔ اُن کا کفر ساری زندگی کا کفر تھا، اور ایمان صرف چند لمحوں کا ایمان، لیکن چند لمحوں کے ایمان نے عمر بھر کا کفر محو کر دیا۔ اُنکا دل صدیقوں کا دل، اور اُنکی صدا شہدا حق کی صدا ہوگئی۔ مصری شہنشاہی کا سارا قہر و جلال ایک پل کے لیے بھی ان کی استقامتِ ایمانی پر غالب نہ آسکا!

ہر طرح کی آلودگیوں سے) پاک رہا!

اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا۔ پھر سمندر میں ان کے گزرنے کے لیے خشکی کی راہ نکال لے۔ نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا، نہ اور کسی طرح کا خطرہ۔

۷۷ پھر (جب موسیٰ اپنی قوم کو لیکر نکل گیا، تو) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ اُس کا پیچھا کیا۔ پس پانی کا ریلا جیسا کچھ اُن پر چھانے والا تھا، چھا گیا (یعنے جو کچھ اُن پر گذرنی تھی، گزر گئی) اور فرعون نے اپنی قوم پر راہ (نجات) گم کر دی۔ اُنھیں سیدھی راہ نہیں دکھائی!

۷۸-۷۹ اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہارے دشمن سے تمہیں نجات بخشی۔ تم سے (برکتوں اور کامرانیوں کا) وعدہ کیا جو کوہِ طور کے دہنی جانب ظہور میں آیا تھا۔ تمہارے لیے (صحرائے سینا میں) "من" اور "سلویٰ" مہیا کر دیا۔ تمہیں کہا گیا، پاک غذا مہیا کر دی گئی ہے۔ شوق سے کھاؤ مگر اس بارے میں سرکشی نہ کرو۔ کروگے تو میرا غضب نازل ہو جائیگا، اور جس پر میرا غضب نازل ہوا تو بس وہ (ہلاکت میں) گرا!

۸۰-۸۱ اور (میں نے کہا) جو کوئی توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل ہو، تو میں یقیناً اُس کے لیے بڑا ہی بخشنے والا ہوں!

۸۲ (۱۵) آیت (۷۷) اور (۷۸) حضرت موسیٰ اور فرعون کے معاملہ کا خلاصہ و ماحصل ہے۔ اس کے بعد اُن حالات کی طرف اشارہ کیا ہے جو مصر سے خروج کے بعد دشتِ سینا میں پیش آئے تھے، اور آیت (۸۳) سے سامری کا واقعہ شروع ہوتا ہے۔

پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے کہ جب حضرت موسیٰ طور پر معتکف

۸۳ اور (جب موسیٰ طور پر حاضر ہوا، تو ہم نے پوچھا) "اے موسیٰ! کس بات نے تجھے جلدی پر اُبھارا اور تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا؟"

موسیٰ نے عرض کیا "وہ مجھ سے دور نہیں۔ میرے

عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ۝ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۬

۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷

ہونے کے لیے گئے، تو قوم کو حضرت ہارون کی نگرانی میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں سامری کا فتنہ ظہور میں آیا۔ یہاں آیت (۸۵) میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت موسیٰ جب قوم کو پیچھے چھوڑ کر کوہ پر پہنچ گئے، تو وحی الٰہی نے انہیں مخاطب کیا "کس بات نے تجھے قوم کی طرف سے اس درجہ مطمئن کر دیا کہ فوراً انہیں چھوڑ کر چلا آیا؟" حضرت موسیٰ جو پیش آنے والے واقعے سے بے خبر تھے بولے میں نے مقررہ وقت پر آنے میں جلدی کی کہ تو رضامند ہو، اور قوم میرے نقش قدم پر چل رہی ہے۔" فرمایا "ہاں، مگر قوم کا یہ حال ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں گمراہ ہو گئی۔"

نقش قدم پر ہیں۔ اور اے پروردگار! میں نے تیرے حضور آنے میں جلدی کی کہ تو خوش ہو" ۸۴

فرمایا "مگر ہم نے تیرے پیچھے تیری قوم کی (استقامت کی) آزمایش کی، اور سامری نے اُسے گمراہ کر دیا ہے" ۸۵

پس موسیٰ خشمناک اور افسوس کرتا ہوا قوم کی طرف لوٹا۔ اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! (یہ تم نے کیا کیا؟) کیا تم سے تمہارے پروردگار نے ایک بڑی بھلائی کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ پھر کیا ایسا ہوا کہ تم پر بڑی مدت گزر گئی (اور تم اسے یاد نہ رکھ سکے؟) یا یہ بات ہے کہ تم نے چاہا، تمہارے پروردگار کا غضب تم پر آنازل ہو، اور اس لیے تم نے مجھ سے ٹھہرائی ہوئی بات توڑ ڈالی؟" ۸۶

اُنہوں نے کہا "ہم نے خود اپنی خواہش سے عہد شکنی نہیں کی، بلکہ (ایک دوسرا ہی معاملہ پیش آیا۔ مصری) قوم کی زیب و زینت کی چیزوں کا ہم پر بوجھ پڑا تھا (یعنے بھاری بھاری زیوروں کا جو مصر میں پہنے جاتے تھے۔ ہم اس بوجھ کے رکھنے کے خواہشمند نہ تھے) وہ ہم نے پھینک دیا" (بس ہمارا اتنا ہی قصور ہے)

(۱۶) آیت (۸۷) میں "فقذفناھا" تک لوگوں کا جواب ہے۔ اُس کے بعد "فکذلک" سے قرآن واقعہ کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ یہ لوگوں کے جواب کا ٹکڑا نہیں۔ صرف اتنی سی بات پر غور نہ کرنے کی وجہ سے مفسروں اور مترجموں نے اس مقام کا پورا مطلب غلط کر دیا، اور اسلوب کلام کی بھی ساری کل بگڑ گئی۔ اب ہم نے جس طرح ترجمہ کیا ہے، اُس پر غور کرو۔ مصری گردن اور سر پر سونے کے بھاری

چنانچہ اس طرح (جب سونا فراہم ہو گیا تو) سامری نے اُسے (آگ میں) ڈالا، اور اُن کے لیے ایک (سنہرا بچھڑا بنا کر) نکال لایا۔ محض ایک بیجان دھڑ، جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی! ۸۷

لوگ یہ دیکھ کر بول اُٹھے "یہ ہے ہمارا معبود، اور موسیٰ کا

ھ جب لوگ آپس میں باتیں کرتے ہیں، تو اردو محاورہ یہ ہے کہ کہتے ہیں "ہمیں ایسا کرنا چاہیے" اور "ہمارا ایسا حال ہو رہا ہے" لیکن عربی میں اس موقع پر "ہم" نہیں بلکہ "تم" کہیں گے۔ مثلاً "آپس میں لوگوں نے کہا تمہیں ایسا کرنا چاہیے"۔ چنانچہ برادران یوسف نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے کہا تھا "اقتلوا یوسف" اور "تکونوا من بعدہ قوما صالحین" (۹) "آؤ یوسف کو مار ڈالیں۔ اس کے بعد ہماری ساری الجھنیں سلجھ جائیں گی۔" اسی طرح اسی سورت کی آیت (۶۳) میں بھی اردو کے محل تکلم کی جگہ ضمیر خطاب جا بجا آگئی ہے۔ یہاں بھی اصل میں "الا ھکم" (بقیہ برصفحہ)

رکوع ۱۴ — ۸۸-۸۹

فَنَسِيَ ۝ أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۝ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ

۹۰ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ۝ قَالُوا لَن نَّبْرَحَ

۹۱-۹۲ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ۝ قَالَ يَا هَارُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۝ أَلَّا تَتَّبِعَنِ

۹۳ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ۝ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ

۹۴-۹۵ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ۝ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ ۝ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ

---

۸۸ بھی، مگر وہ بھول میں پڑ گیا۔

۸۹ (افسوس اُن کی سمجھ پر!) کیا اُنہیں یہ (موٹی سی) بات بھی دکھائی نہ دی کہ بچھڑا (آواز تو نکالتا ہے مگر) اُن کی بات کا جواب نہیں دے سکتا، اور نہ اُنہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان!

۹۰ اور ہارون نے اس سے پہلے اُنہیں (صاف صاف) جتا دیا تھا "بھائیو! یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمہاری (استقامت کی) آزمائش ہو رہی ہے۔ تمہارا پروردگار تو خدائے رحمان ہے۔ دیکھو! میری پیروی کرو اور میرے کہے سے باہر نہ ہو" مگر اُنہوں نے جواب دیا تھا "جب تک موسیٰ ہمارے پاس واپس نہ آجائے ہم اس کی پرستش

۹۱ پر جمے ہی رہیں گے"

(بہرحال) موسیٰ نے (اب ہارون سے) کہا "اے ہارون! جب تو نے دیکھا، یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں"

۹۲-۹۳ تو کیا بات ہوئی کہ اُنہیں روکا نہیں؟ کیا تو نے پسند کیا کہ میرے حکم سے باہر ہو جائے؟"

ہارون بولا "اے میرے عزیز بھائی! میری ڈاڑھی اور سر کے بال نہ نوچ (میں نے اگر سختی میں کمی کی، تو صرف اس خیال سے کہ) میں ڈرا، کہیں تم یہ نہ کہو۔ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے حکم کی

۹۴ راہ نہ دیکھی"

۹۵ تب موسیٰ نے (سامری سے) کہا "سامری! یہ تیرا کیا حال ہوا؟"

کہا "میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی۔ اس لیے (اللہ کے) رسول کی پیروی میں میں نے

بھاری زیور پہنتے تھے۔ یہودیوں نے بھی اختیار کر لیے تھے، اور جب نکلے تو پہنے ہوئے نکلے۔ اُنہی کو گلا کر سامری نے بچھڑا بنایا تھا۔ اب جب حضرت موسیٰ نے پرستش کی تو لوگوں نے اپنا بچاؤ یہ کہہ کر کرنا چاہا کہ ہمارا تو کچھ قصور نہیں۔ مصری زیوروں کا بڑا بوجھ ہمارے سروں پر پڑا تھا۔ ہم نے چاہا اُسے پھینک دیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ سامری اس سے ایک عجیب و غریب چیز بنا کر ہمیں گمراہ کر دیگا۔

قرآن کہتا ہے ہوا تھا ایسا ہی۔ اُنہوں نے اپنا سب زیور اُتار دیا، اور سامری نے اُسے گلا کر بچھڑا بنا لیا۔

(۷۱) جب حضرت موسیٰ نے سامری سے پوچھا۔ تو دینِ حق سے کیوں پھر گیا؟ تو اُس نے کہا میں نے اللہ کے رسول کی دینے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۵۵) تھا ہم نے وضاحت کے لیے اُردو محاورہ کی رعایت کی اور "ہمارا" ترجمہ کیا۔ اتنی سی بات کی عدم وضاحت نے مترجموں کو بے شمار شکلوں میں ڈال دیا ہے۔

قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۝ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ ۹۶
اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ
لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۝ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ كَذٰلِكَ ۹۷-۹۸
نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۝ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ ۹۹
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَاۗءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۝ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ ۱۰۰-۱۰۱
يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۝ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ ۱۰۲-۱۰۳

بھی کچھ حصہ لیا تھا۔ پھر چھوڑ دیا۔ (کیا کہوں) میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سجھائی" ۹۶

موسیٰ نے کہا "اگر ایسا ہے تو پھر جا۔ زندگی میں تیرے لیے یہ ہونا ہے کہ کہے۔ میں اچھوت ہوں۔ اور (آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں۔ اور دیکھ تیرے (گڑھے ہوئے) معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے جس کی پوجا پر جم کو بیٹھ رہا تھا۔ ہم اُسے جلا کر راکھ کر دینگے، اور راکھ سمندر میں اُڑا کر بہا دینگے۔ معبود تو تمہارا ۹۷
بس اللہ ہی ہے۔ اُس کے سوا کوئی نہیں۔ وہی ہے جو ہر چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے!" ۹۸

آپ کی) ایک حد تک پیروی کی۔ کیونکہ جو بات میری قوم کے دوسرے آدمی نہ پاسکے تھے، میں نے پالی تھی۔ مگر پھر میں نے آپ کا طریقہ چھوڑ دیا۔ میری طبیعت کے بے اختیارانہ ولولے نے مجھے اس کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ کیونکہ میرا آبائی طریق عبادت یہی ہے۔
اس پر حضرت موسیٰ نے اُسے جماعت سے باہر کر دیا، اور حکم دیا کوئی اُس سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھے۔ "ان تقول لامساس" (۹۰) کا مطلب ہے کہ لوگ تجھ سے اس درجہ نفرت کرنے لگینگے کہ تیری چھوت سے بھاگینگے۔ تو "لامساس" یعنے اچھوت ہو جائیگا۔ کہتا پھریگا مجھ کوئی نہ چھوئے۔

(اے پیغمبر!) اس طرح ہم گزری ہوئی سرگزشتوں میں سے (خاص خاص واقعات کی) خبریں تجھے سُناتے ہیں۔ اور بلاشبہ ہم نے اپنے پاس سے تجھے ایک سرمایۂ نصیحت عطا فرما دیا ہے (یعنے قرآن) تو جس کسی نے اس سے ۹۹
رُخ پھیرا، یقیناً وہ قیامت کے دن ایک (بہت بڑے جرم کا) بوجھ اُٹھائے ہوگا، اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیگا۔ ۱۰۰
کیا ہی بُرا بوجھ ہے جو یہ قیامت کے دن اپنے اوپر لادے ہونگے! ۱۰۱

(۱۸) آیت (۹۸) پر سرگزشت ختم ہو گئی ہے، اور اس کے بعد سلسلۂ بیان منکرین دعوت کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ فرمایا جس طرح حضرت موسیٰ پر ہدایت وحی اُتری تھی، اُسی طرح ہم نے تجھے بھی ایک سرمایۂ نصیحت یعنے قرآن عطا فرمایا ہے، اور اس کے منکروں کے لیے بھی وہی ہونا ہے، جو پہلے ہو چکا ہے۔

وہ دن کہ نرسنگھا پھونکا جائیگا، ہم مجرموں کو جمع کرینگے، اور اُن کی آنکھیں مارے دہشت کے بے نور ہونگی۔ ۱۰۲
وہ آپس میں چپکے چپکے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہونگے "ہم (اس حالت میں، یعنے پہلی اور دوسری زندگی کی درمیانی حالت میں) ہفتہ عشرہ سے زیادہ کیا رہے ہونگے؟" ۱۰۳
یہ (اُس دن) جیسی جیسی باتیں کرینگے، ہم اس سے

(۱۹) لوگوں کو اکٹھا کرنے کا پرانا دستور یہ چلا آتا ہے کہ نرسنگھا پھونکا کرتے ہیں۔ آشوریوں، مصریوں، ہندوستانیوں، ایرانیوں، چینیوں، سب میں یہ طریقہ پایا گیا ہے، اسی لیے نرسنگھا پھونکنے کا مطلب یہ ہو گیا کہ جمع ہونے کی پکار بلند ہوئی۔ تورات اور انجیل کی یہ عام اصطلاح ہے، اور قرآن نے بھی جا بجا "نفخ فی الصور" کی ترکیب استعمال کی ہے۔

رکوع ۶

يَقُولُ أَمْثَلُهُمْ طَرِيقَةً إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا ۝ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۝
فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۚ وَ ۱۰۵-۱۰۷
خَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ۝ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ ۱۰۸
الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ۝ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ ۱۰۹-۱۱۰
لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا

(۲۰) آیت (۱۰۳) کا وہی مطلب ہے جو پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ آدمی سو کر اُٹھتا ہے تو نہیں جانتا کتنی دیر سویا۔ یہی حال دوسری زندگی میں ہوگا۔ انسان اپنی پچھلی زندگی یاد کریگا، تو ایسا معلوم ہوگا، جیسے چند دن پہلے کی بات ہو۔ ایک کہیگا ہفتہ عشرہ کی بات ہے، دوسرا جو اندازہ لگانے میں زیادہ تیز ہوگا، کہیگا، نہیں صرف ایک دن کی بات! دوسری جگہ اس سے بھی کم اندازہ کی تعبیر آئی ہے: عشیۃ او ضحاھا۔

۱۰۴ بے خبر نہیں۔ اِن میں جو سب سے بہتر سُراغ پر ہوگا وہ بول اُٹھیگا "نہیں ہم بہت رہے ہونگے تو بس ایک دن"[۲۰] (اس سے زیادہ یہ مدت نہیں ہو سکتی)

اور یہ پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ ان کا حال کیا ہوگا) تو کہدے "میرا پروردگار (ریزہ ریزہ کرکے) بالکل اُڑا دیگا۔ پھر انہیں ایسا کر دیگا، جیسے صاف ہموار میدان ہو جائے۔ کہیں تم کجی نہ پاؤ اور نہ اونچ نیچ۔ ۱۰۵-۱۰۷

(۲۱) آیت (۱۰۸) میں قیامت کے منظر کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، اس کا سارا زور مترجموں نے ضائع کر دیا۔ ایک میدان میں بے شمار آدمی چل رہے ہوں، مگر سب کے ہوش اُڑے ہوئے ہوں اور سب کی زبانیں ہیبت نے گونگی کر دی ہوں، تو اس منظر کا کیا حال ہوگا؟ ایک دہشت انگیز سناٹا، جس میں قدموں کی آہٹ کے سوا اور کوئی آواز محسوس نہ ہوگی، اور یہ آواز بھی زندگی کی خوشگواری پیدا نہیں کریگی بلکہ منظر کی دہشت میں اور اضافہ کر دیگی۔

۱۰۸ اُس دن سب پکارنے والے کے پیچھے ہونگے۔ اس سے منحرف نہ ہو سکینگے۔ اور خدائے رحمان کے جلال کے آگے سب کی آوازیں خاموش[۱] ہو جائینگی۔ اس سناٹے میں کوئی آواز سُنائی نہیں دیگی مگر صرف قدموں کی آہٹ![۲][۲۱]

اُس دن سفارشیں کچھ کام نہ دینگی۔ مگر ہاں جس کو خدائے رحمان اجازت دے، اور اُس کا زبان کھولنا ۱۰۹ پسند فرمائے!

جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے، اور جو کچھ ان کے پیچھے گزر چکا، سب کا وہ علم رکھتا ہے۔ مگر انسان اپنے علم سے ۱۱۰ اُس پر چھا نہیں سکتا!

۱۱۱ اس حیّ و قیوم کے آگے سب کے سر جھک گئے۔ جس نے ظلم کا بوجھ لاد لیا تھا، دیکھو وہ نامراد ہوا!

اور (ہاں) جس کے عمل اچھے ہوئے اور وہ مومن بھی ہے، تو اُس کے لیے کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ نہ تو ناانصافی

۱ "خشعت" ای سکنت۔ ومنہ قول الشاعر: لما أتی خبر الزبیر تواضعت سور المدینۃ والجبال الخشع۔
۲ "الہمس" صوت نقل الاقدام۔ یقال للاسد الہموس۔ لانہ یہمس فی الظلمۃ۔ قال رؤبۃ یصف نفسہ:
لیث یدق الاسد الہموسا　　ولا یہاب الفیل والجاموسا

وَلَا هَضْمًا ۝ وَكَذٰلِكَ أَنزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِن قَبْلِ أَن يُقْضٰى إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۖ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۝ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلٰى اٰدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبٰى ۝ فَقُلْنَا يٰاٰدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ

ہوگی، نہ حق تلفی! (۱۱۲)

(۱۱۳) اور (دیکھو) اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے اس (سرمایۂ نصیحت) کو قرآن عربی کی شکل میں اُتارا، اور مختلف طریقوں سے اُس میں (انکار و بدعملی کی) پاداش کی خبر دیدی، تاکہ لوگ (گمراہی سے) بچیں، یا پھر ایسا ہو کہ نصیحت پذیری کی روشنی ان میں نمودار ہو جائے!

(۱۱۴) پس ہر طرح کی بلندی اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہی حاکم حقیقی ہے!

اور (اے پیغمبر!) جب تک قرآن کی وحی تجھ پر پوری نہ ہو جائے، تو اس میں جلدی نہ کر۔ تیری پکار یہ ہو کہ "پروردگار! میرا علم اور زیادہ کر!"

(۱۱۵) اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آدم کو پہلے سے جتا کر عہد لیا تھا، پھر وہ بھول گیا، اور ہم نے (نافرمانی کا) قصد اس میں نہیں پایا تھا۔

(۱۱۶) اور (پھر) وہ معاملہ یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے آگے جھک جاؤ" سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا۔ اُس نے انکار کیا۔

(۱۱۷-۱۱۸) اس پر ہم نے کہا "اے آدم! (دیکھ لے) یہ (ابلیس) تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو، یہ تمہیں جنت کو نکال کے رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لیے اب ایسی زندگی ہے کہ نہ تو اس میں بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ۔ نہ تمہارے لیے پیاس کی جلن ہے نہ سورج کی تپش" (اگر اس سے نکلے تو سرتاسر محنت میں مبتلا ہو جاؤ گے)

(۱۱۹) لیکن پھر شیطان نے آدم کو وسوسہ میں ڈالا۔ اس نے کہا "اے آدم! میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا نشان

(۲۲) آیت (۱۱۴) میں فرمایا، جب تک سلسلۂ وحی پورا نہ ہو جائے اس بارے میں جلدی نہ کر، اور منتظر رہ کہ فیضانِ غیب کی بخششیں کہاں تک مالامال کرتی ہیں۔ تیری زبانِ حال کی صدا تو یہ ہونی چاہیے کہ رب زدنی علما! یعنے میری تشنگی کی سیرابی کے لیے علم کے یہ سارے دریا اور عرفانِ حقیقت کی یہ ساری بارشیں بھی کافی نہیں۔ اے علم کی لاانتہائی اور حقیقت کی ناپیداکناری! اپنی بخششیں اور زیادہ کر!

اس آیت نے واضح کر دیا کہ پیغمبر اسلام کے مقام علم و عرفان کی وسعت و عظمت کا کیا حال تھا؟ وہ کسی حد پر بھی رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کے لیے کوئی زیادتی بھی زیادتی نہ تھی۔ اس کے لیے ہر افاضہ نئے استفاضہ کا اشارہ تھا۔ اس کے لیے ہر عطیہ نئے عطیہ کا تقاضہ تھا۔ وہ یکسر طلب تھی۔ پے بہ پے رب زدنی کا سوال تھی۔ یہ معلوم ہے کہ یہاں مطلوب کی وسعت کے لیے کوئی انتہا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ کیونکر معلوم کیا جائے کہ طالب کی طلب کہاں جا کر منتہی ہوئی تھی؟

۱۲۰ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰى
۱۲۱-۱۲۲ اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۝ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ
۱۲۳ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ
۱۲۴ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ
۱۲۵-۱۲۶ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ

۱۲۰ دیدوں؟ اور ایسی پادشاہی کا جو کبھی زائل نہ ہو؟"

چنانچہ دونوں نے (یعنے آدم اور اُس کی بیوی نے) اُس درخت کا پھل کھالیا، اور دونوں کے ستر اُن پر کھل گئے۔ تب اُن کی حالت ایسی ہوگئی کہ باغ کے پتے توڑنے لگے اور اُن سے اپنا جسم ڈھانکنے لگے۔

۱۲۱ غرضکہ آدم اپنے پروردگار کے کہنے پر نہ چلا پس وہ (جنت کی زندگی سے) بے راہ ہوگیا۔

(لیکن) پھر اس کے پروردگار نے اسے برگزیدہ کیا۔ اس پر (اپنی رحمتوں سے) لوٹ آیا۔ اُس پر (زندگی

۱۲۲ عمل کی) راہ کھول دی۔

(چنانچہ) اللہ نے حکم دیا تھا "تم دونوں اکٹھے یہاں سے نکل چلو۔ تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوا (اب تم پر ایک دوسری زندگی کی راہ کھلیگی) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس (یعنے تمہاری نسل کے پاس) کوئی پیام ہدایت آیا، تو (اس بارے میں میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری ہدایت پر چلیگا، وہ نہ تو راہ سے

۱۲۳ بے راہ ہوگا، نہ دُکھ میں پڑیگا۔ جو کوئی میری یاد سے رو گرداں ہوگا، تو اُس کی زندگی ضیق میں گزریگی اور قیامت

۱۲۴ کے دن بھی ہم اُسے اندھا اُٹھاوُنگا"

وہ کہیگا "پروردگار! تونے مجھے اندھا کر کے کیوں اُٹھایا؟ میں تو اچھا خاصا دیکھنے والا تھا"

۱۲۵ ارشاد ہوگا "ہاں، اسی طرح ہونا تھا۔ ہماری نشانیاں تیرے سامنے آئیں مگر تونے انہیں بھلا دیا۔ سو اسی طرح آج تو بھی بھلا دیا گیا ہے!"

۱۲۶ اور (دیکھو) جو کوئی (سرکشی میں) بڑھ نکلتا ہے اور اپنے

(۱۲۳-۱۲۴) آیت (۱۲۳) اور (۱۲۴) مہمات معارف میں سے ہیں۔ ان دو آیتوں سے ہم وہ سب کچھ معلوم کرلے سکتے ہیں جو قرآن انسان کی روحانی سعادت و شقاوت کے بارے میں بتلانا چاہتا ہے۔

فرمایا۔ جو ہدایت وحی پر چلیگا، نہ تو کامیابی کی راہ سے بے راہ ہوگا، نہ دکھی۔ پس معلوم ہوا کہ یہ ہدایت اِس لیے ہے کہ انسان کو بے راہی اور اُس کے لازمی نتیجہ سے محفوظ کردے۔

غور کرو، انسان کی ساری محرومیوں کی تصویر کس طرح صرف دو لفظوں کے اندر کھینچ دی ہے! ضلالت اور شقاوت۔ انسان کو جتنی ٹھوکریں بھی لگتی ہیں، بے راہ ہوجانے سے لگتی ہیں ہر گوشہ میں کامیابی و سعادت کی ایک مقررہ راہ ہے۔ جونہی اس سے قدم بے راہ ہوئے، شقاوت میں گر گئے!

پھر فرمایا جس نے ہمارے ذکر سے اعراض کیا، تو اُسے دو حالتیں پیش آئینگی۔ دنیا میں اُس کی زندگی ضیق میں پڑجائیگی۔ یعنے وہ بظاہر کتنا ہی نہال ہوجائے لیکن دل کی طمانیت اور روح کا انبساط اُسے کبھی نہیں ملیگا۔ اور آخرت میں بینائی سے محروم ہوجائیگا۔ سعید انسانوں کی نگاہیں روشن ہونگی۔ اس کی اندھی: وہ جمالِ الٰہی کا نظارہ کرینگی۔ اس کے آگے پردہ پڑا ہوگا۔ کلا انھم عن ربھم

مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ۝ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا ۱۲۷
قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ ۱۲۸ ع
مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ۝ فَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ ۱۲۹
الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ ۱۳۰
اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ڏ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ

پروردگار کی نشانیوں پر یقین نہیں کرتا، تو اس طرح ہم اُسے (اُس کی حالت کا) بدلہ دیتے ہیں، اور آخرت کا عذاب تو بہت زیادہ سخت ہے۔ بہت دیر تک رہنے والا ہے! ۱۲۷

کیا ان لوگوں کو اس بات سے بھی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے قوموں کے کتنے ہی دور گزر چکے ہیں، جنہیں ہم (پاداشِ جرائم میں) ہلاک کر چکے! یہ اُن کی بستیوں میں چلتے پھرتے ہیں۔ (اُن کے آثار ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں!) جو لوگ دانشمند ہیں، اُن کے لیے اسی ایک بات میں (تذکیر و عبرت کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں! ۱۲۸

اور (اے پیغمبر!) اگر ایسا نہ ہوتا کہ پہلے سے تیرے پروردگار نے (اس بارے میں) ایک بات ٹھہرا دی ہوتی (یعنے ایک قانون ٹھہرا دیا ہوتا) تو اسی گھڑی ان پر جرم کا الزام لگ جاتا اور مقررہ وقت نمودار ہو جاتا! ۱۲۹

پس چاہیے کہ ان کی ساری باتوں پر صبر کر، اور اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کی پکار میں لگا رہ۔ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے، شام کو ڈوبنے سے پہلے۔ رات کی گھڑیوں میں بھی۔ اور دوپہر کے لگ بھگ بھی۔ بہت ممکن ہے کہ تو بہت جلد (ظہورِ نتائج سے) خوشنود ہو جائے۔ ۱۳۰

اور یہ جو ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیوی زندگی کی آرائشیں دے رکھی ہیں اور اُن سے وہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں، تو تیری نگاہیں اس پر نہ جمیں۔ (یعنے یہ بات تیری نگاہ میں نہ جچے) یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ہم نے اُنہیں آزمائش میں ڈالا ہے، اور جو کچھ تیرے پروردگار کی بخشی ہوئی روزی ہے، وہی (تیرے لیے) بہتر ہے اور (بہ اعتبار نتیجہ

یومئذ لمحجوبون (۸۳: ۱۵)

وہ اندھا کیوں ہو جائیگا؟ اس لیے کہ آخرت کی زندگی دنیوی زندگی کا نتیجہ ہے۔ اس نے دنیا میں قدرت کی نشانیوں سے آنکھیں بند کر لی تھیں، اس لیے آخرت میں بھی اس کی آنکھیں بند ہونگی۔ من کان فی ھذہ اعمی فھو فی الاخرۃ اعمی واضل سبیلا!

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ قرآن کے نزدیک ثواب آخرت کی حقیقت یہ ہے کہ نگاہیں جمال الٰہی کے نظارہ سے شادکام ہونگی۔ عذاب کی یہ ہے کہ اندھی ہو کر محجوب ہو جائینگی۔

(۴۲) آیت (۱۲۹) میں فرمایا، اگر پہلے سے اللہ کا یہ قانون موجود نہ ہوتا کہ انکار و بدعملی کے نتائج اپنے مقررہ وقت اور مقررہ حالت کے مطابق ظہور میں آئیں، تو یہ لوگ اپنی سرکشیوں کی وجہ سے کب کے ملزم ہو چکے تھے، لیکن یہاں ہر گوشہ میں رحمتِ الٰہی نے ڈھیل دے رکھی ہے، اور ضروری ہے کہ مقررہ وقت کا انتظار کیا جائے۔

لیکن یہ انتظار کس طرح کیا جائے؟ اس طرح کہ صبر اور صلوٰۃ کی روح سے معمور ہو جاؤ۔ یہی وہ دو عنصر ہیں جن سے ہر طرح کی کامرانی و فتح مندی حاصل ہو سکتی ہے اور ظہور میں آسکتی ہے۔

۱۳۱ أَبْقَىٰ ○ ۱۳۲ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ○

۱۳۳ وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ○ ۱۳۴ وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُم بِعَذَابٍ

مِّن قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِن قَبْلِ أَن نَّذِلَّ وَنَخْزَىٰ ○

۱۳۵ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدَىٰ ○ ع ۱۷

---

۱۳۱ سکے) باقی رہنے والی؛

اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دے، اور اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جا۔ ہم تجھ سے روزی کا سوال نہیں کرتے

۱۳۲ تو ہم سے سائل ہے۔ ہم بخشنے والے ہیں۔ اور انجام کار تقوٰے ہی کے ہاتھ ہے!

اور ان لوگوں نے کہا "کیوں یہ اپنے پروردگار کی کوئی نشانی اپنے ساتھ نہیں لایا؟"

۱۳۳ لیکن کیا ان تک وہ روشن دلیلیں نہیں پہنچ چکیں جو اگلی کتابوں میں موجود ہیں؟

اور اگر ہم انہیں اس سے پہلے (یعنے نزول قرآن سے پہلے) عذاب نازل کر کے ہلاک کر ڈالتے، تو یہ ضرور کہتے۔ خدایا! اس سے پہلے کہ ہم ظہور عذاب سے ذلیل و رسوا ہوں، تو نے ایک پیغمبر کیوں نہ بھیج دیا کہ ہم

۱۳۴ تیری آیتوں پر چلتے اور ہلاک نہ ہوتے؟

(اے پیغمبر!) تو کہدے "یہاں ہر ایک کے لیے (مستقبل کا) انتظار کرنا ہے، پس تم بھی انتظار کرو۔ بہت

۱۳۵ جلد تمہیں معلوم ہو جائیگا، کون سیدھے راستہ پر ہے، اور کون منزل مقصود پر پہنچا ہے؟

سورت ختم ہو گئی لیکن چند مقامات کی مزید تشریح ضروری ہے؛

فرعون اور حضرت موسیٰ کا مکالمہ

(الف) آیت (۴۹) میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا جو مکالمہ نقل کیا ہے، وہ اگرچہ دو تین جملوں سے زیادہ نہیں ہے، لیکن حقائق و معارف کے دفاتر اس میں پنہاں ہیں۔

فرعون کا پہلا سوال یہ تھا کہ من ربکما یا موسیٰ؟ جس پروردگار کا ذکر کرتے ہو، وہ کون ہے!

اس سوال کی نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے معلوم کر لیا جائے، مصریوں کے عقائد کیا تھے؟

مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے جیسے نیفات، فتا، اور مات، اور بعض عالمگیر قوتوں کے الگ الگ مظاہر تھے۔ جیسے اوزیرس۔ عالم آخرت کا خدا۔ میہ اورت۔ آسمان کا خدا۔ کنیو جسم بنانے والا۔ ایزیز۔ روح بخشنے والی دیبی۔ طوط۔ عمر کی مقدار مقرر کرنے والا۔ ہوراس۔ درد و غم دور کرنے والا۔ حاتور (گائے) رزق بخشنے والا۔ اور ان سب سے بلند تر آمن رع تھا یعنے سورج دیوتا۔

نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو و نما پا چکا تھا، اور تاجداران مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی اُن کا لقب "فارع" اسی لیے ہوا کہ وہ "رع" یعنے سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے[1]

من ربکما یا موسیٰ؟

پس جب حضرت موسیٰ نے کہا میں خدا کا فرستادہ ہوں، تو فرعون نے متعجب ہو کر پوچھا کس خدا کے؟ آمن رع کے، جس نے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو [illegible] ڈوٹ۔

[2] [illegible] ایشنٹ ایجپٹ مصنف ہے [illegible] بریسٹڈ Breasted۔ اور انسائیکلوپیڈیا [illegible] ہے [illegible]۔

یعنی ہمارا پروردگار کون ہے؟ ایسی ہستی کے جو ہر چیز کو پیدا کرنے والی ہے؟ کیوں نہ یہ ہی کہ جو جسم و خلقت بنانے والا ہے؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا نہیں۔ الذی اعطی کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ! ہمارا پروردگار تو وہ ہے کہ ہر کسی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا جسم و بناوٹ بخشا، اور پھر ہر چیز کی ضروری قوتیں دے کر اس پر زندگی و عمل کی راہ بھی کھول دی!

غور کرو، فرعون کے استفسار میں اُس کے عقائد و تصورات کے بے شمار پہلو پوشیدہ تھے۔ اور اگر حضرت موسیٰ کا طریقہ جدل و مناظرہ کا ہوتا تو ان میں سے ہر بات الجھا لینے کے لیے کافی تھی۔ لیکن انہوں نے اور کسی بات سے تعرض نہیں کیا۔ صرف ایک ہی بات کہی۔ مگر ایسی بات جو اس کے سوال کا براہ راست جواب بھی تھی، اُس کے تمام تصورات کا بالواسطہ ابطال بھی تھا، اور صرف دعویٰ ہی نہ تھا، دعوے کے ساتھ اُس کی خاموش دلیل بھی موجود تھی!

اس کے تمام تصورات کا ابطال کیونکر ہوا؟ اس طرح کہ میں تمہارے ان گڑھے ہوئے معبودوں کا قائل نہیں جن میں سے کسی کو تم نے خلقت دینے والا سمجھ رکھا ہے، کسی کو رنج بخشنے والا، کسی کو رزق و تندرستی کا سرچشمہ۔ میں تو صرف اس ایک ہی ہستی کا پرستار ہوں جو جسم بھی دیتی ہے اور وہ سب کچھ بھی دیتی ہے جو جسم کے نشو و نما و قیام کے لیے ضروری ہے۔ خالق بھی وہی ہے، راہنمائے زندگی بھی وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ چنانچہ پھر آگے چل کر انہوں نے اس اعتقاد کی تفصیل بھی کر دی ہے۔

پھر اس جملہ کی جامعیت اور بلاغت دیکھو۔ کائنات ہستی میں جو کچھ بھی ہے وہ اس کے سوا کیا ہے کہ یا تو وجود ہے، یا وجود کی وہ معنوی قوتیں ہیں جو اسے قائم و باقی رکھتیں اور قیام و عمل کی راہوں پر لگاتی رہتی ہیں۔ انہیں دو حقیقتوں کو یہاں خلقت اور ہدایت سے تعبیر کیا ہے، اور ان دو لفظوں نے وجود اور حیات کے تمام گوشے سمیٹ لیے ہیں۔

دعوے کے ساتھ دلیل کیونکر ہوئی؟ اس کے لیے تفسیر سورۂ فاتحہ کا مبحث "ربوبیت" دیکھنا چاہیے۔

فما بال القرون الاولیٰ!

اس کے بعد فرعون نے دوسرا سوال کیا اور بطریق جدل کیا۔ فما بال القرون الاولیٰ؟ اچھا، اگر حقیقتِ حال یہی ہے، تو جو لوگ پچھلے عہدوں میں گزر چکے اُن کے لیے کیا ہونا ہے؟ وہ راہ صواب پر تھے یا گمراہی پر؟ انہیں تو تمہارے اس اعتقاد کی خبر بھی نہ تھی۔

اب دیکھو، یہاں پھر وہی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر یہ سوال امام فخر الدین رازی سے کیا جاتا تو اسی بحث میں صبح کر دیتے اور سارا معاملہ اسی میں اُلجھ کر رہ جاتا، لیکن حضرت موسیٰ داعی تھے۔ مجادل اور مناظر نہ تھے۔ اُنہوں نے صرف ایک بات کہہ کر ساری بحث ہی ختم کر دی علمھا عند ربی فی کتاب! اس کا علم اللہ کو ہے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور ہمیں اس کی فکر کیوں ہو؟ ہمارے جاننے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ لا یضل ربی ولا ینسیٰ! خدا انسانوں کی طرح نہیں ہے کہ غلطی میں کھو جائے، یا کوئی بات بھول جائے۔ اُس کا قانون یہ ہے کہ ہر انسان کا جیسا اعتقاد و عمل ہوگا، ٹھیک اُسی کے مطابق اُسے نتائج بھی ملیں گے۔ پس پچھلوں کا جیسا حال رہا ہوگا، ویسا ہی نتیجہ بھی بھگتیں گے۔ ہم کو اپنا حال دیکھنا ہے۔ اور اپنے ہی سامنے کی باتوں کا ہم علم بھی رکھتے ہیں۔ ہم اس کاوش میں کیوں پڑیں کہ پچھلوں کا کیا حال تھا، اور وہ بخشے جائیں گے یا نہیں۔

غور کرو، فرعون کا سوال مجادلانہ تھا اور ایسا تھا کہ بحث و کاوش کی قسم کا کوئی جواب بھی دیا جاتا تو مسکت اور ختم کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جوابات بھی کچھ ہوتے، بحث طلب ہوتی اور ایک نیا سوال پیدا کر دیتی۔ لیکن انبیاء کرام کا طریق دعوت یہ نہیں ہوتا کہ بحث میں اُلجھیں یا دوسرے کو اُلجھائیں۔ پس حضرت موسیٰ نے اس کاوش میں پڑنے ہی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ہم یہ جانتے ہی نہیں، اور ہمیں اس کا خواہشمند بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اسے جانیں۔

اور پھر غور کرو۔ اُنہوں نے اس جملے کے اندر جو بات کہہ دی، وہ انسان کی فکری گمراہیوں کی کتنی راہیں بند کر دیتی ہے بشرطیکہ لوگ اسے سمجھیں! مگر مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ اسی کاوش کی پیروی کرتے رہے جو فرعون کے سوال سے ٹپک رہی ہے، وہ حقیقت نہ پا سکے جو حضرت موسیٰ کے جواب میں مضمر ہے۔ حضرت موسیٰ کے جواب نے ہمیں یہ اصل عظیم بتلا دی ہے کہ جن گوشوں کا ہمیں علم نہیں ہے اور جن کی کاوش ہمارے لیے سودمند بھی نہیں، ان کی فکر میں ہمیں نہیں پڑنا چاہیے، اور ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کر دینا چاہیے۔ اگر لوگ اس اصل عظیم پر عامل ہو جائیں، تو مذاہب کے کتنے ہی گمراہ کن جھگڑے ختم ہو جائیں۔

ابھی دور نہ نکلو۔ اسی گوشہ میں دیکھو جو فرعون کے اس مجادلانہ سوال کی اصلی جگہ ہے۔ اور غور کرو مذاہب کے نام سے کتنے

جھگڑے بنا لیے گئے ہیں جن میں سے ہر جھگڑا فما بال القرون الاولیٰ کی فرعونی صدا کا ٹھیک ٹھیک اعادہ ہے! اب سے پہلے فلاں گروہ جو گزر چکا، اہل حق میں تھا یا اہل باطل میں؟ فلاں انسان جو گزر چکا، نیک تھا یا بد؟ فلاں بزرگ کا رتبہ خدا کے نزدیک زیادہ ہے یا فلاں بزرگ کا؟ افضل کون ہے؟ زید یا عمرو؟ ولایت و طریقت میں سب سے بڑا کون رہا؟ فلاں یا فلاں؟ پھر اس پر بحثیں ہیں، تصنیفیں ہیں، لڑائیاں ہیں، فرقہ بندیاں ہیں۔ گویا انسان کی نجات کے لیے صرف یہی فکر کافی نہیں کہ خود اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اس فیصلہ کے لیے بھی ذمہ دار بنا دیا گیا ہے کہ اب سے پانچ سو برس پہلے کسی نے کیا کیا تھا، اور ایک ہزار برس پہلے کون کیسا تھا۔ پھر ان میں سے ہر فریق اس طرح حکم لگانا شروع کر دیتا ہے۔ گویا خدا کے دفتر کا رجسٹر ابھی ابھی پڑھ کر اُٹھا ہے، اور اسے علم قطعی حاصل ہو گیا ہے کہ فلاں کا نام فلاں درجہ میں لکھا ہوا ہے۔ فلاں کا فلاں درجہ میں!

پچاس برس ہوئے شام میں مسلمانوں کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی بستیاں صرف اس لیے جلا دی تھیں کہ ایک کہتا تھا حضرت شیخ عبد القادر جیلانی سب سے بڑے ولی ہیں۔ دوسرا کہتا تھا نہیں، شیخ احمد رفاعی۔ ہندوستان کا یہ حال ہے کہ آج تک میرے پاس نہایت سنجیدہ عبارتوں میں لکھے ہوئے استفسار آتے رہتے ہیں "زید کہتا ہے بڑے پیر صاحب سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ عمرو کہتا ہے۔ مجدد الف ثانی سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ نماز کس کے پیچھے جائز ہے؟"

ایک مرتبہ جی میں آیا۔ لکھ دوں۔ دونوں کے پیچھے نہیں!

فقہ کے مذاہب اربعہ جب مشخص و مدون ہو گئے اور تقلید شخصی کا التزام قائم ہو گیا تو سوال پیدا ہوا۔ ان چاروں اماموں میں افضل کون ہیں؟ حضرت امام ابو حنیفہ یا امام شافعی؟ اب بحث شروع ہوئی، اور بحث نے جنگ و قتال کی شکل اختیار کی چنانچہ ہلاکو خاں کو اسلامی ممالک پر حملہ کی سب سے پہلی ترغیب خراسانیوں کے اسی جھگڑے سے ملی تھی۔ حنفیوں نے شافعیوں کی ضد میں آکر بلوا بھیجا اور شہر کے پھاٹک کھول دیے۔ پھر جب تاتاریوں کی تلوار چل گئی تو اُس نے نہ شافعی کو چھوڑا، نہ حنفی کو۔ فجاسوا خلال الدیار، وکان وعدًا مفعولًا!

شیعہ سنی کے اختلاف نے مسلمانوں کو دو مختلف اُمتوں میں متفرق کر دیا لیکن اس تمام اختلاف کا حاصل بھی کیا ہے؟ یہی کہ فما بال القرون الاولیٰ۔ اور تیرہ سو برس گزر گئے مگر اتنی بات کسی کے سمجھ میں نہیں آتی کہ علمہا عند ربی فی کتاب۔ لا یضل ربی ولا ینسیٰ۔

بہر حال یاد رکھنا چاہیے کہ اس طرح کی تمام کاوشوں کے اندر وہی فرعون والی مجادلانہ روح کام کیا کرتی ہے، اور طریق موسوی یہ ہے کہ علمہا عند ربی فی کتاب کہہ کر سارے جھگڑے ختم کر ڈالنا، اور سرے سے ان کاوشوں میں پڑنا ہی نہیں۔

قرآن اور صاحب وحی نے ہمیں جن امور کی خبر دیدی ہے، اُن کا علم ہمیں حاصل ہو گیا ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ اُن باتوں کو اُسی طرح یقین کریں، جس طرح تبلادی گئی ہیں لیکن اُن سے زیادہ جو سوال بھی دینی عقائد کی بنا پر اُٹھایا جائیگا، ہمارا جواب یہی ہوگا۔ علمہا عند ربی فی کتاب۔ لا یضل ربی ولا ینسیٰ۔ خدا نے اپنے دفتر کی مثلیں ہمارے پاس نہیں بھیجدی ہیں، اور نہ ہمیں لوگوں کی سعادت و شقاوت اور مدارج و فضائل کے فیصلہ کی ٹھیکیداری عنایت فرمائی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں حقیقت حال کیا ہے۔ الحمد للہ خوش قسمتی سے معاملہ ایسے محاسب کے ہاتھ ہے جو نہ تو غلطی کر سکتا ہے۔ نہ بھول چوک میں پڑ سکتا ہے۔ پس دوسروں کی فکر میں تمہیں گھلنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی خبر لو، اور اُن کا معاملہ اُن کے خدا پر چھوڑ دو!

سامری اور گوسالہ پرستی کا معاملہ

(ب) آیت (۸۷) میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اور یہ مقام بھی من جملہ اُن مقامات کے ہے جن میں قرآن کی تصریحات تورات کے موجودہ نسخہ سے مختلف واقع ہوئی ہیں اور اس کی صریح تحریفات نمایاں کرتی ہیں۔ خروج (۳۲: ۱) میں ہے کہ سنہرا بچھڑا خود حضرت ہارون نے بنایا تھا لیکن قرآن نے یہاں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ حضرت ہارون کا دامن اس شرک سے پاک تھا۔ یہ دراصل سامری کی کارستانی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا؟ یہ اُس کا نام تھا، یا قومیت کا لقب؟

قیاس کہتا ہے کہ یہاں "سامری" سے مقصود سُمیری قوم کا فرد ہے۔ کیونکہ جس قوم کو ہم نے سُمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے وہ اپنی

میں اس کا نام قدیم سے سامری آرہا ہے، اور اب بھی عراق میں اُن کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں قرآن کا "السامری" کہہ کر اس شخص کو پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے۔ اُس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا۔

سمیری تمدن

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ و فرات کے دوآبہ میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی، عرب تھی۔ دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اُتری، سُمیری تھی۔ اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سامرا اور آور آباد ہوا تھا جس کا محل اب تل المقیر میں دریافت ہوا ہے، اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہو رہے ہیں۔

سمیری قوم کی اصل

سُمیری قوم کی اصل کیا تھی؟ اس بارے میں اس وقت تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکی ہے، لیکن نینوا میں آشور بنی پال[1] (متوفی ۶۲۶ قبل مسیح) کا جو کتب خانہ نکلا ہے، اُس میں تختیوں کا ایک مجموعہ لغت کی کتاب کا بھی ہے[2] جس میں آکادی اور سُمیری زبان کے ہم معنی الفاظ جمع کیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سُمیری زبان کے اصوات سامی حروف کے اصوات سے چنداں مختلف نہیں تھے، بہت ممکن ہے کہ وہ بھی دراصل اُنہی قبائل کے مجموعہ سے کوئی بعید تعلق رکھتے ہوں جن کے لیے ہم نے تورات کی اصطلاح "سامی" اختیار کر لی ہے۔

نسل انسانی کے دو قبائلی سرچشمے

اصل یہ ہے کہ جس طرح عہد قدیم میں منگولیا کا علاقہ صحرا نورد قبائل کا ابتدائی سرچشمہ رہا ہے، اور یہاں سے انسانی گروہوں کے قافلے نکل کر وسط ایشیا، ہندوستان، ایران، اناتولیا، اور پھر تمام یورپ میں پھیل گئے، ٹھیک اسی طرح نسل انسانی کے اقدام و انشعاب کا ایک مرکزی سرچشمہ جزیرہ نمائے عرب بھی رہ چکا ہے۔ یہاں کے صحراؤں میں یکے بعد دیگرے نسل انسانی کا مواد بنتا رہا اور پھر اُبل اُبل کر دور دور تک پھیلتا گیا۔ فلسطین، شام، مصر، عراق، آرمینیا، اور خلیج فارس کی ساحلی آبادیاں، سب اسی مرکزی نسل کا انشعاب تھیں اور سب کا تمدن اسی عربی نسل کا تمدن تھا۔ قوم "عیلام" جس کا ذکر کتاب پیدائش میں آیا ہے اور جو جنوبی ایران میں آباد تھی، عجب نہیں، دراصل اسی نسل کی ایک شاخ ہو (اس مقام کی مزید تفصیل سورۂ نوح کی تشریحات میں ملیگی)

بہر حال سُمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا۔ مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مصر سے ان کے تعلقات کا سُراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آچکا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے، اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ کا بھی معتقد ہو گیا، اور جب بنی اسرائیل نکلے، تو یہ بھی اُنکے ساتھ نکل آیا۔ اسی کو قرآن نے "السامری" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

سامری کا ایمان اور پھر ارتداد

گائے، بیل، اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی۔ مصری اپنے دیوتا حورس کا چہرہ گائے کی شکل کا بناتے تھے، اور خیال کرتے تھے، کرۂ زمین ایک گائے کی پشت پر قائم ہے۔ جب سامری نے دیکھا، بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی سے مضطرب ہو رہے ہیں، تو اُس نے کہا۔ مجھے سونے کے زیور لا دو۔ پھر انہیں گلا کر بچھڑے کی ایک مورتی بنا دی۔ مصری مندروں کی مخفی کاریگریاں اُسے معلوم تھیں۔ اُس نے مورتی کے اندر ہوا کے نفوذ و خروج کی ایسی کل بٹھا دی کہ اُس سے ایک طرح کی آواز نکلنے لگی۔

سامری حضرت موسیٰ کا معتقد ہو گیا تھا لیکن اسرائیلی توحید پر اُس کا دل جما نہیں تھا۔ چند دنوں اُسی طریقہ پر کاربند رہا۔ پھر منحرف ہو گیا۔ اسی لیے جب حضرت موسیٰ نے پوچھا۔ یہ تو نے کیا کیا؟ تو اُس نے کہا۔ بصرت بما لم یبصروا بہ۔ مجھے ایسی بات سجھائی دی جو دوسروں کو نہیں سوجھی۔ یعنے بچھڑا بنانا۔ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول فنبذتھا۔ میں نے رسول کی پیروی میں تھوڑا بہت حصہ لیا تھا مگر پھر چھوڑ دیا۔ یعنے گو میں نے آپ کی پیروی میں چند قدم اُٹھا دیے تھے مگر میرا دل اس پر جما نہیں تھا۔ وکذٰلک سوّلت

[1] یہ نینوا کا وہی عظیم الشان شاہنشاہ ہے جسے یونانی نوشتوں میں سردانا پالس (Sardanpalus) کے نام سے پکارا گیا ہے۔

[2] یہ لغت کی کتاب قدیم اقوام کے علوم و ادبیات میں اپنی کوئی دوسری نظیر نہیں رکھتی اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اب سے تین ہزار سال پہلے دجلہ و فرات کی علمی ترقیاں کہاں تک پہنچ چکی تھیں۔ اس لغت میں صرف آکادی اور سُمیری زبان ہی کے ہم معنی الفاظ جمع نہیں کیے گئے ہیں بلکہ حِتّی، قاصی، اور مصری زبان کے ہم معنی الفاظ بھی آگئے ہیں۔ اس کتاب کے انکشاف نے قدیم زبانوں کے حروف و اصوات کے لیے ایک مستند اور قطعی ذریعہ بہم پہنچا دیا۔ (حِتّی وہی قوم ہے جسے آج کل Hittite لکھا جاتا ہے اور قاصی سے مقصود Kussite ہے۔ ان دونوں کے لیے تورات میں حتّی اور قاصی کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم نے بھی وہی اختیار کیے۔ تفصیل کے لیے دیکھو ایم جسٹرو کی دی سِولیزیشن آف بیبلونیا اینڈ اسیریا مطبوعہ ۱۹۱۵ء اور سر ای۔ اے۔ ڈبلیو Budge کی "بابی لون اینڈ اسیریا" مطبوعہ ۱۹۲۰ء)

لی نفسی۔ کیا کروں، میری طبیعت کا ایسا ہی تقاضا ہوا۔ میں آپ کے پیچھے چل نہ سکا۔

عربی میں جب کہیں گے قبضت قبضۃً میں نے صرف ایک مٹھی اٹھائی، تو اس کے معنی تقلیل کے ہوں گے۔ قبضت قبضۃ ای شیئ قلیل، والقبضۃ القدر المقبوض (ابن سیدہ) اردو کا بھی محاورہ ہے "میں نے تو صرف ایک ہی مٹھی اٹھائی ہے" یعنے بہت تھوڑا حصہ لیا ہے۔

گوسالہ کی نسبت یہودی خرافات

یہودیوں نے اپنی قومی برتیت کے لیے یہ کہانی گھڑ لی تھی کہ گوسالہ پرستی کے معاملہ میں ایک روحانی طاقت کا اثر کام کر رہا تھا۔ ورنہ ہمارے اسلاف کیوں ایسی گمراہی میں پڑتے! وہ کہتے تھے۔ بچھڑے کی گویائی اس مٹی کا معجزہ تھا جو حضرت جبریل کے گھوڑے کے سموں سے پامال ہوئی تھی۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو اُن کے آگے آگے جبریل جا رہے تھے اور زندگی کے فرشتہ پر سوار تھے جس نے گھوڑے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس گھوڑے کے سم جس مٹی پر پڑتے تھے اس میں زندہ کر دینے کی خاصیت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ بات کسی نے نہیں دیکھی لیکن سامری نے دیکھ لی۔ پس اُس نے بچھڑا بنا کر اس میں (آبحیات کی جگہ) اس خاکِ حیات کی ایک مٹھی ڈال دی بس پھر کیا تھا۔ وہ زندہ ہو کر بولنے لگا!

مفسرین کا تسامح

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہانی تفسیر کی روایتوں میں بھی داخل ہو گئی، اور اثر الرسول کا مطلب یہ بنا لیا کہ "جبریل کے نقش قدم" کی ایک مشتِ خاک سامری نے اٹھائی تھی لیکن یاد رہے کہ یہ تفسیر کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایسی تفسیر کرنا قرآن کے اس مقام کو تمسخر انگیز حد تک بے معنی بنا دیتا ہے۔

اولاً قرآن نے اس معاملہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، اور یہ بات بلاغت قرآنی کے صریح خلاف ہے کہ ایک ایسا واقعہ جو قیاس اور قرینہ سے معلوم نہیں کیا جا سکتا بیان نہ کرے، اور پھر اچانک صرف "اثر الرسول" کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دے۔

ثانیاً قرآن میں جہاں کہیں بھی بغیر اضافت و اسناد کے "الرسول" کہا گیا ہے، اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے۔ یعنے پیغمبر۔ پس یہاں "الرسول" سے فرشتہ سمجھنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

ثالثاً ایسا سمجھنا صریح قرآن کو جھٹلانا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ بچھڑے کی مورتی میں زندگی پیدا ہو گئی تھی، بلکہ صاف صاف کہتا ہے کہ جسداً لہ خوار۔ ایک بے جان دھڑ تھا جس سے آواز نکلتی تھی۔ اگر ایک ملکوتی کرشمہ نے اُسے زندہ کر دیا ہوتا، تو قرآن اُسے عجلاً جسداً کیوں کہتا!

رابعاً قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ اس مورتی میں کوئی بات نہ تھی۔ محض ایک شعبدہ تھا۔ کیونکہ وہ بنی اسرائیل کے استعجاب و تاثر کو اس کی حد درجہ بے وقوفی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔ افلا یرون الا یرجع الیھم قولا! یعنے ان عقل کے اندھوں نے اتنی بات بھی نہ دیکھی کہ اگر یہ کوئی زندہ وجود ہے تو اُن کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ خالی بھاں بھاں کیوں کرتا رہتا ہے؟ پھر اگر مفسروں کی کہانی مان لی جائے تو تسلیم کر لینا پڑے گا کہ قرآن کا یہ بیان یکسر غلط ہے۔ کیونکہ اس میں تو ایک ملکوتی معجزہ تھا۔ اُس کے اندر تو جبریلی زندگی کی ایک روح دوڑ رہی تھی!

خامساً یہ کہانی خود اپنی بناوٹ ہی میں ناقابل تسلیم ہے۔ اگر فی الحقیقت کوئی ایسا ملکوتی مظاہرہ ہوا تھا اور بصرت بما لم یبصروا بہ کے یہی معنی ہیں، تو ماننا پڑے گا کہ سامری کی روحانی بصیرت تمام بنی اسرائیل سے حتیٰ کہ حضرت ہارون سے بھی کہ پیغمبر تھے بڑھی ہوئی تھی کیونکہ یہ کرشمۂ الٰہی کوئی نہ دیکھ سکا۔ صرف اس کی نگاہ حقیقت شناس کام کر گئی۔ بلکہ کہنا پڑے گا۔ خود حضرت موسیٰ سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ بھی یہ بات نہ پا سکے لیکن کیا ایسا مانا جا سکتا ہے؟ حمزہ، کسائی، اور اعمش کی قرأت میں بما لم یبصروا بہ کی جگہ بما لم تبصروا بہ (بالتاء) ہے اگر یہ قرأت اختیار کر لی جائے تو صریح مطلب یہ ہو گا کہ "میں نے وہ بات دیکھ لی جو تم بھی نہ دیکھ سکے" یعنے حضرت موسیٰ بھی نہ دیکھ سکے پھر کیا "بصرت" کو اس کہانی پر لے جانا صحیح ہو سکتا ہے!

سادساً، خود ہی مفسر عجلا جسداً لہ خوار کی تفسیر میں یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ خوارہ کان بالریح۔ لانہ کان عمل فیہ خروقا، فاذا دخلت الریح فی جوفہ، خار، ولم یکن فیہ حیاۃ۔ یعنے اس میں زندگی نہ تھی۔ محض ہوا کے نفوذ سے بچھڑے کی سی آواز نکلتی تھی۔ پھر جب یہ تفسیر بھی موجود ہے، تو کونسی وجہ ہے کہ خواہ مخواہ حضرت جبریل کو گھسیٹا جائے اور فرشتوں کو گھوڑا بننے کی زحمت دی جائے!

سابقًا جن روایتوں کی بنا پر یہ کہانی چلی ہے، اگر اُن کے متن سے قطع نظر کرلی جائے، تو باعتبار اسناد کے بھی لائق اعتنا نہیں سب سے زیادہ زور ابن المنذر، ابن ابی حاتم، اور حاکم کی روایت پر دیا جاتا ہے جس میں حضرت علی کا قول نقل کیا گیا ہے، لیکن وہ بھی مجروح ہے، اور حاکم کی تصحیح کی جو قدر و قیمت ہے، وہ ہم امام ذہبی کی زبانی سُن چکے ہیں۔

سُورَةُ الاَنبِيَاءِ ۲۱

مکی - ۱۱۲ - آیات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱ اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۞ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ۞ لَاهِيَةً قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجۡوَى ۖ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۖ هَلۡ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ۞ ۲ قٰلَ رَبِّىۡ يَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِى السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۞ ۳ بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۢ بَلِ افۡتَرٰٮهُ بَلۡ هُوَ شَاعِرٌ ۖۚ فَلۡيَاۡتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرۡسِلَ ۴

وقت قریب آلگا ہے کہ لوگوں سے (اُن کے اعمال کا) حساب لیا جائے۔ اس پر بھی اُن کا یہ حال ہے کہ رُخ پھیرے، غفلت میں متوالے، چلے جارہے ہیں!

اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر نصیحت کی باتیں پے بہ پے آتی رہیں مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ انہوں نے جی لگا کر سنا ہو! وہ سُنتے ہیں مگر اس طرح کہ کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں اور دل ہیں کہ یکقلم غافل۔ اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جادو کے سوا اور کچھ نہیں؟"

(۱) یہ سورت بھی اُن سورتوں میں سے ہے جو مکی عہد کے اواخر میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ بالاتفاق سورۂ ابراہیم کے بعد اور مومنون سے پہلے اتری۔

سورت کی ابتدا، اُس کا وسط، اُس کا خاتمہ سب اعلان کر رہے ہیں کہ محاسبہ کا وقت قریب آگیا، اور ضروری ہے کہ فیصلہ کن معاملہ ظہور میں آجائے۔

چنانچہ وقت فی الحقیقت قریب آگیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ہجرتِ مدینہ کا واقعہ ظہور میں آیا، اور دعوتِ حق کے فتح و اقبال اور معاندینِ حق کے خسران و ادبار کا دور شروع ہوگیا!

(پیغمبر نے) کہا "آسمان و زمین میں جو بات بھی کہی جاتی ہے (خواہ پوشیدہ کہی جائے۔ خواہ علانیہ) میرے پروردگار کو سب معلوم ہے۔ وہ سننے والا، جاننے والا ہے!"

(اتنا ہی نہیں) بلکہ انہوں نے کہا "یہ محض خوابِ خیال کی باتیں ہیں۔ بلکہ من گھڑت دعویٰ ہے۔ نہیں بلکہ یہ شاعر ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی (نزولِ ہلاکت کی) نشانی ہمیں لا دکھائے جس طرح اگلے وقتوں کے لوگ نشانیوں

(۲) پیغمبر اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اُن کے سخت سے سخت معاند بھی اُس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے تھے جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی؟ اور چونکہ اعترافِ حقیقت کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے مجبور ہو جاتے تھے کہ اُسے جادو سے تعبیر کریں؟ یہاں آیت (۳) میں فرمایا وہ پیغمبر اسلام کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے ہیں تم ان کے پاس گئے اور جادو میں پھنسے۔ وہاں تو جادو ہی جادو بھرا ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں، اس آدمی میں وحی و نبوت کی تو کوئی بات نظر نہیں آتی۔ کیونکہ یہ ہماری ہی طرح ایک

الْاَوَّلُوْنَ ○ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ○ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ○ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ○ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ۧ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ

۵-۶ ۷ ۸-۹ ۱۰ ع ۱ ۱۱

کے ساتھ بھیجے جا چکے ہیں" ۵

لیکن اِن سے پہلے جن جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا، اُن میں سے تو کوئی بھی (نزولِ ہلاکت کی نشانیاں دیکھ کر) ایمان نہیں لے آیا تھا۔ پھر کیا یہ لوگ ایمان لے آئینگے؟ ۶

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اسی طرح، کہ آدمی تھے۔ اُن پر ہماری وحی اُترتی تھی۔ پھر (اے گروہ منکرین!) اگر تمہیں یہ بات معلوم نہیں تو اُن لوگوں سے پوچھ کر معلوم کرلو جو اہل کتاب ہیں! ۷

اور ہم نے اُن پیغمبروں کو کبھی ایسے جسم کا نہیں بنایا کر کھانا نہ کھاتے ہوں۔ اور نہ ہی وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے۔ ۸

(ہم نے تمہاری ہی طرح کے آدمیوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا، اور) پھر جس بات کا وعدہ کیا تھا، وہ انہیں سچا کر دکھایا۔ ہم نے انہیں اور (اُن کے ساتھ) جس کسی کو چاہا، نجات دیدی، اور حد سے نکل چلنے والوں کو ہلاک کر ڈالا! ۹

ہم نے تمہارے لیے ایک کتاب نازل کردی ہے۔ اُس میں تمہارے لیے موعظت ہے۔ (پھر اس کر زیادہ تمہیں اور کیا چاہیے؟) کیا تم سمجھتے نہیں؟ ۱۰

اور کتنی ہی بستیاں جو ظلم و شرارت میں غرق تھیں، ہم نے پامال کر ڈالیں، اور اُن کے بعد دوسرے گروہوں کو اُٹھا کھڑا کیا! جب ہمارا عذاب اُنہوں نے محسوس ۱۱

آدمی ہے۔ پس جو کچھ بھی اس کا اثر و نفوذ ہے، جادو ہی کی وجہ سے ہے۔

(۳) سچائی کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اُسے سچائی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کچھ اور کہنا چاہو گے، تو خواہ کتنا ہی زور لگاؤ، بات بنیگی نہیں۔ بنیگی اُسی وقت، جب سر جھکا دوگے کہ ہاں، یہ سچائی ہے!

لیکن مشکل یہ ہے کہ نفس انسانی کی گمراہی و سرکشی پر حقیقت کا اعتراف ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ وہ بغیر لڑے کبھی ہتھیار نہیں رکھیگی۔ وہ مانیگی (کیونکہ سچائی بغیر منوائے رہ نہیں سکتی)، مگر اُسی وقت، جب ماننے پر مجبور ہو جائیگی!

پیغمبر اسلام نے جب کلامِ حق کی منادی شروع کی تو قریش مکہ کا یہی حال ہوا۔ وہ سچائی دیکھ رہے تھے، مگر اُسے سچائی کہنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ مجنون ہو گیا ہے۔ خواب و خیال کو وحیِ نبوت سمجھ رہا ہے۔ پھر تاثیر و نفوذ دیکھتے تو کہتے۔ یہ جادوگر ہے۔ پھر یہ بات بھی نہ بنتی تو کہتے۔ چالاک مفتری ہے۔ من گھڑت باتوں کو خدا کا پیغام بتلاتا ہے۔ پھر یہ بات بھی چل نہیں سکتی تو کہتے۔ کچھ نہیں شاعری کا کرشمہ ہے!

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے اور یہ ساری باتیں آپس میں کہیں (ابن ہشام)

(۴) قرآن نے پچھلی قوموں کی ہلاکتوں کی سرگزشتیں سنائی ہیں، اور کہا ہے، جب خدا کے رسول جھٹلائے گئے تو اُنہوں نے ظہور عذاب کی خبر دی۔ یہ سرگزشتیں سُن کر قریش مکہ کہتے تھے۔ ایسی ہی کوئی نشانی تم کیوں نہیں لا دکھاتے! آیت (۶) میں فرمایا۔ اگر کوئی ایسی خبر دیدی جائے تو کیا تم فوراً ایمان لے آؤگے؟ تم سے پہلے جتنی سرکش قومیں ہلاک ہوئیں، اُن میں سے تو کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا، اور پرستارانِ حق کی طرح پرستارانِ باطل کی سنت بھی ہمیشہ ایک ہی رہی ہے، اور ہمیشہ ایک ہی رہیگی!

۱۲-۱۳ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْكُضُوْنَ ○ لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ○
۱۴-۱۵ قَالُوْا یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ○ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ ○
۱۶ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ○ لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ق
۱۷ اِنْ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ○ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَ لَكُمُ الْوَیْلُ مِمَّا
۱۸ تَصِفُوْنَ ○ وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ

۱۲ کیا تو دیکھو، اچانک بستیوں سے بھاگے جا رہے ہیں!

اب بھاگتے کہاں ہو؟ اپنے اُسی عیش و عشرت میں لوٹو (جس نے تمہیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا) اور اُنہی مکانوں میں (جن کی مضبوطی کا تمہیں غرہ تھا) شاید (وہاں تدبیر و مشورہ میں تمہاری ضرورت ہو، اور) تم سے کچھ دریافت کیا جائے!

۱۴ بستیوں کے باشندوں نے پکارا "افسوس ہم پر! بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے!"

۱۵ تو (دیکھو) وہ برابر یہی پکارا کیے۔ یہاں تک کہ ہم نے (اُنہیں ہلاک کر دیا۔ کٹے ہوئے کھیت کی طرح) بجھے ہوئے انگاروں کی طرح!

۱۶ اور (دیکھو) ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کچھ کھیل تماشہ کرتے ہوئے نہیں بنایا ہے (بلکہ کسی مصلحت و مقصد سے بنایا ہے) اگر ہمیں کھیل تماشہ بنانا منظور ہوتا تو (ہمیں اس سے کون روک سکتا تھا!) ہم خود اپنی جانب سے ایسا ہی کارخانہ بناتے۔ مگر ہم ایسا کرنے والے نہ تھے!

۱۷ بلکہ (یہاں حقیقت حال ہی دوسری ہے) ہم حق سے باطل پر چوٹ لگاتے ہیں۔ تو وہ باطل کا سر کچل ڈالتا ہے اور اچانک اُسے فنا کر دیتا ہے۔ افسوس تم پر، تم کیسی کیسی باتیں بیان کرتے ہو!

۱۸ آسمانوں میں جو کوئی ہے، اور زمین میں جو کوئی ہے

(۵) آیت (۸) میں اُن کے اس وہم کا رد کیا ہے کہ نبیوں کو آدمیوں کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ اور ہونا چاہیے۔ فرمایا۔ یہودیوں اور عیسائیوں سے پوچھ لو خدا کے جو پیغمبر پہلے آچکے ہیں، وہ آدمیوں ہی کی طرح تھے۔ یا ہوا میں اُڑا کرتے تھے!

مشرکین مکہ، ازراہ تحقیر کہا کرتے تھے مالھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق! یہ کیسا نبی ہے کہ آدمیوں کی طرح غذا کا محتاج ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے! فرمایا ہم نے کسی کو ایسا دھڑ نہیں دیا کہ اُسے غذا کی احتیاج نہ ہو اور ہمیشہ زندہ رہے۔ ہمارا قانون حیات یہی ہے کہ جسم ہوگا، تو اُسے قائم رہنے کے لیے غذا کی احتیاج بھی ہوگی

(۶) پھر آیت (۱۰) میں صاف صاف کہہ دیا۔ اگر سچائی کی طلب ہے تو قرآن کو دیکھو۔ اس کی موعظت سے بڑھ کر سچائی کی اور کونسی نشانی ہو سکتی ہے!

اس مقام نے، اور اسی طرح کے اور بے شمار مقامات نے حقیقت قطعی طور پر واضح کر دی ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی صداقت کے لیے جس چیز پر بطور ایک نشانی کے زور دیا ہے، وہ صرف قرآن ہے۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں اس کی مزید وضاحت ملے گی۔

(۷) آیت (۱۶) قرآن کے مہمات دلائل میں سے ہے لیکن بہت کم مفسروں کو اس پر حسب عادت غور کرنے کی مہلت نہ ملی۔ اس سے پہلے پچھلی قوموں کی ہلاکت اور ان کی جگہ نئی جماعتوں کے اُبھرنے کا ذکر کیا تھا۔ فرمایا یہ انقلاب حال کیوں پیدا ہوا؟ آباد و خوشحال بستیاں کیوں کٹے ہوئے کھیتوں کی طرح اُجڑ گئیں؟ زندگی اور حرکت کے بھڑکتے ہوئے شعلے کیوں بجھ کے رہ گئے؟ اس لیے کہ یہاں ہمارا ایک عالمگیر قانون کام کر رہا ہے۔ یعنے حق و باطل کے تزاحم و تنازع کا قانون۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝ (۲۰-۱۹) اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ (۲۱) لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝ (۲۳-۲۲) اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ

سب اُسی کے لیے ہیں۔ جو (فرشتے) اُس کے حضور ہیں، وہ کبھی گھمنڈ میں آکر اُس کی بندگی سے سرتابی نہیں کرتے۔ نہ کبھی (بندگی سے) تھکتے ہیں! (۱۹)

وہ رات دن اُس کی پاکی کے ترانوں میں زمزمہ سنج رہتے ہیں۔ وہ کبھی تھمتے نہیں! (۲۰)

کیا اِن لوگوں نے زمین (کی مخلوقات میں) سے ایسے معبود بنالیے ہیں جو مُردوں کو زندہ کر دیتے ہیں؟ (۲۱)

اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہوتا، تو (ممکن نہ تھا کہ اُن کا کارخانہ اس نظم و ہم آہنگی کے ساتھ چلتا) وہ یقیناً بگڑ کے برباد ہو جاتے!

پس اللہ کے لیے کہ (جہانبانی عالم کے) تخت کا مالک ہے، پاکی ہو۔ اُن ساری باتوں سے پاکی ہو جو یہ اُس کی نسبت بیان کرتے ہیں! (۲۲)

وہ جو کچھ بھی کرے، اُس سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اور سب (اُس کے آگے جوابدہ ہیں۔ اُن) سے باز پرس ہونی ہے! (۲۳)

پھر کیا اِن لوگوں نے اُس کے سوا دوسرے معبود پکڑ رکھے ہیں؟ (اے پیغمبر!) تو اُن سے کہہ دے "اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ۔ تمہاری دلیل کیا ہے؟ یہ ہے وہ کلام جو میرے ساتھیوں کے ہاتھ میں ہے (یعنے قرآن) اور جو مجھ سے پہلوں کے لیے اُتر چکا ہے (یعنے پچھلی کتابیں تم اُن میں کوئی بات بھی میری دعوت کے خلاف نکال

ہم نے کائناتِ ہستی کا یہ پورا کارخانہ ایک فعل عبث کی طرح نہیں بنایا ہے۔ کسی طے شدہ مصلحت و مقصد ہی سے بنایا ہے۔ وہ مقصد کیا ہے؟ یہ کہ کائناتِ ہستی پستی سے بلندی کی طرف برابر ترقی کرتی جائے یہاں تک کہ علو و رفعت کے اُس انتہائی نقطہ تک پہنچ جائے جو کار فرمائے قدرت نے اُس کے لیے ٹھہرا دیا ہے۔ اس مقصد کے لیے کونسا ہاتھ کام کر رہا ہے؟ حق و باطل کی کشاکش کے قانون کا ہاتھ یعنے یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس لیے ہوتا ہے کہ حق باقی رہے اور باطل نابود ہو جائے۔ "حق" اس لیے باقی رہتا ہے کہ اُسی سے بعث اور علو و ارتقاع ہے۔ "باطل" اس لیے نابود ہو جاتا ہے کہ وہ نقص و فساد اور زوال ہے۔

چنانچہ زندگی اور وجود کے ہر گوشہ میں یہ کشاکش جاری ہے۔ فطرت "حق" کے ہتھیار سے "باطل" پر ضرب لگاتی ہے، اور وہ ٹک نہیں سکتا، کیونکہ "حق" کے مقابلہ میں اس کے لیے ٹکنا نہیں۔ پھر اچانک ایسا ہوتا ہے کہ "باطل" ملیامیٹ ہو گیا، اور میدان میں صرف "حق" ہی کی نمود باقی رہ گئی!

(۸) آیت (۲۴) پر پہلے مفسروں نے زیادہ غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن تم سرسری نظر ڈال کے گزر نہ جاؤ۔ ایک لمحہ کے لیے رُک جاؤ۔ یہ استدلال وحدت ادیان کی اصل عظیم کا استدلال ہے جس پر قرآن نے اپنی دعوت کی تمام بنیادیں استوار کی ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ تعلیم حق ہے جو میرے ساتھیوں کے پاس ہے؛

الْحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ ○ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا
فَاعْبُدُونِ ○ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ عِبَادٌ مُكْرَمُونَ ○ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَ
هُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ○ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُمْ
مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ○ وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِنْ دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَٰلِكَ
نَجْزِي الظَّالِمِينَ ○ أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ

اور اسی طرح، تمام تعلیمیں بھی موجود ہیں جو مجھ سے پہلے دی جا چکی ہیں۔ تم کسی تعلیم سے بھی یہ بات ثابت کر دکھاؤ کہ سچائی کی بات وہ نہیں ہے جو میں پیش کر رہا ہوں! پھر اگر بغیر کسی اختلاف کے دنیا کے ہر عہد اور ہر گوشہ کی دینی تعلیم ایک ہی رہی ہے، اور سب نے توحید و خدا پرستی ہی کی طرف بلایا ہے، تو کیا یہ عالمگیر وحدت تعلیم اور باہمدگر تصدیق و توثیق حقیقت کی موجودگی کا ایک قطعی ثبوت نہیں ہے؟ چنانچہ آیت (۲۵) میں وضاحت کر دی کہ دعوت قرآن سے پہلے جتنی دعوتیں بھی دنیا میں اٹھ چکی ہیں، اُن سب کی پکار اس کے سوا کچھ نہیں رہی ہے کہ لا الٰہ الا انا فاعبدون!

یہی بات آگے چل کر سورۂ احقاف میں بھی ملے گی: ائتونی بکتاب من قبل ھذا، او اثارۃ من علم، ان کنتم صدقین! (۴:۴۶) مزید تشریح کے لیے تفسیر فاتحہ بحث وحدت ادیان دیکھو۔

سکتے ہو؟) اصل یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثروں کو حقیقت کا پتہ ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (سچائی سے) رُخ پھیرے ہوئے ہیں!

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر اس بات کی وحی ہم نے نہ بھیجی ہو کہ "کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف میری ذات۔ پس چاہیے کہ میری ہی بندگی کرو!"

اور (دیکھو) اُنہوں نے کہا "خدائے رحمان نے اپنے لیے اولاد بنائی ہے" پاکی ہو اُس کے لیے۔ (جنہیں اُس کی اولاد بناتے ہیں، وہ اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے) بلکہ وہ تو اُس کے معزز بندے ہیں۔ وہ اُس کے آگے بڑھ کے بات نہیں کر سکتے۔ وہ اُس کے حکم پر سرتاسر کاربند رہتے ہیں۔

جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور جو کچھ پیچھے چھوڑ آئے (یعنے اُن کا ماضی بھی اور مستقبل بھی) سب اللہ جانتا ہے۔ اُن کی مجال نہیں کہ کسی کو اپنی سفارش سے بخشوا لیں مگر ہاں جس کسی کی بخشش اللہ پسند فرمائے، اور وہ تو اُس کی ہیبت سے خود ہی ڈرتے رہتے ہیں!

اور ان میں سے اگر کوئی ایسی جرأت کر بیٹھے کہ کہے "اللہ کے سوا میں معبود ہوں" تو اُس کی پاداش میں ہم اُسکو جہنم کی سزا دیں۔ ہم اسی طرح ظلم کرنے والوں کو ان کے ظلم کا بدلہ دیتے ہیں!

(۹) قرآن کا عام اسلوب موعظت یہ ہے کہ توحید ربوبیت و خالقیت سے توحید الوہیت پر استدلال کرتا ہے۔ چنانچہ آیت (۳۰) میں فرمایا کیا منکرین حق اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کس کی قدرت و حکمت نے یہ تمام کارخانۂ خلقت پیدا کیا ہے؟ اور کس کی ربوبیت نے اُسے زندگی اور زندگی کی ساری احتیاجوں کے لیے اس طرح

جو لوگ منکر ہیں، کیا اُنہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین، دونوں (اپنی ابتدائی خلقت میں) ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں الگ الگ کیا، اور پانی سے تمام جاندار چیزیں پیدا

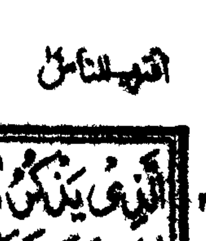
السَّمَاءَ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ○ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا (۳۰)
فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ○ وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ ○ (۳۱-۳۲)
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ○ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن (۳۳)
قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ○ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ (۳۴)
فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ○ وَإِذَا رَآكَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا أَهَٰذَا (۳۵)

(۳۰) کر دیں ! - پھر کیا یہ (اس بات پر) یقین نہیں رکھتے ؟
اور ہم نے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ[۱] بنا دیے کہ ایک طرف کو اُن کے ساتھ جھک نہ پڑے ، اور ہم نے ان میں (یعنے پہاڑوں میں) ایسے درّے[۲] بنا دیے کہ راستوں کا کام دیتے ہیں : تا کہ لوگ اپنی منزل مقصود پا لیں۔ (۳۱)
اور ہم نے آسمان کو ایک چھت کی طرح بنا دیا - (ہر طرح کے نقص اور خرابی سے) محفوظ ! مگر یہ لوگ اُس کی نشانیوں سے رُخ پھیرے ہوئے ہیں ! (۳۲)
اور (دیکھو) وہی ہے جس نے رات اور دن کا اختلاف پیدا کیا ، اور سورج اور چاند بنائے - یہ تمام (ستارے) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں - (۳۳)
اور (اے پیغمبر !) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لیے ہمیشہ زندہ رہنا ہے) پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں ؟ (۳۴)
ہر جان کے لیے موت کا مزہ چکھنا ہے - اور ہم تمہیں (زندگی کی) اچھی بُری حالتوں کی آزمائش میں ڈالتے ہیں تا کہ تمہارے لیے (یعنے تمہاری سعی و طلب کے لیے) آزمائشیں ہوں - اور پھر (بالآخر) تم سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے ! (۳۵)
اور (اے پیغمبر !) جب تجھے وہ لوگ دیکھتے ہیں جنہوں نے انکار حق کی راہ اختیار کی ہے ، تو انہیں اور تو کچھ سوجھتا نہیں ، بس تجھے اپنی ہنسی ٹھٹھے کی بات بنا لیتے ہیں " کیا

موفق و ہم بنا دیا ہے ! اس طریق استدلال کی تشریح تفسیر فاتحہ میں ملے گی - تخلیق کائنات کی جو حالت یہاں بیان کی گئی ہے ، اُس کی تشریح سورۂ یونس کے آخری نوٹ میں گزر چکی ہے -

(۵۱) جب انسان کسی کے بغض و عناد میں کھویا جاتا ہے ، تو پھر اپنی زندگی کا اتنا خواہشمند نہیں رہتا جتنا اُس کی موت کا آرزومند ہو جاتا ہے - دعوتِ حق کے معاندوں کا بھی یہی حال تھا - وہ پیغمبر اسلام کی موت کے خیال سے اپنا جی خوش کیا کرتے تھے ، اور کہتے تھے : آدمی تو کچھ ہونے والا نہیں - ہاں اسی طرح دعوے کرتے کرتے ختم ہو جاوے گا - آیت (۳۴) میں منکروں کی انہی خام خیالیوں کی طرف اشارہ کیا ہے - فرمایا - دنیا میں ہر جان کے لیے مرنا ہے - یہاں کسی کے لیے دائمی زندگی نہ ہوئی پس اصلی سوال مرنے کا نہیں ہے - سوال تو یہ ہے کہ نبلوکم بالشر والخیر فتنۃ - ہم نے آزمائش عمل میں ڈالنے کے لیے خیر و شر کی آزمائشیں پیدا کر دی ہیں - اُن آزمائشوں سے کون کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے ؟ خیر کا سرمایہ جمع کرتا ہے یا شر کا ؟ یہ تمہاری موت کے خیال سے اپنا جی خوش کرتے ہیں مگر خود اپنی زندگی کی

[۱] یقال رسا یرسو - اذا ثبت واقام - قال الشاعر : فصبرت عارفۃ لذالک حرۃ ترسوا اذا نفس الجبان تطلع
[۲] قال الزجاج : کل مخترق بین جبلین ، فہو فج !



۳۶ الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ وَهُم بِذِكْرِ الرَّ [illegible] هُمْ كَافِرُونَ ○ خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَأُرِيكُمْ

۳۷-۳۸ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ○ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ [illegible] الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ

۳۹ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ [illegible] عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ○ بَلْ تَأْتِيهِم

۴۰ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا [illegible] ونَ ○ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ

۴۱ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ [illegible] ○ قُلْ مَن يَكْلَؤُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ

خبر نہیں لیتے!

[illegible] جو ہمارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے؟"

۳۶ اور ان کا حال یہ ہے کہ خدائے رحمان کے ذکر سے یکسر منکر [illegible]

۳۷ [illegible] ہی میں جلد بازی ہے۔ (وہ مستقبل کا انتظار کرنا [illegible]) اچھا عنقریب تمہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں د[illegible]۔ اتنی جلدی نہ کرو!

۳۸ اور یہ کہتے ہیں "اگر تم [illegible] ہو، تو بتلاؤ، یہ وعدہ کب ظہور میں آئیگا؟"

۳۹ اگر یہ منکر اس گھڑی کا حال معلوم کرلیں جب آتشِ (عذاب بھڑکیگی اور اس) کے شعلے نہ تو اپنے آگے سے ہٹا سکینگے نہ پیچھے سے، اور نہ کہیں سے مدد پا سکینگے (تو کبھی اس شوخی و شرارت سے ظہورِ نتائج کا مطالبہ نہ کریں!)

۴۰ بلکہ وہ گھڑی تو ان پر اچانک آموجود ہوگی، اور انہیں مبہوت کردیگی۔ پھر نہ تو اس وقت کو پھرا دے سکینگے اور نہ ہی مہلت پائینگے!

۴۱ اور (اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ تجھ سے پہلے بھی پیغمبروں کی ہنسی اڑائی جا چکی ہے لیکن اس کا نتیجہ یہی نکلا ہے کہ جس بات کی ہنسی اڑاتے تھے (یعنی ظہورِ نتائج کی) وہی بات اُن پر چھا گئی!

(۱۱) قرآن نے جا بجا انسانی طبیعت کے اس خاصہ کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی خواہشوں، رایوں، اور اقدامِ عمل میں جلد باز واقع ہوا ہے۔ یہاں بھی آیت (۳۷) میں اس طرف اشارہ کیا۔ فرمایا۔ جن نتائج کے ظہور کی خبر دی جارہی ہے، وہ عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں، لیکن یہ منکر شور مچا رہے ہیں کہ فوراً ظاہر کیوں نہیں ہو جاتے! اچھا تھوڑا سا انتظار اور کریں۔ بہت جلد سامنے آجائینگے۔

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر انسانی طبیعت میں جلد بازی ہے، تو قرآن اس خاصہ کی مذمت نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک فطرتِ انسانی کا کوئی خاصہ بھی فی نفسہ بُرائی کے لیے نہیں ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (۹۵:۴) ضروری تھا کہ اس کی طبیعت میں جلد بازی ہوتی۔ کیونکہ یہی جلد بازی ہے جو اس کے اندر سعی و عمل کا فوری ولولہ پیدا کرتی ہے، اور اس کی ساری سرگرمیوں کے لیے ایک محرک کا کام دیتی ہے لیکن خواصِ طبیعت کے ہر گوشہ کی طرح، یہاں بھی اسے ٹھوکر اصل خاصہ کے تقاضہ میں نہیں لگتی، بلکہ اس کے بے محل اور بے اعتدالانہ استعمال میں لگتی ہے۔ اسے جہاں صبر کرنا چاہیے، وہاں بے صبری کرنے لگتا ہے، اور جب فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، تو بے دھڑک فیصلہ کر دیتا ہے۔ پس قرآن انسان کی ہر گمراہی کی طرح اس گمراہی میں بھی سوء استعمال کی مذمت کرتا ہے، نہ کہ طبیعت اور خواصِ طبیعت کی۔

۴۲ (اے پیغمبر!) ان سے پوچھو "رات کا وقت ہو یا دن کا، مگر کون ہے جو خدائے رحمان سے تمہاری نگہبانی

الرَّحْمٰنِ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۴۲
نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ○ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۴۳
اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ ۴۴
بِالْوَحْيِ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ○ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ ۴۵
لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط ۴۶

کر سکتا ہے؟ (اگر وہ تمہیں عذاب دینا چاہے؟) مگر ان سے کیا پوچھو گے؟) یہ تو اپنے پروردگار کی یاد سے بالکل رخ پھیرے ہوئے ہیں! ۴۲

پھر کیا اُن کے لیے معبود ہیں جو ہم سے انہیں بچا سکتے ہیں! (بھلا وہ کیا بچائینگے؟) وہ خود اپنی مدد تو کر نہیں سکتے، اور نہ ہماری ہی طرف سے حفاظت پا سکتے ہیں[1]! ۴۳

اصل یہ ہے کہ ہم نے انہیں اور ان کے باپ دادوں کو (فوائد زندگی سے) بہرہ ور ہونے کے موقعے دیئے یہاں تک کہ (خوش حالیوں کی سرشاری میں) ان کی بڑی بڑی عمریں گزر گئیں (اور اب غفلت ان کی رگ رگ میں رچ گئی ہے) مگر کیا یہ لوگ نہیں دیکھ رہے کہ ہم زمین کو چاروں طرف سے اُن پر تنگ کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں! پھر کیا وہ (اس مقابلہ میں) غالب ہو رہے ہیں! ۴۴

(اے پیغمبر!) تو کہہ ”میری پکار اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی وحی سے علم پا کر تمہیں متنبہ کر رہا ہوں“ اور (یاد رکھ) جو بہرے ہیں، اُنہیں کتنا ہی خبردار کیا جائے کبھی سُننے والے نہیں!“ ۴۵

اور اگر اُن پر تیرے پروردگار کے عذاب کی ایک چھینٹ[2] بھی پڑ جائے، تو (ساری سرکشی و شرارت بھول جائیں اور) بے اختیار پکار اُٹھیں ”ہائے افسوس! بلاشبہ ہم ہی ظلم کرنے والے تھے!“ ۴۶

اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو کھڑے کر دینگے پس کسی جان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی۔

(۱۲) آیت (۳۸) سے (۴۷) تک مشرکین مکہ کو ان کی سرکشی و غفلت پر سرزنش کی ہے کہ سچائی کی نشانیاں دیکھتے تھے، بشارت و نذارت کے پیہم اعلانات سُنتے تھے، مگر شرارت سے باز نہیں آتے تھے، اور نصیحت پکڑنے کی جگہ اعلانِ حق کی ہنسی اُڑاتے تھے۔

(۱۳) آیت (۴۵) نے دعوتِ حق کی پوری حقیقت واضح کر دی ہے ”میں تمہیں وحی الٰہی سے خبر پا کر متنبہ کر رہا ہوں۔ مگر جانتا ہوں، جو بہرے ہیں، اُنہیں کتنا ہی خبردار کیا جائے سُننے والے نہیں!“

(۱۴) آیت (۴۷) میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ فطرت کا ترازو بڑا ہی دقیقہ سنج ہے۔ ایک ذرہ بھی اس کی تول میں کم نہیں ہو سکتا، کوئی عمل کتنا ہی حقیر ہو۔ مثلاً تم نے کسی مصیبت زدہ پر ہمدردی کی ایک اُٹھتی ہوئی نظر ڈال دی۔ راہ چلتے ایک پتھر ہٹا دیا، ایک پیاسی چیونٹی کے آگے پانی کا قطرہ ٹپکا دیا، مگر ضروری ہے کہ اس کے

[1] العرب تقول "صحبک اللہ" ای حفظک واجارک۔ قال الشاعر:-
ینادی باعلی صوتہ متعوذا — لیصحب منا والرماح دوانی!

[2] قال ابن کیسان "النفحۃ" ای الشی القلیل ماخوذ من نفح المسک۔ وقال المبرد "النفحۃ" الدفعۃ من الشی التی دون معظمہ۔ یقال نفحہ نفحۃ بالسیف اذا ضربہ ضربۃ خفیفۃ۔

۴۷ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۖ وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ ۝ ۴۸ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ ۝ ۴۹ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَهُم مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ ۝ ۵۰ وَهَٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ ۚ أَفَأَنتُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ۝ ۵۱ وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ۝ ۵۲ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ۝ ۵۳ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ۝ ۵۴ قَالَ لَقَدْ كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ ۵۵ قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ ۝

ع ۴

اگر رائی برابر بھی کسی کا عمل ہوگا، تو ہم اسے وزن میں لے آئینگے جب ہم (خود) حساب لینے والے ہوں، تو پھر اُس کے بعد کیا باقی رہا؟

۴۸ اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان، (یعنے حق کو باطل سے الگ کردینے والی قوت) اور (وحی الٰہی کی) روشنی، اور متقیوں کے لیے نصیحت دی تھی۔ اُن متقیوں کے لیے جو اپنے پروردگار

۴۹ کی ہستی سے بغیر اُسے دیکھے ہوئے، ڈرتے رہتے ہیں، اور آنے والی گھڑی کے تصور سے بھی لرزاں رہتے ہیں!

وزن میں آجائے۔ ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ رائیگاں جائے۔

اور تم خود اپنی زندگی ہی میں دیکھ لو، فطرت کے قانون مجازات کی دقائق اندیشیوں کا کیا حال ہے؟ تم نے ایک پل کے لیے کسی پر ہمدردی کی نظر ڈالی، اور معاً تمہارے اندر حسن اخلاق کا ایک نقش جم گیا۔ تم نے کسی جانور پر بھی بے رحمی کی نگاہ ڈالی، اور تمہارے آئینۂ اخلاق میں قساوت کا بال پڑگیا۔ تمہاری کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی تمہیں بدلہ دیے بغیر نہیں رہ سکتی، اور بدلہ ٹھیک ٹھیک نپا تُلا ہوتا ہے۔ رائی برابر بھی ادھر اُدھر نہیں!

۵۰ اور یہ (قرآن) بھی نصیحت ہے، برکت والی ہم نے اسے نازل کیا۔ پھر کیا تمہیں اس سے انکار ہے؟

۵۱ اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اُس کے درجہ کے مطابق[1] سمجھ بوجھ عطا فرمائی تھی، اور ہم اُس کی حالت سے بے خبر نہ تھے۔

۵۲ جب اُس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا "یہ کیا مورتیاں ہیں جنکی پوجا پر تم جم کر بیٹھ گئے ہو؟"

۵۳ تو اُنہوں نے جواب دیا تھا "ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا، انہی کی پوجا کرتے تھے"

۵۴ ابراہیم نے کہا "یقین کرو۔ تم خود بھی اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے"

۵۵ اس پر اُنہوں نے کہا "تو ہم سے سچ مچ کہہ رہا ہے یا مزاح کر رہا ہے؟"

(۵۱) آیت (۴۸) سے سلسلۂ بیان اس طرف متوجہ ہوگیا ہے کہ مذکورۂ صدر مقاصد پر گزشتہ دعوتوں اور قوموں کی سرگزشتوں سے استشہاد کیا جائے۔ چنانچہ پہلے حضرت موسیٰ کی دعوت کی طرف اشارہ کیا جن کی کتابِ وحی کا حال عام طور پر معلوم و مسلم تھا۔ فرمایا۔ اسی طرح قرآن کا بھی نزول ہوا ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منکر ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام سلسلۂ وحی و تنزیل سے منکر ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم کی زندگی کا وہ ابتدائی واقعہ بیان کیا ہے جو اُن کے وطن "اور" میں پیش آیا تھا، جہاں سے ہجرت کر کے وہ کنعان گئے اور وہیں بقیہ عمر کے لیے بس گئے۔

[1] "ولقد اٰتینا ابراھیم رشدہٗ" ای الرشد اللائق بہ وبامثالہ من الرسل۔ مترجموں نے "رشدہٗ" کی ضمیر کا مطلب بالکل ضائع کردیا۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ ۵۶
وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ ۵۷
اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ ۝ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی ۵۸-۵۹
یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِیْمُ ۝ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤی اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ ۝ قَالُوْۤا ۶۰-۶۱
ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖۗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا ۶۲
یَنْطِقُوْنَ ۝ فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤی اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰی رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ ۶۳-۶۴
عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ یَنْطِقُوْنَ ۝ ۶۵

ابراہیم نے کہا "نہیں، میں کہتا ہوں. آسمان اور زمین کا پروردگار جس نے ان سب کو پیدا کیا، وہی تمہارا بھی پروردگار ہے - میں اس حقیقت پر تمہارے آگے گواہ ہوں!" ۵۶

" اور (ابراہیم نے کہا) بخدا! میں ضرور تمہارے ان بتوں کے ساتھ ایک چال چلونگا جب تم سب پیٹھ پھیر کے چل دو گے" ۵۷

چنانچہ (اُس نے ایسا ہی کیا) اُس نے بتوں کو توڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا. صرف ایک بت جو اُن میں بڑا سمجھا جاتا تھا، چھوڑ دیا کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں. ۵۸

اُنہوں نے کہا (یعنے جب لوگ معبد میں واپس آئے تو یہ حال دیکھ کر کہنے لگے) "ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی؟ جس کسی نے کی ہو، وہ بڑا ہی ظالم آدمی ہے" ۵۹

چند آدمیوں نے کہا "ہم نے ایک نوجوان کو ان کے بارے میں کچھ کہتے سنا تھا. اسی ابراہیم کہہ کے پکارتے ہیں" ۶۰

لوگوں نے کہا "اُسے یہاں تمام آدمیوں کے سامنے بلا لاؤ. تاکہ سب گواہ رہیں" ۶۱

ان لوگوں نے ابراہیم سے کہا (کیونکہ اب اُسے بلا لائے تھے) "ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی؟" ۶۲

ابراہیم نے کہا "بلکہ (یوں سمجھو) اس بت نے کی، جو ان میں سب سے بڑا ہے. اگر بت بول سکتے ہیں تو خود اسی سے دریافت کر لو" ۶۳

تب وہ آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے. اُنہوں نے کہا "اس میں شک نہیں ناانصافی کی بات تو ہم ہی سے ہو گئی" ۶۴

پھر وہ اس حال میں پڑ گئے کہ (شرم و خجالت سے) سر جھکے ہوئے تھے. اُنہوں نے کہا "تو اچھی طرح جانتا ہے یہ بت بات نہیں کیا کرتے" ۶۵

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ ٦٦
دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ ٦٧، ٦٨
بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ۝ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ ٦٩، ٧٠
الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَ ٧١، ٧٢
جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۤءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ
كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ ٧٣

ابراہیم نے کہا "پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جو تمہیں نہ تو کسی طرح کا نفع
٦٦ پہنچائیں نہ نقصان! تمہاری حالت کتنی ناقابل برداشت ہے، اور ان کی بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے
٦٧ ہو، کیا تم عقل سے بالکل کورے ہوگئے؟"

اُنہوں نے (آپس میں) کہا "اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہو
٦٨ تو آؤ، اس آدمی کو آگ میں ڈال کر جلا دیں اور اپنے
معبودوں کا بول بولا کریں"
(مگر) ہمارا حکم ہوا "اے آگ! ٹھنڈی ہو جا، اور ابراہیم
٦٩ کے لیے سلامتی!"
اور (دیکھو) اُنہوں نے چاہا تھا، ابراہیم کے ساتھ
٧٠ ایک چال چلیں، لیکن ہم نے اُنہیں نامراد کر دیا۔ ہم
نے اُسے اور (اُس کے بھتیجے) لوط کو (دشمنوں سے)
نجات دلا کر ایک ایسے ملک میں پہنچا دیا جسے قوموں کے
٧١ لیے (بڑا ہی) بابرکت ملک بنایا ہے (یعنے سرزمین کنعان)
اور (پھر) ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحاق عطا
٧٢ فرمایا، اور مزید براں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو ہم نے نیک کردار بنایا تھا۔ ہم نے اُنہیں (انسانوں کی)
پیشوائی دی تھی۔ ہمارے حکم کے مطابق وہ راہ دکھاتے تھے۔ ہم نے اُن پر وحی بھیجی کہ ہر طرح کی بھلائی کے کام
٧٣ انجام دیں۔ نیز نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ وہ ہماری بندگی میں لگے رہتے تھے!
اور (اسی طرح) لوط کو بھی ہم نے (احکامِ حق دینے کا) منصب اور (نبوت کا) علم عطا فرمایا۔ ہم نے اُس بستی
سے اُسے نجات دیدی جس کے باشندے بڑے ہی گندے کام کیا کرتے تھے، اور کچھ شک نہیں، بڑے ہی

(۱۶) حضرت ابراہیم نے جب دیکھا کہ بتوں کی عظمت لوگوں کے دلوں میں اس طرح جم گئی ہے کہ عقل و بصیرت کی کوئی صدا بھی اُسے متزلزل نہیں کر سکتی، تو اعلانِ حقیقت کے لیے اُنہوں نے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ایسا طریقہ کہ تمام لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اُن کے معبود خود اُن سے بھی زیادہ عاجز اور بے بس ہیں، اور وہمی اور روایتی عقیدت کے سوا کوئی حقیقت موجود نہیں۔ تشریح اس کی سورت کے آخر میں ملیگی۔
جب لوگ اس مقابلہ میں عاجز و درماندہ ہوگئے، تو پھر جیسا کہ جہل و تعصب کا قاعدہ ہے، ظلم و تشدد پر اتر آئے۔ اُنہوں نے چاہا حضرت ابراہیم کو زندہ آگ میں جلا دیں۔ لیکن اللہ نے اُن کے سارے منصوبے ہی خاک میں ملا دیے، اور حضرت ابراہیم زندہ و سلامت وہاں سے نکل کر کنعان چلے گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے بھتیجے حضرت لوط بھی تھے۔ ان دونوں کے توطن کنعان کی تفصیل بہ ضمن آیت (۲۹) سورۂ ہود میں گزر چکی ہے

كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً

بدراہ، حد سے گزرے ہوئے لوگ تھے۔ (ہم نے اُن سے لوط کو نجات دی) اور اپنی رحمت کی پناہ میں لے لیا۔ یقیناً وہ نیک کردار انسانوں میں سے ایک انسان تھا!

اور (اسی طرح) نوح کا معاملہ (بھی یاد کرو) جو اُن (نبیوں) سے پیشتر کا ہے۔ جب اُس نے ہمیں پکارا تھا، تو (دیکھو) ہم نے اُس کی پکار سُن لی۔ اور اُسے اور اُس کے گھرانے کو ایک بڑی ہی سختی سے نجات دیدی۔ نیز اُن لوگوں کے مقابلہ میں جو ہماری نشانیاں جھٹلاتے تھے، اُس کی مدد کی۔ وہ بڑے ہی بدراہ لوگ تھے پس ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا!

اور داؤد اور سلیمان (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب وہ (ملک کے) کھیت میں کہ لوگوں کی بکریاں اُس میں منتشر ہوگئی تھیں حکم چلاتے تھے، اور ہم اُن کی حکم فرمائی دیکھ رہے تھے۔ پس ہم نے سلیمان کو اُس بات کی پوری سمجھ دیدی، اور ہم نے حکم دینے کا منصب اور (نبوت کا) علم ان میں سے ہر ایک کو عطا فرمایا تھا۔ نیز ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لیے مسخر کر دیا تھا۔ وہ اللہ کی پاکی کی صدائیں بلند کرتے تھے، اور اسی طرح پرندوں کو بھی۔ اور ہم (ایسا ہی) کرنے والے تھے۔

اور (دیکھو) ہم نے داؤد کو تمہارے لیے زرہ بکتر بنانا سکھا دیا کہ تمہیں ایک دوسرے کی زد سے بچائے۔ پھر کیا تم (ہماری بخششوں کے) شکر گزار ہو؟

اور (دیکھو) ہم نے (سمندر کی) تند ہواؤں کو بھی

(۱۷) اگر ایک آدمی ایک طرف کھیت بوئے، دوسری طرف رات کو اپنی بکریاں بھی کھول دیا کرے تو کیا نتیجہ نکلیگا؟ یہی کہ ساری فصل تباہ ہو جائیگی۔ وہ جتنا چر سکینگی، چر لینگی، جتنا روند سکینگی، روند جائینگی!

یہی حال یہودیوں کا تھا۔ وہ ایک طرف بناتے تھے، دوسری طرف خود اپنے ہی ہاتھوں اُسے اُجاڑ دیتے تھے۔ حضرت داؤد نے انہیں فلسطینیوں پر فتح مند کرایا، اور تمام ملک ساحل بحر تک اُن کے قبضہ میں آگیا، لیکن پھر بھی ان میں نظم و اطاعت کی روح پیدا نہ ہوئی۔

البتہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں ایک نیا انقلاب رونما ہوا اور انہوں نے اپنی دانش و حکمت نبوت سے یہودیوں کی حالت ایسی پلٹ دی کہ ایک عظیم الشان عبرانی مملکت قائم ہوگئی۔

آیت (۸۰) میں اسی صورت حال کی طرف غالباً اشارہ کیا گیا ہے۔

آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "الحرث" سے مقصود کوئی خاص کھیتی ہو، اور غنم القوم سے کسی خاص گروہ کی بکریاں یعنی کسی کا کھیت تھا، اور کسی کی بکریاں اُس میں جا پڑی تھیں۔ اس جھگڑے

۸۱ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ

۸۲ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِيَ

۸۳ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ

۸۴ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ

۸۵ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ

سلیمان کے لیے کیسا مسخر کر دیا تھا کہ اُس کے حکم پر چلتی تھیں اور اُس سرزمین کے رُخ پر جس میں ہم نے بڑی ہی برکت رکھ دی ہے (یعنے فلسطین اور شام کے رخ پر جہاں (بحر احمر اور بحر متوسط سے دور دور کے جہاز آتے تھے) اور ہم ساری باتوں کی آگاہی رکھتے ہیں! ۸۱

کا فیصلہ دونوں نے کیا۔ حضرت داؤد نے بھی اور حضرت سلیمان نے بھی، اور فیصلہ حضرت سلیمان کا زیادہ قوی اور اوفق تھا۔ مزید تشریح عام تفاسیر میں ملے گی۔

اور شیطانوں میں سے ایسے شیطان، جو اُس کے لیے غوطے لگاتے، اور اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے کام کرتے، اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لیے ہوئے تھے۔ ۸۲

اور ایوب (کا بھی معاملہ یاد کرو) جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا "میں دُکھ میں پڑ گیا ہوں اور خدایا! تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں!" ۸۳

پس ہم نے اُس کی پکار سُن لی اور جس دُکھ میں پڑ گیا تھا، وہ دور کر دیا۔ ہم نے اُس کا گھرانا (پھر سے) بسا دیا، اور اس کے ساتھ ویسے ہی (عزیز و اقارب) اور بھی دیے۔ یہ ہماری طرف سے اُس کے لیے رحمت تھی، اور یہ نصیحت ہے اُن کے لیے جو اللہ کی بندگی کرنے والے ہیں! ۸۴

اور (اسی طرح) اسماعیل، ادریس، اور ذوالکفل۔ سب (راہِ حق میں) صبر کرنے والے تھے ہم نے انہیں

(۱۸) آیت (۷۹) میں "یُسَبِّحْنَ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ، جو "ان من شیء الا یسبح بحمدہ" میں ہے۔ دوسرا یہ کہ جب حضرت داؤد حمد الٰہی کے نغمے گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا، اور چٹانیں تک وجد میں آجاتی تھیں! لہ

حضرت داؤد بڑے ہی خوش آواز تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عبرانی موسیقی مدون کی اور مصری اور بابلی مزامیر کو ترقی دے کر نئے نئے آلات ایجاد کیے۔

تورات اور روایات یہود سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر حمد الٰہی کے ترانے گاتے اور اپنا بربط بجاتے تو شجر و حجر جھومنے لگتے تھے۔

روایاتِ تفسیر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ پرندوں کی تسخیر کو بھی دونوں باتوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس پر بھی کہ ہر طرح کے پرندان کے محل میں جمع ہو گئے تھے، اور اس پر بھی کہ ان کی نغمہ سرائیوں سے متاثر ہوتے تھے۔

کتاب زبور دراصل اُن گیتوں کا مجموعہ ہے جو حضرت داؤد نے الہام الٰہی پر نظم کی تھیں۔

لہ التسبیح اما حقیقة او مجاز۔ وقد قال بالاول جماعة وهو الظاهر۔ وقال بالمجاز آخرون۔ وحملوا التسبيح على تسبيح من رآها، تعجبا من عظم خلقها وقدرة خالقها (فتح القدير للشوكاني) قلت ولكل وجهة هو موليها، فاستبقوا الخيرات۔

وَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُـنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَزَكَرِيَّاۤ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ○ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ

۸۷ ۸۸ ۸۹

اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیا۔ یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے۔

۸۷ اور (اسی طرح) ذوالنون (کا معاملہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ وہ (راہِ حق میں) خشمناک ہو کر چلا گیا پھر اس نے خیال کیا، ہم اُسے تنگی میں نہیں ڈالینگے لیکن پھر (جب اُس پر حالت تنگ ہوئی تو مایوسی کی) تاریکیوں میں اُس نے پکارا "خدایا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں! تیرے لیے (ہر طرح کی) پاکی ہو! حقیقت یہ ہے کہ میں نے (اپنے اوپر) بڑا ہی ظلم کیا!"

۸۸ تب ہم نے اُس کی پکار سن لی، اور غمگینی سے اُسے نجات دی (دیکھو) ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں!

۸۹ اور (اسی طرح) زکریا (کا معاملہ یاد کرو) جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا "خدایا! مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ (یعنے بغیر وارث کے نہ چھوڑ) اور یوں تو تو ہی (ہم سب کا) بہتر وارث ہے!"

تو (دیکھو) ہم نے اُس کی پکار سن لی۔ اُسے (ایک فرزند) یحییٰ عطا فرمایا، اور اُس کی بیوی کو اس کے لیے تندرست کر دیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے، (ہمارے فضل سے) اُمید لگائے ہوئے اور

(۱۹) جس وقت تک آتشیں اسلحہ ایجاد نہیں ہوئے تھے جنگ میں حفاظت کا بڑا ذریعہ آہنی لباس کا استعمال تھا یعنے زرہ کا۔ آیت (۸۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد نے اس صنعت کو بہت فروغ دیا تھا، اور اس میں طرح طرح کی نئی ایجادات کی تھیں۔ تاریخی آثار سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک ہزار سال قبل مسیح تک زرہ کا استعمال قوموں میں دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اس کے بعد سے خود کا استعمال شروع ہو جاتا ہے، اور پھر دوسری چیزیں بھی مستعمل ہونے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ سکندر کے عہد میں یونانی اور ایرانی، دونوں سرتاپا آہن پوش ہو گئے تھے۔

(۲۰) آیت (۸۱) میں فرمایا۔ ہم نے سمندر کی باد تند سلیمان کے لیے مسخر کر دی تھی۔ یعنے بادبانی کے بڑے بڑے جہاز چلنے لگے تھے۔ اور خشکی کے جانوروں کی طرح سمندر کی ہوائیں بھی اُن کے لیے باربرداری اور نقل و حرکت کا ذریعہ ہو گئی تھیں۔

سمندر کی ہواؤں کا معاملہ بھی قدرت کے عجائب مظاہر میں سے ہے۔ جس وقت تک دُخانی قوت کا انکشاف نہیں ہوا تھا بحری سیر و سیاحت کا ذریعہ یہی ہوائیں تھیں۔ یہ مختلف جہتوں میں چلتی ہیں، اور مختلف وقتوں میں چلتی ہیں، اور اُن کی جہتیں اور اوقات اس درجہ معین اور منضبط ہیں کہ کبھی اُن میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ پھر اُن کی تندی و طاقت کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے جہازوں کو تنکوں کی طرح سطح سمندر پر دوڑاتے ہوئے لے جاتی ہیں!

قدیم عہدوں میں حضرت سلیمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے جہازوں سے اس طرح کام لینا شروع کیا کہ ہندوستان اور مغربی جزائر تک بحری آمد و رفت کا منظم سلسلہ قائم ہو گیا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تجارتی بیڑہ وقت کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑہ تھا

لہ "لن نقدر علیہ" ای لن نضیق علیہ۔ یقال قدر و قدر، وقتر و قتر، ای ضیق۔ ومنہ قولہ "یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر" ای یضیق ومن قدر علیہ رزقہ"

۹۰ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ○ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ

۹۱، ۹۲ جَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ○ وَتَقَطَّعُوْٓا

۹۳ ع (۱۸) اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ○ع فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ

۹۴ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ○ وَحَرٰمٌ عَلٰي قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ

(ہمارے جلال سے) ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے آگے عجز و نیاز سے جھکے ہوئے تھے!

اور (اسی طرح) اُس عورت کا معاملہ جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی، (یعنے مریم کا معاملہ) پس ہم نے اپنی رُوح میں سے (یعنے اپنے ملائکہ کے جوہر ملکوتیت میں سے ایک جوہر) اُس میں پھونک دیا اور اُسے اور اس کے بیٹے (مسیح) کو تمام دنیا کے لیے (سچائی کی) ایک نشانی بنا دیا!

(ان تمام رسولوں کے ذریعہ ہم نے جو تعلیم دی تھی، وہ یہی تھی کہ) "یہ تم سب کی اُمت فی الحقیقت ایک ہی اُمت ہے (الگ الگ دین اور الگ الگ گروہ بندیاں نہیں ہیں) اور میں ہی تم سب کا (تن تنہا) پروردگار ہوں پس چاہیے کہ میری ہی بندگی کرو" (اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو)

مگر لوگوں نے آپس میں اختلاف کر کے اپنے (ایک ہی) دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ (بالآخر) سب کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔

پس (یاد رکھو۔ اصل اس باب میں یہ ہے کہ) جس کسی نے نیک کام کیے اور وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اُس کی کوشش اکارت جانے والی نہیں۔ ہم اس کی نیکیاں لکھ لینے والے (موجود) ہیں!

اور (دیکھو) جس آبادی کے لیے ہم نے ہلاکت ٹھہرا دی

بحر احمر میں اُس کا مرکز "ترسیس" تھا، جو خلیج عقبہ میں واقع تھا، اور بحر متوسط میں صور، طائر، یافہ کی بندرگاہیں۔

فلسطین کا علاقہ ایسے گوشہ میں واقع ہوا ہے کہ اس کے مغرب و شمال میں بحر متوسط ہے، اور جنوب میں بحر احمر پس اُسے متضاد سمتوں کی ہوائیں چاہئیں تاکہ دنیا کے جہاز اس کے ساحلوں تک پہنچ سکیں۔ یعنے بحر احمر میں شمالی ہوا اور متوسط میں جنوبی اور مشرقی اور اگرچہ دونوں سمندروں کا باہمی فاصلہ کچھ زیادہ نہیں، لیکن قدرتِ الٰہی نے ان کی ہواؤں کی سمتیں ایسی ہی رکھ دی ہیں، بیک وقت بحر احمر میں بادِ شمال کے جھونکے چلتے ہیں اور متوسط میں بادِ جنوب کے اور دونوں یکساں طور پر سواحل شام و فلسطین کے لیے مفید ہیں۔

اس تفصیل کے بعد "الی الارض التی بارکنا فیھا" کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

(۳۱) قرآن میں شیطان کا اطلاق شیاطین الجن پر بھی ہوا ہے اور شیاطین الانس پر بھی۔ مثلاً انما ذلکم الشیطان یخوف اولیاءہ (۳: ۱۶۹) میں شیطان سے مقصود قریش مکہ کا بھیجا ہوا جاسوس ہے یا واذ زین لھم الشیطان اعمالھم (۸: ۴۸) میں شیطان کا اطلاق سراقہ بن مالک ابن جعشم پر کیا گیا جو قریش کو لڑائی پر اُبھارتا تھا مگر پھر بھاگ گیا۔

پس یہاں آیت (۸۲) میں بھی معلوم ہوتا ہے، شیاطین کا اطلاق شیاطین الانس ہی پر ہوا ہے۔ یعنے فلسطین اور شام کی ان شریر اور سرکش قوموں پر جو حضرت سلیمان کے عہد میں بالکل مطیع و منقاد ہو گئی تھیں، اور اُنہوں نے ہیکل کی تعمیر میں تیرہ برس تک ہر طرح کی سخت سخت خدمتیں انجام دی تھیں۔

ہیکل کی بنیاد حضرت داؤد نے ڈال دی تھی لیکن تعمیر حضرت سلیمان

أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ ۝ وَاقْتَرَبَ ۹۵-۹۶
الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا
بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ۝ ۹۷-۹۸
لَوْ كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ۝ ۹۹-۱۰۰
إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۝ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا وَهُمْ ۱۰۱

تو اس کے لیے (کامیابی و سعادت) ممکن نہیں۔ وہ کبھی (اپنی سرکشی و غفلت سے) لوٹنے والے نہیں! ۹۵

جب وہ وقت آجائیگا کہ یاجوج اور ماجوج کی راہ کھل جائیگی، (زمین کی) تمام بلندیوں سے وہ دوڑتے ہوئے اُترآئینگے، اور (خدا کے ٹھہرائے ہوئے) سچے ۹۶ وعدہ کی گھڑی قریب آجائیگی، تو اُس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ لوگوں کی آنکھیں (شدتِ دہشت و حیرت سے) کھُلی کی کھُلی رہجائینگی۔ اُن لوگوں کی آنکھیں جنہوں نے (سچائی سے) انکار کیا تھا۔ (وہ پکار اُٹھینگے) "افسوس ہم پر! ہم اس (ہولناک گھڑی) سے غفلت میں رہے۔ بلکہ ہم ظلم و شرارت میں سرشار تھے!" ۹۷

تم اور وہ تمام چیزیں جن کی اللہ کو چھوڑکر پوجا کرتے ہو، دوزخ کا ایندھن ہیں۔ تم سب وہاں پہنچنے والے ہو۔ ۹۸

اگر یہ چیزیں سچ مچ کو معبود ہوتیں، تو کبھی دوزخ میں نہ پہنچتیں، حالانکہ سب اس میں ہمیشہ کے لیے رہنے والے ہیں! ۹۹

ان کے لیے دوزخ میں (صرف دُکھ اور جلن کی) چیخیں ہونگی، اور وہ (اور کچھ) نہیں سُنینگے۔ ۱۰۰

(مگر) جن لوگوں کے لیے ہم نے پہلے سے بھلائی کا حکم دیدیا، تو وہ یقیناً دوزخ سے دور کردیے گیے۔ وہ ۱۰۱ (اس سے اتنے دور ہونگے کہ) وہاں کی (اذیتوں کی) بھنک

نے کی۔ تورات کی کتاب سلاطین اول سے معلوم ہوتا ہے کہ تیس ہزار آدمی تیرہ برس تک کام میں لگے رہے، تب کہیں جاکر عمارت طیار ہوئی تھی۔

(۲۲) عہد عتیق میں "ایوب" کے نام سے ایک صحیفہ ہے، اور اس میں اس نام کے ایک راست باز اور صابر انسان کی سرگزشت لکھی ہے۔ آیت (۸۳) میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سرگزشت کا خلاصہ یہ ہے کہ "عوض کے ملک میں ایوب ایک کامل اور راست باز انسان تھا۔ خدا نے اُسے بڑا خاندان اور بڑی دولت دے رکھی تھی۔ اُس کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل، اور پانچ سو باربرداری کے گدھے تھے۔ اس کے نوکر چاکر بھی بے شمار تھے، اور اہل مشرق میں اس درجہ کا دولتمند کوئی نہ تھا۔ وہ اس دولت و شوکت کے لیے خداوند کا شکرگزار تھا اور ہمیشہ بدی سے دور رہتا تھا"

لیکن پھر زندگی کی ساری مصیبتیں اُن پر آپڑیں۔ اُن کے مویشی لوٹ لیے گئے۔ نوکر چاکر قتل ہو گئے۔ اولاد مرگئی۔ جاہ و حشم نابود ہوگیا اور زندگی کی خوش حالیوں میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ رہی۔ پھر بربادیوں کے یہ تمام زخم ایک ایک کرکے نہیں لگے کہ سنبھلنے اور جھیلنے کی مہلت ملی ہو۔ یہ یک وقت لگے، اور اچانک دنیا کچھ سے کچھ ہوگئی!

لیکن عین اس حالت میں بھی حضرت ایوب کی زبان سے کلمۂ صبر و شکر کے سوا اور کچھ نہیں نکلا: "وہ سجدے میں گر پڑا، اور کہا۔ میں اپنی ماں کے پیٹ سے برہنہ پیدا ہوا تھا، اور برہنہ ہی دنیا سے جاؤنگا۔ خداوند نے مجھے دیا تھا۔ اور خداوند نے لے لیا۔ اُس کے نام کے لیے ساری پاکیاں اور مبارکیاں ہوں!" (ایوب ۱: ۲۲)

۱۰۲ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ ۝ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ
۱۰۳ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ
۱۰۴ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ۝ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ
۱۰۵ ۱۰۶ ۱۰۷ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ قُلْ
إِنَّمَا يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَهَلْ أَنتُم

سب کچھ جا چکا تھا مگر جسم کی تندرستی باقی رہ گئی تھی۔ اب اس نے بھی جواب دیدیا: "اور ایوب کے تلوے سے لیکے سر کی چاندی تک، سارے جسم میں جلتے ہوئے پھوڑے نکل آئے۔ وہ ایک ٹھیکرا لے کر اپنا جسم کھجاتا اور راکھ پر بیٹھا رہتا" (۲: ۸)

لیکن اس پر بھی اُن کی زبان ایک لمحہ کے لیے شکوہ و شکایت سے آلودہ نہ ہوئی!

اب درد و مصیبت کی یہ حالت برابر بڑھتی ہی جاتی ہے۔ لیکن جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، روح کا یقین، دل کا صبر، اور زبان کا زمزمۂ شکر بھی بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ تمام صحیفۂ ایوب اُنہی دلنشین مواعظ کا مجموعہ ہے جو اُن کے درد و غم کی آہوں اور کرب و اذیت کی صداؤں کے اندر نمایاں ہوئے۔ اُن کی ہر آہ حمد و ثنا کا نغمہ تھی اور ہر پکار صبر و شکر کی تلقین۔ اسلوب بیان یہ ہے کہ تین دوست مصیبت کا ماتم کرتے ہیں اور اللہ کے کاموں اور حکمتوں پر ان سے رد و کد کرتے ہیں۔ پھر اللہ کی وحی اُنہیں مخاطب کرتی ہے، اور اُن کی آزمائش کا دور ختم ہو جاتا ہے: "اور خداوند نے ایوب کی حالت بدل دی اُسے پہلے کی نسبت دو چند دولت عنایت کی۔ اس کے تمام عزیزوں کو اس کے گرد جمع کر دیا۔ اُسے آخری عمر میں پہلے کی طرح اولاد ملی۔ وہ ایک سو چالیس برس تک جیا، اور اپنی نسل کی چار پشتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں" (۴۲: ۱۰)

اس بات کے اظہار کے لیے کہ یہ حضرت ایوب کے لیے ایک آزمائش تھی، پیرایۂ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ "شیطان نے کہا۔ ایوب کی خدا پرستی و راست بازی اس لیے ہوئی کہ خدا نے اُسے ہر طرح کی خوشحالیاں دے رکھی ہیں۔ اگر وہ ان سے محروم ہو جائے تو پھر کبھی خدا کا شکر گزار نہ ہو" لیکن وہ خوشحالیوں سے محروم ہو گئے پھر بھی ان کا ایمان و یقین گھٹنے کی جگہ اور زیادہ بڑھ گیا!

قرآن نے صبر و شکر کی یہ پوری داستان یہاں صرف چند جملوں

بھی اُن کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔ وہ اپنی پسند اور خواہش کی تمام نعمتوں میں ہمیشہ کے لیے مگن رہیں گے!

اُنہیں (روز قیامت کی) بڑی سے بڑی ہولناکی بھی ہراساں نہ کریگی۔ فرشتے اُنہیں بڑھ کر لینگے۔ (اور کہینگے:) "یہ ہے وہ تمہارا دن، جس کا (کلام حق میں) وعدہ کیا گیا تھا!"

وہ دن، جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دینگے جیسے بہی کھاتوں کے طومار لپیٹ لیے جاتے ہیں۔ ہم نے جس طرح پہلی پیدائش شروع کی تھی، اُسی طرح اُسے دہرائیں گے بھی۔ اس وعدہ کا پورا کرنا ہم پر ہے، اور ہم پورا کر کے رہینگے!

اور (دیکھو) ہم نے زبور میں تذکیر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ "زمین کی وراثت اُنہی بندوں کے حصے میں آئیگی جو نیک ہونگے" اس بات میں اُن لوگوں کے لیے جو عبادت گزار ہیں، ایک بڑا ہی پیام ہے،

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر اس لیے کہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہو!

تو کہہ دے "مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے، وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی تنہا معبود ہے (اس کے سوا کوئی نہیں) پس بتلاؤ، تم اس کے آگے سر جھکاتے

مُسْلِمُونَ ۝ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۖ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ ۝ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ۝ وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ ۗ وَرَبُّنَا الرَّحْمَٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝ ع

۱۰۸ ہو یا نہیں ؟"

۱۰۹ پھر اگر وہ روگردانی کریں، تو کہدے "میں نے تمہیں (انکار و سرکشی کے نتائج سے) یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے۔ میں نہیں جانتا جس بات کا وعدہ کیا گیا ہے، اُس کا وقت قریب آلگا ہے یا ابھی دور ہے۔ (تاہم وہ ٹلنے والا نہیں)

۱۱۰ اللہ کے علم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں، جو کچھ پکار کے (علانیہ) کہا جاتا ہے، وہ بھی، اور جو کچھ تم (دلوں میں چھپائے) ہوئے ہو، وہ بھی۔ اور مجھے کیا معلوم؟ ہو سکتا ہے کہ اس (تاخیر) میں تمہارے لیے آزمائش رکھ دی گئی ہو اور یہ بات ہو کہ ایک مقررہ وقت تک زندگی کا لطف اٹھالو!

۱۱۱ اُس نے کہا (یعنے پیغمبر نے دعا کرتے ہوئے عرض کیا): "خدایا! اب (دیر نہ کر) سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے۔

۱۱۲ اور ہمارا پروردگار تو (وہی) الرحمٰن ہے۔ اُسی سے مدد مانگی گئی ہے۔ جیسی کچھ باتیں تم بنا رہے ہو، ان کے خلاف اسی کی مددگاری فیصلہ کر دیگی!

سا بیان کر دی ہے، اور اس کا ایجاز بلاغت اتنا ہی موثر ہے، جتنا صحیفۂ ایوب کے پچاس صفحوں کا شاعرانہ اطناب ہے۔ آیت (۸۱) صفحہ ۸۳ پر ذکر گزر چکا: وایوب اذ نادی ربہ: انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین: فاستجبنا له، فکشفنا ما به من ضر، وآتیناہ اھله، ومثلھم معھم، رحمة من عندنا وذکری للعابدین!

"انی مسنی الضر" میں اُن کے درد و مصیبت کی ساری داستان آگئی۔ کوئی گوشہ بھی نہیں چھوٹا۔ ساتھ ہی اسلوب خطاب یہ ہوا کہ "میں دکھ میں پڑ گیا ہوں" یہ نہ ہوا کہ "تو نے مجھے دکھ میں ڈال دیا ہے" کیونکہ وہ تو کسی کو بھی دکھ میں نہیں ڈالتا۔ اُس نے جو کچھ بھی بخشا ہے، سرتاسر سکھ اور راحت ہی ہے۔ جو حالت بھی ہمارے لیے دکھ ہو جاتی ہے، خود ہماری ہی صورت حال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام کے مخاطبات میں ہر جگہ یہ حقیقت نمایاں ہوئی۔ حضرت آدم نے کہا: ربنا ظلمنا انفسنا، وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین (۷: ۲۳) خدایا! ظلم ہم نے کیا اور مغفرت کی امیدواری تجھ سے ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم کی موعظت سورۂ شعرا میں آچکی: واذا مرضت فھو یشفین (۲۶: ۸۰) جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہی ہے جو مجھے شفا دیتا ہے۔ یعنے بیماری میں پڑنا میری حالت ہوئی۔ شفا دینا اُس کا کام ہوا۔ کیونکہ اُس کے پاس جو کچھ ہے، شفا ہی شفا ہے۔ اس کی رحمت نے دار الشفا بنایا ہے، بیماریاں بانٹنے کا کوئی گھر نہیں بنایا ہے۔ ما احسن قول الشاعر العارف:

حضرت ایوب کی دعا اور شرح انی مسنی الضر

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست　　چوں بما نسبت کنی، کفر آفت ست!

اور یہی وجہ ہے کہ فرمایا: تعز من تشاء وتذل من تشاء۔ بیدك الخیر! (۳: ۲۶) "تو جسے چاہے عزت دیدے، جسے چاہے ذلیل کر دے۔ ہر طرح کی خیر تیرے ہی ہاتھ ہے" جسے عزت ملی، وہ بھی خیر کی بات ہوئی جسے ذلت ملی، وہ بھی خیر کی بات ہوئی۔ حالانکہ جسے ذلت ملی اس کے لیے تو "شر" ہی کی بات ہوئی "خیر" کی بات نہیں ہوئی۔ لیکن قرآن کہتا ہے، اُس کے لیے اور اس کی اضافت سے "شر" کی بات ہوئی۔ فی الحقیقت "شر" کی بات نہ ہوئی کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے، خیر ہی خیر ہے۔ شر کا یہاں گزر ہی نہیں۔ یہ ہم ہیں اور ہماری حالت ہے جو "شر" کا جامہ پہن لیا کرتی ہے:

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست　　ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست!

مسلم کی حدیث ابوذر میں یہی حقیقت واضح کی گئی ہے: یا عبادی! انما ھی اعمالکم، احصیھا لکم ثم اوفیکم ایاھا۔ فمن وجد

خیراً، فلیحمد اللہ، ومن وجد غیر ذٰلک، فلا یلومن الا نفسہ۔" اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں شمار کر کے محفوظ کرتا ہوں اور پھر ان کے نتائج پورے پورے لوٹا دیتا ہوں۔ پس تم میں سے جو کوئی خیر پائے، تو اللہ کی ستائش کرے، اور جس کسی کو کوئی دوسری حالت پیش آجائے، تو اور کسی کا شکوہ نہ کرے۔ خود اپنے نفس کو ملامت کرے۔"

"وانت ارحم الراحمین"

اس کے بعد کہا وانت ارحم الراحمین! اور غور کرو، اس ایک جملہ میں سفر ایوب کے کتنے صفحے آگئے؟ اس میں صبر و شکر کا دامن بھی نہیں چھوٹا، طلب و الحاح کا ہاتھ بھی دراز ہوگیا، اور عجز و نیاز کی پیشانی بھی بندگی و تذلل کی زمین پر جھک گئی۔ "خدایا! میں دُکھی ہوں اور تجھ سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو؟"

طوبیٰ لعبد تکون مولاہ،

اگر ایک فقیر بادشاہ سے کہے "میں محتاج ہوں اور تجھ سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں" تو پھر اس کے بعد اور کیا رہ گیا جو اُس نے نہیں کہا؟ اور کیوں اس سے زیادہ اُس کی زبان سے کچھ نکلے؟ بلاشبہ یہ عرضِ حال ہے۔ طلب و سوال نہیں لیکن

درحضرتِ کریم تقاضہ چہ حاجت است!

بت ہو بی جامعیت

اس کے بعد صرف ایک آیت کے اندر پوری سرگزشت اور اُس کا ماحصل بیان کر دیا۔ غور کرو، کس طرح یہ آیت ایک پورے صحیفہ کا کام دے رہی ہے، اور کس طرح اُس کا ہر جملہ اپنی جگہ ایک پورا باب ہے؟

(ا) فاستجبنا لہ۔ ہم نے اُس کی پکار سُن لی۔ یعنے وحیِ الٰہی کی وہ اجابت جو سفر ایوب کے چار بابوں میں بیان کی گئی ہے۔ ۳۸ سے ۴۲ تک۔

(ب) فکشفنا ما بہ من ضر۔ پس درد و مصیبت میں سے جو کچھ اُسے پیش آیا تھا، سب ہم نے دور کر دیا۔ اس میں وہ ساری مصیبتیں آگئیں جن کی تفصیلات دو بابوں میں آئی ہیں۔

(ج) واٰتیناہ اھلہ۔ اُس کا گھر اُسے دیدیا۔ "دیدیا" یعنے اُس سے کھو یا گیا تھا۔ پھر اسے واپس مل گیا۔ اس اشارے نے خاندانی مصیبت اور تفرقہ کی ساری داستان بتلا دی۔

(ہ) ومثلھم معھم۔ اتنا ہی اور بھی۔ یعنے گھر بار کا جمگھٹا پہلے سے دوچند کر دیا۔

(و) لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اور اس سرگزشت کا ماحصل کیا ہے؟ رحمۃ من عندنا! یہ ہماری طرف سے رحمت کا ظہور تھا کیونکہ رحمت کو پکارا گیا تھا "وانت ارحم الراحمین!" پس ضروری تھا کہ رحمت جواب دے۔

(ز) وذکریٰ للعابدین۔ اور اس لیے کہ بندگی کرنے والوں کے لیے اس میں نصیحت ہو۔ یعنے یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ جو عبادت گزارانِ حق ہیں، وہ کبھی رحمتِ الٰہی کی بخششوں سے محروم نہیں رہ سکتے!

قرآن کے قصص اور اشاراتِ قصص کا یہی حال ہے۔ ترجمان القرآن میں اس کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی کہ ہر مقام کی تفسیر اس تفصیل کے ساتھ کی جائے۔ پس صرف اس مقام کی تفسیر کر دی گئی، تاکہ اہلِ نظر کے لیے ایک نمونہ کا کام دے، اور تمام مقامات کا مطالعہ اسی روشنی میں کر سکیں۔

اس سلسلہ میں چار باتیں اور یاد رکھنی چاہئیں:

حضرت ایوب عرب تھے

اولاً، محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوب عرب تھے، عرب میں ظاہر ہوئے تھے، اور سفر ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ نے اسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔

سفر ایوب میں ہے کہ وہ "عوض" کے مُلک میں رہتے تھے، اور آگے چل کر تصریح کی ہے کہ اُن کے مویشی پر شیبا (سبا) کے لوگوں نے اور کسدیوں (بابلیوں) نے حملہ کیا تھا (۱: ۱۵) ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کتاب پیدائش اور تواریخ اول میں "عوض" کو "ارام" بن "سام" بن "نوح" کا بیٹا کہا ہے، اور "ارامی" بالاتفاق عرب عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں سے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی، لیکن اب اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا ہے۔ پھر اس مقام کا ایک جگہ ہونا جہاں سبا اور بابل کے باشندے آکر حملہ آور ہوتے تھے، ایک مزید جغرافیائی روشنی ہے۔ کیونکہ ایسا مقام بجز عرب کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہ عرب کا وہی مقام ہوگا جو قوم عاد کا مسکن تسلیم کیا گیا ہے یعنے عمان سے لیکر حضر موت تک کا علاقہ۔

"یوباب"

کتاب پیدائش اور تواریخ اول میں ایک اور سامی نام بھی ہمیں ملتا ہے۔ یعنے "یوباب" یہ بنی یقطان میں سے تھا۔ یقطان، عبر سے پیدا ہوا، اور عبر سلح بن ارفکسد بن سام سے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا "یوباب" اور "ایوب" ایک ہی نام نہیں ہیں؟

بالاتفاق یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ تورات میں سب سے زیادہ قدیم صحیفہ یہی ہے، اور حضرت ایوب کا زمانہ حضرت موسیٰ سے بہت پہلے تھا۔ لیکن اگر یوباب سے مقصود "ایوب" ہیں، تو انہیں حضرت ابراہیم کا معاصر ہونا چاہیے۔ یا کم از کم حضرت اسحاق اور یعقوب کا۔

سفر ایوب منظوم کتاب ہے

ثانیاً سفر ایوب کا ایک ایک جملہ کہہ رہا ہے کہ یہ شعر ہوں۔ نثر نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے محققین تورات نے اسے بھی امثال اور زبور کی طرح اصلاً کتاب منظوم ہی قرار دیا ہے۔ بلاغتِ کلام شعریت بیان، اور بلندی اسلوب کے لحاظ سے یہ اس درجہ کی کتاب ہے کہ عہد عتیق کا کوئی صحیفہ امثال و زبور مستثنیٰ کر دینے کے بعد، اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

عربی علم ادب کی قدامت

ثالثاً معلوم ہو گیا کہ عربی علم ادب کی تاریخ اُس عہد سے بہت پہلے شروع ہوجاتی ہے، جو عہد عام طور پر سمجھ لیا گیا تھا۔ کیونکہ اگر حضرت موسیٰ سے پہلے سفر ایوب جیسی نظم عربی میں لکھی جاسکتی تھی، تو یقیناً عبرانی علم ادب کے نشوونما سے صدہا سال پہلے عربی علم ادب پوری طرح ترقی یافتہ ہوچکا تھا۔ بلاشبہ سفر ایوب کی عربی وہ عربی نہ ہوگی جو نزول قرآن کے وقت بولی جاتی تھی۔ یقیناً عربی کی کوئی ابتدائی شکل ہوگی جس کی اخوات ہمیں آرامی، کلدانی، اور آشوری کتبات کے الفاظ و اسماء میں نظر آرہی ہیں اور قدیم مصری بھی اس کی جھلک سے خالی نہیں۔ تاہم وہ عربی زبان ہی ہوگی، اور اُسی عربی نے موجودہ عربی کے تمام عناصر و مواد بہم پہنچائے ہوں گے۔

اصل یہ ہے کہ عہد جاہلیت کی عربی اگرچہ صحرائیوں کی عربی تھی، لیکن زبان کی نوعیت بول رہی ہے کہ یہ صحرائی قبائل کی پروردہ نہیں ہوسکتی۔ اتنی وسیع، اتنی ہمہ گیر، اتنی دقیقہ سنج، اس درجہ متمول زبان، ضروری ہے کہ صدیوں کی متوارث اور مسلسل ادبی زندگی سے نشوونما پذیر ہوئی ہو جو زبان قرآن کے معانی و دقائق کی متحمل ہوگئی، کیونکر ممکن ہے کہ اُسے غیر متمدن قبائل کی ایک بدوی زبان تسلیم کرلیا جائے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے، جس عربی میں امرء القیس نے اشعار کہے ہیں، اُس عربی کی لغوی تاریخ اس سے بہت زیادہ قدیم اور بہت زیادہ متمدن ہونی چاہیے۔ جتنی اُس وقت تک سمجھی گئی ہے۔

جدید اثری انکشافات اور عربی کی قدامت

گذشتہ صدی تک عربی کی لغوی تاریخ کا یہ مسئلہ ایک لاینحل مسئلہ سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ بعض محققین نے مجبور ہو کر یہ رائے قائم کرلی تھی کہ زبانوں کی تخلیق اور نشوونما کا اسے ایک فوری تحوّل تسلیم کرلینا چاہیے۔ لیکن اب اثری تحقیقات کے آخریں مواد نے بحث و تعلیل کا ایک نیا میدان پیدا کر دیا ہے، اور عربی نسل اور عربی زبان کی تاریخ بالکل ایک نئی شکل میں نمودار ہورہی ہے۔ یہ زبان جس پر زندگی و خلود کی آخری مہر قرآن نے لگائی، دراصل مدنی نشوونما کے اتنے مرحلوں سے گزر چکی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی اس وصف میں اس کی شریک نہیں۔ سُمیری اور اکادی اقوام کا تمدن، نینوا اور بابل کی علمی کامرانیاں، قدیم مصری لغات کا عمرانی سرمایہ، آرامی زبان کا عروج و انحطاط، کلدانی اور سریانی کا ادبی تمول، دراصل ایک ہی زبان کی لغوی تشکیل و تکمیل کے مختلف مرحلے تھے، اور اسی نے آگے چل کر چھٹی صدی قبل مسیح کی عربی کا بھیس اختیار کیا۔ جو زبان حضارۃ و تمدن کی اتنی بھٹیوں میں سے پک کر نکلی ہو، ظاہر ہے کہ اس کے اسماء و مصادر کسی مفلس اور خام زبان کے اسماء و مصادر نہیں ہوسکتے۔

تابوت احیرام کا انکشاف اور عربی کتبہ

آج ہم تعجب کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ ظہور مسیح سے آٹھ نو سو برس پہلے آشوری اور بابلی زبان میں طبق، ملک، شمس، سماء، فلک، نجم، ارض وغیرہ الفاظ ٹھیک ٹھیک اُنہی معنوں میں مستعمل تھے، جن معنوں میں آج مستعمل ہیں! اتنا ہی نہیں بلکہ ۱۹۲۳ء کے ایک جدید انکشاف نے تو ہمیں تیرہ سو برس قبل مسیح تک پیچھے ہٹا دیا ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ عربی زبان کے ابتدائی مواد نے ایک کتابی اور ادبی زبان کی حیثیت حاصل کرلی ہے، اور اس میں نہ صرف موجودہ اسماء و مصادر ہی پائے جاتے ہیں، بلکہ بعض حروف نحویہ تک موجود ہیں۔ مثلاً حرف عطف وہی "و" ہے اور اپنی ابتدائی فینیقی شکل ۲ میں لکھا جارہا ہے۔ الف لام بدستور حرف تعریف ہے، اور ہر اسم کے پہلے اپنی نمود رکھتا ہے۔ مثلاً الملک، الجبل۔ "ذی" (بمعنی ذو۔ ذوالجلال و ذوالقرنین) ہر جگہ نمودار ہے۔ اسم اشارہ وہی "ھو" ہے۔ "علی" اسی معنی میں مستعمل ہے جس میں اب مستعمل ہوتا ہے۔ نیز ملک، فعل، طمع، محن، فتح، محو، ٹھیک اُنہی معنوں میں بولے گئے ہیں جو بعد کو لغتِ قریش میں بولے گئے!

۱؎ حروف نحویہ یعنے مصطلح نحو، ورنہ حروف ابجد تو سب کے سب موجود ہیں۔

۲؎ غالباً بعض بادشاہ نے تو ایسی اعلیٰ صولت و کشیر حاصل کرلی تھی کہ ایران کی آرین زبان بھی اسے برتنے پر مجبور ہوگئی چنانچہ دارائے اعظم (بقیہ بر صفحہ)

عربی میں یہ کتبہ ایک تابوت پر منقش ہے۔ اس میں "احیرام" ملک جبلس کی نعش رکھی گئی تھی، اور اس کے بیٹے "ایتوبعل" کے حکم سے تیار ہوا تھا۔ "احیرام" کا نام تورات میں بھی آیا ہے، اور تاریخی حیثیت سے اس کا زمانہ باتفاق ۱۲۵۰ قبل مسیح ہے۔ کتبہ کا خط وہی ابتدائی عربی خط ہے جسے عام طور پر فینیقی خط کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور جس نے آگے چل کر آرامی، سریانی، اور نبطی خطوط کی شکلیں اختیار کر لیں۔ اس انکشاف نے تاریخ کے متعدد گوشوں کے لیے بحث و نظر کے نئے نئے چراغ روشن کر دیے۔ از انجملہ یہ کہ معلوم ہو گیا، تورات کے نزول اور کتب خانۂ بابل کی الواح سے بھی پہلے عربی زبان کے مواد و مصادر نے ایک مکتوب و مرسوم زبان کی نوعیت اختیار کر لی تھی یعنے اس درجہ تک پہنچ چکی تھی کہ اس میں اعلانات و فرامین لکھے جاتے تھے محض بول چال ہی کی زبان نہ تھی نیز یہ کہ اگر ۱۲۵۰ قبل مسیح عربی زبان کی ایک ابتدائی شکل کا یہ حال تھا، تو یہ بات کیوں عجیب سمجھی جائے کہ حضرت موسیٰ سے پہلے حضرت ایوب نے عربی میں کوئی منظوم صحیفہ لکھا تھا، اور شریعت حمورابی بھی اصلاً عربی کی کتابت ہے۔

قرآن کا عربی میں نزول

علاوہ بریں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا، اور جابجا اس بات پر زور دینا کہ انا انزلناہ قرآناً عربیاً (۱۲:۲) "ہم نے قرآن کسی اور زبان میں نازل نہیں کیا۔ عربی میں نازل کیا" صرف اتنے ہی معنی نہیں رکھتا جس قدر اس وقت تک سمجھے گئے ہیں بلکہ ایک بہت زیادہ وسیع اور گہری حقیقت اس میں مضمر ہے۔ تفصیل اس مقام کی مقدمہ میں ملیگی۔

دنیا کی قدیم ترین نظم سفر ایوب ہے

رابعاً، اگر سفر ایوب کی یہ نوعیت تسلیم کر لی جائے، تو ماننا پڑیگا کہ شعر و ادب کا سب سے قدیم نمونہ یہی ہے جو اس وقت تک ہماری معلومات میں آیا ہے۔ اور اگر قدامت کے اعتبار سے دنیا کی کوئی کتاب منظوم اس سے معارضہ کر سکتی ہے، تو وہ صرف ہندوستان کا رگ وید ہے۔ بشرطیکہ اسفار ہند کی قدامت کا وہ مذہب تسلیم کر لیا جائے جو رگ وید کو ۱۵۰۰ قبل مسیح یا اس سے بھی پیچھے لے جانا چاہتا ہے۔ اس وقت تک غیر غنائی شاعری کا سب سے زیادہ قدیم نمونہ ہومر کی ایلیڈ تسلیم کی گئی ہے۔ لیکن اگر ہومر کا عہد وہی قرار دیا جائے جو ہیروڈوٹس کے بیان سے متبادر ہوتا ہے، تو زیادہ سے زیادہ ۸۵۰ قبل مسیح ہے لیکن سفر ایوب کا زمانہ اس سے بھی پہلے کا زمانہ ہونا چاہیے۔ پس قدیم ترین نظم ہومر کی نہ ہوئی۔ سفر ایوب کی ہوئی۔

ہندوستان کی دو رزمیہ نظمیں مہابھارت اور رامائن بھی قدیم نظمیں ہیں، لیکن ان کا زمانۂ تصنیف بھی محققین عصر کے نزدیک چوتھی صدی قبل مسیح سے زیادہ پیچھے نہیں جا سکتا، اور زمانۂ تدوین بشکل کتاب تو اکثروں کے نزدیک، زیادہ سے زیادہ، سنہ مسیحی کے ابتدائی قرون ہیں[۲]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۷) اپنے کتبوں میں اپنے کو "شہنشاہ" کہنے کی جگہ "ملک ملکان" کہتا ہے۔ (دیکھو کتبہ ہنجرو بے ستون) بعد کو اردشیر بابکان نے "شاہ شاہان" کا لقب اختیار کیا۔ جسے عربوں نے "ساسان" بنا دیا۔ تاہم "ملک ملکان" کا لقب بھی شاپور ساسانی کے کتبوں میں بار بار آتا ہے جیسا کہ حاجی آباد کے کتبوں سے ظاہر ہے۔ علاوہ بریں ساسانی عہد میں عربی اسماء و الفاظ کے غلبہ و رسوخ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ خود اوستا کی زبان عربی آمیز ہو گئی۔ ساسانی اوستا کے جو اجزاء ہندوستان کے پارسیوں سے ملے ہیں، ان میں جابجا عربی الفاظ و اصوات پائے جاتے ہیں۔ ایک مدت تک یہ آمیزش محل تعجب رہی۔ حتیٰ کہ سر ولیم جونس نے ان اجزاء کی اصلیت ہی سے انکار کر دیا۔ مگر اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جس طرح بعد الاسلام کی فارسی جدید عربی سے مخلوط ہوئی ہے۔ اسی طرح قبل از اسلام کی قدیم فارسی قدیم عربی الفاظ سے مخلوط ہو گئی تھی۔ پوری شرح اس مسئلہ کی مقدمہ میں ملیگی۔

[۱] یہ جنگ کے بعد کے نہایت اہم انکشافات میں سے ہے۔ اس وقت تک حروف ابجدی (یعنے غیر تصویری و غیر سماری) کی منضبط کتابت کا سب سے قدیمی نمونہ "حجر سینا" سمجھا جاتا تھا یعنے وہ پتھر جو ۱۹۰۴ء میں جزیرہ نمائے سینا میں ملا اور جس پر "میشا" شاہ موآب نے ۸۵۰ قبل مسیح میں اپنی ایک فتح کا حال کندہ کرایا ہے۔ یہ فتح اسے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی۔ لیکن اب اس تابوت کے انکشاف نے اس سے ساڑھے تین سو برس پیشتر کی کتابت مہیا کر دی، اور اس طرح معاملہ ۸۵۰ ق م کی جگہ ۱۲۰۰ ق م تک پہنچ گیا گویا دست انسانی کی علمی کتابت کا سب سے زیادہ قدیمی نمونہ جو اس وقت ہمارے قبضہ میں ہے، وہ ۱۲۰۰ ق م کا ہے، اور عربی زبان اور عربی کے فینیقی رسم الخط میں ہے۔

[۲] ویدوں کے عہد تصنیف و تدوین کی نسبت میکس مولر کا مسلک اس وقت تک ماہرین موضوع میں مقبول چلا آتا ہے، اور علمی حیثیت سے اس پر کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ میکس مولر نے ویدوں کی تصنیف کا زمانہ چار عہدوں میں منقسم کر دیا ہے۔ سوتر کا زمانہ ۶۰۰ سے ۲۰۰ ق م تک۔ برہمن ۸۰۰ سے ۶۰۰ ق م تک۔ منتر اور رگوید کا آخری باب ۱۰۰۰ سے ۸۰۰ ق م تک۔ چھند ۱۲۰۰ سے ۱۰۰۰ ق م تک۔ گویا رگوید کی سب سے قدیم نظمیں ۱۲۰۰ ق م کے زیادہ پیچھے نہیں جاتیں۔ حال میں مسٹر اے۔ بی۔ کیتھ Keith پروفیسر سنسکرت ایڈنبرا یونیورسٹی نے اس موضوع پر جو مقالہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کے لیے لکھا ہے، اس میں بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ وہ تمام بحث کا خاتمہ اس نتیجہ پر کرتے ہیں کہ "رگوید کے قدیم ترین ترانے، مثلاً ۱۴۰۰ ممکن ہے ۱۲۰۰ ق م تک پیچھے لے جائے جائیں لیکن اس کو زیادہ اس سے پیچھے لے جانا موجودہ معلومات کی روشنی میں ممکن نہیں" (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول صفحہ ۱۱۲)۔

[۳] دیکھو پروفیسر ای واشبرن ہاپکنس E. Washburn Hopkins کا "رزمیہ نظموں کا عہد" مندرجہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول صفحہ ۲۵۸۔

یونس علیہ السلام

(۴۴۳) آیت (۸۷) میں "ذوالنون" سے مقصود باتفاق حضرت یونس ہیں۔ محققین میں اُن کا عبرانی نام "یوناہ" آیا ہے، اور اُن کے نام سے ایک صحیفہ بھی موجود ہے۔ یہاں انہیں "ذوالنون" کے نام سے پکارا گیا، کیونکہ اُن پر مچھلی کا حادثہ گزرا تھا، اور قدیم عربی میں "نون" مچھلی کو کہتے تھے۔ چنانچہ آرامی، کلدانی، اور عبری میں بھی مچھلی کا یہی نام بولا گیا ہے۔

اس صحیفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یروشلم میں تھے کہ وحی الٰہی نے انہیں مخاطب کیا، اور حکم دیا، باشندگان نینوا کو نزول عذاب کی خبر پہنچا دیں۔ نینوا اُس زمانے میں دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان آبادی تھی۔ جس کی گرانباری اور اپنی بے سروسامانی دیکھ کر، بہ مقتضائے بشریت طبیعت ہراساں ہوئی۔ بہرحال یافہ سے ایک جہاز پر سوار ہو گئے، جو ترسیس جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں طوفان نے گھیر لیا۔ قدیم زمانے میں جہازرانوں کا اعتقاد تھا، اگر طوفان عرصہ تک نہ تھمے تو یہ اس کا ثبوت ہوتا ہے کہ کوئی گنہگار آدمی جہاز میں سوار ہے۔ جب تک وہ موجود رہیگا، اُس کی نحوست سے طوفان بھی جاری رہیگا۔ چنانچہ یہی خیال اُس جہاز کے مسافروں کو بھی ہوا۔ وہ قرعہ ڈالنے لگے کہ کون مجرم ہے اور کسے سمندر کے حوالے کریں۔ جب حضرت یونس نے سُنا تو کہا۔ ایسا ہی کرنا ہے تو مجھے سمندر میں پھینک دو۔ مجھ سے زیادہ اس کا کون مستحق ہو سکتا ہے! صحیفہ میں ہے کہ قرعہ کا فیصلہ بھی یہی ہوا تھا۔

جب طوفان نہیں تھما تو لوگوں نے اُنہیں سمندر میں ڈال دیا۔ سمندر میں ایک بہت بڑی مچھلی تھی۔ وہ نگل گئی۔ یہ تین دن تک اُس کے اندر رہے۔ پھر وہ ساحل کی طرف گئی، اور خشکی پر انہیں اُگل دیا۔ اس طرح قدرتِ الٰہی نے موت کے منہ میں ڈال کر پھر اُس سے زندہ و سلامت نکال لیا۔

یوناہ نبی کے صحیفہ میں ہے کہ "اُس نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند اپنے خدا سے دعا مانگی تھی اور اُس نے اُس کی پکار سُن لی۔ وہ پاتال کے بطن میں سے چلایا، اور اُس کی آواز سُنی گئی" (۲:۱)

قرآن نے یہاں غالباً اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "اذ ذھب مغاضباً" ای مغاضباً من اجل ربہ۔ کما یقولون "غضبت لک" ای من اجلک۔ یعنے اللہ کی خاطر خشمناک ہو کر روانہ ہوا۔ فظن ان لن نقدر علیہ" ای لن نضیق علیہ۔ اُس نے گمان کیا کہ ہم اُسے تنگی میں نہیں ڈالینگے۔ حالانکہ اُسے ایک آزمایش پیش آنے والی تھی۔

یاد رہے اس جملہ کا مطلب وہ نہیں ہے، جو تفسیر کی روایات میں سعید بن جبیر اور حسن کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ان اللہ لا یقدر علی معاقبتہ۔ یعنے یونس نے خیال کیا۔ خدا اس پر قابو نہیں پا سکتا۔ کیونکہ ایسا اعتقاد تو صریح کفر ہے، اور ممکن نہیں ایک لمحہ کے لیے کسی نبی کے قلب میں گزر سکے۔ یقیناً یہ ان ائمہ تفسیر کا قول نہیں ہو سکتا۔ بعد کے راویوں کی کج فہمی ہے۔

اس آیت کی ایک تفسیر تو یہ ہے۔ اسی طرح ایک دوسری تفسیر بھی ہو سکتی ہے، اور شاید پہلی سے زیادہ موزوں۔

تورات کے اسی صحیفہ میں ہے کہ اس حادثہ کے بعد پھر اُنہیں نینوا کے لیے حکم ہوا۔ وہ نینوا گئے اور اعلان کیا "چالیس دن کے بعد یہ شہر برباد ہو جائیگا" لیکن یہ بات سُن کر باشندگانِ نینوا نے سرکشی نہیں کی، بلکہ بادشاہ سے لیکر ادنیٰ باشندے تک سب کانپ اُٹھے۔ سب نے خدا کی ہستی پر اعتقاد کیا۔ بادشاہ نے شاہی لباس اُتار کر ٹاٹ کا پیراہن پہن لیا اور تمام باشندوں کے نام فرمان جاری کیا کہ ہر کوئی اپنی بُری راہ سے اور ظلم و شرارت کی بات سے باز آجائے۔ روزہ رکھے۔ خدا کے حضور زاری کرے۔ توبہ و انابت کا سر جھکائے" (۳:۵)

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ عذاب ٹل گیا۔ چالیس دن گزر گئے مگر کوئی ہلاکت ظہور میں نہیں آئی۔ یہ بات حضرت یونس کو گراں گزری۔ وہ مضطرب ہوئے کہ اعلانِ حق میں تخلف کیوں ہوا؟

وہ شہر کے باہر ایک چھپر بنا کے مقیم ہو گئے تھے۔ رینڈی کے ایک درخت کی شاخیں چھپر پر پھیل گئی تھیں۔ قضارا اُس درخت کی جڑ میں کیڑا لگ گیا۔ ایک دن صبح اُٹھے تو کیا دیکھتے ہیں، اس کی شاخیں بالکل سوکھ گئی ہیں اور سایہ کی جگہ دھوپ ہے۔ یہ حال دیکھ کر نہایت رنجیدہ ہوئے۔ "تب خداوند نے کہا۔ تو اس رینڈی کے درخت کے سوکھ جانے پر اتنا رنجیدہ ہو رہا ہے، حالانکہ اس کے بونے اور اگانے میں تو نے کچھ بھی محنت نہیں کی تھی۔ پھر غور کر، میرے لیے ضروری نہیں کہ اس عظیم الشان نینوا پر رحم و شفقت کروں؟ اس نینوا پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمی اور بے شمار مویشی بستے ہیں! جنہیں میں نے پیدا کیا اور پرورش چڑھایا!" (۴:۱۰)

یعنے عذاب والی بات اپنی جگہ صحیح تھی، وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن عذاب کا ظہور لوگوں کے انکار و بدعملی ہی کا نتیجہ تھا۔

جب وہ اس سے باز آ گئے تو عذاب بھی ٹل گیا، اور یہاں اصل کارفرمائی ہر حال میں عفو و بخشش کی ہے۔ سرزنش و عقوبت کی نہیں ہے۔ جب حقیقت اُن پر کھل گئی تو ان کا سارا رنج و غم دور ہو گیا۔

پس ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں اُن کی خشمناکی سے مقصود وہ حالت ہو جو باشندگانِ نینوا کا حال دیکھ کر اُن پر طاری ہوئی تھی، اور ظلمات سے مقصود رنج و غم کی تاریکیاں ہوں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے رنج و غم کی حالت میں اللہ کو پکارا اور اللہ نے حقیقتِ حال منکشف کر کے ان کے دلِ مضطر کو تسکین دیدی۔

تفسیر آیت ۹۲

(۴۴) آیت (۹۲) اُس تمام تذکرہ کا خلاصہ ہے جو انبیاء کرام کا اوپر گزر چکا ہے یعنے اللہ کے یہ تمام رسول جو مختلف عہدوں اور قوموں میں ظاہر ہوئے، اُن سب کی دعوت کا حاصل کیا تھا؟ اُنہوں نے نسلِ انسانی کے مختلف عہدوں اور گروہوں کو کس بات کا پیام پہنچایا؟ وہ بات ایک ہی تھی، یا ایک سے زیادہ؟ یہ آیت اپنے نپے تلے لفظوں میں جواب دیتی ہے کہ اُن سب کا پیام ایک ہی تھا، اور وہ یہی تھا کہ ان ھذہٖ امتکم امۃ واحدۃ، وانا ربکم، فاعبدون! تم سب ایک ہی اُمت ہو، تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے، پس الگ الگ نہ ہو، اُسی کی بندگی کرو۔ وتقطعوا امرھم بینھم۔ لیکن قوموں نے یہ تعلیم بھلا دی، اور اپنے دین کا معاملہ آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا یعنے ایک ہی دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سے دین بنا لیے اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے کٹ کر الگ ہو گیا۔ وحدت کی جگہ تفرقہ اور اجتماع کی جگہ اشتات ان کا شعار ہوا۔ کل الینا راجعون۔ بالآخر سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے۔ اس وقت حقیقتِ حال آشکارا ہو جائیگی۔ ہر گروہ دیکھ لیگا کہ اُس کی حقیقت فراموشیوں نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا؟

مبادی ثلاثہ توحید

سبحان اللہ قرآن کی معجزانہ بلاغت، ایک چھوٹی سی آیت کے اندر اس معاملہ کے سارے دفتر کس طرح سمیٹ دیے ہیں! اور پھر صرف امر و خبر ہی نہیں ہے بلکہ ترتیبِ بیان نے خود بخود استدلال کی روشنی بھی پیدا کر دی ہے:

(ا) ان ھذہٖ امتکم امۃ واحدۃ۔ تم نے کتنے ہی تفرقے پیدا کر رکھے ہوں مگر تمہاری اُمت اصلاً ایک ہی اُمت ہے۔

(ب) وانا ربکم۔ اور میں ہی تم سب کا تنہا پروردگار ہوں۔ میرے سوا کوئی نہیں۔

(ج) فاعبدون! جب تمام نوعِ انسانی ایک ہی اُمت ہوئی، اور سب کا پروردگار بھی ایک ہی ہوا، تو پھر سب کے لیے بندگی نیاز کی چوکھٹ بھی ایک ہی کیوں نہ ہو؟ ایک سے دو کیوں ہو؟ پس اُسی ایک کی بندگی کرو، کیونکہ تم سب ایک ہی ہو، اور ایک ہی کے لیے ہو۔ یہاں ایک سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں ہے! غور کرو، "فاعبدون" کی "ف" یہاں کس طرح بول رہی ہے؟ کس طرح اس نے استدلال کا پہلو پکار دیا ہے؟

[توحید] اُمت۔ توحید [ربو]بیت۔ توحید عبادت

ایک آیت کے اندر تینوں توحیدوں کا بیان جمع ہو گیا: توحید اُمت۔ توحید ربوبیت۔ توحید دین و عبادت۔ اور یہی تین توحیدیں دعوتِ قرآنی کا اصل الاصول ہیں۔ وہ ہر جگہ انہی کی صدا بلند کرتا ہے، اور انہی پر اپنی تعلیم و تذکیر کی ساری بنیادیں اُستوار کرتا ہے۔

توحید اُمت سے مقصود یہ ہے کہ افرادِ انسانی کی کثرت و انتشار کے پردے میں اس کی وحدت چھپی ہوئی ہے۔ اسے نہ بھولو۔ تمہاری نسل، تمہارا وطن، تمہاری بولیاں کتنی ہی الگ الگ ہو گئی ہوں مگر تم سب ایک ہی نسلِ انسانی کا گھرانا ہو، اور تمہارا گروہ اصل میں ایک ہی گروہ ہے۔

توحید ربوبیت سے مقصود یہ ہے کہ تم نے کتنے ہی مختلف نام رکھ لیے ہوں، کتنی ہی مختلف عبادت گاہیں بنا رکھی ہوں، کتنے ہی مختلف تصور گڑھ لیے ہوں، مگر تمہارے پیدا کیے ہوئے اختلاف سے حقیقت مختلف نہیں ہو جا سکتی۔ جس طرح تم سب کا گروہ ایک ہی ہے اسی طرح تمہارا پروردگار بھی ایک ہی ہے۔ اُس ایک کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

توحید عبادت سے مقصود یہ ہے کہ جب گروہ ایک ہی گروہ ہے، اور پروردگار ایک ہی پروردگار ہے تو دین بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ وہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ پس سچائی کی راہ یہ ہوئی کہ اُسی ایک کی بندگی کرو، اور اس راہ میں مختلف و متفرق نہ ہو جاؤ۔

[نج]ات صرف [ایمان] و عمل ہے

پھر ایک آیت کے اندر صاف صاف واضح کر دیا کہ نجات و سعادت کا قانون کیا ہے؟ یعنے قوموں کے اس تقطع اور گروہوں کے اس تفرق کے بعد بھی قانونِ نجات و سعادت کیا ہے؟ فرمایا، وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی یہی ہے کہ فمن یعمل من الصالحات وھو مؤمن فلا کفران لسعیہ۔ نجات کی شرط صرف دو باتیں ہیں۔ ایمان اور عملِ صالح۔ جس انسان نے نیک عمل کیے اور اس کے اندر ایمان تھا

ہوا، تو اُس کی سعی کبھی رائیگاں جانے والی نہیں۔ ضروری ہے کہ مقبول ہو۔ فمن کے زور پر غور کرو۔ یہودی کہتے تھے "کونوا ھوداً" نصاریٰ کہتے تھے "کونوا نصاریٰ"۔ قرآن کہتا ہے نہیں "فمن یعمل من الصالحات وھو مومن" کوئی ہو، لیکن اگر وہ مومن ہوا اور اُس نے نیک عملی کی راہ اختیار کی، تو اُس کا ایمان و عمل کبھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنا اجر ضرور پائیگا۔ وانا لہ کاتبون: یہ ہمارا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔ ہم اُس کا ایمان و عمل لکھ دینے والے ہیں۔ پھر کون ہے جو اُسے رائیگاں ٹھہرا سکتا ہے؟ دنیا کا ہر انسان ٹھہرادے لیکن ہمارے دفتر میں وہ ثبت ہو جائیگا۔

کتنا اہم مقام ہے۔ مگر تفسیریں اُٹھا کر دیکھو، کس طرح اس کی ساری اہمیت بے محل بحثوں میں ضائع کر دی گئی ہے۔ اہمیت کی وضاحت کے لیے یہ سطریں بھی کافی نہیں ہیں، لیکن اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

فتح یاجوج و ماجوج

(۲۵) سورۂ کہف کے آخر میں یاجوج و ماجوج کی تحقیق گزر چکی ہے۔ اس سورت کی آیت (۹۶) میں جس خروج کی خبر دی گئی ہے، یہ اُن کا آخری خروج تھا۔ یعنے منگولی تاتاریوں کا وہ خروج، جو چھٹی صدی ہجری میں منگولیا کی بلندیوں سے اُمنڈا، اور پھر آناً فاناً تمام مشرق و مغرب پر چھا گیا۔ مشرق میں چین کی تمام مملکت اُس نے مسخر کر لی۔ مغرب میں بحراسود کے شمالی ساحل سے گزرتا ہوا ڈینیوب کی وادیوں تک پھیل گیا پھر ہنگری و روس پر قابض ہو کر جرمنی کی سرحد تک پہنچ گیا۔ پھر اسلامی ممالک کی طرف متوجہ ہوا، اور چھ صدیوں کے اندر اسلامی تمدن نے جو کچھ تعمیر کیا تھا، جیحون سے لے کر دجلہ تک چشم زدن میں پامال کر دیا۔ وکان وعداً مفعولاً!

تعبیر بیان کے بعض دقائق

غور کرو۔ یہاں صرف چند لفظوں کے اندر اس معاملہ کی خصوصیات کس طرح واضح کر دی ہیں! یاجوج ماجوج کے اس ظہور کو "خروج" یا اسی طرح کے کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کیا۔ بلکہ "فتح" کا لفظ استعمال کیا "حتی اذا فتحت یاجوج و ماجوج" عربی میں جب "فتح" کا لفظ اشیا کے لیے کہا جاتا ہے تو اس کے معنی صرف کھلنے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً "فتح الباب" لیکن جب حیوانات کے لیے بولا جاتا ہے، تو اُس کے معنی صرف کھلنے ہی کے نہیں ہوتے بلکہ کھل کر اچانک نکل پڑنے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ٹڈیوں کا دل کسی گوشہ سے نکل پڑتا ہے تو کہتے ہیں "فتحت الجراد" پس مطلب یہ ہوا کہ یاجوج ماجوج کسی گوشہ میں الگ تھلگ پڑے ہیں۔ ایک وقت آئیگا کہ اچانک نکل پڑینگے اور اس طرح نکل پڑینگے، جیسے مدتوں سے پانی بند پڑا ہو۔ بند ٹوٹ جائے۔ اور ہر طرف سیلاب اُمنڈ آئے۔

اب دیکھو، کس طرح اس ایک لفظ نے معاملہ کی پوری تاریخی نوعیت آشکارا کر دی ہے!

فتنۂ تاتار

سورۂ کہف کی تشریحات میں پڑھ چکے ہو کہ ظہور اسلام سے پہلے منگولیا کا آخری قبائلی سیلاب وہ تھا جو چوتھی صدی مسیحی میں مغرب و شمال کی طرف پھیلنا شروع ہوا، اور پھر یورپ کے مختلف قطعات میں منقسم ہو کر تھم گیا۔ اُس کے بعد قبائل کے نئے سیلابوں کا خروج رُک گیا تھا۔ البتہ جو قبائل وسط ایشیا اور سواحل یورال و خزر کے مختلف حصوں میں متوطن ہو گئے تھے، اُن کی نسل وہاں نشو و نما پاتی رہی۔ اسلامی فتوحات نے جب ان اطراف کا رُخ کیا، تو انہی قبائل کو وہاں آباد پایا۔ یہ بتدریج مسلمان ہوتے گئے۔ چنانچہ ترک، کرغز، خزر، قپچ، تاجیک، چرکس، کرد، اوزبک، سلجوق وغیرہ سے مقصود یہی قبائل ہیں۔ یہ سب اگرچہ منگولیا کی پچھلی بھرتوں کا بقایا تھے، لیکن اب ان کا کوئی تعلق اپنے وطن قدیم سے نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک دوسرے کو اجنبیوں اور دشمنوں کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اس عرصہ میں منگولیا کا گوشہ بدستور صحرانشین قبائل کے نئے نئے گروہ پیدا کرتا رہا۔ اب یہ دنیا سے الگ تھلگ تھے۔ اطراف کے سرحدی قطعات پر لوٹ مار کے لیے نکل جاتے مگر اس سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرتے۔ بعض گروہ جنوب میں پنجاب تک اور مغرب میں بلخ و ماوراء النہر تک بھی پہنچ گئے، اور ایک قبیلہ کی ترکتازیاں تو بنارس تک پہنچ گئی تھیں۔ لیکن جیسے قبائلی سیلاب پہلے اُٹھ چکے تھے، ویسا کوئی سیلاب اب نہ اُٹھ سکا۔ تمام قبائلی مواد منگولیا ہی میں سمٹا اور بند رہا۔

لیکن چھٹی صدی ہجری میں ایک طرف تو ان کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی، دوسری طرف ایک غیر معمولی عزم و استعداد کا قائد بھی پیدا ہو گیا۔ یہ مشہور منگولی قائد چنگیز خاں تھا۔ اس نے تمام منتشر قبائل کو ایک رشتۂ اطاعت میں منظم کر دیا، اور اس طرح ایک عظیم الشان عسکری قوت پیدا ہو گئی۔ اب یہ قتل و غارت کا ایک ایسا منظم سیلاب تھا جسے دنیا کی کوئی انسانی قوت روک نہیں سکتی تھی۔ چنگیز خاں کے بیٹے اوکتائی خاں کے عہد میں اس سیلاب کا بند ٹوٹا اور پھر اچانک اس طرح ہر طرف پھیل گیا، گویا دنیا اپنی بربادی کے لیے صرف اسی بند کے ٹوٹنے کی منتظر تھی!

آگے بعد فرمایا۔ من کل حدب ینسلون۔ "حدب" کے معنی کسی چیز کا اُٹھا ہوا اور اُبھرا ہوا حصہ ہے چنانچہ زمین کے مرتفع حصوں کو حدبۃ الارض کہتے ہیں۔ ابی کل اکمۃ من الارض مرتفعۃ۔ "نسل" کے معنی تیزی کے ساتھ دوڑنے کے ہیں۔ بعض نے کہا کہ "نسلان الذئب" کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ زمین کے تمام مرتفع حصوں سے دوڑتے ہوئے آ گرینگے۔

غور کرو۔ تاتاریوں کے حملے کی یہ کیسی مکمل تصویر ہے! تمام مورخ متفق ہیں کہ ان کے خروج کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی۔ اولاً خود منگولیا میں جہاں کرہ ارضی کی سطح مرتفع ہے۔ مشرق کی طرف بڑھے تو یہی بلندی سے اُترنا تھا، مغرب کی طرف چلے تو بھی بلندی سے اُترنا تھا۔ پھر شمال میں روس تک پہنچ گئے۔ اور جنوب میں تمام مغربی ایشیا کے میدانوں پر چھا گئے۔ یہ بھی بلندیوں سے گرنا ہی تھا کیونکہ وسط ایشیا کی بلندیوں پر نمودار ہوئے اور پھر شمال و جنوب کے زیریں میدانوں پر ٹوٹ پڑے۔ پھر ان کے ظہور کے لیے "ینسلون" کا لفظ کس درجہ موزوں واقع ہوا ہے؟ ان کی شب و روز کی زندگی منگولیا کے باد رفتار گھوڑوں کی پیٹھ پر بسر ہوتی تھی اور سو سو میل تک بغیر دم لیے چلے جاتے تھے۔ جب ان کے جتھے اسلامی ملکوں پر گرے تو ان کی برق رفتاری کا یہ حال تھا کہ ایک شہر کی تباہی کی خبر دوسرے شہر تک پہنچنے نہیں پاتی تھی کہ وہ خود اس کے دروازے پر نمودار ہو جاتے تھے!

علماء عہد کی تصریحات

یہی وجہ ہے کہ اُس عہد کے اکثر اصحاب نظر ان کی حالت دیکھتے ہی بے اختیار پکار اُٹھے کہ یاجوج و ماجوج کا موعودہ خروج یہی ہے۔ امام ذہبی نے تاریخ میں متعدد علماء کا یہ تاثر نقل کیا ہے، اور حافظ علم الدین برزالی نے تاریخ دمشق میں اور مقریزی نے درر العقود میں تصریح کی ہے کہ اس عہد میں "ایک کثیر جماعت" اہل علم کی اس فتنہ کو فتح یاجوج و ماجوج قرار دیتی تھی۔ نیز حافظ سیوطی نے اپنے رسالہ فضائل بنی عباس میں مقریزی کے ایک رسالہ "ما ورد فی بنی امیۃ و بنی العباس من الروایات والاقوال" کا حوالہ دیا ہے، اور اس سے یہی قول نقل کیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے جد مجد الدین ابن تیمیہ صاحب منتقی کہا کرتے تھے۔ اگر یہ خود یاجوج و ماجوج نہیں ہیں تو ظاہر ہونے والے یاجوج ماجوج ایسے ہی ہونگے۔ صاحب تاریخ گزیدہ نے بھی دبے لفظوں میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

سد سے مقصود قید خانہ کی دیوار نہیں ہے

ہمارے مفسروں نے چونکہ سد ذوالقرنین کی تعمیر کا مطلب یہ سمجھ رکھا تھا کہ جس طرح قیدیوں کو دیوار چن کر بند کر دیتے ہیں، اسی طرح ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کو بند کر دیا ہے، اس لیے یہاں "فتحت" کا لفظ دیکھ کر جھٹ اُنھوں نے یہ مطلب ٹھہرا دیا کہ جب دیوار کھل جائیگی اور یاجوج ماجوج آزاد ہو کر نکل پڑینگے۔ حالانکہ نہ تو سد سے مقصود قید خانہ کی دیواریں ہیں۔ اور نہ یاجوج ماجوج سے مقصود بھیڑوں کا کوئی گلہ ہے جسے باڑہ کھینچ کر بند کر دیا گیا ہو۔ دنیا میں اس طرح کوئی کسی قوم کو دیواروں میں چن نہیں دے سکتا۔ ذوالقرنین کے زمانہ میں یاجوج ماجوج کا حملہ ایک خاص راہ سے ہوتا تھا۔ دوسری راہیں ان پر نہیں کھلی تھیں، اس لیے اُس نے سد تعمیر کر کے اُسے بند کر دیا اور صدیوں تک کے لیے ملک محفوظ ہو گیا۔ اسی طرح چینیوں نے بارہ سو میل لمبی دیوار تعمیر کر کے شمال اور مغرب کی ساری سرحد بند کر دی۔ لیکن اب یہ دونوں رکاوٹیں بیکار ہو گئی تھیں، کیونکہ چین کے لیے جنوب کی راہ اور مغربی ایشیا کے لیے خراسان کی راہ کھل گئی تھی۔ والقصہ بطولہا۔

یاجوج اور تاریخ اسلام

اس واقعہ نے تاریخ اسلام کو دو بڑی قسموں میں منقسم کر دیا ہے۔ قبل از فتنہ تاتار اور بعد از فتنہ تاتار۔ پہلے عہد کی تمام دینی، تمدنی، ذہنی، اور عملی خصوصیات دوسرے عہد میں یک قلم معدوم ہو گئیں۔ پہلا عہد صرف عروج ہی کا عہد نہ تھا بلکہ تنزل کا بھی تھا تاہم مسلمانوں کے فکر و عمل کی جو معنوی روح اوائل میں پیدا ہو گئی تھی، وہ کسی نہ کسی شکل میں کم و بیش قائم تھی۔ لیکن اس فتنے نے پچھلا دور بالکل ختم کر دیا اور عالم اسلامی کی خون آلود سرزمین سے جو نیا دور بنا، وہ ہر اعتبار سے ایک مختلف اور متضاد دور تھا، اور سر تا سر عہد تنزل کی پیداوار۔ آج مسلمانوں کے فکر و عمل کا جو ڈھانچا نظر آ رہا ہے، یہ اسی دور کی پیداوار ہے۔

اس انقلاب حال کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ عربی خلافت کا بکلی خاتمہ ہو گیا۔ عربی خلافت اس سے پہلے بھی خلافت نہیں رہی تھی۔ خلافت کا محض سایہ تھی۔ تاہم سایہ باقی تھا، اور وہ اصلیت کی یاد تازہ کرتا رہتا تھا لیکن سقوط بغداد سے یہ سایہ بھی معدوم ہو گیا۔

حدیث زینب بنت جحش

بخاری کی حدیث زینب بنت جحش میں اس صورت حال کی طرف صاف صاف اشارہ موجود ہے: استیقظ النبی صلی اللہ علیہ وسلم محمرا وجہہ، یقول لا الہ الا اللہ، ویل للعرب من شر قد اقترب۔ فتح الیوم من ردم یاجوج وماجوج مثل ھذا (وعقد سفیان تسعین او مائۃ) قیل "انھلک وفینا الصالحون؟" قال "نعم، اذا کثر الخبث" یعنی آنحضرت صلعم ایک دن

سو کر اٹھے تو آپ کا چہرۂ مبارک شدت کرب سے سرخ ہو رہا تھا، اور فرما رہے تھے "لا الٰہ الا اللہ! اس شر سے جو قریب آگیا عرب کے لیے افسوس! آج یاجوج و ماجوج کی روک کھل گئی" پھر انگلیوں سے حلقہ بنا کر بتلایا کہ ابھی صرف اتنی راہ کھلی ہے۔ یہ حلقہ روپیہ کے برابر یا اس سے کچھ چھوٹا تھا۔[1] آخری راوی کو اس بارہ میں شبہ پڑ گیا بہر حال مطلب یہ تھا کہ ابھی صرف رخنہ پڑا ہے پوری راہ نہیں کھلی۔ اس پر عرض کیا گیا "کیا ہم ہلاکت میں پڑ جائیں گے حالانکہ ہم میں صالح انسان بھی ہونگے؟" فرمایا "ہاں جب گند بڑھ جائیگی"

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

اولاً آنحضرت کے زمانے میں یعنے ساتویں صدی مسیحی میں یاجوج ماجوج کی روک کھلنا شروع ہو گئی تھی لیکن اتنی نہیں کھلی تھی کہ قدم باہر بڑھا سکیں۔ یہ حقیقت خواب میں اس طرح دکھائی گئی، جیسے ایک دیوار ہے اور اس میں ذرا سا سوراخ بن گیا ہے۔ چنانچہ تاریخ اس کی ہو بہو تصدیق کرتی ہے۔ ٹھیک یہی زمانہ ہے جب منگولی قبائل نے اس راہ کے علاوہ جسے ذوالقرنین بند کر چکا تھا، ایک دوسری راہ کا سراغ پالیا۔ یعنے بحر خزر اور بحر اسود کی درمیانی راہ کی جگہ بحیرۂ یورال اور بحر خزر کا درمیانی راستہ۔ چھٹی صدی میں تاتاریوں کے بعض قبائل اس طرف بڑھ آئے، اور دریائے جیحوں کی وادیوں میں آباد ہو گئے۔

ثانیاً، یاجوج ماجوج کے ظہور میں عرب کے لیے ہلاکت تھی۔ کیونکہ "ویل للعرب" فرمایا "للمسلمین" نہیں فرمایا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو نسل عربی اقتدار و عروج کے انقراض کا باعث ہوئی، وہ یہی منگولی نسل ہے، اور اس لیے یقیناً یاجوج و ماجوج سے مقصود یہی نسل تھی۔ عربی اقتدار کی ہلاکت کی ابتدا بھی اسی نسل کی مختلف شاخوں سے ہوئی۔ یعنے ترکوں اور سلجوقیوں سے، اور انتہا بھی اسی کے نئے ظہور سے ہوئی یعنی منگولی تاتاریوں سے۔

تاریخ کی ایک ناقابل فراموش عبرت

اس باب میں بہت سے امور تفصیل طلب ہیں، لیکن یہاں مزید اطناب کا موقعہ نہیں۔ البتہ تذکیر و عبرت کے لیے ایک تاریخی حقیقت یاد رکھنی چاہیے۔ اسلام کا مورخ کبھی اس واقعہ کے ماتم سے فارغ نہیں ہو سکتا کہ تاتاریوں کی ابتدائی تاخت اور آخری تاخت، دونوں کا باعث خود مسلمانوں کی فرقہ بندی اور اس کی جاہلی عصبیت ہوئی۔ یعنے بربادی کا پہلا دروازہ حنفیوں اور شافعیوں کے باہمی جدال سے کھلا، اور بربادی کی آخری تکمیل یعنے بغداد کا قتل عام سنیوں اور شیعوں کے اختلاف کا نتیجہ تھا!

چنگیز خاں نے وسط ایشیا کا بالائی علاقہ خوارزم تک (یعنے خیوا تک) فتح کر لیا تھا، لیکن اس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکا تھا۔ بعد کو جب اس کے پوتوں میں سلطنت تقسیم ہوئی تو وسط ایشیا اور اس کے ملحقات ہلاکو خاں کے زیر حکومت آئے لیکن اسے بھی آگے بڑھنے کی جرات نہیں ہوئی کیونکہ اسلامی حکمتوں کی شش صد سالہ عظمت کا رعب ابھی تک دلوں سے محو نہیں ہوا تھا۔ مگر اس اثنا میں اچانک ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس نے خود بخود ہلاکو کے آگے فتح و تسخیر کی راہیں کھول دیں۔ خراسان میں حنفیوں اور شافعیوں میں باہمی جنگ و جدال کا بازار گرم تھا۔ طوس کے حنفیوں نے شافعیوں کی ضد میں آکر ہلاکو کو حملہ کی دعوت دی اور شہر کے دروازے کھول دیے پھر جب تاتاریوں کی تلوار چمک گئی تو اس نے نہ حنفیوں کو چھوڑا نہ شافعیوں کو۔[2] دونوں کا خاتمہ کر دیا!

خراسان کی تسخیر نے بغداد کی شاہراہ کھول دی تھی۔ پھر بھی ہلاکو اس کی جرات نہ کر سکا کہ عباسی دار الخلافہ پر حملہ کرے، لیکن اب پھر خود مسلمانوں کے باہمی قتال نے اسے بلاوا بھیجا۔ بغداد سنیوں اور شیعوں کے باہمی پیکار کا میدان جنگ بن چکا تھا۔ خلیفہ مستعصم کا وزیر ابن علقمی شیعہ تھا، اور سنیوں کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کر چکا تھا۔ اس نے خواجہ نصیر الدین طوسی کے ذریعہ (کہ ہلاکو کا وزیر اور معتمد تھا) ہلاکو کو بغداد آنے کی ترغیب دی، اور اس طرح تاریخ اسلام کی سب سے بڑی بربادی اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گئی!

یہی معنی ہیں سورۂ انعام کی اس آیت کے جس میں جماعتی زندگی کے عذابوں میں سے ایک عذاب یہ بتلایا ہے کہ کسی ایک جماعت کا مختلف جماعتوں میں تشیع اور متحزب ہو جانا اور پھر ہر گروہ کا دوسرے گروہ کو اپنی شدت کا مزہ چکھانا: قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض (۶: ۶۵)

---

[1] ذکر کے شمار کے لیے عربوں میں تسبیح کا رواج نہ تھا۔ تسبیح پیروان بودھ کی ایجاد ہے اور انہی سے مسلمانوں نے لی۔ عرب جب شمار کرنا چاہتے تو انگلیوں پر شمار کرتے۔ اسی کو عقد انامل کا طریقہ کہتے ہیں۔ عقد انامل میں ایک علامت نوّے کی ہے ایک سو کی۔ دونوں میں حلقہ بن جاتا ہے۔ ایک ذرا بڑا ایک چھوٹا۔ سفیان سفیہ روایت بیان کرتے ہوئے ایسا ہی حلقہ بنا کر دکھایا تھا لیکن آخری راوی کو شبہ پڑ گیا کہ نوّے والا تھا یا سو والا۔ اس لیے اس نے دونوں کا ذکر کر دیا۔

[2] اس واقعہ کی طرف اشارہ اگرچہ تمام مورخوں نے کیا ہے لیکن تفصیل ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ میں ملیگی جو ایران اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ چنگیز خاں کو خوارزم پر حملہ کرنے کی ترغیب خود خلیفہ الناصر لدین اللہ عباسی نے دی تھی کیونکہ سلجوقیوں کے بعد خوارزم شاہیوں کا اقتدار قائم ہوگیا تھا، خلیفۂ بغداد اس اقتدار کی وجہ سے سخت ضیق میں تھا۔

چنگیز خاں کا نام تیموجن تھا۔ ۶۰۳ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں اس نے چنگیز خاں کا شہنشاہی لقب اختیار کیا۔ ۶۱۶ھ مطابق ۱۲۱۹ء میں خوارزم فتح کرلیا۔ سال وفات ۶۲۴ھ مطابق ۱۲۲۷ء ہے۔

اس کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی قاآن جانشین ہوا۔ اوکتائی کے بعد منکو۔ منکو کے بعد قبلائی۔ قبلائی کے بھائی ہلاکو کے حصہ میں وسط ایشیا کی فرمانروائی آئی۔ اسی نے ۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں بغداد پر حملہ کیا، اور عربی خلافت کا آخری نقش قدم بھی مٹ گیا۔

قانونِ وراثتِ ارض

(۳۶) آیت (۱۰۵) سے آخر تک سورت کے مواعظ کا خاتمہ ہے۔ فرمایا: ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر: "ان الارض یرثھا عبادی الصالحون" ہم نے زبور میں اپنے اس مقررہ قانون کا اعلان کردیا تھا کہ زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہوتے ہیں یعنی جماعتوں اور قوموں کے لیے یہاں یہ قانونِ الٰہی کام کر رہا ہے کہ انہی لوگوں کے حصہ میں ملک کی فرمانروائی آتی ہے جو صالح ہوتے ہیں۔ "صلح" کے معنی سنورنے سنوارنے کے ہیں "فسد" کے معنی بگڑنے بگاڑنے کے۔ "صالح" انسان وہ ہے جو اپنے کو سنوار لیتا ہے اور دوسروں کو سنوارنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے، اور یہی حقیقت نیک عملی کی ہے "مفسد" وہ ہے جو بگاڑ میں پڑا اور بگاڑنے والا ہوتا ہے، اور یہی حقیقت بدعملی کی ہے۔ پس قانون یہ ہوا کہ زمین کی وراثت سنورنے سنوارنے والوں کی وراثت میں آتی ہے۔ ان کی وراثت میں نہیں جو اپنے اعتقاد و عمل میں بگڑ جاتے ہیں اور سنوارنے کی جگہ بگاڑنے والے ہوتے ہیں۔

زبور کا اعلان

زبور کا جو مجموعہ آج موجود ہے اس کے بے شمار ترانوں میں یہ حقیقت صاف صاف بول رہی ہے۔ مثلاً زبور، ۳۷ میں ہے "بدعمل کاٹ ڈالے جائینگے۔ مگر وہ جو خداوند کی بات کی راہ دیکھتے ہیں، زمین کو میراث میں لینگے۔ قریب ہے کہ شریر نابود ہوجائے۔ تو اس کا ٹھکانا ڈھونڈے اور نہ پائے۔ پر وہ جو حلیم ہیں، زمین کے وارث ہونگے، اور ہر طرح کی راحتوں سے خوش دل ہونگے۔" (۳۷: ۹)

انسانی زندگی سرتا سر وارث و میراث ہے

تورات، انجیل، اور قرآن، تینوں نے زمین کی "وراثت" کی ترکیب جا بجا استعمال کی ہے اور غور کرو، یہ ترکیب صورتِ حال کی کیسی سچی اور قطعی تعبیر ہے؟ دنیا کے ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں، ایک طرح کی بدلتی ہوئی میراث کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ یعنی ایک فرد اور ایک گروہ طاقت و اقتدار حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ چلا جاتا ہے اور دوسرا فرد اور گروہ اس کی ساری چیزوں کا وارث ہوجاتا ہے۔ حکومتیں کیا ہیں؟ محض ایک ورثہ ہیں جو ایک گروہ سے نکلا اور دوسرے کے حصہ میں آجاتا ہے۔ اگر زمین کا کوئی ایک قطعہ سامنے رکھ لو، اور جس وقت سے اس کی تاریخ روشنی میں آئی ہے، اس کے حالات کا کھوج لگاؤ، تو تم دیکھوگے، اس کی پوری تاریخ کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ارث و میراث کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ایک قوم قابض ہوئی۔ پھر مٹ گئی۔ دوسری اس کی وارث ہوگئی۔ پھر اس کے لیے بھی مٹنا ہوا، اور تیسرے وارث کے لیے جگہ خالی ہوگئی۔ وھلم جرا۔

پس قرآن کہتا ہے۔ یہاں ارث و میراث کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اب سوچنا یہ چاہیے کہ جو ورثہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں، کیوں ہوتے ہیں؟ اور جو وارث ہوتے ہیں، کیوں وراثت کے حقدار ہوجاتے ہیں؟ فرمایا، اس لیے، کہ یہاں خدا کا ایک اٹل قانون کام کر رہا ہے، "ان الارض یرثھا عبادی الصالحون!" وراثتِ ارضی کی شرط اصلاح و صلاحیت ہے۔ جو صالح نہ ہونگے، زمین اُن سے نکل جائیگی۔ جو صالح ہونگے، اُن کے ورثہ میں آئیگی! ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

عابدین حق کے لیے پیام

اس کے بعد فرمایا: ان فی ھذا لبلاغا لقوم عابدین۔ اس بات میں عبادت گزارانِ حق کے لیے ایک بڑا پیامِ حقیقت مضمر ہے۔ یعنی اس قانونِ الٰہی کے تذکرہ میں اُن کے لیے وراثتِ ارضی کا پیام ہے کہ وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (۲۴: ۵۵) جس طرح اُن سے پہلے خدا کے صالح بندوں کی وراثت میں زمین آچکی ہے،

---

[1] غیر ضروری ہے کہ یہاں "الارض" سے مقصود فلسطین کا ملک قرار دیا جائے جیسا کہ مفسرین نے قرار دیا ہے۔ کیونکہ اسلوبِ بیان عموم کا مقتضی ہے، اور صاف نظر آرہا ہے کہ "الارض" سے مقصود روئے زمین ہے۔ علاوہ بریں حوالہ زبور کا ہے، اور زبور میں عموم و استغراق کے ساتھ ذکر ہے۔ نہ کہ ارضِ موعود۔

اسی طرح عنقریب اُن کی وراثت میں بھی آنے والی ہے۔ اور پھر یہ انقلاب کیوں ہونے والا ہے؟ اس لیے کہ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین! پیغمبر اسلام کا ظہور کرۂ ارضی کے لیے رحمت الٰہی کا ظہور ہے۔ پس ضروری ہے کہ انسانی شقاوت کا خاتمہ ہو۔ ضروری ہے کہ اس کی جگہ رحمتِ الٰہی کا سایہ کرۂ ارضی پر چھا جائے!

اس کے بعد واضح کر دیا کہ پیغمبر اسلام کی دعوت کا ماحصل کیا ہے؟ انما الٰھکم الٰہ واحد۔ فھل انتم مسلمون!

باقی رہی یہ بات کہ یہ انقلاب حال کب ظہور میں آنے والا ہے؟ تو: ان ادری، اقریب ام بعید ما توعدون۔ میں جانتا ہوں کہ یقیناً ایسا ہونے والا ہے لیکن ابھی اس میں کچھ دیر ہے یا بالکل سامنے آ گیا؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس بارہ میں بھی اللہ کے مقررہ قوانین ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں۔ وان ادری، لعلہ فتنۃ لکم ومتاع الی حین۔ کون جانتا ہے، ہو سکتا ہے کہ جو تاخیر ہو رہی ہے، وہ اس لیے ہو کہ تمہیں ابھی کچھ دنوں اور آزمائش میں ڈالنا ہے۔ یا اس لیے کہ تمہارے تمتع حیات کے کچھ دن ابھی باقی ہیں۔

یہ سورت کا کتنا اہم مقام ہے؟ سورت کے تمام بیانات کس طرح وقت کی سب سے بڑی موعظت پر ختم ہو رہے ہیں؟ اور پھر کیسی فیصلہ کن بات ہے جس میں مومنین صالحین کے لیے پیام اقبال اور منکرین مفسدین کے لیے پیام ادبار ہے! لیکن تفسیریں اٹھا کر پڑھو۔ ہمارے مفسر اس تیزی سے نکل گئے ہیں۔ گویا رکنے اور نظر و تدبر سے کام لینے کی اس میں کوئی بات ہی نہیں ہے!

رحمۃ للعالمین — یہاں پیغمبر اسلام کے ظہور کا ایک ایسا وصف بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے بیان کردہ اوصاف میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ یعنے رحمۃ للعالمین! یہ ظہور صرف کسی ایک ملک، کسی ایک قوم، کسی ایک نسل ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہے، یہ وصف بیان کر کے قرآن نے ایک کسوٹی ہمارے حوالہ کر دی ہے۔ اس پر ہم اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکھ لے سکتے ہیں۔ اگر یہ فی الحقیقت تمام نوع انسانی کے لیے رحمت کا ظہور ثابت ہوا ہے، تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے، تو پھر سچائی نے قرآن کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارا فرض ہے کہ حقیقت کا حقیقت کے لیے اعتراف کریں۔

یہ جانچ تاریخ کی بے لاگ اور بے رحم جانچ ہونا چاہیے۔ ہر طرح کی مذہبی خوش اعتقادیوں سے منزہ، ہر طرح کی خود پرستانہ طرفداریوں سے پاک۔ کیونکہ یہاں حقیقت کی عدالت موجود ہے، اور وہ صرف حقیقت ہی کی شہادت پر کان دھرتی ہے!

تاریخ کا فیصلہ — جہل و تعصب نے ہمیشہ اعلانِ حقیقت کی راہ روکنی چاہی ہے، لیکن روک نہیں سکی ہے۔ اس فیصلہ میں بھی تاریخ نے دیر لگائی، لیکن بالآخر اُسے کرنا پڑا۔ ضروری ہے کہ یہ فیصلہ خود اُسی کی زبانی سنا جائے، اور ایک معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک مورخ کی طرح عالم انسانیت کے ایک ایک گوشہ سے شہادت طلب کی جائے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی جو اس موضوع پر علمی حیثیت سے وقیع سمجھی جا سکے۔ ہم نے مقدمۂ تفسیر میں اس کی کوشش کی ہے، اور ایک خاص باب کا موضوع بحث یہی مسئلہ ہے۔ یہاں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں، اور اختصار مفید مدعا نہیں، اس لیے مجبوراً قلم روک لینا پڑتا ہے۔

حضرت ابراہیم بت شکنی کا واقعہ — (۲۷) سورت کی تشریحات ختم ہو گئیں مگر ایک نہایت اہم بحث باقی رہ گیا ہے۔ یعنے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی بت شکنی کا واقعہ جو آیت (۵۰) سے (۶۷) تک بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر مفسروں نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین موقعوں پر ایسی بات کہی جس پر بظاہر جھوٹ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس میں سے ایک موقعہ یہ ہے جب اُن سے پوچھا گیا "ءانت فعلت ھذا" کیا تو نے بتوں کو توڑا ہے؟ تو انہوں نے کہا "بل فعلہ کبیرھم ھذا" بلکہ اس بڑے بت نے ایسا کیا۔ حالانکہ فی الحقیقت فعل خود انہی کا تھا۔

اس بارے میں استدلال صحاح کی ایک روایت سے کیا جاتا ہے، لیکن سب سے پہلے ہمیں خود اس مقام پر غور کرنا چاہیے کہ کیا فی الحقیقت یہاں کوئی ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہے جس سے حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا ثابت ہوتا ہو؟ خواہ وہ جھوٹ کسی درجہ اور کسی نوعیت کا ہو۔

کیا حضرت ابراہیم نے جھوٹ بولا — حقیقت یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی تاریخ کی بوالعجبیوں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی ناقابل توجیہ بوالعجبی نہیں۔ قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے اس اصدق الصادقین کا جھوٹ بولنا نکلتا ہو۔ لیکن بہ تکلف ایک آیت کو توڑ مروڑ کر ایسا بنایا جا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح جھوٹ بولنے کی بات بن جائے۔ اور اثباتِ کذب کی یہ مبارک کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟ صرف اس لیے کہ ایک مزعومہ

حدیث موجود ہے۔ پس کہیں یہ قباحت نہ لازم آئے کہ اس کے غیر معصوم راویوں کی روایت کو ہمارے اوپر چھا دیا جائے۔ کیونکہ اصل چیز اب بھی غیر معصوم راویوں کا تحفظ ہے۔ نہ کہ معصوم رسولوں کا۔ اور اگر قرآن میں اور کسی روایت میں اختلاف واقع ہو جائے تو قرآن کو روایت کے مطابق بنانا پڑے گا۔ راوی کی شہادت اپنی جگہ سے کبھی جنبش نہیں کر سکتی!

اب غور کرو۔ یہاں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ خود قرآن کے صاف صاف لفظوں میں کیا ہے!

شہر اُور کی بت پرستی

سرزمین دجلہ و فرات میں نینوا اور بابل سے پہلے جو شہر آباد ہوئے ان میں ایک شہر اُور تھا۔ یہ جنوبی عراق میں فرات کے کنارے آباد تھا اور محل وقوع وہ مقام تھا جو آج کل "تل العبید" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کی تنقیب و تحقیق کا سلسلہ ابھی جاری ہے لیکن جس قدر آثار و کتبات روشنی میں آچکے ہیں، اُن سے باشندگان شہر کے عقائد و اعمال کے بہت سے گوشے واضح ہو چکے ہیں۔ یہاں بت پرستی کی وہ ساری بنیادیں استوار ہو چکی تھیں جو آگے چل کر نینوا اور بابل میں زیادہ وسیع اور منظم شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ پرستش کا مبدا کواکب تھے۔ سب سے بڑا بت "شمش" کا تھا یعنی شمس (سورج) کا۔ اس کے نیچے بہت سے بت مختلف طاقتوں یا مختلف قبیلوں اور آبادیوں کے تھے۔ خود شہر اُور کا محافظ خدا "نانار" تھا۔ یعنی چاند۔ "تل العبید" کے ٹیلے میں جس مندر کے آثار ملے ہیں، یقین کیا جاتا ہے کہ وہ "نانار" کا مندر تھا۔

مندر کے خاص پجاریوں اور محافظوں کا ممتاز گروہ بھی پیدا ہو چکا تھا، اور انہیں دینی ریاست پیشگی (Priest hood) کی نوعیت حاصل ہو گئی تھی۔

آزر نام نہیں لقب تھا

حضرت ابراہیم کا ظہور اسی شہر میں ہوا۔ اُن کے والد تارخ کا بچپنے ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ چچا نے پرورش کی تھی، اور چونکہ وہ مندر کے پجاریوں میں سے تھا، اس لیے "آدار" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ "آدار" قدیم کالدی زبان میں بڑے پجاری یا خادم معبد کو کہا کرتے تھے۔ یہی "آدار" ہے جس نے بعد کی عربی میں "آزر" کی شکل اختیار کر لی، اور اسی لیے قرآن نے اُس کا ذکر اسی لقب کے نام سے کیا۔

حضرت ابراہیم کا گھرانا

حضرت ابراہیم نے جب آنکھ کھولی تو خود اپنے گھر میں بت پرستی پائی لیکن اللہ نے سچائی کی حجتوں اور دلیلوں کی وحی سے ان کا قلب سلیم اس طرح معمور کر دیا تھا کہ نہ تو قوم و وطن کی جہالت و گمراہی اسے چھو سکی، نہ خود اپنے عزیزوں اور بزرگوں کا اعتقاد راسخ اُسے متاثر کر سکا۔ اُنہوں نے پہلے اپنے گھرانے میں تبلیغ کی۔ پھر تمام قوم کو پیام حق پہنچایا۔

دعوت و تبلیغ حق

اُنہوں نے پہلے شرک و بت پرستی کے خلاف عقل سلیم کی حجتیں اور وجدان صادق کی شہادتیں پیش کیں: وتلك حجتنا آتيناها ابراهيم على قومه نرفع درجات من نشاء، ان ربك حكيم عليم (۶: ۸۳) لیکن پھر دیکھا کہ آباؤ اجداد کی تقلید کی ظلمت اس طرح دلوں پر چھا گئی ہے کہ عقل و بینش کی کوئی روشنی بھی انہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ہر حجت و آیت کا جواب ان کی زبانوں سے یہی نکلتا ہے کہ وجدنا آباءنا لها عابدين (۵۳) نیز اُنہوں نے دیکھا، ایک عرصہ کے تعامل و توارث نے لوگوں کی عقلیں یکسر مفلوج کر دی ہیں۔ بتوں کے روحانی اقتدار و تصرف کا عقیدہ اُن کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ الوہیت و قدوسیت کی یہ متشکل روحانیتیں جو طرح طرح کے روایتی معجزوں اور الہامی اچنبھوں کا سرچشمہ چلی آتی ہیں، محض بے اختیار مورتیاں ہو جائیں، اور درحقیقت ہمارے آباؤ اجداد اور ان کے آباؤ اجداد نہ پا سکے، وہ کل کا ایک نوجوان لڑکا پالے۔ چنانچہ وہ ان کی دعوت تبلیغ کا تمسخر اُڑاتے اور کہتے: اجئتنا بالحق، ام انت من اللاعبين! (۵۵) فی الحقیقت تمہارا ایسا ہی عقیدہ ہے یا ہم سے ہنسی تمسخر کر رہے ہو؟ یعنی بتوں کی عظمت اور ان کے روحانی اقتدار و تصرف کی ہیبت دلوں پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے خلاف کسی کا بے دھڑک زبان کھولنا اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ وہ حضرت ابراہیم کی باتیں سُنتے تو متعجب ہو کر کہتے۔ تمہارے ہوش و حواس کہاں گئے؟ تم سنجیدگی سے ایک بات کہہ رہے ہو یا ہم سے مزاح کر رہے ہو!

یہ محسوس کرنا کہ غلبۂ جہل کے لیے دلائل بیکار ہیں

جب ابنائے قوم کے جہل و کوری کی یہ حالت دکھائی دی، تو حضرت ابراہیم نے محسوس کیا، حجتوں اور دلیلوں کی روشنی ایسے

۱؎ فلاڈلفیا یونیورسٹی (امریکہ) کے عجائب خانہ اور برطانی عجائب خانہ کی ایک مشترک اثری جماعت نے تل العبید کی کھدائی کا کام شروع کیا تھا جو جنگ کی وجہ سے رُک گیا تھا مگر اب پھر جاری ہو گیا ہے۔ اس کے انکشافات نے حضرت ابراہیم کی سرگزشت متذکرۂ قرآن کے متعدد گوشوں پر اہم روشنی ڈالی ہے۔ سورۂ الصافات کی تشریحات میں مختصراً اس کا ذکر کیا جائیگا اور تفصیل مقدمہ میں ملیگی۔

...ان کے لیے باطل ہو گیا ہے۔ ان کے دلوں میں بتوں کے اقتدار و تصرف کا وہم اعتقاد بن کر جم گیا ہے جب تک اس پر چوٹ نہیں لگے گی ان کی آنکھیں کھلنے والی نہیں۔ پس ضروری ہے کہ اعلانِ حقیقت کے لیے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے، اور وہ طریقہ ایسا ہو کہ مری دلیلوں اور منطقوں کی روشنی سے نہیں بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ صدیوں کی یہ گڑھی ہوئی عظمتیں اور نسلوں کی مانی ہوئی معبودیتیں بے اختیار مورتیوں اور بے جان پتھروں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں اور انسانوں کی کسی بڑی تعداد کا کسی بڑی مدت تک ایک بات مان لینا اور سچے جانا سچائی کا ثبوت نہیں۔ سچائی کا ثبوت صرف عقلِ سلیم کی حجت ہے۔

یہ طریقہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ انہوں نے تمام لوگوں کو کھلا کھلا چیلنج دے دیا: تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ اپنے اگر عقل کی کوئی دلیل بھی تمہارے لیے سود مند نہیں۔ تم اپنے اس وہم باطل میں جمے ہوئے ہو کہ یہ مورتیاں طاقت و تصرف رکھتی ہیں تو اچھا اپنی آنکھوں سے دیکھ لو نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ جونہی تم کل اپنے بڑے میلے میں گئے میں تمہارے ان بتوں کے ساتھ ایک داؤ کھیلونگا۔ اگر فی الحقیقت ان میں طاقت و تصرف ہے تو وہ کوئی معجزہ دکھا کر اپنے کو بچا لیں۔ یا میرے ہاتھ پاؤں شل کر دیں۔

جب ایک جماعت تقلید و وہم پرستی میں اس درجہ ڈوب جائے کہ عقل و بصیرت کی کوئی بات بھی اُس کے اندر نہ اُتر سکے تو پھر اقناع فکری کی صرف یہی ایک راہ رہ جاتی ہے کہ ان کی عقل کی جگہ ان کے حواس کو مخاطب کیا جائے اور کوئی ایسی بات کر دکھا دی جائے جس سے ان کی ساری وہم پرستیوں کا بطلان ہو جائے۔ مثلاً ایک بچہ چڑیا کو دیکھ کر ڈرنے لگتا ہے، تم ہزار اُسے سمجھاؤ کہ چڑیا کاٹتی نہیں لیکن وہ ماننے والا نہیں۔ اب ایک دانشمند آدمی کیا کریگا؟ یہ کریگا کہ دلیلوں کی جگہ مشاہدہ سے کام لیگا۔ وہ اپنی انگلی چڑیا کی چونچ میں ڈال دیگا اور پھر نکال کر بچہ کو دکھا دیگا کہ دیکھ لے اُس نے کاٹا ہے یا نہیں کاٹا ہے۔ یہ ایک مشاہدہ بچہ کے اندر وہ یقین پیدا کر دیگا، وہ ایک سو آدمیوں کی ایک ہزار دلیلوں سے بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی حال عقولِ فاسدہ کا ہے۔ تم ان کی عقل و فکر سے کچھ نہیں پا سکتے لیکن تم انہیں مشاہدہ کے ذریعہ عاجز کر دے سکتے ہو۔ حضرت ابراہیم نے بالآخر یہی طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے کہا: جس حقیقت کو تم عقل و فکر سے نہیں پا سکے، میں تمہارے مشاہدہ میں لا کر خود تمہاری زبانوں سے اُگلوا لونگا۔ تمہارے دل میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ ان میں طاقت و تصرف ہے۔ اچھا میں ان پر ہاتھ اُٹھاتا ہوں۔ اب اگر سچ مچ کو ان میں اختیار و تصرف ہے، تو یہ اپنے سارے معجزے لیکر نمودار ہو جائیں، اور مجھے اس سے روک دیں یا مجھ پر کوئی آسمانی عذاب اُتار دیں۔

لوگوں نے اُن کا یہ اعلان سُنا لیکن چونکہ دلوں میں بتوں کی عظمت و تقدیس بسی ہوئی تھی، اس لیے قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ ... یہ ایک مجنونانہ بڑ ہے۔ بھلا کون ہے جو ان قادر و توانا معبودوں کی جناب میں ایسی جرأت کر سکتا ہے! اور اگر کرے تو اُسے اس کی مہلت ہی کب ملیگی؟ نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائے؟

لیکن حضرت ابراہیم اپنے فیصلہ کا اعلان کر چکے تھے اور اُسے کر کے دکھا دینا تھا۔ جونہی معبد خالی ہوا، انہوں نے ایک ایک کر کے تمام بت توڑ دیے۔ صرف بڑے بت یعنی "شمش" کو چھوڑ دیا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ "لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ" اگر یہ باقی رہیگا تو شاید اس کی طرف لوگ رجوع کریں۔ یعنی یہ سوال اُٹھایا جا سکے کہ اس کے سامنے بتوں پر آفت آئی۔ اور خود یہ بھی کہ ربّ الارباب تھا کچھ نہ کر سکا۔ اب اسی سے بتوں کی تباہی کی کہانی سُن لی جائے!

جب لوگ واپس آئے، اور اُنہوں نے دیکھا، جو بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی وہ وقوع میں آگئی، اور سچ مچ کو ابراہیم نے سارے بت پاش پاش کر دیے۔ تو غور کرو، ان کے دل و دماغ کا کیا حال ہوا ہوگا! اور ایسی حالت میں کیا ہونا چاہیے! پہلے حیرت چھائی ہوگی کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا! کیا یہ مقدس مورتیاں اس طرح توڑ پھوڑ ڈالی جا سکتی تھیں! پھر حضرت ابراہیم کی ساری باتیں سامنے آگئی ہونگی۔ صاف نظر آگیا ہوگا کہ اس بارے میں سچا وہی نکلا، ہم جھوٹے ہوئے۔ پھر اپنی شکست کے خیال نے غم و غصہ کی شکل اختیار کر لی ہوگی۔ فتح مند آدمی اتنا غضبناک نہیں ہوتا جتنا شکست خوردہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ شکست سخت ذلت و ندامت کی شکست ہو۔ اب پجاریوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ معاملہ کی شاعت عامۃ الناس پر پوشیدہ رکھی جائے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ابراہیم نے پہلے چیلنج دے دیا تھا، اور پھر کر کے دکھا دیا، تو اُن کے عقیدے فوراً متزلزل ہو جائیں گے۔ پس مصلحت کے لیے پجاریوں نے ایسا انداز اختیار کر لیا، گویا ابراہیم والی بات کی انہیں خبر ہی نہیں۔ آپس میں پوچھنے لگے یہ شرارت کس نے کی ہے؟ جس کسی نے کی ہے، وہ بڑا ہی ظالم ہے۔ وہ دیوتاؤں کے سخت عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس پر بعض دکھاوے کے

تمام حجت کا عملی طریقہ

پہلے چیلنج دیا پھر کر کے دکھا دیا

پجاریوں کی حیرانی اور پھر تجاہل

پہیل اُٹھے سمعنا فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیم (۶۰) ہم نے سنا ہے ایک نوجوان ان مورتیوں کا ذکر کیا کرتا تھا، غالباً اُسی نے کیا ہوگا۔ ابراہیم کہہ کر پکارتے ہیں۔ غور کرو، کہنے والا اب بھی یہ نہیں کہتا کہ اُس نے مورتیوں کے خلاف کچھ کہنے کی دھمکی دی تھی۔ بلکہ صرف یذکرھم کہہ کے چپ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کوشش یہ ہے کہ اصل معاملہ عوام سے چھپایا جائے۔ جب اس حادثۂ عظیم کی خبر سُن کر وہاں جمع ہو گئے تھے اور جس کا پتہ فاتوا بہ علیٰ اعین الناس (۶۱) سے لگتا ہے۔ یعنی پجاریوں نے کہا ابراہیم کو یہاں لوگوں کے سامنے لاؤ۔ بہرحال حضرت ابراہیم بُلائے گئے۔ وہ اب تمام مجمع کے سامنے کھڑے ہیں۔ مجمع میں پجاری اور عوام دونوں ہیں۔ پجاریوں کو سب کچھ معلوم ہے۔ عوام کو تفصیلات معلوم نہیں۔

حضرت ابراہیم کا مجمع عام میں پجاریوں سے اعتراف

اب وہ وقت آگیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے انکشافِ حقیقت کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اُس کا نتیجہ آشکارا ہو جائے، اور جس حقیقت کے اعتراف سے لوگوں کو انکار تھا، وہ خود اُنہی کے حلقوں سے اگلوالی جائے۔ اور دیکھو کیسے صاف اور قدرتی طریقہ سے حضرت ابراہیم اپنی اس عملی اور قوی حجت کی سلطانی کا اعتراف کرا لیتے ہیں؟ پجاریوں نے دکھاوے کے لیے بے خبر بن کر پوچھا: ءانت فعلت ھذا بالاھتنا یا ابراھیم (۶۲) کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ تو نے یہ حرکت کی ہے؟ اب اگر حضرت ابراہیم ان کے جواب میں کہتے: میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ ایسا کروں گا۔ اس میں پوچھنے کی بات کیا ہے؟ تو انہیں رد و کد کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ وہ عوام کے سامنے انکار کر دیتے کہ تم نے کبھی ایسا نہیں کہا تھا، اور اس طرح اصل مسئلہ کی جگہ ایک دوسری بات میں سوال و جواب چھڑ جاتا۔ پس اُنہوں نے جواب میں حجت الزامی کا ایسا طریقہ اختیار کیا کہ رد و کد کے سارے دروازے بند ہو گئے اور حقیقت آشکارا ہو گئی: بل فعلہ کبیرھم ھذا، فاسئلوھم ان کانوا ینطقون (۶۳) بلکہ اس سب سے بڑے بُت نے شمش نے کیا ہے جس کے آگے تم ہمیشہ اپنے سوالات پیش کرتے رہتے ہو اور پھر کہتے ہو کہ اس کی پراسرار صدائیں تمہیں (یعنی تم پجاریوں کو) سنائی دیتی ہیں۔ یہ ابھی زندہ و سلامت موجود ہے۔ اگر فی الحقیقت مورتیاں سوالوں کا جواب دیا کرتی ہیں تو اسی مورتی سے پوچھ لو، مجھ سے کیوں سوال کرتے ہو؟

پجاریوں کا اعتراف پر مجبور ہونا

یہ جواب سُنتے ہی سب پر سناٹا چھا گیا۔ کیونکہ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نہ تو یہ کہہ سکتے تھے کہ مورتی سے اُمید جواب نہیں۔ نہ مورتی سے سوال ہی کر سکتے تھے۔ اُدھر عوام نتیجہ کے منتظر تھے۔ فرجعوا الیٰ انفسھم "انفسھم" یعنے پجاریوں کی جماعت عوام سے الگ ہو کر آپس میں باتیں کرنے لگی، اور چونکہ اب حضرت ابراہیم کا تیر ٹھیک نشانہ پر لگ چکا تھا، اس لیے اُنہیں اقرار کرنا پڑا: فقالوا انکم انتم الظالمون۔ بلاشبہ حق سے نافرمانی کرنے والے ہم ہی ہیں۔ ٹھیک بات تو وہی ہے جو ابراہیم کہہ رہا ہے۔ بالآخر مجبور ہوئے کہ جو بات حضرت ابراہیم ان سے کہلوانی چاہتے تھے، وہ سر جھکا کر دبی زبان سے کہہ دیں: لقد علمت ما ھؤلاء ینطقون۔ "لقد علمت" یعنے یہ حقیقت تو تجھے معلوم ہی ہو چکی ہے کہ مورتیوں کی صداؤں اور مندر کے اَن دیکھی کے جوابوں کا معاملہ وہ نہیں ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ مورتیاں بولا نہیں کرتیں۔ پھر تیرا یہ کہنا کہ بڑے بُت سے پوچھ کر فیصلہ کر لو کیا معنی رکھتا ہے؟ تب حضرت ابراہیم نے تمام مجمع سے مخاطب ہو کر ندائے حق بلند کر دی: افتعبدون من دون اللہ مالا ینفعکم شیئاً ولا یضرکم؟ افٍ لکم ولما تعبدون من دون اللہ۔ افلا تعقلون؟ (۶۷) جب ان مورتیوں کے نطق و الہام کے سارے قصے من گھڑت ہیں، اور ان کی عجز و درماندگی کا یہ حال ہے جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، تو پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش پر جم گئے ہو؟ کیا اتنی موٹی بات بھی سمجھ نہیں سکتے؟

تفسیر ان کانوا ینطقون

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ کالڈیا میں پجاریوں کی خاص جماعت پیدا ہو چکی تھی، اور بت پرستی کی تاریخ میں اصلی کارفرما جماعت ہمیشہ یہی رہی ہے۔ یہ لوگ عوام سے الگ ہو جاتے تھے، اور پھر عوام کو اپنے قبضہ و اقتدار میں رکھنے کے لیے مندروں کی پُراسرار قوتیں برابر بڑھاتے رہتے تھے۔ چنانچہ مختلف طریقے کام میں لا کر لوگوں کو یقین دلاتے کہ مورتیاں بولتی ہیں۔ سوالوں کا جواب دیتی ہیں۔ نذرانے قبول کرتی ہیں۔ ہر طرح کے عجائب و خوارق شب و روز ان سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کا اصلی خاندان انہی پجاریوں سے تھا۔ وہ گھر کے بھیدی تھے۔ کیونکہ خود ان کا چچا مندر کے پجاریوں میں سے تھا، اور اس طرح وہاں کے تمام حالات سے باخبر ہونے کا پورا موقعہ انہیں حاصل ہو گیا تھا۔ انہوں نے چاہا عوام کے سامنے حقیقت حال کا پجاریوں سے اعتراف کرائیں، اور انہوں نے اعتراف کرا کے چھوڑا۔ پس ان کے اس قول کا کہ "ان کانوا ینطقون" یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ اگر مورتیاں

کی پوجا بنانے والوں کی وہ بات ٹھیک ہے جس کا تم عوام کو یقین دلاتے رہتے ہو تو اس بڑے بت سے دریافت حال کا مطالبہ کرو۔ اگر یہ ہمیشہ تمہارے سوالوں کا جواب دیتا ہے تو آج کیوں نہ دے؟ اور ایسے موقعہ پر کیوں نہ دے جب تمام مندر تہ و بالا ہو گیا ہے! یعنے یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر بت عام طور پر نطق و کلام کرتے ہیں تو ان سے بات کرالو۔ کیونکہ بتوں کا عام طور پر آدمیوں کی طرح بات نہ کرنا تو عام طور پر مسلم تھا۔ کوئی بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا تھا کہ یہ ہماری طرح بولتے چالتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کی یہ بات عوام کے دلوں میں قطعاً اتر گئی ہوگی۔ ہر شخص بول اٹھا ہوگا کہ بات ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بڑی مورتی سے اس معاملہ میں کیوں نہ رجوع کیا جائے۔

لیکن جب حضرت ابراہیم نے مجمع عام میں بت پرستی کے خلاف وعظ شروع کر دیا، تو پجاری ڈرے، اور انہوں نے چاہا، عوام کے مذہبی جذبات بھڑکا کر اپنا کام نکال لیں۔ انہوں نے کہا: احرقوہ وانصروا الٰھتکم ان کنتم فاعلین اسے زندہ آگ میں جلا دو۔ کیونکہ تمام قدیم قوموں میں دستور تھا کہ مذہبی اور سیاسی مجرموں کو زندہ جلا دینے کی سزا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ کالڈیا میں آخری زمانے تک یہی دستور رہا۔ کتاب دانیال سے معلوم ہوتا ہے کہ کالدیوں نے ان یہودیوں کو زندہ جلا دینا چاہا تھا جنہوں نے بادشاہ کی معبودیت سے انکار کر دیا تھا۔

فرض الباطل مع الخصم کذب نہیں ہے

اب غور کرو، اس تمام سرگزشت میں کونسی بات ایسی ہے جس سے حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا نکلتا ہو؟ بتوں کو انہوں نے کچھ چوری چھپے نہیں توڑا تھا کہ خلاف واقعہ بات کہہ کے اسے چھپانا چاہتے۔ تمام پجاریوں کے سامنے صاف صاف اعلان کر دیا تھا، اور اعلان بھی اس تاکید کے ساتھ کہ "تاللہ لاکیدن اصنامکم" خدا کی قسم! میں ضرور تمہارے بتوں کو اپنے داؤ کا نشانہ بناؤں گا۔ پھر جو بات اس طرح صاف صاف کہہ دی گئی ہو، اور علانیہ کی گئی ہو، اس میں جھوٹ بولنے کی بات کہاں سے نکل آئی؟ باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ بل فعلہ کبیرھم ھذا تو ظاہر ہے کہ ایک لمحہ کے لیے اس سے مقصود انکار فعل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فعل کا تو وہ پہلے سے اعلان کر چکے تھے اور خود پوچھنے والوں میں ایک ایک فرد جانتا تھا کہ انہی کا کیا دھرا ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ محض حجت الزامی تھی اور حجت الزامی کا وہ طریقہ جسے ہمارے مناظر "فرض الباطل مع الخصم حتی تلزمہ الحجۃ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ صدق و کذب کا سوال یہاں کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

اثبات کذب کے لیے ایک غلط توجیہہ

چونکہ ہمارے مفسروں کے سامنے ایک روایت موجود تھی، اور اس کی تعمیل میں ضروری سمجھتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح جھوٹ کی بات بن جائے، اس لیے انہوں نے کوشش کی کہ جو بات قرآن میں نہیں ہے، وہ محذوف بنا کر بڑھا دی جائے۔ چنانچہ وہ حضرت ابراہیم کے قول تاللہ لاکیدن اصنامکم کو سلسلۂ بیان سے الگ کر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں، یہ بات انہوں نے مخاطبوں سے نہیں کہی تھی۔ اپنے جی میں کہی تھی۔ یعنے ان کا اعلان نہ تھا۔ جی ہی جی میں ایک سازش سوچی تھی۔ لیکن یہ محض ملائے سے قرآن کے مطالب میں اضافہ کرنا ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے جی میں کہا تھا۔ وہ تو صاف صاف کہہ رہا ہے کہ موقعہ مخاطبہ اور مکالمہ کا تھا اور جب پجاریوں نے یہ بات کہی کہ اجئتنا بالحق ام انت من اللاعبین؟ تو اس کے جواب میں حضرت ابراہیم نے اعلان کیا۔ علاوہ بریں اس طرح کے محذوفات جبھی تسلیم کیے جا سکتے ہیں جبکہ کوئی لفظی قرینہ موجود ہو۔ یہاں بجز اس ضرورت کے کہ حضرت ابراہیم کو کذب ثابت کرنا چاہیئے، اور کونسی ضرورت لاحق ہو گئی ہے کہ یہ محذوف گڑھ لیا گیا؟

روایت صحیحین

باقی رہی صحیحین کی روایت کہ لم یکذب ابراھیم فی شئ قط الا ثلاث کلھن فی اللہ۔ الخ۔ تو اگرچہ اس کی توجیہہ و تاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھول لی ہیں، مگر صاف بات وہی ہے جو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ہے اور جسے امام رازی نے بھی دہرایا ہے۔ یعنے ہمارے لیے یہ تسلیم کر لینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر حدیث میں غلطی ہو گئی، بہ مقابلہ اس کے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کر لیں! اگر ایک راوی کی جگہ سینکڑوں راویوں کی روایت بھی ناقص ٹھہر جائے، تو بہرحال غیر معصوم انسانوں کی غلطی ہوگی۔ لیکن اگر ایک معصوم پیغمبر کو بھی غلط بیان تسلیم کر لیا گیا، تو نبوت و وحی کی ساری عمارت درہم برہم ہو گئی!

صحت اور عصمت

بلاشبہ روایت صحیحین کی ہے، لیکن اس تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے بھی راویانِ حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا۔ نہ امام بخاری و مسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے۔ کسی روایت کے لیے بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے، وہ اس کی صحت ہے۔ عصمت نہیں ہے۔ اور صحت سے مقصود صحت مصطلحۂ فن ہے۔ نہ کہ صحت قطعی و یقینی مثل صحتِ قرآن۔ پس ایک روایت پر صحت کی کتنی

اصل رد و قبول

بھی مبنی کیوں نہ ہوں، لیکن بہرحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ظنیات کے لیے مفید حجت ہو سکتا ہے مگر یقینیات و قطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی ایسا ہوگا کہ کسی راوی کی شہادت یقینیات سے معارض ہو جائیگی، تو یقینیات اپنی جگہ سے نہیں ہلینگے۔ غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑیگی۔

نبوت اور سچائی لازم و ملزوم ہیں

نبی کا سب سے بڑا وصف جو قرآن نے بتلایا ہے، وہ اس کی سچائی ہے، اور اعتبار تفصیل نہیں، نبوت ایک سیرت مجسم صرف سچائی ہی سے بنتی ہے، اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک نبی کبھی بات سے عاجز نہیں ہوتا کہ کوئی بات سے کہ سچ نہ بولے حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے، خواہ کسی شکل اور کسی درجہ میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر نبوت ہوگی تو سچائی بھی ہوگی۔ اگر سچائی نہیں ہے تو نبوت بھی نہیں۔ پس انبیاء کرام کی سچائی اور عصمت یقینیات مذہبیہ و عقلیہ میں سے ہے۔ روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں، اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لیے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ یہی ماننا پڑیگا کہ یہ بات رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑیگا اور نہ زمین شق ہو جائیگی۔

صحیحین کے باب میں افراط و تفریط

اصل یہ ہے کہ ہر گوشہ کی طرح اس گوشہ میں بھی متاخرین افراط و تفریط میں پڑ گئے ہیں اور اس کی وجہ سے عجیب عجیب الجھاؤ پیش آ رہے ہیں۔ ایک طرف فقہاء حنفیہ ہیں جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ صحیح بخاری و مسلم کی مرویات کی زد ان کے مذہب پر پڑ رہی ہے، اس امر کی کوشش شروع کر دی کہ ان دونوں کتابوں کی صحت کی قوت کسی نہ کسی طرح کمزور کی جائے۔ چنانچہ ابن ہمام وغیرہ نے اس طرح کے اصول بنانا شروع کر دیے کہ صحیحین کی ترجیح صحیحین کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ان کی شروط کی وجہ سے ہے پس اگر کسی دوسری کتاب کی روایت بھی ان شرطوں پر اتر آئی تو قوت میں صحیحین کی روایت کے ہم پلہ ہو جائیگی۔ حالانکہ صحیحین کی ترجیح محض ان کی شروط کی بنا پر نہیں ہے بلکہ "شہرت" اور "قبول" کی بنا پر ہے، اور اس پر تمام امت کا اتفاق ہو چکا ہے۔ دوسری طرف عامۂ اصحاب حدیث ہیں جنہوں نے اس باب میں ٹھیک ٹھیک تقلید کی وہی چادر اوڑھ لی ہے جو فقہاء مقلدین کے سروں پر انہوں نے دیکھی تھی اور تار تار پارہ پارہ کر دینا چاہا تھا۔ ان کے سامنے جونہی بخاری و مسلم کا نام آ جاتا ہے، بالکل درماندہ ہو کر رہ جاتے ہیں، اور پھر کوئی دلیل و حجت بھی انہیں اس پر طیار نہیں کر سکتی کہ اس کی کسی روایت کی تضعیف پر اپنے آپ کو راضی کر سکیں!

یہ محل تفصیل کا نہیں لیکن چونکہ ایک اہم اور اصولی سوال ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مختصراً اشارات کر دیے جائیں کہ اس باب میں تحقیق کی راہ یہ سمجھنی چاہیے کہ:

مسلک تحقیق

(ا) قرآن کے بعد دین کی ان تمام کتابوں میں جو انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ہیں سب سے زیادہ صحیح کتاب جامع بخاری اور جامع مسلم ہے، اور ان کی ترجیح محض ان کی شروطیں کی بنا پر نہیں ہے بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے۔ "شہرت" یہ کہ ایک کتاب علم و نظر کے تمام عہدوں اور طبقوں میں عالمگیر طور پر مشہور رہی ہو، اور اہل علم نسلاً بعد نسل اس کی صحت و فضیلت پر مہریں لگاتے رہے ہوں۔ "قبول" یہ کہ وہ تمام امت کی نظر و بحث کا مرکز بن گئی ہو۔ ہر عہد اور ہر طبقہ میں بے شمار ناقدوں اور محققوں نے اس کی ایک ایک سند، ایک ایک راوی، ایک ایک متن، ایک ایک لفظ پر ہر طرح کی بحثیں کی ہوں، ہر طریقہ سے جانچا ہو، ہر طرح کی نگاہیں رد و قبول کی ڈالی ہوں، زیادہ سے زیادہ موافق و مخالف شرحیں لکھی ہوں، زیادہ سے زیادہ درس و تدریس میں الجھتے رہے ہوں، اور پھر بھی اس کی مقبولیت یکسر بے داغ رہی ہو۔ چونکہ یہ دو باتیں تاریخ اسلام میں صرف انہی دو کتابوں کے حصے میں آئی ہیں ولیس لها ثالث اس لیے انکی یہی بجائے خود ایک دلیل صحت ہو گئی ہے، اور بلا شبہ جب کبھی اختلاف ہوگا، تو صحیحین کی روایت محض اس لیے بھی قوی ترجیح پا جائیگی کہ وہ صحیحین کی روایت ہے۔ دوسرے مجامیع کی روایات کتنی ہی شروط بخاری و مسلم پر نکال کر دکھا دی جائیں، لیکن وہ اس کی ٹکر کا ہم پلہ نہیں ہو سکتیں۔

(ب) لیکن یہ جو کچھ ہے، ان کی صحت کا اعتقاد ہے یعنی ایسی صحت کا جیسی اور جس درجہ کی صحت ایک غیر معصوم انسان کے اختیارات کی ہو سکتی ہے۔ عصمت کا اعتقاد نہیں ہے، اور اس لیے اگر کوئی روایت شاذ یقینیات قطعیہ قرآنیہ سے معارض ہو جائیگی، تو ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی تضعیف میں تامل نہیں کرینگے۔ کیونکہ اصل ہر حال میں قرآن ہے، جس کا تواتر یقینی اور جس کی قطعیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ہر انسانی شہادت اس پر کسی جائیگی۔ وہ کسی غیر معصوم شہادت اور علمی پرکھ سے نہیں پرکھا جا سکتا۔

غرض اندریں بیان سلامت است!

اور پھر ہم دیکھ رہے ہیں کہ محققین حدیث نے اس باب میں کبھی ارباب جمود و تقلید کا شیوۂ اعمیٰ اختیار نہیں کیا۔ یہ بخاری کی روایت اسریٰ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر والی ہے جس کی نسبت تمام محققین نے بے تامل تصریح کر دی کہ شریک کو غلط فہمی ہوئی اور انوکھی بات کہی ہے جو مسلم کی روایت انس بن مالک میں ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم کی حدیث خلق اللہ التربۃ یوم السبت کی نسبت تمام محققین نے اتفاق کیا اس کا رفع ثابت نہیں اور اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔ پھر اگر اسی طرح صحیحین کی یہ روایت بھی رد کر دی گئی کہ ابراہیم خلیل کی صداقت مجروح نہ ہو جائے، تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑیگی!

اس روایت میں حضرت ابراہیم کی تین باتوں کو "کذب" سے تعبیر کیا ہے۔ ایک تو یہی بات، دوسری وہ جو سورۂ صافات میں ہے: فقال انی سقیم (۳۷: ۸۹)۔ تیسری یہ کہ انہوں نے بادشاہ مصر کے آگے اپنی بیوی سارہ کو بہن کہا تھا۔ آخری بات قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ تورات میں ہے، اور ہم اس کے موجودہ نسخوں کی صحت کے ذمہ دار نہیں۔ باقی رہا "انی سقیم" والا قول، تو اس کی شرح صافات میں ملیگی۔ یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اس کا کوئی مطلب بھی ٹھہرایا جائے، لیکن اس میں جھوٹ کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟ ایک شخص نے کہا میں سقیم ہوں۔ پھر کیوں اسے جھوٹ پر محمول کیا جائے؟

فقال "انی سقیم"

ہم نے یہاں اصل واضح کر دی۔ لیکن یہ بھی ضروری کہ روایت مشہورہ کے متن و اسناد پر نظر ڈالی جائے۔ اس کے لیے البیان کا انتظار کرنا چاہیے۔

سُوْرَةُ الْحَجِّ

مدنی۔ ۷۸۔ آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ

اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ

۲-۳ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ كُتِبَ

۴ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ

(۱) سورت کی ابتدا حیاتِ اُخروی کے اثبات اور قیامت کی ہولناکیوں کی تذکیر سے ہوئی ہے۔ غور کرو۔ صرف ایک آیت کے اندر اس ہولناک ترین حادثۂ کائنات کی کیسی کامل تصویر کھینچ دی ہے! ماں کی محبت سے بڑھ کر طبیعتِ انسانی کا کوئی علاقہ نہیں، اور اس محبت کے جوش کی سب سے زیادہ تیزی اس وقت ہوتی ہے جب بچہ دودھ پیتا ہوتا ہے اور ہر وقت ماں کی چھاتی سے لگا رہتا ہے۔ پس ہولناکی کی شدت کی یہ کس درجہ حقیقی اور فطری تصویر ہے کہ ماؤں کو اپنے دودھ پیتے بچوں تک کا ہوش نہ رہا۔ دہشت میں ایسی کھوئی گئیں کہ اپنی گود کے بچوں کو بھول گئیں! جس ہولناکی کا یہ حال ہو اس سے بڑھ کر طبیعتِ بشری کے لیے اور کونسی ہولناکی ہو سکتی ہے؟

(۲) اس کے بعد فرمایا۔ حاملہ عورتیں کہ ابھی ان کے وضعِ حمل کا وقت نہیں آیا، شدتِ ہول سے بے اختیار جنین گرا دینگی۔ اور یہ دہشت کی انتہا ہے۔ جسمِ انسانی پر اس سے زیادہ دہشت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور لوگ کس حال میں ہونگے؟ ایسے جیسے متوالے ہو گئے ہوں۔ یہ حالت فی الحقیقت متوالے ہونے کی حالت نہ ہوگی، بلکہ ہولناکی کی شدت انہیں مجنوط الحواس کر دیگی!

(۳) گذشتہ جنگ میں جب جرمن فوج نے لیژ اور انٹورپ پر گولہ باری کی تھی، تو وہاں کے بہت سے باشندے بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ اگر گولہ باری کی ہولناکی کا یہ اثر ہوتا ہے، تو اس حادثہ کا اثر کیسا ہوگا جس میں اجرامِ سماویہ ایک دوسرے سے ٹکرا جائینگے؟

۱ لوگو! اپنے پروردگار (کے عذاب سے) ڈرو یقین کرو آنے والی گھڑی کا بھونچال بڑا ہی سخت واقعہ ہوگا!

۲ جس دن وہ تمہارے سامنے آموجود ہوگی، اُس دن (کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہیگا) دودھ پلانے والی مائیں اپنا دودھ پیتا بچہ بھول جائینگی۔ حاملہ عورتیں (وقت کے پہلے) اپنا حمل گرا دینگی۔ لوگوں کو تم اس حال میں دیکھوگے کہ بالکل متوالے ہو گئے۔ حالانکہ وہ متوالے نہیں ہوئے مگر اللہ کے عذاب کی ہولناکی بڑی ہی ہولناک ہے (جس نے انہیں متوالوں کی طرح بے ہوش کر دیا!)

۳ اور (دیکھو) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ وہ ہر سرکش شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔

۴ شیطان کے لیے یہ بات لکھ دی گئی ہے کہ جو کوئی اس کا رفیق ہوا، وہ ضرور اُسے گمراہی میں ڈالیگا اور عذابِ جہنم تک پہنچا کر رہیگا!

۵ لوگو! اگر تمہیں اس بارے میں شک ہے کہ آدمی (دوبارہ) جی اُٹھیگا، تو (اس بات پر غور کرو) ہم نے تمہیں (کس چیز سے) پیدا کیا (؟) مٹی سے۔ پھر (تمہاری پیدائش کا سلسلہ کس طرح جاری ہوا؟) اس طرح کہ پہلے نطفہ

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَ

ہوتا ہے۔ پھر علقہ بنتا ہے (یعنے جونک کی طرح کی ایک چیز) پھر مشکل اور غیر مشکل گوشت کا ایک ٹکڑا۔ اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ تم پر (اپنی قدرت کی کارفرمائیاں) واضح کر دیں پھر دیکھو جس نطفہ کو ہم چاہتے ہیں (تکمیل تک پہنچائیں) اسے عورت کے رحم میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر (جب نطفہ تکمیل کے تمام اندرونی مراتب طے کر لیتا ہے، تو) طفولیت کی حالت میں تمہیں باہر نکالتے ہیں۔ پھر تم پر (یکے بعد دیگرے) ایسی حالتیں طاری کرتے ہیں کہ (بالآخر) اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جاتے ہو۔ پھر تم میں کوئی تو ایسا ہوتا ہے جو (بڑھاپے سے پہلے ہی) مر جاتا ہے۔ کوئی ایسا ہوتا ہے جو (بڑھاپے تک پہنچتا اور اس طرح) عمر کی نکمی حالت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے، کہ سمجھ بوجھ کا درجہ پا کر پھر ناسمجھی کی حالت میں پڑ جائے۔

اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے۔ پھر جب ہم اُس پر پانی برسا دیتے ہیں، تو اچانک لہلہانے اور اُبھرنے لگتی ہے۔ ہر قسم کی روئیدگیوں میں سے حسن و خوبی کا منظر اُگ آتا ہے! ۵

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی ہستی ایک حقیقت ہے اور وہ بلاشبہ مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے، اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔ نیز اس بات کی کہ مقررہ گھڑی آنے والی ہے۔ اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں، اور اسکی کہ ۶

(۲) پیدائش سے پہلے جنین پر جو مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں، انکی طرف یہاں اشارہ کیا ہے:

"نطفة" لغت میں پانی کے ایک قطرہ کو کہتے ہیں، چونکہ جنین کی تکوین کا ابتدائی مادہ پانی کے چند قطروں کی طرح ہوتا ہے، اس لیے اسے نطفہ کہنے لگے۔

"علقة" جمے ہوئے خون کے لوتھڑے کو بھی کہتے ہیں، اور جونک کو بھی۔

"مضغة" کے معنی ہیں، گوشت کا ایک ٹکڑا۔

"مخلقة" یعنے اُس ٹکڑے میں شکل و صورت کی شان کا پیدا ہو جانا۔

"غیر مخلقة" بگڑ کے رہ جانا اور متشکل نہ ہونا۔

پیدائش کے بعد کی تین حالتیں بیان کی ہیں، طفولیت، رشد و عقل، ارذل العمر یعنے بڑھاپا۔ بڑھاپے کو عربی میں ارذل العمر کہتے ہیں کیونکہ اس عمر میں تمام قوتیں جواب دے دیتی ہیں، اور طاقت کے بعد پھر کمزوری و بے بسی کا عہد طاری ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس کی تعلیل واضح کر دی کہ یہ رشد و عقل کے بعد پھر طفولیت کی نادانی و بے عقلی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ گویا انسان کی عمر طفولیت کی نادانی سے شروع ہوتی ہے، اور بتدریج بڑھتے بڑھتے رُشد و عقل کے بلوغ و کمال تک پہنچ جاتی ہے، پس کمال کے بعد پھر زوال شروع ہو جاتا ہے، اور جس حالت سے عمر چلی تھی، اُسی کی طرف لوٹ آتی ہے

اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ○ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ (٧)
مُّنِيْرٍ ○ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ (٨)
الْحَرِيْقِ ○ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ (٩، ١٠ — ع ١٠)
اللّٰهَ عَلٰي حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰي وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ (١١)
ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ○ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ○ (١٢، ١٣)

(٧) اللہ ضرور انہیں اُٹھا کھڑا کریگا جو قبروں میں پڑ گئے (یعنی مر گئے)

(٨) اور دیکھو، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ نہ تو اُن کے پاس علم کی کوئی روشنی ہے، نہ کسی طرح کی رہنمائی، نہ کوئی کتاب روشن، مگر گھمنڈ کرتے ہوئے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کو اُس کی راہ سے بھٹکا دیں۔ ایسے (٩) آدمی کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی رسوائی ہے اور قیامت کے دن بھی ہم اُسے عذابِ آتش کا مزہ چکھائیں گے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے جو خود تیرے ہاتھوں نے پہلے سے مُہیا کر رکھا تھا، اور اللہ تو اپنے بندوں کے لیے کبھی ظالم نہیں (١٠) ہو سکتا"

(١١) اور (دیکھو) کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کی بندگی تو کرتے ہیں مگر دل کے جمائے سے نہیں۔ اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچ گیا، تو مطمئن ہو گئے۔ اگر کوئی آزمائش آ لگی، تو اُلٹے پاؤں اپنی (کفر کی) حالت پر لوٹ پڑے۔ وہ دنیا میں بھی نامراد ہوئے اور آخرت میں بھی، اور یہی ہے جو آشکارا نامرادی ہوئی!

(١٢) وہ اللہ کے سوا اُن چیزوں کو (اپنی حاجت روائی کے لیے) پکارتے ہیں جو نہ تو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں، نہ نفع۔ یہی گمراہی ہے جسے سب سے زیادہ گہری گمراہی سمجھنا چاہیے!

(١٣) وہ ایسی ہستی کو پکارتے ہیں جس کے نفع سے زیادہ اس کا نقصان قریب تر ہے (یعنے واضح و آشکارا ہے) سو کیا ہی بُرا کارساز ہوا، اور کیا ہی بُرا ساتھی!

(٣) قرآن نے جابجا انسان کی ایک ذہنی حالت کو "مجادلہ فی اللہ بغیر علم" سے تعبیر کیا ہے۔ تشریح اس کی آخری نوٹ میں ملیگی۔

(٤) قرآن نے ہر جگہ یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ایمان اُمید اور یقین ہے، اور کفر شک اور مایوسی ہے، اور وہ بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ مایوس نہ ہو۔ اُمید کا چراغ روشن رکھو۔ ہر حال میں اُمیدوارِ فضل و سعادت رہو۔ یہی مقتضائے ایمان ہے۔ یہی سرچشمۂ زندگی ہے۔ اسی سے تمام دنیوی اور اُخروی کامرانیوں کی دولت حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر مایوس ہو گئے۔ اگر مایوسی کی پرچھائیں بھی دل پر پڑنے دی، تو پھر یہ زندگی کا خاتمہ ہوگا، دنیا کی نامرادی ہوگی، عاقبت کا خسران ہوگا!

وہ کہتا ہے، زندگی اُمید ہے اور موت مایوسی۔ جونہی تم نے اُمید کی شمع جلائی، زندگی و سعادت کے دائرہ میں آ گئے۔ جونہی یہ شمع بجھی، موت اور نامرادی کی ظلمت میں گر گئے!

غور کرو۔ قرآن جو کچھ کہتا ہے، کیا اس کے علاوہ بھی کچھ اس بارے میں کہا جا سکتا ہے؟ کیا انسانی زندگی کی ساری کامرانیوں اور فتحمندیوں کی اصل و اساس اُمید ہی نہیں ہے؟ اور کیا نااُمیدی سے بڑھ کر کوئی موت کا سرچشمہ ہو سکتا ہے!

ا۔ الحرف: الطرف۔ اصلہ من حرف الشیٔ وھو طرفہ۔ مثل حرف الجبل، وھاکذا فان القائم علیہ غیر مستقر۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ
مَا يُرِيدُ ○ مَن كَانَ يَظُنُّ أَن لَّن يَنصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ۱۴
ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ○ وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَأَنَّ اللَّهَ ۱۵
يَهْدِي مَن يُرِيدُ ○ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ ۱۶
أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ○ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ ۱۷

یہاں آیت (۱۱) میں یہی حقیقت واضح کی ہے۔ فرمایا، کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی بندگی تو کرتے ہیں، مگر اس طرح کہ دل میں جماؤ نہیں ہے، اور ایمان کی بنیاد یقین پر نہیں ہے۔ زندگی کے عارضی اور وقتی حالات پر ہے۔ اگر آرام و خوشحالی کی کوئی بات پیش آگئی، تو مطمئن ہوگئے مصیبت پیش آگئی تو اکھڑ گئے۔ ایسا آدمی نہ تو دنیا کی زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے، نہ آخرت میں۔ کیونکہ ہر کامیابی یقین اور امید ہے۔ جو اس متاع سے محروم رہا، وہ دونوں جگہ نامراد ہوگا، اور زندگی کی سب سے نمایاں نامرادی یہی ہے!

پھر فرمایا، زندگی کی ذرا سی مصیبت بھی انہیں اللہ کی طرف سے ہٹا کر دوسری چوکھٹوں پر گرا دیتی ہے۔ جہاں نہ ان کے لیے نفع ہے، نہ نقصان۔ اور گمراہی میں سب سے زیادہ گہری گمراہی یہی ہے!

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کیے، تو ضرور اللہ انہیں ایسے باغوں میں پہنچا دیگا جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہونگی (اور اس لیے وہ کبھی خشک ہونے والے نہیں) اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ (وہ مالک و مختار ہے!) ۱۴

جو آدمی (مایوس ہوکر) ایسا خیال کر بیٹھتا ہے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد کرنے والا نہیں، تو (اس کے لیے زندگی کی کوئی راہ باقی نہ رہی) اُسے چاہیے، ایک رسّی چھت تک لیجا کر باندھ دے۔ اور (اُس میں گردن لٹکا کر زمین سے) رشتہ کاٹ لے پھر دیکھے، اس تدبیر نے اُس کا غم و غصہ دور کردیا یا نہیں ؟ ۱۵

(۵) آیت (۱۱) پر غور کرو۔ انسانی زندگی کی گمراہیوں کی کیسی سچی تصویر ہے؟ کتنے ہی آدمی ہیں جو بظاہر خدا پرستی کے دعوے میں کسی سے پیچھے نہیں ہوتے، لیکن جہاں زندگی کے کسی اُلجھاؤ میں پڑے اور وہ حسب خواہش دور نہیں ہوا، معاً اُنہوں نے خدا سے منہ موڑ لیا، اور گو زبان سے اقرار نہ کریں لیکن ان کی اعتقادی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے کہ اب حاجت براری کے لیے دوسرے آستانے ڈھونڈھنے چاہئیں۔ چنانچہ جو چوکھٹ سامنے نظر آجائیگی فوراً جھک جائینگے، اور اسے اپنی بندگی و نیاز کا کعبہ بنا لینگے۔ قرآن کہتا ہے: ذٰلک ھو الضلال البعید! یہی گمراہی کی سب سے زیادہ گہری حالت ہے!

آیت (۱۲) میں فرمایا۔ وہ ایسی ہستیوں کو پکارنے لگتے ہیں جنکی نفع سے زیادہ ان کا نقصان اقرب ہے۔ یعنی اگر وہ ذرا بھی سمجھ بوجھ سے کام لیں تو دیکھ لیں، ان سے نفع پہنچنے کے لیے تو کوئی دلیل موجود

اور دیکھو اس طرح ہم نے یہ کلام روشن دلیلوں کی شکل میں اُتارا، اور اس لیے اُتارا کہ اللہ جسے چاہتا ہے (کامیابی کی) راہ پر لگا دیتا ہے! ۱۶

جو لوگ ایمان لائے (یعنے مسلمان) جو یہودی ہوئے جو صابی ہیں، جو نصاری ہیں، جو مجوسی ہیں، جو مشرک ہیں، قیامت کے دن ان سب کے درمیان اللہ فیصلہ کر دیگا (اور اُن کے اعمال کی حقیقت ظاہر ہو جائیگی) اللہ سے کوئی بات چھپی نہیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے! ۱۷

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کوئی بھی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی بھی زمین میں ہے، نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۞ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

نہیں لیکن نقصان میں پڑجانا بالکل واضح اور آشکارا ہے۔ کونسا نقصان؟ ایمان وعقل کا نقصان۔ اگر ایک انسان اپنے ہی جیسی عاجز و محتاج ہستی کو حاجت روائی کے لیے پکارتا ہے، تو حاجت پوری ہو یا نہ ہو لیکن اُس کے ایمان وعقل کا تو فوراً خاتمہ ہو ہی گیا۔ اُس نے سچائی اور حقیقت سے منہ موڑا۔ نجات وسعادت کی راہ اپنے اوپر بند کرلی۔ یہ تو ہوا فوری نقصان۔ باقی رہا نفع، تو اس کے لیے کوئی روشنی موجود نہیں۔ محض اوہام وظنون ہیں جو اسے ان چوکھٹوں پر گرا رہے ہیں! پس نقصان یقینی اور فوری ہوا، اور نفع محض مظنون و موہوم!

(۲۶) آیت (۱۵) پچھلے بیانات کا خلاصہ ہے۔ فرمایا جس انسان نے امید ویقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے، خواہ آخرت کے لیے، اُسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارۂ کار رہجاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کرڈالے!

سبحان اللہ! انسانی زندگی کے تمام مسائل اس ایک آیت نے حل کردیے۔ زندگی امید اور سعی ہے۔ موت مایوسی اور ترک سعی ہے پس اگر ایک بدبخت نے یہ فیصلہ کرلیا کہ خدا کے پاس اُس کے لیے کچھ نہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تو پھر اُس کے لیے باقی کیا رہا؟ کیا ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہ سکتا ہے؟ اور زندہ رہے تو کیوں زندہ رہے؟

لیکن نہیں، ایمان نام ہی امید کا ہے، اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہوسکتا۔ اُس کا ذہنی مزاج کسی چیز سے بھی اتنا بیگانہ نہیں جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اُسے کتنا ہی کاہش کریں، لیکن وہ پھر سعی کریگا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اُسے کتنا ہی گھیرے، لیکن وہ پھر توبہ کریگا۔ نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہوسکتا ہے، نہ آخرت کی نجات سے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے، اور آخرت کی مایوسی شقاوت۔ وہ دونوں جگہ رحمتِ الٰہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر یقین رکھتا ہے کہ لا تقنطوا

جانپائے، سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں! اور کتنے ہی انسان بھی! ہاں بہت سے انسان ایسے بھی ہیں کہ اُن پر عذاب کی بات ثابت ہوگئی، اور جس کسی کو اللہ ذلت میں ڈالدے تو پھر کوئی نہیں جو اُسے عزت دینے والا ہو۔ وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے!

(دیکھو) یہ دو مخالف (فریق) ہیں جو اپنے پروردگار کے بارے میں ایک دوسرے سے مخالف باتیں کہتے ہیں۔ ان میں سے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن کے لیے آگ کا پہناوا قطع کردیا گیا۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائیگا۔ اُس (کی گرمی کی شدت) سے جو کچھ اُن کے شکم میں ہے، جل کر گل اُٹھیگا۔ اُن کے جسم کے چمڑے کا بھی یہی حال ہوگا نیز اُن کی روک تھام کے لیے لوہے کے گرز ہونگے۔ جب کبھی (عذاب کے) دکھ سے بیقرار ہوکر نکلنا چاہینگے، تو اسی میں لوٹا دیے جائینگے کہ (اب نکلتے کیوں ہو؟) "عذابِ سوزاں کا مزہ چکھو!"

جو فریق ایمان لایا اور نیک عمل ہوا، تو یقیناً اللہ اُسے (نعیم ابدی کے) باغوں میں داخل کریگا، اُن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں۔ (اس لیے ان کی بہار کبھی ختم ہونے والی نہیں) انہیں وہاں (آگ کے پہناوے کی جگہ

الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ
فِيْهَا حَرِيْرٌ ○ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ښ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ۲۳،۲۴
يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَاۗءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ
وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ ۲۵ ع ۳
لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـــًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ۲۶
يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ

سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائینگے، اور لباس اُن کا ریشمی ہوگا۔ اُنہیں باتوں میں سے ایسی بات ۲۳ کی رہنمائی ملی جو نہایت پاکیزہ ہے۔ اُنہیں راہوں میں سے ایسی راہ پر چلایا گیا جس کی ستائش کی گئی! ۲۴

من رحمة الله۔ ان الله يغفر الذنوب جميعا۔ انه هو الغفور الرحيم! (۵۳:۳۹)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، اور جو اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، نیز مسجد حرام سے جسے ہم نے بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے (عبادت گاہ) ٹھہرا دیا ہے، خواہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے (تو) اُنہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اُنہیں) اور ہر اُس آدمی کو جو اُس میں ازراہ ظلم حق سے منحرف ہونا چاہیگا، عذاب دردناک کا مزہ چکھائینگے۔ ۲۵

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانۂ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر، اور میرا یہ گھر اُن لوگوں کے لیے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں، عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں، رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں! اور ۲۶ (حکم دیا تھا کہ) "لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے۔ لوگ تیرے پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں سے آیا کرینگے پا پیادہ، اور ہر طرح کی سواریوں پر، (جو مشقتِ سفر سے) تھکی ہوئی ہونگی۔ وہ اس لیے آئینگے کہ اپنے فائدہ پانے

(۷) اس کے بعد آیت (۱۷) میں فرمایا کہ دنیا دارالعمل ہے، اور ہر فرد اور گروہ کو اس کے ایمان و عمل کے مطابق نتیجہ ملتا ہے یہاں حقیقت کا فیصلہ نہیں ہوتا کیونکہ آنکھوں کے آگے پردے پڑے ہیں لیکن قیامت کے دن تمام پردے اُٹھ جائینگے، اور سب دیکھ لینگے کہ اللہ کا فیصلہ حق کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ اُن مذہبی گروہوں کا بھی ذکر کیا جو عرب اور عرب کے جوار میں موجود تھے: یہودی، صابی، مسیحی، مجوس، اور مشرک یعنے عرب کے بت پرست

آیت (۱۸) نے واضح کر دیا کہ قرآن کے نزدیک اتباعِ حق کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا کائناتِ ہستی میں جس قدر مخلوق ہے سب اللہ کے احکام و قوانین کے آگے جھکی ہوئی ہے۔ اجرامِ سماویہ سے لیکر درختوں اور پتھروں تک، کوئی چیز نہیں ہے جس کے لیے اُس نے احکام و قوانین ٹھہرا دیے ہوں، اور اُن کے مطابق ان کی ہستی کا کارخانہ نہ چل رہا ہو۔ پھر اگر یہاں درخت کے ایک پتہ اور پہاڑ کی ایک چٹان کے لیے بھی کسی کے ٹھہرائے ہوئے احکام ہیں، تو کیا انسان کے لیے نہیں ہونگے جو کرۂ ارضی کے تمام سلسلۂ خلقت کا ماحصل اور تمام کارخانۂ تخلیق و تکمیل کا آخرین مظہر ہے؟ اور اگر سب کی ہستی و بقا اس پر موقوف ہوئی کہ احکامِ حق کے آگے سربسجود رہیں، تو کیا انسان کی ہستی و سعادت کے لیے ایسا ہونا ضروری نہیں؟

اس آیت کے اسلوب بیان پر غور کرو انسان کو مخلوقاتِ ہستی کی عام صنعت سے الگ ٹھہرا نہیں کیا ہے، بلکہ ایک ہی سلسلہ میں

۲۷ عَمِيقٍ ۝ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ
۲۸ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا
۲۹ بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝ ذَٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۗ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ
۳۰ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ۖ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ۝ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ
۳۱ بِهِ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ۝ ذَٰلِكَ

کی جگہیں حاضر ہو جائیں، اور ہم نے جو پالتو چارپائے اُن کے لیے مہیا کر دیے ہیں، ان کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں۔ پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیر کو بھی کھلاؤ۔ پھر قربانی کے بعد وہ اپنے جسم و لباس کا میل کچیل دور کر دیں (یعنے احرام اتار دیں) نیز اپنی نذریں پوری کریں اور اس خانۂ قدیم (یعنے خانۂ کعبہ) کے گرد پھیرے پھر لیں"۔

تو دیکھو (حج کی) بات یوں ہوئی۔ اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے، تو اُس کے لیے اُس کے پروردگار کے حضور بڑی ہی بہتری ہے۔ اور (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) اُن جانوروں کو چھوڑ کر جن کا حکم قرآن میں سُنا دیا گیا ہے، تمام چارپائے تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں پس چاہیے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو نیز جھوٹ بولنے سے۔ صرف اللہ ہی کے لیے ہو کر رہو۔ اس کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہ کرو جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، تو اُس کا حال ایسا سمجھو جیسے بلندی سے اچانک نیچے گر پڑا۔ جو چیز اس طرح گر گئی اُسے یا تو کوئی اُچک لیگا یا ہوا کا جھونکا کسی دور دراز گوشہ میں لیجا کر پھینک دیگا!

(حقیقت حال) یہ ہے، پس (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی، تو اُس نے ایسی بات مانی جو

سب کا ذکر کیا ہے: والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب، وکثیر من الناس یعنے اس اعتبار سے سب ایک ہی صف میں ہیں۔ انسان کا گوشہ عام سلسلۂ قوانینِ فطرت سے کوئی الگ گوشہ نہیں ہے۔ جس طرح سورج، چاند، ستارے، نباتات، جمادات، احکامِ فطرت کے آگے سربسجود ہیں، اسی طرح صحیح الفطرت انسانوں کے بھی سر جھکے ہوئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہاں حقیقت کی راہِ عمل صرف یہی ہے!

یہ مقام مہمات معارفِ قرآنی میں سے ہے اور صرف اس ایک آیت کی تفسیر میں پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا: وکثیر حق علیہ العذاب۔ بہت سے انسان ایسے ہیں جو اس دائرۂ اطاعت سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان پر تعذیب کا قانون لازم آ جاتا ہے۔ ومن یھن اللہ فما لہ من مکرم۔ اور جس کسی پر اللہ کے قانون تذلیل کی مہر لگ گئی تو پھر کوئی نہیں جو اُسے سربلند کر سکے!

(۸) آیت (۱۹) میں فرمایا دین کے کتنے ہی جتھے بن گئے ہوں، مگر راہیں صرف دو ہی ہیں، اور دو ہی منزلوں پر ختم ہوتی ہیں۔ ایک منکروں کی ہے، ایک مومنوں کی ہے۔ پہلی انکار، مایوسی، اور بدعملی کی راہ ہے۔ دوسری ایمان، اُمید، اور نیک عملی کی۔ پہلی کو بالآخر عذاب کی منزل پر پہنچنا ہے۔ دوسری کو نعیم و سرورِ ابدی پر۔ انہی دو راہوں پر چلنے والوں کو ہذان خصمان اختصموا فی ربھم سے تعبیر کیا۔

(۹) اس کے بعد آیت (۲۵) سے سلسلۂ بیان کفارِ مکہ کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ یہ گویا اذنِ قتال کی تمہید ہے جو آیت (۳۹) میں آنے والا ہے۔ فرمایا یہ صرف کفر ہی پر قانع نہیں ہیں بلکہ ظلم و تشدد پر اتر آئے ہیں۔ مسجد حرام کو اپنی ملک سمجھتے ہیں، اور جسے چاہتے ہیں وہاں آنے

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۗ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ

٣٢ فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے۔

ان (چارپایوں) میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لیے (طرح طرح کے) فائدے ہیں۔ پھر (اس) خانۂ قدیم تک

٣٣ پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے۔

اور (دیکھو) ہر اُمت کے لیے ہم نے عبادت کا ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا کہ چارے دیے ہوئے پالتو چارپائے ذبح کرے تو اللہ کا نام یاد کر لے پس (یاد رکھو) تمہارا معبود وہی ایک معبودِ یگانہ ہے (اور جب اُس کے سوا کوئی نہیں تو چاہیے کہ) اُسی کے آگے فرماں برداری کا سر جھکا دو!

ع ۵

اور (اے پیغمبر!) عاجزی اور نیازمندی کرنے والے

٣٤ بندوں کو (کامرانی و سعادت کی) خوشخبری دیدو۔ اُن (نیازمندانِ حق) کو، جن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل لرز اٹھتے ہیں، جو ہر طرح کی مصیبتوں میں صبر کرنے والے ہیں، جو نماز کے پڑھنے اور درستگی میں کوشاں رہتے ہیں، جو اُس رزق میں سے کہ اللہ نے دے رکھی ہے

٣٥ (نیک کاموں کی راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں!

اور (دیکھو، قربانی کے یہ اونٹ (جنہیں دور دور سے حج کے موقعہ پر لایا جاتا ہے) تو ہم نے اُسے اُن چیزوں میں سے ٹھہرا دیا ہے جو تمہارے لیے اللہ کی (عبادت کی) نشانیوں میں سے ہیں۔ اس میں تمہارے لیے بہتری کی بات ہے۔

اور عبادت کرنے سے روک دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ انسان کے لیے معبد عام ہے۔ وہ صرف باشندگانِ مکہ ہی کے لیے نہیں بنایا گیا ہے۔ تمام انسانوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں کہ اس کا دروازہ عبادت گزاروں پر بند کرے۔

اس کے بعد آیت (۲۶) سے (۲۹) تک سے واضح کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اس عبادت گاہ کی بنیاد رکھی، تو کیا مقاصد ان کے پیش نظر تھے اور وحی الٰہی نے کس راہ کی تعیین کی تھی؟ اور پھر حج کا اعلان کیا گیا، تو اس کے بنیادی اعمال و مقاصد کیا کیا تھے؟ اور کس طرح وحی الٰہی نے اس کی رہنمائی کی تھی؟ خلاصہ ان کا یہ ہے کہ:

(ا) توحید کا اعتقاد۔

(ب) عبادت گزارانِ حق کے لیے معبد کی تطہیر

(ج) حج کا اجتماع، تاکہ اس کے گوناگوں منافع سے لوگ مستفید ہوں اور معین ایام میں ذکرِ الٰہی کا ولولہ تازہ ہوتا رہے۔

(د) جو لوگ اس موقع پر جمع ہوں جانوروں کی قربانیاں کریں اور محتاجوں کے لیے غذا کا اہتمام ہو۔

پس جب مرکزِ عبادت کا قیام اول دن سے ان مبادی و مقاصد کے لیے ہوا ہے، کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ قریشِ مکہ اس کے مالک بن بیٹھیں اور جنہیں چاہیں وہاں آنے دیں، جنہیں چاہیں روک دیں۔

(۱۰) بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت (۲۶) سے (۳۰) تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ سب اُن احکام کی حکایت ہے جو حضرت ابراہیم کو دیے گئے تھے۔ لیکن عام طور پر مفسروں نے آخری حصہ کو براہ راست خطابِ قرآن قرار دیا ہے۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ تمام تفصیلات اسی بات کی شرح ہیں کہ جعلناہ للناس، سواء العاکف فیہ والباد۔ یعنے یہ عبادت گاہ صرف باشندگانِ مکہ ہی کے لیے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○ ٣٦ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ ○ ٣٧ إِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ○ ٣٨ ع أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۗ وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ○ ٣٩

بلا امتیاز سب کے لیے خواہ مکہ کے رہنے والے ہوں۔ یا دوسری جگہوں کے۔ چنانچہ اسی لیے حج اور قربانی کا حکم دیا گیا۔ لوگ دور دور سے یہاں آنے لگے اور قربانی کے جانور لانے لگے۔ خصوصاً قربانی کے اونٹ جو صحراؤ جبال طے کر کے حرم مکہ میں پہنچائے جاتے، اور لوگ انہیں اس معبد کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تصور کرتے۔ اب اگر قریش مکہ کا یہ اختیار تسلیم کر لیا جائے کہ جسے چاہیں آنے دیں جسے چاہیں روک دیں، تو پھر نہ کعبہ کعبہ رہا، نہ حج حج۔

(۳۶) ضمناً یہ بات بھی واضح کر دی کہ قربانی کی حقیقت کیا ہے؟ آیۃ (۲۸) اور (۳۶) میں فرمایا تھا کہ اس کا گوشت خود بھی کھاؤ اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ یعنے مقصود اس سے جانوروں کا خون بہانا نہیں ہے جیسا کہ لوگ سمجھتے تھے۔ بلکہ یہ ہے کہ لوگوں کے لیے غذا کا سامان ہو۔ پھر آیت (۳۷) میں صاف صاف کہہ دیا کہ اصل عبادت تمہارے دلوں کا تقویٰ ہے۔ نہ کہ قربانی کا گوشت اور خون۔

بت پرست اقوام میں قربانی کی رسم اس طرح چلی تھی کہ انہوں نے خیال کیا، انسانوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی چڑھاؤں کی ضرورت ہے اور جانوروں کا خون بہانا ان کا غضب و قہر ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے، نہ تو خدا تک گوشت کا چڑھاوا پہنچ سکتا ہے، نہ وہ خون بہانے کا شائق ہے۔ اصل شے جو اس کے حضور مقبول ہو سکتی ہے، دل کی نیکی اور طہارت ہے!

پس چاہیے کہ انہیں قطار در قطار ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام یاد کرو۔ پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں (یعنے ذبح ہو جائیں) تو اُن کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ (احسان الٰہی کے) شکر گزار رہو! ۳۶

یاد رکھو، اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے نہ خون، اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے، وہ تو صرف تمہارا تقوا ہے (یعنے تمہارے دل کی نیکی ہے) ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ اللہ کی رہنمائی پر اس کے شکر گزار رہو، اور (اس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو، اور نیک کرداروں کے لیے (قبولیتِ حق کی) خوش خبری ہے! ۳۷

جو لوگ ایمان لائے ہیں، یقیناً اللہ (ظالموں کے ظلم و تشدد سے) اُن کی مدافعت کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ امانت میں خیانت کرنے والوں کو کہ کفرانِ نعمت کر رہے ہیں، کبھی پسند نہیں کر سکتا! ۳۸

جن (مومنوں) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے، اب انہیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی رخصت دی جاتی ہے کیونکہ اُن پر سراسر ظلم ہو رہا ہے، اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے! ۳۹

لہ صواف، صف سے ہے۔ چونکہ اونٹ کو کھڑے کھڑے ذبح کرتے ہیں، اس لیے اس لفظ سے تعبیر کرنے لگے نیز صفت قوائم کھوڑے کے لیے بھی بولتے ہیں صفن الفرس فهو صافن اذا قام علی ثلاث قوائم وثنی الرابعۃ۔

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ (۴۰) الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۴۱) وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودُ ۝ وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ۝ وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ ۖ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ فَأَمْلَيْتُ (۴۲-۴۳)

یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دیے گئے۔ اُن کا کوئی جرم نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے "ہمارا پروردگار اللہ ہے"! اور دیکھو، اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کرنے کے لیے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں، جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ (یاد رکھو) جو کوئی اللہ (کی سچائی) کی حمایت کریگا، ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں، وہ یقیناً قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے! (۴۰)

یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا (یعنے اُن کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز (کا نظم) قائم کرینگے، زکوٰۃ کی ادائگی میں سرگرم ہونگے، نیکیوں کا حکم دینگے، بُرائیاں روکینگے، اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے! (۴۱)

اور (اے پیغمبر!) اگر یہ (منکر) تجھے جھٹلائیں، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے کتنی ہی قومیں اپنے اپنے وقتوں کے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں: قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، اصحاب مدین، اور موسیٰ بھی جھٹلایا گیا (اگرچہ خود اُس کی قوم نے نہیں جھٹلایا) اور ہم نے (ہمیشہ ایسا ہی کیا کہ) پہلے منکروں کو (کچھ عرصہ (۴۲، ۴۳)

(۱۳) آیت (۳۸) اور (۳۹) میں مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی دفاع میں اب ہتھیار اُٹھا سکتے ہیں۔ بالاتفاق یہ پہلی آیت ہے جو اذن قتال کے بارے میں نازل ہوئی۔

اس سے پہلے قریش مکہ کا یہ ظلم بیان کر دیا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں پر حج کی راہ بند کر دی ہے جس کا انہیں کوئی حق نہیں۔ اب یہاں صاف صاف لفظوں میں واضح کر دیا کہ جواز قتال کی علت کیا ہے؟! فرمایا: بانهم ظلموا۔ اس لیے کہ مسلمان مظلوم ہیں، اور مظلوم کا حق ہے کہ ظالم کے مقابلہ میں اپنا بچاؤ کرے۔

یہ مظلوم تیرہ برس تک قریش مکہ کے ظلم و تشدد کا نشانہ رہے بالآخر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ لیکن غربت میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا گیا اور خلاف جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ آخر اُن کا قصور کیا تھا؟ صرف یہ کہ یقولوا ربنا الله، وہ کہتے تھے، ہم اپنے یقین کے مطابق اپنے پروردگار کو یاد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دوسروں کو مجبور نہیں کرتے کہ ہمارا اعتقاد تسلیم کر لیں لیکن دوسرے ہمیں کیوں مجبور کرتے ہیں کہ اپنے اعتقاد سے دست بردار ہو جائیں؟

اس کے بعد واضح کیا کہ یہ مظلوموں کا قدرتی حق ہے۔ اگر وہ اس حق سے محروم کر دیے جائیں تو دنیا میں انسانی ظلم و استبداد کی مدافعت کا کوئی سامان باقی نہ رہے جس گروہ کی بن پڑے دوسرے گروہ کے اعتقاد و عمل کی آزادی ہمیشہ کے لیے پامال کر دے۔ چنانچہ فرمایا یہاں اللہ نے ایک جماعت کے ہاتھوں دوسری جماعت کے ظلم و تشدد کو دفع کرانے کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ اگر یہ سلسلۂ مدافعت بعض بعض نہ ہوتا، تو دنیا میں خدا پرستی کا خاتمہ ہو جاتا۔ کسی گروہ کی عبادت گاہ انسانی ظلم و استبداد کے ہاتھوں محفوظ نہ رہتی۔

لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ
خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ
قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ
فِي الصُّدُوْرِ ۝ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۚ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ
سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ قُلْ يٰۤاَيُّهَا

کے لیے) ڈھیل دی، پھر (مواخذہ میں) پکڑ لیا، تو دیکھو میری ناپسندیدگی ان کے لیے کیسی سخت ہوئی؟

پھر دیکھو، کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ظلم کرنے والی تھیں۔ وہ ایسی اجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر کے رہ گئیں۔ کنویں ناکارہ ہو گئے۔ سربفلک محل کھنڈر بن گئے۔ کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے؟ ان کے پاس دل ہوتے اور سمجھتے بوجھتے، کان ہوتے اور سنتے اور پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے، تو آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں (جو سروں میں ہیں) دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں!

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تجھ سے عذاب کے مطالبہ میں جلدی مچا رہے ہیں (یعنے کہتے ہیں، اگر سچ مچ کو عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آچکتا!) اور اللہ کبھی ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے۔ مگر تیرے پروردگار کے یہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے، جیسے تم لوگوں کی گنتی میں ایک ہزار برس۔

(۴۳) آیت (۴۱) نے واضح کر دیا کہ قرآن کے نزدیک مسلمانوں کے اقتدار و حکومت کا اصلی مقصد کیا تھا؟ فرمایا۔ ان مظلوم مسلمانوں کے اگر قدم جم گئے، تو یہ کیا کریں گے؟ یعنے تمکن فی الارض کو کن مقاصد کے لیے کام میں لائیں گے؟ اس لیے کہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکی کا حکم دیں، برائیوں سے روکیں، اور ظلم و بدعملی کی جگہ عدالت و نیکی کی حکومت قائم ہو جائے!

(۴۴) اس کے بعد فرمایا۔ یہ انقلاب اسی سلسلۂ انقلاب کی ایک کڑی ہے، جو دنیا میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے، پس اگر منکرین حق سچائی کو جھٹلا رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پہلے بھی ہمیشہ ظلم و غرور کے متوالوں نے حق و صداقت کی آوازیں جھٹلائی ہیں۔ اگر ان کے دل اندھے نہ ہو گئے ہوتے تو پچھلوں کی سرگزشتوں سے عبرت پکڑتے۔ مگر انسان کے ظلم و غرور کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ دوسروں کی حالت سے کبھی عبرت نہیں پکڑتا۔ یہاں تک کہ خود اس پر بھی وہ سب کچھ گزر جائے جو دوسروں پر گزر چکا ہے!

اس بات پر بھی غور کرو کہ یہاں اسلامی اعمال میں سے اور کسی عمل کا ذکر نہیں کیا۔ صرف قیام صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کا ذکر کیا۔ اس سے معلوم ہوا، قرآن کے نزدیک مسلمانوں کے جماعتی اقتدار کی اصلی علامت یہی دو عمل ہیں۔ جس گروہ کا اقتدار ان دو عملوں کے قیام سے خالی ہو، اس کا اقتدار اسلامی اقتدار نہیں سمجھا جا سکتا۔

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے (ابتدا میں) ڈھیل دی اور وہ ظالم تھیں۔ پھر ہم نے مواخذہ میں پکڑ لیا، اور بالآخر سب کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے!

(اے پیغمبر!) کہہ دے اے لوگو! میں اس کے سوا

(۴۵) آیت (۴۶) نے انسان کے ذہنی تعطل اور قلبی غفلت کی کیسی کامل تصویر کھینچ دی ہے! فرمایا۔ اگر فہم و بصیرت کی ساری دلیلیں ان کے لیے بے سود ہیں تو کیا آنکھوں کا مشاہدہ بھی کچھ کام نہیں دیتا! کیا انہوں نے زمین میں سیر و گردش نہیں کی؟ حوادث و انقلاباتِ عالم کے نتائج نہیں دیکھے؟ کیا ان کے کان بہرے ہو گئے کہ شن

النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ ٤٩-٥٠
وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ ٥١
رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ
اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ ٥٢
الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ ٥٣

نہیں سکتے، اور عقلیں ماری گئیں کہ سمجھ کام نہیں دیتی۔ پھر خود ہی ان سارے سوالوں کا جواب دیدیا کہ فانہا لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور! اصل یہ ہے کہ جب کسی پر اندھے پن کا وقت آتا ہے تو آنکھوں کی بصارت نہیں جاتی۔ دل کی بصیرت جاتی رہتی ہے اور اسی کی بصیرت سے ساری بصارت ہے!

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ! تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

کچھ نہیں ہوں کہ (انکار و شرارت کے نتائج سے) تمہیں علانیہ خبردار کر دینا چاہتا ہوں!" ٤٩

پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔ ٥٠ جن لوگوں نے اللہ کی نشانیوں کے خلاف لڑکر کامیاب ہونا چاہا وہ دوزخی ہیں (ان کے لیے ہر طرح کی کامیابیوں اور سعادتوں سے محرومی ہے!) ٥١

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول اور جتنے نبی بھیجے، سب کے ساتھ یہ معاملہ ضرور پیش آیا کہ جونہی اُنہوں نے (اصلاح و سعادت کی) آرزو کی، شیطان نے ان کی آرزو میں کوئی نہ کوئی فتنہ کی بات ڈال دی، اور پھر اللہ نے اس کی وسوسہ اندازیوں کا اثر مٹا یا اور (اپنی نشانیوں کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ وہ (سب کچھ) جاننے والا، (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے! ٥٢

اس میں (ایک بڑی) مصلحت یہ رہی کہ شیطان کی وسوسہ اندازی اُن لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ ہو جائے جن کے دل روگی ہیں اور (سچائی کی طرف سے) سخت پڑ گئے ہیں، اور بلاشبہ یہ ظلم کرنے والے بڑی ہی گہری مخالفت میں پڑے ہیں۔ ٥٣

نیز (اس میں) یہ مصلحت بھی تھی کہ (اے پیغمبر!) جن لوگوں نے علم پایا ہے، وہ جان لیں کہ یہ معاملہ فی الحقیقت

(١٦) آیت (٤٧) میں قوانین کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مفسروں نے اس کی ساری اہمیت ضائع کر دی۔ فرمایا۔ یہ عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔ یعنے ازراہ شرارت کہتے ہیں۔ اگر سچ مچ کو بدعملیوں کا مجرا نتیجہ پیش آنے والا ہے تو کیوں نہیں آچکتا؟ لیکن یہ نہیں جانتے کہ فطرتِ کائنات کی اوقات شماری کا وہ حساب نہیں جو دنیا میں لوگوں نے بنا رکھا ہے۔ اس کی گھڑی کا کانٹا بہت دیر میں چلتا ہے۔ تمہاری تقویم میں ہزار برس گزر جائیں تو اُس کی تقویم کا بمشکل ایک دن گزرے۔ پس ظہور نتائج کا فیصلہ اپنی صبح شام دیکھ کر نہ کر لیا کرو۔ ٹھہرو اور انتظار کرو۔ ایک دوسرے موقعہ پر ہزار برس کی جگہ پچاس ہزار برس کی بھی مدت فرمائی ہے۔ یہ مقام مہمات معارف میں سے ہے۔ تشریح کے لیے تفسیر سورۂ فاتحہ دیکھو۔

۵۴ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○
۵۵ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ○
۵۶ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِىْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
۵۷ وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ ع وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا
۵۸ اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا
يَّرْضَوْنَهٗ ؕ

(۱۷) آیت (۴۹) پچھلے ارشادات کا خلاصہ ہے۔ فرمایا اعلان کردو۔ میرا ظہور تمہارے لیے ایک آشکارا انذار ہے، اور اب راہیں صرف دو ہی ہیں اور نتیجے بھی دو ہی پیش آنے والے ہیں۔ ایمان و عمل والوں کے لیے آخرت میں مغفرت اور دنیا میں رزق کریم کی بشارت ہے، اور سچائی کی نشانیوں سے لڑنے والوں کے لیے نامرادی و عذاب کی وعید۔ اب جو راہ چاہو اختیار کرلو۔

(۱۸) پھر آیت (۵۲) میں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ راہ کی ٹھوکروں سے غافل نہ ہو جائیں۔ نتائج کا ظہور یقینی ہے، لیکن ساتھ ہی کشمکش بھی ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس بارے میں سنۃ الٰہی کی نمود ہمیشہ ایسی ہی رہی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ حق و باطل کی کشمکش کے بغیر حق کی فتح مندی آشکارا ہو جائے۔

چنانچہ فرمایا۔ کوئی رسول اور نبی دنیا میں ایسا نہیں آیا کہ اس کی طلبگاریوں کی راہ میں یعنے اصلاح و ہدایت کی راہ میں شیطان کی فتنہ پردازیوں نے رخنہ ڈالنا نہ چاہا ہو، اور مفسدانہ قوتیں پوری طرح آمادۂ پیکار نہ ہوگئی ہوں پس اس معاملہ کی سچائی کا معیار یہ نہیں ہے کہ شیطانی وسوسہ اندازی خلل انداز ہوتی ہے یا نہیں؟ بلکہ یہ ہے کہ بالآخر کامیاب ہوتی ہے یا نہیں اور وحی و نبوت کی ربانی قوتیں اس کے اثرات ملیا میٹ کر دیتی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ شیطانی قوتیں کسی حال میں بھی نابود نہیں ہوجا سکتیں۔ جب تک انسان موجود ہے، شیطان اور اُس کی وسوسہ اندازیاں بھی موجود ہیں لیکن وحی و نبوت کے اعمال کی خصوصیت یہ ہے کہ شیطانی قوتیں کتنی ہی ابھریں، فتح مند نہیں ہوسکتیں۔ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان، ثم یحکم اللہ آیاتہ۔ وہ جتنے فتنے بھی اُٹھاتی ہیں، اللہ اُن کے اثرات محو کردیتا ہے، اور پھر اپنی نشانیوں کو اور زیادہ مضبوط کردیتا ہے یعنی شیطانی فتنہ مٹتا چلا جاتا ہے، اللہ کی نشانیوں کا نقش اور

تیرے پروردگار ہی کی طرف سے ہے، اس طرح اس پر ایمان لے آئیں، اور ان کے دلوں میں عجز و نیاز پیدا ہو جائے۔ یقیناً اللہ ایمان والوں کو (سعادت و کامرانی کی) سیدھی راہ چلانے والا ہے!

(یاد رکھو) جو لوگ منکر ہیں، وہ اس بارے میں برابر شک ہی کرتے رہینگے۔ یہاں تک کہ (فیصلہ کُن) گھڑی اچانک اُن کے سروں پر آجائے۔ یا کسی منحوس دن کا عذاب آنمودار ہو!

اُس دن پادشاہی صرف اللہ ہی کی ہوگی۔ وہاں سب کے درمیان فیصلہ کریگا۔ پھر اُن لوگوں کے لیے نعیم و سرور کے باغ ہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ اور اُن لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے جنہوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیاں جھٹلائیں!

اور (دیکھو) جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، پھر لڑائی میں قتل ہوئے یا اپنی موت مرگئے، تو (دونوں صورتوں میں) ضروری ہے کہ اللہ انہیں (آخرت میں) بہتر سے بہتر روزی دے، اور یقیناً اللہ ہی ہے جو سب سے بہتر روزی بخشنے والا ہے!

وہ ضرور انہیں ایسی جگہ پہنچائیگا جس سے وہ خوشنود

وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ ۵۹ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ ۶۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ ۶۱ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝ ۶۲ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۡ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ ۶۳ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ

ہونگے یقیناً وہ (سب کچھ) جاننے والا، اور (اپنے کاموں میں) بڑا بردبار ہے! ۵۹

(بہرحال) حقیقت حال یہ ہے کہ جس کسی نے خود زیادتی نہیں کی، بلکہ جتنی سختی اُس کے ساتھ کی گئی تھی، ٹھیک اتنی ہی بدلے میں کرنی چاہیے، اور پھر دشمن مزید زیادتی پر اُتر آیا، تو ضروری ہے کہ اللہ مظلوم کی مدد کرے۔ اللہ یقیناً معاف کردینے والا بخشدینے والا ہے! ۶۰

اور یہ (صورتِ حال) اس لیے ہوئی کہ اللہ رات کو دن کے اندر نمایاں کرتا ہے، اور دن کو رات کے اندر (یعنے یہاں ہر گوشہ میں حالات کی متضاد تبدیلی کا قانون جاری ہے) نیز اس لیے کہ اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے! ۶۱

نیز اس لیے بھی، کہ حق اللہ ہی کی ہستی ہے، اور جن ہستیوں کو اُس کے سوا پکارتے ہیں، باطل ہیں، اور پھر اس لیے بھی کہ اللہ ہی کی ہستی بلند مرتبہ ہے، بڑائی والی! ۶۲

کیا تم نے (یہ منظر) نہیں دیکھا کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور (سوکھی) زمین سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے؟ یقین کرو، اللہ بڑا ہی لطف کرنے والا، ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے! ۶۳

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔

یادہ جھکتا اور گمراہ ہوتا جاتا ہے۔

پھر آیت (۵۳) اور (۵۴) میں واضح کردیا کہ اس صورتِ حال میں لوگوں کے لیے آزمائش ہوتی ہے جن کے دل روگی ہیں، وہ اور زیادہ ضد اور عناد میں بڑھ جاتے ہیں۔ جو اصحاب علم و بصیرت ہیں، اُن کا ایمان اور زیادہ پختہ ہوجاتا ہے!

(۱۹) آیت (۶۰) سے (۶۲) تک تین آیتوں میں تین "ذٰلک" آئے ہیں۔ ان کا مطلب سمجھ لینا چاہیے۔

ذٰلک ومن عاقب بمثل ما عوقب بہ۔ یعنے اب صورتِ حال یہ ہے جو اوپر بیان کردی گئی ہے۔ اور ایسی حالت میں ضروری ہے کہ مظلوموں کو دفع ظلم و تشدد کا موقعہ دیا جائے۔ پس جو مظلوم مدتوں تک ستائے جانے کے بعد دفع کے لیے آمادہ ہونگے، اور جس طرح اُن پر تلوار اُٹھائی گئی ہے، ٹھیک اُسی طرح خود بھی تلوار اُٹھائیں گے اور پھر اُس کی وجہ سے ظالم از سرِ نو ظلم و تعدی پر آمادہ ہوجائیں گے، تو وہ یقین رکھیں۔ اللہ ضرور اُن کی مدد کریگا، کیونکہ وہ ظالم نہیں ہیں، ظلم کا دفاع کرنے والے ہیں۔ آخر میں کہا: ان اللّٰہ لعفو غفور۔ اللہ کی بخشش پر بھروسہ رکھیں۔ یعنے وہ جو قدم اُٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں، وہ کتنی ہی مجبوری کی حالت میں اُٹھایا ہو، مگر پھر قتل و خونریزی کا قدم ہے، لیکن چونکہ بڑی بُرائی کو دور کرنے کے لیے چھوٹی بُرائی اختیار کرلینی پڑتی ہے، اس لیے وہ یقین رکھیں۔ اللہ درگزر کرنے والا بخشدینے والا ہے۔

ذٰلک بان اللّٰہ یولج الیل فی النہار۔ اور اللہ کی مدد کیوں اُن کا ساتھ دیگی؟ اس لیے کہ قانونِ الٰہی یہی ہے کہ یہاں حالت بدلتی رہے۔ وہ دن کے اندر سے رات کو اُبھارتا، اور رات کے اندر سے دن کو نمایاں کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی حالت سدا قائم

ع ۹

۶۴ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ

۶۵ بِاَمْرِهٖ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

۶۶ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا

۶۷ هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاِنْ

۶۸ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ

وہی ہے جو بے نیاز ہے، ہر طرح کی ستائشوں کا سزاوار! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کس طرح اللہ نے زمین کی تمام چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں؟ جہاز کو دیکھو، کس طرح وہ اس کے حکم سے سمندر میں تیرا چلا جاتا ہے؟ پھر کس طرح اس نے آسمان کو (یعنے فضاء سماوی کے اجرام کو) تھامے رکھا کہ زمین پر گریں نہیں، اور گریں تو اس کے حکم سے؟ بلاشبہ اللہ انسان کے لیے بڑی ہی شفقت رکھنے والا، بڑی ہی رحمت والا ہے!

۶۴ پس ضروری ہے کہ تمہاری حالت میں بھی اب انقلاب ہو۔ وان اللہ لسمیع بصیر۔ نیز اس لیے کہ وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ یعنے یہاں اندھے بہرے قوانین کی حکومت کام نہیں کر رہی ہے جو نہ تو ظالموں کا ظلم دیکھتی ہو۔ نہ مظلوموں کی فریاد سنتی ہو۔ بلکہ ایک سمیع و بصیر عدالت کی کار فرمائی ہے۔ پس ضروری ہے کہ دیکھا جائے اور سنا جائے!

ذلک، بان اللہ ہو الحق۔ کیوں دیکھا جائے؟ کیوں سنا جائے؟ کیوں دیکھنے اور سننے کا نتیجہ ہی نکلے؟ اس لیے کہ حق اللہ ہی کی ہستی ہے، اور یہ منکرین رسالت جنہیں پکار رہے ہیں، وہ بطلان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پس ضروری ہے کہ حقیقت دیکھے اور سنے، اور بطلان اپنے بطلان کا ثبوت دیدے۔ وان اللہ ہو العلی الکبیر۔ نیز اس لیے کہ رفعت و کبریائی اللہ ہی کے لیے ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کے کلمۂ حق کی رفعت اور بڑائی آشکارا ہو کر رہے۔ ۶۵

اور (دیکھو) وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی۔ ۶۶ پھر وہ موت طاری کرتا ہے۔ پھر (دوبارہ) زندہ کریگا۔ در اصل انسان بڑا ہی ناشکرا ہے!

(اے پیغمبر!) ہم نے ہر اُمت کے لیے (عبادت کا) ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چل رہی ہے، پس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنے اسلام کے طور طریقہ میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستے پر گامزن ہے!

اگر (اس پر بھی) لوگ تجھ سے جھگڑا کریں، تو کہدے "اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ تم جن باتوں

(۲۰) آیت (۶۳) میں اس انقلابِ حال کی مثال دیدی گیا۔ تم نے یہ منظر نہیں دیکھا ہے کہ سوکھی زمین پر پانی برستا ہے، اور پھر وہ اچانک سر سبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے؟ ایسا ہی حال اس معاملہ کا بھی سمجھو۔ انسانی سعادت کی زمین پر بھی خشک سالی کا عالم چھا جاتا ہے۔ پھر جب سر سبزی کا موسم آتا ہے تو بارش کا ایک چھینٹا انقلابِ حال پیدا کر دیتا ہے۔ وہ موسم اب آچکا، اور انقلاب کچھ دور نہیں۔

(۲۱) آیت (۶۷) میں اس اصل عظیم کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اصل دین ایک ہے۔ البتہ "مناسک" میں یعنے عبادت کے ۶۷ طور طریقہ میں اختلاف ہوا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی۔ جس کی جیسی حالت تھی، اس کے مطابق ایک طور طریقہ ہی دیدیا گیا۔ پس طالبِ حق کو چاہیے کہ سب سے پہلے اصل کو دیکھے۔ ۶۸

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ○ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ۶۹
ذٰلِكَ فِىْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ ۷۰
سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ○ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ۷۱
تَعْرِفُ فِىْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ
اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ۷۲ ع ۹/۱۶
ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ

تیکر فرع کے پیچھے پڑجائے۔ فرمایا فلا ینازعنك فی الامر
اس بارے میں تم سے تزاع کرنے کا لوگوں کو حق نہیں جس بات
پر اُنہیں غور کرنا چاہیے وہ تو یہ ہے کہ اصل دعوت کیا ہے! و
ادع الی ربك ۔ انك لعلی هدی مستقیم۔ اصل دین
دعوت الی اللہ ہے، اور یہی ہے جو ہدایت کی سیدھی راہ ہے!
اس کے بعد فرمایا۔ اگر لوگ اس پر بھی نہ مانیں اور جھگڑا کریں
تو پھر اللہ پر معاملہ چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ قیامت کے دن ان تمام
نزاعات کا آخری فیصلہ کر دیگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر دین کے
بارے میں لوگ جدل و نزاع سے باز نہ آئیں، تو پھر "اللہ اعلم بما
تعملون" کہہ کر جھگڑا ختم کر دینا چاہیے۔ اس سے زیادہ کسی کے پیچھے
پڑنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ اور اگر اللہ کے رسول کے لیے بھی یہی
راہ اختیار کرنی تھی، تو اور کسی کو اس سے آگے بڑھنے کا کب حق
مل سکتا ہے۔

اگر پیروان مذاہب صرف اتنی بات سمجھ لیں کہ ان جادلوك
فقل اللہ اعلم بما تعملون، تو مذہبی نزاع و منافرت کے سارے
جھگڑے ختم ہو جائیں۔

میں باہم گرا ختلاف کر رہے ہو، قیامت کے دن وہ
تمہارے درمیان فیصلہ کرکے حقیقتِ حال آشکارا کر دیگا" ۶۹
"(اے پیغمبر!) کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ پر سب کچھ روشن
ہے۔ جو کچھ آسمان میں ہے۔ جو کچھ زمین میں ہے! یہ ساری
باتیں نوشتہ میں ضبط ہیں۔ اور ایسا کرنا اللہ کے لیے کوئی
مشکل کام نہیں!" ۷۰

اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کی بندگی کرتے
ہیں جن کے لیے نہ تو اُس نے کوئی سند اُتاری، اور نہ
اُن کے پاس علم کی کوئی روشنی ہے۔ اور بے انصافوں
کو مدد کا کوئی سہارا نہیں مل سکتا! ۷۱

اور جب انہیں ہماری روشن آیتیں پڑھ کر سنائی
جاتی ہیں تو جن لوگوں کے دلوں میں کفر ہے، اُن کے
چہروں پر ناپسندیدگی اُبھرتی ہوئی دیکھ کر تم پہچان لیتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارے ناپسندیدگی کے یہ پڑھنے
والوں پر حملہ کر بیٹھیں گے۔ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے "کیا میں تمہیں اس سے بھی ایک بدتر صورتِ حال کی خبر دوں؟
آگ کے شعلے! جس کا اللہ نے منکروں کے لیے وعدہ کر لیا، اور جس کا ٹھکانا یہ ہوا تو کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے!" ۷۲

اے لوگو! ایک مثال سنائی جاتی ہے۔ غور سے سنو! اللہ کے سوا جن (خود ساختہ) معبودوں کو تم پکارتے
ہو، اُنہوں نے ایک مکھی تک پیدا نہیں کی۔ اگر تمہارے یہ سارے معبود اکٹھے ہو کر زور لگائیں، جب بھی پیدا
نہ کر سکیں۔ اور (پھر اتنا ہی نہیں، بلکہ) اگر ایک مکھی اُن سے کچھ چھین لے جائے، تو ان میں قدرت نہیں کہ
اُس سے چھڑا لیں۔ تو دیکھو طلبگار بھی یہاں درماندہ ہوا اور مطلوب بھی درماندہ (یعنے پرستار بھی عاجز ہیں اور

وَلَنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

۷۳ اُن کے معبود بھی عاجز)

۷۴ اللہ کے مقام کی جو عزت کرنی تھی، یہ نہ کر سکے۔ وہ تو سرتاسر قوت ہے، سب پر غالب!

اللہ نے فرشتوں میں سے بعض کو پیام رسانی کے لیے برگزیدہ کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی (لیکن اس برگزیدگی سے انہیں معبود ہونے کا درجہ نہیں مل گیا، جیسا ان گمراہوں نے سمجھ رکھا ہے) بلاشبہ

۷۵ اللہ ہی ہے سُننے والا، دیکھنے والا!

وہ جانتا ہے جو کچھ انہیں پیش آنے والا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے گزر چکا۔ اور ساری باتوں کا آخری

۷۶ سررشتہ اسی کے ہاتھ ہے!

مسلمانو! رکوع میں جھکو، سجدے میں گرو، اپنے پروردگار کی بندگی کرو، جو کچھ کرو، نیکی کی بات کرو، عجب

۷۷ نہیں کہ اس طرح بامراد ہو!

اور اللہ کی راہ میں جان لڑا دو۔ اُس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے، پوری طرح ادا کرو۔ اُس نے تمہیں برگزیدگی کے لیے چن لیا۔ تمہارے لیے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔ وہی طریقہ تمہارا ہوا جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اُس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا، پچھلے وقتوں میں بھی اور اس (قرآن) میں بھی۔ اور یہ اس لیے کیا، تاکہ رسول تمہارے لیے (حق کا) گواہ ہو (یعنے معلم ہو) اور تم تمام انسانوں کے لیے۔ پس نماز کا نظام

(۳۲) آیت (۷۷) سے آخر تک سورت کے مواعظ کا خاتمہ فرمایا:

(ا) اللہ کی بندگی و نیاز میں سرگرم رہو۔ تمہارے سارے کام خیر و صلاح پر مبنی ہوں۔ اگر حسن عمل کی یہ روش تم میں بس گئی، تو پھر تمہارے لیے فلاح ہی فلاح ہے!

(ب) جہد فی اللہ تمہاری زندگی کا شعار ہو۔ "جہد" کے معنی کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ زیادہ سے زیادہ کوشش جو ایک انسان کسی مقصد کے لیے کر سکتا ہے، وہ تمہیں اللہ کے لیے کرنی چاہیے۔ کیونکہ تمہارے مساعی کا نصب العین اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ کوشش نیت سے بھی ہے، زبان سے بھی، مال سے بھی، ہاتھ پاؤں سے بھی۔

(ج) اُس نے تمہیں برگزیدگی کے لیے چن لیا۔

(د) اُس نے تمہیں دین کی بہتر سے بہتر راہ دکھا دی۔ اس بہتری کا معیار کیا ہے؟ یہ کہ کسی طرح کی بھی تنگی اور رکاوٹ اس میں نہیں ہے۔ سب سے زیادہ سہل، سب سے زیادہ سبک، سب سے زیادہ واضح، سب سے زیادہ فکر و عمل کی وسعت رکھنے والی حنیفیۃ

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۧ

قائم کرو، زکوٰۃ کی ادائیگی کا سامان کرو۔ اللہ کا سہارا مضبوط پکڑ لو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہوا، تو کیا ہی اچھا کارساز ہے اور کیا ہی اچھا مددگار!

السمحۃ۔ لیطا آکنہارھا!

انسان پر فکر و عمل کے ارتقاء کی راہ جس بات نے روک رکھی ہے وہ یہی دین کی تنگی اور رُکاوٹ ہے۔ اس تنگی نے اس طرح انہیں جکڑ بند کر رکھا ہے کہ ایک قدم بھی وسعت و بلندی کی طرف نہیں اُٹھا سکتے۔ اللہ نے اس جکڑ بندی سے تمہیں نجات دیدی۔ اور یہ اُس کا سب سے بڑا احسان ہے جو کسی انسانی گروہ پر ہو سکتا ہے۔

(ہ) یہ تنگیاں جس قدر ہیں، بعد کو پیدا کرلی گئیں۔ اصلِ دین میں نہ تھیں جو تمہارے بزرگ ابراہیم کا دین تھا۔ اُسی دینِ خالص کی راہ تم پر کھول دی گئی۔

(و) اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا۔ کیونکہ دینِ خالص اول دن سے "اسلام" ہی ہے۔ یعنے قوانینِ حق کی اطاعت۔ یہی نام پہلے تھا۔ یہی اب ہوا۔

(ز) تمہیں اس لیے چنا گیا، کہ اللہ کا رسول تمہارے لیے شاہد ہو۔ تم تمام انسانوں کے لیے۔ تم اپنا چراغ اس سے روشن کرو گے، تمہارے چراغ سے تمام دنیا کے چراغ روشن ہو جائینگے:

یک چراغ ست دریں خانہ، کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند!

(۳) یہ فرض کیونکر انجام پا سکتا ہے؟ اس طرح کہ نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ کا نظام استوار کرو۔ اللہ کا سہارا مضبوط پکڑ لو۔ ھو مولٰکم، فنعم المولیٰ ونعم النصیر!

یہاں سے دو باتیں قطعی طور پر معلوم ہو گئیں۔ ایک یہ کہ دین کی سچائی کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ اس میں تنگی و رکاوٹ نہ ہو۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کے لیے دینی نام صرف "مسلمان" ہی ہے۔ اس کے سوا جو نام بھی اختیار کیا جائیگا، وہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے نام کی نفی ہوگا۔ پس مسلمانوں کے مختلف فرقوں، مذہبوں، اور طریقوں نے جو طرح طرح کے خود ساختہ نام گڑھ لیے ہیں، اور اب اُنہی سے اپنے کو پہچنوانا چاہتے ہیں، وہ صریح "سماکم المسلمین" سے انحراف ہے۔

بعث بعد الموت اور قرآن کا

سورت کی ضروری تشریحات ختم ہو گئیں، لیکن بعض مقامات کی اہمیت مزید تفصیل کی طالب ہے۔ خصوصاً سورت کا ابتدائی حصہ جس میں بعث بعد الموت کا اثبات ہے۔ اس میں پہلے دلائل بیان کیے ہیں۔ پھر اُن سے نتائج نکالے ہیں۔ یہ نتائج حسب ذیل ہیں۔ آیت (۶) پر غور کرو:

(ا) ذٰلک بان اللہ ھو الحق۔ اللہ کی ہستی ایک حقیقت ہے۔

(ب) وانہ یحیی الموتیٰ۔ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔

(ج) وانہ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔ اُس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

(د) وان الساعۃ اٰتیۃ لاریب فیہا۔ ایک مقررہ گھڑی آنے والی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔

(ہ) وان اللہ یبعث من فی القبور۔ جو مر گئے ہیں، اللہ انہیں اُٹھا کھڑا کریگا۔

یہ پانچ باتیں ہیں جن پر اس مقام کی موعظت نے روشنی ڈالی ہے۔ یہ شک کو دور کرتی اور اذعان و یقین کی طمانیت پیدا کر دیتی ہے۔ جو موعظت ایسی ہو، اُسے قرآن اپنی اصطلاح میں دلیل، برہان، اور حجت سے تعبیر کرتا ہے۔ نہ کہ دلیل مصطلح منطق و نحو جدلیہ۔ اب غور کرو۔ ان پانچوں باتوں کے لیے یہاں دلیل کی روشنی کس طرح نمایاں ہوئی ہے؟ فرمایا: ان کنتم فی ریب من البعث۔ اگر تم شک میں پڑے ہو کہ مرنے کے بعد پھر دوبارہ اُٹھنا کیسے ہو سکتا ہے، تو اس بات پر غور کرو جو بیان کی جاتی ہے۔ تمہارا

سارا شک اور استغراب دور ہو جائیگا۔

تخلیق حیات اور اعادۂ حیات

فانا خلقنٰکم من تراب. یعنی یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انسان مرکر پھر اُٹھ کھڑا ہو یعنی زندگی کا دوسرا اُٹھان تمہیں عجیب معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر یہ بات عجیب ہے، تو کیا اس سے زیادہ یہ بات عجیب نہیں کہ زندگی کا پہلا اُٹھان ظہور میں آگیا؟ تم اپنی ہستی میں تو شک نہیں کرسکتے؟ اچھا، یہ ہستی کس طرح ظہور میں آئی؟ دوسری مرتبہ اگر انسانی ہستی اُٹھیگی، تو یہ زندگی کی ابتدا نہیں ہوگی۔ زندگی کا اعادہ ہوگا۔ لیکن اس کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ من تراب! مٹی سے یعنی من صلصال من حمأ مسنون (١٥: ٢٨) مٹی ... میں مرتوں تک خمیر اُٹھتا رہا، اور پھر سوکھ کر کھنکھنانے لگا۔ سب سے پہلے زندگی کا جرثومہ اسی میں نمودار ہوا تھا۔ پھر حکمت الٰہی نے اسے درجہ تکمیل تک پہنچایا۔ سوال یہ ہے کہ اگر زندگی عدم حقیقی سے وجود میں آسکتی تھی تو کیا ایک مرتبہ وجود میں آکر پھر دہرائی نہیں جاسکتی؟ زیادہ عجیب بات کونسی ہے؟ کسی چیز کی ابتدائی پیدائش۔ یا پیدائش کے بعد اعادہ؟ اگر تمہارے لیے ابتدائی پیدائش میں کوئی اچنبھا نہیں تو اعادہ میں کیوں ہو؟ کیوں تم قطعی فیصلہ کردو کہ ایسا نہیں ہوسکتا؟ جس قدرت پر یہ دشوار نہ ہوا کہ زندگی پیدا کردے، اُس پر یہ کیوں دشوار ہونے لگا کہ پیدا شدہ زندگی کو، کہ بکھر گئی ہے، پھر سمیٹ دے؟ اگر کمہار نئی مٹی سے نیا برتن بنا سکتا ہے تو یقیناً ٹوٹے ہوئے برتن کے ٹکڑوں کو بھی دوبارہ ڈھال لے سکتا ہے!

پیدائش کا تدریجی سلسلہ اور قانون تحول

اچھا، یہ تو ابتدائی پیدائش ہوئی۔ اس کے بعد پیدائش کا جو سلسلہ قائم ہوا، اُس کا کیا حال ہے؟ اُس کا حال یہ ہے کہ دو حقیقتیں ہر وقت تمہارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایک یہ، کہ انسانی وجود کا پورا درخت صرف ایک بیج سے پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام "نطفہ" ہے۔ لیکن "نطفہ" کیا ہے؟ کیا گوشت پوست ہے؟ ہڈیوں کا ڈھانچا ہے؟ ڈیل ڈول ہے؟ شکل و صورت ہے؟ عقل و حواس ہے؟ نہیں، کچھ بھی نہیں ہے، اور پھر سب کچھ ہے۔ ایک قطرۂ حقیر، مگر اسی سے انسان کا جسم، اس کی قامت، اس کی صورت، اس کی ساری معنوی قوتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ دوسری بات یہ، کہ یہاں یکسر تغیر و تحول کا قانون جاری ہے۔ شکم مادر میں جنین کو دیکھو، کتنی مختلف حالتوں سے گزرتا ہے؟ نطفہ سے علقہ۔ علقہ سے مضغہ، مضغہ سے عظم و لحم، عظم و لحم سے تشکل و صورت۔ پھر پیدائش کے بعد بچے کو دیکھو، کس طرح یکے بعد دیگرے نشو و بلوغ کے درجے بدلتا رہتا ہے؟ جوان آدمی کو دیکھو، کس طرح جسم و عقل کے کمال تک پہنچا اور پھر زوال کی طرف پلٹتا ہے؟ گویا انسان کی ہستی سراسر تبدل ہے، تطور ہے، تحول ہے، ایک حالت سے بدل کر دوسری حالت میں داخل ہوتے رہنا ہے!

عالم نباتات اور اعادۂ تحول

یہی حال عالم نباتات کا ہے۔ زمین کی گود میں بھی زندگیاں اور پیدائشیں ہیں جس طرح یہاں "نطفہ" ہے، وہاں بھی تخم اور تخم کے ذرات ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ اس کی گود زندگیوں کی نمود سے بالکل خالی ہوگئی۔ پھر دیکھتے ہو کہ زندگیوں کی فراوانی سے شاداب ہوگئی۔ یہ انقلاب کس طرح ظہور میں آیا؟ اسی طرح کہ محض ایک تخم سے، تخم کے ایک ذرہ سے، حیات نباتی کی ایک جوہری تلقیح سے پورا وجود نباتی پیدا ہو گیا اور تبدل و تحول کی تمام حالتیں اُس پر بھی اُسی طرح گزریں، جس طرح تمہاری ہستی پر گزرتی رہتی ہیں۔

قانون تاجیل

ساتھ ہی غور کرو۔ یہاں ایک تیسرا قانون بھی کام کر رہا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ہر تبدل کے لیے ایک اجل مسمّٰی یعنی ایک مقررہ وقت ہے جونہی وہ وقت آیا، احیا اور اجسام ظہور میں آگئے۔ "نطفہ" کو دیکھو۔ نقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسمّی۔ وہ اندرونی طور پر بنتا رہتا ہے مگر ایک مقررہ وقت تک ارحام کے اندر چھپا رہتا ہے۔ اجسام نباتیہ کو دیکھو۔ ان کی زندگی کا جوہر موجود ہوتا ہے مگر ابھرتا نہیں۔ ابھرتا کب ہے؟ اذا انزلنا علیها الماء جب بارش کی گھڑی آتی ہے اور زندگی کے ظہور و نمود کا اعلان کر دیتی ہے۔ اُس وقت اهتزت، وربت، وانبتت من کل زوج بهیج کا عالم نمایاں ہو جاتا ہے!

تخم حیات اور اعادۂ نشأۃ

یہ انسان و حیوان کی کامل ہستی جو محض "نطفہ" سے ظہور میں آجاتی ہے، کیوں ظہور میں آتی ہے؟ اس لیے کہ اس میں جوہر حیات بالقوۃ موجود ہے، اور پھر وہ بالفعل نمود کرتا ہے۔ اچھا، اگر تمہاری روزانہ زندگی کا یہ معاملہ تمہارے لیے عجیب نہیں، تو یہ بات کیوں عجیب ہے کہ اسی طرح کوئی نطفۂ حیات ہے جو مرنے کے بعد بھی موجود رہتا ہے، اور اس سے دوبارہ وجود انسانی ظہور میں آجائیگا؟ تم کہو گے اس کی کوئی مثال نہیں، لیکن تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ اس کی مثال ہمیشہ تمہاری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہے؟ وتری الارض هامدة۔ تم زمین کو دیکھتے ہو۔ وہی زمین جو کچھ عرصہ پہلے شاداب تھی، یکقلم سوکھ گئی ہے۔ پھر جب اس کی زندگی کی اجل مسمّی آجاتی ہے یعنی پانی برسنے لگتا ہے، تو اچانک مری ہوئی شادابی دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے، اور ہر تخم نباتی اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جس طرح نباتات کے اعادۂ نشأۃ کا یہ منظر ہمیشہ دیکھتے رہتے ہو ٹھیک اسی طرح انسانی زندگی کے اعادۂ نشأۃ کا معاملہ بھی سمجھو۔ بارش نے نئی زندگی پیدا نہیں کردی، اسی طرح

شدہ زندگی کو دہرا دیا جو زمین کی آغوش میں محفوظ موجود تھی۔ قیامت کی اجل مسمّٰی بھی نئی زندگی پیدا نہیں کرے گی۔ اُسی پیدا شدہ زندگی کو دُہرا دے گی جو کائنات کی آغوش میں موجود ہے۔ اب تم کہوگے۔ اگر موجود ہے تو وہ دکھائی کیوں نہیں دیتی؟ لیکن تمہیں کونسی چیز دکھائی دیتی ہے؟ تمہیں نطفہ میں انسان اور تخم میں درخت دکھائی دیتا ہے؟ تم کہو گے، مگر نطفہ اور تخم تو دکھائی دیتا ہے۔ اور زندگی کے جو جراثیم آنکھوں سے نہیں دیکھے جا سکتے، آلات کے ذریعہ دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔ ہاں، دیکھ لیے جا سکتے ہیں، مگر اس لیے کہ زیادہ دقیق نہیں۔ جو دقیق نہیں تھے، وہ تمہیں صاف نظر آنے لگے۔ جو دقیق تھے، وہ ہزاروں برس تک نظر نہیں آئے۔ یہاں تک کہ تم نے طاقتور خوردبینیں ایجاد کیں۔ پس تم کیسے حکم لگا دے سکتے ہو کہ ان سے بھی دقیق تر تخمہائے حیات موجود نہیں؟ اگر تمہیں صرف اتنی سی بات کے لیے دس ہزار برس تک انتظار کرنا پڑا کہ نطفۂ حیوانی کے جراثیم دیکھ لو۔ تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ان سے بھی دقیق تر تخمہائے حیات کے لیے تمہیں چند ہزار برس اور مطلوب نہیں؟ اور ان کا مرئی نہ ہونا ان کی معدومیت کا قطعی ثبوت ہے؟

تفصیل استدلال

اب دیکھو، مندرجہ صدر موعظت سے ان پانچوں باتوں پر کس طرح اذعان و یقین کی روشنی پڑ رہی ہے؟

(ا) ان اللہ ھو الحق۔ کیونکہ یہ سب کچھ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ خالقیت اور قدرت کی ایک حقیقت کام کر رہی ہو۔ تم وجدانی طور پر ایسا اعتقاد رکھنے پر مجبور ہو۔

(ب) انہ یحیی الموتیٰ۔ کیونکہ زندگی نہ تھی۔ اُس نے پیدا کی، اور پھر برابر اُسے دہراتا رہتا ہے۔

(ج) انہ علیٰ کل شیٔ قدیر۔ کیونکہ جس کی قدرت نے ایک ایسے مواد سے جو مٹی اور پانی کا ملا جُلا کیچڑ تھا، زندگی کا شعلہ روشن کیا، اور اس کا ایسا نظم قائم کر دیا کہ نطفہ کے ایک قطرہ اور تخم کے ایک ذرہ سے پیہ اُٹھیں نکلتی اور زندگیاں بنتی رہتی ہیں، اس کی قدرت سے کونسی بات بعید ہو سکتی ہے؟

(د) ان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا۔ ایک مقررہ گھڑی قیامت کی ضرور آنے والی ہے۔ کیونکہ یہاں تبدیلی کا قانون نافذ ہے اور ہر تبدیلی کے لیے ایک اجل مسمّٰی مقرر ہے۔ پس جس طرح بارش کی مقررہ گھڑی تمام اجسام نباتیہ کو موت کی حالت سے زندگی کی حالت میں لے آتی ہے، ضروری ہے کہ نوع انسانی کے لیے بھی ایک ایسی ہی اجل مسمّٰی ہو۔

(ہ) وان اللہ یبعث من فی القبور[1]۔ اور جب وہ گھڑی آئے تو تمام اموات لہلہاتی ہوئی کونپلوں کی طرح اٹھ کھڑی ہوں۔

قرآن کی اس موعظت کو ٹھیک طور پر سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے کہ چند مقدمات واضح ہو جائیں۔

قرآن کی اصطلاح میں "بعث"

اولاً: قرآن نے جا بجا حیات بعد الموت کو "بعث" سے تعبیر کیا ہے۔ بعث کے معنی اٹھ کھڑے ہونے کے ہیں۔ گویا اُس کے نزدیک یہ معاملہ ایسا ہوگا، جیسے کوئی سو رہا تھا۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے خلقت کے "اعادہ" سے بھی تعبیر کرتا ہے: کما بدانا اول خلق، نعیدہ (۲۱:۱۰۴)

موت اور "حیات"

ثانیاً: موت اور حیات کا اطلاق وہ صرف انہی حالتوں پر نہیں کرتا جو فلسفیانہ اصطلاح کی معدومیت اور تخلیق ہیں، بلکہ ہر ایسی حالت پر کرتا ہے جس میں زندگی کی نمود مفقود ہو جائے، یا بالفاظ دیگر صورت معدوم ہو جائے، اور پھر نمایاں اور متشکل ہو جائے۔ اس باب میں اس کا اطلاق اس درجہ وسیع ہے کہ نیند کی حالت پر بھی اُس نے موت کا اطلاق کیا ہے، اور دراصل یہ خود عربی زبان کا لغوی اطلاق ہے۔ بعد کو موت اور حیات نے جو فلسفیانہ معانی پہن لیے، وہ قرآن کی زبان نہیں ہے۔

انسان کا عام مشاہدہ، اور اعتقاد بھی یہی ہے۔ "نطفہ" کو ہم زندہ نہیں کہتے۔ حالانکہ اس میں زندگی کا جرثومہ موجود ہے۔ آم کی گٹھلی اور پتھر کے ایک ٹکڑے میں ہم کوئی فرق نہیں کرتے۔ دونوں ہماری زبان، ہمارے اعتقاد، اور ہمارے مشاہدہ میں بے جان ہیں، حالانکہ علمی اصطلاح میں گٹھلی بے جان نہیں۔ اس میں نباتی زندگی کا تخم موجود ہے۔ پس قرآن کے اختیارات لغویہ کو کہ لغت کے اعتبار سے ہیں، علمی مصطلحات پر ڈھالنا نہیں چاہیے۔ اس کی زبان میں "موت" عام ہے۔ خواہ انعدام محض ہو، خواہ انعدام صورت ہو۔ اسی طرح "حیات" بھی عام ہے۔ خواہ معدومیت محضہ سے تخلیق ہو۔ خواہ کسی جوہر حیات سے بروز و انبعاث ہو۔ چنانچہ جس طرح وہ اُس ابتدائی حالت کو موت سے تعبیر کرتا ہے جو عدم محض کی حالت تھی، اُسی طرح نطفہ کی اور تخمہائے نباتات کی حالت کو بھی موت سے تعبیر

[1] من فی القبور کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مردے قبر نامی محل دفن میں مدفون کیے گئے، بلکہ یہ عربی کا محاورہ ہے کہ مُردوں کو اصحاب قبور کہتے ہیں۔ ما انت بمسمع من فی القبور یعنی تو مُردوں کو مخاطب نہیں کر سکتا۔ زندوں ہی سے بات چیت کی جاتی ہے۔

کرتا ہے، اور کہتا ہے۔ پہلے زندگی مٹی سے ہوئی جبکہ حیات حیوانی ہیں سے کچھ نہ تھا پھر نطفہ سے ہوتی ہے، جبکہ نطفہ کا ظہور حیات موجود ہوتا ہے۔

(۱) الحق۔ اس نے حشرِ اجسام کے معاملہ کو بھی اُسی حالت سے تشبیہ دی ہے جو نطفہ سے زندگی کے ابھرنے اور تخم سے درختوں کے نکلنے کی حالت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا، انسان کی دوسری زندگی کا ظہور اُس طرح کا ظہور نہ ہوگا، جیسا ابتدائی تخلیق کا ظہور تھا یعنی جس میں اصلِ حیات کے حیات ظہور میں آگئی تھی۔ بلکہ ایسا ہوگا، جیسا نطفہ سے ایک نئی پیدائش اور بزور نباتات سے ایک نیا ظہور میں آجاتا ہے۔ یعنی اصلِ حیات بالقوہ موجود ہوتی ہے، اور بالفعل ظہور میں آجاتی ہے۔ اسی لیے وہ اُسے بعث سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جیسے کوئی آدمی بہت دیر تک سوتا رہا تھا پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اس انبعاث کے احساسات و واردات ایسے بیان کیے ہیں، جیسے نیند کے بعد بیدار ہونے پر طاری ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً جا بجا کہا ہے۔ اُس وقت لوگ سوچیں گے، ہم کتنے عرصہ تک بےخبر رہے؟ کوئی کہیگا، تھوڑی دیر۔ کوئی کہیگا زیادہ عرصہ تک۔ اور پھر یہی وجہ ہے کہ وہ اس حالت کو اعادۂ حیات سے تعبیر کرتا ہے اور عالمِ ہستی کے تبدل و تحول سے استدلال کرتا ہے یعنی جب فطرت کائنات کے ہر گوشہ میں تبدلِ حالت کا قانون کام کر رہا ہے۔ اور یہاں ہر قدم پر تبدل اور ہر منزل پر تجدد ہے، تو کیوں تمہیں اس سے انکار ہو کہ ایک اور تبدل بھی پیش آنے والا ہے، اور اُس کا نام بعث و حشر ہے؟

انسان اپنی ہستی کی جس منزل تک پہنچ چکا ہے، وہاں سے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھو۔ کتنے بے شمار تبدلات ہیں جن سے اس کی ہستی گزرتی رہی ہے؟ پھر اگر ماضی میں بے شمار تبدلات ہو چکے ہیں، تو کیوں مستقبل میں بھی نہ ہوں؟ کیوں تبدلات کا سفر اسی منزل تک پہنچ کر رک جائے؟ کیوں اس پر تعجب ہو کہ جہاں ایک ہزار تبدیلیاں ہو چکی ہیں وہاں ایک آخری تبدیلی اور بھی ہونے والی ہے؟ ہم نے اضافی حیثیت سے یہاں "آخری" کہدیا۔ ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ تبدل بھی آخری ہوگا؟ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا!

رابعاً، ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے، پھر اُس کی حقیقت معدوم نہیں ہوتی۔ صرف صورت معدوم ہو جاتی ہے۔ اور اسی صورت کا انعدام ہمارے لیے اس کا معدوم ہو جانا ہوتا ہے۔ تم درخت کو چیر کر تختہ بنا لیتے ہو۔ اب درخت معدوم ہوگیا۔ تختہ پیدا ہوگیا۔ مگر جو چیز معدوم ہوگئی، وہ کیا تھی؟ صورت یا حقیقت؟ محض صورت۔ جو پیدا ہوگئی، وہ کیا پیدا ہوئی؟ نئی حقیقت یا نئی صورت؟ نئی صورت۔ کیونکہ درخت پر جو تبدیلی طاری ہوئی وہ صرف صورت کی ہوئی حقیقت تختے کی بھی وہی ہے جو درخت کی تھی۔ اب تختہ جلا دو۔ تختہ نابود ہوگیا۔ راکھ پیدا ہوگئی۔ راکھ بھی اُڑا دو۔ راکھ نابود ہوگئی۔ منتشر ذرات پیدا ہوگئے۔ مگر ان دونوں حالتوں میں بھی جو انعدام ہوا، وہ کس چیز کا ہوا؟ محض صورت کا۔ اگر تم منتشر ذروں کا بھی تعاقب کر سکتے ہو تو کرو دیکھو صورت بدلتی جائیگی حقیقت کبھی معدوم نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہاں ہر گوشہ میں تبدل صرف صورت کے لیے ہے۔ حقیقت کے لیے نہیں ہے۔

لیکن صورت کے اس تبدل کا سلسلہ کس نقطہ پر جا کر ختم ہوتا ہے؟ اس کا کھوج ہم آج تک نہ پا سکے۔ ہماری جستجو کا قافلہ ہمیشہ کی طرح اب بھی رواں ہے۔ ہم نے عرصہ تک عناصر کا خواب دیکھا۔ ہم مدتوں جزو لایتجزیٰ کی سراغ رسانی میں رہے۔ ہم نے ذی مقراطیسی سالمات پر صدیوں تک اعتماد کیا۔ اب ہم الکٹرون کی مثبت اور منفی لہروں میں اُسے دیکھ رہے ہیں، اور نہیں جانتے کہ آگے بڑھیں گے، یا یہیں رُکے رہیں گے۔ البتہ اس آخری منزل نے حقیقت کا ایک نیا جلوہ آشکارا کر دیا ہے یعنی یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مادہ کا آخری بت! محض ایک جامد ذرہ ہی نہیں ہے بلکہ حرکت و خواص حرکت کی ایک مشتعل قوت ہے، اور نہیں معلوم اس نقطۂ قوت میں فعل و انفعال کی کتنی دنیائیں پوشیدہ ہیں!

قرآن کہتا ہے، جب تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں تبدلِ صورت اور بقاء حقیقت کا قانون ہر گوشہ میں کام کر رہا ہے، تو پھر تم نے کیسے سمجھ لیا کہ ایک انسانی ہستی وجود میں آکر پھر مطلقاً نابود ہو جاتی ہے، اور اُس کی کوئی حقیقت جوہری باقی نہیں رہتی؟ فطرت کا جو قانون وجود و ہستی کے ہر گوشہ میں نافذ ہے، وہ زندگی اور روح کے لیے کیوں معطل ہو جائے؟ وہ انسان کی زندگی کے لیے کیوں معطل ہو جائے، جو کرۂ ارضی کی تمام مخلوقات کا ماحصل اور سلسلۂ تخلیق کا منتہیٰ اور مقصود ہے؟ نہیں، یہاں کوئی ہستی بھی وجود میں آجانے کے بعد نابود محض نہیں ہو سکتی۔ بلا شبہ اُس کی صورت مٹ جاتی ہے مگر حقیقت نہیں مٹیگی۔ اس کی صورت پر ہزار تبدیلیاں طاری ہو جائیں، مگر یاد رکھو کوئی نہ کوئی حقیقتِ جوہری ضرور باقی رہیگی۔ وہ ایک دانۂ تخم کی طرح ہو، ایک نطفۂ پیدائش کی طرح ہو، ایک ذرۂ حیات کی طرح ہو، مگر ممکن نہیں کہ

بعث کی تعبیر، حشر اجساد و تبدل حالت

یہاں وجود کی حقیقت نہیں مٹتی صورت مٹتی ہے

تبدل صورت اور بقاء حقیقت سے استدلال

موجود ہو۔ وہ کسی نہ کسی حالت میں ضرور موجود رہتی ہے، اور پھر جونہی بعث اعادہ کی گھڑی آئیگی، اور زندگی کا صور پھونکا جائیگا، ہر انسانی زندگی اس سے نمودار ہوکر اُٹھ کھڑی ہوگی۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح نطفہ پیدائش سے شکم مادر میں، تخم نباتی سے آغوشِ ارضی میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے!

یہاں کوئی ہستی جو پیدا ہو جاتی ہے، پھر نابود نہیں ہو جاتی۔ وہ کسی مخفی نشیمن میں سوئی رہتی ہے۔ اب اُسے دوبارہ خلق کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف اُٹھا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نباتات کی ہستی ذرات تخم کے نشیمنوں میں سوئی رہتی ہے۔ جب نمود و بروز کا موسم آتا ہے، تو وہ نئی ہستیاں پیدا نہیں کر دیتا، سوئی ہوئی ہستیوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اسی طرح انسان کی ہستی بھی کسی نہ کسی نقطۂ تخم میں بند ہوکر سو رہی ہے اور جب وقت آئیگا تو اُٹھ کھڑی ہوگی۔ تم اسے دیکھتے نہیں، لیکن تم اور کتنی حقیقتوں کو دیکھ رہے ہو؟ تمہیں اس کا پتہ نہیں، لیکن تم نے اور کتنی حقیقتوں کا پتہ لگا لیا ہے؟ تمہارے عدم ادراک سے حقیقت معدوم نہیں ہو جا سکتی۔ تم اگر اعتقادِ وجود کے لیے مشاہدۂ وجود کو شرط سمجھ لوگے، تو تمہیں آدھی دنیا سے انکار کر دینا پڑیگا۔ تم نے اگر ایسا سمجھ لیا ہوتا تو آج حقائقِ مادیہ کی دو تہائی حقیقتیں غیر معلوم ہوتیں۔ تم عرفانِ حقیقت کی راہ میں صرف حواس کے سہارے چل نہیں سکتے۔ تمہیں ادراکِ عقلی کا سہارا پکڑنا پڑتا ہے، اور پھر جب یہ سہارا بھی جواب دیدیتا ہے، تو تم رُک جاتے ہو اور انتظار کرتے ہو۔ تمہیں اس گوشہ میں بھی مان لینا چاہیے اور انتظار کرنا چاہیے۔

موسمِ ہستی کی گردش اور تقویمِ فطرت

خامساً، قرآن نے بعث و حشر کے معاملہ کا جس طرح ذکر کیا ہے، اور عالمِ نباتات کے اعادۂ حیات کی مقررہ گھڑی سے جس طرح اُسے تشبیہ دی ہے، اُس سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ تبدّلِ کائنات کے معاملہ کو بھی موسموں کی تبدیلیوں کا سا معاملہ تصور کرنا چاہیے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں، خزاں و بہار، خشک سالی و سیرابی، گرمی و سردی کے مختلف موسم آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تبدّلِ کائنات کا بھی ایک موسم ہے، اور ہمارے سال کی طرح اُس کا بھی کوئی سال، اور ہماری روزشماریوں کی طرح اُس کی بھی کوئی روزشماری ہے۔ لیکن ہم اپنی تقویم پر جو کائنات کے صرف ایک حقیر کرہ کی سیر و گردش کا نتیجہ ہے، اس کی تقویم کو قیاس نہیں کر سکتے۔ اس کی مدت کوئی بڑی ہی طولانی مدت ہے۔ اتنی طولانی کہ ہماری وقت شماری کا پچاس ہزار سال، اور اس کا صرف ایک دن۔ چنانچہ آگے چل کر سورۂ معارج میں پڑھوگے: تعرج الملائکۃ والروح الیہ فی یوم، کان مقدارہ خمسین الف سنۃ (۷۰: ۴) ہمارے سال کے موسموں کی طرح اس کا بھی ایک موسم ختم ہوتا اور دوسرا موسم شروع ہوتا ہے۔ یہاں جب حیاتِ ارضی کا موسم آتا ہے، تو اُس کی محرک اول بارش ہوتی ہے۔ بارش گرتی ہے، اور امواتِ نباتات کو زندگی کا حکم مل جاتا ہے۔ اھتزت، وربت، وانبتت من کل زوج بھیج۔ ٹھیک اسی طرح جب سالِ کائنات کا وہ مقررہ موسم آئیگا تو بارش ہی کی طرح زندگی کا کوئی صور پھونک دیا جائیگا: فاذا نفخ فی الصور نفخۃ واحدۃ (۶۹: ۱۳) اور بمجرد حکم، تمام امواتِ انسانی اُٹھ کھڑی ہونگی: یخرجون من الاجداث کانھم جراد منتشر مھطعین الی الداع (۵۴: ۷)

علم اس مقام میں نہیں کہ جرأتِ انکار کرے

آخر میں ایک اصلِ عظیم نہیں بھولنی چاہیے۔ جہاں تک مسئلۂ حیات کی حقیقت کا تعلق ہے، علمِ انسانی کے سامنے کوئی یقینی روشنی موجود نہیں۔ ہم اس وقت تک یہ بھی نہ جان سکے کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ ارنسٹ ہیکل Ernst Haeckel کے لفظوں میں، ہم زیادہ سے زیادہ جو کہہ سکتے ہیں، وہ صرف یہی ہے کہ "اس کے آنے کا انتظار کریں، اور جب آجائے تو اُس کے اطوار و احوال اور خواص و افعال کے تعاقب میں نکل جائیں" لیکن وہ ہے کیا؟ وہ آتی کہاں سے ہے؟ وہ جاتی کہاں ہے؟ تو اس بارے میں علمِ انسانی کا قدم اُس جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکا، جہاں ہزاروں برس سے متحیر و درماندہ کھڑا ہے!

جب حقیقتِ حیات کے بارے میں ہماری عقلی معلومات کا یہ حال ہے، تو کیا ہمیں ایسا مقام حاصل ہے کہ وحی الٰہی کے اعلاناتِ علم و یقین کے مقابلہ میں نفی و انکار کی جرأت کریں؟ اگر کرینگے، تو یہ ویسی ہی جرأت ہوگی جسے اسی سورت میں جدال فی اللہ بغیر علم سے تعبیر کیا ہے: ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم، ولا ھدی، ولا کتاب منیر!

---

(۲) دلائلِ بعث کے بیان کے بعد فرمایا۔ ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم، ولا ھدی، ولا کتاب منیر (۸) اور کتنے ہی آدمی ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں؟ اور ان کی حالت کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ نہ تو علم کی روشنی رکھتے ہیں، نہ کوئی رہنمائی کی

راہ، اور نہ کوئی کتاب روشن۔ اور عرفانِ حق کے یہی تین وسائل ہیں جو انسان کو حاصل ہو سکتے ہیں پس ایسے لوگوں کے لیے بحث کی کوئی دلیل بھی سود مند نہیں، وہ دلائل بحث کی یہ تمام موعظت سنکر بھی سر ہلا دینگے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ آیت مہمات معارف قرآنی میں سے ہے کیونکہ اس نے جدال فی اللہ بغیر علم کی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہی حالت قرآن کے نزدیک جہل و ضلالتِ انسانی کا سب سے بڑا مبدء ہے۔ لیکن چونکہ یہ مقام زیادہ تفصیل کے ساتھ آئندہ سورہ فرقان میں آنے والا ہے، اس لیے یہاں اس کی تشریح میں جانا ضروری نہیں۔

سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْن

مکی - ۱۱۸ - آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ○ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ

بلا شبہ ایمان لانے والے کامیاب ہوئے۔ (کون ایمان لانے والے؟) جو اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع رکھتے ہیں، جو نکمی باتوں سے رُخ پھیرے ہوئے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں، جو اپنے ستر کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ ہاں اپنی بیبیوں سے زناشوئی کا علاقہ رکھتے ہیں، یا اُن سے جو ان کی ملکیت میں آگئیں (یعنی غلامی کی حالت میں پڑی ہوئی عورتیں جو ان کے نکاح میں آگئیں) تو اُن سے علاقہ رکھنے پر اُن کے لیے کوئی ملامت نہیں۔ اور جو کوئی (اس معاملہ میں) اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نکالے، تو ایسی صورتیں نکالنے والے ہی ہیں جو حد سے باہر ہو گئے۔

نیز جن کا حال یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں، اور اپنی نمازوں کی حفاظت میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ تو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنا ورثہ پانے والے ہیں۔ یہ فردوس کی زندگی میراث میں پائیں گے ہمیشہ کے لیے اس میں بسنے والے!

اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ

(۱) یہ مکی زندگی کی آخری تنزیلات میں سے ہے۔ بالاتفاق الانبیاء کے بعد اتری۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت مکہ میں پیدا ہو گئی تھی، اور دعوت حق کے فیضان نے اُس کے خصائص اسلامی آشکارا کر دیے تھے۔ یہ گویا مریضوں کی پہلی جماعت تھی جو اس شفاخانہ سے تندرست ہو کر نکلی۔ اب طبیب ان کی طرف اشارہ کرکے کہہ سکتا تھا کہ جسے میری طبابت میں شک ہو، وہ انہیں دیکھ لے۔ جو طبیب اپنے نسخۂ شفا سے ایسی تندرست روحیں پیدا کر دیتا ہے، وہ طبیب ہے یا نہیں؟

یعنی یہ جماعت اپنے خصائص ایمانی و عملی میں دعوت حق کی صداقت کی ایک مشہود دلیل بن گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی سورتوں میں جا بجا اس کے اعمال و خصائص کی طرف اشارات کیے ہیں۔

اس سورت کی ابتدا اسی مرقع سے ہوتی ہے۔ غور کرو اس مرقع کے اصلی نقش و نگار کیا ہیں!

(۲) یہاں خصوصیت کے ساتھ پانچ وصف بیان کیے گویا قرآن کے نزدیک ایمان و عمل کے مرقع میں سب سے زیادہ نمایاں یہی خط و خال ہیں جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں، وہ مومن زندگی نہیں سمجھی جا سکتی۔

(ا) نماز کی محافظت اور اُس کا خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا۔ "خشوع" کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تم

سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۞ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۞ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۞ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۞ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۞ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۞ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۞ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۞ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ

سے پیدا کیا (یعنے زندگی کی ابتدا مٹی کے خلاصہ سے ہوئی) پھر ہم نے اُسے "نطفہ" بنایا۔ ایک ٹھہر جانے اور جاؤ پانے کی جگہ میں۔ پھر "نطفہ" کو ہم نے "علقہ" بنایا۔ پھر "علقہ" کو ایک گوشت کا ٹکڑا سا کر دیا پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچا پیدا کیا۔ پھر ڈھانچے پر گوشت کی تہہ چڑھا دی۔ پھر دیکھو، کس طرح اُسے بالکل ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا؟ تو کیا ہی برکتوں والی ہستی ہے اللہ کی۔ پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر پیدا کرنے والا!

پھر (دیکھو، اس پیدائش کے بعد) تم سب کو ضرور مرنا ہے، اور پھر (مرنے کے بعد) ایسا ہونا ہے کہ قیامت کے دن اُٹھائے جاؤ!

اور (دیکھو) یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ تمہارے اوپر (گردش کے) سات راستے بنا دیے، اور ہم مخلوق کی طرف سے غافل نہ تھے۔

اور ہم نے ایک خاص اندازہ کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا، اور اُسے زمین میں (حسب ضرورت) ٹھہرائے رکھا۔ اور ہم یقیناً قادر ہیں کہ اُسے (جس طرح نمودار کیا، اُسی طرح اُڑا) لے جائیں۔

پھر اُسی پانی کی آبیاری سے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغوں کو نشوونما دیدی۔ ان باغوں میں

١٢ کسی ہیبت و اجلال مقام میں کھڑے ہو جاؤ، تو تمہارے ذہن و جسم پر کیسی حالت طاری ہو جائیگی! ایسی ہی حالت کو عربی میں خشوع کی حالت کہتے ہیں

١٣ (ب) ہر اُس بات سے مجتنب رہنا جو لغو ہو۔ صرف اُنہی باتوں کا اشتغال رکھنا جو دین و دنیا میں نافع ہوں۔

(ج) اپنی کمائی اپنے محتاج بھائیوں کے لیے خرچ کرنا۔

(د) زنا سے کبھی آلودہ نہ ہونا

(ہ) امانت دار رہنا، اپنے عہدوں کو پورا کرنا۔

آیت (۷) سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک اتحاد تناسلی کا جائز طریقہ صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ ازدواج کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائیگا، ناجائز ہوگا۔ خواہ کسی شکل اور کسی نوعیت کا ہو۔

١٤ تمام دنیا کی طرح عرب میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی اور لونڈی غلاموں کے معاملہ کو ملک یمین سے تعبیر کرتے تھے یعنے کسی چیز پر قابض ہو جانے سے بیان فرمایا۔ وہ زناشوئی کا علاقہ بجز منکوحہ عورتوں کے اور کسی سے نہیں رکھتے۔ ان کی بیبیاں ہوں جو سوسائٹی کے آزاد افراد میں سے ہیں۔ یا لونڈیاں ہوں جو ان کے نکاح میں آگئی ہیں

چونکہ وقت کی سوسائٹی میں آزاد اور غلام افراد کی یہ دو قسمیں پیدا ہو گئی تھیں، اس لیے ان کا ذکر ناگزیر تھا۔ باقی رہی یہ بات کہ خود قرآن نے رسم غلامی کے باب میں کیا حکم دیا؟ اور کس طرح اسے مٹانا چاہا؟ تو اس کا جواب سورۂ محمد کی تشریحات میں ملیگا۔

١٨ (۳) آیت (۱۲) میں وہی بات کہی جو سورۂ حج میں گزر چکی ہے یعنے انسان کی ابتدائی پیدائش کس چیز سے ہوئی؟ سلالۃ من طین، ایک ایسے جوہر سے جو کیچڑ کا خلاصہ تھا۔ یعنے مرطوب مٹی تو ایک خمیر کی حالت میں رہی۔ پھر اس میں کوئی ایسی چیز پیدا ہو گئی

فِيهَا فَوَاكِهُ كَثِيرَةٌ وَّمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْآكِلِينَ ۝ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَّمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ۝ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً

تمہارے لیے بہت سے پھل پیدا ہوتے ہیں بعض تمہارے کھانے میں کام آتے ہیں۔

اور وہ درخت جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے، (یعنے زیتون کا درخت) جو چکنائی اُگاتا ہے اور کھانے والوں کے لیے (نہایت اچھا) سالن!

اور (دیکھو) تمہارے لیے چارپایوں کی خلقت میں بھی بڑی ہی عبرت ہے۔ جو کچھ ان کے شکم میں بھرا ہے (یعنے ناگوار آلائشیں) اسی میں سے تمہارے لیے پینے کی (خوشگوار) چیز پیدا کر دیتے ہیں (یعنے دودھ) اور تمہارے لیے اُن کے وجود میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔ انہی میں سے بعض تمہارے لیے غذا کا بھی کام دیتے ہیں۔ تم (خشکی میں) اُن پر اور جہازوں پر (سمندر میں) سوار بھی ہوتے ہو۔

اور (پھر دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف (ہدایت کے لیے) بھیجا تھا۔ اُس نے کہا تھا "بھائیو! اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم (بدعملی کے نتائج سے) ڈرتے نہیں؟"

اُس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، وہ یہ سُن کر (لوگوں سے) کہنے لگے "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے، تم پر اپنی بڑائی جتائے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اُتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی

ہے اُس کا خلاصہ اور ست سمجھنا چاہیے۔ اسی خلاصہ سے زندگی کی اولین نمود ہوئی، اور اُسی سے بالآخر وجود انسانی متشکل ہوا۔

یہ تو پہلی پیدائش ہوئی۔ اس کے بعد پیدائش کا سلسلہ کس طرح جاری ہوا؟ توالد و تناسل سے۔ چنانچہ پہلے "نطفہ" رحم مادر میں جگہ پکڑتا ہے۔ پھر اس پر نشو و نما کے مختلف دور طاری ہوتے ہیں۔ قرآن نے یہاں اور دوسرے مقامات میں تشکیل جنین کے جو مراتب بیان کیے ہیں، گزشتہ زمانے میں اُن کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوئی تھی، کیونکہ علم تشریح جنین Embryology بالکل ناقص حالت میں تھا۔ لیکن اب انیسویں صدی کی تشریحی تحقیقات نے تمام پردے اُٹھا دیے ہیں، اور اُن سے پوری طرح ان تطورات کی تصدیق ہو گئی ہے۔ خصوصاً ثم انشانٰہ خلقاً اٰخر کی تفصیل اس کی سورت کے آخری نوٹ میں ملیگی۔

(۴) انسان اگر غور کرے تو حقیقت کے دلائل و شواہد اُسے تین راہوں سے گھیرے ہوئے ہیں۔ خود اُس کی ہستی کا ہر گوشہ سراسر دلیل حقیقت ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاح میں "عالم انفس" ہے۔ اُس سے باہر جو کچھ ہے، وہ بھی حقیقت کا پیام ہے۔ یہ "عالم آفاق" ہے پھر عالم آفاق کے دلائل کی بھی دو قسمیں ہوئیں۔ کائنات ہستی کی خلقت و نظم کے مظاہر۔ یہ آیات کونیہ ہیں۔ اقوام ماضیہ کے احوال و تجارب۔ یہ براہین عملیہ ہیں۔

قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ ان تمام اقسام سے استدلال کرتا، اور ایک قسم کے دلائل کے بعد دوسری قسم کے دلائل لاتا ہے۔ اس سورت میں علی الترتیب تینوں قسموں کے دلائل جمع ہو گئے ہیں۔ آیت (۱۲) سے (۱۶) تک انسان کو توجہ دلائی ہے کہ خود اپنی خلقت پر غور کرے۔ آیت (۱۷) سے (۲۲) تک عالم آفاق کے دلائل کونیہ

مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ قَالَ
رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا
وَفَارَ التَّنُّوْرُ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ
وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ
فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ

طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیام بر کیوں بنانے لگا؟ ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سُنی نہیں۔ کچھ نہیں یہ پاگل ہوگیا ہے پس (اس کی باتوں پر کان نہ دھرو) کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو،

۲۵ اس کا انجام کیا ہوتا ہے"۔

۲۶ اس پر نوح نے دعا مانگی "خدایا! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے تو تُو میری مدد کر!"

۲۷ پس ہم نے نوح کی طرف وحی بھیجی کہ "ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔ پھر جب ایسا ہو کہ ہمارے حکم کا وقت آجائے اور تنور کے شعلے بھڑک اُٹھیں (یعنے ظہور نتائج کا معاملہ پختہ ہوجائے) تو کشتی میں ہر جانور کے دو دو جوڑے ساتھ لے لے، اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ مگر گھر کے ایسے آدمی کو نہیں جس کے لیے پہلے فیصلہ ہوچکا۔ اور دیکھ! جن لوگوں نے ظلم کیا ہے، اُن کے بارے میں ہم سے کچھ عرض معروض نہ کیجیو۔ وہ ڈوب کر رہینگے!"

۲۸ "اور جب تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوجائے تو اُس وقت تیری زبان سے یہ صدا اُٹھے: ساری ستائشیں اللہ کے لیے جس نے ہمیں ظالم قوم (کی بیتا) سے نجات دی! نیز یہ دعا بھی مانگیو کہ "خدایا! مجھے اب زمین پر اس طرح اُتار کہ برکت کا اُترنا ہو، اور تو سب سے بہتر

بیان کیے ہیں کہ اپنے نفس سے باہر کے عالم میں تفکر کرے۔ آیت (۲۳) سے (۵۲) تک گزشتہ دعوتوں کی سرگزشتوں سے استدلال کیا ہے کہ حوادث ماضیہ سے حال و مستقبل کے لیے عبرت پکڑے اس کے بعد آخر سورت تک جو کچھ بیان ہے، وہ اسی سلسلۂ استدلال کے قدرتی نتائج و عبر ہیں۔

(۵) آیت (۱۷) سے (۲۲) تک جن دلائل کو تدبر پر توجہ دلائی ہے، وہ برہانِ ربوبیت کا استدلال ہے تفصیل کے لیے تفسیر فاتحہ دیکھو۔ آیت (۱۷) میں فرمایا "خلقنا فوقکم سبع طرائق"۔ "طرائق" کے صاف معنی عربی میں راہ کے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے مفسروں کے سامنے نظام بطلیموسی موجود تھا، اور اس میں کواکب کی جگہ طبقات سماوی کی گردش تسلیم کی گئی تھی، اس لیے مجبور ہوئے کہ کسی نہ کسی طرح اسے طبقات کے معنوں میں لے جائیں۔ مگر اب نظام بطلیموسی کا پورا کارخانہ ہی اُلٹ ہوگیا۔

سات بڑے ستاروں کا تعین انسانی علم کی نہایت قدیم معلومات میں سے ہے۔ اسی لیے قرآن جابجا ان کی سیر و گردش اور عجائب آفرینش پر توجہ دلاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی خلقت پر اس لیے بھی زور دیا گیا کہ تمام قدیم قوموں میں ان کی پرستش کا اعتقاد پیدا ہوگیا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کی مخلوقیت کے پہلو پر بار بار زور دیا جاتا۔

(۶) آیت (۲۰) میں خصوصیت کے ساتھ زیتون کے درخت کا ذکر کیا ہے۔

فطرت کے افادہ و فیضانِ عام کا یہ ایک خاص گوشہ ہے اُس نے دانوں اور پھلوں میں ہر طرح کی ٹھوس غذا ہی پیدا نہیں کر دی، بلکہ دُہنیت کے ایسے ذخیرے بھی مہیا کر دیے جن سے بکثرت تیل نکلتا

خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝

جگہ دینے والا ہے!"

(۳۰) بلا شبہ اس واقعہ میں (سمجھنے والوں کے لیے) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ نیز یہ کہ یہاں ضرور ایسا ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں۔

(۳۱) پھر ہم نے قوم نوح کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا۔ (۳۲) اُن میں بھی اپنا رسول بھیجا جو خود انہی میں سے تھا۔ (اس کی پکار بھی یہی تھی:) کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم (انکار و فساد کے نتائج بد سے) ڈرتے نہیں؟"

(۳۳) اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، اور آخرت کے پیش آنے سے منکر تھے، اور جنہیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی دے رکھی تھی (لوگوں سے) کہنے لگے "اس سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ جو کچھ تم کھاتے ہو، یہ بھی کھاتا ہے۔ جو کچھ تم پیتے ہو، یہ بھی پیتا ہے۔ (۳۴) اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کرلی تو بس سمجھ لو، تم تباہ ہوئے۔ (۳۵) تم سنتے ہو۔ یہ کیا کہتا ہے؟ یہ تمہیں امید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض مٹی اور ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے، تو پھر تمہیں موت سے نکالا جائیگا۔ (۳۶) کیسی انہونی بات ہے کیسی انہونی بات ہے جس کی تمہیں توقع دلاتا ہے! (بھلا دوبارہ زندہ ہونا کیسا؟)

ہے اور انسان کے لیے نہایت مقوی غذا اور دوا کا کام دیتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ عجیب نافع درخت زیتون کا درخت ہے۔ اس کا دانہ سرتاسر دُہنیت ہے۔ حتیٰ کہ اگر چٹکی میں لیکر زور سے مسل ڈالو، تو تیل کے قطرے ٹپکنے لگینگے۔ خواص کے لحاظ سے کوئی چکنائی اتنی معتدل اور موافق نہیں جتنی زیتون کی ہے۔

شاید بہت کم لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہوگا کہ دُہنیت کے لیے تمام دنیا کا اعتماد ہمیشہ سے نباتاتی دہنیت ہی پر رہا ہے۔ اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ زیتون پر۔ یہ صرف ہندوستان ہے جہاں مکھن کو گھی بنا کر استعمال کرنے کا رواج پیدا ہوا، اور لوگ اسے نباتاتی دُہنیت پر ترجیح دینے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں گھی کے لیے کوئی خاص لفظ نہیں ملتا۔ وہ اس سے آشنا ہی نہ تھے۔

زیتون کے لیے طور سیناء کی طرف اس لیے اشارہ کیا کہ منابت زیتون میں سے قریب تر مقام جزیرہ نمائے سینا ہی کا علاقہ تھا۔ گویا زیتون کی اصلی دنیا یہاں سے شروع ہو جاتی ہے۔

(۵) آیت (۲۳) سے اقوام ماضیہ کی سرگزشتوں کا جو بیان شروع ہوا ہے، وہ تمام تر مجمل اشارات پر مشتمل ہے۔ کیونکہ یہاں یہ موعظت مقصود بالذات نہیں ہے۔ پچھلی دو موعظتوں کو دلائل قصص سے مزید تقویت دی ہے۔

چونکہ گذشتہ دعوتوں کا تذکرہ ہر جگہ حضرت نوح کی دعوت سے شروع کیا گیا ہے، اور حضرت مسیح کی دعوت پر ختم ہو جاتا ہے، اس لیے یہاں بھی ابتداء دعوت نوحی ہی سے ہوئی اور حضرت مسیح کے تذکرہ پر ختم ہوگئی۔ درمیان میں جو دعوتیں اور قومیں گزریں، اُن کی طرف صرف اشارہ کر دیا گیا۔ البتہ حضرت موسیٰ کا خصوصیت کے ساتھ

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ۝ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ۝ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ ۝ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝ ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۖ كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةً رَسُولُهَا كَذَّبُوهُ ۚ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ ۚ فَبُعْدًا لِقَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

۳۷ زندگی تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں ہم بسر کرتے ہیں۔ یہیں مرتے ہیں یہیں جینا ہے۔ ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ مرکر پھر جی اٹھیں۔ کچھ نہیں یہ ایک مفتری آدمی ہے جس نے اللہ کے نام سے جھوٹ موٹ بات بنادی۔ ہم کبھی اس پر یقین لانے والے نہیں!"

۳۸-۳۹ اس پر اُس رسول نے دعا مانگی "خدایا! اُنہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر!"

۴۰-۴۱ حکم ہوا "عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ یہ اپنے کیے پر شرمسار ہونگے" چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے اُنہیں آپکڑا، اور ہم نے خس و خاشاک کی طرح اُنہیں پامال کر دیا۔ تو محرومی ہو اس گروہ کے لیے کہ ظلم کرنے والا ہے!

۴۲-۴۳ پھر ہم نے اُن کے بعد قوموں کے اور بہت سے دور پیدا کیے۔ کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے۔ نہ پیچھے رہ سکتی ہے (سب کو قانونِ الٰہی کے مطابق اپنا دور پورا کرنا ہے!)

۴۴ پھر ہم نے لگاتار یکے بعد دیگرے، اپنے رسول بھیجے۔ لیکن جب کبھی کسی قوم میں اُس کا رسول ظاہر ہوا، تو وہ جھٹلانے پر آمادہ ہوگئی پس ہم بھی ایک کے بعد ایک کرکے اُنہیں ہلاک کرتے گئے، اور اُن کی ہستیاں (زوال کا) افسانہ بن گئیں۔ تو اُن کے لیے محرومی و نامرادی ہو جو آیاتِ حق پر یقین نہیں کرتے!

ہم پہنچایا۔ کیونکہ ان سے سلسلۂ دعوت کے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی تھی

(۸) ایک صورتِ حال یہ ہے کہ افرادِ انسانی پیدا ہوں اور آباد ہوں ایک یہ ہے کہ ان کی جماعتی زندگی اور اس کی مدنی خصوصیات اس طرح اُبھریں اور عروج تک پہنچیں کہ ایک خاص قومی عہد پیدا ہو جائے عربی میں دوسری حالت کو کسی قوم و ملک کے "قرن" سے تعبیر کرینگے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا "قرن" اور "قرون" کا لفظ اختیار کیا ہے یعنے صرف قوموں کا پیدا ہونا، آبادیوں میں بسنا ہی نہیں بلکہ قومی عروج و اقبال کے دور اور عہد

ہمارے مترجموں اور عام مفسروں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا وہ قرن اور قرون کا مطلب ادا کرنے کے لیے صرف قوم و اقوام کے الفاظ پر قناعت کر لیتے ہیں۔

(۹) منکرینِ حق کے یہاں جو معاندانہ اقوال نقل کیے ہیں، اُن پر غور کرو۔ یہ گویا تمام منکرینِ رسالت کے وجوہِ انکار و اعراض کا خلاصہ ہے، اور سب کا مشترکہ و متفقہ مسلک۔ کیونکہ یہاں کسی خاص دعوت اور اس کے منکروں ہی کا ذکر نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اُن سب کا جنہوں نے حضرت نوح کے بعد اپنے اپنے وقتوں اور اپنے اپنے ملکوں میں دعوتِ وحی سے روگردانی کی۔ یہ انکار دو باتوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ ہماری طرح کا ایک آدمی جو ہماری ہی طرح کھاتا پیتا ہے، خدا کی سچائی کا پیامبر کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا اور عذاب و ثواب کا پیش آنا نہایت ہی عجیب بات ہے۔ ایسی بات کیونکر مانی جا سکتی ہے۔

(۱۰) حضرت نوح کے بعد قومی نشت کے جس عہد کا ذکر کیا ہے، یہ غالباً قوم عاد و ثمود کا عہد تھا۔ کیونکہ دوسری جگہ انہیں قوم نوح کا جانشین کہا ہے۔ پھر ان کے بعد جن "قرون" کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے مقصود

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۝ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ

(٤٥) پھر (دیکھو) ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں اور آشکارا دلیلیں دیں، اور فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف بھیجا لیکن اُنہوں نے گھمنڈ کیا۔ (٤٦) وہ سرکشوں کا گروہ تھا۔

وہ (آپس میں) کہنے لگے "کیا ہم اپنے ہی طرح کے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ حالانکہ اُن کی قوم ہمارے آگے جھکی ہوئی اور ہماری پرستار ہے؟" (٤٧)

پس اُنہوں نے موسیٰ اور ہارون کو جھٹلایا، نتیجہ یہ نکلا کہ ہلاک ہو جانے والوں میں سے ہوئے! (٤٨)

اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم نے (اس واقعہ کے بعد) موسیٰ کو الکتاب (یعنے تورات) دی تھی تاکہ لوگ ہدایت پائیں۔ (٤٩)

اور (اسی طرح) ابن مریم (یعنے مسیح) اور اُس کی ماں کو (اپنی سچائی کی) ایک بڑی نشانی بنایا، اور اُنہیں ایک مُرتفع مقام میں پناہ دی جو بسنے کے قابل اور شاداب تھی۔ (٥٠)

"اے گروہ پیغمبراں! پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو۔ جیسے کچھ تمہارے اعمال ہوتے ہیں، مجھ کو پوشیدہ نہیں۔ (٥١) اور دیکھو، یہ تمہاری اُمت دراصل ایک ہی اُمت ہے اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں۔ پس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرو۔" (ان تمام پیغمبروں کے ذریعہ جو تعلیم دی گئی، وہ یہی تعلیم تھی) (٥٢)

لیکن لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کٹ کر الگ

وہ بے شمار قومیں ہیں جو حضرت موسیٰ کے ظہور سے پہلے گزری ہیں اور جن کی نسبت سورۂ ابراہیم کی آیت (٩) میں گزر چکا ہے کہ والذین من بعدھم لا یعلمھم الا اللہ۔

آیت (٤٤) سے معلوم ہوا کہ ان عہدوں میں بے شمار قومیں اُبھریں اور پامال ہوئیں، اور خدا کے رسولوں کا بھی بکثرت اور لگاتار ظہور رہا، کیونکہ فرمایا: ارسلنا رسلنا تترا۔ اور اتبعنا بعضھم بعضا۔ یکے بعد دیگرے، لگاتار رسول ظاہر ہوتے رہے، اور ایک کے بعد ایک قومیں اُبھرتی اور پاداشِ عمل میں پامال ہوتی رہیں۔

(١) آیت (٥٠) میں حضرت مسیح اور ان کی والدہ (علیہما السلام) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: واوینا ھما الی ربوۃ ذات قرار و معین۔ ہم نے انہیں ایک مرتفع مقام میں پناہ دی جو بسنے کی اچھی جگہ اور پانی کی فراوانی سے شاداب تھی۔

غالباً اس سے مقصود وادیٔ نیل کی بالائی سطح ہے یعنے مصر کا بالائی حصہ۔ اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش کے بعد "مریم کے شوہر یوسف نے ماں بیٹے کو ساتھ لیا اور فلسطین سے مصر چلا گیا" چنانچہ حضرت مسیح کا بچپن اور شباب وہیں گزرا۔ جب فلسطین واپس آئے، تو جوانی کی عمر تک پہنچ چکے تھے۔ غالباً ان کی زندگی کے اسی واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے۔

دریائے نیل کے پانی کی فراوانی، اور اس کے سالانہ سیلاب کی عجیب و غریب نوعیت سرزمین مصر کا ایک امتیازی وصف رہی ہے۔ اس کی آبادی و شادابی، یعنے اس کا ذات قرار و معین ہونا،

بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ○ فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ○ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا ۵۴-۵۳
نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ○ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ ۵۶-۵۵
مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا ۵۸-۵۷
يُشْرِكُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ ۶۰-۵۹
يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ○ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا ۶۱

ہوگئے اور اپنا دین الگ الگ کرلیا۔ اب جو جس کے پلّے پڑگیا ہے، اُسی میں مگن ہے!

پس (اے پیغمبر!) ان منکروں کو ان کی غفلت و سرشاری میں پڑا رہنے دے۔ ایک مقررہ وقت تک (یہ اسی حالت میں رہینگے۔ پھر حقیقتِ حال کا فیصلہ ہوجائیگا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے)

کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں، ہم مال اور اولاد (کی فراوانی) سے اس لیے ان کی امداد کررہے ہیں کہ بھلائی پہنچانے میں سرگرمی دکھائیں؟ نہیں، (حقیقتِ حال دوسری ہی ہے، مگر) وہ شعور نہیں رکھتے!

جو لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، جو اپنے پروردگار کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں، جو اپنے پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے، جو (اس کی راہ میں) جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلاتامل دیتے ہیں، اور (پھر بھی) ان کے دل ترساں رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور لوٹنا ہے، تو بلاشبہ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لیے تیزگام ہیں، اور یہی ہیں جو اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں!

اور ہم کسی جان پر ذمہ داری نہیں ڈالتے مگر اتنی ہی جتنی کی اس میں طاقت ہے (یعنے استعداد ہے) ہمارے پاس (ان سب کی حالت و استعداد کے لیے

ضرب المثل کی طرح زبان زد ہوگیا تھا۔ چنانچہ عبرانی کی یہ قدیم مثل آج تک ملتی ہے کہ "فلاں ملک میں پانی کی اتنی فراوانی ہے جیسے مصر میں" چونکہ یہ مصر کا ایک امتیازی وصف ہوگیا تھا، اس لیے اسی وصف سے اُسے یاد کیا گیا۔ اس تعبیر میں یہ پہلو بھی پوشیدہ ہے کہ وہ فلسطین جیسا سرسبز ملک ترک کردینے پر مجبور ہوگئے، لیکن اللہ کے فضل نے ایسی جگہ پناہ دیدی جو فلسطین ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ذات قرار و معین تھی!

حضرت مریم اس سفر پر کیوں مجبور ہوئیں؟ اناجیل میں اس کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہیرودس حاکم شام کے ظلم و تشدد سے۔ اُسے نجومیوں نے پیدائش مسیح کی خبر دیدی تھی اور وہ چاہتا تھا، انہیں قتل کردے۔ تب "فرشتہ نے یوسف کو خواب میں حکم دیا۔ اُٹھ، اور بچے اور اسکی ماں کو ساتھ لے کر مصر بھاگ جا" (متی ۲: ۱۳) لیکن قرآن نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔

(۱۲) آیت (۵۱) میں وحدتِ دین و اُمت کی وہی اصلِ عظیم بیان کی گئی ہے جو پچھلی سورتوں میں جا بجا گزر چکی ہے اور ابھی ابھی سورۂ انبیاء میں پڑھ چکے ہو۔ فرمایا۔ ان تمام رسولوں پر جو ان بے شمار قوموں میں آتے رہے، جو تعلیم نازل کی گئی تھی، وہ کیا تھی؟ یہی، کہ اچھی چیزیں کھاؤ، نیک عملی کی زندگی بسر کرو۔ الگ الگ نہ ہو۔ تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہاری اُمت بھی ایک ہی اُمت ہے۔ یہی سچائی کی سیدھی راہ ہے۔

لیکن لوگوں نے وحدت کی جگہ تفرقہ کی، اور جمعیت کی جگہ تشتت و تحزب کی راہ اختیار کی۔ اب جو جس کے پلّے پڑگیا ہے، اسی میں مگن ہے!

غور کرو۔ آیت (۵۳) میں کل حزب فرمایا۔ کل امۃ نہیں کہا۔ کیونکہ قرآن کے نزدیک نوعِ انسانی کی اُمت ایک ہی ہے۔ ایک سے دو نہیں ہوسکتیں۔ یہ تفرقہ جو لوگوں نے گمراہ ہوکر پیدا کرلیے ہیں حزب

كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ (۶۲)
هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ۝ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ (۶۳-۶۴)
مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ۝ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ (۶۵-۶۶)
سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ۝ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا (۶۷-۶۸)
رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ

نوشتہ ہے جو ٹھیک ٹھیک (حقیقتِ حال کے مطابق) حکم لگا دیتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ کسی جان کے ساتھ نا انصافی ہو! (۶۲)

لیکن (اصل یہ ہے کہ) ان لوگوں کے دل اس حقیقت کی طرف سے غفلت و سرشاری میں پڑ گئے، ان کے اور بھی اعمال (بد) ہیں جو ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ کرتے رہینگے۔ یہاں تک (کہ ظہور نتائج کی گھڑی سامنے آجائے) جب ہم ان کے خوش حال آدمیوں کو عذاب میں پکڑ لینگے، تو پھر اچانک دیکھوگے کہ (سرکشی کی جگہ) آہ و زاری کر رہے ہیں! (۶۳-۶۴)

"اب آج آہ و زاری نہ کرو (اس سے کیا فائدہ؟) تم ہماری طرف سے مدد پانے والے نہیں!" (۶۵)

"ایک وقت تھا کہ ہماری آیتیں تمہارے آگے پڑھی جاتی تھیں اور تم اُلٹے پاؤں بھاگنے لگتے تھے۔ تمہارے اندر اُن (کی سماعت) سے گھمنڈ پیدا ہو جاتا تھا۔ تم اپنی مجلسوں کی داستاں سرائیوں میں اُنہیں مشغلہ بناتے۔ تم اُن کے حق میں ہذیان بکتے تھے!" (۶۶-۶۷)

پھر (اُنہیں کیا ہو گیا ہے؟) کیا اُنہوں نے اِس بات پر (یعنے قرآن پر) غور نہیں کیا؟ یا اُن کے سامنے کوئی ایسی عجیب بات آگئی ہے جو اُن کے اگلے بزرگوں کے سامنے نہیں آئی تھی؟ یا یہ اپنے رسول کو پہچان نہ سکے، اس لیے (۶۸)

ہیں یعنے جتھے ہیں۔ اُمت نہیں۔

(۱۴۳) آیت (۵۴) میں خطاب پیغمبرِ اسلام سے ہے۔ فرمایا: شرارت کی طرح شقاوت کا مزاج بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہتا ہے۔ پس جس طرح پہلے ہوتا رہا ہے، اب بھی ہوگا، اور جو ماننے والے نہیں، وہ کبھی نہیں ماننے کے۔ پس انہیں ان کی حالت میں چھوڑ دو، اور اپنا کام کیے جاؤ۔

(۱۴۴) آیت (۵۵) سے (۶۱) تک قانونِ امہال کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی تشریح سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ نیز پچھلی سورتوں کی تشریحات میں بھی۔ فرمایا: یہاں مہلت سب کے لیے ہے، اچھوں کے لیے بھی، مجرموں کے لیے بھی۔ پس اگر مفسدوں کو دنیوی زندگی کی خوش حالیاں مل رہی ہیں، تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہمارا قانونِ مجازات معطل ہو گیا ہے، اور ہم چاہتے ہیں، بدعملیوں پر بھی انہیں فوائد سے بہرہ اندوز کریں۔ بلکہ محض اس لیے کہ مقررہ وقت ابھی آیا نہیں اور یہاں ہر چیز کے لیے ایک اجلِ مسمّٰی کا قانون کام کر رہا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: خیرات و برکات کے حصول کی اصلی راہ تو اُن لوگوں کی ہے جنہوں نے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کی۔ انکی کامرانیاں کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ان کی بھلائیاں عارضی اور مؤجّل نہیں۔ وہ اس لیے بلند نہیں ہوتے کہ زیادہ بلندی سے گریں بلکہ اس لیے کہ اور زیادہ بلند ہوں۔

(۱۵۱) آیت (۶۲) میں فطرتِ کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت چند لفظوں کے اندر بیان کر دی ہے۔ فرمایا: یہاں فطرت کا قانون یہ کام کر رہا ہے کہ کسی جان پر اسکی جسمانی اور معنوی استطاعت کو زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی۔ ہر جان سے فطرت کا مطالبۂ عمل اتنا ہی ہے، جتنے کی اس میں استعداد ودیعت کر دی گئی ہے۔ یعنے فطرت نے ہر وجود کو استعداد دی ہے، اور اُس استعداد

مُنۡكِرُوۡنَ ۝ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلۡ جَآءَهُمۡ بِالۡحَـقِّ وَاَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَـقِّ كٰرِهُوۡنَ ۝ وَلَوِ اتَّبَعَ الۡحَـقُّ
اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ ؕ بَلۡ اَتَيۡنٰهُمۡ بِذِكۡرِهِمۡ فَهُمۡ عَنۡ ذِكۡرِهِمۡ
مُّعۡرِضُوۡنَ ۝ اَمۡ تَسۡـئَلُهُمۡ خَرۡجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيۡرٌ ۖ وَّهُوَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ۝ وَاِنَّكَ لَتَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوۡنَ ۝ وَلَوۡ رَحِمۡنٰهُمۡ وَ
كَشَفۡنَا مَا بِهِمۡ مِّنۡ ضُرٍّ لَّـلَجُّوۡا فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝ وَلَقَدۡ اَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡعَذَابِ

منکر ہوگئے؟ یا یہ کہتے ہیں، اسے جنون ہوگیا؟

نہیں، (ان میں سے کوئی بات نہیں ہوسکتی) اللہ کا رسول ان کے پاس سچائی کے ساتھ آیا، مگر ان میں سے اکثروں کا یہ حال ہوگیا ہے کہ سچائی کا ماننا انہیں گوارا ہی نہیں ہے!

اور اگر ایسا ہوتا کہ سچائی ان کی خواہشوں کی پیروی کرتی، تو یقیناً آسمان و زمین اور وہ سب جو ان میں ہے یک قلم درہم برہم ہوجاتا۔ ہم نے اُن کے لیے اُن کی نصیحت کی بات مہیا کردی، تو یہ اپنی نصیحت کی بات سے گردن پھیرے ہوئے ہیں!

(اے پیغمبر!) کیا وہ سمجھتے ہیں، تو اُن سے مال و دولت کا طالب ہے؟ تیرے لیے تو تیرے پروردگار کا دیا مال ہی بہتر ہے (تو ان سے کیوں طالب زر ہونے لگا؟)

وہی سب سے بہتر روزی دینے والا ہے!

بلاشبہ، یقیناً، تو انہیں (کامیابی و سعادت کی) سیدھی راہ کی طرف بلا رہا ہے، اور جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، وہ یقیناً راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں!

اور اگر ہم ان پر (مزید) رحم کریں، اور جو کچھ انہیں دکھ پہنچ رہے ہیں، دور کردیں، تو کیا یہ شکر گزار ہونگے؟ نہیں! یہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے اور زیادہ بڑھ چلینگے!

اور (دیکھو) ہم نے انہیں عذاب میں مبتلا بھی کیا،

کے جاسکیں عمل چاہتی ہے، لیکن عمل کا یہ تقاضہ ٹھیک ٹھیک اتنا ہی ہوتا ہے جتنے کی استعداد اُسے دیدی گئی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی کو استعدادِ عمل تو چھٹانک بھر دی ہو، اور مطالبۂ عمل کا بوجھ اس پر سیر بھر کا ڈال دیا جائے۔

یہ مطالبۂ عمل کس بات میں ہوتا ہے؟ فرائضِ ہستی کی انجام دہی میں۔ ہر وجود کو اپنی بقا و تکمیل کے لیے جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جتنی کچھ اور جیسی کچھ جد و جہد کرنی پڑتی ہے، ٹھیک اتنی ہی اور اُسی کیفیت کی استعداد بھی اُسے دیدی گئی ہے۔ ادائے فرض کا مطالبہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنی اس کی طاقت و گنجائش ہے۔ اگر استعداد اور مطالبۂ عمل میں یہ تطابق کلی نہ ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ کوئی جان یہاں زندہ رہ سکتی۔

قرآن کہتا ہے جب اللہ کا یہ قانون ہر جان کے لیے ہے تو ضروری ہے کہ انسان کے لیے بھی ہو۔ اور جس طرح عالم جسم و صورت میں جاری ہے، ضروری ہے کہ روح و معنی میں بھی ہو۔ پس سعادت روحانی کے لیے بھی جو مطالبۂ عمل ہے، وہ ٹھیک ٹھیک انسان کی استعدادِ عمل کے مطابق ہے۔ اور یہاں عالم جسم و روح، دونوں کے لیے اُس کا قانون ایک ہی ہے۔

یاد رہے کہ اس آیت میں "تکلیف" کو صرف تکلیف شرعی پر لیجانا صحیح نہیں ہوسکتا۔ یہاں "تکلیف" عام معنوں میں بولا گیا ہے، اور اس میں ہر طرح کی تکلیف آگئی ہے۔ تکلیف کے لیے ہمیں کوئی موزوں لفظ نہیں ملا۔ اس لیے مجبوراً ہم نے "ذمہ داری" کی ترکیب اختیار کی یعنی اُردو ترکیب ہے لیکن ادائے مفہوم کے لیے نسبۃً بہتر اور جامع ہے۔

(۲۴) آیت (۶۴) میں فرمایا، حتیٰ اذا اخذنا مترفیہم بالعذاب جب ان میں سے خوش حال اور دولت مند لوگوں کو ہم نے مواخذہ میں پکڑا۔ نیز جا بجا ان لوگوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے جو قوم کے دولت مند طبقہ میں سے ہوتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیۃ (۱۶) میں گذر چکا ہے، امرنا مترفیہا ففسقوا فیہا فحق علیہا

فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ○ حَتّٰى إِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيدٍ إِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ○ وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ○ وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○ وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ○ قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ○ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا

٧٦-٧٧، ٧٨، ٧٩، ٨٠-٨١، ٨٢ — ع

القول۔ اس سے معلوم ہوا، انفرادی زندگی میں بدعملی کا بڑا مرکز دنیوی خوش حالی کی زندگی ہو جاتی ہے، اور ہمیشہ حق و صداقت کی مخالفت وہیں سے شروع ہوتی ہے

سبب اس کا ظاہر ہے۔ خوش حالی و ثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو، تو اس سے بڑھ کر کوئی برکت نہیں، اور اگر صرف چند افراد میں سمٹی ہوئی ہو، تو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ کیونکہ جب دولت صرف چند افراد ہی کے قبضہ میں آگئی، باقی افرادِ جماعت محروم رہ گئے، تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ و تسلط چند افراد کے ہاتھ آجائیگا۔ اور ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرورِ باطل اور استکبار عن الحق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس جماعتی خوش حالی کو اللہ کا سب سے بڑا فضل قرار دیتا ہے، اسی کو انفرادی حالت میں فتنہ اور متاعِ غرور بھی کہتا ہے۔ چونکہ ہمارے مفسروں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی۔ اس لیے یہ مقام واضح نہ ہو سکا۔ آج تمام دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ انفرادی سرمایہ داری دنیا کے لیے مصیبت ہے۔ لیکن قرآن تیرہ سو برس پہلے اُسے فتنہ قرار دے چکا، اور اس کے لیے "اکتناز" کا لفظ بول چکا ہے۔ الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا (٩: ٣٤) مشکل یہ ہے کہ جب تک قرآن کی صدا صرف قرآن کی صدا ہے، تمہاری نظر میں جچتی نہیں۔ جب وہی بات وقت کے ذہن و فکر کے حلقوں سے اُٹھنے لگتی ہے، تو تم فوراً اُس کی پرستش شروع کر دیتے ہو!

اس پر بھی وہ اپنے پروردگار کے آگے نہ جھکے۔ اور نہ ہی عاجزی کی! ٧٦

پھر جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائیگا کہ ہم ان پر ایک بڑے ہی سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں، تو اُس وقت اچانک متحیر ہو کر رہ جائینگے! ٧٧

اور (دیکھو) وہی ہے جس نے تمہارے (سُننے کے لیے) کان (دیکھنے کے لیے) آنکھ (سوچنے کے لیے) دل[1] پیدا کر دیئے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم شکر بجا لاؤ! ٧٨

اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین کی سطح پر ہر طرف پھیلا دیا ہے (اور گزران و معیشت کے مختلف سامان پیدا کر دیئے ہیں) اور پھر وہی ہے جس کے حضور اکٹھا کر کے لائے جاؤ گے! ٧٩

اور وہی ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے۔ اُسی کی کارفرمائی ہے کہ رات دن ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ ٨٠

نہیں، اُنھوں نے تو ویسی ہی بات کی جیسی ان سے پہلے کہہ چکے ہیں۔ ٨١ اُنھوں نے کہا "جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیوں کا چورہ ہو گئے، تو پھر کیا ہم (دوبارہ) اُٹھائے جائینگے! ہم سے اور ہم سے پہلے ہمارے ٨٢

[1] یاد رہے کہ عربی میں "قلب" اور "فؤاد" کا اطلاق صرف اُس عضو ہی پر نہیں ہوتا جو علم تشریح کا دل ہے۔ بلکہ قوت مدرکہ و عاقلہ پر بھی ہوتا ہے۔ یعنے ذہن و عقل پر۔

هٰذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هٰذَآ إِلَّآ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ○ قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَآ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ○ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ○ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ ○ بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ○

باپ دادوں سے ایسی ہی بات کا وعدہ ہوتا آیا ہے۔ کچھ نہیں پچھلے عہدوں کے افسانے ہیں"

(اے پیغمبر!) ان منکروں سے کہہ دے "اچھا، اگر تم جانتے ہو، تو بتلاؤ، زمین اور وہ تمام مخلوقات جو اس میں ہیں کس کے لیے ہیں؟"

وہ فوراً کہینگے "اللہ کے لیے"

تو کہہ "پھر کیا ہے کہ تم غور نہیں کرتے؟"

تو اُن سے پوچھ "وہ کون ہے جو ساتوں آسمانوں کا پروردگار ہے؟ اور (جانداری کے) عرشِ عظیم کا مالک ہے؟"

وہ فوراً کہینگے "یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے"

تو کہہ "پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ (شرک و انکار کے نتیجہ سے) ڈرتے نہیں!"

تو ان سے پوچھ "اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ، وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمام چیزوں کی پادشاہی ہے! اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے، اور کوئی نہیں جو اُس سے اوپر پناہ دینے والا ہو؟"

وہ فوراً کہینگے "یہ صفتیں تو اللہ ہی کے لیے ہیں"

تو کہہ "پھر یہ کیا ہے کہ تمہاری عقل ماری گئی؟"

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے سچائی اُنہیں جتلادی، اور یہ اپنے (انکار و ادعا میں) قطعاً جھوٹے ہیں!

(۱۷) آیت (۶۸): پر غور کرو۔ کس طرح قرآن بار بار اس پہلو پر زور دیتا ہے کہ کیا لوگوں نے اس پر تدبر نہیں کیا؟ کیونکہ اُس کا سارا مطالبہ تدبر و تعقل ہی سے ہے۔ وہ کہتا ہے، سچائی کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ عقل و بصیرت اُسے پالیگی، اور جہل و کوری اس سے روگرداں رہیگی۔ پس اگر لوگ قرآن میں تدبر و تفکر کریں، تو ممکن نہیں کہ اس کی سچائی انہیں گرویدہ نہ کرلے۔

یہاں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ قرآن کا مطالبہ غور و فکر کا ہے۔ نہ کہ تقلید کا۔ پس جو شخص قرآن کے مطالب میں غور و فکر نہیں کرتا، وہ اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتا۔ اور پھر جب قرآن کے لیے کہ وحی الٰہی ہے، تدبر ضروری ہوا، تو کیونکر یہ بات جائز ہوسکتی ہے کہ کسی مجتہد اور امام کی تحقیقات میں تدبر ضروری نہ ہو؟ اور اہل علم کے لیے ضروری ہو کہ ازروئے تقلید سر اطاعت خم کردیں؟

(۱۸) یہاں تین باتیں فرمائیں۔ کیا اُنہوں نے قرآن پر غور نہیں کیا؟ اگر غور کرتے تو یقیناً حقیقت پالیتے۔ کیا اُنہیں رسول کی معرفت نہیں؟ اگر ضد اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیں، تو اس کی پاکی و صداقت کی معرفت سے کبھی انکار نہیں کرسکتے۔ پھر کیا یہ سمجھتے ہیں، یہ مجنون ہوگیا ہے کہ ایسی باتیں کرنے لگا ہے؟ لیکن کیا راست بازی کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ سچ مچ کو وہ مجنون ہے؟

یہاں سے معلوم ہوا کہ دعوتِ اسلام کی معرفت کی دو راہیں ہیں۔ قرآن میں تدبر کیا جائے، اور صاحب قرآن کی زندگی میں۔

(۱۹) آیت (۱۰) میں ایک بہت بڑی اصل کائنات کی طرف اشارہ کیا ہے جو قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے۔ یعنی قرآن جس حقیقت کو "حق" سے تعبیر کرتا ہے، وہ محض کسی ایک گوشہ ہی کی حقیقت نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ بلکہ اصل کائنات کی ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ وہ کہتا ہے، یہاں اصل تخلیق و تکوین حق

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (۹۱) عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (۹۲) ع قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۝ (۹۳) رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۹۴) وَاِنَّا عَلٰٓي اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝ (۹۵) اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ (۹۶) وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ (۹۷) وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝ (۹۸) حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ (۹۹) لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا

اور قیامِ حق کا قانون ہے۔ اسی کا نام عدل و قسط بھی ہے۔ اور اسی پر تمام نظامِ کائنات قائم ہے۔ عالمِ جسم و مادہ کا ایک ایک گوشہ دیکھو تمہیں ہر گوشہ میں وجود، تکوین، تعمیر، ایجاب، زندگی، بناؤ کی اصل یہی حقیقت ملیگی۔ یہی حقیقت جب افکار و اعمالِ انسانی میں ظاہر ہوتی ہے، تو اس کا نام ایمان اور عملِ صالح ہو جاتا ہے، اور یہی حقیقت ہے جس کی طرف ہدایتِ وحی بلاتی ہے۔

یہاں فرمایا۔ اگر حقیقت ان منکرینِ حق کی خواہشوں کی پیروی کرے، تو تمام نظامِ ارضی و سماوی درہم برہم ہو جائے، کیونکہ انہیں معلوم نہیں جس حقیقت سے یہ انکار کر رہے ہیں، وہی حقیقت ہے جس پر یہ تمام کارخانۂ ہستی چل رہا ہے۔

یہ مقام بہت دقیق ہے تشریح کے لیے تفسیرِ فاتحہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

نہ تو اللہ نے کسی ہستی کو اپنا بیٹا بنایا۔ نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ہو سکتا ہے۔ اگر ہوتا، تو ہر معبود اپنی ہی مخلوق کی فکر میں رہتا، اور ایک معبود دوسرے معبود پر چڑھ دوڑتا۔ اللہ کی ذات اُن باتوں سے پاک ہے جو یہ اُس کی نسبت بیان کرتے ہیں! (۹۱)

وہ غیب اور شہادت، دونوں کا جاننے والا ہے (یعنے محسوسات اور غیر محسوسات، سب کا جاننے والا ہے، اُس کے لیے کوئی چیز غیر محسوس نہیں) اُنہوں نے جو کچھ شرک کی باتیں بنا رکھی ہیں، وہ ان سب سے بالاتر ہے! (۹۲)

(اے پیغمبر!) تو کہہ "خدایا! جن باتوں کا تو نے وعدہ کیا ہے، اگر ان کا ظہور میرے سامنے ہونے والا ہے، (۹۳) تو خدایا، مجھے اُس گروہ میں نہ رکھیو جو ظالم گروہ ہے!" (۹۴)

اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ جن جن باتوں کا ان سے وعدہ کیا ہے، اُنہیں (تیری زندگی ہی میں ظاہر کرکے، تجھے دکھا دیں۔ (۹۵)

(اے پیغمبر!) بُرائی کو بُرائی سے نہیں، بلکہ ایسے طرزِ عمل کے ذریعہ دور کرو جو بہتر طرزِ عمل ہو (یعنے عفو و درگزر کرکے) ہم اُن باتوں سے بے خبر نہیں جو یہ تیری نسبت کہتے رہتے ہیں۔ (۹۶) تیری دعا (ہمارے حضور یہ) ہو کہ "خدایا! میں شیطانی وسوسوں سے تیرے دامن میں پناہ لیتا ہوں۔ میں اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں!" (۹۷-۹۸)

ان منکروں کا حال ایسا ہی رہیگا۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سرہانے موت آکھڑی ہوگی، تو اس وقت کہنے لگیگا "خدایا! مجھے پھر (دنیوی زندگی میں) لوٹا دے کہ زندگی کے جو موقعے میں نے کھو دیے، شاید (اس (۹۹)

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ○
فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ فِىْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ○ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ○ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِىْ تُتْلٰى
عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ○ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ○ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا

(۳۰) آیت (۸۰) کے چند لفظوں کے اندر قرآن کا ایک بہت بڑا استدلال پوشیدہ ہے۔ جلد نہ گزر جاؤ، اس پر غور کرلو۔ فرمایا۔ وہی ہے جو جِلاتا ہے اور موت طاری کرتا ہے۔ اور یہ اُسی کی کارفرمائی ہے کہ رات دن کے پیچھے آتی رہتی ہے اور دن رات کے پیچھے۔

یہاں "اختلاف الیل و النہار" کہہ کر اس قانونِ ہستی کی طرف اشارہ کیا ہے جسے قرآن قانونِ ازواج سے تعبیر کرتا ہے۔ ہم نے اپنی مفروضہ مصطلحات میں اسے قانونِ تثنیہ کہا ہے۔ یعنی کارخانۂ ہستی کے ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں، یہاں کوئی حقیقت اکہری اور طاق نہیں ہے کسی نہ کسی شکل میں دُو دُو ہونے کی نوعیت ضرور پائی جاتی ہے۔ ہر چیز کی تکوین و تشکیل اسی طرح ہوگی کہ دو متماثل اور متقابل نوعیتیں ابھرینگی اور اسی تماثل و تقابل کا تثنیہ ایک مکمل حقیقت کی شکل اختیار کرلیگا۔ مثلاً نر کے لیے مادہ۔ مرد کے لیے عورت۔ زندگی کے لیے موت، رات کے لیے دن، صبح کے لیے شام، مثبت کے لیے منفی، تکوین کے لیے افساد۔ جس گوشہ میں بھی دیکھوگے، ہر حقیقت کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی ثنی بھی ضرور موجود ہے: ومن کل شیٔ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (۵۱: ۴۹)

قرآن کا استدلال یہ ہے کہ اگر کارخانۂ ہستی کے ہر گوشہ میں دُو دُو ہونے کی حقیقت کام کر رہی ہے، اور یہاں ہستی کی کوئی نمود بغیر اپنے ثنی اور زوج کے نہیں ہے۔ تو پھر تمہیں اس بات پر کیوں تعجب ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی نمود بھی اکہری نہیں ہے، دوہری ہے، اور دنیوی زندگی کے لیے بھی ایک ثنی ہے، اُس کا نام آخرت ہے؟ جس حقیقت کو تم سینکڑوں میں دیکھتے ہو اور پہچانتے رہتے ہو، اسی کو اکیسویں میں دیکھ کر کیوں چونک اٹھتے ہو! اسی لیے آیت کا خاتمہ اس پر ہوا کہ افلا تعقلون؟ کیونکہ اس معاملہ میں مطالبۂ تعقل سے تھا اور وہی مفقود ہوجاتی ہے۔

اب غور کرو۔ اس کے بعد کی آیت کس طرح اس آیت کے مربوط ہوگئی؟ اور اس کی ابتدا میں حرف "بل" کا آنا کس طرح ٹھیک اپنی جگہ میں بیٹھ گیا؟ بل قالوا مثل ما قال الاولون۔ قالوا ءاذا متنا

دفعہ) ان میں نیک کام کرسکوں"

حکم ہوگا "ہرگز نہیں۔ یہ محض ایک کہنے کی بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے۔ اب ایسا ہونے والا نہیں۔ ان لوگوں کے (مرنے کے) پیچھے ایک آڑ ہے جو اس دن تک رہیگی کہ (دوبارہ) اٹھائے جائیں"

پھر جب وہ گھڑی آجائیگی کہ نرسنگا پھونکا جائے (یعنی تمام انسانی ہستیوں کو دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونے اور اکٹھا ہو جانے کا حکم ہو) تو اس دن نہ تو اُن لوگوں کی باہمی رشتہ داریاں باقی رہینگی، نہ کوئی ایک دوسرے کی بات ہی پوچھیگا۔

اُس دن جن لوگوں (کے نیک عملوں) کا پلہ بھاری نکلا، بس وہی ہیں جو کامیاب ہونگے۔ اور جن کا پلہ ہلکا ہوا تو وہی ہیں جنہوں نے اپنے کو بربادی میں ڈال دیا۔ ہمیشہ جہنم میں رہنے والے!

آگ کے شعلوں کی لپٹ اُن کے چہروں کو جھلستی ہوگی۔ وہ اُن میں منہ بگاڑے پڑے ہونگے!

"کیا ایسا نہیں ہوچکا ہے کہ میری آیتیں تمہارے آگے پڑھی جاتی تھیں؟ اور تم انہیں جھٹلاتے رہتے تھے؟" (اُن سے یہ بات کہی جائیگی)

وہ کہینگے "اے ہمارے پروردگار! دراصل ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی۔ ہمارا گروہ گمراہوں کا گروہ تھا۔ اب ہمیں اس حالت سے نکال دے۔ اگر ہم پھر اسی گمراہی میں

مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ○ قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ○ إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي ۱۰۷-۱۰۸

يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ○ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ۱۰۹

ذِكْرِي وَكُنتُم مِّنْهُمْ تَضْحَكُونَ ○ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ○ قَالَ كَمْ ۱۱۰-۱۱۱

لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ○ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْأَلِ الْعَادِّينَ ○ قَالَ إِن ۱۱۲-۱۱۳

لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا ۱۱۴

تُرْجَعُونَ ○ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ○ وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا ۱۱۵-۱۱۶

بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ○ وَقُل رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ○ ۱۱۷-۱۱۸

وکنا ترابا وعظاما ء انا لمبعوثون ؟
مزید تشریح کے لیے دیکھو تفسیر فاتحہ بحث تسکین حیات۔

پڑیں تو بلاشبہ نافرمان ہوئے" ۱۰۷

اللہ فرمائیگا "جہنم میں جاؤ۔ اور زبان نہ کھولو" ۱۰۸

"ہمارے بندوں میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو کہتا تھا۔ خدایا! ہم ایمان لے آئے پس ہمیں بخشدے اور ہم پر رحم فرما۔ تجھ سے بہتر رحم کرنے والا کوئی نہیں! لیکن تم نے اُنہیں اپنے تمسخر کا مشغلہ بنالیا تھا۔ یہاں تک کہ اس مشغلہ نے ہماری یاد بھی بھلادی تھی تم ان لوگوں کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے۔ آج دیکھو ہم نے اُنہیں اُن کے صبر کا بدلہ دیدیا۔ وہی ہیں جو فیروزمند ہوئے!" ۱۰۹-۱۱۱

اُن سے کہا جائیگا "تمہیں خیال ہے۔ زمین میں کتنے برس تک رہے؟" ۱۱۲

وہ کہینگے "بس ایک دن یا ایک دن کا بھی کچھ حصہ (ہمیں ٹھیک وقت کا اندازہ نہیں) ان سے پوچھو جو گنتے رہے ہیں" ۱۱۳

اُن سے کہا جائیگا "ہاں تمہارا زمین میں رہنا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بہت ہی تھوڑے زمانہ کا رہنا۔ کاش تم نے یہ بات جانی ہوتی!" ۱۱۴

کیا تم خیال کرتے ہو، ہم نے تمہیں بیکار کو پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ ۱۱۵

اللہ کہ پادشاہ حقیقی ہے، ایسی بات کرنے سے پاک و بلند ہے۔ وہ، کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر اُسی کی ایک ذات، جہانداری کے تختِ عزت کا مالک! ۱۱۶

اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی دوسرے (من گھڑت) معبود کو پکارتا ہے، تو اس کے پاس اس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ اُس کے پروردگار کے حضور اُس کا حساب ہونا ہے۔ یقیناً کفر کرنے والے کبھی کامیابی نہیں پائینگے! ۱۱۷

اور (اے پیغمبر!) تو کہہ "خدایا! بخشدے، رحم فرما، تجھ سے بڑھ کر کوئی رحم کرنے والا نہیں!" ۱۱۸

سورت کا ترجمہ ختم ہو گیا۔ مگر چند مقامات کی تشریحات باقی رہ گئی ہیں:

تخلیق میں مراتب ستہ

قرآن حکیم نے اس سورت میں اور دوسرے مقامات میں انسانی پیدائش کے مختلف احوال و مراتب پر توجہ دلائی ہے اور ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور بعث بعد الموت کے وقوع پر استشہاد کیا ہے۔ یہ مراتب تطور چھ ہیں، جیسا کہ یہاں آیت (۱۳) میں بیان کیے گئے ہیں:

(ا) "نطفہ" کی حالت، جبکہ وہ "قرار مکین" میں ہوتا ہے۔

(ب) "علقہ" کی حالت۔

(ج) "مضغہ" کی حالت۔

(د) "خلقنا المضغۃ عظاماً" کی حالت۔

(ہ) "کسونا العظام لحماً"

(و) ایک ایسی آخری حالت جسے "خلقاً آخر" سے تعبیر کیا ہے۔

مفسرین کی سرگردانی

ان میں سے آخری حالت کو قرآن نے "خلقاً آخر" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس مرتبہ میں پہنچ کر کوئی ایسا انقلاب طاری ہو جاتا ہے کہ بالکل ایک دوسری ہی طرح کی خلقت ظہور میں آجاتی ہے۔ گویا مرتبۂ (الف) سے لے کر مرتبۂ (ہ) تک جنین کی جو حالتیں رہیں، اور جس نوعیت کی مخلوق بنتی رہی، وہ کوئی دوسری طرح کی چیز تھی، اور اب اس مرتبہ میں آکر بالکل ایک دوسری طرح کی چیز نمایاں ہو گئی چونکہ مراتب پیدائش کی کوئی ایسی انقلابی حالت ہمارے مفسروں کے سامنے نہ تھی، اس لیے قدرتی طور پر اس کی کوئی جچی تلی تفسیر ان کی سمجھ میں نہ آئی، اور مختلف وادیوں میں نکل گئے۔ بعضوں نے کہا۔ اس سے مقصود نفخ روح کی حالت ہے کیونکہ اس مرتبہ سے پہلے روح نہیں پھونکی جاتی، بعضوں نے کہا۔ یہ شکم مادر سے باہر نکلنے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وضع حمل اسی کے بعد ہوتا ہے۔ بعضوں نے کہا مقصود بالوں کا پیدا ہونا ہے کیونکہ اس سے پہلے بال نہیں ہوتے۔ بعضوں نے کہا نہیں، مقصود دانت ہیں۔ دانت اسی مرتبہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ بعضوں نے جمع و تطبیق کی راہ اختیار کرنی چاہی تو کہا۔ دراصل مقصود تمام قویٰ کی تکمیل ہے۔ اس میں بال بھی آگئے، دانت بھی آگئے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی تفسیر بھی "خلقاً آخر" کا تقاضہ پورا نہیں کرتی۔ منطوق کے اعتبار سے بھی، اور مفہوم کے اعتبار سے بھی۔

اسی طرح پچھلے مراتب تطور کی بھی حقیقت واضح نہ ہو سکی۔ "علقہ" کو جمے ہوئے خون کے معنوں میں لے گئے، اور "مضغہ" کو گوشت بن جانے کے معنوں میں۔ اور ترتیب نشئہ یوں سمجھی گئی کہ پہلے خون پیدا ہوتا ہے اور وہ کلیجی کی طرح جما ہوا ہوتا ہے۔ پھر یہ منجمد خون گوشت بن جاتا ہے پھر اس گوشت میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھ جاتا ہے۔ اس چڑھنے کو "کسونا العظام" میں مجازاً "لحم" کہا ہے۔

مفسرین قدیم معذور تھے

لیکن اگر اس مقام کی شرح و تحقیق کا حق ادا نہ ہو سکا، تو اسے مفسروں کے قصور فہم پر محمول نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس باب میں وہ یقیناً معذور تھے۔ علم و تحقیق کا یہ گوشہ تمام تر زمانۂ حال کی پیداوار ہے، اور زمانۂ حال کی پیداوار میں بھی سب سے آخری عہد کی پیداوار۔ انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ جو تمام علوم حدیثہ کے انکشاف و تکمیل کا سب سے زیادہ شاندار زمانہ ہے، یوں ہی گزر گیا، اور کارخانۂ فطرت کے اس گوشۂ مستور کے تمام حجاب نہ اُٹھ سکے پس اگر اٹھارہویں صدی کے حکما معذور تصور کیے جا سکتے ہیں کہ اس بارے میں بالکل غلط رُخ پر جا رہے تھے، حالانکہ خوردبین ایجاد ہو چکی تھی، اور انسانی نعش کی تشریح کا باب مسدود کھل چکا تھا، تو ظاہر ہے، نویں اور دسویں صدی کے مفسر قرآن کیوں معذور تصور نہ کیے جائیں، جن کے سامنے اس سے زیادہ کچھ نہ تھا، جتنا ارسطو اپنی کتاب الحیوانات میں اور جالینوس اپنے مقالات میں لکھ چکا ہے؟

علم الجنین کی سرگزشت

دراصل پیدائش حیوانات کے بارے میں، گزشتہ دو ہزار سال تک، انسانی علم کی پرواز اسی حد تک رہی۔ علم و نظر کی تمام شاخوں کی طرح علم الجنین (Embryology) میں بھی ارسطو ہی کی تحقیقات پر تمام تر دار و مدار تھا۔ سترہویں صدی میں جب خوردبین کی ایجاد ایک خاص حد تک ترقی پذیر ہوئی، تو پرندوں کے انڈوں کا خوردبینی مطالعہ شروع ہوا، اور بہ تدریج ایک نئے نظریہ کی بنیاد پڑ گئی جو اُس وقت نظریۂ ارتقاء سے تعبیر کیا گیا تھا، لیکن اب "نمو و بروز" کے نظریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی Preformation theory۔ اس نظریہ کا ماحصل یہ تھا کہ اصلی پیدائش جنس اُناث کا بیضہ (Ovary) ہے۔ جنین پر تطورات کی کوئی نئی حالت طاری نہیں ہوتی بلکہ بیضہ میں جو کامل وجود موجود ہوتا ہے وہی کھلنے اور بڑھنے لگتا ہے۔ مثلاً انسان کے تخم حیات میں ایک کامل انسان

اپنے تمام خارجی، و داخلی اعضاء کے ساتھ موجود ہوتا ہے، لیکن اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین سے بھی اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کا اصل و شکل ذرۂ وجود کا بڑھ جانا، نطفہ کا انسان بن جانا ہے۔ ۱۶۷۷ء میں جب ایک ڈچ عالم خوردبینی لیون ہاک Leeuwenhoek نے جنسِ رجال کے مادۂ منویہ کے جراثیم کا انکشاف کیا، تو ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے بیضِ اُناث کی جگہ جراثیم منویہ کو اصل حیات قرار دیا۔ تاہم اس رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ جنین پر تطور کی نہیں بلکہ محض بروز و نمو کی حالت طاری ہوتی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط تک یہی رائے وقت کی مقبول و معتمد رائے رہی۔ یہاں تک کہ ۱۷۵۹ء میں ایک جرمن محقق فریڈرک ولف نے یہ پورا نظریہ غلط ٹھہرایا، اور تولید و تطور کے اصل پر زور دیا۔ پھر ۱۸۱۷ء میں پانڈر نے اور ۱۸۲۸ء میں بیر نے اسے مزید ترقی دی۔ اسکے بعد اسی رُخ پر قدم اٹھنا شروع ہو گئے۔ پھر جب ۱۸۵۹ء میں ڈارون کی کتاب "اصلیت انواع" شائع ہوئی، تو اس نے علم کے تمام گوشوں کی طرح اس گوشہ کے لیے بھی ایک نئی روشنی مہیا کر دی، اور بالآخر انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ارنسٹ ہیکل Ernst Haeckel کے ہاتھوں یہ تحقیقات تکمیل تک پہنچ گئی۔ اب علم الجنین کا ہر گوشہ نظریوں اور قیاسوں کے سہاروں سے بالکل بے پروا ہو گیا ہے، اور جو کچھ ہے، تمام تر استقراء و مشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ اب فلسفہ کی بحث و تعلیل کا محتاج نہیں۔ کیونکہ خود علم کی ایک حقیقت ہے۔

اس باب میں سب سے زیادہ معتمد خود ارنسٹ ہیکل کی دو کتابیں ہیں۔ نیچرل ہسٹری آف کریشن اور ایوولیوشن آف مین۔ اس بحث میں ہمارا اعتماد انہی پر ہے۔

جدید تحقیقات

قبل اس کے کہ قرآن کے بیان کردہ مراتب پر نظر ڈالی جائے، معلوم کر لینا چاہیے کہ انسانی وجود کی پیدائش، اور اُس کے جنین کے احوال و تطورات کے باب میں علم کے حقائق کیا ہیں؟ یہ بحث بتفصیل مقدمہ میں ملیگا۔ یہاں مختصر اشارات کرینگے:

تمام حیوانات کی طرح انسان کی پیدائش بھی ایک بیضہ سے ہوتی ہے جسے اصطلاح میں Ovum کہتے ہیں۔ یعنے خلیۂ تخم (خلیہ یعنے Cell)۔ یہ خلیۂ تخم جنسِ اُناث میں بھی پیدا ہوتا ہے اور جنسِ رجال میں بھی۔ فعل تلقیح اُس وقت واقع ہوتا ہے جب جنسِ رجال کے خلیاتِ تخم جنسِ اُناث کے بیضہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ خلیۂ تخم ایک بہت ہی دقیق ذرہ کا سا حجم رکھتا ہے۔ یعنے اُس کا قطر ایک انچ کا ایک سو بیسواں حصہ بلکہ اس سے بھی کم ہوتا ہے۔ یہی خلیہ زندگی اور وجود کا اصلی تخم ہے۔

نطفہ کے قرار پانے کے معنی یہ ہیں کہ جنسِ رجال کا خلیۂ تخم جنسِ اُناث کے بیض میں جگہ پا جائے۔ استقرار کے بعد جنین کا تطور شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں وہ محض خلیات کا ایک کروی مجموعہ ہوتا ہے۔ پھر ایک مجوف گیند کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے اطراف کی دیوار خلیات سے مرکب ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ خلیات ایک دوسرے سے بالکل ملجاتے ہیں، اور آہستہ آہستہ ان میں طولانیت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بالکل ایک نعل نما (Sole Shaped) صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اب ان میں ایک ایسی ہیکلی ہیئت پیدا ہو جاتی ہے جیسی مچھلی کی ہوتی ہے۔ پھر یہ ہیئت حیواناتِ قوازب[1] (Amphibia) کا سا ہیکل اختیار کر لیتی ہے اس کے بعد حیواناتِ لبونہ (Mammals) کا ہیکل نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن پہلے ادنیٰ درجہ کے حیواناتِ لبونہ کا۔ مثلاً ایسا جیسا آسٹریلیا کے خلد آبی (Duck bill) کا ہوتا ہے۔ یا اُن حیوانات کا جنھیں ذوات الکیس (Marsupials) کہتے ہیں۔ پھر اونچے درجہ کے حیوانات لبونہ کا۔ مثلاً گھوڑا، کتا، بیل۔ پھر یہ مرتبہ ترقی کرکے ایک ایسے ہیکل تک پہنچتا ہے، جو ٹھیک ٹھیک بندر کا سا ہوتا ہے۔ دُم بھی موجود ہوتی ہے۔ پھر اس میں تبدیلی شروع ہوتی ہے، اور بندر کے ترقی یافتہ اعلیٰ اقسام کا سا ہیکل نمایاں ہونے لگتا ہے یعنے گوریلا، شمپانزی، گیبون وغیرہ اقسام کا۔ اب اس کے بعد آخری مرتبۂ تطور آتا ہے، اور اچانک ایک انقلابی حالت طاری ہونے لگتی ہے۔ یعنے تمام حیوانی و بیمونی خصوصیات مفقود ہو جاتی ہیں، ایک نئی نوعیت کا ہیکل نمایاں ہو جاتا ہے، اور وجود انسانی اپنی ساری خصوصیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ اُبھر آتا ہے!

ابتداء کے تمام تطورات ایک مہینے کے اندر طاری ہو جاتے ہیں۔ آخری تطورات دوسرے مہینے کے اندر، اور پھر حمل کا تمام زمانہ جس قدر گزرتا ہے، صورتِ انسانی ہی کی تکمیل پر گزرتا ہے۔

قانون حیات کی عالمگیر وحدت

اس سلسلہ میں جو حقیقت سب سے زیادہ اہم نمایاں ہوئی ہے، اور جس نے علم و نظر کے بہت سے گوشوں میں انقلاب پیدا کر دیا،

---

[1] Amphibia کا لفظی ترجمہ ذوات الحیاتین ہے۔ یعنے ایسے جانور جو تری اور خشکی، دونوں طرح کے گردوپیش میں رہتے ہیں۔ ہم نے اس کے لیے قوازب کا لفظ اختیار کیا جو میجر جنرل امین معلوف صاحب معجم الحیوانات کے اختیارات میں سے ہے۔

وہ پیدائشِ حیات کے قانون کی عالمگیر وحدت ہے۔ نباتات سے لے کر وجودِ انسانی تک، اصل و بنیادِ حیات ایک ہی ہے جس سے طرح طرح کے امتیازی اختلافات پیدا ہوتے ہیں، ٹھیک ٹھیک اُنہی حدود کے اندر اور اُنہی ترتیبات سے، جو قانونِ نشو و ارتقا کی بنا پر ضروری ہیں۔ اس اعتبار سے اگر انسان کے جنین پر نظر ڈالی جائے، تو حسب ذیل مدارج اور ان کے احکام سامنے آئینگے:

مدارج نطفہ

(ا) پہلا درجہ وہ ہے جس میں خلیۂ تخم کی حالت ٹھیک ٹھیک ویسی ہی ہوتی ہے جیسی تمام نباتات اور حیوانات کی۔ گویا اس ابتدائی درجہ میں ایک انسان کا جنین بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ایک درخت کا، ایک مچھلی کا، ایک چارپائے کا، ایک پرند کا۔

یہ حالت نطفہ کی ابتدائی حالت ہوتی ہے۔

(ب) پھر خلیات کا کروی مجموعہ ایک دوسرے درجہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس درجہ میں پہلا امتیاز نمایاں ہوتا ہے۔ یعنے اب جنین نباتات کے دائرہ سے علیحدہ ہو کر صرف حیوانات کے دائرہ کی چیز بن جاتا ہے۔ ہم تمام حیوانات کا جنین ایسا ہی پاتے ہیں مگر نباتات کا نہیں۔

یہ حالت دو ہفتہ کے اندر طاری ہو جاتی ہے۔

(ج) تیسرے ہفتہ میں جنین دو گُنی طوالت پیدا کر لیتا ہے، اور نعل کی سی شکل بن جاتی ہے۔ نیز ایک نشان ظاہر ہو جاتا ہے جو آگے چل کر سر بننے والا ہوتا ہے۔ یہی نشان تین بنیادی حاسوں کی پہلی داغ بیل ہے۔

اس درجہ میں دوسرا امتیاز نمایاں ہوتا ہے۔ یعنے اب جنین حیوانات کے عام دائرہ سے نکل کر حیواناتِ لبونہ کے خاص دائرہ میں آجاتا ہے لیکن ادنیٰ درجہ کے دائرہ میں۔

(د) چوتھے ہفتہ میں سر کا نشان ایک غیر متشکل گنبد کی سی ہیئت پیدا کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر بھیجے کے چاروں خانے بھی نمایاں ہو جاتے ہیں، عنصری نالیاں بھی اُبھر آتی ہیں، دل کے چاروں حصے بھی وجود پذیر ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ ریڑھ کی ہڈی کا ڈھانچہ پوری طرح نشو و نما پانے لگتا ہے

اس درجہ میں پہنچ کر جنین اعلیٰ درجہ کے حیواناتِ لبونہ کی خصوصیات پیدا کر لیتا ہے۔ یعنے اب انسان کا جنین ایسا ہو جاتا ہے جیسا گھوڑے، بیل، کُتے وغیرہ شیر خوار جانوروں کا ہوتا ہے۔

اب حمل کا پہلا مہینہ ختم ہو گیا۔

(ہ) پانچویں ہفتہ سے صورت آرائی کا زیادہ مشخص دور شروع ہوتا ہے لیکن یہ بندر کے سے ہیکل کا ہوتا ہے۔ اس درجہ کے جنین کی تصویر بندر کے جنین کی تصویر کے ساتھ رکھی جائے تو دونوں میں کوئی نمایاں فرق دکھائی نہیں دیگا۔

(و) پھر یہ ہیکل بندر کی اونچی قسم کے ہیکلوں کی طرف بڑھتا ہے، اور گوریلا اور شمپانزی وغیرہ کے جنین کی سی ہیئت پیدا کرنے لگتا ہے۔

(ز) اس کے بعد ایک آخری انقلاب طاری ہوتا ہے، اور انسانی جسم و صورت کی خصوصیات یکایک اُبھرنے لگتی ہیں حتیٰ کہ بالکل ایک نئی قسم کا تناسب و اعتدال ظہور میں آجاتا ہے۔

دوسرے مہینے کے اختتام پر یہ درجہ پوری طرح صورت پذیر ہو جاتا ہے۔

(ح) اس کے بعد فطرت کی نقاشی زیادہ دقیق قسم کے امتیازات کا نوک پلک درست کرنے لگتی ہے۔ یعنے نوعِ انسانی کی مختلف وطنی، موسمی، نسلی، اور معنوی اختلافات اُبھرنے اور بننے لگتے ہیں۔ پھر جدی اور آبائی اثرات کی نمود شروع ہوتی ہے۔ اور ہر والدین کو اپنی قوم، اپنے ملک، اپنی نسل، اور اپنے ماحولی مؤثرات کا مولود میسر آجاتا ہے۔

یہ آخری انسانی دور، سب سے بڑا دور ہے۔ یعنے ابتدا کے دو مہینے چھوڑ کر، باقی تمام ایامِ حمل جن کی مدت چاہے سات مہینوں تک پہنچ جاتی ہے، اسی دور میں بسر ہوتے ہیں۔

قرآن کی تصریحات

اب ان تمام تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی تصریحات پر غور کرو، اور پچھلی تفاسیر پر بھی ایک نظر ڈال لو جس وقت تک علم جنین کے یہ تمام حقائق منکشف نہیں ہوئے تھے، قرآن کے بیان کردہ مدارجِ ستہ کی تشریح کس درجہ دشوار تھی؟ قدیم نظریوں کا ساتھ دینے کے لیے مفسروں کو کیسی کیسی توجیہیں ڈھونڈھنی پڑیں اور پھر بھی بات بنی نہیں! لیکن اب ان انکشافات کے بعد کس طرح سارا معاملہ صاف ہو گیا ہے؟ کس طرح دونوں بیان ٹھیک ٹھیک ایک دوسرے کے مطابق ہیں، اور ایک کے اجمال کی دوسرا تفصیل کر رہا ہے؟ کس طرح آج علم کی آنکھیں بھی وہی دیکھ رہی ہیں جو وحی کی زبان نے آشکارا کر دیا تھا!

یہ کی یہ صدا کس کی زبان سے نکلی تھی! ساتویں صدی عیسوی کے ایک اُمّی کی زبان سے جو ریگستان عرب کے بادیہ نشینوں میں پیدا ہوا اور جس کی ساری زندگی انہی بادیہ نشینوں میں بسر ہوئی تھی!

قرآن کا سترہویں صدی کے نظریہ سے انکار

سترہویں صدی میں خوردبینی مطالعہ سے جراثیم حیات کا انکشاف ہوا، لیکن حکماء جو اصل حقیقت پر مطلع نہ ہو سکے، اور مذہب ظہور و بروز کا نظریہ قائم کر لیا گیا۔ اب دیکھو، جس طرح قدیم قیاسات قرآن کا ساتھ نہیں دیتے تھے، اسی طرح یہ مذہب بھی ساتھ چلنے سے صاف انکار کر رہا تھا۔ قرآن جنین کے تمام تغیرات کو صاف صاف ایک انقلابی تطور قرار دے رہا ہے: ثم من نطفة، ثم من علقة، ثم من مضغة (٢٢: ٥) اور: ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة (٢٣: ١٤) یعنے تخلیق کی ایک حالت نطفہ کی ہوتی ہے پھر تخلیق کی دوسری حالت علقہ کی ہوتی ہے۔ پھر تخلیق کی تیسری حالت مضغہ کی ہوتی ہے۔ پس یہ محض کسی ایسے کیڑے کا نشوونما بروز نہیں ہو سکتا جس کے اندر وجود انسانی اپنے تمام اصول و جزئیات کے ساتھ موجود ہو، بلکہ ایک حالت کے بعد صریح دوسری حالت کی پیدائش اور دوسرے کے بعد تیسرے کی، اور تیسرے کے بعد چوتھے کی پیدائش ہے، اور ہر پیدائش تخلق و تطور کی نوعیت میں ظاہر ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ یکے بعد دیگرے طرح طرح کے تطورات طاری ہوں۔ ضروری ہے کہ ہر تطور ایک نئی پیدائش کا حکم رکھتا ہو۔

عہد مفسرین کی بے جا توجیہ قطع و برید

چونکہ انیسویں صدی کے اواخر تک یہی نظریہ "ظہور و بروز" عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، اور فن طب و تشریح نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا، اس لیے جس طرح قدیم مفسروں کو شرح و تحقیق آیات میں دشواریاں پیش آئیں اور طرح طرح کی توجیہات کرنی پڑیں، اسی طرح مصر و ہندوستان کے بعض نئے مفسروں کو بھی ٹھوکر لگی، اور رفاعہ بک طہطاوی، حسن پاشا محمود، سر سید احمد خاں، شیخ محمد عبدہ وغیرہم اسی نظریہ کی وادیوں میں گم ہو گئے۔ انہوں نے کوشش کی کہ قرآن کی تصریحات کو اس کے مطابق کر دکھائیں۔ مطابق ہو نہیں سکتی تھیں، اس لیے ہر طرح کا تجوز و تکلف جو لغت و زبان سے کیا جا سکتا ہے، جائز کر لیا گیا۔ اور نہیں سمجھے کہ یہ تمام قطع و برید چند سالوں کے بعد بیکار ہو جائیگی۔

قرآن اپنی جگہ سے نہیں ہلا مگر علم کو ہٹنا پڑا

لیکن قرآن کی تصریحات اپنی جگہ بدستور قائم رہیں۔ جس طرح قدیم جامہ اُن پر راست نہیں آیا تھا، اسی طرح نئے جامے سے بھی اُنہوں نے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ جمال حقیقت بے پردہ ہوا، اور نظریوں کی شب کوری کی جگہ انکشاف و مشاہدہ کی صبح نمودار ہو گئی۔ اب ہر نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ قرآن کو اپنی جگہ سے ہلنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ علم کا نقص تھا کہ صحیح جگہ نہ پا سکا۔ آخر اُسے اپنی جگہ چھوڑنی پڑی، اور وہیں آگیا جہاں تیرہ صدیوں سے قرآن کی صداقت بھی کھڑی ہے! لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه، تنزیل من حکیم حمید!

تم علم کی ایک ذرا سی نمود دیکھ کر مرعوب ہو جاتے ہو، اور چاہتے ہو، قرآن کو فوراً اس کی جگہ سے ہٹا دو۔ لیکن اگر تم جلدی نہ کرو، تو قرآن کو ہلنے کی ضرورت کبھی نہ ہوگی۔ جلد یا بدیر علم اپنی جگہ چھوڑ دیگا، اور آگے بڑھ کر قرآن کی تصدیق کریگا!

اب غور کرو۔ علم کی روشنی میں کس طرح قرآن کی تمام تصریحات واضح ہو رہی ہیں، بغیر اس کے کہ لغت و زبان کے قدرتی مقتضیات سے رائی برابر بھی انحراف کیا جائے؟

قرآن کے مدارج رشتہ

(١) سب سے پہلے جعلناه نطفة فی قرار مکین پر غور کرو۔ استقرار حمل یوں ہوتا ہے کہ جنس رجال کا جنسی خلیہ جنس اُناث کے بیض میں پہنچتا ہے، اور اس طرح ٹک جاتا ہے گویا اپنے اصلی مکان میں پہنچ گیا۔ اس صورت حال کے لیے فی قرار مکین کی ترکیب کس درجہ صحیح اور وافق ہے؟ دو لفظوں کے اندر پوری وضاحت کے ساتھ دونوں حالتیں آگئیں۔ اُس کا ٹھہر جانا، اور تمکن کے ساتھ قرار پا جانا۔ یہ استقرار و تمکن کس طرح پیدا ہوا؟ دونوں جنسوں کے خلیوں کے اتحاد سے۔ اس اتحاد و امتزاج کی ان میں قدرتی طلب تھی بغیر اس کے قرار نہیں پا سکتے تھے۔

اس وقت تک ہم نے اس کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ نطفہ رحم میں قرار پا جاتا ہے، لیکن فی الحقیقت بات پوری طرح جمتی نہ تھی۔ رحم تو ایک طرح کا مجوف خول ہے۔ اس میں ایک ذرۂ تخم کا پڑ جانا فی قرار مکین سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تعبیر کہہ رہی ہے کہ کوئی نطفہ ہی کی کا دقیق محل ہونا چاہیے جہاں وہ پہنچ کر اس طرح ٹک جائے، جیسے ٹھیک اپنے حجم اور اپنی نوعیت کے مطابق ایک جگہ اُسے مل گئی یقیناً اس سے مقصود بیض کا خلیہ ہے۔ نہ کہ پورا عضو رحم۔

(٢) اس کے بعد "نطفہ" پر مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں، لیکن سب سے پہلی انقلابی حالت کون سی ہوتی ہے جو بالکل ایک نئی قسم کی

نوعیت پیدا کر دیتی ہو اور جو تمام آئندہ انقلابوں کے لیے سنگ بنیاد کا کام دیتی ہے! وہ حالت جب خلیات کا کروی ابھار چاک ہو کر [illegible] بننے لگتا ہے، اور پھر اس طرح کی نئی چیز بن جاتا ہے جس کے دونوں سرے کسی قدر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ پروفیسر ہیکل نے اس کی ابتدائی حالت کو Sole-Shaped سے اور پختہ حالت کو Sandal-Shaped سے تعبیر کیا ہے۔ اور ہم نے اس کے صورت "نعل نما" حالت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اسی مرتبۂ تحول کو قرآن نے "علقہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ "علق" کی تعبیر اس مرتبہ کے لیے ہو اتنی صاف اور چسپاں تعبیر ہے کہ جونہی میری پہلی نظر اس نعل نما جنین کی تصویر پر پڑی تھی، میری زبان سے بے اختیار خلق الانسان من علق نکل گیا تھا!

جونک کے لیے علوق، سلوقہ، عولق، علقہ سامی زبانوں کی نہایت قدیم تعبیر ہے۔ عبرانی میں اسے علوقہ کہتے تھے اور بجنسہٖ عربی میں ملتا ہے۔ چنانچہ امثال میں ایک جگہ آیا ہے "جونک کی دو بیٹیاں ہیں جو چلاتی رہتی ہیں کہ لا لا، لا لا" (۳۰ : ۱۵) عبرانی نسخہ میں یہاں جونک کے لیے علوقہ کا لفظ ہے۔ یہی علوقہ عربی میں علق اور علقہ ہے۔ اور جونک کے لیے مستعمل ہے۔ اب جونک کی حالت اور صورت کا معائنہ کرو۔ اس میں ہڈی نہیں ہوتی۔ محض ایک لوتھڑے کی نمایاں ہوتی ہے، اور خون پی کر جب سیراب ہو جاتی ہے، تو ٹھیک ٹھیک ویسی ہی صورت ہو جاتی ہے جیسی اس مرتبۂ جنین کی تصویر میں نظر آتی ہے۔

"علقہ" کی تعبیر

ہیکل نے اس حالت کو محض اس کی جزئی مشابہت کی بنا پر "نعل نما صورت" سے تشبیہ دی، لیکن قرآن نے "علقہ" سے دی جو خود سلسلۂ حیوانات کی ایک خاص زندہ کڑی ہے، اور اس طرح عجب نہیں کہ ایک دوسری مخفی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہو۔

پیدائش انسانی کے مختلف مدارج کی جو تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں، اُن سے تمہیں پتہ لگ گیا ہوگا کہ قانون نشو و ارتقاء کے مختلف مدارج کس طرح نطفۂ انسانی کے مدارج میں جمع ہو گئے ہیں، اور کس طرح ہر انسان کا جنین اب بھی ان مدارج سے گزر کر انسان بنتا ہے جن مدارج سے گزر کر انسان اپنے موجودہ مرتبۂ خلقت تک پہنچا ہے۔ اچھا اب غور کرو، ان مدارج خلقت میں ابتدائی مخلوقات کا درجہ کونسا ہے؟ آبی مخلوقات کا، یعنی حکم وجعلنا من الماء کل شیء حی زندگی کا سب سے پہلا ظہور پانی میں ہوا۔ اور پہلی مخلوقات، آبی مخلوقات ہوئی۔ انکے بعد خشکی کی مخلوقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اچھا، آبی مخلوقات میں ابتدائی مراتب کی مخلوقات کونسی ہیں؟ جونک کی قسم کی غیر عظمی مخلوقات انہی کے ارتقاء سے تمام اونچی قسم کی آبی کڑیاں وجود پذیر ہوئیں پس اگر حیوانی نطفہ اپنے تمام ارتقائی تطورات سے گزر کر کسی درجہ تک پہنچا کرتا ہے، تو کیا ضروری نہیں کہ اس کا ابتدائی درجہ آبی مخلوقات کی حالت کے درجہ کا ہو؟ اور اس میں بھی سب سے پہلے جونک کی قسم کی نوعیت اپنی نمود دکھائے؟ یقیناً ضروری ہے، اور یقیناً یہی ہے جو اس نعل نما صورت کے درجہ میں نمایاں ہوتی ہے۔ پس اسے "علقہ" سے تعبیر کرنا، گویا اسکے درجۂ خلقت کو ٹھیک ٹھیک اسکے اصلی نام سے پکار دینا ہے۔

(۳) اس کے بعد تیسرا انقلابی تطور وہ ہے، جب یہ نعل نما چیز اور زیادہ بڑھتی ہے اور اس کے مادہ میں گوشت کی صلابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی حالت کو قرآن نے "مضغہ" سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اب جنین بوٹی کی طرح بن جاتا ہے، اور چونکہ یہی مرتبہ ہے جس میں ارتسام و انقسام اعضاء کی داغ بیل پڑتی ہے، اس لیے سورۂ حج میں اشارہ کر دیا کہ مخلقۃ وغیر مخلقۃ (۲۲ : ۵) یعنی یہی مضغہ کا درجہ ہے جس میں یا تو داغ بیل پڑ جاتی ہے یا بگڑ کے رہ جاتا ہے۔

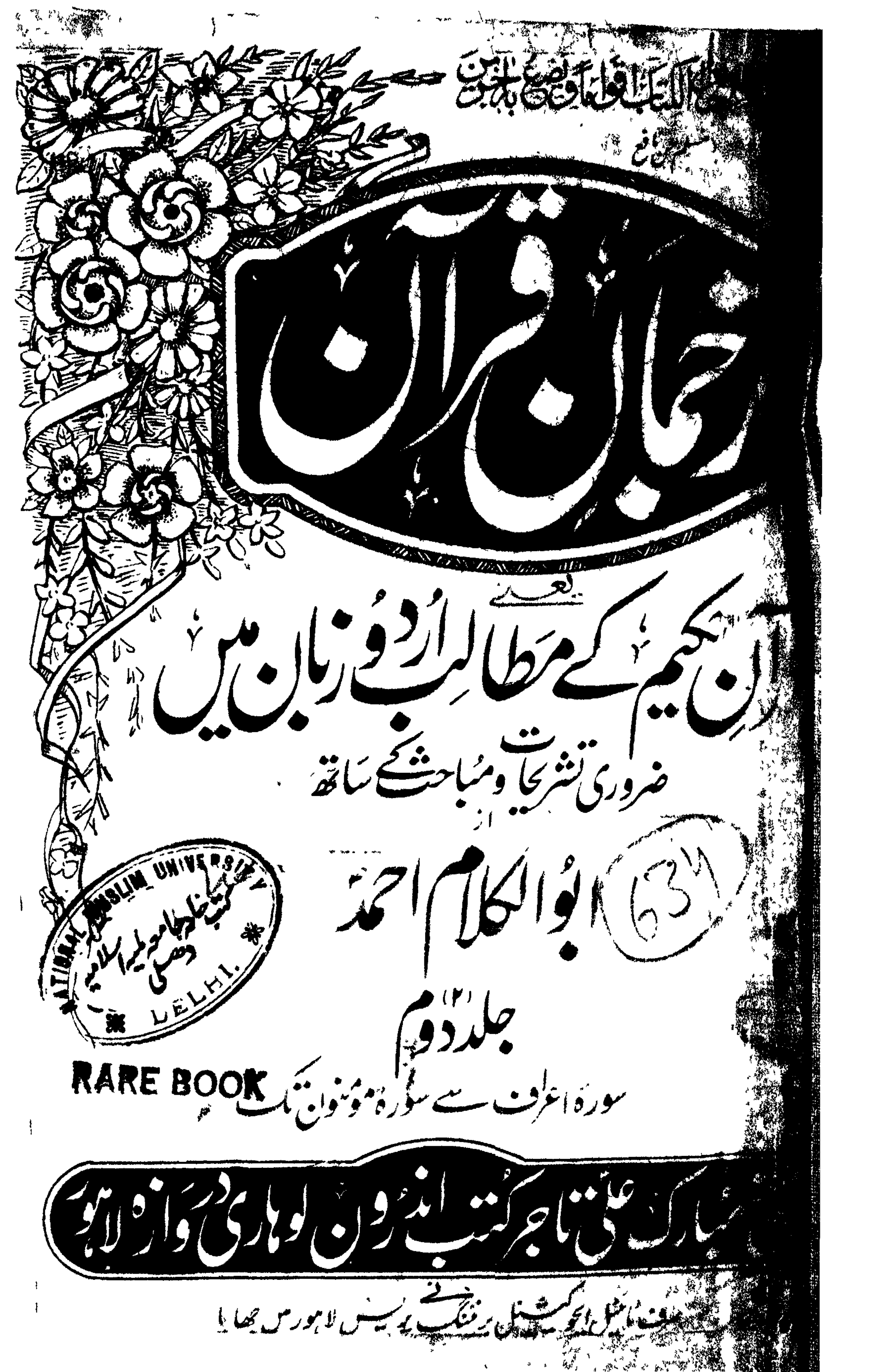
(۴) چوتھا درجہ وہ ہے جب اس مضغہ میں ریڑھ کی ہڈی کا ڈھانچا نشو و نما پانے لگتا ہے، اور ایک ایسا ہیکل نمایاں ہوتا ہے جو مچھلی سے مشابہ کہا گیا ہے۔ اسی کو فخلقنا المضغۃ عظاما سے تعبیر کیا ہے۔ اسی درجہ میں آکر جنین حیوانات فقاریہ Vertebrates [illegible] کی امتیازی خصوصیات پیدا کر لیتا ہے۔

(۵) پھر اسکے بعد ہڈیوں اور گوشت پوست کا التحاق تکمیل تک پہنچتا اور ایک حیوانی صورت متشکل ہو کر نمایاں ہو جاتی ہے۔ اسی کو فکسونا العظام لحما کے درجہ سے تعبیر کیا ہے۔

خلقا آخر

(۶) لیکن جو صورت [illegible] بھی کرتی ہو تو بندر کی صو[illegible] محض مضغہ تھا، وہی [illegible] کی سی صورت میں ابھرا [illegible] ہو؟ نہیں، ایسی، جو تمام حیواناتِ لبونہ کی مشترک صورت ہوتی ہے، وہ [illegible] کی دستکاری ایک نیا انقلاب تحول پیدا کر دیتی ہے۔ وہی جنین جو [illegible] تھا جس نے عام حیوانی شکل کی [illegible]، وہی حیوانی ہیکل [illegible] خصوصیتیں اور رعنائیاں پیدا کر لیتا ہے: فتبارک اللہ احسن الخالقین
یہی آخری مرتبۂ تحول ہے جسے ثم انشأناہ خلقا آخر سے تعبیر کیا ہے۔

ؔ دیکھیں پروفیسر موصوف کی کتاب دی ایوولیوشن آف مین [illegible] ترجمہ [illegible] جلد اول صفحہ ۲۰۲ (مطبوعہ [illegible])


ترجمان القرآن
یعنی
قرآن حکیم کے مطالب اردو زبان میں
ضروری تشریحات و مباحث کے ساتھ
از
ابو الکلام احمد
جلد دوم
RARE BOOK
سورہ اعراف سے سورہ مومنون تک
مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور
NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
DELHI.